تہذیب الاخلاق

B

Rs.4.50

اغراض ومقاصد

1. جدید سائنسی اور دور حاضر کے [illegible] دانشوری اور مربوط فکر کی روایت کا [illegible] سائنسی [illegible] آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت
2. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم [illegible] جامع رابطہ پر گہرا اور بامعنی [illegible]
3. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں [illegible] کو قریب تر کرنے کی کوشش۔
4. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔
5. مذہبی اداروں [illegible] کے موجودہ سائنسی علوم [illegible] اور تعلیم [illegible] کا جائزہ۔
• سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی [illegible] کی عام فہم زبان میں اشاعت۔
• علوم و فنون اور تحقیق کے فروغ میں [illegible] اور سامانوں [illegible]
— [illegible]

مقالہ نگاروں کیلیے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین [illegible]
عام فہم سائنسی [illegible] اصلاحی [illegible] مضامین [illegible] کو ترجیح دی جائے گی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

❋

❋ ❋

جلد ۱۰

شمارہ ۱-۲

SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جنوری-فروری ۱۹۹۱ء

* * *

خط و کتابت کا پتہ :

جوائنٹ ایڈیٹر کبیر احمد جائسی

ادارہ تہذیب الاخلاق [illegible]

[illegible]

زر سالانہ :

انڈیا — Rs. 40.00

بیرون ملک [illegible] ہوائی ڈاک

[illegible] بحری ڈاک

ترسیل زر کا پتہ :

ادارہ تہذیب الاخلاق [illegible]

[illegible]

Editor : TAHZEEB-UL-AKHLAQ

[illegible]

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

مندرجات

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بحیثیت ادارہ ان سے متفق ہو۔
[مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق، اینڈ لفاٹ، ایس ایم ہال
علی گڑھ — پرنٹرز: ایس کے آفسٹ پریس — دہلی ۶]

اداریہ

نومبر ۱۹۹۰ء کے اوائل ہی سے علی گڑھ کے شہری اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قرب وجوار اور کیمپس میں رہنے والے افراد جن اعصاب شکن حالات سے دوچار رہے ہیں اخبار بین طبقہ ان سے کسی حد تک آگاہ ہو چکا ہے۔ جس وقت یہ سطریں تحریر کی جا رہی ہیں اس وقت اگرچہ کشت وخون کی گرم بازاری ختم ہو چکی ہے مگر ساری فضا اب بھی اس طرح مسموم ہے کہ سانس لینا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ پہلے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں غلط بیانیوں کی گرم بازاری رہی، اب اس کا رُخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف موڑ دیا گیا ہے اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ فرقہ پرستوں کی ساری قوتیں یکجا ہو کر یونیورسٹی کو اپنی افواہوں، دشنام طرازیوں اور الزام تراشیوں کے تیروں کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ یہ قومی اہمیت ہی کا نہیں بلکہ بین الاقوامی اہمیت کا علمی وتدریسی ادارہ ہر طرف سے باد مخالف کے تھپیڑے کھا رہا ہے اور نام نہاد "قومی پریس" اس طوفانِ بے تمیزی کو مزید مہمیز کر رہا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس ادارے میں کبھی بھی مذہب، رنگ، نسل، زبان اور قومیت کی بنیاد پر طلبا، اساتذہ اور کارکنوں میں کوئی تفریق نہیں برتی گئی، سب باہم شیر وشکر ہو کر مدتوں سے ساتھ رہتے چلے آ رہے ہیں۔ جس زمانے میں ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور کثیر آبادی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئی، اس زمانے میں پورے ملک کی جو فضا تھی اس کو دیکھنے والے ابھی بہت سے افراد بقید حیات ہیں، وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ اس ماحول میں بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ان اعصاب شکن حالات سے نہیں گزری تھی جتنی ان تین مہینوں میں گزر چکی ہے۔ اس ادارے کے سلسلے میں ایسا گھناؤنا جھوٹ گھڑا گیا جس کو گھڑنے کی ہمت گوئبلز بھی نہ کرتا۔ ایک روزنامے نے اپنی خبث باطنی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ من گھڑت افسانہ شاہ سرخیوں سے شائع کر دیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے میڈیکل کالج میں زیر علاج ایک ہی فرقے کے افراد ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ پورے علی گڑھ میں آگ لگ گئی اور اسی خبر کی اشاعت کے نتیجہ میں گومتی ایکسپریس کو روک کر ایک ہی فرقہ کے افراد کو چن چن کر بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان بدقسمت افراد میں دوسرے فرقے کے بھی ایک صاحب تھے جنھوں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی اور بلوائیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ کیا بے تمیزی ہے" داڑھی اور بے تمیزی کے لفظ نے اُن کی جان لے لی۔ یہ نکتہ ناچیز صرف اس وجہ

ہے کہا کہ ایک مقامی اخبار نے تمام صحافتی اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایسا من گھڑت مسالہ شائع کر دیا جس کو پڑھ کر لوگ انسان سے حیوان بن گئے۔

گزشتہ تین ماہ میں جتنی جانیں جا چکی ہیں اب وہ اس دنیا میں دوبارہ لوٹ کر نہ آئیں گی۔ اس کشت و خون کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ جتنے لوگ بربریت و درندگی کا شکار ہوئے ہیں ان میں سے شاید ہی پانچ فی صد اصل بلوائی رہے ہوں۔ ان میں سے بیشتر لوگ بے قصور تھے۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انھوں نے انسان کی "انسانیت" پر یقین کیوں کر لیا تھا۔

ان فسادات کا ایک المناک پہلو اور بھی ہے۔ موجودہ حالات نے جس طرح باہمی اعتماد کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے اس کی بازیابی کے لیے برسوں ان تھک کوشش کرنی ہوگی۔ شک و شبہ کی جو فضا پیدا کر دی گئی ہے اس نے لوگوں کے سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب کر لی ہے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس فضا کو تقویت دینے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر میڈیا کا بھی ہاتھ رہا ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ دسمبر میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے یہ خبر نشر ہوئی تھی کہ پی اے سی کے جوانوں پر یونیورسٹی کیمپس میں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۹۱ء کے ٹائمس آف انڈیا کی ایک رپورٹ کے مطابق اس خبر کی حقیقت صرف اتنی سی تھی کہ سویلین پولس کے ایک فرد کو کچھ لڑکوں نے دوڑا لیا تھا۔ وہ شخص خاردار تاروں سے ٹکرا گیا اور اس کو معمولی خراشیں آئیں۔ اس واقعہ کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اس طرح نشر کیا جیسے پولس کے افراد پر مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں نے قاتلانہ حملہ کیا ہو۔ مذکورہ اخبار کی رپورٹ کے مطابق یونین وزیر داخلہ مسٹر سبودھ کانت سہائے نے حکم دیا ہے کہ اس بات کی تحقیق کی جائے کہ یہ غلط خبر کیسے اور کیوں نشر ہوئی؟ تحقیق ہو جائے گی، ممکن ہے غلط کار افراد کو سزا بھی مل جائے مگر جو باہمی اعتماد مجروح ہوا ہے اس کی تلافی کیسے ہوگی یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔

اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا جائے، باہمی اعتماد کی فضا بحال کی جائے، شک و شبہ کی فضا کو ختم کیا جائے اور ہر واقعے کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے مگر سوال یہ ہے کہ یہ سب کرے گا کون؟ سارے ذہن تو مسموم ہو چکے ہیں، دلوں میں نفرت کا لاوا ابل رہا ہے، آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے، چہروں سے درندگی نمایاں ہونے لگی ہے۔ آندھی میں چراغ جلانے والا آئے تو کہاں سے؟

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ دینیات (سنی) اور مشہور عالم دین مولانا محمد تقی امینی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم اس ادارے میں علمائے سلف کی آخری یادگار تھے۔ اب دور دور تک ان جیسا کوئی فرد نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ان کا نعم البدل اور ان کے دوستوں، شاگردوں، چاہنے والوں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی دولت عطا فرمائے۔ آمین۔

[illegible]

سرسید نے فرمایا

"قوم کی حالت اور اسلام کی عزت کیسی ہی خراب ہوتی جاوے اس کے اسباب پر غور کرنے اور اس کو رفع کرنے کا کسی کو خیال نہیں ہے۔ اپنے خیال کے مطابق جو ثواب اور دوسرے جہان میں اپنے جی کرنے کا کام سمجھتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ پھر کس طرح خیال ہو سکتا ہے کہ وہ قومی ہمدردی کے کام ہیں بلکہ محض خود غرضی ہے اور امید ہے وہ بھی حاصل نہ ہوگی۔"

"میں تم سے خدا کے سامنے بھی سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لیے کہتا ہوں۔ تم انہی پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔"

"میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچا سچائی کا پسند کرنے والا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے، چھوڑنا چاہیے، تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے پس اس کی ہم کو پیروی چاہیے۔"

"نہایت افسوس اور نادانی کی بات ہے کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں جس کا اثر خود اسی تک محدود ہے اور ہم کو اس سے کچھ بھی ضرر و نقصان نہیں جو صفت کہ انسان میں اس کے ابنائے جنس کا ہے اس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیے اور وہ صفت آپس کی محبت، باہمی دوستی، ایک دوسرے کی اعانت ایک دوسرے کی ہمدردی ہے جس کے مجموعے کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور آپس میں برادرانہ برتاؤ، قومی اتفاق، قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے، جو قومی ترقی کے لیے پہلی منزل ہے۔"

"شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں۔"

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH

PROF. M. N. FARUQUI
VICE CHANCELLOR

مکتوب شیخ الجامعہ

میرے عزیز بچو!

میں پہلی بار تہذیب الاخلاق کے ذریعے آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں، ادھر چند ماہ سے آپ کی مادر علمی جس طرح مخالف ہواؤں کی زد میں ہے اس سے آپ نہ صرف بخوبی واقف ہیں بلکہ شدید طور پر متاثر بھی۔ اس ہیجانی اور ہمت شکن عالم میں آپ نے جس صبر، ضبط، تحمل اور ڈسپلن کا مظاہرہ کیا ہے اس کے لیے میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اپنی مادر علمی کی نیک نامی اور سربلندی کے لیے آپ آئندہ بھی اسی صبر و ضبط اور تحمل کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔

تعطیلات سرما کے بعد یونیورسٹی دوبارہ کھل چکی ہے اور اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ سارے تدریسی امور مقررہ نظام الاوقات کے مطابق انجام پذیر ہوں، لیکن جو طاقتیں آپ کے کیمپس میں انتشار پھیلا کر آپ کو اور آپ کی یونیورسٹی کو بدنام کرنے کی درپے ہیں انہوں نے افواہوں کا بازار گرم کر رکھا ہے اور زرد صحافت کے نمائندے ان افواہوں کو "حقیقت" کا روپ دینے کے "کارِ خیر" میں شب و روز منہمک اور مصروف ہیں، اس صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ کو بڑی دانشمندی اور احتیاط سے اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت حالات کا تقاضا ہے کہ آپ کی مادر علمی میں ہر کام معمول کے مطابق ہوتے رہیں، دفاتر کھلے رہیں، کلاسوں میں تعلیم ہوتی رہے، لائبریری سے طلباء پورا فائدہ اٹھاتے رہیں، ہالوں میں امن و سکون رہے، کھیلوں کے میدان کی سرگرمیاں جاری رہیں، امتحانات وقت پر ہوں تاکہ آئندہ سال کے داخلے اپنے وقت پر ہو سکیں۔ ان تمام باتوں کی تکمیل کے لیے لازم ہے کہ آپ اسی صبر و ضبط اور ڈسپلن کا مظاہرہ کریں جو گذشتہ کئی ماہ سے آپ کرتے چلے آئے ہیں۔

میں اس تحریر کے ذریعے آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنے اپنے حلقوں میں بلا لحاظ مذہب و ملت ایک دوسرے کی اس طرح نگہداشت کیجیے جس طرح ایک خاندان کے افراد باہم دگر کیا کرتے ہیں، ہر اس عمل سے گریز کیجیے جس سے آپ کی اور آپ کی مادر علمی کی نیک نامی پر حرف آئے، افواہوں پر یقین نہ کیجیے اور جب بھی آپ تک کوئی اشتعال انگیز خبر پہنچے تو اپنا کوئی فوری ردعمل ظاہر کرنے سے قبل اس خبر کی تصدیق کرنے کی کوشش کیجیے، اپنے اساتذہ سینئر طلبا اور انتظامیہ کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کرکے ان کو آگاہ کیجیے اور ان کے تجربے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی ہدایتوں پر عمل کیجیے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حالات سے ہوشمندی کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا حوصلہ و عزم عطا فرمائے تاکہ آپ کی نیک نامی کے ساتھ ساتھ آپ کی مادر علمی کی نیک نامی کا بھی چراغ مخالف ہواؤں کی زد پر بھی جلتا رہے۔ آمین

دعاگو

محمد نسیم فاروقی

معیار کا سودا

سید حامد ○

ابھی چند روز کا ذکر ہے، ایک محفل میں ایک بات کانوں میں پڑی۔ یہ بات اُن باتوں میں سے تھی جو چونکا دیتی ہیں حالانکہ چونکا دینے کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ ایسی بات جس کے وجود کا احساس دل میں بہت دنوں سے کروٹیں لے رہا ہو، اسی کو اگر کوئی دوسرا معرضِ اظہار میں لے آئے تو آپ چونک جائیں آپ کو دھکا سا لگے۔

آپ کہیں گے بات کہہ کیوں نہیں ڈالتے، پہیلیاں کب تک بجھاؤ گے؟

اچھا سنیے بشرطیکہ آپ ایک طویل تمہید کو برداشت کر سکتے ہوں، وطن کی آزادی کے بعد سے مسلمانوں نے پیچھے کی طرف چلنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے انھیں کسی ٹائم مشین کی ضرورت نہیں پڑی، نہ تاریخ کے اوراق الٹنے کی۔ ناانصافیوں اور مصیبتوں پر وہ کڑھتے رہے، سلگتے رہے، وقت گنواتے رہے اور ایک وقت وہ آگیا کہ ان میں حرکت اور غیرت کی ساری صلاحیتیں مرجھا کر رہ گئیں۔ تب جا کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ہاں اس دورِ تعطل میں انھوں نے ایک کام ضرور کیا اپنے لیے ایک قفسِ آسودگی کا تیار کر لیا

اس اندیشے سے کہ پھر کہیں بے حرکتی اور کاہل وجودی پر سرزنش کرنا نہ شروع کر دے انھوں نے بے حسی کا ایک دبیر لبادہ تیار کرایا اور اسے اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ اب دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے، انہیں کوئی فکر نہیں؛ ان کے ہمدرد کتنا ہی شور مچائیں کہ خدارا اٹھ جاؤ، کیا فردائے قیامت کو اٹھوگے؟ ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ انھوں نے اپنے آپ کو دنیا سے اتنا الگ تھلگ اور اس کے پیغام رسانوں کے لیے اتنا بعید اور ناپذیر کر دیا کہ ان کے سکون میں اب خلل پڑ ہی نہیں سکتا۔

تھا ایک دور جب ان کے ساتھ متواتر بے مہری برتی گئی، ان پر ظلم کیے گئے لیکن آگے چل کر حکومتِ وقت نے جب یہ دیکھا کہ اب تو اُن کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں اور جمہوریت کے نام پر (اس کے نقاب پوش استبداد کی وجہ سے) دبا آرہا ہے، تو اس نے یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ آئینہ سانس کی آمد و شد سے نمناک ہے ان کو آکسیجن دینے کی ٹھانی چونکہ ان مسلمانوں کو بڑی جراحت اس بنا پر پہنچی تھی کہ ملک کے انتظام سے ان کو بے تعلق کر دیا گیا تھا، وہ سوچنے لگے تھے کہ اب وہ محکوم ہیں اور اکثریت حاکم۔ حکومت کے ایوانوں اور دفاتر میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ پہلے جو لوگ حکومت

○ سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ——— ہمدرد نگر، نئی دہلی۔

اور اس کے دفتروں میں تھے وہ سوچ کہ اس وقت پار کر گئے جب نقشے پر ریڈ کلف کے کھنچے ہوئے خطوط کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ اور خشک بھی کیسے ہوتی اسے اس ہم سے ہلاکوں انسانوں کا بہایا گیا، لہو برابر ملتی رہی۔ خون کی ندیاں بالعموم آجائیں تو اطراف کی زمین دیر تک گیلی رہتی ہے۔ ریڈکلف نے سرحدوں کے خطوط برجستہ اور بے محابا کھینچے۔ بے محابا کی اصطلاح توضیح طلب ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے حکم دیا اور برطانوی انصاف کے نمائندہ ریڈ کلف نے بلا تامل لکیروں کو آگے پیچھے کر دیا۔ گویا یہ کھیل کاغذ اور روشنائی کا تھا اس میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگی اور موت کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھ رہا تھا۔ محافظ خانہ (آرکائیوز) کے جو کاغذات لندن میں واشگاف ہوئے ہیں، انھوں نے ہمیں اس ناخوشگوار تجربے سے دوچار کر دیا کہ جس بت کی ہم اب تک پرستش کرتے رہے ہیں، اس کے پاؤں مٹی کے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بے دردی کی خفیف سی آہٹ تو ہمیں مل چکی تھی کہ اس نے کس طرح اپنی مرضی کا میں ایک پہر کے اضافے کو لاکھوں جانوں سے زیادہ وزن دیا، لیکن اس کی بے ایمانی کا راز جو تہ خانوں میں محفوظ تھا اب جا کر طشت از بام ہوا ہے۔

معلوم نہیں کیوں آج ہم "بے" کی گردان کر رہے ہیں، ایک انگریز گورنر جنرل کی بے دردی اور بے ایمانی کی اور خود اپنی بے حسی کی۔ ہم نے دیکھا کہ بہت سے مسلمان، جو حکومت اور اس کے دفتروں سے تعلق رکھتے تھے، پہلے ریلے میں ہی سرحد کو پار کر گئے۔ جو بچے وہ تیس پینتیس سال کے عرصے میں ملک عدم کو سدھار گئے۔ ان کی جگہ بھرتی بیشتر دوسروں کی ہوئی۔ کیوں کہ اکثریت کا انصاف اور اقلیت کا حوصلہ خون کی ندیوں میں غرق ہو گیا تھا۔ گھورے کے دن بھی کبھی نہ کبھی پھرتے ہیں، حکومت بالآخر اور اس نے دو تین سال کے غور و فکر کے بعد بحث کے بعد ایک مرتبہ انسانوں کی اس التماس کو مان لیا کہ مسلمانوں کو مقابلے کے امتحانوں کے لیے تیار کیا جانا چاہیے۔ اصل ایک بار لے جائے تو الطاف سنگ میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔ یہ بات مسز گاندھی کے پندرہ نکاتی پروگرام میں شامل ہو گئی۔

جس مثل کا تذکرہ آغاز گفتگو میں کیا گیا ہے وہ ان ہم درجنی مراکز میں سے ایک مرکز سے تعلق رکھتی ہے جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ہندوستان کی منتخب یونیورسٹیوں اور کالجوں میں کھولے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان مراکز نے ابھی تک حوصلہ شکن نتائج دکھائے ہیں۔ وجوہات اس کی کئی ہیں لیکن ایک بڑی وجہ وہی بے حسی کا بادہ ہے جو ہم نے اوڑھ رکھا ہے اور تعلیم کے دوران معیار سے وہ تغافل ہے جو ہم نے اختیار کر رکھا ہے "اگر محنت کی تو آسمان تو ہم پر نہیں گر پڑے گا"۔ جو لوگ امید کی رٹ لگا کر ہماری نیند میں خلل ڈالتے ہیں انھیں مجنوں سمجھ لیا۔ ان مراکز کے منتظمین نے بالعموم اس کام کو جو ایثار اور مجاہدے کا مطالبہ کرتا ہے، مشاہروں میں اضافہ اور احباب کو نوازنے کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ حقیقت کو چھپانے کے لیے نتائج کے اعداد و شمار کو بعض حضرات مبہم رکھتے ہیں اور بعض انھیں اختراع کر لیتے ہیں۔ رسوائی ان غریبوں کی ہوتی ہے جو سچ سچ لکھ دیتے ہیں۔

چنانچہ وہ بات جس نے راقم کو بادصف اندیشہ ہلا دیا کوچنگ کے ایک مرکز کی مشاورتی کمیٹی میں کہی گئی۔ چونکہ بڑی جبر تھا اس لیے 'ادھر' کہہ کر اس تکلیف دہ بات کو سامنے سے ہٹانا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر، مرکزی حکومت کے ایک شعبہ کے سکریٹری، ایک ریاستی پبلک سروس کمیشن کے صدر اور ایک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے سالہا سال بہت سی (انتخاب کرنے والی) سلیکشن کمیٹیوں میں بیٹھے اور جب کبھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا امیدواروں کی حیثیت سے ان کے سامنے آئے تو اُن کے دل نے کہا ان کی خیر ہو۔ اکثر و بیشتر وہ اُن مسلمان امیدواروں سے لیاقت اور رجحان دونوں میں فروتر نکلے جو دوسری یونیورسٹیوں سے فارغ ہو کر آئے

۔کتنی عبرت ناک ہے یہ بات جو ایک درد مند تجربہ کار اور
ب بصیرت اہلِ تعلیم نے برملا برسرِ محفل کہی۔ ہمارے لیے
یہ ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہے؟ ڈوب مرنے سے کام
ہ چلتا۔ کیا ہمارے لیے یہ دانت پیس کر اور کمر کس کے اُٹھ
نے کا موقع نہیں ہے۔ ان یونیورسٹیوں کے پاس کیا نہیں
ہے؟ راقم سطور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو قریب سے جانتا ہے
ن کے پاس وسائل کی ریل پیل ہے۔ وائس چانسلر یونیورسٹی کے
لیے جو مطالبہ کرتا ہے وہ رَد نہیں کیا جاتا۔ یہ اور بات
ہے کہ جتنا روپیہ یو۔جی۔سی سے ملتا ہے اس کے علاوہ بھی
بہت بڑی رقوم پروجیکٹوں کے لیے مختلف شعبوں سے مل
سکتی ہیں۔ اگر معقول پروجیکٹ بنانے کی زحمت اُٹھائی
جانے اور صلاحیت پیدا کی جائے۔ لیکن بے حسی بالعموم ان
باتوں کا موقع نہیں دیتی۔

ابھی کانوں میں یہ دکھ دینے والی بات گونج ہی رہی
تھی کہ تامل ناڈو کے ایک جنوبی ضلع تری چی دہلی میں حاضری
کا اتفاق ہوا۔ یہاں ایک بزرگ کی زبانی وہی بات سنی جو علی گڑھ
میں سُنا کرتا تھا۔ اگر ہم انھیں داخلہ نہ دیں گے تو ہمارے
کمزور بچے کہاں داخلہ پائیں گے۔ گویا ہمارے تعلیمی اداروں
کا کام یہی ہے کہ ان میں ردّی ڈال دی جائے۔ ردی
کی ٹوکری کے تصور میں معیار کو اونچا کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔
یہ بات ہم تسلیم کر کے چلتے ہیں کہ ابھی کچھ عرصے تک (حالانکہ اس
مدّت کو اب ختم ہو جانا چاہیے تھا) ہمارے کچھ ادارے پچھلی
پیڑھی کی تعلیم کے لیے معیار کو ڈھیلا رکھنے پر خود کو مجبور پائیں
گے لیکن ہمارے منتخب اور اعلیٰ اداروں کے تنگ معیاری
کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بیساکھیاں لگا کر دوڑا نہیں جا سکتا اور
دوڑے بنا کام نہیں چلتا۔

مسلمان لڑکے جو عام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ
لیتے ہیں، انھیں دوسرے طالب علموں کی صحبت اور ان سے
مسابقت مہمیز کرتی ہے اور وہ فرطِ محنت سے مقابلے کے
میدان میں سرخرو ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں دیکھا کہ یہاں مسلمان ہی
مسلمان ہیں وہیں محنت کو ایک پریشان خواب کی طرح اپنے دماغ
سے نکال باہر کیا، وہیں کمر کھول دی اور غفلت اور ادبار کا
کمبل تان کر سو گئے۔ کیا ضروری ہے کہ ان لوگوں کو ہائی اسکول
کے بعد تعلیم دی جائے جو اعلیٰ تعلیم کا عَلم اُٹھانے کے در اصل،
اور واضح طور پر، اہل نہیں ہیں۔ یہ دونوں طرف اوقات کا زیاں
ہے۔

بیسویں صدی نے مقابلے کو بہت سخت کر دیا تھا اور
اکیسویں صدی تو آنکھ سے دھمکی دے رہی ہے کہ وہ اور
زیادہ مقابل ہوگی اور اپنی تیز رفتاری میں سست قدموں کو
روندتی اور کچلتی ہوئی آگے بڑھ جائے گی۔

مئی کی شروعات میں الامین سوسائٹی بنگلور نے
اردو اکیڈمی دہلی کی شرکت میں ایک سیمینار مسلمانوں کے تعلیمی
مسائل کے بارے میں کیا تھا، وہاں بھی ہمارے ایک نیک نیت
اور خوش اندیش پروفیسر نے اس بات پر سرِ بزم اعتراض
کیا کہ معیار پر زور کیوں دیا جا رہا ہے۔ ان سے کوئی پوچھے
کہ معیار پر زور نہ دیا جائے تو کاہے پر دیا جائے۔ اگر
زمانے کی لغت سے 'مقابلہ' کا لفظ اور "اکتسابِ فضیلت" کی
اصطلاح نکال دی جائے تو ہم بھی معیار کی بات کرنا چھوڑ دیں
گے۔ یاد رکھیے کہ اگر معیار سے ہم یوں ہی اغماض برتتے چلے
گئے تو عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنا ہمارے قبضۂ
اختیار سے باہر ہو جائے گا۔ ہم سر اُٹھا کر نہیں چل سکیں
گے؛ سرنگوں ہو کر بیٹھے رہیں گے اور کاہلی اور بے حسی کے
تحت جو سرنگوں ہو کر بیٹھا وہ آخری ہچکی خود کردوں کے مصار
میں لے گا۔

مولانا محمد تقی امینی رح

شہادت بہ وجود خود زخون دوستان خواہی

محمد مسعود عالم قاسمی ○

۲۱ جنوری ۱۹۹۱ بروز پیر مولانا پروفیسر محمد تقی امینی کے اچانک حادثۂ انتقال کی خبر سن کر مجھ جیسے ان کے ہزاروں محبین، متوسلین اور تلامذہ ذہنی زلزلہ کا شکار رہے۔ علمی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ یہ حادثہ تادم تحریر آنسوؤں اور دعاؤں کا خراج وصول کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ اس حادثے نے مولانا محترم کی ملت اسلامی و دینی خدمات، تدریس و تقریر اور مجلس و ملاقات کی یادوں کو ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھیر دیا ہے۔ اس تسبیح کے کچھ دانے فراموشی کی تاریکی میں گم ہو گئے اور کچھ کف دست میں ہیں۔ سنا ہے کہ بزرگوں کو یاد کرنا اور ان کی خوبیوں اور نیکیوں کا تذکرہ کرنا ثواب کا کام ہے، تو میں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے ان چند دانوں سے ثواب کی نیت لیے قلم برداشتہ ہوں۔

۴ اگست ۱۹۹۰ء کے ہفت روزہ نظر کے آخری صفحہ پر جناب شمیم طارق صاحب کا "ستارہ جو آفتاب بن گیا" کے عنوان سے مولانا کا سوانحی خاکہ شائع ہوا تو مولانا نے مجھے بلا بھیجا اور اس کی ایک فوٹو کاپی عنایت کی۔ میں نے کہا مولانا شاید آپ کے بعد آپ کا ذکر خیر کرنے والا پہلا آدمی میں ہی ہوں گا۔ مولانا نے فرمایا مجھے بھی اس کا یقین ہے۔ میں مولانا کا حبیب کہتا ہوں اپنے آپ کو کہ مولانا کی نماز جنازہ سے پہلے خبر کا، جنازہ کے سامنے اور نماز جنازہ کے بعد فیکلٹی آف تھیالوجی کے تعزیتی جلسے میں یہ سعادت مجھے ملی اور شاید یہ تحریر بھی اسی سے وابستہ ہے۔ نظر کے مذکورہ اقتباس پر مولانا نے متعدد مرتبہ فرمایا یہ مضمون تو چھپ گیا کہ ستارہ جو آفتاب بن گیا اب یہ بھی چھپے گا کہ وہ آفتاب غروب ہو گیا اور پھر چھ ماہ کے اندر ہی یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد تقی امینی ۵ مئی ۱۹۲۶ء مطابق ۲۲ شوال ۱۳۴۴ھ کو ضلع بارہ بنکی کے ایک گاؤں سمہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں حاصل کی جو تجوید و حفظ اور عربی و فارسی کی ضروری واقفیت پر مشتمل تھی۔ پھر جامع العلوم کانپور میں تحصیل علم کیا اور آخر میں مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل ہوئے جہاں مولانا مفتی کفایت اللہ وغیرہ جیسے جلیل القدر علماء سے رسمی تعلیم کی تکمیل کی۔ مولانا اپنے نام کے ساتھ امینی لکھتے تھے۔ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ امینی کی نسبت قاسمی اور ندوی کی طرح اس ادارہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں سے آپ نے سند فراغت حاصل کی مگر مولانا اس نسبت کو امانت سے جوڑتے تھے جو دین کی اساس ہے۔

فراغت کے بعد مولانا نے مدرسہ سبحانیہ دہلی، جامع العلوم کانپور، مدرسہ فرقانیہ اور مدرسہ ثانویہ ناگپور

○ ناظم دینیات (سنی) اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

دارالعلوم معینیہ اجمیر اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ابتدا میں مولانا نے وعظ و تقریر اور مناظرہ کو بھی اپنا میدان بنایا۔ کانپور اور اپنے وطن میں متعدد مناظرے کیے، بدعات و خرافات اور منکرات کے خلاف لسانی جہاد کیا جس کے نتیجے میں بہت سے وہ لوگ ان مخالف اور درپے آزار ہو گئے جو منکرات و بدعات کو اپنے مفادات اور معیشت کا وسیلہ بنا چکے تھے۔ بعد میں مولانا خود اس طریق تبلیغ سے دست بردار ہو گئے۔ کیونکہ ان کو اس سے کسی مثبت تبدیلی کی توقع نہ رہی۔ مولانا اکثر و بیشتر اپنے علاقے کے چودھری محمد شفیع کا تذکرہ کرتے جو اس فضا میں مولانا کے سرپرست قدردان اور پشت پناہ تھے، اجمیر کے دوران قیام میں اگرچہ وہ مناظرہ چھوڑ چکے تھے مگر ان کی حق گوئی کو وہاں بھی آزار پہنچے۔ ایسے ہی مخالف ماحول میں ایک مرتبہ اپنے حالات مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی " کو لکھے تو مفتی صاحب نے جواباً لکھا۔

"یہ ضروری ہے کہ آدمی جب بھی کہے حق بات کہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وقت کہتا رہے۔"

مولانا ممدوح مفتی صاحب کا یہ فقرہ اکثر دہرایا کرتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں جب کہ ہندوستان کی فضا مسلمانوں کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہ تھی مولانا نے ناگپور کو اپنا مستقر بنایا، وہاں انہوں نے امامت، تدریس اور تصنیف کی سہ گونہ مصروفیات کا حصار اپنے گرد قائم کر لیا۔ مسجد کا وہ حجرہ آج بھی موجود ہے جہاں مولانا محترم نے اپنی پہلی باقاعدہ تصنیف "اسلام کا زرعی نظام" مکمل کی۔

اجمیر میں مولانا صدر مدرس رہے اور تدریس و تصنیف کے ساتھ سماجی کاموں میں بھی حصہ لینے لگے۔ وہ منظور حسین ایڈووکیٹ اور محمد یوسف سابق ایڈیٹر ریڈینس وغیرہ کے ساتھ تعلیمی کونسل کے بھی روح رواں رہے۔ مولانا نے وہاں اپنا ایک چھوٹا سا ادارہ علم و عرفان کے نام سے قائم کیا۔ کچھ عرصے کے لیے مولانا کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی رہا جہاں انھوں نے مجلس تحقیقات شرعیہ کے کنوینر کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد میں کچھ متعین اسباب کی بنا پر اس سے کنارہ کش ہو گئے۔

۱۹۶۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بحیثیت ناظم سنی دینیات کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور بہت جلد طلباء اساتذہ اور ملازمین کی محبتوں کا مرجع بن گئے۔ ۱۹۸۳ء میں محنت و دیانت کے ساتھ انجام دی گئی ان کی بیس سالہ خدمات اور علمی حلقوں میں ان کی مقبولیت و مرجعیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس وقت کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے ان کو پروفیسر شپ کی پیش کش کی جسے مولانا نے قبول کر لیا اور اگست ۱۹۸۶ء تک مولانا نے تدریسی خدمات کے ساتھ صدر شعبہ سنی دینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کی حیثیت سے تعلیمی و انتظامی فرائض انجام دیے۔ مولانا کی طویل دینی و علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سابق شیخ الجامعہ سید ہاشم علی صاحب نے ۱۹۸۹ء تک ان کی ملازمت میں توسیع کی۔

مولانا ممدوح علی گڑھ میں ناظم کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد پابندی سے ہر جمعہ کو جامع مسجد میں ۳۰ منٹ کا اردو میں جامع اور علمی خطبہ دیا کرتے تھے۔ اس خطبہ میں شریک ہونے کے لیے بہت سے نمازی پہلے سے جگہ لیتے اور ذوق و شوق کے ساتھ ان کا خطبہ سنتے۔ ممتاز ادیب و طنز نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم بھی سامعین میں سے ایک تھے۔ بلکہ یہ بزرگ پابندی سے اپنے تاثرات کا بھی اظہار فرماتے۔ مولانا اپنے خطبے میں مبادیات دین سے لے کر تاریخی و علمی مسائل اور حالات حاضرہ کے بہت سے حقائق اور معارف کو سمیٹ لیتے تھے۔ مولانا کا اپنا انداز بیان ہوتا اپنا رنگ و آہنگ ہوتا جسے جیل بھی کہیے اور جلیل بھی۔ مولانا کے خطبات مدتوں یاد کیے جائیں گے۔ ان خطبات میں یونیورسٹی کا ملازم نہیں بلکہ عالم دین اپنی حق گوئی و بیباکی کی روایتی شان کے ساتھ نظر آتا تھا۔ مولانا کے خطبات کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

مولانا کی دوسری کتابیں اس طرح ہیں:

۱۔ اسلام کا زرعی نظام۔ ۲۔ حدیث کا درایتی معیار

۳۔ فقہ کا تاریخی پس منظر ۴۔ اجتہاد کا تاریخی پس منظر

۵۔ مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر (یہ دونوں کتابیں یکجا پاکستان سے شائع ہوئی ہیں)۔ ان میں سے ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ Fundamentals of Ijtihad کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔

۶۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت۔ اس کا بھی انگریزی ترجمہ پروفیسر غلام محمد صاحب سابق ڈین فیکلٹی آف قانون اے ایم یو نے Time Changes in Islamic Law کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادارہ ادبیات دہلی سے شائع ہوا ہے۔

۷۔ لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ The Age of Atheism کے نام سے شائع ہوا ہے اور عربی ترجمہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے عصر الالحاد کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

۸۔ تہذیب کی تشکیل جدید۔ اس کتاب کا بھی انگریزی ترجمہ Reconstruction of Culture کے نام سے اور عربی ترجمہ الاسلام تشکیل جدید للحضارۃ کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔

۹۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔ اس کا عربی ترجمہ النظام الالٰہی للرقی والانحطاط کے نام سے ڈاکٹر ازہری نے کیا ہے۔

۱۰۔ الاسس الفکریۃ الایمانیۃ (عربی) یہ کتاب ہم آہنگ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعض حصوں کا ترجمہ راقم نے کیا تھا۔

۱۱۔ بین الانسان الطبیعی والانسان الصناعی۔ عربی کی مذکورہ [illegible] ہوچکی ہیں۔

۱۲ معاملات میں [illegible] کا اہتمام

۱۳ مراسلات (دینی مسائل و مسائل کا مجموعہ)

۱۴ حکمت القرآن

۱۵ مقالات امینی۔

۱۶ الفرقان کی فکری معنویت۔

۱۷ خطبات جمعہ و عیدین۔

۱۸ ہدایت القرآن۔ اس نام سے عمر کے آخری حصے میں مولانا نے قرآن کریم کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی۔ سورۃ البقرہ کے آخر تک کی تفسیر حکمت القرآن لاہور اور دیگر رسائل میں بالاقساط شائع ہوچکی ہیں۔ مولانا نے یہ تفسیر سورۃ المائدہ تک مکمل کی تھی اور پورے قرآن کی تفسیر کی خواہش رکھتے تھے مگر ہدایت القرآن مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کا ہم قسمت ہوگیا۔ ان کتابوں کے علاوہ پچاس سے زیادہ طویل و مختصر مضامین ہیں جو مختلف رسائل بالخصوص برہان اور احتساب کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔

مولانا کے علمی کام کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے مولانا کے نقطۂ نظر سے واقف ہونا ضروری ہے۔ یوں تو مولانا نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا قرآنیات، حدیث، فقہ و سیرت، تعلیم و تہذیب، مذاہب و نظریات سب سے دلچسپی رکھی مگر ان کی صلاحیت کا اصل میدان فقہ تھا۔ مولانا نے فقہ کی تدوین جدید پر زور انداز میں وکالت کی اور اس سلسلے میں رہنما خطوط و اشارات کی نشان دہی کی۔ مولانا نے قدیم دنیا کے جمود کو توڑنے اور عصر حاضر کی تغیر پذیر قدروں کو سمجھنے پر جتنا زور دیا وہ ان کے معاصرین کے یہاں کم ملتا ہے۔ مولانا کی بصیرت ان کے ہی الفاظ میں یہ تھی کہ ہماری کوشش زندگی اور قانون کے توازن اور تعادل رکھنے کو بحال کرنے کی ہونی چاہیے۔ زندگی اور قانون کا رشتہ ٹوٹے گا تو نہ قانون کی اہمیت ہوگی اور نہ زندگی کی قیمت برقرار رہے گی۔ مولانا کی فقہی تحریروں میں اس کوشش کا

عکس صاف نظر آتا ہے۔ مولانا کے علمی تفردات سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے مگر اس جذبہ صادق کی ناقدری درحقیقت قدرِ علم سے انحراف ہوگا۔ بعض وہ مسائل جن میں بہت پہلے مولانا منفرد تھے وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان کے بیشتر علما نے ان کی تائید کی۔ اس طرح کے بعض مسائل تہذیب کی تشکیل جدید میں اور احکام شرعیہ میں موجود ہیں۔ مولانا اپنے قدیم علمی ورثہ سے بھی وابستہ اور جدید فکری رجحانات سے بھی باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر ان رجحانات کا جمعہ کے خطبات اور احتساب کے صفحات میں محاسبہ بھی کرتے تھے ان کی کتابوں اور مضامین میں یہ پہلو بھی خاصا ممتاز نظر آتا ہے۔ میں ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کے اس تجزیہ سے اتفاق کرتا ہوں کہ

"وہ نہ تو مقلد قلم کار ہیں اور نہ ایسے مفکر ہیں
جو عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیتے ہیں
بلکہ وہ ایسے مسلمان مفکر ہیں جو ان فکری اصول
سے لیس ہیں جن کی عصر حاضر میں اسلام کے
دفاع کے لیے ضرورت ہے۔"

مولانا اپنی ہر بات کا حوالہ ماضی سے ڈھونڈ کر لاتے تھے اور کہتے تھے میں اپنی بات گزشتہ علما کی زبان سے کہتا ہوں، اسی لیے کوئی میری مخالفت نہیں کرتا، بعض لوگوں کو ان کے مسلسل اقتباسات اور حوالوں سے تکدر رہتا اور اس کا اظہار بھی ہوتا مگر مولانا اس راہ کی نزاکتوں سے واقف تھے۔ اس لیے اس انداز تصنیف میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتے تھے۔

مولانا اپنی تحریریں چھپنے سے پہلے دوسروں کو سنایا کرتے۔ اکثر راقم کو بھی سناتے اور کہتے تبصرہ کرو اور میرا حال یہ ہوتا "گویم مشکل نہ گویم مشکل"۔ کبھی کہتے میری کتابیں کون پڑھتا ہے۔ میں تو اپنی دماغی خارش مٹانے کے لیے لکھتا ہوں۔ آخری عمر میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے کہا۔ مولانا کھڑکی بھی بند کر دیجیے۔ یہ بھی حجاب ہے اب ہم لوگوں کا بلاوا آنے والا ہے۔ مولانا بولے۔ میں نہیں چھوڑ سکتا یہ میری عادت ہے۔ یہی میرا ذکر ہے اور یہی سب کچھ ہے مولانا اکثر یہ فرماتے۔ دنیا میں حسن کی کمی نہیں آنکھ کی کمی ہے مولانا کے علم و اخلاق سے فیض یاب ہونے والے جانتے ہیں کہ ان کو اللہ نے حسن بھی دیا تھا اور آنکھ بھی۔ مولانا کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کا اعتراف اور اکرام دونوں کرتے تھے۔ کسی کی کوئی بات اچھی لگتی اسے اپنا لیتے۔ خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ ایک مرتبہ مشہور ہندی مترجم قرآن محمد فاروق خاں صاحب ان سے ملنے آئے۔ مولانا نے پوچھا نجات آسان ہے یا مشکل۔ خاں صاحب نے کہا۔ اللہ کے ساتھ اگر راست بازی اختیار کی جائے تو نجات آسان ہے اور اگر اللہ کے ساتھ چالاکی کی جائے تو نجات مشکل ہے۔ عافیت اسی میں ہے کہ گناہ سرزد ہو تو اعتراف گناہ کرے۔ مولانا اپنی مجلسوں اور تقریروں میں بار بار اس جملہ کو بیان فرماتے۔ مولانا کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی ہے۔ مولانا عموماً وہاں جاتے۔ وہاں علما اور طلبا سے گھل مل کر باتیں کرتے اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے۔ بے تکلف مسئلہ پوچھتے، رائے طلب کرتے۔ مولانا جب یہاں آتے تو سب لوگ روحانی سرور محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ مجھ سے پوچھنے لگے۔ بتاؤ کہ قرآن کی آیت "لم یمسسہم سوء" میں دنیاوی تکالیف کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ شفقتیں یہ رفعتیں یہ بانکپن یہ عنایتیں مولانا اپنے ساتھ لے گئے۔

مولانا دینی جلسوں، علمی سیمیناروں اور خاص کر میٹنگ میں بھی حسب سہولت شرکت فرماتے اور اپنی منفرد شخصیت کا نقش ذہنوں میں چھوڑ آتے۔ علمی ذوق کی تسکین کے لیے صدق جدید کے انداز پر پندرہ روزہ دینی اخبار احتساب بھی نکالتے جس کے لیے ذہنی اور مالی صلاحیت خرچ کرتے

ہوئیں یہ جذبہ بڑھتا گیا۔ مولانا طالب علموں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ ان کے مسائل پر توجہ دیتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ بہت سے طلبا کی مالی امداد کرتے۔ کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو اس کی کسک اپنے دل میں محسوس کرتے اور اس کی مدد کے لیے بے چین رہتے۔ غریبوں اور ناداروں کا بڑا خیال رکھتے اور کبھی اپنے دروازے سے سائل کو ناکام نہ لوٹاتے۔ ایسے لوگوں کا پتہ چلاتے جو ان کی مدد کے مستحق ہوں۔ ایسے متعدد واقعات کا خود میں عینی شاہد ہوں۔ ایک واقعہ بطور مشتے نمونہ از خروارے سن لیجیے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کے کچھ طالب علم علی گڑھ آئے تو مجھ سے ملنے آئے میں ان کو مولانا کی خدمت میں لے گیا۔ سردی کے یہی دن تھے۔ ایک طالب علم سوئیٹر قمیص کے نیچے پہنے ہوا تھا۔ مولانا نے مجھے الگ بلایا اور سو روپے کا ایک نوٹ ہاتھ میں تھما کر کہا اسے دے دینا، سوئیٹر خرید لے گا میں نے تعمیل حکم کیا مگر اس طالب علم نے قمیص اٹھا کر سوئیٹر دکھایا۔ میں نے مولانا کو صورت حال بتائی تو فرمایا پھر بھی دے دو، سفر میں کام آئے گا۔

اپنی یونیورسٹی کے متعدد طالب علموں سے میں واقف ہوں جن کے ڈیوز مولانا کی تنخواہ سے ادا ہوئے۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے میرے سامنے کہا۔ مولانا! ایک عورت ہر ہفتہ یہیں کر آتی ہے، آپ اسے پیسے دے دیتے ہیں۔ وہ ہر ہفتہ آ کر پھر مانگنے آتی ہے آپ منع نہیں کرتے۔ مولانا نے مخلوق خدا کی ضرورت کا حوالہ دے کر ٹال دیا اور اس اصول پر مرتے دم تک قائم رہے کہ کسی کی کمائی میں سب کا حصہ ہے۔

ہمارے مولانا مرنجاں مرنج اور ہشت پہلو شخصیت کے حامل تھے۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے بھی دوست تھے۔ ان کا شیوہ فیض کی زبانی یہ تھا ؎

ہو زمانہ، ہو خیال یار، ہو کہ دست عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

بعض لوگوں نے مولانا پر رکیک حملے کیے اور سنگین الزامات لگائے، مگر مولانا صبر و تحمل اور عفو و درگزر کی تصویر بنے رہے البتہ ایسے لوگوں سے محتاط رہتے۔ انہوں نے بچوں کی سی معصوم طبیعت پائی تھی۔ جلد ناراض بھی ہوتے اور جلد ہی مان بھی جاتے۔ کسی کو ڈانٹ دیتے پھر محسوس کرتے تو خود ہی معافی مانگ کر اس کی تلافی کرتے۔ فیکلٹی کے ایک چپراسی سے ناراض ہوئے تو ڈانٹ لگائی۔ دوسرے دن بلا کر معافی مانگ لی۔ ہاں صاحب! میرے مولانا نے ڈین ہو کر اپنے چپراسی سے معافی مانگی اور جیب سے کچھ روپے نکال کر دیے اور کہا جاؤ چائے پی لینا۔

مولانا کسی کا دل دکھانا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے اور ہر کسی کی دلجوئی کرنا اپنا وطیرہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں، بشیر بھائی (استاد سنی دینیات) رات گئے تک مولانا سے استفادہ کرتے رہے بات مصر کے سابق حکمران جمال عبدالناصر اور اخوان المسلمون پر چل نکلی۔ مولانا کہہ گئے کہ اخوان نے جمال کی حکومت چھیننا چاہی تو جمال نے اخوان کو مٹانا چاہا۔ معاملہ برابر کا تھا۔ اس پر میں نے عرض کیا۔ مولانا! تو پھر حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی حکومت چھیننا چاہی اور فرعون نے ان کے قتل کی سازش کی۔ یہ معاملہ بھی برابر کا رہا۔ اس پر مولانا بہت ناراض ہوئے اور بشیر بھائی سے کہا۔ اس کی دیدہ دلیری دیکھتے ہو، یہ کیسی بات کر رہا ہے۔ پھر مجلس برخاست ہو گئی۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر مولانا سیدھے میرے گھر آئے اور پھر فرمایا "بھئی رات میری بات سے تمہیں تکلیف ہوئی معاف کرنا"۔ ادھر میرا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ پیروں تلے سے زمین نکل گئی، فرشتہ صفت عالم دین سامنے کھڑا تھا۔ ایسے دور میں جب کہ اپنی باتوں پر اصرار اور ہر بات پر اپنی انا کا اظہار دانشوری کا معیار بننے لگا ہو۔ مولانا کا کردار بڑا پاکیزہ نظر آتا ہے۔ مولانا اپنی تعریف اور دوسروں کی غیبت سے پرہیز کرتے تھے۔

حقوق اللہ کے ساتھ مولانا حقوق العباد کے معاملے میں

حساس تھے۔ خود مجھ سے ایک سے زیادہ مرتبہ فرمایا کہ میں نے ۲۳ سالوں تک جامع مسجد کے منبر پر تقریریں کیں مگر ہمارا مذہب ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھا، عبادات میں دینداری و پارسائی ہے مگر معاملات میں داخل نہ ہو سکا۔ مولانا کی خانگی زندگی قابل رحم رہی تھی۔ مولانا کی اہلیہ ہمیشہ ذہنی عارضے میں مبتلا رہیں۔ مولانا کو بہت سے قریبی لوگوں نے عقد ثانی کا مشورہ دیا مگر مولانا نے انکار کر دیا۔ اس کے برخلاف اہلیہ کی تیمارداری اور نگہداشت کی ذمہ داری نباہ کر اپنا مرتبہ بلند کیا۔ مولانا ۱۹۸۵ء کے بعد خود داڑھ کے درد اور گٹھیا کے مرض میں مستقل طور سے مبتلا رہے۔ تکلیف میں کبھی کمی ہوتی اور کبھی اضافہ ہوتا مگر اس عالم میں بھی وہ دوسروں کی عیادت کرنا نہ بھولتے۔ پڑوسیوں کی خبرگیری سے غافل نہ رہتے اور حقوق کی ادائیگی میں حساس رہتے۔ راقم کے ایک شناسا نے جو فیض آباد کے رہنے والے ہیں بتایا کہ میں احتساب کا خریدار تھا۔ ایک مرتبہ احتساب نہیں آیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد منی آرڈر سے باقی پیسہ واپس آیا اس تحریر کے ساتھ کہ احتساب بند ہے۔ آپ کی بقیہ امانت واپس کی جاتی ہے۔

مولانا ممدوح حق گو اور جری تھے اور حق بات کہنے میں رشتے اور تعلقات، منصب و حیثیت کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کنیڈی ہال میں تقریر ہوئی۔ مولانا ندوی نے پیام انسانیت سے متعلق تقریر کی اور کہا کہ ہمیں اس کام کو ہر قسم کی لالچ اور مفاد سے بالاتر ہو کر کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ دینی مفاد سے بھی بلند ہو کر۔ مولانا مرحوم کو یہ بات غلط محسوس ہوئی اور انھوں نے جمعہ کے خطبے میں اس کی تردید کی اور فرمایا: دین کی سربلندی کا جذبہ سارے مفادات سے بالاتر ہونا چاہیے اور قرآن و حدیث سے اسے مبرہن کیا۔ ایک مرتبہ عبداللہ گرلس کالج میں ایک مخلوط ثقافتی پروگرام ہوا۔ دین دار طلبا نے مولانا سے شکایت کی تو مولانا نے جمعہ کے خطبے میں اس پروگرام اور اس کے منتظمین کے خلاف سخت تقریر کی جو اخبارات ورسائل میں بھی چھپی اور شیخ الجامعہ سید حامد سے پارلیمنٹ میں بھی اس حوالے سے سوالات کیے گئے۔ ایک مرتبہ ایک عرب شہزادہ شیخ حامد جامعہ آئے۔ وائس چانسلر صاحب نے جمعہ کی نماز میں قالین بچھانے اور صف اولیٰ میں مہمان کے لیے جگہ رکھنے کے لیے اطلاع بھجوائی۔ مولانا نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ اس جگہ امیر و غریب سب برابر ہیں۔

اس کے باوجود مولانا تنگ نظری کی سختی اور مفاد پرستی دونوں سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کے قائل تھے۔ وہ اگر کہیں اپنے موقف پر اڑے رہتے تو اپنی بات کو واپس لینا بھی جانتے تھے۔ مولانا کی ذات دلگداز بھی تھی اور دلنواز بھی۔ کھلی کتاب کی طرح ہر کسی سے بے لوث طریقے پر ملتے۔ وہ مذہبی شخصیات اور جماعتوں سے الگ تھلگ رہ کر بھی ان سے دلی لگاؤ رکھتے اور ان کے اچھے پہلوؤں اور کارناموں کا ذکر کرتے۔ وہ چند جملے اکثر دہراتے " میاں جیسا آدمی ویسا اس کا مذہب۔ ساری جماعتیں ٹھیک ہیں کسی نے حق پر ہونے کا اللہ سے پٹہ لکھا لیا ہے۔" مولانا مسلک و جماعت کی تمیز و تفریق کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان کا شیوہ اقبال کی زبان میں یہ تھا

تمیز رنگ و بو ما را حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

طبیہ کالج کے پرنسپل صاحب سے ایک مرتبہ کسی ضرورت مند کی ملازمت کی سفارش کی۔ پرنسپل صاحب نے کہا وہ تو بریلوی ہے اور آپ سفارش کر رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا وہ کچھ بھی ہو مسلمان ہے۔ اس کی مدد ہونی چاہیے۔ کوئی عالم خواہ کسی مسلک کا ہو اگر علی گڑھ آتا تو مولانا کی خواہش ہوتی کہ وہ ان کا مہمان ہوتا۔ وہ اگر مولانا سے ملنے آتا تو بہتر ورنہ مولانا ان سے ملنے کا اہتمام کرتے اور ان کی سہولتوں کا خیال رکھتے۔ اپنے ملنے والوں کی خبرگیری بھی

کرتے رہے۔

مولانا کی طبیعت میں نرمی انتہا کی تھی، ظرافت مع ذہانت تھی وہ سنجیدگی کبھی میں بیٹھتے تو بہت کم سوال کرتے اور مجھے بھی ایسے عالموں سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ اسی صلاحیت کے ساتھ میں اسی کو یہ مہلت اور وہ اس جگہ فرق کرتا ہوں۔ یہ تو حالات ہیں جن کے سبب سے بے چارا بے اثر ملے دے رہا ہے۔ مولانا اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کو اکثر چھیڑ کر سوالات کرتے ان کی حوصلہ افزائی کرتے بلکہ ان کا شوخ بناتے اور ان کی شوخی کو پورا کرتے۔ قربانی کا ایک موقع تھا مولانا بھیک والی نئی شیروانی پہنے تشریف لائے۔ محلے کے بچوں نے کہا مولانا شیروانی (علی گڑھ کی یہ روایت بھی Son of Tom کی طرح بڑی محبوب ہے) مولانا بولے۔ ایک شیروانی کے لیے دس دس ہی پیسے لے اور تم لوگ بھی۔ اچھا یہ لو۔' مولانا نے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ بچوں نے فوراً فی صد کا حساب لگایا اور کہا یہ تو کم ہے۔ مولانا نے اسے دوگنا کر دیا۔

مولانا نے جن شاگردوں کو شوخ بنایا ان میں یہ عاجز بھی ہے۔ میں نے اپنی کتاب 'موضوع احادیث کی پہچان' جو اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے مولانا ہی کی تحریک پر اور ان کی ہی نگرانی میں لکھی۔ مولانا اپنے شاگرد کا ہر ممکن پوری امداد ان کی علمی مصروفیات سے باخبر رہتے حوصلہ افزائی کرتے اور مجلسوں میں اس کی وکالت کرتے۔

مولانا نے آخری نکاح ڈاکٹر نبی احمد اور ناہید کا پڑھایا آخری دفعہ سید حامد کو کہا اور آخری خواہش تھی لبنی کی نئی مسجد میں نماز ادا کرنے کی کی اور اچانک وضو کرتے ہوئے نماز وصال میں مصروف ہو گئے۔

مولانا اپنے پیچھے مرحومہ اہلیہ، چار لڑکیاں (صرف ایک شادی شدہ) دو چھوٹے لڑکے اور ایک بڑا علمی ذخیرہ سوگوار چھوڑ گئے۔ مولانا کو ان کی وصیت کے مطابق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں مولانا فضل اللہ جیلانی کی قبر کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

اقبال نے شاید ان ہی جیسے درویشوں کے لیے ہی کہا تھا ؎

چناں خود را نگہداری کہ با ایں بے نیازیہا
شہادت بر وجود خود ز خون دوستاں خواہی

"دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو۔ اس لیے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیے تھا"

[illegible]

کنیڈا کے بارے میں چند دلچسپ اعداد و شمار

محمد زکریا ورک ۞

آپ جانتے ہیں؛

کہ کنیڈا میں ننانوے (۹۹ فی صد) شہریوں کے گھروں میں ٹیلی فون موجود ہیں۔

۲۔ کہ کینڈا کے چھیانوے (۹۶) فی صد شہری گھروں میں رنگین ٹیلی ویژن رکھتے ہیں۔

۳۔ کہ کینڈا کے ۸۰ فی صد شہری کار کے مالک ہیں جب کہ ۶۳ فی صد لوگوں کے گھروں میں مائیکرو ویو اوون (Microwave Oven) اور ۵۹ فی صد کے پاس وی سی آر (V.C.R) موجود ہیں۔

۴۔ کہ کنیڈا کے ۳۳ فی صد شہری جسمانی ورزش کے لیے پیدل چلنا پسند کرتے ہیں۔

۵۔ کہ کنیڈا میں ۱۹۸۹ کے سال میں ۴۱۶۷ افراد ٹریفک کے حادثات میں جاں بحق ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں سب سے زیادہ تعداد صوبہ اونٹاریو میں تھی۔

۶۔ کینڈا کی آبادی تقریباً ۲۶ ملین افراد ہے اور سب سے زیادہ لوگ صوبہ اونٹاریو میں رہتے ہیں جس کی آبادی ۹.۶ ملین ہے۔

۷۔ کہ کنیڈا میں پچھلے سال شہریوں نے ۲۴ بلین (ارب) فون کالز کیں ہر شہری ایک سال میں تقریباً ۱۴۲۳ فون کرتا ہے۔ نیز پچھلے سال کنیڈین لوگوں نے دو ارب لانگ ڈسٹینس (Long Distance) فون کالز کیں۔

۸۔ کنیڈا کی معروف ترین ایرپورٹ ٹورنٹو میں ہے جہاں پچھلے سال ۲۶۸،۵۷۰ جہاز اترے۔

۹۔ کنیڈا میں رجسٹرڈ نرسز کی تعداد ۲۳۱,۹۵۵ ہے۔

۱۰۔ کنیڈا میں ۴۸ فی صد لوگ گھروں میں کتا بطور پالتو جانور کے رکھتے ہیں جب کہ ۲۳.۳ فی صد گھروں میں بلی رکھتے ہیں۔

۱۱۔ پچھلے سال کنیڈا میں ۵۸،۸۱۶ لوگ عارضہ قلب سے فوت ہوئے، جب کہ سرطان سے مرنے والوں کی تعداد ۴۷،۸۰۰ تھی۔ سانس کی تکلیف سے مرنے والوں کی تعداد ۱۴،۹۳۱ تھی۔

۱۲۔ صوبہ اونٹاریو میں ۸۶ فی صد لوگ بیئر (Beer) پینا پسند کرتے ہیں۔

۞ کنگسٹن۔ کینیڈا۔

۱۳- کینیڈا میں لوگ عموماً ۴۰ - ۳۵ گھنٹے فی ہفتہ کام کرتے ہیں۔

۱۴- کینیڈا میں ۸۵ فی صد لوگ کار کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ بس کے ذریعے صرف چار فی صد سفر کرتے ہیں، ریل گاڑی سے دو فی صد اور ہوائی جہاز سے ۹ فی صد سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

۱۵- کینیڈا میں ہونے والی چند ایک معروف ایجادات اور دریافتیں یہ ہیں

نیوز پرنٹ	۱۸۳۸ء
مٹی کا تیل	۱۸۵۳ء
باسکٹ بال	۱۸۹۱ء
انسولین کا ٹیکہ	۱۹۲۲ء
گیس ماسک	۱۹۱۵ء
خلا میں کام کرنے والا بازو Space Arm	۱۹۸۱ء

۱۶- کینیڈا کے سب سے لمبے دریا کا نام میکنزی ([illegible] ۴۲۴۱ کیلومیٹر لمبا ہے۔ سب سے لمبی سڑک کا نام ٹرانس کینیڈا [illegible] ہے جو [illegible] کیلومیٹر لمبی ہے۔ رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ کیوبک ہے۔ سب سے چھوٹا پارک سینٹ لارنس آئی لینڈ جو کنگسٹن کے پاس موجود ہے۔

۱۷- دنیا کا سب سے زیادہ نیوز پرنٹ کینیڈا میں بنایا جاتا ہے کیونکہ نصف سے قریب کینیڈا کی زمین جنگلات سے بھری ہوئی ہے

۱۸- کینیڈا کی سب سے بڑی جھیل لیک سوپیریر (LAKE SUPERIOR) ہے جس کی گہرائی ۴۰۵ میٹر اور کل رقبہ ۸۴،۲۴۳ اسکوائر کیلومیٹر ہے

"بس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو۔ تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔"

سرسیدؒ

پر مصارف کے اعتبار سے ہندوستان کا ۱۱۵ واں نمبر ہے۔ جب وسائل کا یہ عالم ہو تو نئے منصوبوں کا عمل میں آنا معلوم!

۵ نوادوے ودیالیہ کی اسکیم کے تحت ہر ضلع میں ایک مثالی (ماڈل) اسکول بننا تھا جو دیہات اساس ہوتا، اقامتی ہوتا اور ہمارے تعلیمی نشانوں کا عمدہ ترین نمونہ ہوتا۔ ضرورت یہ تھی کہ اس کا عملہ بھی مثالی نمونہ پیش کرے لیکن اس اسکیم سے بھی وہ توقعات پوری نہ ہو سکیں اور رام مورتی کمیٹی کو یہ سفارش کرنے پر مجبور ہونا پڑا کہ اب اس اسکیم کی مزید ہمت افزائی نہ کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس اسکیم پر مزید قومی وسائل ضائع نہ کیے جائیں۔

اب نظام تعلیم میں کوئی بھی تبدیلی اور بہتری پیدا کرنی ہے تو ان موانعات کو پہلے دور کرنا ہوگا۔ متعلقہ افراد کی تربیت اس طرح کرنی ہے کہ وہ مجوزہ تبدیلیوں کی اہمیت کو بھی سمجھ سکیں، ان کو کھلے دل و دماغ سے قبول کر سکیں اور پھر جی جان سے ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کر سکیں۔ یہ کام بھی اساتذہ کا ہے اور یہ بات ذہنی تبدیلی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جب تک انداز فکر نہ بدلے، نیت میں صفائی نہ آئے، مقصد تعلیم کے ساتھ خلوص نہ پیدا ہو اور تعلیمی کام کو قومی امانت کے طور پر اختیار نہ کیا جائے، اس وقت تک حکومت کی ہر تجویز سازی بے کار رہے گی۔ اس لیے تجویز سازی سے زیادہ افراد سازی کی ضرورت ہے کہ افراد کے ذریعہ ہی تجاویز روبہ عمل آئیں گی۔ ورنہ ہر عمدہ سے عمدہ تجویز کو بھی افراد اپنے سانچے میں ڈھالتے رہیں گے اور اس کو ایسے انجام تک پہنچاتے رہیں گے جو کبھی مقصود نہ رہا ہوگا۔

کمیٹی نے جن تجاویز کو شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے ان میں سے زیادہ تر مفید ہیں لیکن ان میں سے بعض غور طلب ہیں۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ ان میں سے بعض تجربے میں آکر ناکام ہو چکے ہیں۔

۱۔ یہ سفارش کی گئی ہے کہ نصابات میں ایسی لچک پیدا کی جائے کہ طالب علم اپنے مزاج اور ضرورتوں کے مطابق مضامین کو جوڑ سکیں۔ اب بھی اس معاملے میں کافی آزادی ہے۔ ابتدائی تعلیم کو چھوڑ کر جو عمومی نوعیت کی ہوتی ہے، ثانوی درجات سے الگ الگ زمرے بن جاتے ہیں، سائنس زراعت کامرس، فنون (آرٹس) وغیرہ۔ لیکن اگر اس تجویز سے مراد یہ ہے کہ ان میں بھی مضامین کے انتخاب کی آزادی ہو (جیسے کہ ایک کامرس کا طالب علم فزکس بھی پڑھنا چاہتا ہے یا سائنس زمرہ کا طالب علم تاریخ بھی پڑھنا چاہتا ہے) تو یہ تجویز محل نظر ہے۔ اس کی نظری افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذاتی شوق سے مطالعے کے نتائج ہمیشہ عمدہ ہوتے ہیں مگر یہاں تو طالب علموں کی بڑی تعداد ذاتی شوق یا افادیت کا اندازہ فوقانی (گریجویٹ) درجات تک بھی نہیں کر پاتی۔ پھر عملی دشواریوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ جتنی زیادہ آزادی دی جائے گی، اتنے ہی وسیع تر انتظام تدریس کی ضرورت ہوگی اور شاید ایک ہی مضمون کو پڑھانے کے لیے دو دو چار طالب علموں کے لیے ایک سے زیادہ جماعتیں بنانی ہوں گی جن کو پڑھانے کے لیے مزید اساتذہ کی ضرورت ہوگی جس کا فی الحال ہمارا بجٹ متحمل نہیں

ہو سکتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ہم اضافی تدریس کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اب یا تو نظریاتی طور پر "ٹھیک" ہونے کے باوجود عملاً صورت حال وہی رہے جو اب ہے، یا طلبا کو مناسب تدریس دی جائے۔ پہلی صورت دوسری سے بہتر ہے کہ اس میں وقت اور صلاحیت کا ضیاع نہ ہوگا۔ تاوقتیکہ ہمارے مالی وسائل اجازت نہ دیں "ٹھیک" کو محدود رکھنا ہی مناسب ہوگا۔

۲۔ ہمارا امتحان کا موجودہ انداز اور نظام کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں رہا۔ اس سے بے اطمینانی کا اظہار برابر کیا جاتا رہا ہے۔ کمیٹی نے ٹھیک کہا ہے کہ ان امتحانات سے طلبا کی ٹھیک جانچ نہیں ہوتی بلکہ ان سے تعلیم کا مقصد ہی مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے "مسلسل داخلی تخمین" کی سفارش کی گئی ہے۔ یعنی جو استاد پڑھاتے ہیں وہ وقتاً فوقتاً آزمائش کرتا رہے اور نمبر یا گریڈ دیتا رہے اور آخر میں ان نمبروں یا گریڈوں کو جوڑ کر مجموعی نتیجہ مرتب کر لیا جائے۔ یہ درست ہے کہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کو استاد سے زیادہ کون جان سکتا ہے اور مسلسل آزمائش (ٹیسٹ) کے ذریعے طالب علم کی صلاحیت اور اس کے علمی اکتساب کی بہترین تخمین ہو سکتی ہے اور کمیوں کو پورا کرنے کا موقع بھی مل سکتا ہے مگر اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ ہمارے ماحول میں نہ طالب علم اپنے اکتساب کی معینہ تخمین پر مطمئن ہوتا ہے، نہ استاد اتنا بے لاگ ہے اتنا دم کر معروضی تخمین کر سکتا ہے۔ بعض یونیورسٹیوں نے داخلی تخمین کو اب سے بیس پچیس سال پہلے شروع کیا تھا۔ ۵۰/۳۰ فی صد داخلی تخمین کے لیے اور ۷۰/۵۰ فی صد خارجی تخمین (موجودہ طریقہ امتحان) کے لیے مختص کیا گیا۔ داخلی تخمین میں افراط زر کی طرح نمبروں کی فراوانی شروع ہو گئی۔ طالب علموں نے دوستی یا دباؤ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی کوشش کی اور استادوں نے زیادہ نمبر دینے کو بیچ جانے کے تبادلے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس اجمال کی تفصیل بہت ہے۔ بالآخر مجبور ہو کر بعض یونیورسٹیوں نے اس نظام کو یکسر منسوخ کر دیا۔ بعض نے داخلی تخمین کے تناسب کو گھٹا کر ۲۵/۲۰ فی صد کر دیا۔ اگر یونیورسٹی سطح پر جہاں ذہنیتوں میں زیادہ پختگی آ جاتی ہے، یہ ہو سکتا ہے تو اسکول کی سطح پر کیا کچھ نہیں ہوگا۔

۳۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ استاد نہ صرف تخمین کا کام کرے بلکہ کیا پڑھایا جائے اس کا تعین بھی وہی کرے۔ اس میں بھی بڑے خطرات مضمر ہیں۔ کیفیتی اور کمیتی دونوں اعتبار سے نصاب بُری طرح متاثر ہو سکتا ہے۔ بعض ملکوں میں جب یہ تجربہ کیا گیا تو ہر استاد نے ہر نصاب میں اپنی پسند و ناپسند کو ٹھونسنا شروع کر دیا۔ غیر معیاری چیزوں کو شامل نصاب کر دیا گیا! سہل پسندی کے باعث نصاب سے اتنی کتر بیونت کی گئی کہ وہ محض ڈھانچہ ہو کر رہ گیا۔ افراط و تفریط کا یہ عالم ہوا کہ [illegible] ہو کر رہ گئی۔ سلیبس نہ صرف مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں مختلف ہو گیا بلکہ ایک ہی یونیورسٹی کے ایک مضمون کے مختلف

پرچوں میں بھی توازن نہ برقرار رہ سکا۔

یہ دو امور نہایت اہم ہیں۔ اصولی طور پر استاد کو داخلی تخمین اور نصاب کی تعین کی آزادی ہونی چاہیے۔ لیکن معاشرہ میں جس طرح کے حالات کارفرما ہیں ان کے پیش نظر ان کی عمل آوری میں سخت خطرات ہیں۔ ان حالات میں اس نظام عمل کو نافذ کرنا گویا تعلیم کی رہی سہی حالت کو مزید ابتر بنانا ہوگا۔ جب تک استاد اور شاگرد دونوں ہی کے ذہن تعلیم کے حقیقی مقصد کو دیانت داری کے ساتھ قبول نہ کریں اس وقت تک اس نظام کی برکات حاصل ہونے کے بجائے اس سے خرابیاں ہی پیدا ہوں گی اگرچہ یہ امر بجائے خود توجہ طلب ہے کہ کیا معاشرے کی خرابی کے باعث مفید باتوں کو شروع نہ کیا جائے۔ اس طرح تو کبھی کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے جہاں ایک طرف تعلیم کے حقیقی مقاصد کو ذہن نشین کرایا جائے اور تعلیمی شعور کو بالیدہ کیا جائے، وہیں منتخب جگہوں پر اس نظام کو شروع کیا جائے۔ ساتھ ہی اس نظام کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے اس وقت تک کڑی نگرانی رکھی جائے جب تک یہ ہمارے مزاج کا حصہ نہ بن جائے۔ کسی بھی مرحلے پر ذرا سی لیت و لعل ہوئی تو خرابیاں پیدا ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

۴۔ سیمسٹر نظام کی بھی سفارش کی گئی ہے جس میں یہ آزادی ہو کہ طالب علم ایک سیمسٹر کے کریڈٹ جمع کر کے چاہیں تو تعلیم چھوڑ دیں اور پھر جب موقع ہو تعلیم شروع کر کے مزید کریڈٹ جمع کریں اور اس طرح کسی کورس کے کریڈٹ پورے کریں۔ وقت کی پابندی اور تعلیم و نظم میں تیز رفتاری اس نظام کے دو بنیادی عنصر ہیں اور بدقسمتی سے ہم دونوں ہی سے محروم ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شاید ملک کی یونیورسٹیوں میں اس نظام کو شروع کرنے والی سب سے پہلی یونیورسٹی تھی۔ اس میں داخلی تخمین اور استاد کو نصاب کے تعین کا اختیار بھی حاصل تھا۔ دس سال یہ نظام چلا اور وہ افراتفری پیدا ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ سیمسٹر کے آغاز و انجام ہی کی کچھ خبر نہ رہی۔ داخلہ اور امتحان کی مدت کم ہوتے ہوتے محبوب کی کمر کے مماثل ہو گئی۔ اور پھر بوجوہ اس نظام کو خیرباد کہہ دیا گیا اور ایک عظیم سوالیہ نشان باقی رہ گیا: کیا ہندوستانی حالات میں سیمسٹر نظام کامیابی سے چل سکتا ہے اس سوال کا مثبت جواب دینے سے پہلے کافی غور و خوض کی ضرورت ہوگی۔

۵۔ جمہوریت کا تقاضا ہے کہ انتظامیہ کے تمام کاموں میں عوام کی شرکت ہو۔ اسی کے پیش نظر اسکول انتظام کی لامرکزیت پر زور دیا گیا ہے اور سفارش کی گئی ہے کہ اسکولوں (ابتدائی، ثانوی اور فوقانی) کا انتظام پنچایتی راج کے اداروں میں بلدیاتی اداروں میں عوامی نمائندوں کو سونپ دیا جائے۔ ہر بستی کے اسکولوں کی ذمہ داری انھیں اداروں کی ہو۔ تعلیمی معاملات میں علاقے کی یونیورسٹی رہنمائی کرے اور جملہ تعلیمی معاملات (جیسے نصاب، امتحان، اساتذہ کی تربیت وغیرہ) خود اساتذہ کے ہاتھ میں رہیں۔

اب بھی منظور شدہ غیر سرکاری اداروں (پرائیویٹ) انتظامیہ

کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ انتظامیہ پاس رجسٹرڈ شدہ ہوتی ہیں اور بچوں کے لیے منتخب نمائندوں پر مشتمل۔ کچھ اسکول مرکزی بنیادی تعلیم کے تحت کئے گئے ہیں اور کچھ بلدیاتی بورڈوں کے تحت ہیں۔ بلدیاتی بورڈ بھی عوام کے منتخب نمائندوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے لیکن ان اسکولوں کا کیا حال ہے؟ اساتذہ کے تقرر کے وقت موٹی موٹی رقمیں اینٹھنا، کم تنخواہ دے کر زیادہ پر دستخط کرانا، اداروں کو ملنے والی سرکاری امداد کو خرد برد کرنا، اداروں کی جائیدادوں سے ناجائز نفع حاصل کرنا، اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو جانبداری کے افراد کا تقرر کرنا، ملازمین ادارہ سے طرح طرح کی خدمات لینا ایسے معاملات ہیں جو حکومت سے لے کر عوام تک سب کو معلوم ہیں اور ان کا کوئی مداوا نہیں کیا جاسکا ہے۔ پھر انتظامیہ کے عہدہ داران، پرنسپل اور عملہ کے درمیان کتنے مناقشات ہیں اور ان سے متعلق کتنے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں، اس کا بھی سب کو اندازہ ہے۔ یہ ادارے مقامی تنازعات اور سیاست کا بھی برابر شکار رہتے ہیں۔ سرکاری اسکولوں کی حالت ان معاملات میں قدرے بہتر ہے۔ مرکزی انتظام کے تحت اسکول ان سب میں بہتر ہیں۔ سب اسکولوں کو پنچایت راج کے ساتھ جوڑ کر ہم ان کی تباہی کی رفتار میں اضافہ تو نہیں کریں گے؟ اس پر بھی زیادہ رائے زنی کرنے کی ضرورت نہیں کہ پنچایت راج کے تحت جو نمائندے چنے جائیں گے، وہ کس حیثیت کے ہوں گے اور تعلیمی اداروں کی ان سے وابستگی کیا گل کھلائے گی۔ کسی نئے اقدام کے وقت ماضی اور حال کے تجربوں کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

یہ سطور لکھتے وقت کانپور کی ایک خبر نظر سے گزری:

"مانٹیسری بیک اسکول کرمچاری سنگھ کے صدر مسٹر ظم گوپال جوشی نے الزام لگایا ہے کہ بیک اسکولوں کی انتظامی کمیٹیاں ہر سال گرانٹ میں ملنے والی رقم خرد برد کر رہی ہیں۔۔۔ مسٹر جوشی نے الزام لگایا کہ ایک کروڑ سے زیادہ کی گرانٹ کو ان اسکولوں کی انتظامیہ خرد برد کر دیتی ہے۔ انھوں نے جوکو جیک شکشا امیکار سے ملاقات کی اور ان کو بتایا کہ کس طرح گرانٹ کی رقم خرد برد کی جاتی ہے۔ انھوں نے اس رقم کے بے جا استعمال کو روکنے کا مطالبہ کیا۔"

(قومی آواز یکم نومبر ۱۹۹۰ء)

اس خبر پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے اور یہ خبر کوئی منفرد بھی نہیں۔ اخبار کے اوراق اور مقدموں کی فائلیں الٹیے تو ایسے بہت سے معاملات آپ کو نظر آئیں گے۔ ان کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہی کسی لامرکزی نظام کو وجود میں لایا جائے تو بہتر ہوگا۔ صرف عوامی شرکت کے خوش نما تصور کے تحت نظام تعلیم کو اس کے حوالے کر دینا مناسب نہ ہوگا۔

مجوزہ اقدام اور ایسے ہی بعض دوسرے اقدام بڑے انقلابی ہیں۔ ان سے نظام تعلیم میں بنیادی اور دور رس نتائج کی حامل تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن شاید ابھی تک ان کو قبول کرنے کے لیے ہم ذہنی طور پر تیار نہیں ہیں۔ ان سے مفید نتائج حاصل کرنے کے لیے پہلے سازگار ماحول بنانا ہوگا تاکہ نظام تعلیم افراتفری اور مزید ابتری کا شکار نہ ہو۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۰، ش ۱-۲، (جنوری فروری ۱۹۹۱)

پروفیسر رشید احمد صدیقی ـ کچھ یادیں، کچھ تاثرات

رشید صاحب کی چودھویں برسی پر

محمد یٰسین ○

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

یادش بخیر، رشید صاحب کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً تیرہ سال ہو گئے، اس دوران میں مسلم یونیورسٹی ترقی کی کئی منزلیں طے کر کے اکیسویں صدی کی طرف گامزن ہے لیکن کچھ اقدار و روایات جو ہمیں عزیز رہی ہیں ان کی پامالی بھی ہمارے مدنظر ہے۔ ہماری یونیورسٹی کی سب سے نمایاں خصوصیت اساتذہ اور طلباء کے درمیان وہ قابلِ رشک رابطہ رہا ہے جس پر ہمیں بجا طور پر ناز ہونا چاہیے لیکن بدقسمتی سے ادھر ہم اساتذہ، طلبا اور حکام کے خانوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال اب سے چند سال پہلے نہیں تھی جب اساتذہ انتظامیہ میں شامل رہ کر بھی اپنے خاص منصب پر فخر کرتے تھے۔ رشید صاحب کا تعلق یونیورسٹی کے ان مایۂ ناز اساتذہ کے گروہ سے تھا جنہیں علمی و ادبی حلقوں میں آج بھی محبت اور عقیدت سے یاد کیا جاتا ہے۔ پروفیسر بابر مرزا، پروفیسر حبیب، پروفیسر ہادی حسن اور پروفیسر یوس کی خدمات اور ان کے کردار آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں کیونکہ بقول شاعر،

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

رشید صاحب ان بزرگ استادوں میں تھے جو نہ صرف اپنے طالب علموں کو بے حد عزیز رکھتے تھے بلکہ خاص "شریفانہ طریقہ" سے ان کی ہر ممکن مدد بھی کرتے رہتے تھے "عزیزانِ گرامی" کے نام ان کے خطوط اور مضامین جس دلسوزی، ہمدردی اور قومی و ملی جذبہ کے تحت لکھے گئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل سے ان کی کیا کیا تمنائیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں۔

راقم الحروف کو رشید صاحب سے سنٹ اینڈریوز کالج گورکھپور میں طالب علمی کے زمانے میں ہی استادِ محترم مجنوں گورکھپوری کی بدولت غائبانہ تعارف ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ موصوف کے انشائیوں اور ان کی لازوال تصنیف "طنزیات و مضحکات اردو" کے مطالعے کے بعد عقیدت بھی ہو گئی۔ ۱۹۵۵ء میں ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا تو سرسید کورٹ کے شرقی بلاک سے گزرتے ہوئے اکثر "دیدار" ہو جاتا تھا۔ پہلی بار ان کے حلیہ سے کچھ مایوسی ہوئی۔ اپنے خیالوں کے "مجسمۂ ظرافت" کی بجائے سنجیدہ شخصیت دیکھ کر کچھ سپنے ٹوٹتے نظر آئے لیکن یہ محض

○ پروفیسر، شعبہ انگریزی، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ۔

وابستہ تھا۔ آخری ملاقاتوں اور ان کی تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ رشید صاحب کی شخصیت اور علمیت کا اندازہ سطحی طور پر نہیں کیا جاسکتا۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں شعبۂ انگریزی میں عارضی ملازمت مل جانے پر یکسوئی سے اردو میں کچھ لکھنے پڑھنے کا موقع ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" (زیر ادارت پروفیسر آل احمد سرور) میں "شعور شاعری، مغربی تنقید کے آئینہ میں" (سلسلۂ مضامین افلاطون سے ایلیٹ تک) کی اشاعت کے دوران مجھے ڈاکٹر یوسف حسین خاں پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور رشید صاحب سے قرب کی سعادت نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف مشہور ماہر تعلیم اور سابق صدر جمہوریہ ہند کے برادر خورد ہی نہیں تھے بلکہ علی گڑھ میں ان کی علمی و ادبی روایات کے امین بھی تھے۔ بحیثیت ایک اعلیٰ درجہ مورخ، ادیب اور دانشور انھوں نے حیدرآباد اور علی گڑھ میں جو امتیازات حاصل کیے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ راقم کو انھوں نے وکٹوریہ گیٹ کے اوپر اپنے دفتر میں اکثر شرف ملاقات بخشی اور بڑی شفقت سے اردو میں لکھنے کے لیے ہمت افزائی کرتے رہے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب "فکر ونظر" کے چیف ایڈیٹر اور رشید صاحب نگراں تھے۔ ان بزرگوں کی فرمائش پر میں نے یونیورسٹی مجلہ کے لیے اپنا پہلا باقاعدہ مضمون "نفسیاتی افسانہ" لکھنے کی جسارت کی۔ مسودہ دیکھنے کے بعد رشید صاحب نے اصرار کیا کہ اردو نفسیاتی افسانہ نگاروں کے بغیر مضمون تشنہ رہ جائے گا۔ شعبۂ انگریزی میں منصبی فرائض اور دیگر مصروفیات کے باعث فرمائش بروقت پوری نہ ہوسکی۔ اسی سلسلے میں رشید صاحب نے مجھے چند رقعے لکھے جن کی نوعیت کم و بیش وہی ہے جس کی طرف کبیر احمد جائسی صاحب نے مرحوم کے تبرکات پر مبنی اپنے

مضمون مطبوعہ "تہذیب الاخلاق" (جنوری ۱۹۹۰ء) میں اشارہ کیا تھا:

> "ان خطوط میں رشید صاحب ایک رہبر ادب، ناقد، مفکر اور اچھی باتیں کرنے والے کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک دوست، ایک شفیق ہمدرد اور اپنے تجربات زندگی کو عام کرنے والے شخص کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔"

آج ان خطوط کو جنھیں میں نے تقریباً تیس سال تک بطور تبرک محفوظ رکھا، قارئین کے سامنے پیش کرکے علی گڑھ کے بزرگ استادوں کی عالی ظرفی، شفقت اور خورد نوازی کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہوں:

پہلا خط

8-6-961

حسین صاحب مکرم۔ آداب، آپ کا مضمون نفسیاتی ناول نظر سے گزرا۔ میں نے اس لیے اور زیادہ شوق سے پڑھا کہ ایک دن آپ سے تحریک بھی کی تھی کہ فکر و نظر کے لیے کچھ لکھیے۔ بجائے خود مضمون کے پرمغز ہونے میں سنجیدہ نہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ جو آپ ہی کی طرح اس نوعیت کے مضامین پر گہری نظر رکھتے ہوں، مجھ سے بھی زیادہ اس کے معترف ہوں۔ البتہ ایک بات محسوس کرتا ہوں جس کا تذکرہ غالباً خود آپ سے اس وقت کی ملاقات میں بھی کردیا تھا وہ یہ کہ انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں کے ناولوں کے اسرار و معارف کو اردو میں بیان کردینا کافی نہیں ہے۔ یہ تو اردو میں مدتوں سے ہوتا آرہا ہے۔ شاید اس لیے

کہ ایسا کر دینا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ میری
آرزو یہ تھی کہ آپ جیسے نوجوان لکھنے والے
جو انگریزی اور اردو دونوں ادبیات کے
رمز آشنا ہیں اس بات کا اہتمام کریں کہ
جو بات کہی جائے وہ اتنی تجریدات میں نہ ہو
جتنی معروضی انداز میں۔ یعنی آپ ان مغربی ناولوں
کے آغاز، ارتقا، موجودہ صورت حال سے
بھی اردو والوں کو آشنا نہ کرائیں بلکہ ان
میں لائے ہوئے افراد کے فکر و عمل کا
جائزہ لیں۔ بالفاظ دیگر مغربی مصنف کی نفسیاتی
رہ نوردی کا ایک معروضی سفر نامہ پیش کریں
اور یہ واضح کریں کہ واقعات کیوں اور کس
طرح وقوع میں آئے اور ان سے فن،
فنکار یا واردات کے کون سے پہلو کس طرح
سامنے آئے۔ عالم، عامی کے لیے اسی وقت
مفید ہو سکتا ہے جب وہ اپنی بات آسان
الفاظ، دلنشیں انداز میں مثالیں دے کر
سمجھائے۔ اس کے بعد اس مطالعہ کی روشنی
میں اردو کے مماثل ناول نگاری کے ذہنی
اور نفسیاتی عمل در عمل کی توضیح کی جائے
اس طرح کا جائزہ اردو ناول نگاروں کے
لیے فکر انگیز اور قابل عمل ہوگا اور آپ کی
کوشش بار آور ہوگی۔ تجریدی تصورات
کا کچھ حاصل نہیں۔ جب تک اس تصورات
کو معروضی انداز میں نہ پیش کیا جائے۔ تقابلی
مطالعہ معروضی انداز میں کیے بغیر آپ اردو
ناول یا افسانہ نگاروں کو ان کے مغربی رفقا
اور ان کے فنی کارناموں سے بطریق احسن آشنا
نہیں کرا سکتے۔

مختصر یہ کہ اس مضمون میں اس کا بھی
اظہار کر دیتے تو اچھا ہوتا کہ نفسیاتی ناول
لکھنے میں اردو کے کون کون سے ناول
نگار کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اور
اردو میں اس نوعیت کے ناولوں کا
کیا مستقبل ہے۔ پھر آپ کا یہ مضمون
نہایت درجہ جاندار ہو جائے گا لیکن
یہ باتیں اس لیے نہیں کہی گئیں کہ آپ ایسا
نہ کریں گے تو مضمون شائع نہ کیا جائے گا
مضمون ضرور شائع ہوگا لیکن اگر
آپ تھوڑی سی وہ رعایت بھی کر دیتے
جس کی طرف توجہ دلائی ہے تو ہم سب
آپ کے شکر گزار ہوتے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

دوسرا خط

22.5.1961

عزیز گرامی، تسلیم

آپ کا مضمون بھیجتا ہوں، اس امید
پر کہ اس کا . . . کرنے میں آپ میری
مدد کریں گے تو مضمون اور فکر و نظر دونوں
کے حق میں بہتر ہوگا۔ میں کروں گا تو نہ
کہیں اصلاح کر سکوں گا نہ اضافہ۔ آپ
کرتے تو شاید یہ دونوں باتیں انجام پا جاتیں
اور ظاہر ہے مجھے اس کی کتنی خوشی ہوگی۔
لیکن پرسوں رات کی گفتگو سے مجھے
اس کا بھی احساس ہے کہ آپ اپنے
THESIS کی تکمیل میں کتنے منہمک ہیں

اور کچھ تعجب نہیں نفس کے مطالبات بھی اسی طرح سے ادا ذکر پاتے چہ جائیکہ دوسرے مطالبات بقول شاعر ؎

کہاں کی رباعی کہاں کی غزل!

مخلص

رشید احمد صدیقی

تیسرا خط

14-6-1961

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۷ جون ۱۹۶۱ء

یٰسین صاحب مکرم، تسلیم

کتنے دنوں بعد کس مشکل سے آپ کے گھر کا پتہ دستیاب ہوا تو خط لکھنے کی نوبت آئی۔ آپ کے اس مضمون کا کیا ہوا؟ کافی دنوں انتظار کرنے کے بعد فکر و نظر کی دوسری سہ ماہی کے مضامین پریس کو دے دیے آپ مضمون بھیج دیں تو ابھی سے تیسری سہ ماہی کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔ آپ نے رقعے کا کوئی جواب نہیں دیا تو اندیشہ ہوا کہ مضمون کی سرا پھیری سے کہیں آپ آزردہ تو نہیں ہو گئے لیکن یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ میرے برابر کے یا مجھ سے بڑے مجھ سے ناراض ہو جائیں تو نہ مجھے تعجب ہوتا ہے نہ اپنے پر لعنت کرتا ہوں لیکن خدانخواستہ میرے خورد مجھ سے بدگمان ہو جائیں تو میں اپنے پر لعنت کروں گا اور سب کو سمجھاؤں گا کہ مجھ سے ناراض ہونے میں خود آپ کی توہین ہے اس لیے کہ میں اپنے خوردوں کو اپنے بہت سے بزرگوں سے زیادہ عزیز و گرامی رکھتا ہوں... میں چاہتا ہوں کہ آپ میری طرف سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں آپ کو عزیز و گرامی رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ سے فکر و نظر کو اور فکر و نظر سے آپ کو فائدہ پہنچے اور دونوں سے علی گڑھ کا نام اونچا ہو۔ مضمون کو اگر نصف کر دیا جائے تو بہت مختصر ہو جاتا ہے۔ جی یہ چاہتا ہے کہ اس کی موجودہ ضخامت باقی رہے لیکن اس کا دوسرا حصہ جو اردو سے متعلق ہے اس پر آپ نظر ثانی کر لیں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر مکمل کا مکمل ایک ہی نمبر میں شائع ہو جاتا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

مضمون بالآخر "فکر و نظر" شمارہ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) میں شائع ہوا۔ بعد ازاں رشید صاحب مہینہ دو مہینے کے وقفے سے یاد کر لیتے تو اُن کی کوٹھی پر حاضری ہوتی۔ ان ملاقاتوں میں وہ اکثر مسلم یونیورسٹی، مسلم کلچر اور اردو زبان و ادب پر گفتگو کرتے۔ انھیں مسلمانوں کے تشخص، مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار اور اردو کی بقا اور مستقبل کی بڑی فکر رہتی۔ اس زمانے میں انھوں نے "فکر و نظر" میں جو مضامین لکھے ان سے ان کی قومی معاملات میں دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

رشید صاحب اصناف شاعری کے مماثل انگریزی اصناف پر گفتگو میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا شعری مذاق خالص مشرقی تھا لیکن وہ غزل اور سانیٹ، مثنوی اور انگریزی بیانیہ شاعری، ہجو اور

[illegible] کے علاوہ کلیم الدین احمد صاحب کے عرب معاملی شاعروں کی مقبولیت کے اسباب پر مجھ سے اکثر بات چیت کرتے۔ ایک دن عوامی گیتوں (Folk Songs) اور عوامی ناٹک (Folk Drama) کی بات چلی تو انھوں نے برج بھاشا، اودھی اور بھوجپوری لوک ناٹک سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا اور "قلم سنگھ" اور "بدلیا" کا پلاٹ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ ضمناً یہ عرض کر دوں کہ بہار کے بھکاری ٹھاکر کا ڈراما "بدلیا" صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں اس قدر مقبول ہوا کہ سیکولر شادی بیاہ کے موقع پر پیشہ ور فنکار بار انھیں کی تفریح طبع کے لیے اس کا سوانگ ضرور پیش کرتے تھے۔ "فکر و نظر" میں "بدلیا" پر مضمون میں نے رشید صاحب کے اصرار پر ہی لکھنے کی جرأت کی۔

رشید صاحب شعبۂ اردو میں طویل ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی تصنیف و تالیف میں منہمک رہے مگر اپریل ۱۹۷۵ء کے افسوس ناک سانحہ نے انھیں بالکل توڑ کر رکھ دیا۔ "عزیزان گرامی" کو وہ جس تعمیری منصوبے کی تکمیل کی دعوت دے رہے تھے وہ وائس چانسلر پر حملے کے بعد ناکام ہوتا نظر آنے لگا۔ اس ادارہ کی خوش قسمتی تھی کہ تمام ہنگامہ آرائیوں اور اشتعال انگیزیوں کے باوجود عالی ظرف وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ نے یونیورسٹی کی آن پر حرف نہیں آنے دیا۔ تقریباً پندرہ سال بعد کیمپس پر چند گمراہ طالب علموں اور سیاست زدہ اساتذہ کی بدولت پھر سے دوبارہ فساد برپا ہوا جس کو فرو کرنے کے لیے عفو و درگزر اور عالی ظرفی کے بجائے انتقامی کارروائیاں کی گئیں اور نوجوان نسل کے حوصلے پست کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے اختیار کیے گئے۔ رشید صاحب شاید اس کی تاب نہ لا سکتے مگر ان کے لیے ۱۹۷۵ء کا واقعہ ہی کافی تھا۔ یہاں تک کہ وہ بجھ کر [illegible] ہو گئے۔ پھر ان سے ملاقاتیں بھی وہ ایک بار تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ آخری ملاقات میں "نیم کے پھول" پر تبصرہ لکھنے کے لیے مشہور ادیبوں کے نقطۂ نظر کا خاکہ طلب کیا مگر میں ان کے حضور میں سرخرو نہ ہو سکا۔ صاحب تصنیف کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ مل گیا اور ظاہر ہے اس میں رشید صاحب کی سفارش بھی ہو گی مگر میرا ضمیر اپنے مشفق بزرگ کی آخری فرمائش پوری نہ کرنے پر برابر مجھے ملامت کرتا رہا۔

علی گڑھ نے اپنے بیشتر محسنوں کے ساتھ بے اعتنائی ہی نہیں بے رخی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ یہاں تک کہ سرسید، مولانا حالی اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی مستثنیٰ نہیں رہے۔ رشید صاحب کا انتظامیہ سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ وہ ساری زندگی علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ آخری زمانے میں وہ فرانسیسی قاموسیں ([illegible]) سے بہت متاثر تھے اور فرنچ اکاڈمی کے نہج پر ایک مرکزی اردو اکاڈمی کے قیام کے آرزومند تھے۔ رشید صاحب اپنے دور کے مشہور ترین اردو اساتذہ میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ برصغیر ہند و پاکستان میں ان کے سیکڑوں شاگرد نہ صرف اعلیٰ سرکاری منصبوں پر فائز رہے بلکہ شعر و ادب اور سیاست کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں مگر حیف صد حیف کہ ان کے انتقال کے بعد نہ تو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے لیے کوئی سیمینار منعقد ہوا اور نہ کوئی یادگار مجلہ ہی شائع ہو سکا۔ البتہ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر اصغر عباس نے ۱۹۸۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کے معروف ادیبوں اور ناقدوں کے مضامین ان کی شخصیت اور فکر و فن پر مضامین کا گلدستہ "رشید احمد صدیقی: آثار و اقدار" پیش کر کے ہم سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرنے کی کوشش کی۔

۵ ۲ ۲ ہے باز خواں این قصہ پارینہ را

تہذیب الاخلاق اختلافات علمی

احمد فرید

مئی ۱۹۹۰ء کے "تہذیب الاخلاق" میں مدیر محترم (پروفیسر اسرار احمد صاحب) نے علمی رویہ ۔ Scientific Temperament پر بڑا فکر انگیز اداریہ لکھا تھا لیکن چند ایک الفاظ کے غیر مانوس استعمال کی وجہ سے یہ بڑا جذباتی موضوع بحث بن گیا ہے۔ اس اداریہ میں ایسی کوئی بات نہ تھی کہ اسے موضوع نزاع بنایا جاتا لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک بات کبھی تو نیک نیتی سے کہی جاتی ہے لیکن اس کا پیرایۂ بیان غیر محتاط ہوتا ہے۔ اس کی خیال پروفیسر اسرار احمد کے اداریہ میں سے ان کا یہ فرمانا اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ:

> جہاں یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان کو دین کی بنیادی باتوں کا علم ہو وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ علوم دینیہ کے ماہرین کو عصری علوم کی مبادیات سے واقفیت ہو۔

موصوف کی یہ رائے نہ صرف یہ کہ صائب ہے بلکہ نیک نیتی پر محمول ہے۔ اس سے ان کے جذبۂ اخلاص کا بعینہٖ اظہار ہوتا ہے۔ البتہ جب جذبات کی بے پایانی نوک قلم سے اظہار کی طلب گار ہوتی ہے تو اکثر جذبات کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ پروفیسر اسرار احمد کے اداریہ میں ایسا طوفان تو نہیں آیا ہے لیکن ایک دو مرتبہ ضرور ابھر آیا ہے۔ تبلیغی جماعت

صوم و صلوٰۃ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے مولانا مودودیؒ پر خصوصی توجہ دی ہے۔ مولانا سے اختلاف کرنا اور ان کے تسامح کی نشان دہی کرنا جرم نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے امام جعفرؒ سے، امام یوسفؒ اور امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے اختلافات کیے ہیں لیکن ان اختلافات کی وجہ سے نہ کسی کی عظمت میں کمی ہوئی ہے اور نہ کسی نے کسی کی عظمت کم کی ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ پر مولانا محمود شیرانی مرحوم نے اور مولانا ابوالکلام آزاد پر مولانا ماہر القادری نے بڑے باوزن اعتراضات کیے ہیں لیکن علامہ شبلیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی و دینی مرتبوں پر قطعاً کوئی حرف نہیں آیا ہے۔

مولانا مودودیؒ عالم دین ہیں، نبی نہیں! ان کے یہاں خامیاں ہو سکتی ہیں جنہیں ہمیں ماننا ہی ہوگا اور مستقبل کے اہل علم کو ان کی اصلاح کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ لیکن غلطیوں، خامیوں اور تسامح کی نشاندہی کا انداز علمی ہونا چاہیے جذباتی نہیں۔ اسی طرح ان اصحاب کا انداز بھی بردبارانہ اور علمی ہونا چاہیے جو مولانا کی مدافعت کرنا چاہتے ہیں۔ کسی بھی طرف سے اگر جذباتیت، نا شائستگی اور طنز کا انداز اختیار کیا جائے گا تو دوسری طرف سے بھی ویسا ہی طرز اختیار ہوگا۔ اس کے بعد تحسین کا

○ بیت الصالحہ، زینہ فاتح خان، رام پور ۔ ۲۴۴۹۰۱

پڑھنا بدیہی بات ہے۔

پروفیسر اسرار احمد صاحب کا اداریہ (مئی ۱۹۹۰ء) جب میں نے پڑھا تو اس کے بالکل آخری پیراگراف نے کچھ خلش سی پیدا کی۔ کیا مندرجہ ذیل جملوں سے Academic snubbing کا اشارہ نہیں ملتا؟

اپنی علمی تاریخ اور علوم عقلیہ سے عدم توجہی...

(عدم توجہی؟)

کہا جاتا ہے کہ انھیں عصری علوم پر بھی دسترس حاصل تھی۔

(کہا جاتا ہے؟)

وہ "جدید ذہن" کے بھی مالک تھے۔

(واوین؟)

ان جملوں نے مداحین کو بے آرام کر دیا۔ چنانچہ مولانا محمد مسعود عالم قاسمی (تہذیب الاخلاق، جون ۱۹۹۰ء) اور ابوسفیان اصلاحی صاحب (حیات نو، جون ۱۹۹۰ء) وغیرہ نے بہت ہی زیادہ تیز جملے استعمال کیے۔ ان جملوں کو یہاں نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کا اصل بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ پروفیسر اسرار احمد کی ذات اور شخصیت پر حملہ ضرور ہیں۔ کسی بھی اختلافی مسئلہ پر اگر ایسی زبان استعمال کی جائے تو یہ باور کر لینا چاہیے کہ صاحب قلم کے پاس علمی تحمل نہیں ہے۔

جولائی ۱۹۹۰ء کے تہذیب الاخلاق کے شمارے میں "چائے کی پیالی میں طوفان" پر بند باندھنے کے لیے پروفیسر اسرار احمد کو پورے نو صفحات کا مضمون لکھنا پڑا۔ اس مضمون میں انھوں نے "علمی عدم توجہی" کی وضاحت کی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس رویے کو ثابت کرنے کے لیے ہی انھوں نے یہ مقالہ قلم بند کیا ہے۔ ایک نوعیت سے یہ مضمون کچھ مدافعتی Deference سا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس سے بحث کے بعض نئے موضوع کھل گئے ہیں۔

پروفیسر اسرار احمد سے میں احتراماً عرض کرنا چاہوں گا کہ آپ نے انگریزی کی جس اصطلاح کے لیے "عدم توجہی" بطور ترجمہ استعمال کیا ہے، اس کا مفہوم اس لفظ مرکب سے ادا نہیں ہوتا، اسی وجہ سے غلط بحث ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہیں سے بات بگڑ بھی گئی ہے۔

مولانا مودودیؒ نے جب علم فلکیات کے بارے میں لکھا تھا تو اس زمانے میں عصری علوم کے ماہرین نے قطب نما کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا اور ان سے تعیین اوقات کے بارے میں انھوں نے بڑے دلچسپ اشارے کیے تھے، لیکن جلد ہی یہ معلوم ہوا کہ یہ سب Romanticism وغیرہ قسم کے رسائل کی جو الجھنیں تھیں تو انھوں نے عالمی پیمانے پر بلاواسطہ اور بالواسطہ اہل علم کو متوجہ کیا اور مختلف کمیٹیوں نے اوقات صوم و صلوٰۃ کا تعین کیا۔ مولانا مودودیؒ ان سب کمیٹیوں میں عملاً شریک نہ تھے لیکن فکراً شریک ضرور تھے۔ ان میں چند کمیٹیوں کا حوالہ پروفیسر اسرار احمد نے خود دے دیا ہے (ملاحظہ ہو تہذیب الاخلاق، جولائی ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۱) یہ کمیٹیاں بالخصوص وہ ہیں جنھوں نے مولانا مودودیؒ کے افکار و نظریات سے انحراف نہیں کیا ہے۔

جہاں تک آلات سمت و ساعات کا تعلق ہے ان کا استعمال اور سمت قبلہ و اوقات صوم و صلوٰۃ کے سلسلے میں جتنا علماے دین نے کیا ہے وہ لائق صد ستائش ہے۔ اس وقت ہندستان کا کوئی شہر و قصبہ ایسا نہیں ہے جس کی دائمی تقویم موجود نہ ہو اور جس کا سمت قبلہ متعین نہ ہو چکا ہو۔ یہی حال دنیا کے ان تمام ممالک کا ہے جہاں مسلمان موجود ہیں۔ اب جہاں وہ پہنچ رہے ہیں وہاں کے جغرافیائی و ماحولی حالات کے تحت وہ مقامی نقشہ جات و تقویمات تیار کرتے جا رہے ہیں، ان کے لیے رہنما اصول وہی ہے جو مولانا مودودیؒ نے پیش کیا ہے:

"اس مذہب نے نماز کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے نہیں مقرر کیے کہ گھڑی ہر مسلمان کے لیے اس کے دین کا جزو بن جائے بلکہ اس نے سورج کے طلوع و غروب اور زوال جیسے عالمگیر مظاہر کو

اوقات نماز کی علامت قرار دیا جسے ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے:

اس کی وضاحت صراحت پروفیسر اسرار احمد نے مئی ۱۹۹۰ء کے اداریے میں بہت علمی انداز میں کی ہے۔

• انسان کے وقت کے ادراک کی تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہر وہ نظام یا شئے جس سے کسی بھی دو واقعات کے درمیان کا وقفہ معلوم کیا جا سکے ایک گھڑی ہے۔ زمین کی محوری گردش جس کی وجہ سے سورج اور دیگر ستاروں کی گردش اور ان کے طلوع و غروب کے مناظر نظر آتے ہیں، بھی ایک گھڑی کا کام کرتی ہے:

پروفیسر اسرار احمد کی اس تصریح سے واضح ہوتا ہے کہ آلات سمت و ساعات کی حیثیت اشاریوں secondary indices کی ہے جن کا اصل سیاق مناظر طلوع و غروب یا فطرت کا نظام الاوقات ہے۔ اسی وجہ سے شریعت میں اصل اہمیت اشاریوں indices کو نہیں سیاق source کو دی گئی ہے۔

پروفیسر اسرار احمد نے 'سمت قبلہ کے تعین کے سلسلے میں مستثنیات کا ذکر کرتے ہوئے یہ اچھا کیا کہ مسجد الحرام کا ذکر کر دیا اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ بحث کو صحیح رخ پر قائم رکھنے کے لیے اس مثال سے استفادہ کیا جائے۔

کعبۃ الشریفہ کو پہاڑیوں کی وادی میں اس طرح بنا ہوا ہے کہ جیسے کسی گہرے پیالے کے وسط میں رکھا ہوا ہو۔ بعض اطراف میں تو نوعیت یہ ہے کہ آپ چند سو میٹر وادی کعبہ سے دور چلے جائیں اور حرم کعبہ مع اپنے میناروں کے نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جتنے بھی مینار مختلف سمتوں میں ہیں، وہ سب بالعموم حرم کعبہ کا اشاریہ تو قرار پا سکتے ہیں لیکن کعبۃ الشریفہ کے صحیح رخ کا تعین ان سے نہیں ہوتا۔

پروفیسر اسرار احمد نے لکھا ہے کہ:

• مکہ شہر کے قریب جوار میں بسنے والے مسلمان قبلہ کا رخ صحن مسجد الحرام کے مینار دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں:

اس سلسلے میں میں یہ عرض کروں گا کہ قبلہ کے رخ کا تعین حسب الحکم میں صرف اور صرف کعبۃ الشریفہ سے ہوگا، حرم کعبہ سے نہیں۔ البتہ جس قدر بُعد بڑھتا جائے گا، سمت کی رعایت بڑھتی جائے گی۔

تاریخ مکۃ المکرمہ پر کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیے آپ کو علم ہو جائے گا کہ کعبۃ الشریفہ کے ساتھ میناروں کا کبھی کوئی تصور نہیں رہا ہے۔ یہ تو بعد کے اضافے ہیں، اس لیے ان کی کوئی تقدیسی حیثیت نہیں ہے۔

اس تسلسل میں اگر مدینہ منورہ کو بھی مثال میں شامل کر لیا جائے تو خود پروفیسر اسرار احمد کے بعض تسامح رفع ہو جائیں گے۔

ہجرت کے سفر میں جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ اصحابہ اجمعین نے مدینہ میں داخل ہونے سے قبل ایک مضافہ قبا میں قیام کیا تو وہاں ایک مسجد تعمیر کی جو آج بھی مسجد قبا کے نام سے موجود ہے۔ پھر جب آپؐ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو وہاں بھی ایک مسجد تعمیر کی جو مسجد نبوی کہلاتی ہے ان دونوں کا رُخ قبلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین نے خود متعین کیا تھا۔ چنانچہ آج تک کسی نے یہ جرأت نہیں کی ہے کہ یہ تحقیق کرے کہ ان کے رخ قبلہ کی طرف ہیں یا نہیں۔ (اعیاذاً باللہ) صرف اتنا ہی نہیں! اُن کے جوار میں جتنی بھی مسجدیں بنتی رہی ہیں، بنی ہیں یا بن رہی ہیں سب کے قبلہ کے رخ کا تعین مسجد نبویؐ اور مسجد قبا کے رخ کے حوالے سے ہی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمان اپنے ابتدائی دور سے ہی فلکیاتی (navigational) Astronical اور زمانی Temporal علوم میں شرق و مغرب کے

محققہ ممہ Pioneers رہے ہیں۔ معلوم نہیں پروفیسر اسرار احمد اس روایت یا روش کی کیا تاویل کریں، لیکن میں اسے سنت نبوی کا احترام کامل قرار دوں گا جسے قرآنی علوم دنیاوی پر فوقیت دی ہے۔

اوقات کے سلسلے میں ایک بات مجھے ختم کلام کے طور پر یہ عرض کرنی ہے کہ اوقات صوم وصلوٰۃ کے سلسلے میں قرآن و حدیث میں جو ہدایات ہیں وہ آثار و مناظر کے حوالے سے ہی ہیں۔ اسی وجہ سے اہل اسلام کے تمام شرعی مسالک میں تعیین اوقات صوم وصلوٰۃ میں اختلاف ہے۔ اگر ہمیں بھی گھڑی کی سوئیوں کو تقدیم عطا کی گئی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ تمام شرعی مسالک کا اختلاف ختم ہو جاتا بلکہ فجر کی نماز کا نام بھی عمل دینا پڑتا، کیونکہ بیک وقت ناروے، سنگاپور، بنگلا دیش، کیپالا، کانگو، گیبون اور ایکویڈور میں صبح دوپہر اور شام کو پڑھی جاتی۔ وقس علی ھذا۔

اس بحث اور ان مستثنیات کو پیش نظر رکھیے اور پھر مولانا مودودیؒ کے اس اقتباس کو ملاحظہ کیجیے۔

"نمازوں اور روزوں کے اوقات انہی قاعدوں پر مقرر کیے جائیں گے جو قرآن اور حدیث میں بتائے گئے ہیں۔"

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ اس کلیہ کو بیان کر کے انھوں نے کون سی سہو کی ہے۔

مجھے پروفیسر اسرار احمد کے اس قول سے اتفاق کلی ہے کہ

"اسلام میں دین اور دنیا الگ نہیں ہیں"

(ماہنامہ تہذیب الاخلاق، مئی ۱۹۹۰ء)

اس امر کی بھی خوشی ہے کہ ان کے انداز فکر پر مولانا مودودیؒ کے اثرات اب تک مرتسم ہیں۔ میں اُن کے اس جذبہ کی بھی قدر کرتا ہوں جس سے دین کے لیے دردمندی کا اظہار ہوتا ہے، بالخصوص اُس وقت جب وہ لکھتے ہیں کہ

"جہاں یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان کو دین کی بنیادی باتوں کا علم ہو وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ علوم دینیہ کے ماہرین کو عصری علوم کی مبادیات سے واقفیت ہو۔

ہماری اس تحریر کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم خود کو قطبین کے علاقوں میں عبادات کے اوقات کے تعین کے بارے میں کسی قسم کی رائے دینے کا اہل سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ علماے دین کا کام ہے کہ وہ حتمی طور پر ثابت شدہ حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن و سنت کی روشنی میں اس قسم کے مسائل کا حل تلاش کریں۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے پروفیسر اسرار احمد کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ علوم دینیہ کے ماہرین عصری علوم کی مبادیات سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ یہ خیال اچھا ہے اور اس نہج پر بہت سی دینی تعلیمی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں جن میں سے ایک I.O.S کی دینی تعلیمی کمیٹی بھی ہے۔ جب تک یہ منزل طے ہو کہ علوم دینیہ کے ماہرین عصری علوم سے آگاہی حاصل کریں اُس وقت پروفیسر اسرار احمد جیسے دردمند اہل علم کو چاہیے کہ وہ پیش قدمی کر کے علوم دینیہ کے ماہرین کے ساتھ عصری علوم کے معاملے میں تعاون کریں۔ ہندوستان کے علماے دین نے اپنی جرأت مندی و وسیع القلبی کا ثبوت دیا ہے کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں اور اپنے مسلکی اختلافات کے باوجود ایسے عصری مسائل پر غور و فکر کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس پر حنفی، شافعی، اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی، ندوی علما وغیرہ متفق الخیال ہو سکیں۔ وہ کوشاں ہیں کہ شیعہ علما بھی اس منہاج میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ یہ قابل اعتراف سعی وجہد اسلامی فقہ اکیڈمی، پھلواری شریف، پٹنہ (بہار) کر رہی ہے۔ مارچ ۱۹۸۹ء سے اب تک اس نے تین بین الاقوامی سمینار منعقد کیے تھے جن میں تمام مسالک اور تمام دینی

تحریکات کے زعما شریک ہوتے ہیں۔ اس اکیڈمی نے اپنے سیمیناروں اور سب کمیٹیوں میں عصری علوم کے ماہرین کو نہ صرف شریک رکھا ہے بلکہ ان کی آراء کو اہمیت دی ہے اور ان سے حسب ضرورت خدمات بھی حاصل کی ہیں۔ اس طرح ایک ایسا خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے جو پروفیسر اسرار احمد نے دیکھا تھا۔

ایسے سنجیدہ، علمی اور وقیع اجتماعات میں اگر کسی عالم دین کی رائے، خواہ وہ مولانا مودودیؒ ہی کی رائے کیوں نہ ہو، زیر بحث آئے، اس کا سقم ثابت ہو اور اس کے مقابلے میں کوئی صحیح رائے منظر عام پر آئے تو تمام وہ لوگ اسے خوش آمدید کہیں گے جو مولانا مودودیؒ کا اور ان کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ علم دین کے سلسلے میں خطاء بزرگاں گرفتن خطا نیست۔

"ایک سچے مسلمان کے قول اور عمل میں مطابقت ہونی چاہیے جو کچھ کہے اسے کر دکھائے اور کرنے کی ہمت یا نیت نہ ہو تو زبان سے بھی نہ نکالے۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ۔ یہ انسان کی ان بدترین صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں۔ کجا کہ ایک ایسا شخص اس اخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سائنس پارے

صابرہ خاتون ◇

طاقتور روشنی کی دھار

شکاگو یونیورسٹی کے طبعیات دانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے سطح زمین سے ٹکرانے والی سورج کی روشنی کو چھان کر قدرے تیز روشنی کی دھار تیار کی ہے۔ سائنسی جریدہ "نیچر" میں شائع شدہ مضمون کے ایک ممبر داوے کک (Dave Cook) نے لکھا ہے کہ ہم پورے نظام شمسی میں سب سے زیادہ شدت (Intensity) کی روشنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اس تجربے میں ایک عام دوربین کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں ۴۲ سینٹی میٹر کا آئینہ نصب تھا۔ اس کے ذریعے سورج کی روشنی ۳۹ء۱ انچ قطر میں ایک گز کے فاصلے پر ایک دھبے کی شکل میں مرکوز کر لی گئی۔ اس طرح روشنی محدود طور پر گاڑھی ہو گئی۔ بعد ازاں یاقوت کا ایک روا استعمال کیا گیا جس کا مقصد روشنی کو چھاننا تھا۔ یہ روا ایک ٹکون کی شکل کا تھا جس کا ایک سرا، جہاں سے روشنی داخل ہوئی، چوڑا تھا اور دوسرا جہاں سے روشنی منعکس ہو کر باہر نکلی نسبتاً پتلا تھا۔ اس ٹکون کے ذریعے مذکورہ بالا روشنی ۰۰۰۴ء ۰ انچ قطر کی دھار (Beam) میں تبدیل کر لی گئی۔ اس روشنی کی دھار کی شدت سورج کی عام روشنی کے بمقابلہ ۴۸۰۰۰ گنا اور سورج کی سطح پر پائی جانے والی روشنی سے ۱۰۰ گنا تیز ہے۔ یعنی سورج کی سطح پر روشنی کی شدت ۶۲ واٹ فی مربع ملی میٹر ہے جب کہ اس مصنوعی روشنی کی شدت ۲ء۷ واٹ فی مربع ملی میٹر ہے۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ تجربہ سورج کے ذریعے چلنے والا لیزر (Solar Pumped Laser) بنانے کا پہلا قدم ثابت ہوگا۔ یعنی اگر تیار شدہ روشنی لیزر سے گزاری جائے تو اس سے بعد باریک ایک مقررہ لہر لمبائی (Wave Length) کی روشنی کی دھار نکل سکے گی اور اس قسم کا لیزر سیاروں تک رسل و رسائل کے کام آ سکے گا۔ کچھ خاص مادے جن کی ہیئت (State) تبدیل کرنے کے لیے کافی درجۂ حرارت درکار ہوتا ہے بآسانی تبدیل کیے جا سکیں گے۔ مزید یہ کہ مادہ (Waste) برباد کرنے کا کام بھی اس سے لیا جا سکے گا۔ اس مادہ پر بالابنفشی لیزر (Ultra Violet Laser) ڈالتے ہی چیز جل کر خاک ہو جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ خطرناک کیمیاوی مادے اس لیزر کے ذریعے مفید مادوں میں تبدیل کیے جا سکیں گے۔

انگلیوں کے نشانات پہچاننے کی مشین

۱۹۷۰ء کی دہائی میں Doug Foster اور Des Freeman نے انگلیوں کے نشانات

◇ لکچرر (طبعیات) ویمنس کالج، اے ایم یو، علی گڑھ

(Finger Prints) کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کا اصول یہ ہے کہ جب کسی پیڈ کے ورق پر کچھ لکھا جاتا ہے تو اس سے بعد والے صفحہ پر اس لکھائی کے دباؤ سے نشانات بن جاتے ہیں۔ بعد والے صفحہ پر الیکٹروسٹیٹک تجزیے سے یہ پتا چلایا جا سکتا ہے کہ پہلے ورق پر کیا لکھا گیا تھا۔ اس طریقے کو الیکٹروسٹیٹک دستاویزی تجزیہ (Electrostatic Document Analysis) (ESDA) کہا جاتا ہے جو لندن کے پرنٹنگ کالج میں ڈاگ فاسٹر اور باب فری مین نے ایجاد کیا۔

لہٰذا یہ ESDA کا تجزیہ ایک اہم عدالتی آلہ بن گیا ہے جسے کچہریوں اور پولیس کی تحقیق کے عمل میں متواتر استعمال کیا جا رہا ہے جس کے ذریعے ان لوگوں کو پکڑا جاتا ہے جنہوں نے بموں کی دھمکی دی ہو، یا استعمال کرنے والے خطوط لکھے ہوں، یا بہی کھاتہ کے اوراق میں کوئی فریب کیا ہو۔

اس تجزیے کے ذریعے وہ نشانات صاف نظر آنے لگتے ہیں جو اتنے ہلکے اور دھندلے ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھنا یا پہچاننا ناممکن ہوتا ہے۔ ESDA لکھے ہوئے خط کے بعد والے ورق کا خوردبینی Disturbance حاصل کر لیتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے پہلے والے صفحہ پر کیا لکھا گیا تھا۔

جس دستاویز کا مشاہدہ کرنا ہوتا ہے اسے ایک چھنی دھات کی پلیٹ پر ہوا نکال کر مضبوطی سے رکھ دیا جاتا ہے باریک پلاسٹک کی جھلی (Film) اس کے اوپر رکھ دی جاتی ہے پھر ۸۰۰۰ وولٹ کی برقی رو اس جھلی کی سطح سے گزاری جاتی ہے جہاں لکھائی کے نشانات ہوتے ہیں وہاں چارج زیادہ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ فوٹو کاپی کا Toner پاؤڈر اس سطح پر چھڑک دیا جاتا ہے جو چارج سے چپک کر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس سے پیشتر کیا لکھا گیا تھا۔

اس تجزیہ کو محفوظ کرنے کے لیے ایک Adhesive (چپکنے والے) پلاسٹک کی ایک چادر اوپر کی طرف رکھ دیتے ہیں۔ پھر اصل دستاویز ہٹا لی جاتی ہے، یا اگر ضرورت ہو تو دوبارہ رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔

دس سال سے ESDA کچہریوں میں ثبوت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۰ سے فاسٹر اور فری مین نے ESDA مشین بنانے کی اپنی فیکٹری کھول لی ہے۔ وہ اب تک پوری دنیا میں ۹۰۰ مشینیں فروخت کر چکے ہیں جن میں سے ۲۰۰ صرف انگلستان میں پولیس کے شعبہ جات نے خریدیں اور بہت کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔

زمین کے اندر دیکھنے کی دوربین

جرمنی میں ارضیاتی تحقیق کے متعلق ایک اولوالعزم اور حوصلہ مندانہ پروجیکٹ کا آغاز ہوا ہے جس میں زمین کے اندر ۱۰۰۰۰ میٹر (یعنی ۳۲۸۰۰ فٹ) گہرا سوراخ کیا جا رہا ہے۔ اس پروجیکٹ کا نام Kontinentales Tiefbohrprogramm ہے یعنی براعظم کا گہری کھدائی کا پروگرام۔ جس کا مقصد ارضیاتی سائنسی معلومات فراہم کرنا ہے۔

مغربی جرمنی کے تحقیق کے وزیر نے اس پروجیکٹ پر خرچ کا تخمینہ تقریباً ۳۳ کروڑ ڈالر لگایا ہے۔ یہ سوراخ زمین کے اندر دیکھنے کے لیے ایک دوربین کی حیثیت رکھے گا جس سے زلزلے اور آتش فشاں وغیرہ کے متعلق نئے انکشافات ہونے کی امید ہے۔ علاوہ ازیں معدنیات، ہائیڈروکاربن اور Geo thermal پانی کے بارے میں بھی معلومات مہیا کی جا سکیں گی۔

K.T.A. کی کھدائی کا آغاز ستمبر ۱۹۸۷ میں Nuremberg سے ۱۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوا۔ یہ سوراخ ۱۰ اور ۴۰۰۰ میٹر تک پہنچ پایا تھا کہ ۱۹۸۹ میں کھدائی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

فی الحال جرمنی کی تقریباً ۱۰۰ یونیورسٹیوں کے ماہرین ارضیات K.T.B. پروگرام میں شامل ہیں اور وہاں سے نکالے گئے نمونے (samples) کا تجزیہ کر رہے ہیں۔ اب ارادہ یہ ہے کہ ایک دوسرا سوراخ ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر کھودا جائے تاکہ پہلے سوراخ والی تحقیق کی توثیق کی جا سکے۔

ڈاکٹر Thomas Wöhrl نے ایک سیاح کو وہ جگہ دکھاتے ہوئے کہا کہ K.T.B کا واحد مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا نمونہ تیار کیا جائے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ زمین کی پرتوں کی بناوٹ کس قسم کی ہے۔

کھدائی کرنے سے قبل اس جگہ کاشت ہوا کرتی تھی۔ اس جگہ کی تحقیق کر کے سارے عملی پہلوؤں پر غور و خوض اور مشاہدہ کر کے یہ معلوم ہوا کہ یہاں چٹانیں بننے کا عمل بالکل الٹ کھا ہے جو سطح زمین کے کافی قریب سرگرم عمل ہے۔

اس جگہ تحقیقی تجربہ گاہیں بنا دی گئی ہیں جن میں ماہرین ارضیات Core Samples کی مختلف النوع تحقیق کر رہے ہیں جسے رہنمائی کرنے والے سوراخ (Pilot Hole) سے ۴۰۰۰ میٹر گہرائی سے نکالا گیا ہے۔ اس تحقیقی کام میں گاما شعاعوں کی طیف شناسی (Spectro Scopy) ارضی کیمیاوی Geo Chemical تجزیہ، برق مقناطیسی پیمائش، حرارتی اور زلزلے سے متعلق مطالعہ اور گیس کی انحراف پیمائی (Gas Spectrometry) وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر Wöhrl کا کہنا ہے کہ جب data ایک ساتھ دیکھنے پر زمین کی اندرونی بناوٹ کا ہلکا سا خاکہ ضرور بن جائے گا۔ پھر اس data کا مقابلہ دوسرے سوراخ کے data سے کرنے کے بعد کسی مثبت نتیجہ پر پہنچا جا سکے گا۔

اس پروجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ نیا سوراخ کم از کم ۱۰۰۰۰ میٹر گہرا ہو۔ حالانکہ بہت سخت روسے دار چٹانیں ہیں جہاں (granite) اور ابرق شکنی پذیر ہیں۔ اس پروجیکٹ کے منیجر نے سوراخ کی کھدائی کو ۱۹۹۲ء تک پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بعد ازاں یہ طے کیا جائے گا کہ آیا یہ سوراخ اور گہرا یعنی ۱۴۰۰۰ میٹر تک کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

جس قدر یہ مقصد سائنسی اہمیت کا حامل ہے اتنا ہی اہم یہ جاننا ہے کہ کھدائی کی ٹکنالوجی کتنی معیاری (sophisticated) ہونی چاہیے۔ اس پروجیکٹ کی زمین دوز کھدائی کمپنی میں چار فرمیں (firms) شریک ہیں جو ایسی جگہ مقیم ہیں جہاں جرمنی کا سارا تیل اور گیس بنانے والے کارخانے آباد ہیں۔

اس کھدائی کا سب سے بڑا مرحلہ یہ ہے کہ جیسے جیسے نیچے کی طرف بڑھ رہے ہیں، گرمی کی شدت بڑھ رہی ہے اور سائنسی آلات ۳۰۰ ڈگری سیلسیس یا اس سے کچھ زیادہ تک ہی کام کر سکتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ سوراخ کے عمودی (vertical) ہونے کا ہے تاکہ کھدائی کرنے والی نلیوں پر کھنچاؤ اور تناؤ کم سے کم پڑے۔ Pilot hole کی کھدائی کے دوران جب کبھی چٹان آتی تھی، کھدائی کرنے والا پائپ چٹانوں کے ٹیڑھے بنکے ہونے کے سبب جھک جاتا تھا۔ اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لیے تحقیق جاری ہے اور یہ سوچا جا رہا ہے کہ ایک خود کار پانی سے چلنے والی سوراخ کرنے کی مشین self-guiding hydraulic drill rod بنائی جائے جس میں sensors لگے ہوں تاکہ جب بھی وہ اپنی جگہ سے ٹیڑھا ہو اسے سیدھا کیا جا سکے۔

بین الاقوامی سطح پر سوراخ کا منتظر نہ صرف سائنسداں طبقہ ہے بلکہ سوراخ کرنے والے انجینئر صاحبان بھی یہ جاننے کے مشتاق ہیں کہ اس پروجیکٹ میں کتنا سخت ظروف آہنی (Hard ware) استعمال کیا گیا ہے، جس سے

اتنا گہرا سوراخ ممکن ہو سکا Pilot Hole کے لیے عام ۴۹ میٹر لمبی سوراخ کرنے کی مشین استعمال کی گئی تھی لیکن اب ۴۰ میٹر لمبی مشین استعمال کی جائے گی جس میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں اور نئے نئے آلات نکالے گئے ہیں۔

اس بات کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے کہ اس پورے عمل میں کم سے کم وقت ضائع ہو۔ جتنا سوراخ گہرا ہوتا جائے گا، اتنا ہی ان چیزوں کو باہر نکالنے اور دوبارہ لگانے میں وقت زیادہ لگے گا۔ اس وقت کو بچانے کے لیے سوراخ کرنے والی مشین میں ۴۰ میٹر لمبی تراشی کی نلی (Drill Section pipe winding) کا استعمال کیا جائے گا جب کہ اس سے قبل معمولی ۲۰ میٹر تراش کی نلی استعمال ہوتی تھی۔ زمین دوز سوراخ کرنے والی مشین — Deeper کی (Super Deep Drill Ring) برقی بجلی کے تعاون سے چل رہی ہے اور اسی بجلی سے کمپیوٹر بھی لگا دیے گئے ہیں۔ مسٹر Jatko کا کہنا ہے کہ جب ہم کافی نیچے پہنچیں گے تو کھدائی کا کام اور مشکل ہو جائے گا کیونکہ نیچے کافی سخت چٹانوں کو توڑنا ہوگا۔ لہذا اس وقت زیادہ بجلی درکار ہوگی اور کمپیوٹر نہیں چل سکیں گے۔

پروجیکٹ شروع ہونے سے پہلے کا مطالعہ یہ پیش گوئی کر رہا ہے کہ زمین دوز سوراخ کرنے والی مشین میں مختلف تبدیلیاں کرنے سے ۳۲۰ دن کے کام کرنے کا وقفہ بچ جائے گا، جس سے خرچ بھی بچے گا لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ عملی طور پر دس کلو میٹر لمبے پتھریلے راستے پر دو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سوراخ ہو سکے گا یا نہیں۔

پروجیکٹ کے بعد سے جرمنی دنیا کے ان چند ملکوں میں شامل ہو گیا ہے جو زمین کی پرت کا مطالعہ کرنے کے کوشاں ہیں۔ روس میں کولا جزیرہ نما میں ۱۲۰۰۰ میٹر تک کھدائی ہو چکی ہے۔ امریکہ سمندر میں کھدائی کا پروگرام بنا رہا ہے لیکن بین الاقوامی سائنسی دلچسپی فی الوقت جرمنی کی گہرے کھدائی کے پروگرام کی جانب مرکوز ہے۔ جو پایۂ تکمیل تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے کتنی اور پریشانیاں ابھی اس راہ میں حائل ہوں گی۔

بدخط تحریریں پڑھنے والا کمپیوٹر

کچھ برس پہلے کی بات ہے جب کمپیوٹروں کا سائز بڑا اور کام کرنے کی رفتار دھیما کم ہوا کرتی تھی لیکن جیسے جیسے استعمال عام ہوتا گیا ان کا سائز مختصر اور کام کرنے کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ ان کے Key Boards اتنے چھوٹے بننے لگے کہ انسانی ہاتھ ان کو آسانی سے استعمال ہی نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ کمپنیاں Calculator کے بٹن کے برابر Key Boards بنانے لگیں اور دیگر کمپنیوں کا اصرار تھا کہ Key Board یکسر ختم کر دیے جانے چاہییں۔ کیونکہ ٹائپ سے نابلد حضرات ان کمپیوٹروں سے بہت خائف نظر آتے تھے۔

مصنوعی Software کی ذکاوت Intelligence نے دور حاضر میں کئی تبدیلی ممکن بنا دی ہے۔ پہلے اس قسم کے طریقے موجود تھے جن سے ٹائپ کی ہوئی عبارت پڑھی جا سکتی تھی، لیکن اس دور میں ہزاروں قسم کی لکھی ہوئی عبارات کمپیوٹر کی مدد سے بآسانی پڑھی جا سکتی ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے الیکٹرانک طریقے سے مختلف علامات (Symbols) اور الفاظ مشین میں بھر دیے جاتے ہیں۔ پھر لکھی ہوئی عبارت کو مشین اپنے جمع شدہ الفاظ سے موازنہ کرتی ہے اور جو کہ قریب تر پاتی ہے پڑھ لیتی ہے۔

بجائے الفاظ اور نمبروں کے دبانے کے استعمال کرنے والا شخص، یا تو اپنے ہاتھ سے ایک الیکٹرانک پین کی مدد سے لکھتا ہے یا مشین کو وہ الفاظ پہچاننے کی ہدایات دے دی جاتی ہیں جو پہلے سے مشین کو یاد داشت میں محفوظ کیے

گئے ہوں۔ جب مشین ہاتھ کی لکھائی پڑھتی ہے تو یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ آیا وہ صحیح پڑھ رہی ہے یا نہیں۔ پڑھنے کے بعد وہ کمپیوٹر کے مطابق اس لکھائی کو تبدیل کر دیتی ہے جسے اسٹور کیا جاسکتا ہے، منتقل کرسکتے ہیں اور نظرثانی بھی کرسکتے ہیں۔

امریکا کی ایک کمپنی نے انگریزی زبان پہچاننے کی مشین ایجاد کی ہے۔ جاپان کی Canon اور Sony کمپنیوں نے جاپانی زبان پہچاننے کی مشین تیار کی ہے فی الحال ان مشینوں کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ دو کلو Canon کی مشین کی قیمت تین ہزار ڈالر ہے۔ Sony کی مشین جس کا وزن ۱۰۳ کلوگرام ہے، ۱۳۵۰ ڈالر کی ہے گو شروع میں ان مشینوں کی خرید و فروخت بہت کم ہے لیکن دس برس بعد Sony کے Palmtop کمپیوٹر کی بہت مانگ ہوگی۔ کیونکہ اس کے آدھے سے زیادہ کمپیوٹر بغیر key boards کے ہوں گے۔ حتمی طور پہ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مشینیں بازار میں اپنی کتنی جگہ بنا پائیں گی۔ گو عوام کی توجہ ان مشینوں کی جانب مبذول ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ ان مشینوں میں ہاتھ کی لکھائی پہچاننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

علامات پہچاننے Character Recognition کا طریقہ جاپانیوں کے لیے مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ ان کے رسم الخط میں ہزاروں قسم کی علامات موجود ہیں اور جن کے لیے اتنے زیادہ key boards نہیں بنائے جاسکتے تھے۔ لہذا انھوں نے ساری علامات کمپیوٹر کی یادداشت (memory) میں محفوظ کردیں۔ جس سے اب کمپیوٹر جاپانی زبان پڑھ سکتا ہے۔ Sony کا کہنا ہے کہ اس کا سسٹم ۳۵۳۵ مختلف علامات پہچان سکتا ہے لیکن ہاتھ کی لکھائی چونکہ ہر شخص کی الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لیے علامات پہچاننے کا دارومدار اس بات پر منحصر ہے کہ کتنا صاف لکھا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے پولس افسران حادثات کی رپورٹ لکھنے میں اب ان مشینوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ریل کے کارخانوں میں کام کرنے والے ریل کے ڈبوں کو گننے اور ان کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا کام پہلے کاغذ اور قلم کی مدد سے کرتے تھے جناب کمپیوٹر کی مدد سے فوراً ہو جاتا ہے۔ تاجر حضرات بھی میٹنگ کی روداد لکھنے میں یہی مشینیں استعمال کرتے ہیں۔ ایک جاپانی Tomashi Hiragama کا کہنا ہے کہ اگر یہ مشینیں ٹیلی فون سے لگادی جائیں تو ہر شخص کے بھی استعمال میں آسکیں گی۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے ٹرین کی برتھ، ہوٹل کے کمرے محفوظ (Reserve) کیے جاسکیں گے اور الیکٹرانک میل بھیجا جاسکے گا۔

فی الحال ہوائی اڈے کے کنٹرول روم اور جہاز کے پائلٹ کے درمیان رابطہ ٹیلی فون کی مدد سے قائم ہوتا ہے جب کہ ان کمپیوٹروں کی مدد سے لکھ کر بات کی جاسکے گی اور ہزاروں لوگ ہوائی جہاز میں بیٹھے بیٹھے بذریعہ کمپیوٹر بات کرسکیں گے۔

کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ایک سفری (Portable) کمپیوٹر ہم کو آفس کے اقتدار سے آزاد کردے گا۔ یہ ہم کو ہر اس کام کے بارے میں آگاہ کرتا رہے گا جو ہم کو کرنا ہے۔

۱۹۸۰ء کے اوائل میں کمپیوٹر کے Macintosh ماڈل نے بازار میں آتے ہی ہلچل پیدا کردی۔ اس میں الکٹرانک علامات Icons کی مدد سے مشین سے بات چیت کی جاسکتی تھی۔

اسی سمت ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اب کمپیوٹر Desktop بننے لگے۔ Portable کمپیوٹر بنانے والوں نے Key Boards لگانے کا سلسلہ سرے سے ختم کردیا۔ جس سے تاجر، قانون داں اور دیگر پیشہ ور

حضرات کو پین یا پنسل کی جگہ کمپیوٹر استعمال کرنا زیادہ سہل ہو گیا۔

Wang تجربہ گاہوں میں اس قسم کے کمپیوٹر بنائے گئے ہیں جن میں کوئی بھی شخص ایک Wand stick کی مدد سے کمپیوٹر کے افقی پردہ پر پوری کمپیوٹر فائل پڑھ سکتا ہے جس میں نوٹس، چارٹ وغیرہ اس طرح نظر آتے ہیں گویا کسی شخص نے انھیں پہلے سے لکھ کر رکھ دیا ہو۔

فی الحال کمپیوٹر داں طبقہ کے سامنے یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ کمپیوٹر کس طرح انسانی آواز پہچاننا شروع کر دے۔ تاکہ کمپیوٹر آواز سنے اور فوراً اسے لکھ دے گو کہ یہ مرحلہ نظریاتی نقطۂ نظر سے آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اسے حقیقت کا جامہ پہنانے میں ابھی وقت لگ جائے گا کیونکہ ہر شخص کا لہجہ، تلفظ اور بول چال مختلف ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس طرح بولتے ہیں کہ حروف ایک دوسرے سے مل کر صاف طور سے کہہ ہی نہیں سکتے۔ لہذا یہ ٹیکنالوجی کے لیے زیادہ مشکل مرحلہ ہے۔ اگر ایسا ممکن ہو سکا تو آج کی الیکٹرانک دنیا میں زبردست انقلاب رونما ہوگا جس سے لاکھوں لوگ مستفید ہوں گے۔

"پانی پت کے میدان میں بابر کی فتح بابر کے رومی توپچی کی مرہون منت تھی۔ رومی ترک تو اس فن میں ۱۵۲۶ء کے بعد بھی مزید تحقیق کرتے رہے لیکن بدقسمتی سے بابر کی اولاد کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ توپ سازی کے فن میں ترقی کے لیے باقاعدہ تجربہ گاہ بناتے"

عبدالسلام

احتساب ذات

قمرالہدیٰ فریدی ◇

ایک دوست کی عیادت کے لیے اسپتال جانا تھا۔ سوچا شام کو چلیں گے، سیر بھی ہو جائے گی، مزاج پرسی بھی اور عیادت کے لیے آنے والے دیگر احباب سے ملاقات بھی۔ ابھی تو کئی کام نمٹانے ہیں اور دھوپ بھی تیز ہے۔

خیال برا نہ تھا لیکن دل ناداں نے بڑی شدت سے اختلاف کیا: اگر کسی کے لیے وقت نکالنا ہے تو فرصت اور فراغت کا انتظار کیسا؟ ساتھ دینا ہے تو اس کٹھن گھڑی میں دو جب حبیب یکہ و تنہا ہو اور ذہنی عافیت کی قربانی مانگے۔

تجویز اصولی طور پر جس قدر درست تھی عملی حیثیت سے اتنی ہی خشک۔ ماضی میں کئی بار اس نوع کے مشوروں پر عمل پیرا ہونے کی نوبت آئی؛ لگا ہے اپنی نگاہوں میں سرخرو ہوا، اکثر اپنی کم عیاری پہ شرمندہ! ایسے موقعوں پر عقل گریز کے سو بہانے تلاش کر لیتی ہے، شوق آمادگی کے لیے متعدد ترجیحات ڈھونڈ لاتا ہے۔ کبھی عقل ہار جاتی ہے، جذبے جیت جاتے ہیں اور آدمیت کا سر بلند ہو جاتا ہے۔ کبھی عقل جیت جاتی ہے، جذبے سو جاتے ہیں اور یہ حقیقت فراموش ہو جاتی ہے کہ ہم پر دوسروں کا بھی حق ہے، ہر اس انسان کا حق ہے جو تنہا اور بے بس ہو، ٹوٹ رہا ہو، بکھر رہا ہو۔ ٹوٹتے ہوئے وجود کو سہارا دینا انسانیت کا فرض ہے، قرض ہے۔ یہ قرض ہم اور ہم جیسے کروڑوں انسانوں کے ذمہ ہے۔ مہد سے لحد تک اس کا سلسلہ دراز ہے! قرض بڑا ہے بہت بڑا! زندگی مختصر ہے، ہمت پست اور حوصلہ تنگ۔ کاش انھیں بیکرانی مل سکتی!

حیات، ہمت اور حوصلوں کو بیکرانی نہیں ملتی۔ اور ہم، اگر کوئی بڑا نقصان نہ ہو تو، تھوڑی دیر کے لیے اپنے وجود کی باگ ڈور ضمیر کے ہاتھوں میں دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ سو اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔

اسپتال میں مریض اپنے بستروں پر کروٹ بدل رہے تھے۔ کسی کو بے کلی مارے ڈال رہی تھی، کسی کو کوئی ضرورت تیماردار کی راہ تک رہی تھی۔ کوئی تنہائی کا شاکی، لاوارثیت کا شکار تھا۔ عجیب دنیا ہے۔ دکھ میں لوگ ذرا دیر بھی ہنسی خوشی ساتھ دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ صحت اور فراغت نصیب ہو تو خوش گپی کے لیے احباب حاضر، حق جتانے کے لیے عزیز و اقارب موجود لیکن برے دنوں میں کوئی پاس پھٹکنے نہیں آتا، کوئی رسم دنیا نبھانے آ بھی جائے تو جانے کی جلدی!

کیوں بھائی! کچھ دیر اور نہیں ٹھہر سکتے؟ تمہاری ذرا سی موجودگی کسی کے لیے بڑا حوصلہ بن جائے گی۔ کیا اتنی مہربانی کر سکتے ہو؟

◇ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نہیں ——— ممکن نہیں!

بے شک انسان بڑا ناشکرا ہے کہ وہ صرف لینا جانتا ہے دینا نہیں۔ اور اگر بدلے میں کوتاہی ہو جائے تو شکایتوں کے دفتر کھول بیٹھتا ہے۔ راقم نے ایک عزیز سے کچھ توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں۔ سخت تکلیف ہوئی۔ کئی روز تک طبیعت اداس رہی۔ اس ذہنی کیفیت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا، ہماری کتنی ہی اداسیاں خود ہماری پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ ہم بیٹھے بٹھائے فرض کر لیتے ہیں کہ اس معاملے میں فلاں کا سلوک ہمارے ساتھ ایسا ہونا چاہیے۔ رویہ اس کے برعکس ہوتا ہے اور دل دکھتا ہے۔ شاید ہماری محبت کی تہہ میں کہیں نہ کہیں کوئی غرض بھی چھپی ہوتی ہے جو موقع ملتے ہی ہمارے سارے وجود کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ اس خطرناک برتاؤ سے چھٹکارا ممکن ہے بشرطیکہ ہماری دوستی اور دشمنی، ہمارے افعال و اعمال ذاتی مفاد، سہولتوں اور مصلحتوں کی تنگ نائے سے بلند تر ہوں۔

حضرت علیؓ نے ایک جنگ میں حریف کو زیر کیا اور سینے پر سوار ہو کر اس کا کام تمام کرنا چاہا۔ اچانک مغلوب نے ان کے چہرۂ مبارک کی جانب تھوک دیا۔ وہ اسے چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مفتوح نے متحیر ہو کر وجہ پوچھی تو جواب ملا ہماری تمہاری جنگ خدا و رسول کے لیے ہے۔ جب تم نے مجھ سے بدتمیزی کی تو طبیعت میں اشتعال آگیا اور وہ جنگ جو حق کی خاطر تھی، ذاتی مخاصمت سے آلودہ ہو گئی۔ اس لیے ہاتھ کھینچنا پڑا۔ مبادا میزانِ عدل میں اخلاص کے ساتھ نیت کا کھوٹ بھی نہ تل جائے۔

نیت کا کھوٹ بسا اوقات یوں چپکے سے اعمال کی پونجی میں شامل ہو جاتا ہے کہ ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ اس قسم کی بے خبری کا علاج ہے: احتساب ذات۔ اور یہ علاج ایک ایسے معاشرے میں جہاں نفاق کو اخلاق، رسمِ دنیا کو اخلاص، اپنے ہر فعل کو درست اور ہر قول کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہو! خاصا مشکل، مہنگا اور ہر آن ضروری ہے۔

• سرسید احمد خاں کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں، خواہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سرسید پسند کرتے۔"

خالدہ ادیب خانم

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۰، شمارہ ۱-۲ (جنوری - فروری) ۱۹۹۱

ہندوستان میں

ایڈس کی بھیانک بیماری

سید ارشد اسلم ○

ہندوستان میں ایڈس کی خطرناک بیماری مغربی ممالک سے آئی ہے۔ ۱۹۸۱ سے قبل ہندوستان میں لوگ اس بیماری کا نام تک نہیں جانتے تھے اور اب جدید طبی تحقیقات کے مطابق آنے والے چند برسوں کے اندر یہ بیماری ہندوستان میں بہت خطرناک صورت اختیار کرنے والی ہے۔ چنانچہ اس خبر کو پاتے ہی ہندوستان میں دہشت پھیل گئی ہے۔

اس وقت ہندوستان میں ایڈس کے سب سے زیادہ مریض بمبئی میں ہیں۔ بمبئی میں اس بیماری کو تیزی سے پھیلتا دیکھ کر ہندوستانی محکمۂ طبی تحقیقات نے اسے روکنے کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں۔ دسمبر ۹۰ء کو بمبئی میں یوم ایڈس منایا گیا لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے چرچ گیٹ اور بمبئی وی۔ ٹی اسٹیشنوں پر نمائشیں لگائی گئیں اس پر فلمیں دکھائی گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ ایڈس کے خلاف جنگی پیمانے پر کام کیا جائے گا۔ لہٰذا اس بیماری کو روکنے کے لیے اب تک کئی اقدامات عمل میں آچکے ہیں لیکن اس میں حسب خواہ کامیابی کی امید نظر نہیں آتی۔

آیئے ایڈس پر ذرا تحقیقی نظر ڈالیں کہ ایڈس کیا ہے۔ اس بیماری کا آغاز کہاں سے ہوا۔ اس کے جراثیم جسم میں کن طریقوں سے داخل ہوتے ہیں۔ اس بیماری کے آثار کیا کیا ہیں، کیا اس کے لیے اب تک دنیا میں کوئی دوا تجویز ہو سکی ہے۔ جسم انسانی میں اس کے جراثیم کے داخل ہو جانے کے بعد کیا کیا ہوتا ہے۔ اس مہلک بیماری سے بچنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آج دنیا میں ایڈس کی بیماری کس رفتار سے پھیل رہی ہے وغیرہ

مثل مشہور ہے کہ ایڈس وہ بیماری ہے جس کا کاٹا پانی تک نہیں مانگنے پاتا۔ اس بیماری سے رہائی کا ذریعہ صرف موت ہے۔ کیونکہ دنیا بھر کے طبی ماہرین اب تک اس پر قابو نہیں پاسکے ہیں۔ شروع میں سائنس دانوں کا خیال تھا کہ یہ بیماری افریقہ کے بندروں کی ایک گرین منکی (Green Monkey) نام کی نسل کے ذریعہ انسانوں میں پھیلی ہے۔ سائنس دانوں نے جب ان بندروں کے وائرس کی جانچ کی تو انھیں ایڈس سے ملتے جلتے جراثیم ملے۔ چنانچہ یہ افواہ چاروں طرف پھیل گئی۔ لوگوں کو موقع ملا اور وہ طرح طرح گمان کرنے لگے کہ بندروں سے یہ جراثیم انسانوں تک کیسے پہنچے۔ کیا اس خاص نسل کے بندر نے کسی افریقی دیہاتی کو کاٹا یا پھر بندروں سے کسی اور طریقے

○ بی۔ پی۔ کے کالج۔ بندو، رانچی، بہار

کا تعلق قایم کیا گیا۔ اس بات کو لے کر کافی ہنگامہ ہوا۔ افریقی ملکوں نے جم کر اس کی مخالفت کی۔ بعد میں تحقیقات سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایسا کچھ نہیں تھا اور ایڈس کے جراثیم کا کسی بھی بندر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ صرف لوگوں کا خیال تھا لیکن درحقیقت ایڈس کے وائرس کہاں سے وجود میں آئے اس کا صحیح پتہ لگانے میں سائنس داں ابھی تک ناکام ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مہلک بیماری ہمارے غلط طرز زندگی کی دین ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں دنیا بھر میں پوری طرح سے غیر قدرتی اور غیر شرعی طریقے سے زندگی گزارنے کا جو فیشن چل نکلا ہے ایڈس اسی کی دین ہے آپ افریقہ کی نئی تہذیبی روش کو دیکھیے، امریکہ میں بڑھتے ہوئے ہم جنسی رجحان کو دیکھیے آدمی کے خون کو کافی دنوں تک محفوظ رکھنے کے غیر قدرتی طریقے پر غور کیجیے۔ غرض ان سب غیر فطری اور غیر قدرتی طرز زندگی پر جب ہم غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ہم قدرت کے بالکل مخالف جا رہے ہیں چنانچہ قدرت سے بغاوت کرنے اور غیر فطری کام کرنے سے ہمیں ایڈس جیسی خطرناک اور مہلک بیماری تحفہ میں ملی ہے جس کا واحد علاج موت ہے۔ ایڈس ایک ایسی بیماری ہے جس کا وائرس ہوا، پانی، مٹی یا کسی جانور سے نہیں بلکہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی میں پھیلتا ہے یہ بیماری زیادہ تر جنسی بے راہ روی یا غیر فطری طریقے سے جنسی تعلقات قایم کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات وغیرہ میں آپ اکثر دیکھتے اور سنتے ہوں گے کہ ایک مرد کے کئی عورتوں سے جنسی تعلقات قایم کرنے سے ایڈس پھیلتا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر دس عورتوں سے جنسی تعلقات قایم کیے گئے اور ان میں ایڈس کے وائرس نہیں ہیں تو اس مرد کو ایڈس نہیں ہوگا اور اگر ایک ہی ایسی عورت جس کے اندر ایڈس کے وائرس آچکے ہیں، جنسی تعلق قایم کیا گیا تو اس آدمی کو ایڈس کی بیماری ضرور ہو جائے گی۔ یہ بیماری تو اس قدر عجیب و غریب ہے کہ اگر کسی آدمی کے جسم میں اس کے وائرس آ کر داخل ہوتے ہیں تو قریب دس سال تک اسے اس بات کا پتہ ہی نہیں چل سکے گا کہ اس کے جسم میں ایڈس کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ وہ آدمی کئی سالوں تک عام حالات میں صحت مند ہی رہے گا۔ اس کے جسم کے اندر اس دوران جو اتھل پتھل ہوتی رہتی اس کا علم شروع میں مریض کو نہیں ہو پاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایڈس کا وائرس [illegible] کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ جسم کے اندر جا کر بیماریوں سے مقابلہ کرنے والے جراثیم کو برباد کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کی شروعات ہوتے ہی خون کے سفید ذرّوں کے ایک خاص گروپ T4 کو بھی نقصان پہنچنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ [illegible] T4 بالکل ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی بیماریوں سے مقابلہ کرنے والے جراثیم بالکل ہی ختم ہو جاتے اور جب یہ ایک بار بالکل ختم ہو جائیں تو ایسی صورت میں انسان کا بچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بہت سے وبائی امراض مثلاً تپ دق کی بیماری، انفلوئنزا، خسرہ، ملیریا وغیرہ میں یہ کچھ دنوں کے لیے کمزور پڑ جاتے ہیں تو انسان کی بُری حالت ہو جاتی ہے لیکن یہ [illegible] ان کو بری طرح ختم کر دیتے ہیں اور یہ کام کافی دنوں تک اندر ہی اندر چلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے تو اس بیماری کا پتہ ہی نہیں چل پاتا اور جب چلتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

ہندوستان میں یہ بیماری سب سے پہلے ۱۹۸۱ء میں ظاہر ہوئی۔ پھر ۱۹۸۶ء میں وبائی بیماری کی حیثیت سے اس کی تحقیق ہوئی۔ ۱۹ رجون ۱۹۸۸ء کو جب بمبئی میں اس بیماری سے ایک ۲۸ سالہ طوائف کی موت ہوئی تب ہی سے ہندوستانی محکمۂ طبی سائنس کو اس کی طرف سے شدید فکر لاحق ہوئی اور اب تو اس بیماری نے ہندوستانی میڈیکل سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ بمبئی میں اس وقت

ہندوستانی میڈیکل ریسرچ ایسوسی ایشن کے تحت کے.آئی پچ ہاسپٹل میں باقاعدہ ایڈس پر تحقیقات کے لیے ایک سنٹر قایم کیا گیا ہے۔ کیونکہ طبی ماہرین کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر اس پر قابو نہ پایا گیا تو آئندہ چند برسوں میں پورے ہندوستان اور بالخصوص بمبئی میں یہ بیماری بہت خطرناک شکل اختیار کرنے والی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ بمبئی، کلکتہ، تامل ناڈو اور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں طوائف پیشہ عورتوں میں روز افزوں اضافہ ہے اس وقت بمبئی کی حالت یہ ہے کہ وہاں قانونی اعتبار سے ایک لاکھ طوائفیں ہیں جو کھلے عام پیشہ کراتی ہیں۔ حال ہی میں ان کے خون کی طبی تحقیق ہوئی جس میں یہ بات سامنے آئی کہ ہر دس طوائف میں سے ایک میں ایڈس کے جراثیم ہیں۔ ان ایک لاکھ طوائفوں میں سے ہر طوائف اوسطاً ایک رات میں دس مردوں سے جنسی تعلقات قایم کرتی ہے اس حساب سے صرف بمبئی میں روزانہ ستر ہزار آدمی ایڈس کے شکار ہو رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ بیماری ہندوستان میں کس رفتار سے پھیل رہی ہے اتنا ہی نہیں پھر جب یہ مرد دوسری جگہ جاکر ایسی عورتوں سے جنسی تعلقات قایم کرتے ہیں جنہیں پہلے سے یہ بیماری نہیں تھی تو ان کے اندر بھی اس بیماری کے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں پھر ان عورتوں سے ہونے والے تمام بچوں کو یہ بیماری ہو جاتی ہے۔ غرض یہ بیماری ہندوستان میں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے جس کا پتہ ابھی نہیں چل پا رہا ہے لیکن چند ہی سالوں کے اندر اس کی حقیقت سبھوں کے سامنے آجائے گی۔ ڈاکٹروں کی کئی ٹیمیں اس پر تحقیق اور اسے روکنے کے طریقوں پر غور کر رہی ہے ایسے ہی ڈاکٹروں میں ڈاکٹر مہندر تیواری جو بمبئی میں طوائفوں کے محلے میں پریکٹس کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی طبی تحقیقاتی کمیٹی کو بتایا کہ ایسی دو ہزار طوائفوں کے خون کی جانچ کرنے پر ۴۱۲ طوائفوں کے خون میں اس بیماری کے جراثیم پائے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک لاکھ طوائفوں میں سے کتنی طوائفیں اس سے متاثر ہو چکی ہوں گی۔ یہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں ہے بلکہ مغربی ممالک میں بھی یہ بیماری اسی رفتار سے پھیل رہی ہے ابھی کچھ دنوں قبل پینوس انسٹی ٹیوٹ نے لندن سے اپنی شائع شدہ رپورٹ [illegible] میں لکھا ہے کہ دنیا میں تقریباً ہر منٹ ایک آدمی اس بیماری کا شکار ہو رہا ہے۔

اس بیماری کے آثار جب نمودار ہونے لگتے ہیں تو اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ ایک ماہ سے زیادہ مدت گزر جاتی ہے بخار نہیں اترتا۔ جسم کے وزن میں دس فی صدی سے زیادہ کمی آجاتی ہے۔ مہینوں سے دست آتے رہتے ہیں، جسم میں تھکاوٹ کا احساس ہونے لگتا ہے اور پسینہ بہت زیادہ آنے لگتا ہے دن کے مقابلے میں رات میں زیادہ پسینہ آتا ہے۔ جسم کے تمام جوڑوں میں سوجن آنے لگتی ہے۔ منہ پر سفید دھبے نمودار ہو جاتے ہیں اور غذا جانے والی نلی میں زخم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے دنیا میں اب تک کوئی دوا تجویز نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس پر قابو نہیں پایا جا سکا ہے۔ عالمی محکمہ طب نے جدید تحقیقات کے مطابق یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں تقریباً تین کروڑ لوگ ایڈس جیسی مہلک بیماری کے شکار ہو چکے ہیں اور آئندہ پانچ سالوں کے اندر اندر ایک ارب لوگ اس بیماری کے شکار ہو جائیں گے۔ اس بیماری کے پھیلنے کے جو طریقے ہیں اس میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہے اور اکثر اس کا بہت بھیانک انجام سامنے آتا ہے۔ افریقہ ہی کی بات ہے کہ جب ایک فیملی میں بیوی کے خون کی جانچ کرائی گئی تو اس کے جسم میں ایڈس کے جراثیم ملے۔ اس کا پتہ چلا تھا کہ شوہر نے

اسے لات مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ بیچاری بیوی مرتی کیا نہ کرتی آخر اس نے طوائف کا پیشہ اختیار کر لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے پھر سیکڑوں لوگوں کو یہ بیماری پھیلی۔ ادھر اس کا شوہر نادانستہ طور پر اس بیماری سے پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا اس نے دوسری شادی کر لی۔ چنانچہ اس کی نئی بیوی کو یہ بیماری ہوئی۔ پھر اس کے جتنے بچے پیدا ہوئے سبھوں کو یہ بیماری ہوئی۔ غرض ایک چھوٹی سی بھول سے اس کے مریضوں کی اتنی بڑی تعداد سامنے آگئی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غیر انسانی حرکات سے یہ مرض ابھر رہا ہے آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایڈس کے مریضوں کو ہسپتال تک میں داخل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے کئی کئی جگہ اس بیماری کے شکار لوگوں کے گھر تک جلا دیے گئے ہیں۔ انھیں چرچ میں گھسنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بیماری کے شکار بچوں کو اسکول میں داخلہ نہیں ملتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی حرکت سے یہ بیماری بجائے گھٹنے اور کم ہونے کے اور زیادہ پھیل رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ بیماری مریضوں کے تھوک سے، پیشاب پاخانہ سے، چھینک سے، اس کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے گاڑیوں میں ساتھ سفر کرنے سے اسکولوں میں بچوں کے ساتھ پڑھنے سے اس مریض کے جسم میں سٹنے سے یہاں تک کہ ایک گھر میں ساتھ رہنے سے یہ بیماری نہیں پھیلتی۔ یہ بیماری صرف چار طریقوں سے پھیلتی ہے۔

۱۔ جنسی تعلقات

۲۔ خراب خون کے لین دین سے

۳۔ انجکشن کی گندی سوئی استعمال کرنے سے

۴ اس بیماری کی شکار عورت کے حاملہ ہو جانے سے یہ بیماری پھیلتی ہے۔

ہندوستان میں یہ بیماری زیادہ تر طوائف خانوں سے اور طوائف پیشہ عورتوں کے ذریعے پھیل رہی ہے۔ کلکتہ، بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں جگہ جگہ بس اسٹاپ پر، ہوٹلوں کے آس پاس تفریح کے دوسرے مقامات پر سیکڑوں لڑکیاں ایسی ملیں گی جو بظاہر تو شریف معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت ان کا پیشہ یہی ہے۔ لہٰذا اس بیماری کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ہمارے ملک میں کئی اقدامات کیے گئے ہیں۔ ان اقدامات کے تحت طوائفوں کو ہیلتھ کارڈ دیے گئے ہیں اور ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ یہ کارڈ لے کر ہسپتال جائیں اور اپنی صحت کی جانچ کرائیں کہ ان کے جسم میں ایڈس کے جراثیم ہیں یا نہیں اگر ہیں تو ان کی طبی امداد حکومت کی طرف سے مفت دی جائے گی۔ کئی کئی جگہ حکومت نے ایسے ادارے بھی کھولنے کا فیصلہ کیا ہے جہاں ان لوگوں کو رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کے لیے الگ آبادکاری کا انتظام کیا جا رہا ہے جہاں ان کے لیے مکانات اور رہنے سہنے کے انتظام کے علاوہ ان کے روزانہ کے خرچ کے لیے پندرہ سو روپیہ ماہانہ دینے کا فیصلہ بھی حکومت نے کیا ہے تاکہ وہ اس پیشے کو چھوڑ کر ایک صاف ستھری زندگی گزاریں لیکن اس ہیلتھ کارڈ کو لے کر طوائفوں کے درمیان کافی ہنگامہ ہے۔ ان لوگوں نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔ میڈیکل ایسوسی ایشن کے ایک ڈاکٹر کو ایک طوائف نے بتایا کہ جب ڈاکٹروں نے ہم لوگوں کو ایسے کارڈ دیے تھے لیکن ہم لوگوں نے اس کارڈ کو سوسائٹی آفس میں پھینک دیا کیونکہ کوئی بھی طوائف ایسی بے وقوف نہیں ہے کہ وہ کارڈ لے کر میڈیکل کا چکر لگائے۔ اس نے مزید بتایا کہ ہسپتال کے لوگ مجھے بہت گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اگر کسی ڈاکٹر کو یہ پتہ چل گیا کہ ہمیں یہ بیماری ہے تو وہ ہمیں عجیب خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور پھر تو یہ لوگ ہمارے نزدیک تک آنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے یہ ہم ہرگز نہیں چاہتے کہ ہم اس چیز کی تحقیق کروا کر ایک اچھوت کی زندگی گزاریں۔ غرض ہماری حکومت اس بیماری کو پھیلنے سے روکنے کے لیے بڑے بڑے اقدامات کر رہی ہے ملک

اقدامات زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ ذاتی طور پر اس بیماری سے بچنے کی کوشش کریں۔ انجکشن لیتے وقت ہمیشہ نئی سوئی کا استعمال کریں۔ جنسی بے راہ روی اور غیر فطری طریقوں سے پرہیز کریں۔ حکومت کو چاہیے کہ طوائف بازی کے خلاف قانونی اقدامات کرے۔ اس کے تحت جس طوائف کے جسم میں اس بیماری کے جراثیم پائے جائیں انہیں فوراً [illegible] کیا جائے اور ایسی تمام طوائفوں کے رہنے کے لیے آبادی سے دور مکانات بنوائے جائیں اور ان کی معقول زندگی کے لیے حسب خواہ مالی امداد کی جائے۔ اگر ان اقدامات پر حکومت نے سنجیدگی سے سوچا تو وہ اس بیماری کو پھیلنے سے روکنے میں مزید کامیاب ہوگی۔ ورنہ چند سال بعد اس کے بڑے خطرناک نتائج سامنے آئیں گے۔

"ہم اپنی قوم کو بارہا جتا چکے ہیں کہ جب تک مسلمان خود اپنی تعلیم کا بوجھ آپ نہیں اٹھا دیں گے اس وقت تک ان کی ذلت، ان کا ادبار دور نہیں ہو سکتا۔ اس ہمارے قول کی تصدیق بہت ہو چکی ہے اور جو رہی سہی باقی ہے وہ بہت جلد ہو جانے والی ہے۔ قوم کی جو حالت ہونے والی ہے اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے، اس نے ہمارے دل کو دکھایا ہے۔ اس ہمدردی اور دل دکھنے سے ہم نے مسلمانوں کے لیے مدرسۃ العلوم کے قایم کرنے کا بوجھ اٹھایا ہے مگر افسوس کہ بہت تھوڑے آدمیوں نے اس کے ساتھ ہمدردی کی۔ اگر ہماری قوم کو خدا توفیق دے تو مدرسۃ العلوم کی تکمیل (جو اُن کی نسل کے لیے آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے) کیا چیز ہے۔ ایسے ایسے متعدد مدرسۃ العلوم وہ قایم کر سکتے ہیں مگر خدا نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، کانوں کو بہرا کر دیا ہے، عقل کا ناس کر دیا ہے کہ نہ کچھ دیکھتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں، یا سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔"

سرسید

قسط ۲

دردہا دادی و درمانی ہنوز

ڈاکٹر ہادی حسن

عبدالعزیز (علیگ) ○

فردوسی کے زمانے میں ایران کے حدود کیا تھے؟ یہی جو آج ہیں یا ہخامنشیوں کے تاریخی یا افسانوی حدود — از نیل تا سندھ اور از یونان تا بحیرۂ عرب باستثنائے جزیرۃ العرب یا ساسانیوں کے پھیلتے سکڑتے حدود؟ چوں کہ فردوسی کا شاہ نامہ ایک اساطیری نظم ہے جس کے کردار افسانوی یا نیم افسانوی ہیں، اس لیے اس کے بیان سے کوئی تاریخی استنباط صحیح نہ ہوگا۔ آج جو شواہد ہمیں ملتے ہیں ان سے یہی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ خاندانی یا قبیلائی حکومتیں تھیں جس کی فوج آزمائی جہاں تک پہنچ گئی، وہی اس کے حدود مقرر ہو گئے۔ ہخامنشی سائرس یا سکندر مقدونی یا سیلوکس یا اردشیر (بابکان) ساسانی اپنے خانوادوں یا قبیلوں کے نمائندہ بادشاہ یا شہنشاہ تھے۔ ان پر دورِ جدید کے جدید قومی یا جغرافیائی تشخص کا اطلاق کرنا ایک تاریخی گناہ ہوگا۔ البتہ قبائلی یا محدود علاقائی تصور سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فردوسی یا یونان کے پلوٹارک (Plutarch) اور ہیروڈوٹس (Herodotus) نے جو کچھ لکھا اس سے اس وقت کی شاہی زندگی کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ شاہی خانوادے کی زبان اور اس کے معمولاتِ حیات کا عکس محکوموں پر ضرور پڑتا تھا۔ اس کی مثال ہندوستان اور پاکستان میں فارسی زبان اور اس کی لائی ہوئی ثقافت سے دی جا سکتی ہے لیکن اب وہ زبان اور ثقافت اس خطۂ ارض میں اپنی اس حیثیت سے باقی نہیں ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کا جو زوال اٹھارویں صدی میں شروع ہوا وہ انیسویں صدی میں اپنے منطقی نتیجے پر پہنچا۔ اس کی جگہ انگریزوں کی شہنشاہیت قائم ہو گئی جو آج بھی ہمارے معیارِ اقدار کی کسوٹی ہے۔ قدیم ایلم یا موجودہ خوزستان یا عربستان کا تعلق ہخامنشی خاندان سے ضرور بنتا ہے، لیکن فارسی زبان نے جو ایرانیت کی پہچان کہی جاتی ہے ایلم سے جنوب مشرق کے علاقے پارس یا فارس میں پرورش پائی ہے۔ اس زبان میں بہرصورت اتنی جان تھی کہ اس نے مسلمانوں کے دور میں اتنا فروغ پایا کہ اس کا ملعوذ الہم سے دہلی تک چلن عام ہو گیا۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو اسے ادوارِ ماقبل میں نصیب نہ ہوا۔ دریائے دجلہ کے ایک کنارے پر یونانیوں کا شہر سیلوشیا (Seleucia) اور اس کے دوسرے کنارے پر ساسانیوں کا شہر طیسفون (Ctesiphon) آباد تھے۔ عربوں نے ان دونوں شہروں کو المدائن کہا تھا۔ فان غالباً یونانی

○ ۲۵۵ سی / ایل تیموریہ (شمالی ناظم آباد) کراچی، پاکستان۔

تلفظ ہے، اس کے صحیح ساسانی تلفظ کا اس وقت مجھے علم نہیں ہے۔ خاقانی بھی یہی کہتا ہے کہ

ایوان مدائن را آئینۂ عبرت دان

پارس کا سب سے اہم شہر اصطخر یا یونانی Persepolis Persepolis تھا جس کے تباہ شدہ آثار اور نواحی علاقے میں رضا شاہ دوم نے ایرانی شہنشاہیت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا۔ تاریخی اعتبار سے یہ ایک اساطیری ڈرامہ تھا جسے حقیقت کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی لیکن حقیقت بالآخر حقیقت رہی اور اس کا نتیجہ خود صاحب جشن کے حق میں الٹا نکلا۔ شرق اوسط کی تاریخ قانونِ قدرت کے مطابق بدلتی رہی۔ ہخامنشی خاندان کا دور سوا دو سو برس رہا یعنی سائرس اور دارا گشتاسپ سے لے کر دارا سوم تک۔ سکندر مقدونی اور ایشیائی یونانی کم و بیش ساڑھے پانچ سو برس تک مختلف حیثیتوں سے متصرف رہے۔ ساسانیوں کا عہد حکومت چار سو سترہ برس پر محیط ہے جو اردشیر پاپکان سے شروع ہو کر یزدگرد سوم پر ختم ہوا۔ وہ مسلمان فاتحین کی یلغار کے آگے اپنی خاندانی ہیئت حاکمہ کو نہ بچا سکا۔

مسلمانوں کا پہلا دور حکومت اٹھارہ سال اور چھ صدی پر محیط ہے۔ چنگیزی یلغار اور ہلاکو خاں کی خوں آشامی نے دنیائے اسلام کو منتشر کر دیا۔ ۱۲۵۸ء میں سقوط بغداد کا یہ واقعہ ہوا اور ایلخانی دور حکومت کا آغاز، مگر یہ دور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے ۱۲۹۵ء میں ختم ہو گیا جب غازان محمود نے اسلام قبول کر لیا اور ان علمی مراکز کی تعمیر کا کام شروع کیا جنھیں خود اس کے آبا نے مسمار کر دیا تھا۔ یہ دور زمانے کی شکست و ریخت کے ساتھ جاری رہا۔ اس کا ایک اور دور ۱۵۰۱ء سے شروع ہوا جب شاہ اسماعیل نے صفوی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اثنا عشری مسلک دین دولت بنایا۔ یہ حکومت قاچار اور پہلوی دور سے دست بدست گذرتی ہوئی دور جدید میں داخل ہوئی۔ صفوی دور کے حدود بھی بدلتے رہے۔ چنانچہ آج جو علاقہ ایران کہلاتا ہے، وہ صفوی دور کی یادگار ہے۔ اگرچہ اس خطۂ ارض میں کبھی لسانی اور نسلی ہم آہنگی موجود نہیں ہے، پھر بھی ایک قسم کی ظاہری یکسانیت ضرور ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پانچ سو برس سے اس پر ایک فرقہ کی طاقت ور حکومت مستقیم ہے۔ ایران کے جدید انقلاب سے پہلے جو خاندانی سلطنتیں برسر اقتدار رہیں وہ تمام تر خاندانی حکومتیں تھیں۔ ان میں کسی ایک کو قومی حکومت نہیں کہا جا سکتا اور اس پہلو سے موجودہ حکومت بھی قومیت کی تعریف پر پوری نہیں اترتی۔ رضا شاہ کی افسانوی شہنشاہیت کے ڈھائی ہزار سال میں ہخامنشی خاندان (۵۵۵ ق م تا ۳۳۰ ق م) اور ساسانی خاندان (۲۲۴ء تا ۶۴۱ء) کی زردشتی حکومتیں قائم رہیں، لیکن رضا شاہ تاریخ کی طنابیں کھینچ کر مغربی حکایت گر مورخوں کے قصیدوں سے کھیلا آنکھ اور رام بننے کے چاؤ میں در در بھٹکنا اپنا مقدر بنا لیا۔ مرے تو زمین سخت اور آسمان دور — انور السادات نے انھیں قاہرہ میں امانتاً دفن کر لینے کی اجازت دی تو دو گز زمین میسر آئی۔ ان کے بیٹے سائرس رضا آس لگائے بیٹھے ہیں کہ درفش کاویانی لہرائے اور وہ سریر آرائے سلطنت ہو کر باپ کو عظیم سائرس کے پہلو میں دفنائیں۔ تاریخ کے زیر و زبر کو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اہل پارس کی شخصیت پرستی نئے نئے بت تراشتی رہتی ہے ممکن ہے سائرس کا یہ متوقع جانشین سائرس ثابت ہو اور از خیل تا سند اس کی حکمرانی ہو۔ خواب اچھا ہے، مگر تعبیر کا انحصار امام "خمینی" اور ان کے جانشینوں کی ادائے فرمان روائی پر ہے۔

ضیغۂ زیر تبصرہ سے میرا یہ انحراف ممکن ہے

کہ دوساز کار معلوم ہوا لیکن اس کی تصریح ضروری تھی جو نام نہاد ایران پرستوں کا مزاج بن گیا ہے۔ میرا مقصد اہلِ علم کو نئی معلومات فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ محض ان کا اعادہ ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پچھلی باتیں ذہن سے نکل جاتی ہیں، اس لیے میری ان معروضات کو ایران کے سیاق میں ایک تاریخی مواد کہا جائے۔ اس حوالے سے ایک بات واضح ہوجاتی ہے کہ ملکوں اور سلطنتوں کے جغرافیائی اور سیاسی حدود اور نام بدلتے رہتے ہیں۔ سیاسی لحاظ سے آج خراسان، طخارستان، سیستان، فرغانہ، ماوراء النہر سیحون اور جیحون کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی جو فارس کی مروجہ داستانوں بالکرنامک اور ارتخشتر پابکان یا فردوسی کے شاہنامے میں حاصل ہیں۔ جناب پورے داؤد جس ایران کی پرستش کرتے تھے، اس کے حدود کیا تھے؟ المدائن، سوسیانہ، ایلام، خوزستان، پارس یا کوئی اور علاقہ؟ اسے وہ خود ہی بتا سکتے تھے لیکن وہ فردوسی یا رضا شاہ دوم کی طرح اپنے "حدود و ثغور" کا تعین نہ کرسکے۔ جوان پارسی ایران کی پرستش کرتا تھا اس میں کلام نہیں، مگر خمینی کا ایران بظاہر ایران کی پرستش نہیں کرتا۔ جدید ایران کی اساس اس کا اپنا عقیدہ ہے جس کا تعلق اسلام سے ضرور بنتا ہے اور اسلام میں کسی جغرافیائی، لسانی اور علاقائی وطن پرستی کی گنجائش نہیں ہے ملت واحدہ کا تصور ان حدود سے بالاتر ہے۔ کون، کب، کہاں اور کس کے گھر پیدا ہوتا ہے اس پیدا ہونے والے کو اختیار نہیں۔ پھر زمین اور اس کے پرستاروں کی فضیلت کیسی؟ ایک جوان پارسی سائرس کی نذر ہوگیا اور یہ ذرا کم رتبہ جوان پارسی کسی آتش کدہ کا ہیرو بن گیا ہوگا۔ اس بات کی صراحت یوں کہ ہادی صاحب کے خطاب میں بہ تمام و کمال آگئی ہے، اس لیے میں اس پر مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

خطابت کی داد اور ستائیں پیش خدمت ہیں۔ اگرچہ ان دونوں شاؤں کا اصل مقام میڈیکل کالج کے قیام کی مہم ہے، لیکن بات خطابت، اس کی تاثیر اور نتیجے کی ہے، اس لیے اس فن کاری کی اپنی اہمیت ہے جس کا ذکر خطابت کے ضمن میں بے محل نہ ہوگا۔ میڈیکل کالج کی چندہ مہم میں ڈاکٹر صاحب قریہ قریہ، در شہر شہر بکھرے۔ انھیں کہیں اور کسی کے پاس جانے میں تامل نہ تھا۔ اپنا ہی مقصد لے کر وہ مہاراجہ دربھنگہ کے دربار میں پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑی جسارت تھی۔ مہاراجہ صاحب ہندو مہاسبھا کے مربی سمجھے جاتے تھے۔ ان کے یہاں اس نیت سے جانا کچھ عجیب سی بات تھی، لیکن ہادی صاحب سنگلاخ زمین پر چلنے کے عادی تھے۔ وہ اپنی مہم میں کامیاب رہے اور مہاراجہ صاحب کو علی گڑھ لانے میں کامیاب ہوگئے۔ [illegible] ہال میں یونین نے ان کا روایتی استقبال کیا۔ افتتاحی تقریب ہادی صاحب نے کی، وہی شگفتگی اور وہی وضع داری۔ میری یادداشت کے مطابق انھوں نے سنسکرت میں بارہ سروں کے نام گنائے۔ پھر ان کے فارسی/اردو اور انگریزی میں مترادفات بیان کیے۔ اس کے بعد ہر سُر کی ماہیت اور اس کے آہنگ کا وصف اور پھر الفاظ کے تانے بانے میں ان کی سروں کی ملی جلی دھن کا ایک تصور پیش کیا جو صرف وہی کرسکتے تھے۔ مہاراجہ ہمہ تن گوش تھے۔ الغرض نے تشبیب کا مرحلہ طے کیا تو گریز کا مقام آیا۔ انھوں نے مہاراجہ کی طرف قدرے جھک کر خالص درباری انداز میں فرمایا کہ اس وقت زمانے میں صرف مہاراجہ کی شخصیت ایسی ہے جو ان صفات کی حامل ہے۔ ان کا انداز تخاطب اور لفظوں کا زیر و بم اور سنسکرت زبان سے ان کا یہ استنباط۔ مہاراجہ صاحب اتنے مسرور ہوئے کہ روسٹرم پر آکر یہ اعلان کیا کہ دو لاکھ روپیے نقد کے علاوہ میں مجوزہ اسپتال کا مکمل ونگ [illegible]

تعمیر کرانے کا اعلان کرتا ہوں۔ عین اسی وقت مہاراجہ اور ہادی صاحب پر پھولوں کی بارش ہوئی۔ ایک عجیب عالم تھا۔ طلبا کا شورِ تحسین اور مہاراجہ کا زیرِ لب تبسم۔ جب تقریر ختم ہوئی تو جیسے طلبا نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں جس میں مہاراجہ دربھنگہ کی تالیوں کی گونج بھی شامل تھی اور جب وہ اپنی نشست کی طرف چلے تو مہاراجہ نے خود کھڑے ہو کر تقریر کی داد دی اور خود انھیں ان کی نشست تک لے گئے۔ یہ استاد کا احترام تھا یا زورِ خطابت کا یا دونوں کا؟ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہاراجہ نہیں ہیں بلکہ ایک عالمِ بےبدل کے مداح جو اُن سے دیوانہ وار متاثر ہے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا اقدارِ حیات! — اور اب —؟ طالب علم معلم کی عبا کھینچ کر اس کا عمامہ پاؤں کے نیچے روندڈالتا ہے ڈھاکہ میں سید سلیمان پر جو گزری مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ پھر کیا علم اور کیسی علم کی توقیر! عصمت بی بی از بے چادری۔

میڈیکل کالج فنڈ (Fund) کے سلسلے میں ایک عظیم جلسہ اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا جس کے مہمان خصوصی ایک اسمٰعیلی فرقے کے پیشوا ''سیدنا طاہر سیف الدین'' تھے۔ ہر چند کہ یہ فرقہ شیعوں کا ایک فرقہ ہے لیکن یہ اپنے عقیدے کے لحاظ سے فدایان الموت کے جانشینوں سے مختلف ہیں، جو آغا خاں کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں کی ایک واضح تصریح حِتّی کی تاریخ عرب کے صفحہ ۴۴۴ پر مل جائے گی۔ ایک بوہرہ خاندان سے میرے ذاتی مراسم ہیں۔ وہ مصری کلینڈر (زیج الحاکمی) کے مطابق احکام دینی کی پیروی کرتے ہیں۔ روزہ، نماز، عید اور محرم سب پر اسی کا اطلاق ہوتا ہے اور اپنے طور پر یہ اپنے آپ کو فاطمیان مصر کا جانشین تصور کرتے ہیں۔ یہ فاطمیان مصر کون تھے؟ حِتّی نے اس موضوع پر مختلف مقامات پر بحث کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ فاطمیان مصر کا بانی سعید ابن حسین تھا۔ اس نے عبیداللہ المہدی کا لقب اختیار کیا۔ آبائی لحاظ سے اس کا تعلق عبیداللہ ابن میمون القداح اہوازی سے تھا، جس نے سلسلۂ باطنیہ کی تکمیل اور فروغ میں گراں قدر خدمات انجام دیں، مگر خود اس کا تعلق ایک گمنام (obscure) گھرانے سے تھا۔

گول کلاہ نما پگڑی والے متمول مریدوں کی ایک بڑی بڑی جماعت اپنے پیشوا کے ساتھ علی گڑھ پہنچی۔ اسٹریچی ہال کی پہلی چار طویل قطاروں میں یہ لوگ اپنی وضع خاص میں اس طرح بیٹھے کہ جلسہ گاہ میں ان کی حیثیت منفرد رہی۔ ان کے پیچھے اپنی یونی فارم (uniform) میں علی گڑھ کے جوانان خوش کام۔ اسٹیج پر سیدنا طاہر سیف الدین، ڈاکٹر ضیاءالدین اور ڈاکٹر ہادی حسن سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین کی مختصر سی تعارفی تقریر کے بعد ہادی صاحب کے صوت و آہنگ کی کارفرمائی رہی۔ اس تقریر میں بھی ان کی اپنی طرز کاری سامعین کے دلوں کو زیر و زبر کرتی رہی۔ اسمٰعیلی قائدین کا یہ اجتماع اور علی گڑھ میں ان کا یہ استقبال انہونی بات نہ تھی۔ آغا خاں سوم نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوششوں میں محسن الملک کے چھوڑے ہوئے کام کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کی، لیکن میرے ذہن میں ہزار وسوسے تھے۔ اسمٰعیلی فرقوں کی تاریخ کی ایک ایک داستان اور ایک ایک واقعہ قلب و ذہن میں ایک تموج سا پیدا کرتا رہا۔ باطنی، قرامطہ، دروز، نصیری، فدائین، قلعہ الموت، سلامیہ، اور ان کی درمیون شامیں اور خون آشام خنجر اپنا قہرمانیوں کے ساتھ میرے سامنے رقصاں تھے۔ نئے نئے عقیدے اور نئے نئے مستقر۔ تونس اور مصر کے بنو فاطمہ یا عبیدیہ۔ یہ تحریک

انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قدر مضبوط ہو گئی کہ اس نے عباسی حکمرانوں کے متوازی ایک خلافت کھڑی کر دی جس نے مرکزی طاقت کو بار بار جھنجھوڑا۔ ۹۳۰ء میں ابو طاہر سلیمان بن قرمط نے کعبۃ اللہ کو حجر اسود سے محروم کر دیا جو بیس سال بعد واپس کیا گیا۔ اس وقت تک بنو اغلب مغلوب ہو چکے تھے اور عبید اللہ ابن میمون القداح کی اولاد بنو فاطمہ یا عبیدیہ کے نام سے ایک مضبوط سلطنت کی مالک تھی۔ جرجی کے اس تجزیے کی صداقت کو چھان پھٹک کے بعد بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ عبیدیوں پر ساسانی اور مجوسی اثرات نمایاں تھے، اس لیے انھیں بنو فاطمہ کہنے میں ایک تاریخی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ ابن خلدون، ابن اثیر اور مقریزی عبیدیوں کے بنی فاطمہ ہونے کے دعوے کو صحیح مانتے ہیں، لیکن ابن خلکان، سیوطی، ابن طغری بیگ اور دوسرے مورخین دلائل و براہین کی بنیاد پر اس دعوے کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ "سیدنا طاہر سیف الدین" اور اب اُن کے صاحبزادے "سیدنا برہان الدین" اس فرقے کے سربراہ ہیں جو مصری فاطمیوں یا عبیدیوں کے نسبی پیشوا تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہادی حسن کا گھریلو پس منظر اثنا عشری رہا ہے لیکن میں نے انھیں فرقہ وارانہ مناقشات سے عاری پایا۔ یونیورسٹی میں نہ اُن کے دوستوں اور رفیقوں میں ڈاکٹر طاہر رضوی تھے، نہ مولانا عابد شبّر، نہ سید (قاری) محمود حسین سنبھلی اور نہ کوئی اور چھوٹا بڑا اثنا عشری۔ میری ان سے اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی اور نہ میں نے انھیں طرفین کی نماز کے اجتماع میں دیکھا۔ وہ آپ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ اگرچہ وہ محسن الملک کی طرح دو دھاری تلوار نہ تھے مگر فکری حیثیت سے وہ ایک حقیقت پسند تاریخ داں، حق آگاہ اور آزادہ رَو تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ اسمعیلیوں کے اس نمائندہ اجتماع میں اپنے ڈھب کی تقریر کرنا مشکل ضرور ہوگا لیکن وہ اس مشکل سے آزادہ وار گزر گئے۔ انھوں نے ہندستان میں مسلمانوں کی سیاسی عظمت، علمی وجاہت، تہذیبی عروج و زوال اور عہدِ جدید میں خلافتی اور تعلیمی اداروں کی اہمیت پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی اس تحریک کا موثر انداز میں ذکر کیا جو محسن الملک کے خلوص کا مظہر تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں پانچ چھ سال کی قلیل مدت میں سات لاکھ روپے جمع کر لینا آسان کام نہ تھا، لیکن انھوں نے اسے آسان کر دکھایا۔ یہ اُن کا ایک عظیم کارنامہ تھا، جس کی تکمیل آغا خاں سوم نے ۱۹۱۳ء میں کی۔ آج کا اجتماع یونیورسٹی کی تکمیلی مراحل کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس وقت ہمارے درمیان "سیدنا طاہر سیف الدین" کی شخصیت موجود ہے جن کی علمی سرپرستی کو جامع ازہر سے ملایا جا سکتا ہے اور جو مجوزہ میڈیکل کالج کی تاسیس و تعمیر میں علی گڑھ کی مدد کے لیے خود علی گڑھ تشریف لائے ہیں۔ ان کی اس علمی سرپرستی کے علی گڑھ اور مسلمانانِ ہند دونوں ممنون ہیں اور پھر بیان اپنا والی بات۔ تعریف و توصیف میں جو کلمات انھوں نے کہے اس سے خود بھی مسرور ہوئے اور دوسروں کو بھی شادمان کیا۔ تقریر کے دوران ہی "سیدنا طاہر سیف الدین" نے دس لاکھ روپے کا چیک بطور عطیہ دیا جسے ہادی صاحب نے تبرکاً اپنے سر پر رکھ لیا۔ ہادی صاحب کی تمثیلی فن کاری اور حسنِ آفرینی ہر دیکھنے اور سننے والے پر سرور سا طاری کر چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذرہ ذرہ وجد میں ہے اور اسٹریچی ہال کی تقلیدی تعمیر پر بلادِ اسلامیہ کی فنی دلنوازیوں کا نزول ہو رہا ہے۔ سر سید کیمبرج کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ ان کے عہد کی تعمیرات میں سے اسٹریچی ہال اور وکٹوریہ گیٹ پر تقلید کا رنگ غالب ہے۔ اسٹریچی ہال کی اپنی اندرونی تاریخی عظمت اپنی جگہ، لیکن اس کی بیرونی ساخت جامع مسجد کے زیرِ سایہ ایک پیوند سی لگتی تھی۔ وکٹوریہ گیٹ اگرچہ وکٹوریہ کے آبائی محل (چیرنگ کراس روڈ) سے

خوبصورت ہے، مگر اس کا گھنٹہ گھر مجھے کبھی اچھا نہ لگا۔ البتہ باب اسحٰق کے فن تعمیر میں ایک اپنائیت ہے۔ خیر یہ میری اپنی بات ہے جس کا موضوع سے تعلق نہیں۔

"سیدنا" کے اتباع میں ان کے مریدوں نے لاکھوں روپیے دیے۔ ہادی صاحب اپنی شیروانی کے دامن میں سمیٹتے رہے۔ اس وقت ان کے ملتے بر بشاشت کا فطری تشفہ جلوہ نما تھا، جو ان کے اندرون قلب کی ترجمانی کر رہا تھا۔ امتزاج شور وشادمانی حیرت، استعجاب، شوخی وطراری اور ولولہ کیا کچھ نہیں تھا۔ میں خیالات کی اس رَو میں بہت سی مثالیں دینا چاہتا تھا، بالخصوص انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ علی گڑھ کا خطبہ اور مقالہ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فکر و قلم کی تیز گامی پر کبھی کبھی عناں گیری بھی لازم ہے، اس لیے ان کے طرز خطابت کے اس مختصر سے جائزے کو رسم پو— حامد ہال میں یونین کی ایک رسم تنصیب پر ختم کرتا ہوں —

مسلم یونیورسٹی میں یونین طلبا کا ایک اہم ادارہ ہے جہاں طلبا کی ذہنی فکری اور معاشرتی تربیت ہوتی ہے۔ یونین کے انتخاب میں اپنی وضع کا تنوع ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بنیادی روایات اب بھی نہ بدلی ہوں گی۔ وہی دو دن اور ایک رات کی حصول رائے کی مہم رائے دہی کا پرسکون ماحول، نہ باجا نہ گاجا، نہ تعطیل۔ انتخابات سہ پہر کو ختم۔ گنتی۔ انتخابات میں ایک ہارتا اور جیتا ہے۔ اسی رات نتیجے کا اعلان۔ ہارے ہوئے امیدوار کے چیف الیکشن کا اس کے در پر اس کا جشن جنازہ، مرثیے، نظم اور کچھ شور وشغب۔ دو چار دن میں رسم تنصیب۔ طرفین دل کی بھڑاس نکالتے۔ جنازے میں شور وشغب فاتح امیدواروں کے موئیدین کا ہوتا اور رسم تنصیب میں ہارے ہوئے اپنی فکری تاخت سے کام لیتے۔ یہ اس سال کا ذکر ہے جس سال ہادی صاحب یونین کے نگراں تھے۔ چوں کہ یونین کی سرکاری زبان اردو تھی (یا ہے؟) اس لیے انھوں نے بھی جو کچھ کہا اردو میں کہا۔ مجھے اس وقت بھی وہ سماں یاد ہے اور ان کے الفاظ بھی:

"ہمارے یہاں یہ ایک عام شکایت ہے
کہ معیار گر رہا ہے۔ نہ عالی قدر افراد
پیدا ہو رہے ہیں اور نہ موثر خطیب لیکن
آج اس وقت میں وثوق کے ساتھ
کہہ سکتا ہوں کہ نہ قوم میں قحط الرجال
ہے اور نہ قحط المقررین"۔

یہ منظر دیدنی تھا۔ میں طلبا کے مسرت انبساط کے اس روح پرور ریلے کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا، لیکن ۴۵ سال بعد اس کے لمس کو محسوس کرتا ہوں۔ وہی خوشیوں کا سیل رواں، وہی تحسین شعاری، وہی جوش وولولہ۔

اس کے بعد بھی میں تقریباً تین سال علی گڑھ رہا ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی اجڑی اجڑی سی لگ رہی تھی — کانووکیشن میں پنڈت جواہر لعل نہرو تشریف لائے اور ہم ڈین فیکلٹی آف آرٹس Dean faculty of Arts کی قیادت میں ڈائس کے سامنے کھڑے ہوئے۔ ڈگری عطا کرنے کی درخواست ڈین عربی زبان میں کرتا اور ڈائس چانسلر عربی زبان ہی میں عطائے سند کا اعلان کرتے۔ کچھ عجیب سا لگا۔ آنرز کی ڈگری ایک سال پہلے ملی تو اس کانووکیشن میں لیاقت علی خاں مہمان خصوصی تھے اب وہ پاکستان کے وزیر اعظم بن چکے تھے اور جواہر لعل نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ آنرز کی ڈگری پاکستان کے وزیر اعظم کے ہاتھ سے ملی اور ایم۔ اے کی ڈگری ہندوستان کے وزیر اعظم کے ہاتھ سے۔ دونوں کا لباس اور وضع قطع ایک، مگر ایک کے سر پہ جناح ٹوپی اور دوسرے کے سر پہ

گاندھی ٹوپی جو ایک نمایاں فرق تھا۔ اس وقت میرے بیشتر ہم عصر پاکستان آ چکے تھے اور جو نہیں آئے، وہ طلبا کی صف میں موجود نہ تھے۔ ہمارے ایک دوست کو جو فورتھ ایئر کے طالب علم تھے، یونین کے انتخاب میں حصہ لینے کی سوجھی — سمجھایا کہ بندۂ خدا غلطی جانچتی ہے۔ مانا کہ آفتاب ہال سے جیت جائیں گے مگر دوسرے ہال کے معتبرین موجود نہیں ہیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ جی جان سے الیکشن لڑے دو تین سو ووٹ سے ہار گئے۔ چیف الیکشن کی حیثیت سے جنازہ کا جلوس آیا۔ دو دن سے بخار تھا مگر پرواہ نہ کی۔ اس روز زیادہ تیز ہو گیا۔ جشن جنازہ کا جلوس آیا۔ وی۔ ایم ہال کے ڈبلو خان، جو دوسرے گروپ کے سرکردہ ورکر تھے۔ میرے پاس آئے اور اس حال میں دیکھ کر چند منٹ کے لیے باہر لائے اور پھر اندر لے گئے۔ غرضیکہ اہلِ جنازہ اپنا رنگ دکھاتے رہے جو اور دل کے حصے میں آیا۔ مجھے خواب آور دوا پلا کر سلا دیا گیا تھا ایک ہفتے بعد ہادی صاحب سے ملا تو انھوں نے پوچھا کہ میاں یہ کیا سوجھی؟ ریسرچ کا طالب علم لمحاتی واہ واہ سے آزاد ہوتا ہے۔ جی ہاں! یہ صحیح ہے بس ایک دوست کی دل رسی اور پھر سارا واقعہ سنایا۔ پھر تو ٹھیک ہے جو انجام مقرر تھا، وہ مل گیا، مگر یہ بخار — تپ لرزاں یا تپ گریزاں؟ نہ تپ لرزاں اور نہ گریزاں۔ دن کا وقت کام اور آخری دو رات تو بالکل نہیں سویا۔ آپ اسے تپ تکان کہہ سکتے ہیں۔ زیر لب مسکرائے اور کہا کہ ایک نئی اصطلاح ہے، معلوم نہیں مگر حقیقت یہی ہے۔ شکست گریز نہیں سکھاتی۔ آپ کہا کرتے ہیں شکست نہ ہو تو فتح بے لطف ہو جاتی ہے۔

میڈیکل کالج کے لیے فنڈ (چندہ) جمع کرنا آسان کام نہ تھا۔ دو سال کے اندر حکومت ہند کے مقررہ وقت تک پہنچنے کے لیے ہزار ہفت خواں طے کرنے تھے۔ مسلمان نہ اتنے بڑے سرمایہ دار تھے اور نہ اتنے امیر کبیر کہ لاکھوں کی رقم ایک آواز پر جمع ہو سکتی، لیکن پھر بھی ہادی حسن کی آواز میں وہ کشش تھی کہ وہ خزانوں اور تجوریوں سے رقم نکلواتی رہی۔ بمبئی، مدراس، کانپور اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں کبھی ڈاکٹر ضیاء الدین کی معیت میں اور کبھی تن تنہا پھرتے رہے اس کارِ خیر میں حصہ لینے کے لیے ہر اہلِ خیر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نامراد نہ لوٹے۔ ہندوستان کی مسلمان ریاستیں علی گڑھ کی مالی امداد میں ہمیشہ فراخ حوصلہ رہیں۔ ان میں حیدرآباد، بھوپال، رامپور اور چھوٹی بڑی دوسری ریاستیں قابلِ ذکر ہیں۔ حیدرآباد، بھوپال اور رامپور کے تعمیری احسانات آج بھی علی گڑھ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بہاولپور سے بھی علی گڑھ کے معاملات اچھے تھے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کی کوئی تعمیری یادگار علی گڑھ میں موجود نہیں ہے۔ میڈیکل کالج کے لیے بھی ان ریاستوں نے گراں قدر رقمیں دیں۔ اس سے پہلے انھوں نے علی گڑھ کی مالی اعانت کی۔ یونین کا رامپور حامد ہال ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے — وقار الملک ہال (وی۔ ایم۔ ہال) تعمیر ہوا تو نصراللہ ہوسٹل بکمال و تمام بھوپال کا رہینِ منت ہے اور مزمل ہوسٹل علی گڑھ کے نواب مزمل اللہ خاں کا۔ باقی دو ہوسٹل یعنی جبلی اور میرس بھی ممکن ہے انہی اہلِ خیر کی مدد سے بنے ہوں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جملہ ضروریات پوری کرنے کے لیے سلطان جہاں منزل اور کانفرنس کمپاؤنڈ اور شاہ جہاں منزل بھوپال کے عطیات ہیں۔ خود نواب حمیداللہ خاں آخری والی بھوپال علی گڑھ کے گریجویٹ تھے، اس لیے وہ علی گڑھ کے روزمرہ کے معاملات سے کبھی بے خبر نہ رہے۔ سرسید کے زمانے سے لے کر قیامِ پاکستان تک حیدرآباد نے علی گڑھ کی

قرار واقعی مدد کی ہے - عثمانیہ ہسپتال اس کی زندہ مثال ہے۔ ۱۹۴۶ء میں والیٔ حیدرآباد نے نواب زین یار جنگ کی نگرانی میں ایک کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد یونیورسٹی کے لیے ایک عظیم الشان منصوبہ Master Plan تیار کرنا تھا۔ اس منصوبے میں عمومی منصوبہ بندی کے ساتھ جامعہ ازہر کے طرز پر جامعہ زہرا کا منصوبہ بھی شامل تھا، لیکن سقوط حیدرآباد کے بعد جس میں زین یار جنگ خود ملوث تھے، یہ منصوبہ زمیں ریز ہو گیا۔ میرے خیال میں بعد از سقوط حیدرآباد سے علی گڑھ کو نواب علی یاور جنگ کا تحفہ مزدور ملا ______ بھی اس وقت وہ رقم قطعیت کے ساتھ یاد نہیں ہے جو حیدرآباد نے میڈیکل کالج فنڈ کے لیے بطور عطیہ دی تھی - خیال ہے کہ شاید سب سے زیادہ ہو۔

باقی آئندہ شمارے میں

"کاہلی یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔"

سرسیّد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۰ ش ۱-۲ جنوری۔ فروری ۱۹۹۱ء

تعلیم — اس کی بنیادی ضرورت اور نصاب تعلیم

مقبول احمد ◇

تعلیم کا سلسلہ روز پیدائش سے شروع ہو کر تاحیات چلتا رہتا ہے۔ شاید پہلی تعلیم رحم مادری میں جب بچے کی ابتدائی نشو و نما کے بعد قوت احساس پیدا ہوتا ہے، جب ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ بچہ اپنے ماحول کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے ہر وہ چیز جو ماں پر اثر انداز ہوتی ہے اس کا عکس شکم مادر میں بچے پر بھی پڑتا ہے جو کہ بچے پر آئندہ زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

نوزائیدہ بچے کی پہلی معلم اس کی ماں ہے اور تربیت کا پہلا گہوارہ اپنا گھر ہے اور بعد میں اس کے رشتہ دار اور خاص طور سے قریبی رشتے دار اور پھر محلہ والے، محلے کا ماحول، اپنے بس کے شروع کے ساتھی، اسکول یا اور اسکول کے دوست احباب اس کی تربیت و تعلیم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تعلیم کی ضرورت زندگی کو سنوارنے، اخلاقی حدود کے اندر گزارنے، روحانی تسکین اور تحقیقی کاموں کے لیے ضروری ہے۔ اس کی ضرورت حصول رزق اور دنیاوی کاموں کے لیے بھی ضروری ہے۔ تعلیم اور رزق کا کافی بڑی حد تک ایک دوسرے پر انحصار ہے۔

اگر تعلیم کو صرف حصول رزق کے لیے حاصل کیا جائے تو یہ روپیہ پیدا کرنے کی ٹکسال تو ہو سکتی ہے مگر انسانی اور روحانی پرورش اور اخلاقی بلندی کے لیے بالکل بیکار ہے اگر زندگی کا مقصد کھانا پینا، پہننا اور رہنا ہی ہو تو اس کے لیے ایسی تعلیم کافی ہے۔

بہ الفاظ دیگر تربیت و تعلیم کی ابتدائی بنیاد پر گھر اور گھر والوں کا اثر کافی اہم ہے اور دیرپا۔ اگر یہ ناقص ہو گئی تو پوری دیوار ہی خراب اور کمزور اور عمارت ناقص اور کج ہوگی۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے گھر والوں کا اخلاق بلند کریں، حلال و حرام کا خیال رکھیں، خود کو سنبھالیں اور گھر کا ماحول ٹھیک کریں تاکہ بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت درست ہو سکے۔

اس لیے مذہب کا ایک اہم رول ہے۔ مذہب ہمارے کردار کو بلند کرتا ہے۔ ہم میں بھلائی، ایمان داری، خوف خدا، رواداری، صبر و استقامت پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارے گھروں کا ماحول صاف اور صحیح طور پر مذہبی ہونا لازمی ہے۔

ابتدائی مرحلوں کے بعد اسکول، کالج، یونیورسٹی اور اعلیٰ

◇ پروفیسر، ۹۳ پارک اسٹریٹ، کلکتہ۔ مغربی بنگال

ہمارے تعلیمی ڈھانچے میں ایک اور اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ ہماری باقاعدہ FORMAL تعلیم کا حصہ ہے۔ اس دور میں بھی مذہب کا وہی کردار قائم اور جاری و ساری رہنا ضروری ہے

انگریزوں نے جو تعلیمی اصول اور ڈھانچہ بنایا تھا وہ چند معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ابھی تک جاری و ساری ہے۔ ان کے مقاصد اپنے محکموں میں کارندے اور کارگزار پیدا کرنا، اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو فروغ دینا اور اس کا بول بالا کرنا اور ہندوستانی جسم و قلب میں یورپی ذہن و فکر پیدا کرنا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستانی اپنے مذہب اپنی تہذیب اور اپنی فکر و ملت سے خود متنفر ہو جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخ کو غلط انداز سے اور توڑ موڑ کر ایک سوچی سمجھی تدبیر کے ساتھ، اس طرح پیش کیا گیا کہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے ماننے والوں میں نفرت پیدا ہو اور اس کو نصابی کتابوں میں داخل کر دیا گیا۔ تاکہ ایک مستقل تصادم کی راہ کھل جائے۔ اس میں انگریز پوری طرح کامیاب ہے۔

حصول آزادی کے بعد اب ضروری ہے کہ ایک نئے انداز فکر سے اپنی ہندوستانی تہذیب مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کی تہذیب، ان کی مختلف زبانوں کی فروغ و ترقی اور مذہبی رواداری کو نصب العین بنا کر اپنا تعلیمی نصاب بنائیں۔ تاکہ اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی قدریں اجاگر ہو سکیں اور ساتھ ساتھ تمام وہ مضامین جو قومی ترقی اور انسانی ارتقا میں ہماری معاون ہوں، اچھی طرح پڑھایا جائے۔

ایسا کرنے کے لیے ایسے معلموں کی ضرورت ہوگی جن کا خود اپنا مذہبی اخلاقی اور تہذیبی معیار بلند ہو اور ایسے معلموں کو پیدا کرنے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے، مگر ضروری ہے۔

حصول رزق کے لیے تعلیمی ڈھانچے کا مقصد نہ صرف رزق ہی ہو بلکہ اس کے علاوہ، قومی ترقی، قومی بہبودی اور علوم سائنس کی ترقی اور ریسرچ کا لگاؤ ضروری ہے۔

ایسی تعلیم کی صحیح بنیاد ڈالنے اور تکمیل کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔ بار بار کمیشن بٹھانے، بار بار نصاب کی تبدیلی سے نقصان زیادہ اور فائدہ کم ہوتا ہے۔

اس کی سخت ضرورت ہے کہ گزشتہ کمیشنوں کی رپورٹیں ماہرین تعلیم کے خیالات، ایک وسیع سوال نامے COMPREHENSIVE QUESTIONNAIRE کے جوابات کا مرقع ہو کر بنیادی تعلیمی اداروں، اسکولوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کے اساتذہ اور درمیانی تعلیمی اداروں سے لے کر دارالعلوم کی سطح تک کے بھیجا جائے، سامنے رکھا جائے اور ان کو دیکھ کر ایک تعلیمی ڈھانچہ اور نصاب تیار کیا جائے۔ جب یہ تیار ہو جائے تو پھر اہل الرائے اشخاص کے پاس بھیج کر ان کے تبصروں پر غور کرنے کے بعد آخری مسودہ اور نصاب تیار کیا جائے۔ سیاست اور سیاسی لیڈروں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔

یہ ایک بے حد مفید دستاویز ہوگا اور ان کی صرف جزوی تبدیلی اگر ضرورت ہوگی تو وقتاً فوقتاً کی جا سکتی ہے۔ ایک دفعہ نصاب بن جائے تو اس کی تمام معیاری کتابیں ہر ہندوستانی زبان میں لکھوائی جائیں اور ان کی اشاعت کا بھی بندوبست کیا جائے تاکہ کم داموں میں خریدی جا سکیں اور ہر خاص و عام کو فائدہ ہو۔

اگر سر سید احمد خاں نہ ہوتے

الطاف حسین فریدی ◇

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سر سید احمد خاں، ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر تقی نہایت قانع بزرگ تھے۔ وہ اُن دیدہ وروں میں تھے جن پر ہماری قوم ہمیشہ فخر کرتی رہے گی اور ان کی روشن دماغی اور وسیع النظری زندگی کی راہوں میں مشعل کا کام دیتی رہے گی۔ وہ ایسے جلیل القدر مفکر تھے جنھوں نے اپنی قوت فکر و عمل سے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ قوموں کی قسمتیں بدل دی اور پستی و درماندگی کی دلدل سے نکال کر ہدایت کی راہ پر ڈال دیا۔ ایسے مرد مجاہد صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سرکار انگلشیہ کی نگاہ میں مسلمان معتوب ہو چکے تھے اور وہی سب سے زیادہ کچلے گئے۔ انگریز ان کو اس سازش کا بانی اپنا دشمن اور غدار کہتا تھا۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ ان پہ مایوسی اور افسردگی کا عالم تھا۔ ان کو یقین ہو چکا تھا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سر سید نے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ان پر خود کچھ دنوں مایوسی کا عالم رہا اور اس درد کے کرب سے بے تاب رہے۔ لیکن چند روز یہ غلبہ رہنے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ بزدلی ہوگی کہ وہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر ماتم کرتے رہیں اور پھر اس مرد مجاہد نے عزم کیا کہ وہ اس بُرے اور آڑے وقت میں قوم کا ساتھ دیں گے۔

سر سید کے سامنے بہت سی باتیں حل طلب تھیں۔ وہ اگر جزئیات کی اصلاح یا حل کا ارادہ کرتے تو شاید عمر بھر کوئی کام نہ نکال پاتے۔ ان کی نگاہ میں سب سے بڑا مسئلہ قوم کو غار مذلت سے نکالنے کا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کا علاج صرف تعلیم یعنی جدید مغربی تعلیم ہے۔ ہماری ساری مصیبت پسماندگی اور محرومی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ جہالت بذات خود تمام عیوب اور برائیوں کی جڑ ہے۔ اس لیے انھوں نے انگلستان کا سفر کیا تاکہ بذات خود اصول طرز تعلیم سے واقفیت حاصل کریں۔ غرض اپنا نادر کتب خانہ بیچا اور جائداد کو رہن رکھ کر ۱۸۶۹ء میں ولایت روانہ ہو گئے۔ اور وہاں اپنے ڈیڑھ سالہ قیام کے دوران اپنے منصوبے کا خاکہ تیار کیا۔ وہ ہندوستان کے نظام تعلیم سے مطمئن نہ تھے اور خصوصاً مسلمانوں کے حق میں اسے مضر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت رائج نظام تعلیم کے خلاف ایک جامع پمفلٹ شائع کیا۔ واپسی پر انھوں نے دو اہم کام کیے۔

اول مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح اور ان کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جو آج

◇ جرنلسٹ، خانقاہ بدر الاسلام، سر سید نگر، سول لائن، علی گڑھ۔

ہی جاری ہے۔ اس رسالہ میں سرسید نے مذہب اخلاق اور معاشرت وغیرہ پر ایسے مضامین لکھے جن سے لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔ توہمات اور تعصبات پر کاری ضرب لگی۔ شاید ہی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ ہو کہ جس پر تنقیدی نظر نہ ڈالی ہو اور بڑی اخلاقی جرأت و دلیری اور بے باکی سے وہ بات کہہ دی اور لکھ دی جسے وہ ٹھیک سمجھتے تھے۔ اس پرچے میں مجوزہ مدرسۃ العلوم کی تجویزوں اور کارروائیوں کی روداد بھی چھاپی۔ مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو نفرت تھی اور اس تعصب کو توڑنا آسان کام نہ تھا۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ اس میں عالم اور عامی دونوں متفق تھے۔ جب سرسید نے ان خیالات کا اظہار کیا اور مغربی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا تو ہر طرف سے مخالفت کا ایک طوفان برپا ہو گیا اور سرسید پر لعن طعن شروع ہو گئی۔ چنانچہ ان کو کافر، ملحد، نیچری اور کرسٹان کے خطابات سے نوازا گیا اور تو اور علمائے کرام نے کفر کے فتوے دے دیے۔ ان کے حالات اور افکار کو بھیانک شکل میں پیش کیا لیکن ان سب کے باوجود ان کے دل میں میل تک نہ آیا بلکہ ان کے کام میں گرمی اور جوش پیدا ہو گیا اور وہ بڑی جرأت کے ساتھ اپنے مشن کو بڑھاتے رہے آخر ش کچھ عرصہ بعد ان کے کٹر مخالف بھی نادم و شرمندہ ہو کر ان سے پورا اشتراک کرنے لگے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ سرسید نے قومی خدمت شروع کرنے کے بعد جتنے بھی کام کیے ان میں کبھی ہندو مسلم کا امتیاز نہ کیا اور ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ ایک جگہ اپنے خیالات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں:

"دوستو! ہندوستان ایک دلہن کے مانند ہے جس کی خوب صورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق کریں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کریں گے تو وہ کانڑی بن جائے گی۔ پس اے ہندوستان کے رہنے والو ہندو مسلمانو تم کو اختیار ہے چاہے اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا۔"

بہرحال انھوں نے پہلے غازی پور اور پھر مراد آباد میں جہاں وہ بطور جج کے تعینات رہے مدرسے قائم کیے۔ افسوس کہ دونوں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر ش ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کے نام سے شروع کیا اور لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے علی گڑھ آکر ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو بنیادی پتھر رکھا۔ نوابین و رؤسا علی گڑھ، نظام حیدرآباد، نواب بھوپال اور نواب رامپور نے بھرپور تعاون کے ساتھ دل کھول کر چندہ اور معافیاں وقف کردیں۔ قوم نے بھی پذیرائی کی اور ہر طرف سے چندہ کی بوچھار شروع ہو گئی۔

یہاں یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ کالج سے فارغ ہونے والے پہلے اور دوسرے گریجویٹ مسٹر امبا پرشاد و راجہ مہندر پرتاپ سنگھ اور ایشوری پرشاد تھے۔ سرسید نے جس یونیورسٹی کا خواب دیکھا تھا وہ ان کی زندگی میں پورا نہ ہوا مگر اس خواہش کے پیچھے چونکہ ایک مخلصانہ جذبہ تھا اسی لیے ہماری یونیورسٹی برصغیر کی چند یونیورسٹیوں میں سے ایک عظیم درس گاہ بن چکی ہے جہاں سے ہزارہا ڈاکٹر، انجینئر، وکلا، جج و اساتذہ برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی کارکردگی سے اپنا نمایاں مقام بنا لیا ہے۔ ہماری مادر درس گاہ نے کیسے کیسے مدبر سیاست داں، فلاسفر، ادیب، شاعر، صحافی اور کھلاڑی پیدا کیے وہ خود اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں سے کچھ کے نام نمونے کے طور پر نہ دینا حق تلفی ہوگی۔

مولانا محمد علی و شوکت علی، خان عبدالغفار خاں
نوابزادہ لیاقت علی خاں، جنرل محمد ایوب خاں،
شیخ محمد عبداللہ، رفیع احمد قدوائی، مولانا حسرت
موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر [illegible]
جنرل، پروفیسر خورشید الاسلام، اخلاق الرحمٰن قدوائی،
پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر محمد شفیع،
محمد اعظم خاں، خواجہ غلام السیدین، قرۃ العین حیدر،
کلیم الدین شمس، جاوید اختر، معصوم رضا راہی،

مولانا اقبال سہیل، رشید احمد صدیقی، خلیل الرحمٰن
اعظمی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین، کرنل بشیر حسین زیدی،
صاحب زادہ یعقوب خان، سید حامد، نواب
احمد سعید خان، الحاج عبید الرحمٰن خاں شیروانی،
نواب رحمت اللہ خاں شیروانی، شیخ عبداللہ
(پاپا میاں) پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر
کبیر احمد جائسی، فیاض رفعت خان، پروفیسر بابر
مرزا، ظفریاب جیلانی، ممتاز حیدر، انور مسعود
نازش حسینی، عاصم صدیقی، جاوید حبیب، جاں
نثار اختر، شکیل بدایونی، اسرار الحق مجاز،
دلاور فگار، علی سردار جعفری، بشیر بدر، شہریار
محمد عثمان عارف نقشبندی، خواجہ احمد عباس، زیڈ کے
فیضان، انیس شیروانی، بھیم سنگھ، محمد صادق
شمس الحسن، بی۔ ایم۔ شاہ، اسعد ہاشمی۔

ان میں سے کچھ تو آج بھی اہم عہدوں پر فائز ہیں اور اور اپنا لوہا منوا رہے ہیں۔

مضمون کے طویل ہو جانے کا ڈر ہے۔ ورنہ اس عظیم ہستی پر ہزارہا صفحے بھی لکھنا ناکافی ہوگا۔ الغرض سرسید کا آخری دور قریب سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی کے آخری ایام بڑے کرب و الم میں گزرے۔ انہیں پہلا صدمہ کالج کے روپے کے غبن کا ہوا اور اس سے بڑھ کر اپنے فرزند سید محمود کا۔ کثرت شراب نوشی نے سید محمود کا دماغ معطل کر دیا تھا۔ وہ عالم دیوانگی میں ایسی حرکتیں کر بیٹھتے تھے جو کسی عنوان سرسید برداشت نہ کر سکے۔ مجبوراً انہوں نے اپنا ذاتی مکان جہاں وہ تیس سال قیام کے دوران دن رات کام کرتے رہے تھے چھوڑ دیا اور مزمل منزل کے قریب ایک کوٹھی میں (جس کا نام بیت الانس تھا) اپنے ایک دوست کے یہاں جا کر پناہ لی۔ ان عظیم صدموں سے نڈھال ہو کر تھک کر بیٹھ گئے۔ دل تو بجھ چکا تھا پھر بھی جو لگن دل سے لگی تھی اس کی آگ اس وقت تک باقی رہی اور برابر کام کرتے رہے۔ آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جو کسی کے ٹالے نہیں ٹلا۔ افسوس صد افسوس کہ یہ قوم کا فدائی و شیدائی ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو اس دار فانی کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کی ابدی نیند سو گیا اور انہیں ہزارہا سوگواروں کے ہاتھوں یونیورسٹی جامع مسجد کے احاطہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

وہ ہمارے درمیان تو نہیں رہے لیکن اپنی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گئے جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اس برِ اعظم کے مسلمانوں میں ایک سے ایک بڑے مجاہد ذی علم اور پاک نفس بزرگ گزرے ہیں جن کا دائرہ ایک یا دو مہمات تک ہی محدود رہا لیکن سرسید کا میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ ایسا جامع صفات، بے لوث اور بے نفس، پرعزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت نہیں اس سے پہلے نہ اس کے بعد نصیب ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بزرگ عظیم نے افسردہ و مایوس قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور وہ قومی جذبہ پیدا کر دیا جو برابر کام کرتا رہے گا۔ لطف تو یہ ہے کہ یہ دیوانہ جب مرا تو کفن کے لیے اس کے پاس ایک پیسہ نہ نکلا اور یہ سعادت دوسروں کے حصے میں آئی۔

سرسید علیہ الرحمہ کی سرگرمی، کارکردگی اور عزم صمیم نے ہی اس سوتی ہوئی اور بے جان قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور پھر وہ نئے جوش و ولولے، نئے عزائم اور نئے ساز و آہنگ سے آراستہ ہو کر اس برق رفتاری سے آگے بڑھی کہ اس نے اپنی تہذیب، مشرقی روایات و اقدار اور اپنی عظمت کا لوہا منوا لیا۔ سید جیسا مصلح اعظم و قائد اگر اس قوم کو نہ ملتا تو خدا جانے یہ آج کن راہوں میں بھٹک رہی ہوتی۔

۱۷ اکتوبر کو یونیورسٹی میں جشن منایا جاتا ہے۔ مختلف پروگرام ہوتے ہیں۔ عمارتوں پر چراغاں ہوتا ہے اور مضمون

طور سے ڈنر کا اہتمام ہوتا ہے۔ جس میں طلباء اور اساتذہ
بر وقت دسترخوان پر معہ متعلقین و مہمان خصوصی کے کھانا
تناول کرتے ہیں۔ یہاں کے علاوہ یہ جشن ہندوستان
کے مختلف شہروں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں بڑی
دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
ذرّات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکست فاش یہاں

یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہ گراں پر برسے گا
ہر سرو سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا غیروں کے چمن پر برسے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا۔

"اگر کوئی مذہب سچ ہے اور معتقد اس کو
خدا کی طرف سے جانتے ہیں تو ان کو یقین کرنا چاہیے
کہ اس میں باہم انسانوں میں محبت اور ہمدردی
پیدا کرنا سب سے بڑا فرض ہے۔ پس اگر اس
فرض کو ہمیشہ خیال میں رکھیں تو کسی مذہب سے
انسان کے دل میں بغض و حسد، کینہ پیدا نہیں ہو سکتا
ہمارا تو یہی یقین ہے اور اسی پر برتاؤ ہے"

"سرسید"

اترپردیش کے پندرہ مسلم گرلز انٹر کالجوں و ہائی اسکولوں میں

چون ہونہار طالبات کو شیروانی انعامات ۱۹۹۰ء

انوار اللہ

اگست میں اور ۵ ستمبر تک اترپردیش کے پانچ مسلم گرلز انٹر کالجوں اور دس مسلم گرلز ہائی اسکولوں کی چون ہونہار طالبات کے لیے الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ و جے انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے انعامات بھیجے گئے۔

ہر ایک اداروں میں دونوں بورڈ امتحانوں پر فرسٹ ڈویژن کے ساتھ اوّل پوزیشن حاصل کرنے پر دو سو پچاس روپیے انعام۔ دوسری پوزیشن حاصل کرنے پر ایک سو پچاس روپیے انعام اور تیسری پوزیشن پر سو روپیے انعام پیش کیا گیا۔

مسلم جوبلی گرلز انٹر کالج ـ کانپور

ہائی اسکول

۱ـ کماری فاطمہ زہرا سلمہا۔
۲ـ کماری تبسم آفاقی سلمہا۔
۳ـ کماری لمزارہ پروین سلمہا۔

انٹر

۱ـ کماری صبا کوثر سلمہا
۲ـ کماری زرینہ بیگم سلمہا
۳ـ کماری ریحانہ شکیل سلمہا۔

آل احمد گرلز انٹر کالج۔ امروہہ ـ ضلع مرادآباد

ہائی اسکول

۱ـ کماری فریدہ جمال سلمہا۔
۲ـ کماری ثمینہ خالد سلمہا۔
۳ـ کماری یاسمین کوثر سلمہا۔

انٹر

۱ـ کماری درخشاں شمیم سلمہا۔
۲ـ کماری گلنار بانو سلمہا۔
۳ـ کماری فوزیہ سعید سلمہا

کرامت حسین مسلم گرلز انٹر کالج لکھنؤ۔

ہائی اسکول

۱ـ کماری مجین سلمہا
۲ـ کماری نوتو پانڈے سلمہا
۳ـ کماری رشیدہ خاتون زیدی سلمہا

(انٹر)

۱ـ کماری آصفہ خاتون سلمہا۔
۲ـ کماری عائشہ جوہی سلمہا۔
۳ـ کماری وندنا گپتا سلمہا

بیگم خیر گرلز انٹر کالج۔ گاندھی نگر۔ ضلع بستی

ہائی اسکول

۱۔ کماری رینو مشرا سلہا۔
۲۔ کماری شویتا سری سلہا
۳۔ کماری آنل کماری سلہا

نیشنل گرلز انٹر کالج۔ شاہ جہاں پور

ہائی اسکول

۱۔ کماری شگفتہ پروین سلہا
۲۔ کماری گل زیب فاطمہ سلہا۔

پانچ کالجوں میں سے تین میں دونوں بورڈ امتحانوں میں تین تین ہونہار طالبات نے انعامات جیتے تھے یعنی بیگم خیر گرلز انٹر کالج میں انٹر میں کوئی فرسٹ ڈویژن نہیں۔ پانچویں یعنی نیشنل گرلز انٹر کالج میں انٹر میں کوئی فرسٹ ڈویژن نہیں اور ہائی اسکول میں بھی صرف دو فرسٹ ڈویژن ہیں۔

فیاض بیگم مسلم گرلز ہائی اسکول۔ بلند شہر

۱۔ کماری سونیا سولنکی سلہا
۲۔ کماری رخسانہ بیگم سلہا
۳۔ کماری شگفتہ بیگم سلہا

رفیع میموریل گرلز ہائر سکنڈری اسکول بسول۔ بارہ بنکی

۱۔ کماری ونیتا دیوی سلہا۔ ۲۔ کماری فرزانہ خاتون سلہا۔ ۳۔ کماری وینا دیوی سلہا

عالیہ گرلز ہائر سکنڈری اسکول۔ مئوناتھ بھنجن۔ اعظم گڑھ

۱۔ کماری سلمیٰ خاتون سلہا۔ ۲۔ کماری شگفتہ پروین سلہا
۳۔ کماری شہلا تبسم سلہا۔

حافظ محمد صدیق اسلامیہ گرلز ہائی اسکول۔ اٹاوہ

۱۔ کماری راشدہ خاتون سلہا۔ ۲۔ کماری تزئین انور سلہا
۳۔ کماری شمع پروین سلہا۔

ایچ۔ آر گرلز ہائی اسکول۔ خورجہ۔ ضلع بلند شہر

۱۔ کماری غزالہ پروین سلہا۔ ۲۔ کماری زہرہ نکہت سلہا۔ ۳۔ کماری کوثر پروین سلہا

نجیب الدولہ گرلز ہائر سکنڈری اسکول۔ نجیب آباد

۱۔ کماری منیفہ بانو سلہا۔ ۲۔ کماری عمرانہ خاتون سلہا۔ ۳۔ کماری نفیر پروین سلہا۔

دار العلوم نسواں ہائر سکنڈری اسکول۔ مئوناتھ بھنجن

۱۔ کماری نسیم بانو سلہا۔ ۲۔ کماری سیما بانو سلہا۔ ۳۔ کماری میرا بانو سلہا

زیب النساء اسلامیہ اسکول ملیترا روڈ۔ ضلع بلیا

۱۔ کماری ممتا در ما سلہا ۲۔ کماری شمع پروین سلہا
۳۔ کماری نرملا جیسوال سلہا۔

محمد یہ منکر نسواں ہائر سکنڈری اسکول۔ کانپور

۱۔ کماری انجم پروین سلہا۔ ۲۔ کماری صبا آفرین سلہا
۳۔ کماری نکہت عبید سلہا۔

عائشہ رشید گرلز ہائر سکنڈری اسکول

لار۔ ضلع۔ دیوریہ

۱۔ کماری رینا سلہا۔ ۲۔ کماری فریدہ جلال سلہا

تیسرا انعام دو طالبات میں تقسیم ہوا۔

۳۔ کماری شہناز پروین سلہا۔
۴۔ بے بی تبسم سلہا۔

اس طرح دس گرلز ہائی اسکولوں کی اکتیس ہونہار طالبات اور پانچ انٹر کالجوں کی تیرہ ہونہار طالبات کے لیے انعامات بھیجے گئے۔

اتر پردیش کے جن مسلم ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں کے پرنسپلز نے ابھی تک ۱۹۹۰ء کے نتائج نہیں بھیجے ہیں وہ اب براہ کرم علامہ جلد بھیج دیں۔

سکریٹری۔ بھارت سیوا ٹرسٹ
۱۲ اے۔ کناٹ پلیس۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

D. No .. Bldg. Dated ....

TENDER NOTICE

Sealed tenders on item rate basis are invited to be received on 9-2-91 upto 1.00 P M The tender will be opened on the same date at 3-30 P M Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during Office hours

Sale of tender forms will be stopped two days before the time for receiving the tenders

S.No	Name of work	Amount put to tender	Earnest Money	Cost of tender	Time of Completion.
1.	Providing & Fixing wooden desks and benches for Lecture Theatres for the Building of Faculty of Law & Commerce A. M U. Aligarh	2,27,530.00	5,690.00	100.00	Two mths

Based on DSR 1989

350 1000

(LT. COL. HASAN MUZAFFAR)
UNIVERSITY ENGINEER

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

D. No..... ....blg Dated ....

TENDER NOTICE

Sealed tenders on item rate basis are invited to be received on 31-1-91 upto 1.00 P.M. The tender will be opened on the same date at 3-30 P. M. Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during Office hours.

Sale of tender forms will be stopped two days before the time for receiving the tenders

S.No.	Name of work	Amount put to tender	Earnest Money	Cost of tender	Time of Completion.
1.	A/R to i) Medical College. ii) Genertor room Sub-Station. iii) Mourtury Building. iv) Police Post	1,24,695=00	3,120=00	20/-	upto 31-3-91
2.	A R to Engineering College.	1,44,695=00	3,620=00	20/-	upto 31-3-91

Based on DSR 1985

346 996

(LT. COL. HASAN MUZAFFAR)
UNIVERSITY ENGINEER

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSIT'
ALIGARH.

D. No............. Bldg. Dated............

TENDER NOTICE

Sealed tenders are invited to be received on 20-2-91 upto 1.3(P M The tenders will be opened on the same date at 3-30 P. M Tende documents can be obtained from the office of the University Enginee Building Department, Aligarh Muslim University Aligarh. on an working day during Office hours. (between 9 30 A. M. to 1 00 P M)

Sale of tender forms will be stopped two days bef re the tim for receiving the tenders.

S No.	Name of work	Amount put to tender	Earnest Money.	Cost of tender	Time o Comple tion
	Construction of R C C Overhead Reservior 230 K L. capacity 20 M Staging height	4,36,000,-	1,0900 -	100 -	8 month

Conditions:—

1. Tenderers should have carried out at least three such works, proof which should be given alongwith tender.
2. Tenderers should also submit Income Tax Clearance certificate alon with their tenders Other conditions and requirements will be provide with tender papers

362/1037

(LT. COL. HASAN MUZAFFAR
UNIVERSITY ENGINEER

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

D. No..............Bldg. Dated..............

TENDER NOTICE

Sealed tenders on item rate basis are invisted to be received on 5-2-91 upto 1.00 P M The tender will be opened on the same date at 3-30 P M Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during Office hours

Sale of tender forms will be stopped two days before the time for receiving the tenders

S No.	Name of work	Amount put to tender	Earnest Money	Cost of tender	Time of Completion
	Repairs & Reterracing in old Buildings Spectology Labs & others of physics Deptt Reterracing over roofs of Mesuem & other rooms of Zoology Deptt & Allama Shibli Hostel, M M Hall A M U Aligarh	Rs, 1,15 330/-	2,885 -	20,-	four mths

Estimates based on DSR – 1985

342/992

(LT. COL. HASAN MUZAFFAR)
UNIVERSITY ENGINEER

جلد ۱۰ — شمارہ ۳

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

مارچ ۱۹۹۱ء

سرپرست: ـــــ پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر و صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر: اسرار احمد

*

جوائنٹ ایڈیٹر: ـــــ کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: ـــــ شبلی جمالی

*

تزئین: ـــــ مفرانی

انچارج سرکولیشن: ـــــ مستقیم احمد

*

* * *

ترسیل زر کا پتہ:
ادارہ تہذیب الاخلاق پبلی کیشنز
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
Editor: TAHZIBUL AKHLAQ
& [illegible]
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ:
انڈیا ـــــ Rs. 45.00
بیرونی ممالک [illegible]
[illegible]

خط و کتابت کا پتہ:
چیف ایڈیٹر کبیر احمد جائسی
ادارہ تہذیب الاخلاق پبلی کیشنز
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یو۔پی)

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ ثقافت اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ ۔ پریس: ایس کے آفسٹ پریس دہلی۔

[redacted]

اداریہ

ہمارے ملک میں اخلاقی قدروں کا زوال جس تیزی کے ساتھ ہوا ہے اس کی مثال تاریخ کے شاید ہی کسی عہد میں مل سکے۔ اصول، قواعد، ضوابط، شرافت، مروت اور جواں مردی کے الفاظ جو کسی زمانے میں اخلاقی قدروں کو متعین کرنے والے تھے آج ان کے معنی صرف بدلے ہی نہیں ہیں بلکہ گزشتہ ادوار کے معانی کے بالکل برعکس ہو چکے ہیں۔ اب بے اصولی کا نام اصول، بے ضابطگی کا نام ضابطہ، طوطا چشمی کا نام مروت اور سازش کا نام جوانمردی ہو چکا ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو ہمارے جیسے عامی کسے گواہ کریں کس سے منصفی چاہیں؟

ہم کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ جو لوگ عوام کی سربراہی کرنے کے دعوے دار ہیں وہی سب سے زیادہ بے اصولی، بے ضابطگی، بے مروتی اور ناجواں مردی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ اخبار بین طبقے کو یہ بات ابھی اچھی طرح یاد ہوگی کہ مہینے سوا مہینے پہلے ایک ریاست کے گورنر صاحب پر کیا گزری؟ ایک عمر رسیدہ گورنر جن کی حال ہی میں بائی پاس سرجری ہوئی تھی، جب مقننہ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرنے آئے تو جو افراد حزب مخالف سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ موصوف پسینے سے تربتر ہو گئے۔ سانس قابو میں نہیں رہا اور وہ دھکے دیے گئے کہ اُن کی ٹوپی سر سے گر کر زمین پر آ رہی۔ اب سے پچاس سال پہلے کے "گورنر" اور آج کے صاحب بہادر میں کتنا فرق ہو چکا ہے۔ پہلے گورنر دوسروں کو بے کلاہ کیا کرتے تھے آج خود "بے کلاہ" کیے جاتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کرنے والے وہ لوگ ہیں جو ہماری سوسائٹی کی کریم کہلاتے ہیں۔ جب ان حضرات کے اصول، قواعد و ضوابط اور شرافت و مروت کا یہ نمونہ ہے تو اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نچلی سطح پر آج کیا حالت ہو چکی ہے۔ ہر طرف ایک انتشار ہے، صارفیت کی گرم بازاری ہے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کے مقولے پر عمل عام ہو چکا ہے۔ حصول مقصد کی راہ میں جو بھی اخلاقی قدر حائل ہوتی ہو اس کو عقلی و نقلی دلائل سے غیر اخلاقی قدر ثابت کرنے کا چلن اتنا بڑھ چکا ہے کہ "عقل حیلہ ساز" کا صرف یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرتی رہے۔

"تہذیب کا فرزند" اتنا بے تہذیب ہو چکا ہے کہ خود بے تہذیبی اس کو دیکھ کر ششدر رہے۔ اس کا اثر ہمارے پورے معاشرے پر پڑ رہا ہے۔ علم و ہنر کی کساد بازاری اب بھیانک شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ہر طرف "معیار" کا زوال ہے۔ علم و ہنر کے چراغ زمین بوس ہو چلے ہیں۔ مگر "تہذیب کا فرزند" ہے کہ "افلاک پروازی" کی ڈینگیں مار رہا ہے۔ اس صورت حال سے دوچار تو ہم سب ہیں اور ہم میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو اس صورت حال

کی سنگینی کا بھی احساس رکھتے ہیں اور اس پر کڑھتے بھی ہیں ملول و حزیں بھی ہوتے رہتے ہیں مگر ہم میں سے کسی میں بھی یہ ہمت باقی نہیں ہے کہ اس صورت حال پر صرف زبانی صدائے احتجاج ہی بلند کریں اور کھل کر [illegible] برے کو برا اور اچھے کو اچھا کہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذکورہ صورت حال کے خلاف لب کشائی کی جائے۔ اس کام کا آغاز اُن دانش گاہوں سے کیا جاسکتا ہے جہاں کی فضا قدرے مسموم ہوتے ہوئے بھی ایسی نہیں ہے۔ جہاں اب بھی "دیوانے" "قانون باغبانیٔ صحرا" لکھ رہے ہیں۔ جہاں اب بھی اصول' ضوابط' قواعد' مروت' شرافت اور جوان مردی کے کچھ نہ کچھ مظاہر سامنے آتے رہتے ہیں۔ جہاں اب بھی سودائے زیاں کرنے والے موجود ہیں۔ اگر چند دیوانے مل جل کر' ہم آہنگ و ہم آواز ہو کر اخلاقی قدروں کی زوال کی نشاندہی کرنا شروع کر دیں تو ممکن ہے کہ اُن کی آواز سننے والوں کا ایک ایسا طبقہ سامنے آجائے جو خود بھی اُن کا ہم آواز ہو کر صورت حال کو بدلنے کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ اگر اب بھی صورت حال کو بدلنے کے لیے منظم و متحد کوشش نہ کی گئی تو ہمارے معاشرے کا خدا ہی حافظ ہے۔

مخالفت

سر سید احمد خاں رح

دشمنی اور عداوت، حسد اور رنجش اور ناراضی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو خود اس شخص میں کینہ عادتیں اور رذیل اخلاق پیدا کرتا ہے اور بعوض اس کے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہنچا دے خود اپنا آپ نقصان کرتا ہے۔ اس انسانی جذبے کو ہم مخالفت کہتے ہیں۔

دشمنی اور عداوت کا منشاء اکثر اتلاف حقوق کے سبب سے ہوتا ہے۔ زن یا زر، زمین یا خون، اس جذبے کے جوش میں آنے کے باعث ہوتے ہیں۔ حسد کا منشا صرف وہ اوصاف حمیدہ ہوتے ہیں جو محسود میں ہیں اور حاسد ان کا خواہاں ہے مگر وہ اس میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ رنجش اور ناراضی اکثر باہمی معاشرت میں خلل واقع ہونے سے ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو بغیر ان سببوں کے جوش میں آتا ہے۔ اس کا منشا نہ زر و زمین و زن کی دشمنی ہوتی ہے اور نہ مخالف کے اوصاف حمیدہ کی خواہش ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ شخص اپنے مخالف کے اوصاف حمیدہ کو اوصاف حمیدہ ہی نہیں تصور کرتا اور نہ باہمی معاشرت کا خلل اس کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر ان دونوں میں ملاقات اور واقفیت بھی نہیں ہوتی بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کی مخالف رائے، یا عقل و سمجھ، دوسرے فریق کی رائے اور سمجھ سے مخالف ہوتی ہے۔

یہ جذبہ مخالفت قریباً کل انسانوں میں پایا جاتا ہے مگر مذہب اور تربیت یافتہ اور نیک دل آدمیوں میں اس کا ظہور اور طرح پر ہوتا ہے اور نا مہذب اور ناتربیت یافتہ، بد ذات آدمیوں میں اس کا ظہور دوسری طرح پر ہوتا ہے۔ پہلا اس مخالفت سے ہر قسم کے فائدے اٹھاتا ہے! اور دوسرا ان فائدوں سے بھی محروم رہتا ہے اور دنیا میں خود اپنے تئیں، بدطینت اور کذاب اور نامہذب ثابت کرتا ہے۔

دنیا میں یہ بات تو تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر، گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو، متفق ہو جائیں پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے! اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو چن لوں، اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں؛ اور جب کوئی ایسی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور ان غلطیوں کو اسی طرح برتتا ہے جیسے ایک دل سوز دوست برتتا ہے۔ کبھی کبھی طبیعت

کو تروتازہ کرنے کے لیے نہایت دلچسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے، اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے' اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہونچتا ہے۔

کینہ طبیعت اور نامہذب ناشائستہ آدمی یہ رستہ نہیں چلتا۔ وہ بات کے حسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی پر بحث کرنے لگتا ہے۔ سخت کلامی و زشت گوئی، سب وشتم اپنا پیشہ کر لیتا ہے۔ اپنے مخالف کے عیوب واقعی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے بہتان اس پر لگاتا ہے' اور سیکڑوں جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور خود مورد "لعنۃ اللہ علی الکاذبین" بنتا ہے۔

پس انسان کو چاہیے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی' نیکی اور نیک دلی کو کام میں لاوے، کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔

اعلانِ ملکیت

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قومیت: ہندوستانی

حصہ دار: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ایڈیٹر: پروفیسر اسرار احمد

قومیت: ہندوستانی

پرنٹر پبلشر: پروفیسر اسرار احمد

پریس: ایس۔ کے۔ آفسٹ پریس، دہلی۔

اشاعت کی مدت: ماہانہ

مقامِ اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ ثقافت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں۔

اسرار احمد

وہ مِس بولی

سید حامد ○

...ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب ہے تو اے عاشق قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے نہ خنجر ہے تو قصدِ خودکشی کیسا؟
یہ مانا درد ناکامی گیا تیرا گزر حد سے
کہا میں نے کہ اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو
منگا لوں گا کرایہ پر کوئی افغان سرحد سے

وہ دور بھی ختم ہو گیا جب سرحد سے کرایہ پر افغان منگانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ پاکستان کی دوسری ریاستوں میں یہ بن بلائے پہنچ گئے، اور اسلحہ کا استعمال اور کاروبار شروع کر دیا۔ اس میں برائی بھی کیا ہے؟ اسلحہ کو بے دریغ استعمال کر کے نہ دکھلاتے تو خریدتا کون۔ ترکیب استعمال بتائی بھی جا سکتی ہے، دکھائی بھی۔ بتلانے میں کوئی نقصان نہیں تو دکھلانے میں حرج کیوں ہو۔ دوکانداری کا دستور ہے کہ بانگی دکھا کر گاہک پیدا کیے جاتے ہیں۔ راقم سطور کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے جب چائے کو رواج دینے کے لیے گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچانے والی گرم چائے کے جرعے مفت بانٹے جاتے تھے تاکہ چائے نوشی کے کام و دہن پر چائے کا احسان رہے اور اسے اس کا چسکہ پڑ جائے۔ ایک بار چسکہ پڑ جائے تو شراب و مشروب کا رسنہ اٹھ جاتا ہے۔ پہلے تعاقب چائے کرتی تھی اب چائے نوش۔ ہر نشے کی یہی خو ہے۔ چاہے وہ شراب کا نشہ ہو چاہے حشیش کا، چائے ہے نشوں کی ردیف میں ان افزامات فائقہ کا بیسویں صدی جن پر ناز کرتی ہے اور نا آشناؤں اور کندہ ناتراشوں کے لیے جن کے نام یاد رکھنا اور ان کا صحیح تلفظ کرنا بھی سہل نہیں ہے۔ یہ ایک طویل فہرست ہے جس میں ہیروئن، ماری جوانا، ایل ایس ڈی، اسمیک، براؤن شوگر کے نام بار بار کانوں میں پڑتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک شاید بدنام زمانہ کوکین سے زیادہ مضر اور مہلک ہے۔ افیون کو تو یہ نشے چینیوں کی طرح پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ انہیں پر تو اشتراکی چین نے عرصۂ حیات اس طرح تنگ کیا کہ اپنے ملک سے تو اسے نکالا ہی اب ان کے ہمسایہ ملک میں وہ پہلے کی طرح آسانی کے ساتھ دائی اور اناؤں کو بچوں کو سلانے اور خاموش رکھنے کے لیے بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ شیر شاہ کی شہامت کو دنیا مانتی ہے مگر وہ شاید یہ نہیں جانتی کہ دیو قامت ہمایوں کی سب سے بڑی دشمن افیون تھی شیر شاہ سوری نہیں۔

○ سابق وائس چانسلر، اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ ———— ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

سو پیے تو انسان کا پالا نشوں سے پڑتا ہی رہتا ہے۔ نشے کی دو قسمیں ہیں: خارجی اور داخلی۔ خارجی نشوں میں شراب سرفہرست رہا کرتی تھی لیکن ڈرگ آشام اب صہبا کو اسی تحقیر کے ساتھ دیکھتے ہیں جیسے 'کاک ٹیل' میں شریک ہونے والے 'نیمہ پانی' یا چائے کو دیکھا کرتے تھے۔ تیز سے تیز تر کی تلاش نے دختر رز ٹھنڈائی اور چنیا ہان کا بازار ایک عنوان ٹھنڈا کر دیا ہے اور اُن ہوش ربا اور شخصیت سوز نشوں کے چلن کو عام کر دیا ہے جو ایک پل کی اُڑان کی قیمت زندگی بھر کی نقصان سے وصول کرتے ہیں۔

سرحد کے پٹھانوں کے بے بادہ گلگوں پر قدغن لگی ہوئی ہے۔ انھوں نے نعم البدل کے طور پر ٹکرنگ ہو بہا کر دل کو بہلایا۔ شان آغاز اس کی یوں ہے کہ وہ بسیں اور ٹرک چلاتے ہوئے آئے۔ کراچی کی سڑکوں پر انھوں نے بڑی غفلت اور بے دردی کے ساتھ بسیں چلائیں اور شان بے نیازی سے راہ گیروں کو روندتے ہوئے چلے گئے۔ آسمان سے جو بلا نازل ہوئی وہ انوری کا پتہ پوچھتی ہوئی آئی: چنانچہ مہاجرین کا واسطہ جن آفات ارضی و سماوی سے پڑا اُن میں یہ جفا پیشہ افغان ڈرائیور بھی تھے۔ تنگ آمد بہ جنگ آمد۔ بیچارے مہاجرین مجبوراً اور دفاعاً آمادۂ پیکار ہو گئے۔ افغان اور مہاجر میں سوال و جواب اور ترکی بہ ترکی کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کی جھلکیاں جابجا کراچی کی سڑکوں پر نظر آنے لگیں۔ اخوت اسلامی کی دھجیوں کے پرچم ہر طرف لہرانے لگے۔

اب آپ سوال کریں گے کہ مہاجرین کے ہنوز پا بجا ہونے کا مفہوم کیا ہے۔ ایک عارضی حیثیت کو رنگ دوام کیوں دے دیا گیا؟ ہندوستان میں دس پندرہ سال کے اندر شرنارتھی کی اصطلاح اس طرح متروک ہوئی کہ موجودہ نسل کے کانوں میں بھی یہ لفظ نہیں پڑا۔ پاکستان میں مہاجرین کا نقش مٹنے کے بجائے دن بہ دن گہرا ہوتا جا رہا ہے اور اس میں خون کی سرخی بھی شامل ہو گئی ہے۔ مہاجرین نے خود کو بھی کچھ الگ رکھا اور جب شیر و شکر ہونے کا وقت آیا تو اُن غریب الوطنوں کو دوسروں کے ساتھ شیر و شکر نہ ہونے دیا گیا۔ ان کو کوٹے کی الٹی چھری سے ذبح کیا گیا۔ ملازمتوں میں کوٹا عام طور پر حفاظت اور رعایت کے طور ہوتا ہے۔ ان کے لیے کوٹا جس ڈھنگ سے مقرر کیا گیا اس میں عداوت استغراق غالب تھی۔ اس کوٹے کی نوعیت منفی تھی۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر تقریباً بند کر دیے گئے۔ صلاحیت کی سزا انھیں دی گئی۔ صلاحیت کے علاوہ ایک اور قصور کی پاداش بھی انھیں بھگتنا پڑی۔ وہ قصور تھا تحریک پاکستان میں ان کی سرگرم شرکت، اس کے قیام اور تشکیل میں ان کا حصہ۔ خاموش منطق یہ تھی کہ پاکستان بنوا دیا، بہت اچھا کیا۔ یہ کس نے کہا تھا یہاں آکر بس جاؤ۔ ضرور تمہاری نیت میں کھوٹ رہا ہوگا۔ بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ تمہیں پاکستان کے قیام سے زیادہ آرزو تھی دیگر آزمائی کے مواقع کی۔ بیچارے ستائے گئے تو انھوں نے دفاعی کنارہ کشی اور علیحدگی اختیار کر لی۔ کبھی پنجابیوں نے ہجوم کیا، کبھی افغانوں نے۔ اور اس وقت یہ بیچارے سندھیوں کے ساتھ نبرد آزما ہیں۔

افغانوں نے اپنی مساعی جمیلہ اسلحہ کے کاروبار تک محدود نہیں رکھی۔ یاد رہے کہ بیسویں صدی کی چھوٹی بڑی سبھی لڑائیاں اسلحہ کے کاروبار کی رہین منت ہیں۔ بدنام بیچارے افغان ہیں جو امریکہ اور یورپ کے اسلحہ سازوں کے سامنے کسی شمار و قطار میں نہیں ہیں۔ انھیں ایسے ساز و سامان کی جستجو تھی جو اسلحہ سے بھی زیادہ فتح آور اور مہلک ہو اور وہ چیز انھیں مل گئی۔ وہ 'یوریکا یوریکا' کہتے ہوئے قلب پاکستان تک دوڑتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے خریطے میں جھانک کر دیکھیے تو اسلحہ کے شانہ بشانہ ڈرگ نظر آئیں گے۔ فنا اثر دونوں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلحہ شخص کو فنا کرتے ہیں، ڈرگ شخصیت کو۔ ڈرگ لینے والا شرابی سے زیادہ لائق تعزیر ہوتا ہے۔ پٹھانوں نے مہاجرین

بد حملے بیشتر کراچی میں اور کچھ حیدرآباد میں کیے گئے وکیلوں اور اسلحے۔ ڈرگس سے۔ انھوں نے پورے پاکستان پر یلغار کی۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس نشیلے زہر آور ناجائز تجارت کو روکے۔ ضیاء مرحوم کی جنھوں نے معاشرے کی اصلاح پر کمر باندھی تھی اور اخلاقی فساد کی بیخ کنی کی تھی۔ وہ بھی ڈرگ کے فتنے کی سرکوبی نہ کر سکے اور انھوں نے ایک ایسے شخص کو سرحد کا گورنر بنائے رکھا جو اس ناجائز کاروبار کا محور تھا۔ الغرض سرحد کے افغان کو دھندوں میں اُلجھا دیا گیا ہے اور اب اسے ضرورت نہ فرصت کہ کسی ناکام محبت کی داستان حیات کو پایان تک پہنچانے کے لیے کرایہ پر سرحد سے دوڑتا ہوا چلا آئے۔

خارجی نشوں کی تفصیل اور پاکستان کے ذکر میں اوراق کیوں سیاہ کیے جائیں۔ ہمیں تو اپنی ہی گتھیاں سلجھانا ہیں۔ داخلی نشوں کی بات کر کے ہم آگے بڑھیں گے۔ داخلی نشوں میں طاقت جمال، وجاہت، شباب، دولت، لیاقت (بعض اوقات علم اور زہد) کے نشے بھی شامل ہیں اور یہ سب انسان کو اعتدال توازن، انصاف اور انسانیت کی راہ سے ہٹا دینے کے لیے کافی ہیں۔ غور کیجیے انسان کے لیے مجبوریاں یوں ہی کیا کم ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خارجی اور داخلی نشوں کے رحم و کرم پر ڈال دے۔

دور کی بات ختم ہوئی اب قریب کی بات کیجیے۔ اس ماہ کے آغاز میں الٰہ آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ فضا میں یہ خبر گونج رہی تھی کہ وہاں کے کرسچین کالج کے پرنسپل کو صبح کے اجتماع میں (اسمبلی) کے دوران ایک شخص نے ہلاک کر دیا۔ پہلے پستول سے فیر کیا اور اتمام حجت کے لیے بم پھینکا۔ یہ پرنسپل اپنی منصفانہ سختی اور نظم پسندی اور علم دوستی کے لیے معروف تھے۔ انھوں نے چند سال کے اندر کالج کے معیار کو بہت اونچا کر دیا تھا۔ راقم سطور (بلکہ الٰہ آباد کے مسلمانوں) کی گردن شرم سے جھک گئی جب یہ پتہ چلا کہ قاتل مسلمان تھا۔ بعض

ہندوؤں نے تھوکا کہ مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بات ابھی تک نہیں کھلی کہ قتل کیوں کیا گیا۔ کیا اس لیے کہ قاتل کو کرایہ دے کر اس کام پر مامور کیا گیا؟ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا سابقہ بے علمی اور بے روزگاری کے ساتھ پڑا۔ یہ دونوں اخلاق و اطوار پر اثر ڈالتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں بہت سے مسلمان نوجوان ناامیدی اور بیکاری کی وجہ سے اوباشی اور غنڈہ گردی کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ مسلمان والدین بسا اوقات اپنی اولاد کی تربیت سے بے توجہی برتتے ہیں۔ یہ ان کا قصور ہے لیکن وہ محلے کے ماحول کو کیا کریں۔ اسے ٹھیک کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ گنجان محلوں سے نکل کر شہر کے حاشیہ پر آباد ہونے کی کبھی ہمت کرتے ہیں کہ کھلی ہوا میں سانس لیں تو فسادات انھیں پسپا کر دیتے ہیں۔ انھیں لوٹ کر گنجان اور گندے محلوں میں آنا پڑتا ہے اور کثرت کے ساتھ اُنھی گھروں میں رہنا پڑتا ہے جہاں نہ تازہ ہوا کا گزر ہے نہ روشنی کا، جہاں نہ علم کو بار ہے نہ دانش کو۔ جن لوگوں کو گندی بستیوں میں رہنے کی سزا ملی ہے ان کا چال چلن لامحالہ انھیں بستیوں کے سانچے میں ڈھل جائے گا ان کے خوش حال اور دانش پیشہ بھائی انھیں برا بھلا کہتے ہوئے یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اقدار و اطوار کی توقع وہاں بے محل ہے جہاں جان کے لالے پڑے ہوں، جہاں دو وقت کی روٹی ملنی دشوار ہو، جہاں غیرت اور عزتِ نفس کو ہیل و نہار نے روند ڈالا ہو جن کے تئیں اہل وطن اہل حکومت سے بھی زیادہ بے حس اور بے تعلق ہوں۔ "مسلمان اگر خود کو تباہ کر رہے ہیں تو کریں ہمارا کیا جاتا ہے۔" انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے پاس بچتا کیا ہے۔ ظلم، بے حسی اور بے دردی کا نقصان مظلوم سے زیادہ ظالم کو پہنچتا ہے۔ انسانیت جب چلی گئی تو رہا کیا۔ حکومت کا دھیان کبھی ان باتوں کی طرف نہیں جاتا۔ اسباب سے آنکھیں بند کر کے وہ نتائج کو الزام دینے لگتی ہے۔ الزام

ہی نہیں ان کی سزا بھی۔ گویا الزام دینے کے لیے کوئی ہونا چاہیے تاکہ ضمیر ہلکا رہے اور شبیہ روشن۔ خود مسلمان بھی اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ مایوسی ایک طرح کی بے فکری اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جو لوگ مسلمانوں میں پڑھے لکھے اور سوجھ بوجھ والے ہیں فرض تو اُن کا ہے کہ مل کر تنظیمی شکل میں عملاً تعلیم کا اہتمام کریں اور رہنے کے ماحول کو صاف ستھرا اور پرسکون بنانے کے لیے ہر ضروری تدبیر عمل میں لائیں۔ سیاست نے جلوس، ’عرضیاں‘، جلسے ہیں اور سطحی سیاست نے ان کے رہنماؤں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی ہیں۔ انھیں اس کا احساس تک نہیں کہ مسلمان کتنی تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف جا رہے ہیں اور اُن کے معاشرے کو اصلاحی، تعلیمی، ثقافتی اور تعمیری کام کی کتنی شدید ضرورت ہے

لیکن ان پڑھ مسلمان نوجوانوں کے ایک طبقہ میں چاقو زنی، اسلحہ آزمائی، کٹّہ برداری، غنڈہ گردی اور تشدد کے رجحان کے ذمہ دار صرف مسلمان نہیں ہیں۔ ہماری حکومت اور ہمارے اہلِ وطن بھی اس ذمہ داری میں برابر کے شریک ہیں۔ انھوں نے شاید محسوس ہی نہیں کیا کہ مسلمان بہ حیثیت ہندوستانی کے ان کے بھائی ہیں اور اس ملک میں، جو رشتوں کا بہت احترام کرتا ہے، ایک بھائی کو جہالت اور ستم زدگی کے تنور میں ڈال دینا یا جلنے دینا دوسرے بھائی کے لیے سرمایۂ افتخار نہیں ہو سکتا۔ اگر حکومت اور اکثریت ذمہ داری اور ہمدردی کے تحت مسلمانوں کے لیے کچھ کرنے کو تیار نہیں تو خود غرضی کے زیرِ اثر ہی کر ڈالے کہ امن و امان اور علم، شائستگی اور ترقی کا اجارہ نہیں ہو سکتا۔ پستی ہو کہ تاریکی جہالت ہو کہ بدامنی ان پر کوئی مصنوعی روک نہیں لگائی جا سکتی۔

مسلمان یوں بھی تعلیم کی طرف نہیں آتے کہ ان دنوں انھیں تعلیم سے کوئی زیادہ منفعت نہیں ملا، نہ انھیں امید ہے کہ انھیں تعلیم کی تکمیل پر ملازمت مل جائے گی۔ وہ کسی نہ کسی طرح روزگار سے لگ جائیں گے۔ اگر خود (بالخصوص شمالی ہندوستان میں) وہ اپنے اسکول کھولنے یا چلانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہر قدم پر انھیں، اربابِ اختیار کی طرف سے بہت مشکلات کے سامان دریادلی کے ساتھ فراہم کر دیے جاتے ہیں۔ عام اسکولوں کے نصاب میں بھی ایسا مواد بار بار چھپ چھپا کر داخل ہو جاتا ہے۔ جو یا تو اسلام یا مسلمانوں کے خلاف ہوتا ہے اور جو دین دار والدین کو اسکولی تعلیم سے بدظن کر دیتا ہے۔ حالات کا یہ عجیب طنز ہے کہ ہندوستانی مسلمان جو سید والا گہر کے عہد میں تعلیم سے جاگ گئے تھے اور جو کئی صوبوں میں تعلیمی اعتبار سے اپنے ہندو بھائیوں کے ہم قدم ہو چلے تھے، آزادی ملنے کے بعد تعلیمی پیش رفت کے بندھن سے بھی آزاد ہو گئے' اور 'بہ اعتراف سرکار' ان کی جگہ اب ہندوستانی کاروانِ تعلیم کے پچھلے سرے پر ہے۔

اور ان میں سے جو لوگ پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ روزگار کے دروازوں کو اپنے اوپر بند پاتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کے لیے افق پر سب سے بڑا سوالیہ نشان یہ ہے "روزگار نہ ملے تو کیا کریں؟" نوجوانوں کے لیے زیادہ تر دروازے بند ہو گئے ہیں، بس ایک دروازہ کھلا ہوا ہے: آوارہ گردی، تضیعِ وقت، بے روزگاری، جرائم پیشگی کا دروازہ اب کسی کو قتل کرانا ہو تو سرحد سے افغان بلانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں ایسے نوجوان مل جائیں گے جو ترغیب یا کرایہ پر کاروبارِ قتل و غارت کو بہ احسن وجوہ انجام دینے کی صلاحیت اور دعویٰ رکھتے ہیں۔ آپ انھیں اپنے ماتھے کا کلنک کہہ کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ

١۔ یہ راہ انھوں نے خود اپنے لیے نہیں چنی، وہ یہاں تک نہیں لائے گئے ہیں، اپنوں اور پرایوں دونوں کے ہاتھوں!

٢۔ انھیں عوام کی ہمدردی بھی حاصل ہے جو اپنے ہمارے آگے جو سے پڑھے لکھے لوگوں اور [illegible]

کو کائر اور نامرد سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس بے یقین اور بے مہر طبقے سے تشنہ لبی، عصمت اور سرد مہری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہونے کا۔ مصیبت کے وقت اور نیز فرصت میں یہ اپنے بلوں میں گھس جائیں گے۔ ایسے آڑے وقت میں یہی بدنام زمانہ جانباز پرواز طبع آزما نوجوان اسباب دفاع بن کر سامنے آئیں گے۔

ایسے زمانہ میں جب کہ باڑھ کھیت کو کھانے لگی ہے محافظ ہی مجرم بن گئے ہیں، پولیس کی عصبیت چشم زدن میں اقلیت دشمنی پر اتر آتی ہے، ان نوجوانوں کی افادیت اور اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے، یہ بات ہمارے لیے شرمناک ہے اور ارباب اقتدار کے لیے بھی۔ فوری دفاع کا یہ انوکھا انصرام اقلیت تک محدود نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران دونوں طرف سے یہی وہ لوگ بنتے ہیں جن کے سلسلے سے عام حالات میں بجا طور پر گریز کیا جائے۔

ایک جرم کسی کے دل میں جگہ کرے تو باقی جرائم بھی وہیں جمع ہو جاتے ہیں۔ چاقو اور پستول پر ہاتھ صاف ہو جائے تو اُن کی تجارت کرنے کیا دیر لگتی ہے اور اسلحہ کی تجارت شروع ہوئی تو شراب اور زہریلے نشے پیچھے کیوں رہنے لگے مثلث پورا جب ہوتا ہے جب ہتھیاروں اور نشیلے زہروں کے سوداگر بالا خانوں کو اپنی قلمرو میں لے آتے ہیں۔ دنیا بھر میں مافیا کی جولانگاہ اور ان کی منزل مقصود تکون ہے اس تکونے لشکر میں بھرتی وہی ہوتے ہیں جو اَن پڑھ ہوں اور بے روزگار رہیں۔ ہندوستان میں اس طبقے کا جہاں تک تعلق ہے مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اپنے پرائے اور سرکار بھی انھیں اس سمت میں دھکیل رہے ہیں، غافل اس سے کہ یہ زہر دلی تک، بدن میں سرایت کر گیا تو پھر نہ دلی محفوظ رہے گا، نہ اس میں رہنے والے۔ نا انصافی جلد یا بدیر پنپنا کے برگ و بار لاتی ہے۔ اس کا خمیازہ ہم اپنی سرحد پر کر رہے ہیں جہاں سرفروشی اور دہشت گردی میں کوئی حد فاصل باقی نہیں رہی لیکن دوسروں کی نا انصافی کو ہم بے عملی یا بد عملی کا جواز نہیں بنا سکتے۔ نا انصافی غیرت عمل کے لیے مہمیز کا کام بھی تو کر سکتی ہے۔ اتنی سی بات ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ جن لوگوں کے ہاتھوں سے پیش قدمی کی تحریکیں صدیاں گزریں مٹا دی گئیں، وہ ردِ عمل کی صحت کا تو اہتمام کر ہی سکتے ہیں۔ تعمیر خودکشی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، مذموم ہوتا ہے۔ وقت ہے خودداری خودسازی اور خود افزائی کا۔ اس کے لیے طویل خاموش صبر آزما، زہرہ گداز جتن درکار ہیں۔ خودسوزی خودشکنی اور خودکشی سے زیادہ آسان اور زیادہ خطرناک کام کوئی ہے ہی نہیں۔ کیا ہم اس کو چھوڑ کر اس کی طرف جانے پر راضی ہیں؟ کیا ہم خودکشی کے لیے اس قدر بے تاب ہیں جو عسکری کے بجائے تسکین ہم جوئی اور طالع آزمائی سے آتا ہے؟ کیا ہماری نگاہ میں ہیرو اب وہی ہے جسے ہیروئن سے سروکار ہو؟

" اگر دو آدمی ایک دوسرے کے دشمن
بن جائیں تو تمہارا وطیرہ ایسا ہو کہ اگر کل
ان میں صلح ہو جائے تو تمہیں شرمسار
نہ ہونا پڑے.

سعدی شیرازیؒ

آخری قسط

وہ دھادادی و دربائی ہنوز

ڈاکٹر ہادی حسنؔ

○ عبدالعزیز ملک

میں خیالات کی اس مد میں اور بہت سی مثالیں دینا چاہتا تھا۔ میرے پیش نظر اس وقت بعض معرکۃ الآرا تقریریں ہیں، بالخصوص کل ہند تاریخی کانگریس — Historical Congress — کا خطبۂ استقبالیہ اور خود ان کا مقالہ، لیکن فکر و قلم کی تیز گامی کی عناں گیری بھی ضروری اب ہے، اس لیے ان کے طرز خطابت اور اس کی اس سحر انگیزی کے مختصر سے جائزے کو رام پور حامد ہال میں یونین کی ایک رسم تلبیہ پر کی تقریر پر ختم کرتا ہوں۔ اسٹوڈنٹس یونین مسلم یونیورسٹی میں طلبا کی ذہنی تہذیب کا ایک اہم ادارہ ہے۔ انتخابات میں ہارنا جیتنا معمول کی بات ہے۔ یہ فکری زور آزمائی عام طور پر ہارے ہوئے امیدوار کے انتخابی مرحلہ — Electioneering — کے رسمی جنازے پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ شور و شغب فاتح امیدواروں کے مویدین کا ہوتا۔ رسم تلبیب میں طرفین دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ دونوں اپنے فکری تاخت میں اپنے ہاتھوں سے لگام چھوڑ دیتے اور یونین متنازعی اور متقاطع ذہنی دھڑوں کی جولان گاہ بن جاتی ہے۔ ہادی صاحب اس سال یونین کے نگراں تھے۔ چوں کہ یونین کی سرکاری زبان اردو ہے، اس لیے ہادی صاحب نے بھی جو کچھ کہا، اردو میں کہا۔ مجھے اس وقت بھی وہ سماں یاد ہے اور ان کے الفاظ بھی — فرمایا:

"ہمارے یہاں ایک عام شکایت یہ ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں معیار گر رہا ہے، نہ عالی قدر افراد پیدا ہو رہے ہیں اور نہ موثر مقررین لیکن اس وقت میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہ قوم میں قحط الرجال ہے اور نہ قحط المقررین۔"

یہ منظر دیدنی تھا۔ مسرت و انبساط کے اس ردعمل کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا، لیکن پینتالیس برس بعد بھی اسی شدت سے محسوس کر سکتا ہوں۔ خطابت کا وہی سیل رواں اور تحسینی شماروں کا وہی جوش و ولولہ۔

میڈیکل کالج کی تاسیس کی مہم ہادی صاحب کا ایک عظیم کارنامہ ہے، جسے مسلم یونیورسٹی کا کوئی دیانتدار مورخ نہ اسے جھٹلا سکتا ہے، نہ اس کی اہمیت کو کم کر سکتا ہے اور نہ ایک سپاس گزار مسلم قوم اس کی افادیت کو فراموش کر سکتی ہے۔ دانہ دانہ جمع کرکے انبار لگانا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لیے ایک شوریدہ سامان دل اور صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔

○ سی ۵/۴، ایل تیموریہ (شمالی ناظم آباد) کراچی، پاکستان

ایک دھن، ایک لگن اور اپنے مقصد کی صداقت پر یقین، پیدا کر [illegible] ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کے اندر ایسے صاحبِ فہم و ذکا خال خال نظر آتے ہیں، جو کسی بڑے مقصد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں، مگر علی گڑھ میں ایسے دیدہ ور ہر دور میں پیدا ہوتے رہے۔ سر سید، مولوی سمیع اللہ خاں، محسن الملک، وقار الملک، سر آغا خان سوم، نواب اسحٰق خاں، نواب مزمل اللہ خاں، والیانِ بھوپال، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر راس مسعود، جسٹس شاہ سلیمان، نواب اسمٰعیل خاں، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر حبیب، ڈاکٹر ہادی حسن اور بعض اور نابغۂ روزگار۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلم یونیورسٹی کی تعمیر میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ممکن ہے ایک انسان کی حیثیت سے ان میں بعض کمزوریاں بھی رہی ہوں اور یہ خالی از خطا نہ ہوں، مگر اس وقت مجھے ان سے سروکار نہیں۔ ان کا تجزیہ ان کا سوانح نگار کر سکتا ہے۔ میرے پیشِ نظر اس وقت وہ کارہائے نمایاں ہیں جو اُن کی دیوانگی مسلم یونیورسٹی کے لیے کر گئی۔

تجزیہ نگاری ایک فن ہے جس کی اساس علم اور دیانت ہے۔ ازمنۂ قدیم اور ماضی کے تجزیہ نگاروں کی بات اور ہے۔ ان کے ذرائع محدود ہوتے ہیں۔ ان کا انحصار ان ماخذ پر ہوتا ہے جو اُن کے احاطۂ علم میں آجاتے ہیں، لیکن معاصر تجزیہ نگاروں کے وسائل اس قدر محدود نہیں ہوتے جس پر تبصرہ کرنا مقصود ہے اگر وہ زندہ نہ ہو تو ایسے لوگ ضرور مل جائیں گے، جنہیں مرنے والے کا قرب حاصل رہا ہو یا اس نے اس سے اکتسابِ فیض کیا ہو لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکثر معاصرین تجزیہ نگار گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تنقید کرتے ہیں، مزید کھوج لگانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور نہ اس لغزش کو خود عملاً اصلاح کرتے ہیں جو ان کی نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ مثلاً شیخ اکرام نے موجِ کوثر میں علی گڑھ پر تبصرہ کیا ہے۔ شیخ صاحب کا ایک نام ہے، اس لیے اکثر فن نگار اسے حرفِ آخر سمجھ کر اس کا سہارا لیتے ہیں۔ میں نے بہ حیثیت ایک طالب علم اسے پسند کیا اور بہ حیثیت ایک معلم اسے کئی بار پڑھا اور پروفیسر عبد الغفور چودھری مرحوم ٹریننگ کالج علی گڑھ / لاہور) کی تحریر سے موازنہ کیا۔ چودھری صاحب مرحوم کے ساتھ میں نے لاہور میں برسوں کام کیا۔ ان کی تحریریں جو علی گڑھ میگزین میں چھپ چکی ہیں، ان کی اپنی وابستگی نمایاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ صاحبِ موجِ کوثر کبھی علی گڑھ تشریف نہیں لے گئے۔ انہوں نے کسی نقدِ معتبر سے علی گڑھ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور اگر کی ہے تو یہ ان کے اپنے اندر کا ذہنی تحفظ ہے، جو اپنے تجزیوں، انصاف کے تاریخی تقاضوں کو پھلانگ گیا۔ میں نے اپنے مضمون "سر سید اور وکٹوریہ کا مجسمہ" میں حسبِ ضرورت صحیح صورتحال کی عکاسی کی ہے۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ موجِ کوثر کے ابہام کو دور کیا جائے۔

بات سر سید اور علی گڑھ تک پہنچ گئی لیکن ہادی صاحب یا وہ لوگ جنہوں نے علی گڑھ سے اکتسابِ فیض کیا یا وہ جو فیضان کے اس سرچشمے سے سیراب ہوتے رہیں گے، وہ سب علی گڑھ کا ایک جزو ہیں۔ سر سید کے اہم ترین رفقاء میں مولوی سمیع اللہ خاں کی شخصیت بڑی پاسدار اور متنوع تھی۔ انہوں نے ٹرسٹی بل پر سر سید کی زور دار مخالفت کی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اب رفاقت رنجش میں بدل رہی ہے تو وہ اپنا دامن سمیٹ کر الہ آباد چلے گئے اور اپنی زبان سے ایک بھی ناروا لفظ سر سید کے خلاف نکالنے سے احتراز کیا۔ چاہتے تو وہ ایک رستخیز برپا کر سکتے تھے، جس سے جواب در جواب کا سلسلہ چل پڑتا مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ اس کا مثبت عملی جواب دیا۔ علی گڑھ کا درد اُن کے دل میں رہا، لیکن انہوں نے الہ آباد میں مسلم

بورڈنگ ہاؤس ([illegible]) کی بنیاد ڈالی۔ یہ ادارہ ان کی مساعی کا شاہکار ہے جو ہنوز الہ آباد یونیورسٹی میں مسلمان طلبا کی ذہنی تعمیر میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے معماروں میں ڈاکٹر ہادی حسن کو ایک موقر مقام حاصل ہے۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

"جسٹس سر شاہ سلیمان اور ڈاکٹر ضیاء الدین نے انجینیرنگ کالج کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈاکٹر ہادی حسن کی کوششوں نے میڈیکل کالج کے قیام کو یقینی بنادیا۔ اگرچہ قیام پاکستان کے بعد بعض مصالح کی بنا پر کالج کو پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نام کے حق دار یہی دونوں بزرگ تھے۔"

(علم و آگہی۔ کراچی۔ افکار و تحریکات علی نمبر ص ۱۲۹)

میری خالہ کے ایک پوتے عقیل فاروقی نے جو علی گڑھ میں چھ برس رہا اور معاشیات میں ایم اے کیا، مجھے بتایا کہ میڈیکل کالج سے متعلق ایک ہال کا نام ہادی حسن ہال ہے۔ مجھے اس کی عدم صحت پر یقین نہ رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹی کے بست و کشاد کا یہ بڑا معمولی اعتراف ہے۔ اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ یونیورسٹی کے کارپردازوں سے کہوں کہ سیاست اور اقتدار کے اتار چڑھاؤ کو دوام حاصل نہیں۔ اگر اکبر اور شاہ جہاں پردۂ خفا میں چلے گئے ہیں تو ہر سیاسی دور بھی اپنا دور پورا کر کے پردۂ خفا میں چلا جائے گا، اس لیے کہ قدرت کا یہی اصول ہے لیکن علم اور عالم اور اس کے کارنامے نمایاں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں آج لٹن ([illegible]) اور اسٹریچی Strachey نیم زندہ نام ہیں مگر اس دور کے شبلی کا نام زندہ ہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت کے حامل تھے جو علی گڑھ کی تاریخ میں ایک زندہ حقیقت ہے۔ آج جن کے ہاتھ میں یونیورسٹی کی عنان ہے وہ اپنی مصلحت کوشی یا مداہنت سے ضیاء، ہادی کے کارناموں پر پردہ ڈال سکتے ہیں لیکن ان دونوں مردانِ نبرد کی ارواح میڈیکل کالج کی ایک ایک اینٹ میں سکون آرا نظر آتی ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ایگزیکٹیو کونسل اور کورٹ کا کوئی رکن اپنی جرأت کا مظاہرہ کرے اور اس کالج کا نام ہادی۔ ضیاء یا ضیاء۔ ہادی کر دے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی دیوانہ اس دیوانگی کا مظاہرہ کرے تو اس کی آواز میں اور دیوانوں کی آوازیں شامل ہو جائیں گی۔ اگر یہ آواز اٹھی تو حق داروں کو ان کا حق مل جائے گا ـــــــ کیا مستقبل قریب میں ایسا ہو سکتا ہے؟ بظاہر اس کا دور دور امکان نہیں ہے۔ پھر بھی حق بہ حق دار رسید کی کوشش ایک مثبت راہ عمل ہے۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کا ایک جملہ ہے کہ :

"گھٹ گھٹ کیے جاؤ کچھ ہو ہی جائے گا۔"

کیا عجب کہ کوئی معجزات آزما یہ کام کر جائے

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

پاکستان میں مغرب نواز یا روس پرست یا زمین پرست یا علماء کا ایک طبقہ قیام پاکستان کی نئی نئی تاویلات پیش کرتا رہتا ہے مگر وہ کسی طور پر علی گڑھ کے کردار کو تاریخ کے صفحوں سے نہ مٹا سکا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی ایک بیٹی نے ڈاکٹر ضیاء الدین اسپتال قائم کر کے ان کی یاد کو زندہ رکھا ہے۔ راس مسعود کی اولاد یا ان کے مداحوں نے راس مسعود کلینک قائم کی۔ اب کراچی کی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے ایک اسکول اور ایک ہال ہٹلنگ کی

کو بنیاد ڈالی۔ جناب الحاج الحق سابق ڈائرکٹر ٹکنیکل ایجوکیشن اس کے روح رواں ہیں۔ علی گڑھ شہر کے رہنے والے ہیں۔ زندہ دل آدمی ہیں۔ ان سے میرے روابط پرانے ہیں یعنی از لاہور تا کراچی بیگی ہادی حسن ہنوز آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو میں عارضاً (temporarily) پنجاب یونیورسٹی لاہور سے وابستہ تھا۔ پاکستان ٹائمز لاہور میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی کہ علی گڑھ کے پروفیسر ہادی حسن کا انتقال ہو گیا۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ایک ہفتہ بعد سید محمد عالم کو جو اس وقت گورنمنٹ کالج میاں والی میں انگریزی پڑھاتے تھے، ایک مختصر سا خط لکھا:

لاہور
یکم جون ۱۹۶۳ء

بھائی عالم

ہادی صاحب کے ارتحال کی خبر پڑھ لی ہوگی مجھ پر جو گزری سو گزر گئی۔ تم بھی ان کے معتقدوں میں رہے۔ تمہاری پاسداری اُن کا مزاج تھا۔ سوچتا ہوں کہ علم اور خطابت پر جو بیلاڈ قوٹا وہ اپنے بار الم سے زیادہ ہے۔ اقبال نے داغ کے لیے لکھا تھا کہ

اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

یہ مصرع ہادی صاحب پر بھی صادق آتا ہے پاکستان میں ان سے اکتساب فیض کرنے والے سیکڑوں بلکہ ہزاروں ہوں گے۔ کسی نے ایک حرف نہیں لکھا۔ اخبار اور رسایل انجمن ستائش باہمی کا رول ادا کر رہے ہیں صحافی اور دانش ور بیوروکریٹ سے زیادہ کور ذہن ہیں۔ مخصوص لکھنے والے اور مخصوص چھاپنے والے۔ ہم جیسے محمد سوں تک رسائی نہیں کر اپنے دل پر جو چوٹ لگی ہے اسے کہیں دکھایا جاے۔ اب اخبار کو کیا معلوم کہ وہ چند نفس اور غضب تھا اور اپنی نوعیت میں اس قدر منفرد کہ اس کے ہم عصر اُس کی مدح کو نہ پہنچ سکے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعمیر کے لیے گلی گلی کوچہ کوچہ پھرا۔ مسلمان نوجوانوں کی شخصیت کی تعمیر میں ایک نمایاں حصہ لیا اور اپنی زندگی ہی میں اپنے مقاصد حیات کو پورا کر گیا۔ وہ شگفتہ مزاج، خوش رو، سادہ لباس، بذلہ سنج اور پیری میں بھی جوان اُن بونوں سے کہیں زیادہ قدآور تھا جو اخبار کی شہ سرخیوں کی زینت بنتے رہتے ہیں مگر کیا ہادی صاحب کو اس کی ضرورت ہے؟ میرا خیال ہے نہیں یہ میرا ایک توہم یا خواہش ہے۔ انھوں نے تو موت سے بھی آنکھیں ملا کر بات کی ہوگی اور کہا ہوگا کہ اے فرشتۂ اجل تم آرام کرو میں خود فیصلہ کروں گا۔ تم دو جہاں پر نظر ڈالی ہوگی۔ محسوس کیا ہوگا کہ نہ وہ باغ نہ وہ بہار اور نہ وہ ہم صفیران چمن تو زیر لب یہ کہتے ہوے رخصت ہو گئے ہوں گے کہ

دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

ڈاکٹر اسد علی کو امریکہ اطلاع دے دی ہے اس وقت تم سے ایک آخری بات۔ کیا ہم بھی اپنی زندگی یا بعد از مرگ اس معیار پر پورا اتر سکیں گے؟ ہادی صاحب تو اپنے ساتھ ایک عہد کو لے کر رخصت ہو گئے۔

سوگوار
عبدالعزیز

اس کے بعد بہت کچھ تلپٹ ہو گیا۔ عالم میاں والی

کالج کے پرنسپل تھے، مگر موت نے مہلت نہ دی۔ ڈاکٹر اسد امریکہ میں منتقل ہو چکے ہیں۔ کالج میں میری طرح اور بھی ہمکار وہاں کے بڑے عہدے دار موجود ہیں، لیکن ان پر دنیا سوار ہے۔ ڈاکٹر سروری کی عمر اسی کے لگ بھگ ہے اور میں دل کا مریض۔ ہادی صاحب کے چراغ کو لے کر آگے بڑھنا شاید اور کسی کے نصیب میں ہے۔ میرے بیٹے کے دانش ور خسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بتایا ہے کہ علی گڑھ میں ہادی صاحب پر کچھ کام ہوا ہے، جس کا مجھے علم نہیں۔ سوچتا ہوں کہ اپنے ہمدم دیرینہ پروفیسر احمد علی سے خواہش کروں یا ارشاد یا ابن سعید پٹھان کو یاد دلاؤں یا نیر مسعود کو کہ یہاں ہادی صاحب پر جو کچھ چھپا ہوا ہے بکھرا ہوا ہے

ان کی مطبوعات کو پڑھنے کا تو یہ سرسری
بھی کر ذہن کے روشن
میں در آئے گی۔

- دنیا میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر، گو وہ کیسی ہی صحیح سچ ہو، متفق ہوں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو چن لوں اور اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں اور جب ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور ان غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے جیسے ایک دلسوز دوست بتاتا ہے۔ کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لیے نہایت دلچسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

سر سید

نرسری اسکول میں تعلیمی پروگرام

محمد شریف خان ◊

ہمارے ملک میں یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ بچوں کو جلد جلد اسکول میں داخل کر دیا جاتا ہے اور پھر اس میں جلدی کی جاتی ہے کہ ان کو لکھنا اور پڑھنا سکھانا شروع کر دیا جائے۔ اس سے بچوں کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اول تو اس بات کی ضرورت ہے کہ تین سال سے قبل بچوں کو اسکول میں داخل نہ کرایا جائے۔ دوئم روزانہ مندرجہ ذیل پروگرام کے تحت نرسری درجات میں تعلیم دی جائے۔

نرسری اسکول کی استانیوں کو بچوں کے اسکول پہنچنے کے وقت سے ایک گھنٹہ قبل اسکول پہنچ جانا چاہیے۔ تاکہ جو بچے وقت سے پہلے بھی آ جائیں ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے استانی موجود رہیں۔ ایک استانی کو اسکول کے دروازہ پر موجود رہنا ہونا چاہیے۔ بچے کو استانی کو سلام علیکم کرنا چاہیے۔ استانی کو وعلیکم السلام کہنا چاہیے۔ جو بچے پہلے آ چکے ہوں ان کو بعد میں آنے والے بچوں کو سلام بھی کرنا چاہیے اور خیریت بھی معلوم کرنا چاہیے۔ استانی کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ بچے خوش و خرم ہوں اور بیمار نہ معلوم ہوتے ہوں۔

بچوں کو اس کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی کلاس میں جا کر کھلونوں اور دیگر اشیاء سے کھیلیں۔ استانی کو طلبا سے گزشتہ دن کی کارگزاری پر گفتگو کرنی چاہیے۔ ان کو بچوں سے معلوم کرنا چاہیے کہ کل انھوں نے کیا کیا، کہاں کہاں گئے، کن دوستوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کی۔ ان سب سوالات کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ اپنی بات درست زبان میں ادا کر سکیں۔ بچے اس بات کا بڑا شوق رکھتے ہیں کہ ان کے بھائی بہنوں کے بارے میں بات کی جائے۔ ان سے یہ معلوم کیا جائے کہ ان کے بابا ان کے لیے کیا چیزیں خرید کر لائے۔ انھوں نے راستے میں کن کن چیزوں کو دیکھا۔ بچوں میں یہ ذوق بھی پیدا کیا جائے اور فروغ دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں بات کریں تاکہ معاشرتی ترقی ہو سکے۔ ان بچوں کی طرف خصوصی توجہ دی جائے جو شرمیلے ہوں۔ استانی کو ایسے بچوں کی تعریف کر کے ان کو باتوں میں لگانا چاہیے اور ان بچوں کے خاندان کے افراد کی بات چیت ان بچوں کے ساتھ کرنی چاہیے۔

اس کے بعد تمام بچوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کرنا چاہیے وہ چاہے کوئی بڑا کمرہ ہو یا اسکول کا کھلا میدان۔ ان بچوں کے سامنے قرآن کی کوئی سورہ پڑھی جانی چاہیے۔ اس کے بعد ہر کلاس کو اپنی استانی کے پاس ایک دائرہ میں کھڑا ہو جانا چاہیے اور باری باری سے گیت یا کھیل کا پروگرام ہونا چاہیے۔ بچوں کے اجتماعی پروگرام متوازن ہونے چاہییں

◊ پروفیسر شعبۂ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں جسمانی، دماغی، سماجی، جذباتی اور اخلاقی صلاحیتوں کو فروغ دینا چاہیے۔ بچوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے استانیوں کو ان میں کچھ نیا پن ہر روز لانا چاہیے۔ شروع کے ایک گھنٹے کی بڑی اہمیت ہے اس کی وجہ سے اسکول کی شہرت عام ہو سکتی ہے کیونکہ بیشتر سرپرست جو بچوں کو اسکول چھوڑنے آتے ہیں وہ کچھ دیر اسکول کے باہر اس لیے ٹھہرتے ہیں کہ وہ دیکھ سکیں کہ ان کے بچے اسکول میں کیا کرتے ہیں۔ اسکول کی تمام استانیوں کو ان پروگراموں میں شریک ہونا چاہیے ایک کلاس سے دوسری کلاس کے مقابلے کرانے چاہئیں مثال کے طور پر فرش پر مختلف چیزوں کے کھلونے ڈال کر مختلف کھیل کھیلے جا سکتے ہیں جن پر نمبر دے کر ٹیم کی ہار جیت طے ہو سکے۔

ہر اسکول میں ایک بینڈ ہونا چاہیے جس پر بچوں کو کھیلنا اور گیت گانا چاہیے۔ بچوں کو مختصر وقت کے ڈرامے بھی کرنے چاہئیں تاکہ لسانی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ استانی کو ڈرامے پر ایسے سوالات پوچھنا چاہیں جس سے بچوں میں کچھ اخلاقی قدریں فروغ پا سکیں۔ بچوں کو ایسے کھیل بھی کھلانا چاہیے جن میں ان کو تیزی سے ایکشن کرنا ہو اور ان کو بینڈ بند ہوتے ہی یک لخت رُک جانا ہو۔

زبان سکھانے کے لیے استانی کو کہانی سنانا چاہیے یا کسی بکس یا تھیلے میں کوئی چیز چھپا کر رکھ دینے کے بعد اس پر سوالات پوچھنا چاہیے کہ اس میں کیا ہے۔ اس سے بچوں میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اس کہانی یا سوال و جواب سے بچوں اور استانی میں بہت بات چیت ہو گی استانی اس ذریعے سے کچھ نئے الفاظ سے بچوں کو واقف کرا سکیں گی۔ کچھ بصری امدادوں سے کچھ لفظوں کا پڑھنا بھی سکھایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کھلونے، پوسٹر اور تصویریں بھی استعمال کی جا سکتی ہیں۔ سبق کو اور زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے کھیل بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں

استانی کارڈوں پر چیز کی تصویر چپکا کر اور چیز کا نام لکھ کر بچوں سے اس کی آواز اور ادائگی کی مشق کرا سکتی ہیں۔ اگر کہانی کا استعمال کیا جائے تو اس کے لیے پانچ یا چھ پوسٹر تیار کیے جائیں۔ یہ پوسٹر رنگین ہوں اور ان کو تختۂ سیاہ پر انہیں ترتیب سے لگایا جائے جو کہانی کے واقعات کی ترتیب ہو۔ اس کے بعد استانی ان پوسٹروں کو تختۂ سیاہ سے علیحدہ کر دے اور ان کی ترتیب بگاڑ دے اور بچوں سے ان کو ترتیب سے لگانے کے لیے کہا جائے۔ نئے الفاظ کو بڑے بڑے حروف میں تختۂ سیاہ پر لکھا جائے اور ہر لفظ کی تصویر اس لفظ کے برابر بنائی جائے۔ کچھ بچے اس بات کی کوشش ضرور کریں گے کہ ان الفاظ کو اپنی کاپی میں نقل کریں جو ایسا نہ کریں ان کو ایسا کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ ان کو تصویر بنانے کو کہا جائے جو تصویر بھی نہ بنا سکتے ہوں ان کو بنی ہوئی تصویر دی جائے اور اس میں رنگ بھرنے کو کہا جائے۔ استانی اس دوران بچوں کے پاس گھومتی رہیں اور ضرورت پڑنے پر ان کی مدد بھی کریں۔

اس کے بعد بچوں کو ناشتہ دیا جائے۔ اس وقت بچوں پر نظر ضرور رکھی جائے مگر بچوں کو آزادی بھی فراہم کی جائے۔ اتنا وقت ضرور دیا جائے کہ سب بچے اپنا ناشتہ تسلی سے کھائیں مگر استانی اس وقت ناشتہ نہ کریں۔

ریاضی سکھانے کے لیے بھی جدید بصری امداد کا استعمال کیا جائے۔ ان میں گنتی کرنے، وزن کرنے اور ناپنے کے لیے مختلف چیزیں تیار کی جائیں یا تیار شدہ بازار سے خرید لی جائیں۔ ریاضی کی سمجھ بڑھانے کے لیے ایسی جگہوں پر بچوں کو لے جایا جا سکتا ہے، جہاں بچوں کی لسانی، سماجی، سائنٹفک اور جسمانی صلاحیتوں کو بھی بڑھایا جا سکتا ہے مثلاً سمندر، بازار، جنگل وغیرہ میں ایسی چیزیں بچوں

کو دکھائی جاسکتی ہیں جن میں گنتی، وزن، پیمائش، شکل اور رنگ کے سبق دیے جاسکیں۔

گانا سکھانے کے لیے بچوں کو گانے کے کمرے میں لے جایا جائے جہاں پر گانے کی استانی بچوں کو حب الوطنی کی نظمیں اور قومی ترانہ کی مشق کرا سکتی ہیں۔ اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ جس قسم کی مشق کرائی جائے ویسا ہی ماحول گانے کے کمرے کا کیا جائے تاکہ بچے اچھی طرح لطف اندوز بھی ہو سکیں اور صحیح ماحول سے واقف بھی ہو سکیں۔

بچوں کو اسلامی تربیت دینے کے لیے کلمے سکھائے جائیں اور کورس میں یاد کرنے کی مشق کرائی جائے۔ اس کے بعد کلاس میں بچوں کو پھل، بسکٹ اور ٹافیاں بھی کھانے کو تقسیم کی جائیں۔ ان چیزوں کو کھا لینے اور ہاتھ دھونے کے بعد گھومنے کی کچھ آزادی دے دی جائے۔

ماحولیاتی مطالعہ کا بھی سبق دینا ضروری ہے جس میں "اپنا گھر" سے شروعات کی جاسکتی ہے۔ گھر کی ضروری اشیاء کے صحیح صحیح نام یاد کرائے جائیں اور ان چیزوں کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے کے طریقے سکھائے جائیں۔ اس سبق کا خاص مقصد بچوں کو اپنی سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانا ہے۔

بچوں کو اسکول کی لائبریری میں لے جایا جائے جہاں ان کو رنگین تصاویر کی کتابیں دی جائیں اور ان کو تصویروں کے ذریعے پڑھنے دیا جائے۔ بچوں کو کتابیں پڑھنے کے بعد ایک دوسرے سے بدلنے کے لیے بھی ترغیب دی جائے۔ ایک وقت میں ایک بچّے کے پاس ایک کتاب بھی فراہم کی جائے۔ ایک کہانی بہ بہ تصاویر کی کتاب بچوں کو دی جائے اور سب بچوں کے پاس ایک ہی کتاب ہو۔ استانی اس کہانی کو پڑھتی جائیں اور بچے کہانی کو تصویروں میں دیکھتے جائیں۔ اس کے بعد کچھ بچوں سے وہ کہانی سنی جائے جس کو تمام باقی بچّے سنیں۔

دن کی چھٹی سے قبل بچوں کو اپنے کلاس کے کمرے میں لایا جائے اور ان کے سرپرستوں کے ساتھ واپس جانے دیا جائے۔

اس پروگرام سے بچوں کی تعلیم کو دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔

"اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے کہ افسوس کہ ہم نے یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا! اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں۔"

(سرسیدؒ)

مسلم فلاسفی کا سرچشمہ

شبیر احمد خان غوری ◇

مسلم فلاسفی بالخصوص اس کے اس مصداق کا مبدأ و ماخذ جو برصغیر میں متداول رہا ہے اور خود چوتھی صدی ہجری کے بعد سے ایران، ترکی اور وسط ایشیا میں تدریسی و تعلیمی سرگرمیوں کا موضوع رہا ہے۔ اظہر من الشمس ہے مگر بعض ایرانی دانشور اس کے جملہ شعبوں کو قرآنی الاصل بتانے پر مصر ہیں۔ چنانچہ Aligarh Journal of Islamic Thought کے شمارہ ۱۹۸۹ء میں پہلا مقالہ جو Post Ibn Rushd Islamic Philosophy in Iran کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اسی تحکمیت و ادعائیت سے شروع ہوتا ہے۔

Muslim Philosophy contrary to the views which search its roots in various non-Islamic philosophies and trace their impact on the Muslims owes its origin to the QURAN and the Traditions of the PROPHET" (Salla lahu Alaihe wasallam)

مگر فاضل مقالہ نگاروں نے نہ تو یہ بتانے کی زحمت فرمائی کہ

(۱) یہ مسلم فلاسفی قرآن و حدیث رسول سے کس طرح ماخوذ و منتزع ہے؟ اور نہ

۲۔ اُن مخالف رایوں کے ساتھ کوئی ادنیٰ سا مکالمہ کیا جو اس نظامِ فکر کو غیر اسلامی فلسفوں سے ماخوذ بتاتے ہیں۔

اس ادعا کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ صدرِ اول کے مسلمانوں کا تعلیمات اسلام پر ایمان محکم ایک ذہنی و علمی تلاش و جستجو اور آزادانہ تحقیق کی شکل میں منتج ہوا جس کے اظہار نے تین فکری سرگرمیوں کا راستہ اختیار کیا۔ یعنی کلام، حکمت اور عرفان کا اور ان تینوں سرگرمیوں کا سرچشمہ قرآن ہے۔ فرماتے ہیں:

The chief source of these three branches ..... is none other than Quran.

اس عاجز کا خیال ہے کہ یہ رائے کلام کے بارے میں تفصیل طلب ہے، حکمت یا فلسفہ کے بارے میں قطعی طور پر ناقابلِ تسلیم اور عرفان و تصوف کے سلسلے میں متنازع فیہ

علم کلام کا آغاز و ارتقا

کلامی سرگرمیوں کی بقول علامہ تفتازانی دو منزلیں ہیں

◇ سر سید نگر، علی گڑھ، یو۔پی۔

کلام القدماء اور کلام المتاخرین۔

پہلی منزل میں یہ سرگرمیاں اور ان سے متعلق بحث و مباحثہ مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان محدود تھا۔ موضوع بحث چار مسئلے تھے:

امامت، ارجاء و وعید، جبر و قدر اور مسئلہ صفات باری (جس نے آگے چل کر قرآن کریم کے غیر مخلوق یا مخلوق ہونے کی شکل اختیار کرلی)۔

امامت کا مسئلہ یہ تھا کہ جناب نبی کریمؐ کے بعد ان کا جانشین کون ہو۔ اس کی عملی (قانونی) شکل یہ تھی کہ اسلامی مملکت کا سربراہ کون ہو۔ اس میں کیا صفات ہونا چاہیں اور اس کے تقرر کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعض رد کی نامزدگی یا جمہوری انتخاب۔

اور ارجاء و وعید کا مسئلہ جنگ صفین کے بعد پیدا ہوا جب کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رائے عامہ سے مجبور ہو کر تحکیم ([illegible]) کو مان لیا مگر بعد میں ایک جماعت اس کے خلاف ہوگئی اور کہنے لگی کہ تحکیم کو مان کر ہم نے گناہ کیا اور کافر ہو گئے۔ اس کی عملی (قانونی) شکل یہ تھی کہ کیا ارتکاب گناہ کبیرہ کے بعد مومن دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یا پھر بھی مسلمان بنا رہتا ہے۔ شق ثانی "ارجاء" کہلاتی ہے اور شق اول "وعید"۔

جبر و قدر کا مسئلہ عہد صحابہ کے آخر میں پیدا ہوا کہ آیا بندہ خود اپنے افعال کا خالق ہے یا اللہ تعالیٰ۔ پہلی شق "قدر" کہلاتی ہے اور دوسری "جبر"۔

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں قرآن کریم کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ پیدا ہوا، جس کے لیے ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ یہ یہود کے یہاں سے آیا۔ بعد میں اس نے زیادہ عمومی شکل اختیار کرلی کہ آیا ذات باری تعالیٰ صفات ثبوتیہ سے بھی متصف ہے یا نہیں؟

ہر مسئلہ میں مختلف رائیں تھیں اور ہر رائے کے قائلین اپنے مسلک کی تائید کے لیے قرآن کریم سے استشہاد کرتے تھے۔ اس طرح علم الکلام القدماء کو ایک حد تک قرآنی الاصل کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ہر رائے کے قائلین مخالف رائے کو غیر اسلامی و منکرین سے ماخوذ بتاتے تھے۔

سنہ ۴۰ھ میں سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے منصب خلافت سے دست بردار ہونے کے بعد جب ان کے اصحاب کے لیے امور مملکت میں حصہ لینے کا کوئی موقع نہ رہا تو یہ حضرات گوشہ نشین ہو کر علم و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ یہی لوگ معتزلہ کہلائے۔ اس مکتب فکر کے بانی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحب زادے محمد بن حنفیہ تھے جو بلحاظ علم کے علامہ کہلاتے تھے۔

محمد بن حنفیہ کے شاگرد ان کے صاحب زادے ابو الہاشم تھے اور ان کا شاگرد واصل بن عطاء الغزال جس نے محمد بن حنفیہ کے اعتزال کی تجدید کی اور پھر وہی اس مکتب فکر کا بانی کہلایا۔

واصل نے ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ اگلے سال ایک عظیم انقلاب رونما ہوا جس کے نتیجہ میں امویوں کو مستاصل کر کے عباسی برسر اقتدار آئے۔ عباسی چونکہ ایرانیوں کی مدد سے خلیفہ ہوئے تھے، لہٰذا انھوں نے ان کے بارے میں مداہنت کی پالیسی اختیار کی۔ اس آزادئ رائے نے "زندقہ" کی شکل اختیار کی جو کچھ ہی دنوں میں نظام حکومت کے لیے ایک خطرہ بن گیا۔ اس کے تدارک کے لیے تیسرے عباسی خلیفہ مہدی نے متکلمین کو بلا کر زنادقہ کے اصلاح عقائد کے لیے کتابیں لکھوائیں۔ اس طرح ایک نئے انداز کی ابتدا ہوئی جس کے اندر دائرہ بحث صرف مختلف اسلامی فرقوں کے اندر محدود نہیں تھا، بلکہ غیر اسلامی فرقوں سے بھی مقابلہ تھا جو قرآن کو حرف آخر نہیں مانتے تھے۔ ان کے مقابلے کے لیے عقلی دلائل کی ضرورت تھی اور پھر جب تیسری صدی میں یونانی فلسفہ مسلمانوں میں منتقل ہوا تو اس کے وہ مسائل جو اسلامی تعلیمات کے

منافی تھے اُن کی تردید و ابطال پر توجہ دی گئی۔ اصل عقائد جن کا دفاع ہی علمائے امت کا مقصود تھا، قرآن کریم سے ماخوذ تھے۔ ان کی تائید کے لیے دینا اصول بھی قرآن کریم میں مل جاتے تھے۔ تعلیمات اسلام کے مقابلے میں یونانی فلسفہ کے جو مواقف تھے، ان کے اندر خود ان یونانی فلاسفہ کا اختلاف تھا لہٰذا ان کی تضعیف و تردید کے لیے متکلمین نے ان تناقضات سے بھی فائدہ اُٹھایا۔ اس کے لیے متکلمین نے فلسفہ کی کتابوں کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا، چنانچہ کاتبی قزوینی نے امام رازی کے "المحصل" کی "المفصل" کے نام سے جو شرح لکھی ہے اس میں کہا ہے کہ امام غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" میں جو فلسفہ کے پرخچے اُڑائے ہیں اُس کے لیے انھوں نے یحییٰ النحوی (John Grammaticus) کی تصانیف سے بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے جو اُس نے مروجہ فلسفہ کے رد میں لکھی تھیں۔

اس طرح "کلام المتأخرین" کا ایک جزء قرآن کریم سے اور دوسرا جزء خود یونانی فلسفہ و منکرین سے ماخوذ تھا۔

"کلام المتأخرین" کے تین ذیلی ادوار ہیں۔ پہلے دور میں اِسلام کے مختلف فرقوں نے اس کی ترقی میں حصہ لیا۔ ان میں سب سے اہم فرقہ معتزلہ تھا۔ دوسرا اہم فرقہ شیعہ امامیہ تھا۔ واصل کا شاگرد عثمان بن خالد الطویل تھا اس کا شاگرد ابو الہذیل العلاف جو کلام میں تو معتزلہ کا "الشیخ الاکبر" تھا ہی، فلسفہ میں بھی دستگاہ عالی رکھتا تھا۔ ابو الہذیل کا شاگرد ابو یعقوب الشحام تھا اور اس کا شاگرد ابو علی الجبائی جو اپنے وقت کا رئیس المعتزلہ تھا۔

ابو علی الجبائی کے شاگرد امام ابو الحسن الاشعری تھے چالیس سال تک اعتزال کی آغوش میں پروان چڑھنے کے بعد وہ اس مسلک سے بیزار ہو کر فرقہ اہل السنت والجماعت میں آملے۔ مگر وہ معتزلہ کی اُن بدعتوں سے بیزار ہوئے جنھوں نے "کلام القدماء" کے زیر بحث مسائل اربعہ میں اختیار کی تھیں لیکن فلسفہ کی تردید و ابطال میں انھوں نے جو خدمات انجام دی تھیں ان سے بیزار نہیں ہوئے۔ وہ اپنے ہمراہ اس بارے سرمایہ کو بھی لیتے آئے۔ خود انھوں نے فلسفہ بالخصوص ارسطاطالیسی فلسفہ کے رد میں متعدد کتابیں لکھی ہیں بہرحال انھوں نے "کلام المتأخرین" کے دوسرے ذیلی دور کی ابتدا کی۔ اُن کے متعلمین میں ایک بزرگ ابو القاسم اسکاف تھے۔ موخر الذکر کے شاگرد امام الحرمین جوینی تھے جو "الارشاد" اور "کتاب الشامل" کے مصنف ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اشعری علم الکلام کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہیں۔ امام الحرمین کے شاگرد رشید حجۃ الاسلام امام غزالی تھے، جن کی "تہافت الفلاسفہ" نے واقعتاً یونانی فلسفہ کے پرخچے اُڑا دیے۔ امام غزالی کے شاگرد امام ابو سعید محیی الدین منصور بن عمر البغدادی تھے۔ اُن کے شاگرد مجد الدین محمود بن ابی المبارک تھے، اُن کے شاگرد امام الدین عمر اور اُن کے شاگرد ان کے صاحبزادے قاضی ناصر الدین بیضاوی مصنف تفسیر بیضاوی، منہاج الاصول و طوالع الانوار۔ موخر الذکر علم کلام کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے۔ قاضی ناصر الدین بیضاوی کے شاگرد زین الدین ہنکی تھے اور اُن کے شاگرد قاضی عضد الدین الایجی مصنف "المواقف فی الکلام" جس کی عظمت اور مصنف کی جلالت قدر سے متاثر ہو کر خواجہ حافظ لکھتے ہیں:-

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف
بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد

قاضی عضد کے فیض یافتہ قطب الدین رازی اور ان کے شاگرد اُن کے منہ بولے بیٹے محمد بن مبارک شاہ تھے۔ اُن کے شاگرد میر سید شریف جرجانی مصنف "شرح المواقف" تھے۔ قاضی عضد کے دوسرے شاگرد علامہ سعد الدین مسعود تفتازانی مصنف "المقاصد فی الکلام و شرح المقاصد" تھے میر سید شریف کے دو شاگرد مشہور ہیں۔ محی الدین کوشکناری

اور خواجہ حسن شاہ بقال اور ان دونوں بزرگوں کے شاگرد جلال الدین محقق دوانی تھے جو علم کلام کے تیسرے ذہنی دور کے گل سرسبد ہیں۔

کلام المتاخرین فلسفہ کے رد و ابطال کے لیے وجود میں آیا تھا اس لیے عرصے تک کلام اور فلسفہ دو حریفانہ شکل کی حیثیت سے چلتے رہے مگر امتداد زمانہ کے ساتھ یہ مخاصمت مقاربت میں بدلتی گئی اور دونوں اپنے اپنے تشدد کی تعدیل کرتے گئے تاآنکہ بقول ابن خلدون اسلامی فکر کے یہ دونوں دھارے قاضی ناصرالدین بیضاوی کے یہاں باہم مل گئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف یہ دونوں دھارے بلکہ اسلامی فکر کے چاروں دھارے فلسفۂ مشائیت، فلسفۂ اشراقیت، کلام اور تصوف خواجہ نصیرالدین طوسی کے یہاں مل گئے وہی اس انتخابی (Eclectic) تحریک کے بانی ہیں جسے کسی اور اصطلاح کی عدم موجودگی میں "معقولات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اُن کی تجرید العقاید "کلام" اس معقولات کی پہلی کتاب مقدس ہے اور اس طرح کلام المتاخرین کے تیسرے ذہنی دور کا آغاز ہوا۔

محقق طوسی کے شاگرد علامہ قطب الدین شیرازی تھے ان کے شاگرد بقول امام الدین ریاضی قطب الدین رازی تھے (مگر بقول قاضی نوراللہ شوستری وہ علامہ حلی کے شاگرد تھے جو محقق طوسی کے حکمت میں شاگرد تھے) قطب الدین سے محقق دوانی تک سلسلہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

محقق طوسی کی "تجرید الکلام والعقائد" کی شرح اصفہانی نے لکھی، پھر علامہ قوشجی نے۔ موخر الذکر کی شرح پر محقق دوانی نے حاشیہ لکھا اور جب اس پر ان کے حریف امیر صدرالدین شیرازی نے اعتراضات کیے تو دوسرا حاشیہ لکھا پہلا حاشیہ قدیمہ اور دوسرا "جدیدہ" کہلایا اور پھر انھیں قدرت نے یہ قبول عام عطا فرمایا کہ عرصۂ دراز تک قلمرو اسلام کے طول و عرض میں جید فضلائے بعد نے ان حاشیوں پر حواشی اور حواشی علی الحواشی تحریر فرمائے

حواشی قدیمہ و جدیدہ کے علاوہ محقق دوانی اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جیسے "شرح ہیاکل النور"، "شرح عقائد عضدیہ"، "رسالہ اثبات الواجب" وغیرہ۔ مگر شہرت ان کے "حاشیہ قدیمہ" ہی کو ہوئی اور وہ بجا طور پر معقولات کی دوسری کتاب مقدس کہلانے کا مستحق ہے۔

محقق دوانی کا فیض ہندوستان میں پہنچا جس کا ذکر پچھلی اشاعت میں ہو چکا ہے انھیں کے سلسلۂ تلمذ میں میر زاہد ہروی منسلک تھے (جو شاہ ولی اللہ کے پدر بزرگوار اور استاد شاہ عبدالرحیم صاحب کے استاد تھے) انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں تین مشہور ہیں۔ میر زاہد شرح المواقف، میر زاہد ملا جلال اور میر زاہد قطبیہ اور پھر جلد ہی یہ تینوں کتابیں معقولات کے اعلیٰ نصاب میں شامل ہو گئیں اور بجا طور پر معقولات کی تیسری کتاب مقدس کہلائی جا سکتی ہیں۔

معقولات ایک انتخابی تحریک تھی۔ اس کے ارکان نے کلام کے مواقف پر اس سے بہت اصرار نہیں کیا۔ بلکہ "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر جو فلسفہ وغیرہ سے بھی لیا۔ اس لیے اس کا ایک جز، کلام کے توسط سے قرآن و حدیث سے اور دوسرا جز دوسرے ماخذ سے ماخوذ ہے۔

۲۔ فلسفہ کا آغاز وارتقا

اسلامی فکر میں فلسفہ کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لینے سے پہلے یہ بنیادی نکتہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کے مذہبوں میں علم و حکمت کے حصول کے لیے اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے نظام اقدار میں "خیر کثیر" یا خیر اعلیٰ (Summum Bonum) کا مصداق حکمت کو قرار دیا گیا ہے،

وَمَن یُؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیراً کَثِیراً

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے "حکمت" کو مومن کا متاع گم گشتہ بتایا ہے کہ جہاں ملے وہ اس کے لینے کا دوسروں

کے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہے۔

کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن اینما وجدھا فھو
احق بھا۔"

قرآن حکیم کے صفحات ان تعلیمات سے معمور ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں میں علم و حکمت کے حصول کے لیے ایک نہ بجھنے والی پیاس پیدا ہو جائے جو اپنی آسودگی کے لیے یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں فرماتی کہ وہ جس سے اپنی پیاس بجھا رہی ہے "نمِ آبِ زلال" ہے یا "ماءِ کدر"۔ لہٰذا بقول ابن خلدون جوں ہی مسلمانوں کا سابقہ اُن لوگوں سے پڑا جو کہ اسلاف علم و حکمت کے دانائے راز رہ چکے تھے تو انھوں نے اُن کے چھوڑے ہوئے سرمایے کو حاصل کرنے اور اس پر چار چاند لگانے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ اس قسم کا سب سے بہتر سرمایہ انھیں یونان سے حاصل ہوا جو کمیت میں بہت زیادہ و افر اور کیفیت میں انتہائی جید تھا۔ مسلمانوں میں اس کے داخلے کی کیفیت حسب ذیل ہے۔

پیروان ارسطو کی ایک جماعت اسکندریہ پہنچی جہاں بطالسۂ مصر کے زیر سرپرستی مدرسۂ فلسفہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ مدرسہ تقریباً چھ سو سال تک بڑی آب و تاب سے چلتا رہا۔ مگر جب چوتھی صدی مسیحی میں قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کر کے مسیحیت کو مملکتی مذہب بنا دیا اور پادریوں نے عام رعایا کو جبریہ عیسائی بنانا شروع کیا تو یہ مدرسہ بھی ان کی آزار رسانی سے محفوظ نہ رہ سکا۔ پھر بھی یہ کسی طرح آٹھویں صدی مسیحی کی ابتدا تک لشتم پشتم چلتا رہا۔ مگر حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت (۹۹- ۱۰۱ھ) میں یہ انطاکیہ سے پہلے حران میں اور پھر بغداد میں داخل ہو گیا۔ اس وقت یعنی مقتدر باللہ کے عہد خلافت (۲۹۵ – ۳۱۷) میں اس مدرسہ کا سربراہ یوحنا بن حیلان تھا جو ابو نصر فارابی کا استاد تھا۔

ایک مرتبہ پھر مسیحی دنیا میں جب پادریوں نے غیر مسیحی آبادی کا قلع قمع کر دیا تو پھر اُن کا جوشِ جنون اپنے ہی ہم مذہبوں کی طرف راجع ہوا۔ ایک فرقہ کے بعد دوسرا فرقہ خارج از مسیحیت قرار پاتا رہا۔ ان مخالف فرقوں میں نسطوری فرقہ بھی تھا جو اپنی مذہبی تعلیمات کی تائید میں یونانی فلسفہ سے مدد لیتا تھا۔ وہ بھی ترکِ وطن کرنے اور ایران میں پناہ لینے پر مجبور ہوا جہاں وہ اپنی مذہبی تعلیمات کے ساتھ یونانی علوم و حکمت کے ذخیرہ کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ ایران میں اس کا مرکز سے جس طبقے نے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھایا وہ طبقۂ کتاب تھا جو "دبیران" کہلاتا تھا۔ انھوں نے یونانی منطق و فلسفہ اور طب کے بڑے سرمایے کو پہلوی زبان میں منتقل کیا۔ انھوں نے فلسفہ اور طب کی کتابوں کے لکھنے کے لیے دو دو رسم الخط ایجاد کیے تھے۔ یونانی فلسفے سے انھیں اتنا شغف تھا کہ وہ ہر اس مصنف کی کتاب کا ترجمہ کرنے کے لیے تیار رہتے تھے جس کا نام یونانیوں جیسا ہو۔ جیسا کہ سہروردی نے "المطارحات والمشارع" میں لکھا ہے۔ عہد اسلام میں جب دیوان کتابت کی زبان عربی مقرر ہوئی تو انھوں نے ان علوم کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنا شروع کیا۔ جیسا کہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں لکھا ہے۔

یونانی فلسفہ کے مسلمانوں میں داخلہ کا دوسرا راستہ سرکاری ترجمین تھے۔ اس کی ابتدا پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی میں ہوئی جب کہ خالد بن یزید نے رومی و قبطی علماء سے کیمیا، طب اور نجوم کی کتابوں کا ترجمہ کرایا لیکن جب عباسی برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے بڑی شد و مد سے اس منتقلی کے کام کی سرپرستی کی بالخصوص مامون الرشید نے۔ اس نے اپنے ہم عصر بادشاہ روم کو تحفے تحائف بھیج کر اس بات پر راضی کر لیا کہ اس کی مملکت میں حکمت کے جو جواہر پارے دیمک کی خوراک بن رہے تھے اُنھیں بغداد لانے کی اجازت دے دے۔ ترجمہ کے کام کے لیے اس نے ایک مستقل ادارہ بیت الحکمۃ کے نام سے قائم کیا۔ لیکن اس طرح جو سرمایہ منتقل ہوا وہ علوم قطعیہ (Exact Science) منطق اور طب کا تھا۔ قیاسی فلسفہ (Speculative Philosophy)

مدرسہ فلسفہ کے بغداد میں قدم جمانے کے بعد خصوصیت سے منتقل ہوا۔ چنانچہ فارابی نے اصرار کر کے اپنے استاد سے "کتاب البرھان" پڑھی اور پھر اس کی شرح لکھی۔ دوسری شرح متی بن یونس نے لکھی۔ اس سے پہلے ارسطاطالیسی منطق کی صرف ڈھائی کتابیں ترجمہ ہوتی تھیں یا پڑھائی جاتی تھیں۔

یوحنا بن حیلان کے بعد مدرسہ فلسفہ کا صدر متی بن یونس ہوا پھر فارابی۔ فارابی کے بعد یحییٰ بن عدی، پھر اس کا شاگرد ابو الخیر خمار اور آخر میں ابو الخیر خمار کا شاگرد ابو الفرج بن الطیب جس کے شاگردوں میں ابن ابی اصیبعہ شیخ بوعلی سینا کو بتاتا ہے۔ شیخ رسمی طور پر باقاعدہ فلسفہ میں ابو عبد اللہ الناتلی کا شاگرد تھا جو ابو الفرج بن الطیب کا ہمعصر تھا اور اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس کا سلسلۂ تلمذ بھی ابو الفرج بن الطیب کے اساتذہ تک پہنچا ہے۔ بعد میں فلسفہ کی تاریخ سابق اشاعت میں مذکور ہو چکی ہے۔ ویسے بیہقی ابن سینا کو فارابی کی کتابوں کا شاگرد بتاتا ہے۔ غرض حقیقی طور پر نام نہاد اسلامی فلسفہ کا (جو ابن سینا کے یہاں پختگی کو پہنچا) سرچشمہ یونانی (ارسطاطالیسی) فلسفہ ہے۔ ابن سینا کی فلسفہ کی مستند کتاب "شفا" ہے اس کے چار حصے ہیں۔ منطق، ریاضی، طبیعیات اور ما بعد الطبیعیات۔ منطق والا حصہ ارسطو کی منطقی تصانیف اور فرفوریوس کی ایساغوجی کا چربہ ہے۔ طبیعیات والا جز ارسطو کی طبیعیاتی تصانیف کا چربہ ہے۔ ما بعد الطبیعیات یا الہیات والے جزء کا بیشتر مواد ارسطو کی ما بعد الطبیعہ پر مبنی ہے اور کچھ حصہ خود شیخ کے ذاتی ابتکارات اور دوسرے فرقوں کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ ریاضیات کا ہندسہ "اصول اقلیدس" کی ارثماطیقی یا علم الحساب نقوماخس کی "المدخل الی علم العدد" Introductio Arithmetica کی، علم الہیئت بطلیموس کی "المجسطی" کی تلخیص ہے۔ غرض پورا ابن سینا کا فلسفہ جو کہ نام نہاد "اسلامی فلسفہ" Muslim Philosophy کا اصل و مبنیٰ علیہ ہے، یونانی فلسفے سے ماخوذ ہے۔

"مسلم فلاسفی" کے دو مصداق ہیں: مشائیت (Peri-patetism) اور اشراقیت (Illumination or Philosophy of Illumination) ان میں سے مشائیت کے (یا ارسطاطالیسی۔ ابن سینائی فلسفہ کے) جو مشرق میں بشمول ایران پانچویں صدی ہجری سے "فلسفہ" کے نام سے متداول رہا ہے یونانی الاصل ہونے کی وضاحت پوری طرح شرح و بسط سے سطور بالا میں ہو چکی ہے۔

اور جہاں تک "اشراقیت" کا تعلق ہے تو عہد اسلام میں اس کا مثل اعلیٰ شہاب الدین سہروردی مقتول ہے جو اس فلسفۂ اشراق میں اپنی دستگاہ عالی کی بنا پر "شیخ الاشراق" کہلاتا ہے۔ اور اس کی "حکمۃ الاشراق" کو فلسفۂ اشراقیت کی پہلی کتاب مقدس کہا جا سکتا ہے اس پر قطب الدین شیرازی نے شرح لکھی۔ چنانچہ اس کی "شرح حکمۃ الاشراق" اشراقیت کی دوسری کتاب مقدس کہی جاتی ہے۔ اس شرح پر ملا صدرا نے حاشیہ لکھا۔ اس طرح "اشراقیت" کے آغاز و ارتقا کے باب میں ان افاضل (شہاب الدین سہروردی، قطب الدین شیرازی اور ملا صدرا) کے اقوال و افادات حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس فلسفہ کی ساخت و تشکیل کے بارے میں شارح (قطب الدین شیرازی) شرح حکمۃ الاشراق (مطبوعہ تہران، ص ۱۵) فرماتے ہیں:

"ابتناؤہ علی الذوق والکشف ومشاہدۃ الانوار"

[اس کی بنیاد ذوق، مکاشفہ اور مشاہدہ انوار پر استوار کی گئی ہے]۔

اور اس "علم انوار" کی اصل کے بارے میں خود شہاب الدین شیخ الاشراق لکھتے ہیں:

"وھو ذوق امام الحکمۃ و رئیسنا افلاطون ... وکذا من قبلہ من زمان والد الحکماء ھرمس الی زمانہ (ای زمان افلاطون) من عظماء الحکماء واساطین الحکمۃ

مثل انباذقلیس وفیثاغورث وغیرھما۔۔

و۔ وعلی ھذا ابتنی قاعدۃ الاشراق فی النور والظلمۃ التی کانت طریقۃ حکماء الفرس مثل جاماسف وفرشاد شور و بوزرجمہر ومن قبلہم

ر اور یہی حکمت وفلسفہ کے پیشوا اور ہمارے سردار افلاطون کا ذوق (مسلک) ہے اور اسی طرح ان تمام مفکرین عالی مرتبت کا جو حکماء کے ابوالآباء ہرمس (Hermes) کے زمانے سے افلاطون کے زمانے تک ہوئے ہیں جیسے انباذقلیس، فیثاغورث وغیرھما اور اسی علم الانوار پر اشراق یا فلسفۂ نور وظلمت کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے جو قدیم ایرانی حکماء مثلاً جاماسپ، فرشاد شیرو بزرجمہر نیز اس کے پیش روؤں کا مسلک رہا ہے۔

پھر اسی تاریخی حقیقت کی مزید وضاحت شارح قطب الدین شیرازی نے غیر مبہم الفاظ میں فرمائی ہے:

وقد احیٰ المصنف حکمھم ومذاہبھم فی ھذا الکتاب وھو بعینہ ذوق فضلاء یونان وھاتان الامتان متوافقتان فی الاصل کما ذکر جاماسف تلمیذ زردشت وفرشادشیرو بوزرجمہر الماھر ومن قبلھم مثل الملک کیومرث وطھمورث وافریدون کیخسرو وزردشت من الملوک الافاضل وقد اتلف حکمھم حوادث الدھر۔۔۔۔ و المصنف اظفر باطراف منھا راٰہ موافقۃ للامور الکشفیہ الشھودیہ، استحسنھا کملھا

ر اور مصنف (شہاب الدین مقتول) نے ان کی حکمتوں اور مذہبوں (فلسفۂ اشراق) کو ازسرنو اس کتاب (حکمۃ الاشراق) میں زندہ کیا اور یہی بعینہٖ یونانی مفکرین کا مسلک تھا اور یہ دونوں (ایرانی ویونانی) قومیں اصل میں متوافق وہم آہنگ ہیں جیسا کہ زردشت کے شاگرد جاماسپ، فرشادشیر اور بعد میں بزرجمہر نیز اُن لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے جیسے بادشاہ کیومرث، طہمورث، افریدون، کیخسرو اور زردشت جیسے فاضل بادشاہوں نے ذکر کیا ہے۔ مگر قدیم ایران کے فلسفہ و حکمت کو حوادث روزگار نے تلف وبرباد کر دیا۔۔۔۔۔ اور جب مصنف کو اس فلسفے کے کچھ منتشر اجزاء ہاتھ لگے جو بعد میں کشف و شہود کی کسوٹی پر پورے اترے تو انھیں مصنف نے مستحسن سمجھا اور پھر انھیں مکمل کیا ہے۔

ان تمام تصریحات سے یہ ناقابل تردید حقیقت ثابت ومتحقق ہو جاتی ہے کہ فلسفۂ اشراق قدیم ایرانی ویونانی حکماء کا فکری ورثہ ہے اور یہ سب مفکرین ظہور اسلام سے پہلے گزر چکے تھے۔

غرض فلسفۂ مشائیت ہو یا اشراقیت، قدیم یونانی یا ایرانی فلسفہ وحکمت سے ماخوذ ہے جو نزول قرآن کریم سے کہیں پہلے مدون ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے قرآنی الاصل کہنا سراسر مکابرۂ محض اور حقیقت سے اغماض وچشم پوشی کے مترادف ہے۔

(٣) تصوف

تصوف کے بارے میں راقم الحروف خود کو کچھ کہنے کا مجاز نہیں سمجھتا۔ کیونکہ یہ وہ فلسفہ ہے جس کے بارے میں اس کے دانائے راز کہتے ہیں کہ ؎

ذوقِ این بادہ نہ دانی بخدا تا نچشی

اور یہاں مرد کا قصہ بالکل اس بچے کے مانند ہے کہ بانہ کمبخت تو نے پی ہی نہیں۔

لیکن خود فاضل مقالہ نگار نے جو کچھ فرمایا ہے (صفحہ ۱۰ سطر ۱۰ — ۲۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل و تنظیم بھی قدیم ایرانی و یونانی فلسفہ کی رہین منت ہے

The Sufi doctrines found [in] their most influential exponent in Yahya ibn Habash Shihab ad-Din al Suhrawardi [illegible] known as Shaykh al Ishraq "

اور سطور بالا میں ثابت و مقرر ہو چکا ہے کہ خود شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی اس فلسفۂ اشراق کو قدیم ایرانی و یونانی حکماء کا فکری ورثہ قرار دیتے ہیں:

"وھو ذوق امام الحکمۃ و رئیسنا افلاطون... والانباذقلیس و فیثاغورث ...... (و) طریقۃ حکماء الفرس مثل جاماسف و فرشادشور و بوزرجمہر و من قبلھم۔"

اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا چنداں مشکل نہیں ہے کہ یہ تصوف یا کم از کم اس کا most influential مظہر قرآنی الاصل ہے یا یونانی و ایرانی الاصل۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"جس نے حلال طریقے سے دنیا طلب کی تاکہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال نہ دراز کرنا پڑے اور اپنے اہل و عیال کے لیے روزی حاصل کرے اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرے تو وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا!"

(زادِ سفر)

ارشادات نبی کریمؐ

حضرت عمرو بن تغلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال یا قیدی آئے آپؐ نے اس طرح تقسیم کیا کہ بعض کو دیا اور بعض کو نہیں دیا۔ بعد میں آپ کو خبر ملی کہ جن کو نہیں دیا وہ ناراض ہیں۔ آپؐ نے اللہ کی تعریف اور ثنا بیان کی۔ پھر فرمایا:

"خدا کی قسم میں بعض کو دیتا ہوں اور بعض کو نہیں، وہ مجھے زیادہ محبوب ہے اس شخص سے جس کو دیتا ہوں۔ لوگوں کو اس وقت دیتا ہوں جب اُن کے دلوں میں گھبراہٹ اور بے چینی پاتا ہوں۔ جن کو نہیں دیتا ان کو اس اطمینان پر نہیں دیتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا دل غنی کر دیا ہے اور خیر رکھی ہے انھیں میں عمرو بن تغلبؓ ہیں۔"

حضرت عمرو بن تغلب کہتے ہیں خدا کی قسم مجھے حضورؐ کی یہ بات سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہے۔ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے بیشک اللہ عزوجل جب اپنے کسی بندے کی اس کی دو محبوب چیزوں کے ساتھ آزمائش کرتا ہے (یعنی اس کی آنکھیں جاتی رہتی ہیں) اور وہ صبر کرتا ہے تو ان کے عوض میں جنت ہے۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"جو صبح و شام نماز پڑھے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"مسلمان کوئی پودا لگائے اور اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں تو اس کے لیے صدقہ ہے اور اگر چوری جائے یا اس کو کوئی نقصان پہنچائے تو بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔" (بخاری)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب بندہ بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اس کے لیے وہی عمل لکھا جائے گا جو تیام اور تندرستی کی حالت میں کرتا تھا۔" (بخاری)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۰ شمارہ نمبر ۳ (مارچ ۱۹۹۱)

انسان کے جدِّ امجد

حالیہ تحقیقات کی روشنی میں

ریاض الدین احمد ◇

کیا انسان کے آباواجداد وہ کیڑے مکوڑے ہیں جن
د نابید ہوئے چھ کروڑ بیس لاکھ سال ہو چکے ہیں؟ ماہرین
سائنس کے مابین یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ کیا واقعی انھی نابید
ڑوں نے ترقی کر کے بندر، بن مانس اور انسان کی شکل
ختیار کی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ کب ہوا، کیسے ہوا اور کہاں
وا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ جدید انسان کب
بادۂ انسانیت میں ملبوس ہوا اور اس کے دماغ کی تیز
فتار صلاحیتوں نے اپنے نسلی ساتھیوں کو لامحدود دیتیوں
ں کیوں اور کیسے چھوڑ دیا، یہ دوسرا سوال ناقابل جواب
ہے۔

شاید انسانی سائنس کے ماہرین نے اپنی دلیل کی
یاد، ادنیٰ شہادتوں پر رکھ کر انھیں کافی اچھال دیا ہے
رحقیقت ناکافی شہادتوں اور عدم تاریخیت نے ڈارون
، نظریے کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ مخالفین ڈارون کہتے ہیں
، اس کی تمام کہانی کی اصل بنیاد سر کے دو قدیم ڈھانچے۔
کھوپڑی کی ہڈی کے چند ٹکڑے اور منہ کے چند دانت ہیں
ن میں بھی ایک کھوپڑی محض دھوکا ثابت ہوئی۔ کیونکہ یہ
ہت پرانی نہیں تھی اور دانت کسی نابید قسم کے سؤر
ے۔

علاوہ ازیں جن فوسلز (Fossils) پر نظریے
کی بنیاد رکھی گئی وہ خود ناقابل اعتبار تھے۔ ان کی تاریخیت
پر بھی پوری روشنی نہیں پڑ رہی ہے اور ریڈیو کاربن سے
بھی صحیح تاریخ نکلنا مشکل ہے کیونکہ یہ صرف پچاس ہزار
سال قبل مسیح کا پتہ دیتا ہے۔ ماہرین سائنس نے جو
دوسرے طریقے تعین تاریخ کے معلوم کیے ہیں وہ بھی حرفِ
آخر نہیں ثابت ہوئے کیونکہ ہوائی (HAWAII) میں
آتش فشاں کے لاوا کی جو تاریخ ان تجربات کی بنا پر نکالی
گئی وہ ۲۹۷۰۰ ملین سال غلط ثابت ہوئی۔

ڈارون کے مخالفین کا کہنا یہ بھی ہے کہ راہ ارتقاء
میں انسان نے ایک نادر الوجود ہستی کا درجہ کیسے حاصل
کر لیا جب کہ اس کی تعمیر جسمانی میں کم سے کم ۳۱ علامات
ایسے ہیں جو اس کو دوسرے جانوروں سے ممتاز
کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کے جسم کا بے بال ہونا۔ ان کا
دو پیروں پر سیدھے کھڑے ہو کر چلنا۔ ان کا طویل المدت
زمانہ بچپن جس کی نگرانی کے لیے سوسائٹی کا ممنون احسان
ہونا پڑتا ہے اور سب سے زیادہ حیرت ناک اس کا گنبد
سر کا خول ہے جس میں ایک ایسا دماغ رکھا ہوا ہے جو
دیگر اعضائے جسمانی کے تناسب سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔

◇ (جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل) یوپی ـــ خانہ ڈاکٹر عبداللہ ص ب ۵۰۰۳۰، دوحہ۔ قطر

اس کی جسامت ۵۴:۱ کے تناسب سے ہے جب کہ چمپانزی ۷۵:۱۔ گوریلا کی ۱:۲۰۰۰، ہاتھی کی ۱:۹۰۰ اور وھیل مچھلی کی ۱:۱۰،۰۰۰ ہے۔ یہ انسانی دماغ ہی ہے جس نے زندگی کو ایک سمجھے بوجھے راستے پر چلنے کا اہل بنایا ہے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء اور تنازع للبقاء کے لیے یہ دماغ بہت بڑا چیلنج ہے۔

ڈارون کا بہت بڑا دوست الفرڈ رسل ویلس (Alfred Russel wallace) جو خود اپنی تحقیقات کی بنا پر ارتقاء کا قایل تھا، بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نظریے کا اطلاق انسان پر نہیں ہوتا۔ حیوان کی یہ قسم ارتقاء سے مبرّا ہے۔ کیونکہ قدرت کا یہ قانون کہ تقسیم عطیات بلحاظ ضرورت ہو، نہ کم نہ زیادہ انسان پر نہیں عاید ہوتا۔ اس کو دماغ اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ بڑا دیا گیا ہے۔ اس کی فطری ذہانت اس کی عام فن کاری۔ اس کی حساب دانی اور اس کا جذبۂ موسیقی اس کی جسامت کے مقابلے میں بہت زیادہ باصلاحیت اور طاقت ور ہے۔ مرضی مولا کے علاوہ کوئی دوسرا اصول اس تقسیم بے حساب (یرزق من یشاء بغیر حساب) پر روشنی نہیں ڈالتا۔

حالیہ دریافتوں نے جو یوتھوپیا (Ethiopia) کینیا (KENYA) تنزانیہ (TANZANIA) اور بدایں حالہ واقع پاکستان میں ہوتی ہیں ثابت کر دیا ہے کہ ایسے کوئی فوسلز موجود نہیں جو ڈارون ازم کی ہمنوائی کرتے ہوں۔

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء شدید مخالفتوں کی زد میں رہا ہے۔ مخالفت کرنے والوں میں تین طاقت ور گروہ تھے۔ اول علمائے دین، کیوں کہ یہ نظریہ الہامی کتابوں کے بتائے ہوئے مراحل تخلیق کی تکذیب کرتا تھا۔ دوسرے ماہرین حیاتیات (Biologists) کہ ان کے سائنسی پیمانوں سے اس کا ٹکراؤ تھا اور تیسرے عوام الناس کہ ان کو انسانی رشتہ بندر، بن مانس یا دوسرے کمتر درجے کی مخلوقات سے جوڑنا سخت ناگوار تھا۔

لیکن ۱۹۳۰ء کی دو سنسنی خیز دریافتوں نے ارتقا کی سائنس کو زبردست دھکا پہنچایا ہے۔ انسانی سائنس کی کتابوں میں یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ انسان کی ابتدا ایک ہم جنس ذی حیات (Homoerectus) سے ہوتی ہے جس کو منزل ارتقا میں داخل ہوئے ایک ملین سال ہوئے ہیں لیکن جو ڈھانچے کینیا کے روڈلف جیسی Rudolf (Basin) میں برآمد ہوتے ہیں وہ ۲ ملین سال سے بھی زیادہ پرانے ہیں اور شکل وصورت میں اس سے کہیں زیادہ ماڈرن ہیں جن کو ہمارے آباد اجداد ہونے کا مقام ڈارون اور اس کے ہمنوا الفرڈ اور رسل والے لس (Russel wallace) نے دے رکھا ہے۔

دوسری دریافت جو جنوبی افریقہ کی سرحد پر سوازی لینڈ (Swazi Land) اور نیٹال (Natal) کے درمیان ہوتی ہے وہ اس تصور کی تردید کرتی ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ شکل وصورت کے انسان کی عمر صرف ستر ہزار (۷۰،۰۰۰) سال ہے، کیونکہ سرحدی غار (Border Cave) میں باقیات کے جو ٹکڑوں کا نمونے برآمد ہوتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی تہذیب بیس لاکھ (۲۰،۰۰،۰۰۰) سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں سوازی لینڈ کے مقام بام دیو ریج (Bomvu Ridge) پر لوہے کی تلاش میں کھدائی کا کام شروع ہوا۔ اس کام کے ذمہ دار دو نوجوان انجینئر بوشیر (Boshier) اور بامانٹ (Beaumont) تھے۔ سلسلہ تلاش میں تیس لاکھ قدیم ترین نمونے دستیاب ہوئے۔ ان میں معدوم جانوروں کی ہڈیاں اوزار

ملے اور ایک شیرخوار بچے کا ڈھانچہ بھی ایک قبر میں محفوظ ملا۔ جو منفرد (Stone age) کی دریائی سطح زمین پر تھا اس کے علاوہ کچھ ایسے تراشیدہ فراشیدہ وسلتی بھی ملے جو بطور اوزار استعمال کیے جاتے تھے۔ سرمدی غار کی دریافت سے یہ بھی پتہ چلا کہ انسانی تہذیب ہزاروں ملین سال پہلے بھی موجود تھی۔ وہ مختلف قسم کے کھانوں کا استعمال جانتے تھے۔ ہڈی اور پتھر کے نازک ترین آلات بھی تیار کرتے تھے اور اپنے مُردوں کا احترام کرنا بھی جانتے تھے کیونکہ جس بچے کا ڈھانچہ ملا ہے وہ سلیقے سے دفن کیا گیا تھا اور یقیناً وہ کوئی زبان بھی جانتے تھے کیونکہ ایسا تجریدی (abstract) تصور جیسے ہستی لازوال کا وجود اشاروں میں تمہید نہیں کیا جا سکتا۔

سرمدی غار کی یہ دریافت حادثاتی نہیں ہے بلکہ اسی مسلسل تجسس کا نتیجہ ہے جس نے ڈارون کی تھیوری کو شبہ میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس میں انسانی سائنس کے ماہر ریچرڈ لیکی (Richard Leakey) کے اس یقین کو تقویت ملی ہے کہ انسان کے زمین پر وجود کی تاریخ اس سے کہیں زیادہ قدیم ہے جو بتائی جا رہی ہے۔ وہ بہت پُرامید ہیں کہ ان غاروں کے اندر اس مقصد کا کافی مواد ملے گا۔ دس غاروں میں جہاں کی کھدائی ہو چکی ہے۔ اس یقین کو پوری تقویت پہنچا رہی ہیں۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی غاریں ابھی کھلنے کے لیے باقی ہیں۔ ملکی حالات، جسارت عملی اور ذوق تجسس اس چھپے خزانے کا منہ بھی کسی وقت ضرور کھول دیں گے۔

تعمیر حیات کی منزلیں قرآن کریم نے کھول کر بیان کر دی ہیں ان پر یقین کرنا اب ایک سائنسی فریضہ بھی ہو گیا ہے۔ مگر قابل عبرت یہ بات ہے کہ یہ سہرا علوم قرآنیہ کے سر پر نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ تفکر فی الارض اور تحقیق میں اہل قرآن عملی حصہ نہیں لے رہے ہیں۔

حوالے

1. Marvels and Mysteries of the world around us
2. World book Encyclopedia Vol. V

ہمارے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں سائنس کی پروردہ بہتر ٹیکنالوجی کے رول کی اہمیت کو سمجھنے سے ہم قاصر رہے

پروفیسر عبدالسلام

نواب صاحب چھتاری اور ہندوستان کی آزادی

ا مہنے سید چھتاری ○

نواب صاحب کی زندگی کے دو پہلو میرے سامنے ہیں۔ ایک اُن کی سیاسی زندگی اور دوسری نجی۔

سیاسی زندگی کا عام پہلو جو لوگوں کے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ برٹش راج میں وہ نواب ہوئے، ریاست میں آئے، ممبر گورنمنٹ رہے۔ چیف منسٹر یو۔ پی ہوئے، گورنر یو۔ پی ہوئے پھر حیدرآباد میں وزیر اعظم کے عہدے پر رہے اور تقسیم ہند کے بعد راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے لیکن اس سے شاید بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ملک کی آزادی میں نواب صاحب کا کتنا حصہ تھا۔ ان کی دلی خواہشیں ملک کی آزادی کے لیے کتنی تھیں اور وہ کس طرح برٹش گورنمنٹ کے ممبر ہوتے ہوئے بھی اُن حضرات کی جو ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے مدد کیا کرتے تھے۔

نواب سر حافظ محمد احمد سعید خاں جنھیں آپ نواب چھتاری کے نام سے جانتے ہیں اور جن کی آج صد سالہ یاد منا رہے ہیں، ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تعلیم ایم۔ اے او۔ کالج میں حاصل کی اور پھر ایم ایل سی کی حیثیت سے کونسل میں منتخب ہوئے۔

یہ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ سر ولیم میرس گورنر تھے۔ کسی مسئلہ پر گورنر اور ممبران کونسل میں (اُس کونسل میں Sri C.Y. Chintamani بھی شامل تھے) اختلاف ہو گیا۔ وزراء نے استعفیٰ دے دیا اور سر ولیم میرس کو اس کی فکر ہوئی کہ وہ جلد از جلد نئی وزارت بنالیں گورنر نے نواب صاحب کو ملاقات کے لیے نینی تال طلب کیا۔ اب میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں یہ اقتباس نواب صاحب کی خود نوشت "یاد ایام" سے ماخوذ ہے۔

"میں بریلی پہنچا تو دیکھا کہ جس لائن کی گاڑی میں جس درجہ میں میرا اسباب تھا ایک اور صاحب کا اسباب رکھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں پنڈت موتی لال نہرو تشریف لے آئے اور حسب عادت بزرگانہ شفقت سے ملے۔ پنڈت جی کی خدمت میں مجھے پہلے ہی سے نیاز حاصل تھا اور جب کبھی الٰہ آباد جاتا تھا تو پنڈت جی سے ملنے جانا میرے معمولات میں تھا۔ جب ریل چل دی تو پنڈت جی نے کہا کیا نینی تال جا رہے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا خود جا رہے ہو یا بلائے ہوئے۔ میں نے عرض کیا جا تو رہا ہوں بلایا ہوا ہی۔ البتہ یہ نہیں معلوم کیوں بلایا گیا ہوں۔ ایک آدھ منٹ خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ کیوں پنڈت جی اگر وہ مجھے وزیر بنانا چاہیں تو اسے قبول کرلوں یا نہیں۔ پنڈت جی نے فرمایا کہ تم ہماری طرح ترک موالات کرنے والے نان کوآپریٹر تو ہو نہیں اور پھر کچھ ایسے الفاظ فرمائے کہ جن کا مفہوم یہ تھا کہ موجودہ وزراء سے تو اچھے ہی ثابت ہوسکتے۔"

نواب صاحب نے وزارت قبول کرلی۔ چند روز

○ راحت منزل، میرس روڈ، علی گڑھ

بعد ان ہی گرمیوں میں اُنہیں گورنر کمال جانے کا اتفاق ہوا
وہاں پنڈت موتی لال بھی مقیم تھے اور اُن کے ساتھ حکیم
اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی وہیں تھے۔ نواب
صاحب اپنی آپ بیتی Autobiography، میں لکھتے ہیں کہ:

"میں قدرتاً یہ چاہتا تھا کہ لبرل پارٹی نہ آئے
سوراج پارٹی انہیں شکست دے سکتی تھی
چنانچہ میں نے پنڈت جی سے کہا کہ لبرل پارٹی
کے مقابلے میں زمیندار سوراج پارٹی کی مخالفت
نہ کریں گے اور آپ زمیندار امیدواروں کی
مخالفت نہ کریں۔ میں نے اس کا وعدہ بھی
کیا کہ سوراج پارٹی کے الیکشن فنڈ میں بھی میری
شرکت ہو گی۔ زمیندار پارٹی اور سوراج پارٹی
الیکشن میں دوستانہ طور پر طرفدار
رہیں گے۔ چنانچہ اس الیکشن کا نتیجہ یہ ہوا
کہ ایک بھی لبرل امیدوار کامیاب نہ ہوا۔ میں
نے مزاحاً پنڈت جی سے کہا کہ میں نے آپ کے
مشورے سے وزارت کا کام سنبھالا ہے
آپ میرے خلاف نہیں ہو سکتے۔ اس پر پنڈت جی بہت ہنسے
پنڈت موتی لال جی نے اس ضمن میں جو خط نواب صاحب چھتاری کو لکھا وہ پڑھیے:

" آنند بھون۔ الہ آباد
۱۰ر دسمبر ۱۹۲۳ء
مخدومی تسلیم
والا نامہ لکھنؤ میں ایسے وقت ملا کہ میں
نہایت عجلت میں تھا۔ لہذا حامل والا نامہ
سے جواب از عقب بھیجے جانے کا وعدہ کر کے
میں فوراً پنڈت گوکرن ناتھ مصرا کی خدمت
کے لیے ضلع لکھنؤ کے دیہات کی طرف روانہ
ہو گیا۔ والا نامہ اور نیز اُن پرچہ جات کا جو
اس کے ساتھ تھے شکریہ ادا کرتا ہوں
مجھے افسوس ہے کہ آپ کے آدمی کو میرے
پیچھے پیچھے چند مقامات پر جانا پڑا اور بالآخر
میں اس وقت ملا کہ جب اُن پرچہ جات
کی ضرورت کسی نہ کسی طرح پر رفع ہو چکی تھی۔
بنارس گورکھپور ڈویژن کے لیے سخت ضرورت
تھی۔ مگر اس وقت وہاں کا کام ختم ہو چکا تھا
لہذا ان پرچہ جات پر قبضہ رکھنا مناسب نہیں
معلوم ہوتا اور نہ اُن سے وطن میں مستقل
کمی آئی ہے کہ جو اُٹھایا جا چکا تھا۔ اس لیے
یہ پرچہ جات مع شکریہ بدست حامل ہذا بخدمت
خدمت ہیں۔ علاوہ اس کے ابھی تو بہت
کچھ چھیڑ چھاڑ باقی ہے۔ نہ معلوم آپ کے طبقہ
کے متعلق کیا پالیسی اختیار کی جائے۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
نہ سہی عشق عداوت ہی سہی

ایسی حالتیں پرچہ جات کا رکھنا اخلاقی اصول کے خلاف سمجھتا ہوں۔
زمینداروں کے خلاف تو میں نے ایک
لفظ نہیں کہا اور نہ کبھی ان کا مقابلہ کیا۔ آپ
جانتے ہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ زمینداروں کی
طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ لبرلوں کی تو نسل
ہی ختم کر دی۔ ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ سوراج
کے جھنڈے جہاں تہاں نصب کیے گئے ہیں
ہر مقام پر زوروں سے لہرا رہے ہیں۔
آپ کا مخلص
موتی لال نہرو۔

نواب صاحب نے اپنی Autobiography میں لکھا ہے کہ
ایک بار سوراج پارٹی کی ترتیب دینے اور
عدم اعتماد۔

کے ریزولیشن کے سلسلے میں پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی لکھنؤ تشریف لائے اور رائل ہوٹل میں قیام کیا۔ راجہ پرتھوی پال سنگھ شام کو میرے پاس آئے۔ رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ میں پنڈت جی سے ملنے جا رہا ہوں میں نے کہا میرا آداب عرض کر دیجیے گا اور یہ پرچہ پنڈت جی کی خدمت میں پیش کر دیجیے گا۔ میں نے ایک پرچہ پر یہ شعر لکھ کر راجہ صاحب کو دیا۔

نشود نصیب دشمن کہ بود ہلاک تیغت
سر دوستان سلامت ، تو خنجر آزمائی

راجہ صاحب تھوڑی دیر میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ پنڈت جی پرچہ دیکھ کر بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ میرا سلام کہنا کہ میں تو اس وقت کی گاڑی سے الٰہ آباد جا رہا ہوں۔"

نواب صاحب نے اپنی سرگزشت (Autobiography) میں لکھا ہے کہ

"یہ دونوں واقعات اس کے شاہد ہیں کہ اس زمانے میں سیاسی اختلافات کا اثر ایسی شکل اختیار نہ کرتا تھا جو ذاتی اور باہمی تعلقات کو بھی ختم کر دے۔ بعض خوبیاں پنڈت جی میں ایسی مخصوص تھیں جن کا اب سیاسی زندگی میں بالکل فقدان ہے۔ سیاسی اختلافات کا اثر نہ میری خوددارانہ عقیدت پر تھا اور نہ اُن کی بزرگانہ شفقت پر۔ اُس زمانے میں کسی پر تنقید کی جاتی تھی تو سلیقہ، شرافت اور سنجیدگی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا۔ آج کل کی طرح آبرو ریزی کی نوبت نہ آتی تھی۔"

نواب چھتاری نے اپنی (Autobiography) میں لکھا ہے کہ،

"ایک بار الٰہ آباد جیل کے معائنہ کے لیے گیا وہاں پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی تھے اور شاید اُن کے ساتھ ڈاکٹر محمود بھی تھے۔ یہ جیل میں ایک علیحدہ حصہ تھا لیکن اُن حضرات کے لیے یہ بالکل ناکافی اور غیر موزوں تھا۔ میں نے حکم دیا اور اس میں ایک برآمدہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ سیاسی قیدیوں کی تکالیف کے بارے میں میرے پاس اکثر شکایتیں آتی رہتی تھیں۔ ایک کایستھ سپرنٹنڈنٹ تھے جو قدرے سخت مزاج تھے۔ میں نے انھیں بلا کر فہمائش کی۔"

پنڈت موتی لال نہرو کے انتقال کا نواب صاحب کو بہت دکھ اور افسوس ہوا — نواب صاحب اپنی سوانح عمری (Autobiography) میں لکھتے ہیں کہ

"۶ فروری کو پنڈت جی کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ اس حادثے سے ہندوستان ایک سچے فدائی کی بیش بہا خدمات سے محروم ہو گیا خاص کر جب کہ ملک کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ یوں تو دنیا کی محفل ہمیشہ سے ایسی رہی ہے کہ لاکھوں کے اُٹھ جانے سے بھی اس کی رونق میں فرق نہیں آتا لیکن پنڈت جی کے انتقال نے جس جگہ کو خالی کر دیا وہ پُر نہ ہو سکے گی۔ یہ سچ ہے کہ عوام پر مہاتما جی کی روحانی یا مذہبی اثر کی مثال ہندوستان تو کیا دنیا کے کسی حصے میں بھی نہیں ملتی لیکن پنڈت جی کی ذہنی اور دماغی قابلیت، وضع داری اخلاق، مروت، بذلہ سنجی، محفل آرائی اب کہاں۔

"اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"

نواب صاحب نے پنڈت موتی لال نہرو کے انتقال پر

جو تقریر یو پی اسمبلی میں کی وہ حسب ذیل ہے،

"پنڈت موتی لال نہرو ہندوستان کے صف اول کے رہنماؤں میں تھے۔ بلندیٔ فکر اور وسعت قلب میں وہ اپنی مثال آپ تھے لیکن ان کا سب سے بڑا سرمایہ ان کی وہ محبت تھی جو انھیں اپنے وطن عزیز سے تھی ملک پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا اور حیرت انگیز خندہ پیشانی سے اس کے لیے ہر مصیبت کا سامنا کیا۔ ان کی رحلت سے قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ میرے لیے تو یہ ایک ذاتی صدمہ ہے کیونکہ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ان کی خدمت میں شرف باریابی حاصل تھا۔ میں نے انھیں ہمیشہ ایک مخلص دوست پایا اور وہ مجھ پر ہمیشہ کرم فرماتے رہے۔ خدا جانتا ہے کہ ان کی موت سے ہندوستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

[انگریزی سے ترجمہ]

مہاتما جی کے ڈنڈی پا پیادہ سفر نے گویا ہندوستان کو سوتے سے جگا دیا۔ اس بار سول نافرمانی میں ہزارہا کی تعداد میں لوگ جیل میں گئے۔ نواب صاحب اپنی سوانح عمری Autobiography میں لکھتے ہیں کہ،

"میں ان دنوں جیل کے معائنہ کے واسطے گیا نینی جیل میں داخل ہوا تو یکایک میرے سامنے مسز وجے لکشمی پنڈت، مسز اوما نہرو اور کئی معزز خواتین کھڑی نظر آئیں جن میں اکثر میری دوست بھی تھیں اور مادر ہند کی بیٹیاں بھی تھیں۔ میں ان سے ڈرائنگ روم میں ملنے کا عادی تھا۔ ان کو اس ماحول میں پا کر دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ وہاں کرسیاں اتنی ہی تھیں جتنی خواتین۔ میں نے ان سے بیٹھ جانے کی درخواست کی لیکن ان کا اخلاق اسے گوارہ نہ کرتا تھا کہ میں کھڑا رہوں اور وہ بیٹھ جائیں اور یا یہ کہ میں بیٹھ جاؤں اور ایک خاتون کھڑی رہیں۔ بہرحال میری التجا پر وہ بیٹھ گئیں اور میں کھڑا ان سے باتیں کرتا رہا۔ اس واقعہ نے میری تکلیف میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میری آنکھیں قلبی حالت کو ظاہر کرنے لگیں۔ میں جلد رخصت ہو کر چلا آیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ میری اس روز کی قلبی حالت کو میرے سوا کوئی اور بھی جانتا تھا۔ برسوں کے بعد ۳۷ یا ۳۸ میں ایک روز مسز لکشمی پنڈت میرے ہاں کھانے پر مدعو تھیں، مجھے چھیڑتے ہوئے مذاقاً کہنے لگیں کہ یہ ایسے ہوم ممبر تھے کہ اپنے قیدیوں کو دیکھ کر رونے لگتے تھے۔"

نواب صاحب نے اپنی autobiography میں لکھا ہے کہ

"سائمن کمیشن کی آمد تھی۔ ہندوستان کی مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے عقاید اور پروگرام کے مطابق تیاریاں شروع کیں جو تعاون کرنا چاہتے تھے وہ اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ سائمن کمیشن جہاں بھی گیا ان کے خلاف مظاہرے ہوئے پنجاب میں لالہ راجپت رائے کے چوٹ آئی جس سے کچھ روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ کانپور میں کمیشن کے خلاف مظاہرہ ہوا۔"

لکھنؤ میں بھی ان کمیشن کی آمد نواب صاحب کے لیے خاصی فکر و تشویش کا باعث تھی۔ انھیں اس کا خیال تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی افسوسناک صورت اپنے ان اہل ملک

کے ساتھ پیدا ہو جائے جو اُن کے ساتھ تعاون کے قائل نہ
تھے مگر وہ بدصورت اس دن پیش آکر رہی جس دن پنڈت
جواہر لال نہرو اور پنڈت گوبند ولبھ پنتھ ایک جلوس کی قیادت
کر رہے تھے۔ پولس نے انھیں روکا اور ایک ناخوش گوار واقعہ
پیش آکر رہا۔ اُس زمانے میں صوبے کے کُلّی اختیارات گورنر
کو حاصل تھے۔ گورنر نے براہ راست ضلع کے حکام کو ٹیلی فون کیا
کہ وہ ہر قیمت پر مظاہرہ کرنے والوں کو روکیں۔ اس حکم کی اطلاع
خود نواب صاحب کو بھی نہ تھی اور وہ بہ حیثیت ہوم ممبر اس سے
بے خبر تھے۔ ضلع کے حکام نے گورنر کے احکامات پر سختی سے عمل
کیا۔ پولس تشدد پر اتر آئی۔ سخت اور تکلیف دہ واقعہ پنتھ
جی کے ساتھ پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل دوسرے دن
آئی۔ جی کی خفیہ (Confidential) رپورٹ سے نواب
صاحب کے علم میں آئی۔ نواب صاحب کی طلبی پر سٹی مجسٹریٹ
حاضر ہوئے۔ نواب صاحب نے ان سے کہا کہ

"مقامی حکام جس طرح اپنے اختیارات تیزی کو کام
میں لا رہے تھے وہ بہت غیر موزوں اور نامناسب
تھے۔ کبھی اس کا خیال بھی کیا ہے کہ یہ لوگ
بھی ہمارے ہیں اور ہم ہی میں سے ہیں۔"

نواب صاحب نے اپنی Autobiography
میں لکھا ہے کہ

"میرا عقیدہ ہے کہ قواعد کیسے ہی ہوں تمام تر
مدار اس پر ہے کہ عمل کرنے والا کون ہے
اس زمانے کے قانون کے مطابق تمام سکریٹریوں
اور محکموں کے اعلیٰ افسر یعنی انسپکٹر جنرل یا
ڈائرکٹر جنرل کو یہ حق تھا کہ وہ گورنر سے بھی ملاقات
کریں۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس سے قبل
کے ممبر حکومت کسی خاص مسئلہ کو گورنر کے سامنے
پیش کرے۔ یہ مسئلہ گورنر کے گوش گذار ہو جاتا
تھا لہذا اس کے وہ پہلو گورنر کے ذہن نشین
ہو جاتے تھے جنھیں سکریٹری یا انسپکٹر جنرل ذہن
نشین کرانا چاہتا۔ اکثر یہ سب ممبر گورنمنٹ کے
بغیر علم و اطلاع ہوتا تھا۔ جب قاعدے کے مطابق
ممبر انچارج حکم آخری کی تجویز کو گورنر کے پاس لے
جاتا تو اسے دشواریاں ہوتی تھیں۔ رد و قدح
ہوتی اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ محکمہ کی رائے
غلط ہے گورنر کو اتفاق نہ ہوتا تھا۔"

نواب صاحب نے اپنی آپ بیتی (Autobiography)
میں لکھا ہے کہ

"کاکوری ڈکیتی کے مقدمے کے سلسلے میں سیٹھ
دامودر سروپ کو بریلی جیل میں مقید کیا گیا۔ اب
یہ پروونشل کانگریس کے صدر ہیں اس زمانے
میں بھی اونچے درجے کے کانگریسی خیال کیے جاتے
تھے۔ سیٹھ جی نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔
سیٹھ جی کہتے تھے وہ بیمار ہیں سول سرجن ان
کے مرض کو حیلہ بتاتا تھا۔ میں نے میڈیکل بورڈ
کے ذریعے ایک سے زیادہ ڈاکٹروں کی رائے
لی لیکن مسئلہ کچھ صاف نہ ہوا۔ سیٹھ دامودر
سروپ کی صحت گرتی جاتی تھی۔ وزن کم ہو رہا
تھا۔ سیٹھ جی یہ کہتے تھے کہ یہ مرض کا نتیجہ ہے
اور ڈاکٹر یہ کہتے تھے کہ یہ فاقہ کشی کا اثر ہے
میں چاہتا تھا کہ ضمانت پر چھوڑ دوں۔ گورنر کو
اعتراض تھا۔ آخر کار میں نے ارادہ کیا کہ خود
بریلی جیل میں جا کر سیٹھ جی کو دیکھوں۔ ایک دن
صبح میں بریلی پہنچا۔ جب میں اس کمرے میں
داخل ہوا جس میں سیٹھ دامودر سروپ لیٹے
ہوئے تھے تو پہلی نظر میں مجھے یہ خیال ہوا کہ پلنگ
خالی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک شخص آنکھیں
بند کیے بیٹھا ہے۔ میں نے اپنی عمر میں ایسا

ضعیف اور دبلی صورت کر دیکھی تھی۔ جیل کا
سپرنٹنڈنٹ کوئی انگریز ڈاکٹر تھا جو میرے
ساتھ تھا اس نے آواز دی "دامودر سروپ
ہم ممبر آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔ دامودر سروپ
نے آنکھیں کھولیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے
وہ بات نہ کر سکے۔ مجھے اُن کی آنکھوں میں آنسو
دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ
انھیں ضمانت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ واپسی پر میں
نے گورنر کو راضی کر لیا کہ انھیں ضمانت پر رہائی
دی جائے۔"

۱۷ جنوری کے روزنامچے میں نواب صاحب نے لکھا ہے
کہ

"مجھے مسرت ہے کہ سیٹھ دامودر سروپ کو آج
عدالت نے ضمانت پر چھوڑ دیا۔"

کاکوری قیدیوں کے سلسلے میں پنڈت گوبند
ولبھ پنت نے نواب صاحب کی توجہ مبذول کرائی کہ انھیں بی کلاس
دی جائے اور اُن کی ذہنی اور جسمانی تکالیف کو دور کر دیا جائے
نواب صاحب نے فوری احکامات جاری کر دیے۔ پنت جی نے
نواب صاحب کی ہمدردی اور انسانی خدمت کا شکریہ جس
طرح ادا کیا ہے وہ سنیے۔

ہلدوانی
۲ راپریل ۱۹۳۰ء

میرے عزیز نواب صاحب
میں تہ دل سے آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے
میرے اس تار کا فوراً جواب دیا جو میں نے
بریلی سینٹرل جیل میں کاکوری کیس والے
ملزموں کے متعلق آپ کو بھیجا تھا۔ اس کے
بعد میں نے اخباروں میں پڑھا کہ حکومت نے

انھیں 'بی' کلاس میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے
مجھے ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ ان لوگوں تک یہ
حکم پہنچا کہ نہیں اور نہ ہی یہ معلوم ہوا کہ ان کی
بھوک ہڑتال کے ختم ہونے کی کوئی اطلاع ملی۔ آپ
کے تار ملتے ہی میں نے انھیں بھوک ہڑتال ختم
کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن ابھی تک مجھے کوئی
جواب نہیں ملا۔ بہرحال میں یہ عریضہ آپ کو
مزید تکلیف دینے کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں
بلکہ مقصد ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرنا ہے
جو آپ مجھ پر فرماتے رہے ہیں۔

ہولی آئی بھی اور چلی بھی گئی لیکن اس سال
میں نے آپ کو نہیں چھیڑا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس
کی تلافی کس طرح کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ میں
آپ کو پھر ستاؤں لیکن آپ کی خندہ پیشانی
آپ کے اخلاق اور آپ کے وقار کی زد سے
تھوڑی دور رہ کر۔

ابھی تک کمر کے درد میں مبتلا ہوں۔ اس
سے مزید کچھ لکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ میں اس
امید پر اجازت چاہتا ہوں کہ شاید آپ سے
جلد نینی تال میں ملاقات ہو جائے۔

امید ہے کہ آپ مع متعلقین کے
بخیر ہوں گے۔

آپ کا مخلص

جی۔ بی پنت

[انگریزی سے ترجمہ]

نواب صاحب نے اپنی آپ بیتی An Autobiography
میں لکھا ہے کہ

"ایک روز میں دفتر میں بیٹھا تھا اور اسمبلی کا
اجلاس اُس روز ہونے والا تھا کہ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

Robert Wood - انسپکٹر جنرل پولس نے آکر مجھ سے کہا کہ ایک جلوس خواتین کا کونسل چیمبر کی طرف آرہا ہے۔ اُن کا منشا یہ تھا کہ کونسل چیمبر کے سامنے آکر مظاہرہ کریں اور ممبران کو چیمبر (Chamber) میں جانے سے روکیں۔ انسپکٹر جنرل نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے پولس کے ذریعے سے اس جلوس کو سڑک پر رکوا دیا ہے۔ خواتین سڑک پر بیٹھ گئی ہیں۔ حکومت کی دشواری یہ تھی کہ نہ خواتین کو گرفتار کیا جانا مناسب تھا اور نہ یہ ہی مناسب تھا کہ council chamber کے سامنے مظاہرہ ہو۔ میں نے آئی۔جی سے کہا کہ ان کے چند لیڈروں (Leaders) کو اجازت دی جائے کہ وہ کونسل چیمبر کے دروازے پر آکر جو مظاہرہ کرنا چاہیں وہ کریں۔

چنانچہ مسز متر ااور مسز بخشی آئیں۔ کچھ پرچے تقسیم کیے اور تقریر کی۔ میں نے آئی۔جی سے کہا کہ انھیں میرے دفتر کے کمرے میں بلا لو ایک یورپین ڈی۔وائی۔ایس۔پی گیا اور لوٹ کر اس نے جواب دیا کہ "جناب وہ کہتی ہیں کہ ہم کیوں ہوم ممبر کے دفتر جائیں۔ ہمیں کیا غرض؟"

یہ انداز مجھے بھی ناگوار ہوا لیکن انسپکٹر جنرل کے چہرے سے ناگواری کا اظہار بہت ہی صاف طور پر عیاں تھا۔ میں نے تھوڑی سی خاموشی کے بعد کہا

وہ بادشاہ کی رعایا ہیں اور میں ملازم۔ اگر وہ میرے پاس نہیں آتیں تو مجھے ان کے پاس جانا چاہیے۔ یہ کہہ کر میں دفتر سے اُٹھا اور Council Chamber کے بڑے دروازے پر پہنچا۔ مسز مترا کچھ تقریر کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کا پارہ چڑھ گیا۔ میں ان سے خوب واقف تھا اور وہ میری بیوی کی دوست تھیں۔ جوں ہی وہ رکیں میں نے اُن سے کہا کہ "آپ کی شورش سے نپٹنا میرے لیے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میں نے کہا کہ میں گورنر سے یہ کہوں گا کہ آئندہ میں اور میری بیوی مشترکہ ہوم ممبر ہوں۔ مسز مترا کا غصہ ڈھل گیا اور یہ طے پایا کہ جلوس نکلے اور جب Council Chamber کے دروازے میں مڑنا چاہے تو ایک چپراسی یہ کہہ دے کہ یہ شاہراہ عام (Thoroughfare) نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔"

نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ نہ صرف ملک کے عوام بلکہ مادر وطن کی بیٹیاں بھی اب غلامی کی زنجیروں کو اتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ وہ بھی اب ایک آزاد ملک میں رہنا چاہتی ہیں جہاں کالے اور گورے کا فرق نہ ہو، جہاں مذہب و ملت کا امتیاز نہ ہو۔ ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت سے سب کا ملک ہو اور سب اس کے حصہ دار ہوں۔ لہٰذا ان سب کے ساتھ جس حد تک ممکن ہو سکے نرمی برتی جائے۔

اصلی شان تدبر اس میں ہے کہ لوگوں کی دلجوئی کی جائے نہ کہ جبر و تشدد سے ڈرایا جائے۔

نواب صاحب نے اپنی Autobiography میں لکھا ہے کہ

"میں جانتا تھا کہ سول نافرمانی شروع ہوگی تو برٹش گورنمنٹ اُسے روکنے کی کوشش کرے

گی۔ بے شمار لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں گی حکومت کی پالیسی بے جا سختی کے خلاف تھی ہی کیوں نہ ہو عمال حکومت سے جہاں تہاں زیادتی ضرور عمل میں آئے گی۔ دوسری جانب کہیں یہ تحریک تشدد کا پیرایہ اختیار کرے گی وہاں دشواریاں بہت بڑھ جائیں گی۔ میں جانتا تھا کہ جب کسی ملک میں ہیجان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے خواہ وہ کسی جنگ عظیم کا نتیجہ ہو یا اس قسم کی تحریک کا۔ لوگوں کے دل سے قانون کی قوت جاتی رہتی ہے اور جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے یو۔پی میں میری پالیسی یہ تھی کہ زیادہ سختی نہ کی جائے۔ گو اس کا تعلق تمام ہندوستان سے تھا اور اس کے متعلق ہر پالیسی دہلی میں طے کی جاتی تھی لیکن صوبے کی حکومتوں کو بھی مشورہ دینے کا موقع تھا جس سے میں فائدہ اُٹھاتا تھا۔"

نواب صاحب نے لکھا ہے:

اسی سلسلے میں میرے روزنامچہ مورخہ ۳ر فروری کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"آج دو بجے گورنر کے پاس گیا تھا۔ بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ اسی سلسلے میں میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ نے سختی سے اس تحریک کو دبایا تو دو تین برس کے لیے دب جائے گی مگر پھر ابھرے گی۔ البتہ یہاں کے لوگوں نے اس کی مخالفت کی تو پھر یہ تحریک کبھی زندہ نہ ہوگی۔ انھوں نے اسے ملا بہرحال آج اُن کا رنگ اچھا تھا۔ شاید میرے نوٹ مورخہ ۱۵ر جنوری کا اثر تھا کہ میں نے اُن کی سختی کی پالیسی سے اختلاف کیا تھا۔"

یہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے کہ جب پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت گوبند ولبھ پنتھ بریلی جیل میں تھے۔ نواب صاحب ہوم ممبر کے عہدے پر فائز تھے۔ انھیں اطلاع ملی کہ جواہر لال جی کو Pleurisy ہو گئی ہے اور پنتھ جی Lumbago کے درد میں سخت مبتلا ہیں۔ نواب صاحب نے ایک D.O. آئی۔جی پریزن (I.G. Prison) کو تحریر کیا اور اُن کے علاج کے متعلق دریافت کیا اور اُن کی صحت کی طرف سے فکر وتشویش کا اظہار کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو ان دونوں عظیم ہستیوں کی صحت اور سلامتی کی کتنی فکر تھی وہ جانتے تھے کہ اگر ہندوستان آزاد ہوا تو یہی ہستیاں مستقبل کی قائد ہوں گی۔

لہٰذا D.O. مورخہ ۳ر مارچ ۱۹۳۲ء، نواب صاحب کی طرف سے بنام آئی جی پریزن پڑھیے جو نواب صاحب کی فکر وتشویش کا آئینہ دار ہے۔

مدراج اور حکم

انسپکٹر جنرل جیل

ذرا تکلیف کرکے بریلی جیل سے معلوم کیجیے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت گوبند ولبھ پنتھ کیسے ہیں اور ان کے حال سے مطلع کیجیے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کچھ عرصہ سے علیل ہیں۔ سنا ہے کہ ان کے پھیپھڑے کی جھلی میں پانی آگیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ اور اگر سچ ہے تو کیا اب کچھ افاقہ ہے اور طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے۔ پنڈت گوبند ولبھ پنتھ پچھلے دو برسوں سے عرق النسا میں مبتلا ہیں اب اُن کا کیا حال ہے؟ کیا مرض میں کوئی کمی ہوئی؟

احمد سعید خاں
دستخط

۱۳۔۳۔۳۲ء

آنریبل ہوم منسٹر
رپورٹ نمبر ۳۶ (خفیہ) مورخہ ۱۷ر مارچ ۱۹۳۲ء از سپرنٹنڈنٹ بریلی جیل اطلاع کے لیے منسلک ہے۔

انسپکٹر جنرل جیل

۱۸-۳-۳۲ء

[انگریزی سے ترجمہ]

برٹش حکومت نے سیاسی قیدیوں سے ملاقات پر روک اور پابندی لگادی تھی۔ یہ زمانہ ۱۹۳۲ء مارچ کا تھا۔ اس وقت مسز وجے لکشمی پنڈت، مسز اوما نہرو اور مس نہرو (مس نہرو غالباً مسز اندرا گاندھی ہیں) لکھنؤ جیل میں تھیں اور پنڈت جواہر لال نہرو بریلی جیل میں تھے۔ مسز نہرو ڈاکٹر نہرو آئی۔ سی۔ ایس کی بیوی نے نواب صاحب سے درخواست کی کہ انھیں مسز پنڈت، مس نہرو اور مسز اوما نہرو سے لکھنؤ جیل میں ملنے کی اجازت دی جائے اور بریلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنے کی اجازت دے دی جائے۔ باوجود حکومت کی طرف سے پابندی کے نواب صاحب نے مخصوص اجازت دے دی اور آئی۔ جی جیل نے لکھنؤ اور بریلی احکامات بھیج دیے — جوڈیشیل سکریٹری کے لیے نواب صاحب کا حکم مورخہ ۹ر مارچ ۳۲ء دیکھیے:

اندراجات اور احکامات

سکریٹری محکمہ قانون

ڈاکٹر نہرو آئی۔ سی۔ ایس کی اہلیہ مسز نہرو کی خواہش ہے کہ وہ لکھنؤ جیل جاکر۔ مسز پنڈت، مس نہرو اور مسز اوما نہرو سے ملیں۔ اس کے بعد وہ نینی تال جاتے ہوئے بریلی جیل میں پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملنا چاہتی ہیں — مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ سکریٹری براہ مہربانی اسے انسپکٹر جنرل جیل کو بھیج دیں تاکہ وہ جیل کے سپرنٹنڈنٹوں کو ہدایات دے دیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ ملنا چاہیں انھیں ضابطہ کی پابندی کرتے ہوئے جیل سپرنٹنڈنٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔ اگر ہر شخص گورنمنٹ کے ذریعے اجازت حاصل کرنے لگے تو ہوم ممبر کو ملاقات کی اجازت دینے کے علاوہ اور کسی کام کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔ لیکن خاص طور سے اس معاملہ کو میں سکریٹری کو بھیج رہا ہوں۔

دستخط احمد سعید خاں

۹-۳-۱۹۳۲ء

انسپکٹر جنرل جیل

براے مہربانی متعلقہ جیلوں کے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دے دیا جائے اور اس فائل کو مجھے واپس کر دیا جائے۔

دستخط اسمتھ
(سکریٹری)
۹-۳-۳۲ء

سکریٹری
متعلقہ جیلوں کو ہدایت کر دی گئی ہے۔

انسپکٹر جنرل جیل
۱۱-۳-۳۲ء

یہ واقعہ ۷ر مئی ۱۹۳۲ء کا ہے۔ اس وقت جواہر لال نہرو دہرہ دون جیل میں تھے اور اُن کے برادر نسبتی (Brother in Law) مسٹر رنجیت پنڈت الٰہ آباد جیل میں تھے۔ رنجیت پنڈت سے ملنے کے لیے مسز موتی لال نہرو مسز کملا نہرو اور مس اندرا نہرو گئے۔ مسٹر رنجیت پنڈت نے اپنے بچوں کی خیریت اور تعلیم کی بابت دریافت کیا اس پر مس اندرا نہرو نے ایک پرچہ پڑھ کر سنانا شروع کیا مسٹر

پنڈت نے وہ پرچہ مس اندرا نہرو کے ہاتھ سے لے لیا اور پڑھنا شروع کیا۔ یہ پرچہ یقینی اسکول کی رپورٹ سے متعلق تھا جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خط مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۳۲ء جو سپرنٹنڈنٹ جیل کے نام ہے، بیان ہوتا ہے۔ جیلر نے اس پر سختی سے اعتراض کیا۔ گندہ اور ناگفتہ باتیں کہہ ڈالیں۔ مسز موتی لال نہرو اور مسز کملا نہرو کے انٹرویو [illegible] ممنوع کر دیے۔ اس پورے واقعہ کی تفصیل ۱۰ جولائی ۱۹۳۲ء کے اخبار میں پڑھیے جو مسز موتی لال نہرو اور مسز کملا نہرو کے بیان ([illegible]) پر مبنی ہے اور جو حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو
انٹرویو کیوں بند کر دیے گئے
مسز موتی لال اور مسز جے نہرو پر الزامات
خواتین کی تردید

کوئی سرکاری مراسلہ تو اس بارے میں نہیں شائع ہوا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی والدہ اور اہلیہ کو ان سے ایک مہینے کے لیے ملاقات کی اجازت نہیں ہے لیکن دہرہ دون سے (جہاں کہ پنڈت جواہر لال نہرو اسیر ہیں) اطلاع ملی ہے کہ الٰہ آباد جیل میں مبینہ ایک واقعہ کی بنا پر حکومت نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ واقعہ اس وقت ہوا جب مسز موتی لال نہرو، مسز جواہر لال نہرو اور مس اندرا نہرو پنڈت موتی لال نہرو کے داماد مسٹر رنجیت پنڈت سے ملنے الٰہ آباد ڈسٹرکٹ جیل گئی تھیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس معاملہ پر حکومت کو ایک مراسلہ اس وقت دہرہ دون جیل سے بھیجا جب جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے انھیں حکومت کے اس فیصلے سے مطلع کیا کہ ۲۳ جون کو انھیں اپنی والدہ، بیوی اور مس شیاما کماری نہرو سے ملاقات کی اجازت نہیں ہے۔ جیل کے انسپکٹر جنرل نے انھیں اس کا مطلب سمجھا دیا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ انسپکٹر جنرل نے پنڈت جواہر لال نہرو کو مطلع کیا ہے کہ ۱۰ مئی کو مسٹر رنجیت پنڈت سے ملاقات کے دوران مس جواہر لال نہرو نے ایک خط مسٹر پنڈت کو دیا اور جب جیل سپرنٹنڈنٹ نے اس پر اعتراض کیا تو مسز موتی لال نہرو نے ناشائستہ اور غیر مہذب الفاظ میں جیل سپرنٹنڈنٹ کو جواب دیا۔ انسپکٹر جنرل کا کہنا ہے کہ مسز موتی لال نہرو اور مسز جواہر لال نہرو کی پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات ایک مہینے کے لیے روک دی گئی ہے۔

غیر سرکاری ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے انسپکٹر جنرل جیل کو ان کے خط کے جواب میں ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ الزام کو صحیح ثابت کریں۔ انھوں نے اپنی والدہ پر لگائے ہوئے الزام پر سخت برہمی کا اظہار کیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک اس کا یقین نہ دلایا جائے کہ ان سے ملنے والوں کی عزت واحترام کا لحاظ رکھا جائے گا وہ کسی سے ملاقات نہیں کریں گے

چونکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ مسٹر رنجیت پنڈت سے ملاقات کی اجازت عارضی طور پر بند کی گئی ہے اس لیے پریس کے ایک نمائندے نے مسز موتی لال نہرو سے مل کر ان سے اس معاملے کے متعلق گفتگو کی۔ انھوں

نے فرمایا:

مجھے بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے خط سے معلوم ہوا کہ میری ملاقات کی منسوخی کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ میں نے الٰہ آباد کے ڈسٹرکٹ جیلر سے گفتگو میں کوئی نازیبا کلمات استعمال کیے۔ مجھے ملاقات کی منسوخی کے متعلق تو کچھ نہیں کہنا ہے۔ کیونکہ یہ معاملہ دوسروں کے اختیار میں ہے لیکن یہ الزام سراسر غلط ہے کہ میں نے کوئی نازیبا الفاظ استعمال کیے۔

واقعہ یہ تھا کہ جب ہم اور ہمارے بیٹے کی بیوی اور لڑکی رنجیت سے ملاقات کے لیے جیل پہنچے تو رنجیت نے سب سے پہلے اپنے بچوں کی خیریت پوچھی جو پونا میں زیر تعلیم ہیں۔ میرے پاس وہاں سے کوئی خط نہیں آیا تھا لیکن میری پوتی اندرا کے پاس (جو خود بھی پونا میں زیر تعلیم ہے) خط آیا تھا۔ اس کی مجھے خبر نہیں تھی۔ اس لیے اس نے رنجیت کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے خط پڑھنا شروع کر دیا۔ خط میں شاید تین چار سطریں تھیں۔ رنجیت نے خط لے لیا اور اسی وقت جیل کے کارندے نے جو وہاں کھڑا ہوا تھا رنجیت کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ اس پر جیل کے کارندے اور رنجیت میں کچھ بات چیت ہوئی اور کارندہ جیلر کو بلا لایا۔ جیلر کچھ غصہ میں بھرا ہوا آیا اور اس نے کچھ انگریزی اور کچھ ہندوستانی میں کہنا شروع کیا۔ وہ بہت غصے میں تھا جب وہ رنجیت سے خط چھیننے کے لیے بڑھا تو میں نے اس سے کہا کہ ذرا بھل منساہت سے کام لیجیے۔ رنجیت نے جیلر سے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ کو بلا لیجیے۔ اس پر جیلر نے کہا کہ میں سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ اس پر میں نے کہا کہ تم سپرنٹنڈنٹ ہی نہیں لاٹ صاحب اور گورنر جنرل بھی ہو۔ لیکن وہ اس قدر غصے میں تھا کہ اسی حالت میں بہت کچھ کہا اور ملاقات کو ختم کرنے کا حکم دے کر چلا گیا۔ حالانکہ ملاقات ابھی گویا کہ شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔

مسز موتی لال نہرو نے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوا اور نہ ہی ان سے کسی نے اس کے متعلق کچھ پوچھا۔ [انگریزی سے ترجمہ]

مسز جواہر لال کا بیان

مسز جواہر لال نہرو نے انٹرویو کے دوران فرمایا:

انسپکٹر جنرل نے اپنے خط میں پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا ہے کہ ہم لوگوں کی ملاقات روکنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ۲۷ مئی کو مسز رنجیت کو میں نے الٰہ آباد ڈسٹرکٹ جیل میں کوئی خط دیا تھا۔ انسپکٹر جنرل کا یہ بیان بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ میں نے کوئی خط مسز پنڈت کو ملاقات کے دوران نہیں دیا۔ واقعہ یہ تھا جیسے ہی مسٹر پنڈت جیل کے اندر سے آئے، انھوں نے اپنے بچوں کے متعلق دریافت کیا جو پونا میں زیر تعلیم ہیں جہاں میری بیٹی اندرا بھی پڑھتی ہے۔ اندرا نے ایک پرچہ پڑھنا شروع کیا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ مسٹر پنڈت نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس پر جیل کے کلرک نے جو ملاقات کے وقت موجود تھا، انھیں ایسا کرنے سے روکا اور جیلر کو بلا لیا

جیلر فوراً قریب کے کمرے سے ننگے پاؤں نکل آیا۔ ان میں اور مسز پنڈت میں کچھ گفتگو ہوئی۔ مسز پنڈت نے پرچہ اندرا کو واپس کر دیا۔ اس پرچے والے میں یہ صرف اتنا لکھا تھا کہ میں نے جیلر سے کہا کہ وہ مداخلت نہ کریں اور نرمی سے گفتگو کریں اور وہ خط خود پڑھ لیں جس میں صرف لڑکیوں کی صحت کے متعلق لکھا تھا اور کچھ نہیں۔

گفتگو ختم کرتے ہوئے مسٹر جواہر لال نہرو نے فرمایا کہ حکومت نے بغیر کسی تحقیق کے میرے خلاف اتنا بڑا الزام لگایا ہے۔ اس کو چاہیے کہ معاملے کی تحقیق کرے اور اپنی غلطی تسلیم کرے۔

اس واقعہ کی اطلاع پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی جو اس وقت دہرہ دون جیل میں تھے ملی۔ پنڈت جی جیسی خود دار ہستی، بے لوث خدمت کرنے والی ذات کو سخت تکلیف اور ناگواری ہوئی۔ انہوں نے ایک خط سپرنٹنڈنٹ جیل دہرہ دون کو لکھا اور ان واقعات کی تردید کی جن کے بے بنیاد الزامات اُن کی والدہ محترمہ اور مس اندرا نہرو اور اُن کی رفیقۂ حیات مسز کملا نہرو پر لگائے گئے تھے۔ اس کی تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جائے گی۔

"غور کیجیے! یہ غفلت زدہ، ستم رسیدہ بچے جب زندگی میں قدم رکھیں گے اور اختیار و طاقت اُن کے ہاتھ میں آئے گی تو یہ کیا قیامت ڈھائیں گے۔ اندھی جدیدیت اور مغرب سے مرعوبیت کا جو جنون ہمارے روشن خیالوں کے ذہنوں پر چھا گیا ہے وہ صاف کہہ رہا ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہندوستان کے نوجوانوں کا وہی حال ہوگا جو امریکہ اور ایک حد تک یورپ کے نوجوانوں کا بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہوا ہے۔"

سید حامد

الیکٹرانکس اور ہم

خالد یوسف خاں

الیکٹرانکس کی ترقی کو ناپنے کا اگر کوئی پیمانہ ہوتا تو وہ آج کے دور میں بدلنا پڑتا۔ ہر دن الیکٹرانکس کا ایک نیا کرشمہ ایک نئی ایجاد ایک نیا انداز دنیا کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ عقل حیران ہے، دماغ کافی کچھ سمجھنے سے قاصر ہے لیکن "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا"۔ جب ایک چیز سامنے ہوتی ہے تو وہ اور اس کی مکینکی سمجھ میں آئے یا نہ آئے آنکھ کے دیکھے ہوئے پر یقین تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

ایک زمانہ ٹیوب (Tube) الیکٹرانکس کا تھا۔ شیشے کے ٹیوب میں فلامنٹ (تار) والے ڈایوڈ (Diode) پینٹوڈ (Pentode) وغیرہ الیکٹرانک پرزے ہوتے تھے۔ سیمی کنڈکٹر (Semi-Conductor) کی ایجاد نے بڑے بڑے ٹیوب کی جگہ ٹرانسسٹرز (Transistors) کو لاکھڑا کیا۔ ٹرانسسٹر کی ایجاد نے الیکٹرانکس کی دنیا میں ہنگامہ سا کر دیا اور جلد ہی چپس (Chips) اور ماسفائے ([illegible]) نے پرزوں کی ساخت اور کام میں تناسب کو بے انتہا گھٹا دیا۔

۱۹۳۸ء میں ایک کمپیوٹر بڑے کمرے میں سیٹ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے تار و پرزے ایک بڑے کرگھے کا سا گمان کراتے تھے مگر آج ۲ × ۶ ½ ۲ کی سیریز ۴۔ ۵ کمپیوٹر بہ آسانی رکھے جا سکتے ہیں۔

کمپیوٹرس کا استعمال آفس سے لے کر ہوائی جہاز میں کیا جاتا ہے لیکن اس کا بہترین اور قابل تعریف استعمال فیکٹریوں میں روبٹ (Robot) کی شکل میں کیا جا رہا ہے۔

روبٹ (Robot) دراصل الیکٹرانک اور میکینکل پرزوں کا بنا ہوا نقلی آدمی ہوتا ہے جو دیے ہوئے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہے۔ آدمی سے زیادہ تیزی اور صفائی (Accuracy) سے کام کرنے کی وجہ سے روبٹ ترقی یافتہ ممالک میں جلد ہی عام ہو گئے۔ امریکہ اور جاپان میں خصوصاً صفائی و تیزی سے کام کرنے کے لیے انسانوں کے بجائے انسانوں کے بنائے ہوئے مشینی آدمی روبٹ کو بھروسے مند کاریگر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

ٹی۔وی اور وی۔سی۔آر کے اندر سولڈرنگ (Soldering) تاروں کے ٹانکے لگانے کا کام ایک روبٹ آدمی کے مقابلے کہیں صفائی (Accuracy) کے ساتھ کرتا ہے۔ جھاڑو لگانا اور بڑے بڑے اسٹور روم (Store room) سے سامان لانے اور لے جانے کا کام بالکل عام سا ہو گیا ہے۔

اس وقت روبٹ کی دنیا میں ایک نئی لہر آئی ہوئی ہے۔ اس نئی لہر کا نام ہے منی روبٹ Mini-Robot

۱۲۷، الف خاں سرائے، بدایوں

یعنی چھوٹا روبٹ۔ اس کا سائز کم کرکے ایک سوئی کے سوراخ والے سرے کے برابر کر دیا گیا ہے اسے انسان کے خون کو لے کر چلنے والی نسوں میں چھوڑا جا سکتا ہے۔ یہ اندر نسوں میں جمی ہوئی چربی کا حساب یعنی مقدار بتائے گا اور اسے صاف کر کے خون کے بہاؤ کو معمول پر لانے میں مدد دے گا جس سے بلڈ پریشر (Blood Pressure) اور دل کے درد والے مریضوں کا علاج مہینوں کے بجائے اب دنوں میں کیا جا سکے گا۔

روبٹ کی دنیا کے ایک ماہر ڈاکٹر جیراٹ۔ Dr. ... کا کہنا ہے کہ عنقریب ہم منی روبٹ کا استعمال بڑے پیمانے پر کرنے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر جیراٹ کے مطابق کئی ملک مل کر ہزاروں ملین ڈالر خرچ کر کے ایسے روبٹ تیار کر رہے ہیں جو نیوکلیر توانائی اسٹیشنوں (Nuclear Power Stations) پر ایسی جگہ اور وہ کام کریں گے جہاں جا کر وہ کام کرنا آدمی کو نیوکلیر شعاعوں سے خطرے کی وجہ سے ناممکن تھا۔ ایک اور مغربی کمپنی تیز رفتار آمد و رفت کے ذرائع Transportation کے لیے خصوصی روبٹ تیار کر رہی ہے لیکن سب سے بہترین اور دل کو چھو لینے والا کام منی روبٹ کا لگتا ہے۔ جو انسان کے خون میں جا کر نسوں کی اندرونی تہہ کی چربی اور آنتوں کے پھوڑے و دیگر نامعلوم بیماریوں کی صحیح خبر دے کر انسانوں کی جان بچانے میں مدد کریں گے۔

الیکٹرانکس کی دنیا میں امریکہ نے ایک اور بڑا قدم بڑھایا ہے اور اس کا نام ہے ورچوئل ورلڈ Virtual World یعنی نہ دکھائی دینے والی دنیا جو اس دنیا میں رہتے ہوئے اس دنیا سے مختلف اور اپنے تخیل سے سوچی ہوئی دنیا ہو۔

اس کے لیے سائنس دانوں نے ایک ماسک (Mask) پہننے کا خول تیار کیا ہے جس میں تھری ڈائمنشن لینس (Three dimension lense) لگے ہوئے ہیں اور ہاتھوں کے خصوصی دستانے بنائے ہیں۔ یہ ماسک اور دستانے کسی آدمی کو پہنا کر ماسک اور دستانوں کا تعلق کمپیوٹر سے کر دیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر میں پروگرام کے مطابق آدمی اپنے آپ کو اڑتا ہوا سا اپنے کمرے کے ماحول سے بالکل مختلف ایک نئی دنیا میں پاتا ہے اور دستانوں سے کسی اشیاء کو چھونے پر کیفیات بھی معمول سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس سسٹم (System) کو ایجاد کرنے والے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب دو مختلف شہروں میں رہنے والے یہ ماسک اور دستانے پہن کر اپنے اپنے کمپیوٹر کو ٹیلیفون سے جوڑ کر نئے نئے کھیل کھیل سکیں گے۔

جاپان نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرنے کے بعد امریکہ کی طاقت کے آگے سر جھکا دیا تھا لیکن اس نے مسلمانوں کی طرح اپنی تعلیم اور قوت ارادی کو مجروح یا مسمار نہیں ہونے دیا اور یہی وجہ ہے کہ آج جاپان کسی بھی طرح کی ٹکنالوجی (Technology) میں امریکہ سے پیچھے نہیں ہے آج الیکٹرانکس بلکہ ہر سائنسی اشیا کی منڈیاں جاپان کے ہاتھ میں ہیں۔

ایک جاپانی سائنس داں مسٹر فزوتا (Mr. Fzuta) کا کہنا ہے کہ میں ایک ایسا روبٹ بنانے میں لگا ہوں جو چار طرح کی حس کا مالک ہوگا۔ اس طرح کے دو روبٹ ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے اور آپس میں ہاتھ ملا کر (ایک نظریے سے) اپنے انسان ہونے کا ثبوت دیں گے (یاد رہے قدرت نے انسان کو ۵ حس کا مالک بنایا ہے)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر سائنس کا استعمال تعمیری کاموں میں کیا جائے تو منی روبٹ کے بعد بھی بہت سی مفید چیزیں ایجاد ہو سکتی ہیں۔

بھیک مانگنا اور ہاتھ پھیلانا

محمد مختار اصلاحی علیگ ○

بھیک مانگنا اور کسی سے سوال کرنا اچھی عادت نہیں ہے۔ ایک انسان اپنے ہی جیسے ایک انسان کے سامنے منت و سماجت کے ساتھ اپنی غرض کے لیے ہاتھ پھیلائے تو یہ بڑی بے عزتی اور بے شرمی کی بات ہے اور انسانیت کی کھلی توہین بھی۔ عزت و خودداری ایک قیمتی جوہر ہے اس کی حفاظت کرنا ہر شخص کا فرض ہے دانش مندوں کا کہنا ہے کہ:

"حقیر سے حقیر پیشہ اختیار کرنا ہاتھ پھیلانے سے بدرجہا بہتر ہے"

تمام مذاہب نے بھی جہاں خیرات اور دان دینے کو اچھا کہا ہے، وہیں یہ بات بھی بتائی ہے کہ خیرات صرف اندھوں، اپاہجوں اور انتہائی بے بس و مجبور لوگوں کا حق ہے۔ جو شخص کسی طرح بھی حرکت اور محنت کر کے اپنا پیٹ بھر سکتا ہو، اس کو لینا بھی برا ہے اور دینا بھی برا۔ اندھا بھی اگر تندرست ہے اور ہاتھ پاؤں کو حرکت میں لا کر کچھ کر سکتا ہے تو اسے بھی بھیک مانگنا درست نہیں۔ اسی طرح لنگڑا لولا جو زیادہ کمزور و مجبور نہیں ہے اور بیٹھ کر بھی کچھ کر سکتا ہے تو اسے بھی سوال کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں فقیروں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ خاص طور سے ہندو پاک اور بنگلہ دیش میں فقیروں اور بھکاریوں کا جو تناسب ہے وہ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دینے اور لینے والے دونوں اپنے فرائض و حقوق کا صحیح احساس نہیں رکھتے۔ دینے والوں کا یہ فرض ہے کہ سب سے پہلے وہ یہ دیکھیں کہ جس کو خیرات دے رہے ہیں وہ صحیح معنی میں اس کا مستحق بھی ہے یا نہیں؟ ہم آنکھیں بند کر کے جب ہر مانگنے والے کی مٹھی بھر دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کر کے اپنا پیٹ بھر سکتے تھے ان کو ناکارہ و نکما بنانے میں بڑا ہاتھ ہمارا بھی ہے۔ عورتیں خاص طور سے مستحق اور غیر مستحق کا فرق نہیں سمجھتیں۔ جو بھی ان کے سامنے چکنی چپڑی باتیں کر لیتا ہے وہ بہت جلد پسیج کر کچھ نہ کچھ اس کے حوالے کر دیا کرتی ہیں۔ بہت سے تندرست اور ہٹے کٹے فقیر و فخر کے ساتھ اپنے کو خاندانی شاہ کہتے ہیں، اونچی سے اونچی بلڈنگوں پر چڑھ کر زور دار آواز لگا کر یا گانا گا کر اور منہ دیکھی تعریفیں کر کے بڑی بے حیائی کے ساتھ پیسے وصول کرتے ہیں اور شام تک اپنی جھولی بھر لیتے ہیں۔ انھیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ اس طرح وہ مجبوروں اور اپاہجوں کا حق مار کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر رہے ہیں۔ ان کا یہ گراہوا فعل یقیناً مذہب، اخلاق اور ملکی مفاد سب کے خلاف ہے۔

موجودہ زمانے میں بھیک مانگنا اور سوال کرنا

○ اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ، بمبئی۔

فن اور آرٹ بن گیا ہے۔ اب بھکاری بھیک وصول کرنے کے لیے نئے نئے اور طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان بے شمار واقعات میں سے جو وقتاً فوقتاً اپنے مشاہدے میں آتے رہتے یہاں صرف چند کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے بآسانی یہ اندازہ ہو سکے گا کہ یہ فن اپنے کس درجۂ کمال کو پہنچ چکا ہے۔ ایک عرصۂ دراز کا واقعہ ہے کہ مطب میں ایک نوعمر لڑکا آیا اور جو لوگ بیٹھے تھے سب کو ایک ہینڈ بل تقسیم کیا جس میں لکھا تھا کہ یہ لڑکا گونگا ہے۔ اس کے ماں باپ مر گئے ہیں، قابلِ رحم ہے۔ دل کھول کر مدد کیجیے۔ میرے ایک درد مند دوست بھی اس وقت موجود تھے، ترس کھا کر مجھ سے کہنے لگے بچہ کم سن ہے اور کسی اچھے گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کا علاج ہو سکتا ہے تو جتنی بھی رقم لگے گی میں خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس بات کو سن کر جب بے اختیاری میں گونگے لڑکے نے خوش ہو کر سر ہلایا تو مجھے یہ خیال ہوا کہ جب لڑکا بآسانی ہماری بات سن رہا ہے تو یہ گونگا نہ ہوگا۔ میز پر جو قلم رکھا ہوا تھا وہ میں نے چپکے سے ہاتھ میں لے لیا اور لڑکے کی زبان دیکھنے کے بہانے منہ کھلوایا۔ جیسے ہی اس نے منہ کھولا تو قلم جھٹکے سے منہ کے اندر ڈال دیا۔ اس کے نتیجے میں اس کی بلند زبان باہر نکل آئی۔ اس فریب اور ڈھونگ پر غصہ میں آ کر میرے دوست نے جب اسے پیٹنا شروع کیا تو اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ ایسی حرکت کبھی نہ کرے گا۔ یہ بھی اسی طرح کا ایک پرانا واقعہ ہے کہ ایک چوراہے پر دو ساتھیوں کے ساتھ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک فقیر بڑی دردناک آواز کے ساتھ گھسٹتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ اس کی حالت پر ترس کھا کر جیب سے نکال کر کچھ دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک صاحب نے جھپٹ کر اس کی پیٹھ پر دو لاتیں رسید کیں اور کہا کم بخت رات کو وقت گانا گا کر پڑوسیوں کی نیند حرام کرتا ہے اور دن کو یہ ناٹک کر کے لوگوں کو لوٹتا ہے۔ ڈھونگی فقیر کی پشت پر جیسے ہی لات پڑی وہ بڑی تیزی سے رفوچکر ہو گیا۔ کچھ لوگ

ہنس رہے تھے اور کچھ اس بے حیائی و بے غیرتی پر انتہائی حیرت زدہ تھے۔ چند سال پہلے ایک صاحب عمدہ قسم کا سوٹ بوٹ پہنے اور بیگ ہاتھ میں لیے ہوئے اصلاحی دواخانہ میں آئے۔ ہاتھ میں منی آرڈر فارم بھی تھا۔ گھبرائی ہوئی صورت بنا کر کہنے لگے کہ علی گڑھ سے یہاں ایک فرم میں انٹرویو دینے آیا تھا۔ بس سے اترتے ہوئے بھیڑ میں جیب کٹ گئی اور جو رقم تھی وہ سب نکل گئی۔ آپ کا بورڈ دیکھ کر کہ آپ بھی کالج علی گڑھ کے سند یافتہ ہیں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ اگر کسی صورت سے کرایہ اور زادِ راہ کا انتظام ہو جاتا تو میں آج ہی علی گڑھ روانہ ہو جاتا۔ فارم پر آپ کا پتہ لکھ لیتا ہوں، جاتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ کچھ جگہوں کے نام دریافت کیے تو اندازہ ہوا کہ علی گڑھ ہی کے رہنے والے ہیں بے چون و چرا اُن کا مطالبہ پورا کر دیا لیکن کئی ماہ گزر گئے اب تک ان کے منی آرڈر کا کہیں پتہ نہیں ہے

آج کل آتے جاتے اکثر ایک بڑے میاں کو دیکھتا ہوں جو سر سے پیر تک فقیرانہ لباس میں ملبوس کسی منتخب جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں اور رومال پھیلا دیتے ہیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر "زر دار زمی کشد" کے مقولے کے پیشِ نظر اپنی ہی جیب سے مختلف قسم کے سکے نکال نکال کر سارا رومال بھر دیتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر گریہ و زاری کے ساتھ دینے والوں کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔ بعد میں آنے والے یہ سمجھ کر کہ یقیناً یہ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں جب ہی تو یہ ساری رقم ان پر نچھاور ہو رہی ہے۔ رومال میں مزید رقم ڈالتے جاتے ہیں۔ اس طرح جب اُن کا کوٹا پورا ہو جاتا ہے تو رومال سمیٹ کر اپنے گھر روانہ ہو جاتے ہیں۔

بعض شہروں میں باقاعدہ فیراتی دفتر قائم ہیں جہاں صدقہ خیرات کرنے والوں کی بھی فہرست اور پتے درج ہیں یہ پیشہ ور بھکاری کبھی کسی بیوہ اور کبھی کسی بیمار ضعیفہ کی طرف سے دردناک و موثر اپیل لکھ کر مدد کے طالب ہوتے ہیں

اور رقم اپنے پیٹ پر ستا کر ہزاروں روپیہ ہر ماہ اکٹھا کرتے ہیں
کچھ پیشہ ور بھکارنیں عمدہ لباس پہن کر یا اچھا سا برقعہ اوڑھ کر
چھوٹا بچہ ساتھ میں لے کر دست سوال دراز کرتی ہیں تاکہ لوگ
یہ خیال کر کے زیادہ سے زیادہ رقم دیں کہ یہ کسی بڑے گھر کی
عورت ہے جو گردش زمانہ سے آج بھیک مانگنے پر مجبور
ہو گئی ہے۔

کچھ لوگ بیمار بن کر ثبوت میں لیبارٹری اور ڈاکٹر
کا نسخہ دے کر بھیک مانگتے ہیں۔ کچھ مکار فقیر یوں ہی ہاتھ
یا پیر میں پٹی باندھ کر اس پر خون لگا لیتے ہیں۔ تاکہ یہ ایک نظر
دیکھ کر لوگ ترس کھائیں۔ ان تمام طریقوں میں انتہائی سفاکانہ
طریقہ یہ ہے کہ کچھ درندے نما انسان چھوٹے بچوں کو پکڑ کر
اُن کو اندھا لولا بنا کر بھیک منگواتے ہیں اور ان کی کمائی
سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ بلاشبہ اس دور میں بھیک مانگنے
کے اتنے زیادہ طریقے رائج ہیں کہ اگر ان سب کا ذکر کیا جائے
تو علیحدہ ایک کتاب بن سکتی ہے۔ ہندو پاک میں خاص طور
سے بھیک مانگنا عیب نہیں سمجھا جاتا۔ کچھ ہی دن ہوئے
حکومت پاکستان کے انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز" نے
بھی سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ دریوزہ گری دور حاضر
کا ایک منظم فیشن بن گیا ہے۔ ہمارے یہاں کے بھکاری بھی
کسی تھیٹر کے اداکاروں کی طرح اپنے کو بیمار و معذور ظاہر
کرنے کے لیے زبردست ڈھونگ رچاتے ہیں۔ جولائی ۱۹۹۰ء
کے ایک جائزے کے مطابق پاکستان میں فقیر کی اوسط
آمدنی ماہانہ چھ ہزار سے آٹھ ہزار روپے تک ہے۔ عورتوں
کی آمدنی مردوں سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔ پاکستان میں
بھکاریوں کی تعداد تین لاکھ کے قریب ہے۔ کم و بیش یہی اوسط
ہندوستان اور بنگلہ دیش کا بھی ہوگا

نقصانات : بھیک مانگنے کے نقصانات بہت زیادہ
ہیں۔ چند خاص نقصانات یہ ہیں:

۱۔ یہ بری عادت متعدی بیماری کی طرح ہے جو ایک سے
دوسرے میں منتقل ہوا کرتی ہے۔

۲۔ بھیک مانگنے سے انسان بالکل کاہل اور اپاہج ہو جاتا
ہے اور پھر وہ محنت کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔

۳۔ انسان کی عادات و اطوار اور اخلاق پر بھی اس
کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔

۴۔ شرم و حیا، غیرت و حمیت اور عزت و خودداری
جو انسان کے قیمتی جوہر ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔

۵۔ بھکاری رقم رکھتے ہوئے بھی ناداری کا اظہار کرتا ہے
اس طرح کفران نعمت جھوٹ اور مکاری تینوں برائیوں
کا بیک وقت ارتکاب کرتا ہے۔

۶۔ بھکاریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے کام
کرنے والے آدمیوں کی کمی ہو جاتی ہے۔

۷۔ جس معاشرے میں ننگے اور بھکاری زیادہ ہوں
گے وہ معاشرہ کمزور ہو جائے گا اور ایسا کمزور معاشرہ
ملک کی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنے گا۔

تدارک : ساری دنیا اور خاص کر ترقی پذیر ملکوں
میں گداگری کا انسداد و روک تھام کچھ بہت آسان نہیں ہے
کیونکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ بے سہارے اور
پشتہا پشت سے جو طبیعتیں تن آسانی اور مفت خوری کی
عادی ہو چکی ہیں ان کو ایک دو دن میں بدلا نہیں جا سکتا
لیکن اگر اس مہم میں مرکزی و ریاستی حکومتیں، سیاسی و نیم سیاسی
جماعتیں، تعلیمی و غیر تعلیمی ادارے، معاشرے و سوسائٹیاں،
اخبارات و رسائل سب مل کر اس کے تدارک کی بھرپور
کوشش کریں تو اس لعنت کو بڑی حد تک دور کیا جا سکتا
ہے۔ اس میں سب سے بڑی ذمہ داری حکومت وقت کی
ہے کیونکہ نشر و اشاعت کے تمام اہم ذرائع اور وسائل اسی
کے ہاتھ میں ہیں اور ہر طرح کی طاقت و قوت بھی۔

۱۔ حکومت کو چاہیے کہ گداگری کے لیے از سر نو مکمل قانون
مرتب کرے اور اس پر سختی سے کاربند ہو۔

۲- جو ہٹے کٹے، تندرست و توانا بھکاری نظر آئیں ان کو گرفتار کر کے کسی کارخانے یا ورک ہاؤس (WORK-HOUSE) میں لے جا کر ان سے کام لے۔

۳- جو صحیح معنوں میں مجبور و معذور ہیں ان کے خورد و نوش اور رہنا سہنا کا معقول انتظام کرے۔

۴- بیواؤں کو شادیاں کرنے کی ترغیب دے اور سن رسیدہ بیواؤں اور معذور عورتوں کے لیے ایسا دارے قائم کیے جائیں جہاں وہ اپنی زندگی کے باقی ایام آرام سے گزار سکیں۔

۵- بچوں کو اندھا و لنگڑا بنانے والے گروہ کو پکڑ کر عبرت انگیز سزا دی جائے۔

۶- سینما، ٹی-وی اور ریڈیو وغیرہ سے مختلف شکلوں میں گداگری کی مذمت کی جائے۔

۷- لا وارث بچوں و بچیوں کے لیے معیاری یتیم خانے قائم کیے جائیں، جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا معقول بندوبستہ

۸- اخبارات و رسایل مسلسل بھیک مانگنے کے خلاف موثر مضمون شائع کیا کریں۔

۹- عوام کو چاہیے کہ مستحق اور غیر مستحق فقیروں میں خاص طور سے امتیاز رکھیں اور کسی غیر مستحق فقیر کو کبھی بھی بھیک نہ دیں۔

۱۰- چھوٹے بچے جو اکثر ہاتھ پھیلا کر کچھ نہ کچھ مانگ لیا کرتے ہیں اور پھر اپنی من پسند کی چیزیں خرید کر اپنی عادت و صحت دونوں کو بگاڑ لیتے ہیں۔ انھیں سمجھا بجھا کر ٹالا جائے اور پیسے ہرگز نہ دیے جائیں۔

۱۱- ماں باپ اگر شروع ہی سے توجہ کر کے بچوں کو ہاتھ پھیلانے کی لعنت سے بچانے کی کوشش کریں تو اس کا بہت ہی زیادہ اچھا اثر ہوتا ہے۔ بچپن میں والدہ مرحومہ نے ایک قصہ سنایا تھا وہ قصہ اور اس کی نصیحت ذہن و دماغ میں اب تک محفوظ ہے۔

قصہ یوں ہے کہ ایک بادشاہ جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ ایک شکار کا پیچھا کرتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ جب سورج ڈوب گیا اور اندھیرا چھانے لگا تو بادشاہ کو فکر لاحق ہوئی۔ جنگل کے باہر کچھ دور اسے ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ یہ مکان ایک غریب کسان کا تھا جو اپنے بال بچوں کے ساتھ غربت کی زندگی گزار رہا تھا۔ بادشاہ اپنا گھوڑا بڑھا کر وہاں پہنچا۔ غریب کسان نے ایک مہمان کی حیثیت سے بڑی آؤ بھگت کی۔ بادشاہ تھک بھی گیا تھا اور بھوک سے بے تاب تھا۔ کسان نے گرم گرم جیسی روٹی لذیذ چٹنی کے ساتھ کھلائی۔ پھر گائے کا تازہ دودھ پلایا۔ بادشاہ کو اپنی زندگی میں کبھی اتنا لذیذ کھانا نہیں ملا تھا، خوب لطف لے کر کھایا۔ سخت تکان کی وجہ سے کھری چارپائی پر نیند بھی خوب گہری آئی۔ صبح اُٹھا تو اس کے ساتھی بھی ڈھونڈتے ڈھونڈتے بادشاہ تک پہنچے۔ بادشاہ غریب کسان کی مہمان داری و خاطر تواضع سے بہت متاثر ہوا رخصت ہوتے ہوئے اس نے کسان کو اپنی ایک خاص نشانی دی اور کہا کہ جب کبھی کوئی کٹھن وقت پڑے تو تم یہ نشانی لے کر راجدھانی میں آجانا۔ عرصے کے بعد ایک قحط سالی کے نتیجے میں کسان پر بھی بہت بُرا وقت آیا۔ بیوی کے مشورے سے وہی نشانی لے کر بادشاہ کے یہاں پہنچا۔ نماز کا وقت تھا۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ مسجد میں گیا ہے۔ کسان بھی مسجد میں پہنچا۔ بادشاہ نماز سے فارغ ہو کر ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگ رہا تھا اور کسان مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا غور سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ مسجد سے باہر آیا۔ کسان نے نشانی دی اور اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ از راہ خلوص کسان نے بادشاہ سے دریافت کیا کہ آپ ہاتھ اُٹھا کر کیا مانگ رہے تھے؟ بادشاہ نے بتایا کہ اوپر والا جو حقیقی بادشاہ ہے، اسی سے اپنی ضرورت کی چیزیں مانگ رہا تھا۔ کسان نے کہا۔ اچھا! اچھا! سمجھ میں آگیا

وہی محتاج ہی ہے۔ میں بھی اپنی ضرورت لے کر آیا تھا لیکن میں سے تو مانگ کر پا رہا ہے اب آگی سے میں بھی مانگوں گا۔ تجھ سے کیا سوال کروں؟

بادشاہ سے مل ملا کر وہ بھی کسی قریب کی مسجد میں پہنچا اور ہاتھ منہ دھو کر ہاتھ اٹھا کر جو کچھ مانگنا تھا خدا سے مانگا اور پھر اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

کچھ دور جا کر راستے میں اسے پاخانہ کی حاجت ہوئی۔ کچھ فاصلے پر اسے ایک کھنڈر نظر آیا۔ وہاں پہنچ کر ایک بوسیدہ دیوار کی آڑ میں رفع حاجت کے لیے بیٹھ گیا۔ دیوار میں اسے ایک گڑا ہوا مٹکا نظر آیا۔ محنت کر کے اس نے اسے کھود کر نکالا تو دیکھا کہ اس میں اشرفیاں بھری ہوئی ہیں۔ اپنی چادر میں مٹکے کو لپیٹ کر گھر لایا اور بیوی کو تمام ماجرا سنایا۔ غریب کسان کی تنگ دستی اور پریشانی کی زندگی دفعتاً خوش حالی میں تبدیل ہو گئی۔

اس قصہ یا واقعہ سے والدہ مرحومہ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ انسان اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے دستِ سوال کیوں دراز کرے؟ مانگنا ہے تو اسے ہمیشہ صرف اپنے رب سے مانگنا چاہیے اور ہاتھ پیر ہلانے و کوشش کرنے کا جو حکم اس نے دیا ہے اُسی پر عمل ہونا چاہیے۔

یقیناً بچپن میں اس طرح کی مخلصانہ نصیحتوں کا دل پر گہرا اثر پڑتا ہے اور یہ اثر عمر بھر قائم رہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حکومت سے لے کر گھر و خاندان تک اگر سب کے سب اپنے فرائض کو توجہ کے ساتھ انجام دیں تو گداگری کی لعنت پر بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

"ناانفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ترقی اور قومی ہمدردی اور قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نااتفاقی نے بہت کچھ اثر بد پہنچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی اور یک جہتی سے مبدل کریں۔"

سر سید

امریکی نظام تعلیم

اس مقالے میں امریکی نظام تعلیم کا پاکستانی نظام تعلیم سے موازنہ کیا گیا ہے لیکن چونکہ پاکستانی اور ہندوستانی نظام تعلیم تقریباً ایک ہی جیسے ہیں اس لیے یہ مقالہ ہمارے لیے بھی مفید ہے۔ (ادارہ)

طالب علم جب بھی امریکی نظام تعلیم کا پاکستان کے نظام تعلیم سے موازنہ کرتا ہے تو ایک احساس فخر مندی دامن گیر ہو جاتا ہے طالب علم نے اپنی ابتدائی تعلیم وطن عزیز کے ایک ایسے اسکول میں حاصل کی ہے جہاں ابتدائی کلاسوں کے طلباء ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ گرمی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے سایہ دار درختوں کی پناہ لی جاتی تھی اور موسم سرما میں ادھر ادھر سے اکٹھی کی گئی جھاڑ جھنکار اور خشک لکڑیوں کو جلا کر ٹھٹھرتی انگلیوں کو سینکنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس وقت کے نصابی مواد اور اساتذہ کی محنت نے لالٹین کی روشنی میں اسکول کا کام کرنے والے طالب علموں میں حصول علم کی جو لگن پیدا کی اور ان کے دلوں میں طلب علم کی جو جوت جگائی وہ انہیں کشاں کشاں اس دنیا کے کونے کونے میں لیے پھرتی ہے اور اگرچہ اب بھی وطن عزیز کے کئی اسکول مادی طور پر کس مپرسی کی اس حالت میں ہیں۔ نصاب، اساتذہ اور معاشرے کے باہمی اشتراک نے طالب علموں کی ایک بڑی اکثریت کو وہ ذوق و شوق عطا نہیں کیا جس کی ہمارے ملک کو ضرورت ہے۔ گذشتہ بیس پچیس برس میں جہاں دوسرے ممالک کے تعلیمی اداروں میں آنے والے انقلابوں نے ان ملکوں کی معاشرت کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے وہاں ہمارے اداروں میں پیدا ہونے والے انحطاط نے طالب علموں کی توانائیوں کا رخ اُن سرگرمیوں کی طرف موڑ دیا ہے جن کے نتائج پاکستان جیسے ملک کے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ وہ ادارے جہاں وطن کے مستقبل کو سنہرا اور روشن بنانے کے منصوبے تشکیل پاتے تھے۔ جہاں قوم اپنے مستقبل کے تابندہ خوابوں کی تعبیر کے حصول کی کوشش کرتی تھی، جہاں وطن کے نوجوانوں کو ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور وطن کی باگ ڈور سنبھالنے کی تربیت دی جاتی تھی وہاں ان سپوتوں کو سیاسی جابجا دیں سکھانے کا اہتمام کر دیا گیا ہے ان کے ہاتھ اپنے بھائیوں کے خون میں رنگنے کے لیے اُن کے کندھوں پر کلاشنکوفیں سجا دی گئی ہیں۔ شاہین بچوں کو وطن عزیز کے مستقبل کی بجائے اپنے ذاتی مفادات کا خوبصورت جھانسہ دے کر اصل راہ سے بھٹکا دیا گیا ہے اور ہمارے ملک کی دربدری اور دست نگری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ہمیں اپنے وطن کے لیے پالیسیاں مرتب کرتے وقت دوسرے ملکوں کے مالیاتی اداروں کی اعانت حاصل کرنا پڑتی ہے۔

پاکستان کے تعلیمی اداروں کے ماحول سے آنے والے طلبا کے لیے امریکی اداروں کا ماحول انتہائی حیرت انگیز کیفیت کا باعث بنتا ہے۔ امریکہ میں تعلیمی ادارے اپنے نظام الاوقات نصاب اور دیگر سرگرمیوں کا سال بھر پہلے سے اعلان کر دیتے

ہیں اور بنیادی طور پر اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوتا۔ ادھر اپنے وطن کے تعلیمی ادارے ہیں جو اپنے آنے والے کل کے نظام الاوقات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ امریکی اداروں کے برعکس صرف پہلے سے اعلان شدہ چھٹی کے روز بند ہوتے ہیں۔ دھونس کے تعلیمی اداروں کی طرح اپنی خواہش کی تکمیل یا اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً بند نہیں کرائے جا سکتے اور چھٹی کے دن بھی تجربہ گاہوں میں کام کرنے کے خواہش مند افراد کو کام سے متعلق تمام عمومی سہولتیں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہاں طالب علموں سے بھاری فیسیں تو ضرور وصول کی جاتی ہیں لیکن اس کے عوض انھیں ہر طرح کی تعلیمی و تحقیقی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دنیا میں جمہوریت کے سب سے بڑے نمائندہ ملک میں طالب علموں کی سیاسی تنظیموں کا کوئی وجود نہیں۔ طلبا اپنے اپنے میلان کے مطابق ملکی سیاسی تنظیموں سے دلچسپی اور وابستگی ضرور رکھتے ہیں لیکن ان وابستگیوں کی بنا پر قتل و غارت گری تو دور کی بات ہے ہاتھا پائی تک کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آتا۔ طلبا ایک دوسرے کے سامنے اپنے پسندیدہ امیدواروں کی حمایت میں بولتے نظر آتے ہیں تو اپنے ہی امیدواروں پر تنقید کرتے بھی نظر آ جاتے ہیں اور اپنے پسند کے امیدوار پر تنقید سنتے وقت برداشت اور بردباری کا جو مظاہرہ امریکی طلبا بالعموم اور امریکی افراد بالخصوص کرتے ہیں وہ قابلِ رشک ہے اور غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں امیدواروں کو آسمان سے اتری ہوئی مخلوق نہیں سمجھا جاتا۔ ان امیدواروں کو ایک انسان کی حیثیت سے تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کیا جاتا ہے اور جہاں اپنے امیدوار کی خوبیوں اور حریف امیدوار کی خامیوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں اپنشن کے انتخابات انتہائی خاموشی اور سکون سے انجام پا جاتے ہیں۔ نہ ہڑتال، نہ نعرے بازی، نہ ہاہا کار، نہ گلا سوزی کا بائیکاٹ، تدریس و تحقیق کا کام کسی قسم کی رخنہ اندازی کے بغیر جاری رہتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ یہاں کے طالب علم ان یونین اور شعبہ جاتی سوسائٹیوں میں کسی عہدے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا تو کجا، ان سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے اس ضمن میں امریکی طلبا مسلمان ہوئے بغیر اسلام کے اصولوں پر عمل کر رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں ایک شعبہ جاتی سوسائٹی کے انتخابات کے موقع پر جب اپنے ہم عصروں کو اپنے وطن کے تعلیمی اداروں میں انتخابی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا تو اکثر کا ردعمل یقین نہیں آتا تھا۔ ہمارا وطن تعمیر و ترقی کی جن منزلوں کی تلاش میں ہے اس کی طرف ایک ہی راستہ جاتا ہے ہمت، محنت اور جرأت کا راستہ لیکن اس راستے پر صحیح رہنمائی کا فرض ہمارے تعلیمی اداروں پر عائد ہوتا ہے اور اگر ہم فی الواقعی ان منزلوں تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے تعلیمی اداروں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ ان اداروں سے ان کالی بھیڑوں کو نکالنا ہوگا جو محض ذاتی مفادات کی خاطر ملکی مفادات کو داؤں پر لگانے سے گریز نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے طلبا میں صحیح ملی شعور پیدا کرنا ہوگا تاکہ جب ملک و ملت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آئے تو وہ اپنی صلاحیتوں اور اپنی توانائیوں کو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کریں کہ معاشرے کی مجموعی فلاح کا مطلب ہے معاشرے کے ہر رکن کی فلاح اور یہی ہماری منزلِ مقصود ہے۔

یونیورسٹی یونین یا شعبہ جاتی سوسائٹیوں کے عہدوں سے امریکی طلبا کے گریز کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان عہدوں کے لیے منتخب ہو جانے والے طلبا و طالبات ان اداروں کے مختار نہیں بن سکتے۔ اس کے برعکس ہر عہدے دار کے لیے فرائض کا ایک دائرہ کار متعین ہے اور اسے ان فرائض کو بہر صورت ادا کرنا پڑتا ہے۔ طلبا کے نمائندے اپنے شعبہ کی نصابی کمیٹی میں نصاب کے بارے میں مثبت تجاویز پیش کرتے ہیں اور

شعبہ جات ان کی روشنی میں اپنے نصاب کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن تعلیمی سال کے آغاز، اختتام امتحانات کی تاریخ ایوٹ کرنے میں طالب علموں کا کوئی حصہ نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان اداروں میں تعلیمی سرگرمیاں کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر جاری رہتی ہیں۔

وطن عزیز کے سیاسی نظام کا ہمارے تعلیمی اداروں پر جو اثر پڑا ہے وہ اگرچہ کسی بھی باشعور شخص سے پوشیدہ نہیں لیکن ایک چھوٹی سی مثال اس کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے پاکستانی نظام تعلیم اور امریکی نظام تعلیم کا جو گوشوارہ ۱۹۷۳ء میں تیار کیا تھا اس کے مطابق ایک ایسے پاکستانی طالب علم کو جس نے ہر سال اپنا امتحان پاس کیا ہو، انیس سے بیس برس کی عمر میں ایم۔ اے/ایم۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کر لینا چاہیے لیکن فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ پاکستانی جامعات میں ماسٹر کی سطح کے مضامین میں داخلہ کے خواہش مند طلباء و طالبات کی اوسط عمر بیس سے تیئس برس تک کی ہوتی ہے۔ خود طالب علم کو بھی ایم ایس سی کی ڈگری اکیس برس کی عمر میں ملی اور طالب علم آج تک ان دو سالوں کی تلاش میں ہے جو وطن عزیز کی سیاسی سرگرمیوں کی نذر ہو گئے اور جن دو سالوں میں نہ طالب علم کو کچھ حاصل ہوا نہ طالب علم اپنے وطن کو کچھ دے سکا۔ امریکی جامعات میں طالب علموں کی اپنی یونین ہے، طبعیاتی سوسائٹیاں ہیں لیکن لگی ہوئی ہیں لیکن امریکہ کے تعلیمی اداروں کا سکون اور ان کی تحقیق و تعلیمی سرگرمیوں کی روانی دیکھیے تو احساس تک نہیں ہوتا کہ دنیا کی ایک بڑی "سپر طاقت" چند ماہ بعد ہی اپنا نیا سربراہ چننے والی ہے۔ ایک اپنے وطن کے تعلیمی ادارے ہیں جہاں کسی یونین کے انتخابات پورے ملک یا صوبے کو نہیں تو پورے شہر کو ضرور ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ برسبیل تذکرہ یہاں کی ایک یونیورسٹی کے صدر اور اس کے انتخاب کا بیان ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

امریکی ریاست رہوڈ آئی لینڈ کے صدر مقام پراویڈنس میں واقع براؤن یونیورسٹی ایک نجی تعلیمی ادارہ ہے اور بعض تعلیمی اداروں کی طرح اس کا بھی اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ ہے جس میں ایک عہدہ براؤن یونیورسٹی کے صدر کا بھی ہے۔ اس صدر کا چناؤ یونیورسٹی کی ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کرتی ہے۔ اس چناؤ کی منظوری یونیورسٹی کی گورننگ باڈی سے لی جاتی ہے جسے یہاں کارپوریشن کہا جاتا ہے۔ براؤن یونیورسٹی کی اس مجلس نے اپنے ۳۱ اگست کے اجلاس میں اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے فیصلے کی منظوری دی ہے اور یوں نیویارک پبلک لائبریری کے چیف ایگزیکٹیو افسر وارٹن گریگورین کو یونیورسٹی کے چانسلر کا سولہواں صدر منتخب کیا ہے۔ اس فیصلے کا اعلان یونیورسٹی کے چانسلر اے۔ او۔ دے نے کیا جو اس چناؤ کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ براؤن یونیورسٹی کے اس نئے صدر کا انتخاب گذشتہ اکتوبر میں فی الوقت کام کرنے والے صدر ہورڈ سویئر کے استعفیٰ اور اس اعلان کے نتیجے میں کیا گیا کہ وہ اپنی مصروفیات کے باعث اس عہدے کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔ البتہ وہ نئے صدر کے انتخاب تک اپنے فرائض ادا کرتے رہیں گے مگر کسی بھی صورت میں اس عہدے پر اکتیس دسمبر ان کا آخری دن ہوگا۔ یونیورسٹی کی صدارتی انتخابی کمیٹی نے اس منصب کے لیے تقریباً دو سو شخصیات کے بارے میں غور کیا۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کام کرنے والے اور ان اداروں سے باہر کی دنیا کے سینکڑوں لوگوں سے ان شخصیات کے بارے میں ان کی رائے پوچھی، ان سے مشورے لیے اور ان کی سفارشات اکٹھی کیں۔ اپنے مشیروں سے کئی رسمی و غیر رسمی ملاقاتیں کیں۔ امیدواروں سے براہ راست رابطہ قائم کیا اور اس قدر طویل چھان پھٹک کے بعد وارٹن گریگورین کو اس عہدے کے لیے منتخب کیا۔

وارٹن گریگورین کی عمر چون برس ہے۔ ایران کے شہر

تبریز میں پیدا ہونے والے گریگورین کا تعلق آرمینی نسل سے ہے اور وہ براؤن یونیورسٹی کے پہلے ایسے صدر ہوں گے جن کی پیدائش امریکہ کے علاوہ کسی اور ملک میں ہوئی ان کی اعلیٰ تعلیم کا آغاز پندرہ برس کی عمر میں بیروت کے کالج آرمینین سے ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے اسٹینفورڈ یونیورسٹی امریکہ سے بی۔اے اور ۱۹۶۴ء میں تاریخ و عمرانیات میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں ہی گریگورین اسٹینفورڈ یونیورسٹی میں ٹیچنگ فیلو بنے اور پھر اسی یونیورسٹی میں ہی مدرس منتخب ہو گئے۔ گریگورین ۱۹۸۱ء میں نیویارک پبلک لائبریری سے وابستہ ہوئے اور اس کے بہترین منتظم کے طور پر سامنے آئے۔ انھوں نے اس ادارے کے لیے بڑی رقوم جمع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی عزت و احترام کا مقام حاصل کیا۔ ۱۹۸۱ء سے اب تک اس لائبریری کی موقوف املاک چورانوے ملین ڈالر تک جا پہنچی ہیں۔ علاوہ ازیں ۱۹۸۶ء میں اس ادارے کے لیے تین سو سات ملین ڈالر کا فنڈ اکٹھا کرنے کی جس مہم کا آغاز کیا گیا تھا اس کے تحت اب تک اور پبلک لائبریری میں آنے سے پہلے گریگورین پنسلوانیا یونیورسٹی میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۰ء تک وہ یونیورسٹی کے پرووسٹ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۸ء تک کلیہ فنون و سائنس کے پہلے ڈین، ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک تاریخ کے پروفیسر آرمینین و کاکیشین تاریخ کے پروفیسر، اور تاریخ جنوبی ایشیا کے پروفیسر رہے۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک ٹیکساس یونیورسٹی آسٹن میں تاریخ کے پروفیسر ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء، تک سان فرانسسکو سٹیٹ کالج اور ۱۹۶۰ء میں کیلیفورنیا یونیورسٹی برکلے میں مدرس کے فرائض انجام دے چکے ہیں گریگورین تین کتابوں اور بے شمار مضامین کے مصنف ہونے کے علاوہ سات مختلف زبانوں آرمینین، ترکی، عربی، روسی، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ گریگورین کو ان کی علمی و انتظامی سرگرمیوں کے صلے میں اب تک بائیس اعزازی ڈگریاں اور بے شمار ایوارڈ مل چکے ہیں، جن میں فرانس اور آسٹریا کے دو اعلیٰ ترین اعزازات بھی شامل ہیں۔ براؤن کی کارپوریشن کو امید ہے کہ کئی اعلیٰ بورڈوں میں فعال کردار ادا کرنے والی یہ نامور شخصیت اپریل ۸۹ء جب براؤن کے صدر کا عہدہ سنبھالے گی تو یونیورسٹی کے نام اور وقار میں اضافے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کی علمی سرگرمیوں کو مزید بہتر بنانے میں بھی مدد دے گی۔

[ماخوذ]

" مسلمانوں کو جو مصیبت پہنچتی ہے، خواہ وہ کسی قسم کی ہو، بیماری ہو، رنج ہو، غم ہو، تکلیف و ایذا ہو، حتیٰ کہ اسے ایک کانٹا بھی چبھے، اللہ تعالیٰ اس کے صلے میں اس کی خطائیں معاف کر دیتا ہے "

(بخاری و مسلم)

BUILDING DEPARTMENT

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH.

TENDER NOTICE

Sealed tenders are invited to be received on 16-3-1991 upto 1.30 P.M. The tenders will be opened on the same day at 3.30 P.M. Tender documents can be obtained from the Office of the University Engineer, Building Department, Aligarh Muslim University, Aligarh on any working day during office hours (between 9.30 A. M. to 1.00 P. M.). Sale of tender forms shall be stopped two days before the time of receiving the tenders.

Name of the work	Estimated cost put to tender	Earnest Money	Cost of tender form	Time of Completion.
Construction of R.C.C. Overhead Reservior 230 K.L. Capacity 20 M. staging height.	4,36,000/-	10,900/-	100/-	8 Months

Conditions :

1. Tenderers should have carried out atleast three such works, proof of which should be given alongwith tender.
2. Tenderers should also submit Income Tax clearance certificate alongwith their tenders. Other conditions and requirements will be provided with tender papers.

(Lt. Col. Hasan Muzaffar)
University Engineer

388/1170

BUILDING DEPARTMENT

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH.

TENDER NOTICE

Sealed tenders on percentage/item rate basis are invited to be received on 12-3-1991 upto 1.00 P.M. The tenders will be opened on the same day at 3.30 P.M. Tender documents can be obtained from the Office of the University Engineer, Building Department, Aligarh Muslim University, Aligarh on any working day during office hours (between 9.30 A. M. to 1.00 P. M.). Sale of tender forms shall be stopped two days before the time of receiving the tenders.

Name of the work	Estimated cost put to tender	Earnest Money	Cost of tender form	Time of Completion.
Construction of one Lecture Theatre at first floor for the Faculty of Law & Commerce, A. M. U. Aligarh.	Rs. 1,52,485/-	3,815/-	20/-	Three Months

(Lt. Col. Hasan Muzaffar)
University Engineer

382/465

MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ۱۰ — اپریل ۱۹۹۱ء — شمارہ ۴

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر

شہاب الدین

ترتیب ... سرفراز

انچارج سرکولیشن ... مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ:
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
EDITOR, TAHZIBUL AKHLAQ &
NISHANT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ:
انڈیا ... Rs. 45.00
بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک
بحری ڈاک US $ 8.00

خط و کتابت کا پتہ:
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا۔

مندرجات

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ پریس: ایس کے آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

اداریہ

جون ۱۹۸۶ء کی بات ہے جب مرکز فروغ سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈائرکٹر پروفیسر اسرار احمد صاحب کو تہذیب الاخلاق کی ادارت پر بھی مامور کیا گیا اور ان کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی کہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی جائے تاکہ موجودہ دور کے مسلمانوں میں سائنس سے جو بے رغبتی پیدا ہو گئی ہے اس کو ختم کیا جا سکے اور ہندوستانی مسلمان اس ورثے کے صحیح معنوں میں امین و وارث بن سکیں جو ان کے اجداد کی علمی و فکری بصیرت کی یادگار ہی نہیں حاصل بھی ہے۔

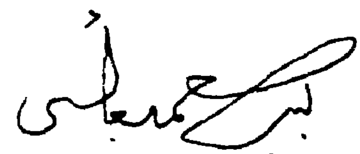
پروفیسر اسرار احمد صاحب کی سربراہی میں تہذیب الاخلاق نے جو قدم اٹھایا تھا اس کے نقوش پا پر بہت سے کارواں گامزن ہو چکے ہیں اور تہذیب الاخلاق کی آواز بہت سے دلوں کی آواز بن کر سامنے آنے لگی ہے پہلے تہذیب الاخلاق اکیلا تھا لیکن اب لوگ ساتھ آتے جا رہے ہیں اور کارواں بنتا جا رہا ہے۔ اس کارواں کی خاص بات یہ ہے کہ اگرچہ اس کا سفر تسلسل کے ساتھ جاری ہے مگر نہ تو شور و شغب سنائی دیتا ہے اور نہ ہی ایک دوسرے پر پیش رفتی کا جذبہ کہیں کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ کارواں خاموشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہے۔ اِس کے راستے میں مخالفت کے جو پہاڑ آتے ہیں اُن سے یہ کارواں ٹکراتا نہیں بلکہ ان سے بچتا بچاتا ناہموار زمین میں اپنی راہ نکالتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

اپنی تقریباً پانچ سالہ بے لوث و بے غرض خدمت، انتھک محنت اور کوشش، منی نعوں سے نرم مزاجی و نرم کلامی کی دلکش یادوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے پروفیسر اسرار احمد صاحب اب اُس تحریک کی تاریخ کا ایک جزو بن چکے ہیں جس کی ابتدا سرسید کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ ان کے دورِ ادارت میں اِس بات کا خاص طور سے خیال رکھا گیا کہ رسالہ تہذیب الاخلاق کو دلچسپ نہیں بلکہ مفید بنایا جائے۔ گزشتہ پانچ برسوں کے تہذیب الاخلاق کے شمارے اس بات کے گواہ ہیں کہ تہذیب الاخلاق کو دلچسپ بنانے کے لیے اس کے اصل و حقیقی مقصد کو کبھی بھی پس پشت نہیں ڈالا گیا۔ تہذیب الاخلاق حالی کے الفاظ میں "اُبالی ہوئی کھچڑی" اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتا رہا۔ مقام مسرت ہے کہ لذت کام و دہن کے اسیروں نے بھی اس "اُبالی کھچڑی" کو گوارہ نہیں بلکہ پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا اور اس کی افادیت کا برملا اعتراف بھی کیا۔

ان پانچ برسوں میں مرکز فروغ سائنس کا کام بہت پھیل چکا ہے۔ علاوہ بریں اس وقت پروفیسر اسرار احمد صاحب شعبۂ طبیعیات (فزکس) کے چیرمین بھی ہیں اور ان کا اچھا خاصہ وقت مذکورہ دونوں شعبوں کی سربراہی کے فرائض

کی انجام دہی میں صرف ہوتا ہے۔ اِدھر ان کو برابر غیر ملکی سفر بھی کرنے پڑے تاکہ وہ فزکس کے جدید تر رجحانات سے نہ صرف اپنے شعبے کے رفقائے کار کو متعارف کراتے رہیں بلکہ خود بھی ماڈرن فزکس (جدید طبیعیات) کے کسی نہ کسی پہلو پر تحقیقی کام بھی کریں۔ اس لیے اُن کی خواہش پر اُن کو تہذیب الاخلاق کی ادارت سے سبکدوش کر دیا گیا ہے اور ان کی جگہ پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد نسیم فاروقی صاحب نے یہ خدمت میرے سپرد کی ہے کہ اب میں اس کاروانِ تہذیب کو لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہوں۔

تہذیب الاخلاق کی ترتیب و اشاعت کا کام میرے لیے نیا نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنی محدود صلاحیت اور مخصوص مزاجی کیفیت کے باوجود پروفیسر اسرار احمد صاحب کے شانہ سے شانہ اور قدم سے قدم ملا کر تہذیب الاخلاق کی ترتیب و اشاعت میں اپنی بساط بھر حصہ لیا ہے لیکن اُس وقت میں شریک مدیر تھا۔ اِس لیے اس احساس ذمہ داری سے گراں بار نہ تھا جس کو آج محسوس کر رہا ہوں۔ میں جب تہذیب الاخلاق کے بانیوں اور اس کے سابق مدیروں کے قدوں کی طرف دیکھ کر خود اپنی طرف نظر ڈالتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس محفل میں میری ہستی ایک "بونے" کی سی ہے، اپنے اس "بونے پن" کے باوجود میں کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ استاذ الاساتذہ مرحوم پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے آپ کو اُس کیڑے سے تشبیہ دی تھی جو نا تردیم کے مشہور گرجا گھر میں گھنٹہ بجایا کرتا تھا جب استاذ الاساتذہ نے "علی گڑھ کا کیڑا" بننے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا تو مجھ جیسے بے بضاعت کو "علی گڑھ کا بونا" بننے میں عار کیوں محسوس ہونے لگا؟ بہر حال میرا واحد سہارا ذات خداوندی ہے۔ میرے سارے کام اسی کی تائید و توفیق سے ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں۔ میں دست بہ دعا ہوں کہ تہذیب الاخلاق کی ادارت کے سلسلے میں بھی مجھ کو اُس کی تائید و توفیق حاصل رہے۔ آمین۔



فرزندانِ جامعہ سے خطاب

مولانا ابوالکلام آزاد

..... جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے انقلابی دور کا سب سے موثر عمل یہیں انجام پایا۔ نئے ہندوستان کے پیدا کرنے میں ملک کے بن نئے حلقوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان میں ایک حلقہ یہ بھی تھا۔ ہندوستان کی نئی دماغی سرگرمیوں کے لیے انیسویں صدی نے ایک نشاۃ جدیدہ (Renaissance) کا دور بہم پہنچایا اور اس نشاۃ جدیدہ کا ایک گوشہ علی گڑھ بھی تھا۔

اگرچہ سرسید کے انتقال کے بعد یہاں کی یہ خصوصیت بہت حد تک ختم ہو گئی۔ کالج ترقی کرتے کرتے یونیورسٹی بن گیا لیکن اپنے دور کی شاندار روایتیں واپس نہ لا سکا۔ تاہم یہ روایتیں آپ ہی کی اس درس گاہ کی روایتیں ہیں۔ آپ کے اسٹریچی ہال کی دیوار پر جو کتبے کندہ ہیں ممکن ہے کہ وہ کسی وقت مٹ جائیں لیکن آپ کی درس گاہ نے زمانے کے صفحوں پر جو کتبے ثبت کر دیے ہیں وہ کبھی نہیں مٹ سکتے، وہ ہمیشہ باقی رہیں گے اور ہندوستان کے آنے والے مورخ ان سے اپنی کہانیوں کے لیے مواد حاصل کر سکیں گے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ایک ایسا تعلیمی ادارہ جو اپنی ماضی کی ایسی شاندار داستان رکھتا ہو، قدرتی طور پر اس کا مستحق ہے کہ شاندار مستقبل اپنے سامنے دیکھے۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت آپ کے احساسات کیا ہیں۔ آپ اپنے مستقبل کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو وہ کس رنگ میں سامنے آتا ہے؟ آپ کو دروازوں کے بند ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے یا کھلنے کی؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی نگاہیں کیا دیکھنے لگی ہیں؟ آپ شاید دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے پرانے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے نئے دروازے کھل جائیں گے۔

تفاوت است میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

افلاطون کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اس نے اپنی درس گاہ پر یہ کتبہ کندہ کر دیا تھا "من لم یعرف جیامیطری فلیس له المدخل"۔ "جو شخص جیامیٹری نہیں جانتا اس کے لیے یہاں جگہ نہیں ہے۔" مگر آپ کو کسی ایسے کتبے کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ آپ کی درس گاہ کا کتبہ یہ ہونا چاہیے "جو لوگ جیومیٹری جانتے ہیں اور جو لوگ نہیں جانتے سب کے لیے یہاں جگہ موجود ہے۔"

مجھے معلوم ہے کہ آپ کی درس گاہ کا پہلے دن سے ایسا ہی طرز عمل رہا ہے۔ آپ کی یہ درس گاہ جب نئی نئی

قایم ہوئی تھی تو طالب علموں کی سب سے پہلی جماعت جو اس میں داخل ہوئی اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی تھے۔ آپ کے اساتذہ کی صف میں بھی ہمیشہ سب کے لیے جگہ رہی۔ آپ کا یہ قدیمی طرز عمل آئندہ اور زیادہ نمایاں ہوگا اور زیادہ وسعتیں پیدا کرے گا۔

اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور اس کی تحقیقات آپ کی درس گاہ کی قدیمی روایت ہے مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سر سید مرحوم کے دور کے بعد اس کی سرگرمیاں بہت کچھ دھیمی پڑ گئیں اور علم و فن کا عام مذاق بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رہا۔ یونیورسٹی قایم ہوئی تو اسے اپنے قیام کے بعد ایک نیا علمی دور لانا تھا۔ مگر اس توقع کو بھی ابھی تک انتظار ہی کرنا پڑا ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اپنی درس گاہ کی پرانی روایتوں کو از سر نو تازہ کریں اور یونیورسٹی کے اندر مطالعہ اور تحقیقات کا اعلیٰ معیار پیدا کریں۔

میں چاہتا ہوں کہ چند الفاظ ان نوجوانوں سے کہوں جنھوں نے اپنی طالب علمی کا دور ختم کر لیا ہے اور زندگی کی نئی منزلوں میں قدم رکھنے والے ہیں۔

تم ایک غیر مذہبی جمہوری نظام حکومت کے باشندے ہو جس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو غیر مذہبی اور جمہوری طریقے کے مطابق نشوونما دے گی۔ ایک غیر مذہبی جمہوری نظام کا جوہری خاصہ یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام افراد کے لیے یکساں طریقے پر ہر طرح کی ترقیوں کے مواقع پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں مذہب، نسل، ذات اور فرقہ کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ایک ایسی حکومت کے باشندے ہونے کی حیثیت سے تم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہو کہ تمہارے آگے ملکی زندگی کے تمام دروازے کھل جائیں۔ سیاست، انتظام حکومت، تجارت، صنعت و حرفت، مختلف قسم کے پیشے، کوئی دروازہ ایسا نہ ہو جو تم پر بند ہو۔ میں تمہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ یقین دلاؤں گا کہ آج کوئی دروازہ تم پر بند نہیں ہے۔ ملک کی زندگی کا ہر دروازہ تم پر کھلا ہے۔ بشرطیکہ تم قابلیت کی پختگی، محنت کی سرگرمی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کی مضبوطی کے ساتھ قدم بڑھا سکو۔ قومی آزادی کی فضا تمہارے مطمح نظر کو زیادہ بلند، تمہاری ہمتوں کو زیادہ اولوالعزم اور تمہارے ولولوں کو زیادہ وسیع کر دے۔ تمہیں اب پرانے ہندوستان کے ذہنی ماحول سے نکلنا ہے اور نئے ہندوستان میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا نیا مصرف ڈھونڈنا ہے۔ تمہاری بلند پروازیوں کے لیے اب پچھلی بلندیاں پست ہو گئیں۔ اور تمہاری جولانیوں کے لیے اب پرانے میدان تنگ ہو گئے۔ تم نے سعی و عمل کے جو پرانے پیمانے اپنے ہاتھوں میں رکھے تھے وہ وقت کی نئی پیمائشوں کے لیے کام نہیں دے سکتے۔ تمہیں اب نئے پیمانے ڈھالنے ہیں۔ تمہیں نئے بٹوں سے سعی و عمل کی نئی مقداریں تولنی ہیں۔ تمہیں اب زندگی کی جدوجہد میں نئے ارادوں اور نئی اولوالعزمیوں کے ساتھ قدم اٹھانا ہے اور اس قابلیت کو جو تم نے اس درس گاہ سے حاصل کی ہے، ایسے کاموں میں لگانا ہے جو تمہارے ملک کی نئی رفتوں کا ساتھ دے سکے۔

اگر تم نے ملک کی ترقی پسند قومیت کی سوجھ بوجھ اپنے اندر پیدا کر لی جو تمہاری غیر جمہوری حکومت کا دستور العمل ہے تو تمہارے وطن کی کوئی بلندی ایسی نہیں ہوگی جہاں تک تمہارا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور کوئی کامرانی بھی ایسی نہ ہوگی جو تمہارا استقبال نہ کرے۔

پیک

سید حامد ◇

پیک عنوان کو پڑھ کر پان کھانے والوں کا دھیان پان کی اس سیال شکل کی طرف جائے گا جسے ماہرانہ لذت کوشی کے ساتھ دیر تک منہ میں رکھا جاتا ہے۔ ایسے لوگ کم نہیں ہیں جو منہ کو پیک دان بنا لیتے ہیں۔ ابتدا کی سرخی سیاہی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سرفروئی کی جگہ پان کی پیک ہونٹوں اور مسوڑھوں سے لے کر تالو کی دیوار تک ایک تہہ سیاہی کی بچھا دیتی ہے، اور چمک دار اور خوب صورت دانت بے آب اور بدرنگ ہو جاتے ہیں۔ پیک سے زیادہ تو وہ لوگ نکالتے ہیں جو پان کو تمباکو سے آلودہ کرتے ہیں لیکن یہ سب کارروائیاں ان لوگوں کی ذات تک محدود رہتی ہیں۔ ہمیں اس کا حق کب پہنچتا ہے کہ ان پہ اعتراض کریں۔ انھیں حق ہے کہ اپنے ذہن کو گندگی اور کالک کا اشتہار بنالیں یا تمباکو خوری سے اپنی صحت کو جتنا نقصان پہنچا سکیں، پہنچائیں۔

اعتراض وہاں شروع ہوتا ہے جہاں یہ لوگ پان کی پیک کو منہ سے در و دیوار کی طرف منتقل کرنے لگتے ہیں — سڑکوں، برآمدوں اور دفاتر کو داغ دار کرتے ہیں۔ زینوں کی مسافت طے کرتے وقت جہاں دو دیواریں ملتی ہیں وہیں یہ سرخ پچکاری زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ منظر اتنا مکروہ ہے کہ اسے دیکھ کر نفیس طبیعتیں مالش کرنے لگتی ہیں۔ ماحول کی گندگی ان جانے ڈھنگ سے مکینوں اور کارکنوں کے نقطۂ نظر اور طرزِ عمل پر اثر ڈالنے لگتی ہے۔

لیکن اس وقت ہمارا روئے سخن انگریزی زبان کے لفظ 'پیک' کی طرف ہے۔ اس کا مطلب ہے نقطۂ عروج، انتہائے کمال، چوٹی۔ اس کا مفہوم ذہن نشین کرنے کے مشین اور انسان میں جو فرق ہے، اس کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ انسان ہر وقت ایک ہی رفتار، ایک ہی مہارت، ایک ہی ذوق، ایک ہی صلاحیت کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس کے یہاں بہت اتار چڑھاؤ ہوتے ہیں ریاضت مشق اور تجربہ کی ہموار سازی کے باوجود بلند پست کا ردّ و بدل چلتا رہتا ہے، عورتوں کے یہاں مرد سے بھی زیادہ۔ اس لیے ہمیں کسی انسان سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ اس کی کارگزاری کی سطح ہمیشہ یکساں ہو۔ ایسا بھی ہوگا کہ اچانک وہ سطح گر جائے گی۔ بعض لوگ باورچی خانے میں بعض بیوی پر اس لیے ناراض ہوتے ہیں کہ آج کھانا ٹھیک نہیں پکایا۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ ہر کام کے لیے موزونی طبع درکار ہوتی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ طبیعت ہر وقت موزوں رہے۔ طبیعت اگر حاضر نہیں ہے تو نہ تحریری اور زبانی امتحان میں کامیابی ہاتھ آئے گی، نہ اچھی تصویر بن سکے گی، نہ غزل

◇ سابق وائس چانسلر، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ —— ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

ـا اچھے اشعار تخلیق پائیں گے، نہ موثر تقریر ہو سکے گی، نہ اچھا
مون لکھا جائے گا نہ خانہ داری کا کام ٹھیک سے سرانجام
سکے گا۔ نہ منہ سے پھول جھڑیں گے، نہ بات میں دلکشی
گی۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ اس فطری نشیب و فراز
رعایت معاملات میں کی جائے اور ظن و تخمین اور احتساب
بے رعایت اور بے لچک سخت گیری سے پرہیز کیا جائے
روج و زوال، اونچ نیچ اور مد و جزر کی عام ناگزیری کے
لاوہ یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ جو شخص اس بار اپنے کام کو حسن و
بی کی متوقع اور معتاد سطح تک نہ پہنچا سکا وہ کن فکروں اور
ریشانیوں سے دوچار تھا۔ اس کے دل میں کیا قیامت
رہا تھی، کون سی الجھنیں اس کے سکون کو برہم کر رہی تھیں
ہیں فطری نشیب و فراز اور وقتی پریشانیوں کی رعایت ضرور
ھنی چاہیے۔

موزونیٔ طبع، عنفوانِ صلاحیت اور جوار بھاٹے کی
قائی یا عناصری اہمیت کا اندازہ اس بار ومبلڈن کے بعض
نتائج سے ہوا۔ پچھلے سال فائنل میں سویڈن کے اسٹیفن ایڈبرگ
نے جرمنی کے بورس بیکر کو اعتماد اور صلابت کے ساتھ ہرا دیا
تھا۔ امسال بورس بیکر نے (کھلاڑیوں کی اصطلاح میں)
یڈبرگ کو دھو دیا، مسمار کر دیا۔ اس نتیجہ کا تجزیہ کرتے
وقت ٹینس کے مبصرین نے لکھا کہ فائنل کے روز بورس
پنی پیک پر تھا اور ایڈبرگ پہلے میچوں میں پیک پر پہنچ کر
ڈھل چکا تھا۔ صلاحیت کے مد و جزر اور چڑھائی اور ڈھلان
کی بات خود بورس بیکر نے شروع کی، جسے نامہ نگار لے
آئے اور اسے ایک نظریے کی شکل دے دی۔ وہ کھلاڑی
بدقسمت ہے جسے متواتر کئی ایسے میچوں سے سابقہ پڑے
جو بتدریج فائنل سے پہلے اس کی صلاحیت کو نقطۂ عروج
پر پہنچا دیں اور جب فائنل آئے تو اسے ڈھلان کی حالت
میں پائے۔

منصوبہ بندی دراصل مقابلہ سے شروع ہوتی ہے
معاشی منصوبہ سازی کا نقطۂ آغاز وہ مقابلہ ہے جو
مختلف موضوعات یا مدوں کے درمیان محدود وسائل کو
حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے گمان غالب ہے
کہ اب کھلاڑی یہ منصوبہ بھی بنایا کریں گے کہ جن میچوں سے انہیں
ٹورنامنٹ کے دوران گزرنا ہے ان میں بتدریج کمال کو
کب اور کس طرح پہنچا جائے تاکہ جب نقطۂ عروج صلاحیت
درکار ہو اس وقت کھلاڑی کی جسمانی اور نفسیاتی اور ارادی
حالتیں اجتماعی کوشش کے ذریعہ اُسے فراہم کر سکیں۔

دیکھیے زندگی کس قدر پیچیدہ اور باتکلف اور
منصوبہ طلب ہوتی جا رہی ہے۔ خود کھیل جسے دنیا ہنسی
کھیل سمجھتی تھی اب کتنی جاں فشانی، منصوبہ سازی اور دور
اندیشی مانگتا ہے۔ آمد آورد کی کوکھ سے جنم لینے لگی ہے
اب زندگی ان لوگوں کے تابع فرمان ہو چلی ہے جو ان تھک
ریاضت سے بھی منصوبہ سازی پر سان رکھتے ہیں۔ مقابلہ
سخت اور بے درد اور پُر پیچ و خم ہوتا جا رہا ہے۔ زہرہ
گداز مقابلہ کا جہاں تک تعلق ہے "اک جوشش تو اس
کے اندر ہے" لیکن اس میں نہ وجد ملے گا، نہ رقص ملے
گا۔ نہ وہ بے نیاز ہے، نہ مگن ہے، نہ آزاد ہے، نہ
خودرو ہے۔ اس میں نہ بے فکری ملے گی نہ وہ نرم تند
انبساط جو آہستہ آہستہ رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے
نہ وہ لاابالی پن جو انسان کو مزاجاً مستغنی اور نفسیاتی
طور پر خودکفیل کر دیتا ہے، نہ وہ ذوق جو زندگی کے
لذائذ اور لطائف سے خوش خرامی کے ساتھ جرعہ بہ جرعہ
حظ اندوز ہونے کے آداب سکھاتا ہے۔

مقابلہ کی چنگاری نے سکون اور خوش
باشی اور ذہن کی بے پروا خرامی اور حواس کی اٹھلاتی
ہوئی لذت اندوزی کو خاکستر کر دیا ہے لیکن انسان
مقابلے سے منہ موڑ بھی نہیں سکتا کہ فضیلت اور عروج
اور مہارت اور لیاقت حاصل کرنے کا یہ سب سے

بڑا ذریعہ ہے اور تہذیب نے سدا اسی کے بانوں
پر اڑان بھری ہے۔ فطرت کا نظام ہی یہ ہے
کہ کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ کھونا ضرور پڑتا ہے
یہ عمل انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس طرح
جاری رہتا ہے کہ وقت کے کسی ایک نقطہ پر یہ
حساب لگانا کہ کیا پایا اور کیا کھویا، دشوار ہو جاتا
ہے۔ دانش اسی میں ہے کہ جو پایا اس پر
جب افزا شکر کیجیے اور جو کھویا اس پر خوش دلانہ
صبر۔

"ایک مسلمان تعلیمی کام کرنے والے کی حیثیت سے
میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی نظام کے بنانے میں سب
سے اہم اصول یہ پیش نظر ہونا چاہیے کہ متعلم
کی خداداد صلاحیتیں درجۂ کمال کو پہنچیں، پوری
طرح نشو و نما پائیں، اس کی انفرادیت میں
یک جہتی پیدا ہو اور اس سے ایک نیک سو
سیرت بنے اور یہ نیک سو سیرت اعلیٰ اخلاقی
اقدار کی خادم ہو کر شخصیت کے مرتبۂ بلند کو
پہنچ سکے۔ انفرادیت سے سیرت، سیرت
سے اخلاقی شخصیت ___ صحیح تعلیم کا یہی راستہ
مجھے اسلامی راستہ معلوم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

آخری قسط

نواب صاحب چھتاری اور ہندوستان کی آزادی

ابن سعید چھتاری ○

پنڈت جواہر لال نہرو کے خط کی نقل جو انھوں نے ۱۱ر جولائی ۱۹۳۲ کو سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل جیل دہرہ دون کو لکھا تھا

آج آپ نے براہ مہربانی مجھے قائم مقام انسپکٹر جنرل جیل کا وہ خط دکھایا جو انھوں نے میرے خط مورخہ ۲۲ جون کو لکھا تھا۔ مجھے اس میں مطلع کیا گیا ہے کہ الٰہ آباد جیل میں مسٹر آر۔ ایس۔ پنڈت سے ایک ملاقات کے دوران میری اہلیہ نے ایک خط مسٹر پنڈت کو دیا اور جب جیلر نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا تو میری والدہ نے توہین آمیز الفاظ استعمال کیے اور اُن کی بے ادبی کی۔ چونکہ یہ بیان بالکل غلط ہے اور اس میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے میں آپ کو دوبارہ لکھ رہا ہوں اور ممنون ہوں گا اگر یہ خط آپ حکومت کو بھیج دیں۔

مسٹر پنڈت سے ۲۰ر مئی کو ملاقات کے دوران انھیں ان کے بچوں کے متعلق کچھ بتایا گیا تھا جن کی عمریں تین، پانچ اور آٹھ برس کی ہیں۔ ان بچیوں کے حالات اسکول کی ایک رپورٹ یا خط میں تحریر تھے۔ میری لڑکی بھی پونا کے اسی اسکول میں پڑھتی ہے اور اس نے یہ رپورٹ یا خط پڑھ کر مسٹر پنڈت کو سنایا بعد میں وہ تحریر انھیں خود دیکھنے کو دے دی جیلر نے اس پر اعتراض کیا اور ترش لہجہ اختیار کیا۔ خصوصاً مسٹر پنڈت سے مخاطب ہو کر۔ مسٹر پنڈت کی توہین کے علاوہ جیلر کا رویہ میری والدہ اور اہلیہ کے ساتھ بھی توہین آمیز تھا۔ میری والدہ نے شاید ہی ان سے کوئی بات کی ہو۔ اس کے تین روز بعد مئی کی ۲۰ر تاریخ کو میری والدہ، اہلیہ اور بیٹی سے بریلی جیل میں میری ملاقات کا دن تھا۔ وہاں مجھے واقعہ کی اطلاع ملی۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ کوئی شخص میری والدہ سے گستاخی کرے اور میں سمجھتا تھا کہ جیل کے ارباب حل و عقد اس پر اپنی پشیمانی کا اظہار کریں گے۔ اس کے برخلاف اب مجھے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ نے میری والدہ اور اہلیہ کو سزا دینے کا فیصلہ

○ راحت منزل، ٹیرس روڈ، علی گڑھ

کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوا ہے کہ یہ فیصلہ جیلر کے کسی بیان پر کیا گیا ہے۔ جہاں تک میری اطلاع ہے میری والدہ اور اہلیہ سے اس کے متعلق کچھ بھی نہیں پوچھا گیا۔ بغیر کسی پوچھ گچھ اور تحقیق کے حکومت نے بلا تامل میری والدہ اور اہلیہ کی توہین کی اور اس کے نتیجے میں تمام لوگوں کو سخت زحمت اُٹھانا پڑی۔

ہو سکتا ہے کہ جیل کے قوانین کے مطابق اسکول کے بچوں کی رپورٹ دکھانا جرم ہو اور ممکن ہے کہ یہ کوئی سخت جرم نہ رہا ہو مگر یہ عین ممکن ہے کہ کسی نئے قانون کے ذریعے اسے سخت جرم بنا دیا گیا ہو۔ اس لیے اگر حکومت اسے بھی قابل سزا سمجھے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اور مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر حکومت سزا کے طور پر میری ملاقاتیں ایک مہینہ یا ایک سال کے لیے پھر روک دے۔ میں جیل میں تفریح کرنے یا اپنی صحت درست کرنے نہیں آیا ہوں لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن پر میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ میں ہرگز کوئی ایسی بات برداشت نہیں کر سکتا جس میں میری والدہ کی شان میں گستاخی کا کوئی شائبہ بھی ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ حکومت میری والدہ سے اس ادب سے پیش نہیں آئی جس کی میں ہر حالت میں توقع کر سکتا تھا۔ انسپکٹر جنرل کا یہ کہنا کہ میری والدہ نے توہین آمیز لہجہ اختیار کیا اور انھوں نے جیلر سے بے ادبی کی ظاہر کرتا ہے کہ وہ حفظ مراتب نہیں جانتے اور انھیں ہندوستانی تہذیب سے واقفیت نہیں ہے اور ذہن کے معاملے میں بھی کمزور ہیں۔

حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے اور جس طرح کیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے ملاقات کے لیے آئیں انھیں اس بات کے لیے تیار رہنا ہوگا کہ حکومت کے کارندے یا خود حکومت ان کی توہین کر سکتی ہے۔ میں ہرگز کوئی ایسی صورت گوارہ نہیں کر سکتا جس میں میری والدہ یا میری توہین کا کوئی بھی امکان ہو۔ ان حالات میں میرے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ میں کسی سے نہ ملوں اور اس وقت تک نہ ملوں جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو جائے کہ ملاقات باعزت ماحول میں ہوگی اور مجھ سے ملنے والوں کی توہین کا کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔ اس لیے میں نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھ سے ملنے ایک مہینے ترک ملاقات کی سزا کے ختم ہونے کے بعد بھی نہ آئیں

مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر قائم مقام انسپکٹر جنرل میرے نام کے ہجے صحیح کریں۔

آپ کا مخلص

جواہر لال نہرو

[انگریزی سے ترجمہ]۔

پنڈت گوبند ولبھ پنت نے اپنے خط مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے ساتھ جواہر لال نہرو کے خط کی کاپی نواب صاحب کو بھیجی اور نواب صاحب کی امکانی مدد کے طلب گار ہوئے۔ پنت جی کا خط جسے خود اُن کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے۔

ذاتی

نینی تال

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء

مکرمی نواب صاحب

مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ آپ کی روانگی سے قبل آپ سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ میں اس کے لیے بہت مشکور رہوں۔

حسب ہدایت میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اس خط کی نقل منسلک کر رہا ہوں جو انھوں نے سپرنٹنڈنٹ کو لکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انسپکٹر جنرل نے یہ آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کر دیا ہو۔ میں نے دو جگہ سطروں کے نیچے لکیریں کھینچ دی ہیں اور مجھے امید ہے کہ آپ اسے پورا پڑھیں گے۔ یہ پڑھنے کے قابل چیز ہے جس فقرے کے نیچے میں نے خط کے تقریباً اختتام پر سطر کھینچی ہے، اس کا مطلب بالکل صاف ہے۔ میرے خیال میں وہ جس بات کی یقین دہانی چاہتے ہیں اس کے دینے میں آپ کو کوئی تامل نہ ہوگا۔ انھوں نے غیر معمولی تحمل سے انسپکٹر جنرل کے اس اشتعال انگیز اور غیر مہذب انداز بیان کا ذکر کیا ہے جس میں انسپکٹر جنرل نے ان کی والدہ پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے جیلر سے گفتگو میں ہتک آمیز الفاظ استعمال کیے اور ان کا لہجہ گستاخانہ تھا۔ اس پورے خط میں ان کا غیر جذباتی اور پُروقار انداز نمایاں ہے۔

پنڈت کے۔ ڈی مالوی سے آپ ذاتی طور سے واقف ہیں۔ نہ معلوم کیوں انھیں بارہ بنکی میں قید رکھا گیا ہے۔ وہاں کی آب و ہوا انھیں موافق نہیں آ رہی ہے اور ان کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ ان کے احباب صرف اتنا چاہتے ہیں کہ انھیں لکھنؤ منتقل کر دیا جائے، جہاں علاج کی سہولتیں نسبتاً اچھی ہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔
براہِ مہربانی دیوالی کی مبارکباد قبول فرمایئے۔
آپ کا مخلص۔ جی۔ بی پنت

نواب صاحب یو۔پی کے اس وقت گورنر تھے یہ واقعہ ۱۹۳۲ء کا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو جیل میں تھے۔ نواب صاحب کو معلوم ہوا کہ شریمتی موتی لال نہرو سخت بیمار ہیں اور حالت تشویشناک ہے۔ نواب صاحب کو اس کا احساس تھا کہ ایک ماں کی علالت سے اس شخص پر کیا گزری ہوگی جو اپنے گھر سے بہت دور جیل خانے میں ہے۔ یہ احساس برابر نواب صاحب کو پریشان کر رہا تھا۔ نواب صاحب نے Legal Advisor کو بلایا اور اس کا مشورہ پوچھا کہ ایسی حالت میں جواہر لال جی کو جیل سے رہا کر دیا جائے Legal Advisor کا مشورہ یہ تھا کہ چوں کہ پنڈت جی کی گرفتاری Centre کے حکم سے ہوئی ہے۔ لہذا وائسرائے ہی انھیں رہا کر سکتا ہے۔ نواب صاحب اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور خود قانون کی کتاب کی چھان بین کی اور آخر انھیں یہ صراحت مل گئی کہ اگر کوئی Emergency واقع ہو تو گورنر اپنے اختیار مجازی سے وائسرائے کے بغیر پوچھے مناسب قدم اٹھا سکتا ہے اور یہ کہ اس کی اطلاع وائسرائے کو دے دے۔ نواب صاحب نے پنڈت جی کے لیے Release Order فوری جاری کر دیے اور وائسرائے لارڈ ولنگڈن کو بذریعہ تار اطلاع بھیج دی۔

نواب صاحب ۱۹۳۳ء میں یو۔پی کے گورنر ہوئے۔ یہ پہلے شخص تھے کہ جنھیں حکومت برطانیہ نے گورنر کا عہدہ سونپا ہو۔ یو۔پی اسمبلی میں بحیثیت ہوم ممبر یہ آخری دن تھا۔ کونسل کے ممبران نے جس میں حزب اختلاف اور گورنمنٹ Benches دونوں شامل تھیں۔ نواب صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ آپ کے سامنے مختصراً ۵ اپریل ۱۹۳۳ء لیڈر اخبار کے چند اقتباسات پڑھتا ہوں۔ جن سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نواب صاحب کا طرزِ حکومت کیا تھا۔ وہ اپنے مخالف پارٹی کے لوگوں کے ساتھ کیسے تعلقات رکھتے تھے اور اپنے ہم وطنوں کی بلا لحاظ مذہب و ملت کس طرح ہر ممکن مدد

کرتے تھے۔ تشدد اور جبر و استبداد سے عوام کو ڈرایا جا سکتا ہے لیکن دل جیتے نہیں جا سکتے۔ اس کے لیے بہترین راہ نرمی اور حسنِ اخلاق ہے۔ حکومت تو وہ ہے جو دلوں پہ کی جائے۔

اخبار لیڈر مورخہ ۵ اپریل ۱۹۳۳ء

اور

سنیچر یکم اپریل ۱۹۳۳ء کی یو پی لیجسلیٹو کاؤنسل کی کارروائی کے اقتباسات

مسٹر سی۔ وائی۔ چنتامنی

جنابِ والا۔ آپ کی اجازت سے میں چند باتیں اپنی اور اپنے ان ساتھیوں کی طرف سے عرض کرنا چاہتا ہوں جن کے ساتھ اس ایوان میں بیٹھنے کا شرف مجھے حاصل رہا ہے آج ہمارے ہوم ممبر آخری دفعہ ہمارے ساتھ حکومت کے ایک رکن اور اس ایوان کے ایک ممبر کی حیثیت سے موجود ہیں۔ آنریبل نواب صاحب تو تشکیلِ کاؤنسل کے پہلے ممبروں میں سے تھے۔ جو لوگ اس وقت یہاں تھے انھیں یاد ہے کہ نواب صاحب اس وقت نوجوان تھے اور نئے ممبروں میں سے جن لوگوں سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی تھیں ان میں سے ایک تھے شروع ہی سے انھوں نے ایوان کی کارروائی میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور جن لوگوں کو ان کی دوستی کا شرف حاصل رہا انھیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ وہ ایک ابھرتی ہوئی شخصیت کے حامل ہیں۔

حزبِ مخالف کے ایک رکن ہونے کے ناتے میرے ناخوشگوار فرائض میں سے غالباً اس سے زیادہ ناخوشگوار اور کوئی فرض نہیں تھا جو مجھے سائمن کمیشن کی آمد پر جو غیر معمولی واقعات ہوئے تھے ان کی طرف ایک تحریکِ التوا کے ذریعے توجہ دلانے کا تھا۔ جن لوگوں نے ہوم ممبر کی اس روز کی تقریر پڑھی ہے اُن پر یہ بات روشن ہو جائے گی کہ ہوم ممبر کے لیے یہ کوئی خوشی کی بات نہیں تھی کہ وہ ان واقعات کا دفاع کریں جو خود ان کے خیال میں اتنے ہی قابلِ ملامت تھے جتنے کہ دوسروں کی نظروں میں سیاست میں اکثر ان باتوں پر غور کرنا پڑتا ہے جو واقعات پر چشم پوشی کے منظر میں ہوتے ہیں۔ جس طرح ہوم ممبر نے اس تحریکِ ملامت کو بغیر مخالفت کے پاس ہو جانے دیا وہ سب کے لیے باعثِ اطمینان اور رشک ہوا۔ نواب صاحب کی ہوم ممبری کے زمانے میں ہمارے صوبے کو ملک کے دوسرے حصوں کی طرح بہت سی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اور بہت کچھ برداشت کرنا پڑا لیکن عالی جناب نواب صاحب نے ایسے موقعے کم سے کم آنے دیے جن میں انھیں کسی جماعت کی رائے کے خلاف بات کہہ کر حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے حزبِ مخالف کو جواب دینا پڑا ہو۔

کیا کوئی ایسا ہے جو ان سے یہاں اور ایوان کے باہر واقف ہو اور ان سے کوئی جھگڑا مول لے سکتا ہو (نعرہ ہائے تحسین) باوجود سخت سے سخت اختلافِ رائے کے؟ کیا کسی کے لیے یہ ممکن ہو سکا ہے کہ وہ ان کے متعلق تلخی سے سوچ سکے؟ کیا کبھی کسی کے ذاتی تعلقات ان سے بگڑے ہیں؟ درحقیقت

میں نے ان سے کئی دفعہ شکایت کی کہ باوجود اس کے کہ ایک ممبر کے شدید حملے ہوئے لیکن کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ ان کے لیے اپنے دل میں تلخی پیدا کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سخت سے سخت تنقید کا جواب وہ اپنی دلفریب مسکراہٹ سے دیتے تھے۔ ان کی ملنساری، ان کا اخلاق، اور ان کی دوست بنانے کی اہلیت اور ان کی مہمان نوازی کے ساتھ ان ذکاوت نے مل کر ان کی شخصیت میں ایسی خوبیاں جمع کر دی ہیں جو بہتوں کو میسر نہیں اور جن کی وجہ سے وہ ایوان کے رخ کو بہت جلد پہچان جاتے تھے اور ایسی قابلیت سے وہ معاملات کو سلجھاتے تھے کہ ان کے ذریعہ تلخ سے تلخ باتیں کم سے کم تلخی کے ماحول میں طے ہو جائیں آنریبل نواب صاحب تقریباً دس برس تک حکومت کی جماعت کے رکن رہے ہیں۔ جناب والا نواب صاحب یہاں سے عام شہریوں کی زندگی کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر ہی وہ دوسری بار ایک بہت بڑا عہدہ سنبھالنے والے ہیں (نعرہ ہائے تحسین) ان کے دوست اور تعریف کرنے والوں کے لیے تو یہ بات باعث مسرت ہے ہی لیکن ہر ہندوستانی بھی اس بات سے خوش ہے کہ ایک انتہائی لائق ہندوستانی دوبارہ اس صوبے کا سب سے اونچا عہدہ سنبھالنے والا ہے اور اس دفعہ تو یہ بات اور بھی مسرت کا باعث ہے کہ ان کا تقرر براہ راست ملک معظم نے فرمایا ہے جب کہ پہلی دفعہ تو ایک قدرتی سانحہ کی بدولت انھیں ذمہ داری ایسے حالات میں سنبھالنا پڑی تھی جس پر سب غم زدہ تھے (نعرہ ہائے تحسین) میں اُن کا ایک ادنیٰ دوست ہوں اور اس رشتہ سے میری دعا ہے کہ ان کی گورنری کا زمانہ امن اور خوشی کا زمانہ ثابت ہو اور ان کے ملک کے لوگوں کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ باوجود اس کے کہ ان کے ملک کا ایک فرد صوبے کا گورنر ہے، قابل تکلیف واقعات اب بھی روزانہ کا معمول ہیں۔

[انگریزی سے ترجمہ]

آنریبل وزیر تعلیم سر جے۔ پی۔ سریواستو

میں دوسری جماعتوں کے نمائندوں کی تائید کرتا ہوں۔ میں نواب صاحب سے گزشتہ پندرہ برس سے واقف ہوں اور اس تمام عرصے میں وہ میرے قریبی دوست رہے ہیں ۱۹۳۱ء سے ہم لوگوں نے ساتھ کام کیا ہے میں ایوان کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ ان کی رائے سے وزراء کو فائدہ پہنچا ہے۔ جب بھی کسی پیچیدہ معاملے کو سلجھانے کے لیے میں نے ان سے رجوع کیا یہ کوشش کبھی ناکام نہیں ثابت ہوئی۔ کوئی ایسی گرہ نہیں ہے جو وہ نہ کھول سکیں۔ ان میں تدبر کی بےپناہ صلاحیتیں ہیں اور مجھ سے پہلے تقریر کرنے والوں نے اس کی تائید کی ہے۔ ایک خاص چیز کی طرف میں آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں فرقہ واریت انھیں چھو کر بھی نہیں گئی ہے۔ انھوں نے کبھی کسی ہندو اور مسلمان میں فرق نہیں کیا۔ ان معنوں میں وہ سچے محب الوطن ہیں

حضور والا! ہم سب جانتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے ضابطہ اور قانون کا بندوبست کیا اس کی سب لوگوں نے تعریف کی۔ حتیٰ کہ کانگریس والوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جو جیل میں ہیں اس سے زیادہ ان کی تعریف اور کیا کی جا سکتی ہے۔

[انگریزی سے ترجمہ]

نوابزادہ محمد لیاقت علی خاں

[جو بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے]

حضور والا۔ جو کچھ حزب مخالف اور آزاد پارٹی کے رہنماؤں نے کہا ہے اس کی پوری طرح تائید کرتا ہوں۔ یہ میری بدقسمتی ہی ہے کہ میں نواب صاحب سے نہ تو غیر سرکاری ممبر کی حیثیت سے واقف ہوں اور نہ ہی ان کے وزیر ہونے کی حیثیت سے۔ جب میرا داخلہ اس کاونسل میں ہوا تو نواب صاحب اسی عہدے پر تھے جس پر آج ہیں ــــ میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ نواب صاحب چھتاری نے ہوم ممبر کی حیثیت سے بھی عوام کی رائے پر اتنا ہی دھیان دیا اور اتنی ذمہ داری سے معاملات طے کیے جتنی ذمہ داری سے وہ وزیر کرتے ہیں جن کا تعلق ان محکموں سے ہوتا ہے جو قانونی طور پر "منتقل" شمار کیے جاتے ہیں۔

حضور والا! ان کے اخلاق کی دلکشی اور مروت کی فراوانی نے سب ہی کے دل جیت لیے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ دوسروں کی مدد کی اور ان لوگوں کے خیالات کو بھی اہمیت دی جن کا اظہار غیر سرکاری ممبروں نے کیا۔ جب بھی نواب صاحب کو ایسے لوگوں کی مدافعت میں کچھ کہنا پڑا جن کی کارگزاری پر ان کا کوئی اختیار نہیں تھا تب بھی وہ ہمیشہ مسکراتے رہے اور تلخی کا کوئی شائبہ کبھی نہیں آیا۔

حضور والا نواب صاحب نے اپنے تدبر اور دانشمندی سے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی بھی اس صوبے کے اعلیٰ ترین عہدوں پر کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ سر مالکم ہیلی کی رخصت کے دوران ان کا گورنر کی حیثیت سے تقرر کر کے صرف ان ہی کی اہلیت کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے بلکہ صوبہ جات متحدہ کے تمام لوگوں اور خصوصاً زمینداروں کی اہلیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ جناب والا میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے ان کی خدمت میں نیک خواہشات پیش کرتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ وہ بحیثیت گورنر کے بہت کامیاب رہیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ نئی کونسل جو اصلاحات کی بنیاد پر بنے گی اس میں بھی ہم ان کی خدمات سے مستفیض ہوں گے اور وہ اس صوبے کی رہنمائی فرمائیں گے۔

[انگریزی سے ترجمہ]

آنریبل صدر (سر سیتا رام)

اس ایوان کے نقیب کی حیثیت سے میرے لیے یہ امر باعث افتخار ہے کہ میں تہ دل سے ان سب باتوں کی تائید کروں جو نواب کپتان سر محمد احمد سعید خاں صاحب کے متعلق یہاں کہی گئیں۔ میں یہ بات صرف اس ایوان کے صدر کی حیثیت سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ

اگر نواب صاحب اجازت دیں تو یہ عرض کر دوں کہ ان کے ایک پرانے دوست کی حیثیت سے بھی ہماری پہلی ملاقات جنگ عظیم کے دوران ہوئی جب ہم دونوں نے میرٹھ میں ایک جلسے سے خطاب کیا جس کی صدارت سر آرکوٹ بٹلر فرما رہے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے نواب صاحب کو دیکھا اور ان کی خطابت کا لطف اٹھایا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ اور میں ایک ساتھ کونسل میں شامل ہوئے اور ہمیں ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بہت جلد بے تکلفی کی باتیں ہونے لگیں۔ ان سے متاثر کرنے والی باتوں میں ان کے اخلاق اور اُن کے موروثی راجپوتی وقار کے علاوہ ان کی منکسر المزاجی کو بھی بڑا دخل تھا۔ اُنھیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ ہری کا مقولہ یاد آتا ہے:

" دولت اچھے آدمیوں میں نخوت پیدا نہیں کرتی۔"

انھوں نے درجہ بدرجہ ترقی کی ہے۔ لیجسلیٹو کاؤنسل کی رکنیت سے وہ وزیر ہوئے۔ یو۔پی کی مجلس عاملہ کے رکن بنے۔ پھر وہ دہلی ایگزیکیوٹو کاؤنسلر بن کر گئے۔ انھوں نے گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی لیکن مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی ایک منٹ کے لیے بھی اخلاق، مروت اور ملنساری نے ان کا دامن چھوڑا ہو۔ یہی خوبیاں ان کی دلفریب مسکراہٹ سے مل کر اس کی ضامن ہوئیں کہ بقول حزب مخالف کے لیڈر کے انھوں نے کسی کو اپنا دشمن نہیں بنایا۔ ان سے ان گنت درخواستیں کی گئی ہوں گی اور کئی دفعہ انھیں انکار بھی کرنا پڑا لیکن کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ جس سے کوئی تلخی پیدا ہوئی ہو۔ کئی دفعہ میں سیاسی تبدیلیوں کو اوپچے درجے والوں کی درخواستیں لے کر ان کے پاس گیا۔ انھوں نے ہمیشہ ہمدردی اور توجہ سے غور فرمایا اور جب انھیں کوئی درخواست رد بھی کرنا ہوئی تو ایسی خندہ پیشانی سے کی جو انھیں کا حصہ ہے۔

ہم اُنھیں یاد کرتے رہیں گے۔ یہ ایوان انھیں یاد کرے گا۔ یہ ایوان اپنے ایک ہر دل عزیز ہوم ممبر کو یاد کرے گا۔ ہم سب کیپٹن نواب سر محمد سعید خاں صاحب کو یاد کریں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ہمیں یاد کریں گے۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے جا رہے ہیں اور ہماری دلی دعائیں ان کی کامیابی کے لیے ان کے ساتھ ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا دل یہاں لگا رہے گا اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ اصلاحات کے بعد اگر انھیں اس سے بھی بڑی کوئی ذمہ داری نہ سونپی گئی تو وہ دوبارہ اس ایوان میں اپنی جگہ پر تشریف لائیں گے۔ نواب صاحب اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے اور میں تہہ دل سے آپ کی کامیابی اور بلندیٔ اقبال کی دعا کرتا رہوں گا۔

راے بہادر بابو وکرم جیت سنگھ۔

میں اپنی طرف سے اور اپنی پارٹی کے ممبران کی طرف سے ان سب باتوں کی تائید کرتا ہوں جو حزب مخالف کے لیڈر اور دوسرے دو ممبروں نے مجھ سے پہلے کیں۔ میرے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ میں اس ایوان میں ان کا سب سے پرانا ساتھی رہا ہوں مجھے وہ دن

یاد ہے جب نواب صاحب چھتاری پہلی دفعہ اس ایوان میں داخل ہوئے ہیں۔ میں اور وہ بتدی ہونے کے ناطے پیچھے کی کرسیوں پر بیٹھنے والوں میں تھے لیکن غالباً میں کسی راز کو افشانہ کروں اگر یہ یاد دلاؤں کہ بہت جلد انھوں نے اس زمانے کے وزیر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ حضور۔ اس ایوان میں انھیں غیر معمولی عروج حاصل ہوا جس کی ہم سب کو بہت خوشی ہوئی اور اس میں ان کی شہرہ آفاق صلاحیتوں کو بہت بڑا دخل تھا۔ ان صلاحیتوں میں جیسا کہ سب نے کہا ان کے اخلاق کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ غیر سرکاری ممبر رہے۔ پھر وزیر ہوئے پھر اس کے بعد ہوم ممبر بنے اور اب گورنر ہونے جا رہے ہیں لیکن ان کے اخلاق نے ان کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ دراصل یہ صورت ہمیشہ رہی بلکہ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں جوں جوں ان کے مدارج بڑھتے گئے ویسے ویسے ان کا اخلاق بھی بڑھا۔ اپنے حسن اخلاق سے ایوان کے تمام ممبروں میں ہر دل عزیز بنے۔ گورنمنٹ کے ایک رکن کی حیثیت سے وہ ہمیشہ باوفا رہے اور جو محکمہ ان کے سپرد ہوا اس کا انتظام کمال تدبر اور دانش مندی سے کیا۔ اس پُر آشوب زمانے میں مختلف سوالات آئے لیکن انھوں نے ایوان کے ممبروں کی درخواستوں پر ہمیشہ بڑی ہمدردی سے غور کیا۔

خان بہادر حافظ ہدایت حسین

حضور نواب صاحب چھتاری سے رخصت ہوتے ہوئے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف راستے کے اس پار کی عالی شان عمارت میں منتقل ہو رہے ہیں۔ نواب صاحب کی ملنساری، اخلاق، فراخ دلی، خلوص اور مقصد کی بلندی کا سب ہی اعتراف کرتے ہیں۔ میں بھی بس یہی ان کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔

جناب والا! انھوں نے ایوان کے ایک عام رکن سے اتنی ترقی کی کہ آج ان کے سپرد صوبے کی حکومت کا سب سے معزز عہدہ کیا جا رہا ہے۔ ہم میں سے کسی کو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مشکل اور صبر آزما ذمہ داریاں بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیں گے۔ ان کی شخصیت ایسی ہے کہ ہر فرقہ کے لوگوں کو ان پر اعتماد ہے اور کوئی یہ شبہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی کا بُرا چاہیں گے۔ ان کو تو سب ہی کی بہبودی کا خیال رہتا ہے۔ وہ بولنے میں معزز ہیں، وہ اپنے افعال میں محترم ہیں اور دیکھنے میں لائق احترام ہیں۔ حضور وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے ان محکموں میں بھی جمہوری طرز عمل اختیار کیا جو قانونی طور پر محفوظ محکموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنا دفتر سب کے سامنے رکھ دیا اور اس ایوان کے تمام ممبروں کا اعتماد حاصل کر لیا۔ مجھے امید ہے کہ جو جگہ وہ آج خالی کر رہے ہیں وہ بہت دنوں تک خالی نہیں رہے گی اور ایک دن وہ اس صوبے کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اور بھی ترقی کریں گے اور ایک دن وہ مستقل گورنر ہو جائیں گے ان الفاظ اور دکھی دل کے ساتھ میں اپنی

اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے انھیں الوداع کہتا ہوں۔

[انگریزی سے ترجمہ]

۱۹۳۷ء میں کانگریس اور نیشنل اگریکلچر پارٹی میں الیکشن ہوا۔ کانگریس جیتی اور نیشنل اگریکلچر پارٹی کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ نواب صاحب بھی اگریکلچر پارٹی کے رکن تھے۔ گورنر نے کانگریس کو منسٹری تشکیل دینے کے لیے مدعو کیا۔ کانگریس نے بعض وجوہ سے گورنر کے دعوت نامے کو رد کر دیا اور منسٹری بنانے سے انکار کیا۔

اسپیشل نمبر　　　رجسٹرڈ نمبر اے۔۳۳۴۵

جلد ۱۱۱۱

یونائیٹڈ پروانس ریویو

لکھنؤ ۸ رمئی ۱۹۳۷ء

اعلان بتاریخ ۲۹ رمارچ ۱۹۳۷ء کانگریس پارٹی کے صوبہ متحدہ میں وزارت بنانے سے انکار

ہز ایکسیلنسی گورنر نے ۲۴ رمارچ کو صوبہ متحدہ کی لیجسلیٹو اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر پنڈت گوبند ولبھ پنت کو وزارت بنانے میں مدد دینے کے لیے مدعو کیا۔ پنڈت گوبند ولبھ پنت نے ہز ایکسیلنسی گورنر کی توجہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی اس قرارداد کی طرف دلائی جس میں اس پیش کش کو قبول کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی گئی تھی کہ کانگریس لیجسلیٹو پارٹی کے لیڈر کو اس کا یقین ہو جائے کہ گورنر اپنے مخصوص اختیارات سے اپنے وزراء کے مشوروں کو مسترد نہیں کریں گے۔ انھوں نے یہ کہا کہ وہ اسی وقت وزارت بنانے کی ذمہ داری قبول کریں گے جب انھیں گورنر کی طرف سے اس بات کی یقین دہانی کر دی جائے جس کا ذکر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ریزولیوشن میں کہا گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی قانونی ذمہ داری کے تحت تمام انتظامی معاملات آتے ہیں۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ ان کے خیال میں ان کی یہ درخواست قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔ ہز ایکسیلنسی نے پنڈت گوبند ولبھ پنت کو مطلع کیا کہ ان کے لیے اس قسم کی کوئی یقین دہانی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ گورنر اپنی ان مخصوص ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جائیں جو انھیں گورنمنٹ آف انڈیا کے ایکٹ کے مطابق سونپی گئی ہیں۔ یہ بات ان ہدایات کے بھی مخالف ہے جو انھیں خاص طور سے دی گئی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے پنڈت گوبند ولبھ پنت کو یقین دلایا کہ ان کی زبردست خواہش ہے کہ کانگریس پارٹی اپنی وزارت بنائے چونکہ اسی پارٹی کو ایوان میں اکثریت ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو ہز ایکسیلنسی کا پورا تعاون، ہمدردیاں اور اشتراکِ عمل انھیں حاصل ہوگا۔ ساری مذاکرات بالکل دوستانہ ماحول میں ہوئیں اور اُن میں یہ جذبہ کارفرما رہا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے نکتۂ نظر کو سمجھیں۔ مذاکرات آج صبح پھر شروع ہوئے اور دونوں طرف سے اپنے اپنے نظریات کا اعادہ کیا گیا اس کے بعد پنڈت گوبند ولبھ پنت نے ہز ایکسیلنسی کو مطلع کیا کہ چونکہ ہز ایکسیلنسی

انھیں ان باتوں کا یقین نہیں دلا سکے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس لیے وہ وزارت کی تشکیل میں مدد دینے سے قاصر ہیں۔

ہز ایکسیلنسی کو بہت افسوس ہے کہ واقعات نے ایسا موڑ لے لیا۔ یہ فیصلہ کانگریس پارٹی کا فیصلہ ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور مخصوص ہدایات کے تحت گورنر کی ذمہ داریوں کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ کانگریس نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ وہ اس وقت تک وزارت نہیں بنائے گی جب تک گورنر اپنے ان مخصوص اختیارات سے دستبردار نہیں ہو جاتے جو ایکٹ میں انھیں دیے گئے ہیں اور یہ عہد نہ کریں کہ وہ وزارت کے کسی فیصلے کو مسترد نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی یقین دہانی ان کے اختیار میں میں نہیں ہے باوجود اس کے کہ گورنر اپنا پورا تعاون وزارت کو دیں گے اور وزارت کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ ان کی ایکٹ کے حدود میں رہتے ہوئے ہر طرح کی حمایت کریں گے لیکن اس کے ساتھ گورنر اپنی ان ذمہ داریوں پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتے جو ایکٹ کے ذریعے ان کو دی گئی ہیں۔

اب ہز ایکسیلنسی اپنی توجہ نئی وزارت کی تشکیل پر کریں گے۔"

[انگریزی سے ترجمہ]

نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر نے نواب صاحب چھتاری کو مدعو کیا کہ وہ نئی منسٹری کی تشکیل کریں۔ نواب صاحب نے یو-پی کی پہلی کیبنٹ بنائی اور یو-پی کے پہلے چیف منسٹر ہوئے۔ اس وقت بحیثیت چیف منسٹر نواب صاحب نے جو Communique شائع کیا وہ پیش خدمت ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ حق اس پارٹی کا ہے جو عوام سے اپنے حق میں Mandate لے کر منتخب ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے بیان مورخہ ۳ر اپریل ۱۹۳۷ء میں اپنی عارضی گورنمنٹ کا ذکر کرتے ہوئے کانگریس کو دعوت دی کہ جب بھی وجہ اختلاف دور ہو جائے وہ حکومت سنبھال لیں۔

اخباری مراسلہ مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۳۷ء

ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ متحدہ نے چھتاری کے نواب سر محمد احمد سعید خاں کے۔سی۔ ایس آئی، کے۔سی آئی۔ ای، ایم۔ بی۔ ای سے مل کر انھیں وزارت کی تشکیل میں مشورہ کے لیے مدعو کیا۔ سر احمد سعید خاں نے ہز ایکسیلنسی کی دعوت کو قبول کر لیا اور اب وہ وزارت بنانے کی کوشش کریں گے۔

حکومت صوبہ متحدہ کا اعلان مورخہ ۳ر اپریل ۱۹۳۷ء

ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ متحدہ نے مندرجہ ذیل انتخاب پر اظہار مسرت فرمایا ہے

۱۔ نواب سر محمد احمد سعید خاں صاحب چھتاری کے۔سی۔ ایس آئی، کے۔سی آئی ای – ایم۔ بی۔ ای

۲۔ نواب سر محمد یوسف کے ٹی بیرسٹر ایٹ لا۔

۳۔ سر جوالا پرشاد سریواستو۔ کے۔ ٹی، ایم۔ ایس۔ سی، اے ایم۔ ایس۔ ٹی

۴۔ راجہ سید احمد علی خاں علوی۔ سی بی ای آف سلیم پور۔

۵۔ راجہ مہیشور دیال سیٹھ، راج بہادر آف کوٹرا۔
۶۔ مہاراج کمار سروجے آنند گجپتی راج۔ کے۔ ٹی۔ آف وجے نگرم۔
۷۔ آنریری کیپٹن راجہ درگا نرائن سنگھ آف تروا

یہ سب گورنر کے وزراء کی کونسل کے ممبر ہوں گے۔

ہز ایکسیلنسی نے مندرجہ ذیل تقرریوں پر اظہار مسرت فرمایا ہے۔

۱۔ آنریبل نواب سر محمد احمد سعید خاں۔ کے سی۔ ایس۔ آئی؛ کے۔ سی آئی۔ ای۔ ایل۔ بی۔ ای؛ ایل۔ ایل۔ ڈی آف چھتاری کو وزیر داخلہ
۲۔ آنریبل نواب سر محمد یوسف۔ کے۔ ٹی بیرسٹر ایٹ لاء وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ اور صحت
۳۔ آنریبل سر جے۔ پی سریواستو۔ کے۔ ٹی۔ ایم۔ ایس۔ سی؛ اے ایم۔ ایس۔ ٹی کو وزیر مالیات۔
۴۔ آنریبل راجہ سید احمد علی خاں علوی۔ سی۔ بی۔ ای آف سلیم پور کو وزیر تعلیم
۵۔ آنریبل راجہ مہیشور دیال سیٹھ۔ راج بہادر آف کو کو وزیر مالگزاری اور زراعت
۶۔ آنریبل مہاراج کمار سروجے آنند گجپتی راج کے۔ ٹی آف وزیا نگرم کو وزیر قانون۔
۷۔ آنریبل راجہ درگا نرائن سنگھ آف تروا کو وزیر صنعت اور رسل و رسائل۔

اور ان حضرات نے آج اپنے عہدوں کا حلف لے لیا۔

نواب صاحب چھتاری وزیر اعلیٰ صوبہ متحدہ کا بیان

غیر معمولی اور غیر متوقع حالات نے مجھے بڑے مشکل راستہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ حق اکثریت والی پارٹی کا تھا کہ وہ صوبے کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیں لیکن چونکہ انھوں نے انکار کر دیا اس لیے اقلیت والی جماعت کے لوگوں پر یہ ذمہ داری پڑی کہ وہ بندوبست چلائیں۔ میں قانون پر عمل کرنے کے حق میں ہوں۔ جیسا کچھ بھی وہ ہے اور اسی طرح اپنے عوام کو موجودہ حالات میں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ قانون کو معطل کر دیا جائے اور انتظام نوکرشاہی کے سپرد کر دیا جائے لیکن میں جانتا ہوں کہ جن حالات میں ہم ہیں ان میں ایسا کرنا عوام کے مفاد میں نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہم ایسا نہ کر سکے اور اسی لیے میں نے یہ عظیم ذمہ داری قبول کی۔

بہر حال میں عوام کو اس کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جب تک موجودہ تعطل قائم ہے میرے ساتھی اور میں بالکل غیر جانبداری سے بغیر کسی خوف کے کام کرتے رہیں گے اور کسی کے ساتھ کوئی ناجائز رعایت نہیں کریں گے۔

ہز ایکسیلنسی گورنر کی تقریر جو انھوں نے حلف برداری کے موقع پر کی۔

آپ اس پہلی وزارت کے اراکین ہیں جو نئے قانون کے تحت تشکیل دی گئی ہے اور میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ جب بھی کوئی انقلابی تبدیلی ہوتی ہے، دقتیں سامنے آتی ہیں۔

لیکن آپ لوگ بہت ہی غیر معمولی اور بہت ہی مشکل حالات میں ذمہ داری سنبھال رہے ہیں۔ جس پارٹی کو الکشن میں اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ قانونی طریقہ سے اسے یہ ذمہ داری سنبھالنا چاہیے تھی لیکن اس پارٹی نے یہ ذمّہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں ہم نے فیصلہ کیا کہ جو لوگ قانون پر عمل کرنے پر تیار ہوں انھیں اس وقت تک یہ ذمّہ داری سنبھالنا چاہیے اور جب تک لے نبھا سکیں، نبھانا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری طرح یقین ہے کہ اس صوبے کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ یہ ذمّہ داری قبول کریں۔

میں نے یہ بات بالکل صفائی سے کہہ دی ہے کہ جو بھی حکومت ذمّہ داری سنبھالے گی اسے میرا پورا تعاون حاصل ہوگا اور وہ میری ہر قسم کی مدد پر بھروسہ کر سکتی ہے۔ ایکٹ کے دائرۂ عمل میں اسے میرا پورا اعتماد حاصل ہوگا۔ مجھے یہ یقین دہانی دلانے میں واقعی مسرت ہو رہی ہے۔ پالیسی بنانے کی ذمہ داری آپ کی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ صوبے کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے اور اس کی اقتصادی ترقی اور وہاں کے رہنے والوں کی خوش حالی کے لیے کوشاں رہیں گے۔ میری تمنا ہے کہ آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے خدا اس میں آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔

پاکستان ایمپائر ہاؤس جو کل ہند انڈیا پاکستان اسلامک ٹرسٹ تنظیم کا صدر دفتر ہے اس کے ایک جلسہ میں مسز اندرا گاندھی شرکت فرما رہی تھیں۔ اپنی تقریر میں فرمایا کہ:

شاید نواب صاحب کو تو اب یاد بھی نہ ہو ایک بار جب نواب صاحب سیاسی قیدیوں کو جیل خانہ میں دیکھنے گئے تو ایک نوجوان کو وہاں دیکھا۔ جیلر سے کہا یہ بہت تندرست اور نوعمر بچہ ہے۔ اسے کیوں گرفتار کر لیا۔ جیلر نے کہا کہ یہ Demonstration میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ نواب صاحب نے اس کی سفارش کر دی اور فوری رہائی کا حکم دے دیا۔ یہ فیروز گاندھی تھے۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنے اور نواب صاحب کے تعلقات کو اسی شان اور وضع داری سے نبھایا جو نہرو خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ مجھے یاد ہے پارلیمنٹ ہاؤس میں ایک جلسہ تھا مالک رام صاحب کی کتاب "نذر زیدی" کا اجرا وزیر اعظم کے ہاتھوں سے ہونا تھا۔ نواب صاحب اس کی صدارت فرما رہے تھے۔ نواب صاحب نے اپنی تقریر میں کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کی مدح سرائی کی اور اپنی تقریر کو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے لیے اس دعائیہ فقرہ پر ختم کیا:

عمرت دراز باد کہ تا دور مشتری
ما از تو برخوریم تو از عمر برخوری

مسز گاندھی نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا کہ:

" میں کیا نواب صاحب کو دعا دے سکتی ہوں میں تو اُن سے دعا ہی لے سکتی ہوں۔"

انھوں نے جو نواب صاحب کی وفات پر پیام دیا وہ اُن کے نواب صاحب کے متعلق خیالات وجذبات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔

نواب صاحب کے پرانے کاغذات، ڈائریاں، اخبار کے تراشے میرے سامنے ہیں اُن کی زندگی کے بہت سے گوشے عیاں ہو رہے ہیں۔ یہ واقعات بھی میں نے ان ہی کاغذات کی مدد سے یکجا کیے ہیں جو عام لوگوں کی نظر سے پنہاں ہیں۔

"اے رہِ انقلاب وقت تجھ کو کیا بتائیں ہم"

انھیں پڑھ کر بیساختہ یہ مصرعہ سامنے آجاتا ہے۔

"ورنہ کبھی رہبر تھے منزل کا پتہ ہم تھے۔"

نواب صاحب اس پر عمل کیا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہو گے تو تم بہت سے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے چڑھو گے۔ لیکن جب تم اترو گے تو پھر ایک بار اُن ہی لوگوں سے ہاتھ ملانا ہوگا۔ لہٰذا ایسا طرز رکھو کہ تمہیں واپسی پر شرمندگی نہ ہو"۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کبھی حکومت کا بیجا استعمال نہیں کیا۔ جب ہوم ممبر تھا، جب یو۔پی کا چیف منسٹر تھا، جب گورنر ہوا اور پھر وزیر اعظم حیدرآباد ہوا، اس کا ہمیشہ خیال رکھا کہ جب کسی کا معاملہ میرے سامنے آیا میں نے اس کے خلاف فیصلہ کرتے ہوئے بھی جتنی ممکن رعایت اس کے ساتھ ہو سکتا تھا بغیر سفارش برتی اور کبھی کسی کے ساتھ ذاتی عناد نہیں برتا۔ یاد رکھو آج کرسی ہے، کل کرسی پر نہیں بھی ہو گے۔"

نواب صاحب کی خانگی زندگی کے لیے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ وہ عظیم ہستی تھے۔ بہت شفیق باپ، اپنے بچوں سے بے انتہا محبت کرنے والے، اُن میں ماں جیسی محبت اور باپ جیسی رہنمائی تھی۔ میری زندگی کے بہترین دن ان کے ساتھ گزرے۔ اُن کی خدمت میری عبادت تھی۔

ہر کجا رفتم غبار زندگی در پیش بود
یارب این خاک پریشان از کجا برداشتم

تم رہے ساتھ تو جلتے رہے راہوں پہ چراغ
ساتھ چھوٹا ہے تو دھندلا گئے منزل کے نشاں

اِس مضمون سے متعلق چند خطوط

وزیر اعظم کی رہائش گاہ
نئی دہلی
۹، جنوری ۱۹۸۲

مجھے نواب محمد احمد سعید خاں صاحب کی وفات سے بڑا صدمہ ہوا ہے۔ وہ واقعی ایک عظیم ہستی تھے۔ انھوں نے اپنی ذات میں وہ اخلاق اور آداب کو لیے تھے جو اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں جو اب نہیں رہا۔ وہ مہذب اور بڑے باوقار تھے اور ہمیشہ اچھے کاموں کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ نواب صاحب ہماری اجتماعی زندگی میں بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے اور انھوں نے اتر پردیش اور ہمارے ملک کی مختلف حیثیتوں میں ایک بڑی خدمت کی ہے انھوں نے فلاح و بہبودی کی بہت سی انجمنوں کی رہنمائی کی۔ اسکاوٹ تحریک کے ابتدائی دور میں انھوں نے جو حصہ لیا اس سے سب واقف ہیں۔

وہ مجھے اور میرے شوہر کو ہمارے بچپن سے جانتے تھے اور انھوں نے خلوص کا یہ رشتہ اس ساری مدت میں برقرار رکھا۔

میں نواب صاحب کے اہل خاندان اور ان کے وسیع حلقۂ احباب سے اظہار تعزیت کرتی ہوں۔

اندرا گاندھی

[انگریزی سے ترجمہ]

راجیو گاندھی
نمبر ۱۰ جن پتھ ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۱
۷ر جولائی ۱۹۹۰ء

مکرمی نواب صاحب

میں نے آپ کے محترم والد نواب سر احمد سعید خاں صاحب کے حالات جو آپ نے قلم بند فرمائے ہیں، بڑے اشتیاق سے پڑھے۔ آپ کے مضمون سے دنیا کو ان قریبی تعلقات کا علم ہوا جو آپ کے والد محترم کو ہمارے عظیم مجاہدین آزادی سے تھے جن میں پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت گوبند بلبھ پنت شامل تھے۔ یہ ہماری تہذیب کا ایک قیمتی ورثہ ہے اور اس سے ہمارے اس زمانے کے حالات کا علم ہوتا ہے جو نواب سر حافظ محمد احمد سعید خاں صاحب کا تھا۔

خیر اندیش
دستخط راجیو گاندھی

نواب ابن سعید چھتاری
راحت منزل۔ میرس روڈ علی گڑھ ۔ اتر پردیش
(انگریزی سے ترجمہ)۔

کے۔سی۔پنت
۷ تیاگ راجا مارگ۔ نئی دہلی (ہندوستان)
فون نمبر ۳۰۱۴۴۳۱ ۔ ۳۰۱۲۶۱۸
۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۰ء

محترم نواب صاحب

اپنے والد صاحب کے متعلق مجھے آپ کے خط مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۹۹۰ء اور اس کے ساتھ آپ کے مضمون ملنے کی بہت خوشی ہوئی۔

نواب صاحب مرحوم مجھے ۱۹۳۰ والی دہائی کے آخری زمانے سے یاد ہیں جب میرا اور آپ کا بچپن تھا اور نینی تال میں ہمارا گھر آپ کے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ مسز پنڈت کی لڑکیاں جن کا ذکر آپ کے مضمون میں ہے وہ بھی قریب ہی رہتی تھیں۔ یو۔پی میں پہلی کانگریس حکومت کا دور تھا لیکن آپ کے مضمون میں تو ان واقعات کا بھی ذکر ہے جو ۱۹۲۰ء والی دہائی میں ہوئے تھے جب ہماری تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی لیکن یہ سب میری پیدائش سے پہلے کی باتیں ہیں۔ وہ چوٹیں جو میرے والد اور پنڈت جی کو سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے میں لاٹھیوں سے لگی تھیں۔ میرے ذہن میں وہی اس زمانے کی اصل تصویر بن کر رہ گئی ہیں۔ آپ کی تحریر سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گورنر نے ہوم ممبر نواب صاحب کو بالکل نظر انداز کر کے براہ راست حکام ضلع کو اس دن ظلم کرنے کی ہدایت کی تھی۔ آپس کے سیاسی اختلافات اور اس زمانے کی فضا کے پس منظر میں میرے والد اور نواب صاحب میں آپس میں جو حفظ مراتب، ادب اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جو باہمی لگاؤ تھا وہ ان دونوں کی شرافت اور تہذیب کا بانگ دہل اعلان ہے۔

نواب صاحب جو شفقت مجھ پر فرماتے تھے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں انہوں نے مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھا اور ہمیشہ میری ہمت افزائی کی۔ آپ اکثر ہماری ملاقات

لے وقت موجود رہتے تھے ۔ وہ یقیناً عالی مرتبت
بزرگ تھے ۔

میں واقعی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے
ان اعلیٰ اقدار کی یاد دلائی جو نواب صاحب کی
ذات سے وابستہ تھیں اور جنہیں وہ اپنی ذات
میں سموئے ہوئے تھے اور جن کی آج کل کمی
ہے ۔

آپ کا مخلص
کے ۔ سی ۔ پنت

نواب ابن سعید چھتاری
راحت منزل
میرس روڈ ۔ علی گڑھ ۔

" دوسری جگہوں کے مقابلے میں اسلام
میں سائنسوں کا پھلنا پھولنا بہت حد تک
اس بات کا مرہون منت ہے کہ اعلیٰ مرتبوں
پر فائز صاحبان سائنسی علوم پر اپنی داد و
دہش نچھاور کرتے رہے ہیں ۔ جہاں جہاں
اسلامی سماج مائل بہ انحطاط ہوا وہاں سائنس
بھی بےجان اور کمزور ہو گئی لیکن جب تک
ایک بھی دارالسلطنت ایسا رہا جہاں بادشاہوں
اور وزیروں کو سائنس کی سرپرستی کرنے
میں لطف آتا تھا یا اس سے ان کو شہرت
یا منفعت حاصل ہوتی تھی تب تک یہ مشعل
روشن رہی "

ایچ ۔ اے ۔ آر ۔ گب

آئن سٹائن کا نظریۂ تجاذب

لطیف جاوید ○

ڈاکٹر البرٹ آئن سٹائن جرمنی کے صوبے ویریا کے ایک مقام "الم" میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا۔ بعد میں نازیوں کے خوف سے امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ چھبیس سال کی عمر میں ۱۹۰۵ء میں اس نے نظریہ اضافیت خصوصی پیش کیا، جب کہ وہ سوئٹزرلینڈ کے شہر برن میں دفتر اجارہ داری میں معائنہ آفیسر تھا۔ پھر اسے خیال ہوا کہ شاید کائنات کے بعض گوشے تشریح طلب رہ گئے ہیں۔ جن کی وضاحت کے لیے ۱۹۱۶ء میں اُس نے "نظریہ اضافیت عمومی" پیش کیا اور یہی نظریہ ہمارا آج کا موضوع ہے۔

محرکات

کسی نظریے کو پرکھنے اور سمجھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ان محرکات واسباب کو بھی جانا اور سمجھا جائے جن سے متاثر ہو کر کسی نظریہ ساز نے نظریہ پیش کیا۔ آئن سٹائن نے جن محرکات کی بنا پہ نظریہ اضافیت عمومی پیش کیا، اُن میں سرفہرست نیوٹن کی تجاذب اور جمود کی مساوات تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ مختلف کمیتوں کے اجسام زمین کی طرف یکساں اسراع سے کیوں گرتے ہیں؟ اس کہانی کا اگلا حصہ لنکن بارنیٹ کی زبانی سنیے لنکن بارنیٹ کی کتاب "کائنات اور آئن سٹائن" ۱۹۴۸ء میں امریکہ میں تب شائع ہوئی جب آئن سٹائن بقید حیات تھا۔ اس نے اس کتاب کو نہ صرف پسند کیا بلکہ پیش لفظ بھی لکھا کہ "لنکن بارنیٹ کی یہ کتاب مقبول عام سائنسی کتب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اس میں نظریہ اضافیت کے نکات خوب صورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔ طبیعیات کے متعلق ہماری موجودہ علمی کیفیت بھی واضح کر دی گئی ہے۔" اس کتاب کا مستند اردو ترجمہ محترم آفتاب حسن صاحب نے کیا جو سید امتیاز علی تاج (تمغۂ امتیاز) نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔

لنکن بارنیٹ لکھتے ہیں:

> نیوٹن نے اس مسئلے کا حل قانون تجاذب کی شکل میں دیا۔ آسان الفاظ میں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ پراسرار قوت جس کی بدولت ایک جسم کسی دوسرے جسم کو کشش کرتا ہے، کشش شدہ جسم کی کمیت میں زیادتی کے ساتھ خود بھی بڑھ جاتی ہے جتنا بڑا کوئی جسم ہوگا اتنی ہی زیادہ قوت تجاذب ہوگی۔ اگر کوئی جسم چھوٹا سا ہے تو اس کے انرشیا یا حرکت کی مزاحمت کی قوت کم ہوگی

○ ۳۷/۸ لیاقت آباد، کراچی۔ پاکستان

نہ صرف یہ بلکہ اس پر قوت تجاذب کی مقدار بھی کم ہوگی اگر جسم بڑا ہے تو اس کا جمود بھی زیادہ ہوگا اور اس پر قوت تجاذب بھی زیادہ ہوگی قوت تجاذب کی اتنی ہی مقدار بروئے کار آتی ہے جتنی اس کا جمود توڑنے کے لیے کافی ہے یہی وجہ ہے کہ تمام جسم خواہ اُن کی جمودیت کتنی ہی ہو، ایک ہی رفتار سے گرتے ہیں۔"

پھر کہتے ہیں:

اس عجیب و غریب اتفاق یعنی تجاذب اور جمود کی مساوات پر یقین تو قائم کر لیا گیا تھا لیکن نیوٹن کے بعد کے تین سو سالوں میں نہ تو اسے سمجھا گیا اور نہ ہی اس کی تشریح کی گئی۔ عہد حاضر کی ساری میکانیات اور انجینئرنگ نیوٹن کے تصورات کی پیداوار ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ افلاک بھی نیوٹن کے قوانین کے تابع عمل کرتے ہیں۔"

لیکن آئن سٹائن کو یہ تشریح تسلیم نہ تھی۔ اس کا انداز فکر نیوٹن سے قطعی مختلف تھا۔ بقول بارنیٹ:

...... ادھر آئن سٹائن کے سارے انکشافات کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلم اعتقادوں کو شک کی نظر سے دیکھنے کا عادی تھا اور نیوٹن کے کئی ایک تصورات کو ناپسند کرتا تھا اسے شک تھا کہ تجاذب اور جمود کا مساوی ہونا محض کائنات کا ایک حادثہ ہے۔ اسے اس خیال کو تسلیم کرنے سے انکار تھا کہ قوت تجاذب ایسی قوت ہے جو دور دراز فاصلوں تک آناً فاناً عمل کر سکتی ہے ۔۔۔۔ اسے یہ بات بھی قابل قبول نہ تھی کہ زمین اپنی کشش ثقل کو دور تک فضا میں پھینک کر کسی جسم کو اپنی طرف ٹھیک اتنی طاقت سے کھینچ لیتی ہے جو ایک مجرے کی طرح اس کی جمودی مزاحمت کے برابر ہے۔ ان اعتراضات کی وجہ سے اس نے تجاذب کا ایک نیا قانون وضع کیا۔"

نظریہ اضافیت عمومی کے اسباب و محرکات واضح ہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس نظریے میں ایک نیا نظریہ تجاذب پیش کیا گیا تھا۔ اس لیے نظریہ اضافیت عمومی کو دراصل نظریہ تجاذب ہی کہا جاتا ہے۔ مشہور برطانوی پروفیسر بانڈی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس نظریے کے لیے "نظریہ اضافیت عمومی" کا نام موزوں نہیں اسے نظریہ تجاذب ہی کہنا چاہیے۔

آئن سٹائن کا نظریہ تجاذب

کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

آئن سٹائن کے نظریہ تجاذب کے متعلق جاننے کے لیے وہ کیا نہیں ہے اور کیا ہے۔ ہم مندرجہ ذیل تحریر کا مطالعہ کرتے ہیں:

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود "تجاذب کیا ہے؟" یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ آئن سٹائن کا تجاذب کا تصور نیوٹن کے تصور سے مختلف ہے۔ یہ "قوت" نہیں ہے۔ آئن سٹائن کی نظر میں یہ خیال کہ مادی جسم ایک دوسرے کو کشش کرتے ہیں۔ ایک واہمہ ہے جو فطرت کے متعلق غلط میکانکی تصورات کی پیداوار ہے۔ جب تک ہم یقین کریں گے کہ کائنات ایک عظیم مشین ہے تو قدرتی طور پر ہم یہ بھی سوچیں گے کہ اس کے مختلف حصے ایک دوسرے پر قوت کا اثر ڈالتے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کو کشش کرتے ہیں لیکن سائنس حقیقت کی تلاش میں جتنی دقت نظر سے کام لیتی ہے، اتنا ہی واضح ہوتا ہے کہ کائنات

شین کی مانند نہیں ہے۔ پس آئن سٹائن کے قانون تجاذب میں قوت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

یہ قانون تجاذبی میدان میں اشیا مثلاً ستاروں کا رویہ "کشش" کی صورت میں نہیں بلکہ ان راستوں کی شکل میں کرتا ہے جن پر وہ اجسام چلتے ہیں۔ آئن سٹائن کی نظر میں تجاذب محض ایک تجزیہ ہے۔ ستاروں اور سیاروں کی حرکات کا سبب ان کا خلق ہونا ہے اور جن راستوں پر وہ چلتے ہیں ان کا تعین فضا کی ساختی خصوصیات سے ہوتا ہے بلکہ بہتر الفاظ میں یوں کہیں کہ یہ تعین مکان و زمان کے سلسلے کی ساختی خصوصیات سے ہوتا ہے۔

آئن سٹائن کا تصور تجاذب واضح ہے وہ اپنے اس نظریہ کی بنیاد ایک مفروضے پر رکھتا ہے جسے اصولِ مساوات کہتے ہیں۔ میں فی الحال اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ آئن سٹائن کا نیوٹن سے اختلاف کہاں تک درست ہے اور جو اس نے حل پیش کیا وہ کہاں تک سائنسی ہے۔

اصولِ مساوات اور آئن سٹائن کے فرضی تجربات

آئن سٹائن کا مفروضہ جسے اصولِ مساوات کہا جاتا ہے۔ نظریہ اضافیت کے دو معروف تشریح کنندوں سے سنیے:

تجاذبی میدان اور مصنوعی قوت کے میدان قطعی طور پر ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی چھوٹے سے مکان میں کسی مقامی تجربے سے ان میں فرق کرنا ناممکن ہے: (یعفبر اینڈ مکی)

" ہمارے پاس کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے ہم مادی قوتوں سے پیدا شدہ حرکتوں اور تجاذب سے پیدا شدہ حرکتوں میں امتیاز کر سکیں" (رنکی وارنیٹ)

اس مفروضے کی بنا پر آئن سٹائن اور سائنس دانوں نے جو آخری نتیجہ اخذ کیا۔ اسے بیان کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ مرکز گریز قوت اور دیگر تمام موجودہ قوتیں دراصل قوت تجاذب ہی ہیں۔ اسی لیے یہ تجاذبی قانون کی پابند ہیں:

اصولِ مساوات کے مفروضے کے ثبوت کے طور پر آئن سٹائن نے تین خیالی تجربات پیش کیے بقول ان کے مندرجہ ذیل حالتوں میں ایک سائنس دان مقامی تجربات سے اپنی صورت حال میں فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان میں میکانی رویہ ایک سا ہی ہوتا ہے۔

۱۔ خالی فضا میں ساکن یا یکساں رفتار سے چلنے والی لفٹ ـــــ اور کسی میدان تجاذب میں آزادانہ گرنے والی لفٹ میں ـــــ کیوں کہ دونوں حالتوں میں سائنس دان اور اس کا سامان بے وزن ہوگا۔

۲۔ کسی تجاذبی میدان میں ساکن ـــــ اور خالی فضا میں یکساں اسراع سے اوپر کی طرف اٹھنے والی لفٹ میں ـــــ کیوں کہ دونوں صورتوں میں ان میں موجود مادی اشیا لفٹ کے فرش پر وزن رکھتی ہوں گی۔

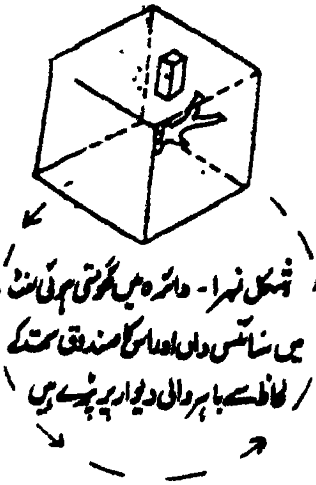
۳۔ قوت تجاذب کے اثرات ـــــ اور خالی فضا میں دائرے میں گھومنے والی لفٹ میں مرکز گریز قوت کے اثرات۔

کیوں کہ دونوں صورت میں مادی اشیا کسی ایک متعلقہ دیوار پر وزن رکھتی ہوں گی اور اسے وہ اپنا فرش تصور کریں گی۔

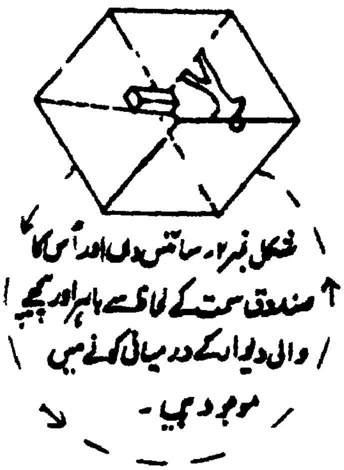
میرے نزدیک آئن سٹائن نے ان خیالی تجربات سے جو نتائج اخذ کیے ہیں قطعی طور پر غلط ہیں۔ یہی تکنیکی مجبوری کے تحت پہلے دو تجربات کو کسی دوسرے وقت پر چھوڑتا ہوں اور تیسرے تجربے کا جائزہ پیش کرتا ہوں۔

آئن سٹائن کا خیالی تجربہ اور سائنس کے نتائج

سوال یہ ہے کہ کیا خالی فضا میں دائرے میں گھومنے



شکل نمبر ۱۔ دائرہ میں گھومتی ہوئی لفٹ میں سائنس داں اور اس کا صندوق سمت کے لحاظ سے باہر والی دیوار پر پڑے ہیں



شکل نمبر ۲۔ سائنس داں اور اس کا صندوق سمت کے لحاظ سے باہر اور پیچھے والی دیوار کے درمیانی کونے میں موجود ہیں۔

والی فضا میں مرکز گریز قوت کے اثرات، تجاذبی اثرات جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آئن سٹائن اس کا جواب "ہاں" میں دیتا ہے اور ایک خیالی تجربہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ایک لفٹ خالی فضا میں دائرے میں گھوم رہی ہو تو (شکل نمبر ۱) اس میں موجود سائنس داں اور اس کا سامان باہر والی دیوار پر موجود ہوں گے۔ سائنس داں کے پاؤں اس دیوار سے مضبوطی سے چپکے ہوں گے جیسے کہ سطح زمین پر ہوتے ہیں۔ دوسرے اگر وہ ہاتھ سے کوئی شے آزاد کرے تو وہ سیدھی اس کے پاؤں میں یعنی باہر والی دیوار پر گرے گی۔ اس سے وہ آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکے گا کہ گویا اس کی لفٹ کسی میدان تجاذب میں ساکن کھڑی ہے۔

جائزہ

اب ہم آئن سٹائن کے خالی فضا میں کیے جانے والے تجربے کا جائزہ لیتے ہیں اور لفٹ کو دائرے میں حرکت دے کر لمحہ بہ لمحہ ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہیں۔

۱۔ فرض کیا خالی فضا میں ایک لفٹ اپنے ایک تصوراتی مرکز کے گرد دائرے میں گھومنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ اس میں ایک سائنس داں اور اس کا ایک صندوق موجود ہے۔ بے وزنی کی وجہ سے یہ دونوں اِدھر اُدھر فضا میں معلق ہیں۔

۲۔ لفٹ دائرے میں گھومنا شروع کرتی ہے تو سائنس داں اور صندوق اپنے اپنے مقام پر کھڑے رہتے ہیں۔ کیونکہ بے وزن ہونے کی وجہ سے اُن کا لفٹ کی کسی دیوار، چھت یا فرش سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے وہ ساکن ہی رہتے ہیں۔

۳۔ سائنس داں خود کو اور صندوق کو پیچھے والی دیوار کی طرف بڑھتا ہوا محسوس کرے گا۔ کیوں کہ دیوار اُن کی طرف بڑھ رہی ہوگی۔

۴۔ وہ دونوں اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے پیچھے والی دیوار سے لگ جائیں گے اور دیوار کے ساتھ دائرے میں گھومنا شروع کردیں گے۔

۵۔ اب مرکز گریز قوت پیدا ہوگی اور وہ سائنس داں اور صندوق کو باہر والی دیوار کی طرف دھکیلنا شروع کردے گی۔

۶۔ سائنس داں اور صندوق باہر والی دیوار سے لگ کر اٹک جائیں گے اور اس کے ساتھ گھومنے لگیں گے۔ (شکل نمبر ۲)

۷۔ باہر والی دیوار مرکز مائل قوت اور پیچھے والی دیوار مرکز گریز قوت مہیا کرتی رہے گی اور یہ اشیاء

دائرے میں گھومتی رہے گی۔

۸۔ اگر سائنس داں خواہ وہ دونوں دیواروں کے سنگم میں کسی بھی جگہ موجود ہو لفٹ کے اندر کی طرف جست لگائے تو پہلے وہ پیچھے والی دیوار سے ٹکرائے گا اور پھر واپس کمرے میں آجائے گا۔ یہی حال اُن اشیا کا ہوگا جن کو سائنس داں اپنے ہاتھ سے آزاد کرے گا یا اندر کی طرف پھینکے گا۔

۹۔ سائنس داں اگر باہر والی دیوار پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہونا چاہے تو اس کے باقی جسم کو یقیناً پچھلی دیوار سے سہارا لینا ہوگا۔ اس سہارے کے بغیر وہ باہر والی دیوار پر کھڑا نہ ہو سکے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال آئن سٹائن کے بیان کردہ نتیجے کے قطعی خلاف ہے جو پہلے بتایا جا چکا ہے۔ اس کا خلاصہ یوں پورا ہوتا ہے کہ وہ سائنس داں باہر والی دیوار پر مضبوطی سے بغیر سہارے کے کھڑا ہو سکے۔ وہ اپنے ہاتھ سے جو چیز بھی آزاد کرے وہ سیدھی اس کے پاؤں میں گرے لیکن امر واقع یہ نہیں ہے۔

پھر آئن سٹائن کا نتیجہ روزمرہ زندگی کے مشاہدات و تجربات اور میکانیات کے مسلمہ قوانین کے بھی خلاف ہے کیونکہ سائنس داں اگر باہر والی دیوار پر کھڑا ہوگا اس کے پاؤں کی رفتار سر کی نسبت سے زیادہ ہوگی۔ اس لیے وہ پیچھے کی طرف گرتا رہے گا۔ اس کی صورت حال دراصل ایسے شخص جیسی ہے جو کسی بس کے فرش پر کھڑا ہو۔ جو اسرائی حرکت سے چل رہی ہو۔ یقیناً ایسا شخص پیچھے کی طرف گرتا رہے گا۔

آئن سٹائن نے بعض ایسے خیالی تجربات بھی پیش کیے ہیں جو ناقابل عمل ہیں لیکن یہ تجربہ خالی فضا میں کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ سطح زمین پر بھی یہ تجربہ کر کے حقیقت حال معلوم کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ تجاذب کے اثرات کو خارج تصور کیا جا سکتا ہے۔

ایک سادہ سا تجربہ تجویز کرتا ہوں، جس کو ہر آدمی اپنے مطالعے کی میز پر کر سکتا ہے۔ ایک چوکور ڈبہ لیں اس میں کچھ مادی اشیا رکھ کر ڈھکنا سختی سے بند کر دیں تاکہ ہوا اندر داخل نہ ہو۔ پھر اس ڈبے کو کسی گول دائرے میں گھومنے والی شے سے لگا دیں۔ چھت والے پنکھے کے پروں کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خوب حرکت دے کر ڈبے میں موجود مادی اشیا کو دیکھیں۔ دو سمت کے لحاظ سے باہر اور پیچھے والی دیوار کے درمیانی کونے میں ہی پڑی ہوں گی۔ خواہ وہ آپ نے کسی بھی جگہ رکھی ہوں۔ ان کا براہ راست یا بالواسطہ دونوں دیواروں سے تعلق ضرور ہوگا۔ فرق صرف یہ ہے کہ تجاذبی قوت کی وجہ سے وہ ڈبے کے فرش پر بھی موجود ہوں گی جب کہ خالی فضا میں تجاذبی قوت کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ کونے میں کسی جگہ بھی موجود ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ فرش سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

محترم قارئین! کہا جاتا ہے کہ سائنس میں حقیقت کو پرکھنے کی پہلی اور آخری کسوٹی تجربہ ہے۔ راقم نے آئن سٹائن کے اپنے تجربے سے اور ایک دوسرا سادہ سا تجربہ پیش کر کے یہ سائنسی بنیادوں پر ثابت کر دیا ہے کہ آئن سٹائن کے اصول مساوات کی تین ٹانگوں میں سے کم از کم ایک ٹانگ بالکل غلط بنیادوں پر کھڑی ہے۔ یعنی خالی فضا میں گھومنے والی لفٹ میں میکانی اثرات میدان تجاذب میں ساکن لفٹ کے سے نہیں ہیں۔ ایک سائنس داں مقامی طور پر ہی اس صورت حال کا اندازہ کر سکتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے معزز ریاضی داں، طبیعیاتی ماہرین ساتھ کس کا دیتے ہیں ——— تجرباتی حقیقت کا ——— یا آئن سٹائن کے غلط مفروضے کا۔

اے ایم یو میں دینیات کی تعلیم و تنظیم

ایک تاریخی جائزہ

محمد سعود عالم قاسمی ○

ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے یہ ہماری زندگی کا تتمہ یا ضمیمہ appendix نہیں بلکہ زندگی کا اصول اور آئین ہے، ضابطہ اور نظام ہے۔ یہ دین نہ صرف تمام شعبہ ہائے حیات میں ہماری رہنمائی کرتا ہے بلکہ ہمارے فکر و عمل کا (خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) معیار اور مقیاس ہے۔ ہماری سرگرمیوں کا خواہ کوئی بھی میدان ہو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنے ضابطۂ حیات سے کس حد تک دور یا نزدیک ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے اس نظام زندگی کے اصول و مبادی سے واقفیت حاصل کریں اور اس کے حدود اور خصوصیات سے آگاہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بغیر ہم بھی کچھ ہو سکتے ہیں مگر مسلمان نہیں ہو سکتے۔ یہی وہ احساس تھا جس نے ہماری عظیم درس گاہ کے بانی سر سید احمد خاں کو عصری علوم کے ساتھ ابدی علوم یعنی دینیات کی تعلیم و ترویج پر مجبور کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی سر سید کے احساس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"جس وقت سر سید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال ہوا اسی وقت ان کو اس بات کی فکر تھی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو تعلیم کے ان مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اس سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے" [۱]

سر سید مرحوم اگرچہ جدید تعلیم کو اہمیت دیتے تھے اور اس کو قومی ترقی کا ذریعہ سمجھتے تھے مگر وہ دینی تعلیم سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے ان کو دینی تعلیم اور دینی حیثیت کا جتنا پاس و لحاظ تھا اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے کالج کے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، اسی پر یقین رکھنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کا نمونہ ہو گے اور جبھی ہماری قوم کی عزت ہوگی" [۲]

○ ناظم سنی دینیات، اے ایم یو، علی گڑھ

مدرستہ العلوم یعنی موجودہ مسلم یونیورسٹی میں دینی تعلیم کو فروغ دینے کے خیال سے سرسید نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے ذمہ دینی تعلیم کے نصاب نظم اور تدریس پر غور کرنا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ خود سرسید اس کمیٹی میں شامل نہ تھے بلکہ انھوں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان علماے کرام سے تعاون کرنے اور ذمہ داری سنبھالنے کی اپیل کی جنھوں نے ان کے بعض اجتہادی خیالات کی بنا پر ان کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ان حضرات کا اندیشہ تھا کہ سرسید اپنے مخصوص افکار و خیالات کی اشاعت کے لیے کالج قایم کر رہے ہیں اور دینی شعبہ کو اس کا آلہ کار بنا رہے ہیں۔ سرسید کا خلوص تھا کہ انھوں نے اپنے ناقدین کی علمی اور معروف دینی حیثیت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ دینیات کی ذمہ داری سنبھالنے کی دعوت بھی ان کو دی۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اس شعبہ میں ان کے ذاتی خیالات کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔ ان کا منشا صرف اس قدر ہے کہ یہاں کے طلبا کو عصری علوم کے ساتھ اسلامی علوم سے بھی خاطر خواہ واقفیت ہو یعنی ان کے دائیں ہاتھ میں قرآن بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پر لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہو۔ اس یقین دہانی کے باوجود ان کو فی الفور کوئی کامیابی نہ ہو سکی اور علما بدستور ان کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ان کو ایک جواں عزم اور جید عالم دین میسر آ گئے جن میں ظاہری اور باطنی دونوں محاسن موجود تھے اور وہ مولانا عبداللہ انصاری تھے (مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی (یہ دونوں بزرگ نصاب کمیٹی میں شامل کیے گئے تھے) جیسے اساتذہ کے زیر سایہ انھوں نے تعلیم و تربیت کے مراحل طے کیے۔ وہ نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے اولین فضلا میں تھے بلکہ بانی دارالعلوم کے داماد بھی تھے جو سرسید" کے استاذ بھائی اور غم گسار تھے۔ اس طرح سرسید نے عصری اور دینی علوم کے امتزاج کا جو خواب دیکھا تھا اس کا ابتدائی حصہ تعبیر آشنا ہوا۔

مولانا عبداللہ انصاری ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ آئے اور بحیثیت ناظم شعبۂ دینیات ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۲۵ء میں مولانا کا انتقال ہوا تا دم وصال مولانا دینیات کی نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے اور ایم۔ اے۔ او کالج کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عالم اسلام میں وقار اور اعتبار حاصل کرنے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۰۰ء میں جب امیر حبیب اللہ خاں سربراہ مملکت افغانستان ہندوستان آئے تو کالج کے ٹرسٹیان کی دعوت پر علی گڑھ بھی تشریف لائے۔ یہاں آ کر انھوں نے نواب محسن الملک سے کہا:

"میں دو حیثیت سے کالج دیکھ سکتا ہوں، ایک بطور محسن کے دوسرے بطور سیاح کے، پہلی حیثیت سے ضروری ہے کہ ہر بات کی تحقیق و تفتیش اور طلبا کا امتحان لے کر میں اپنی رائے ظاہر کروں۔ دوسری صورت میں معمولی اور رسمی طور پر کالج کو دیکھ کر رخصت ہو جاؤں بتاؤ ان دونوں باتوں میں سے کس کو ترجیح دیتے ہو۔ میری اچھی یا بری رائے امتحان لینے پر منحصر ہوگی۔"

محسن الملک کی علمی غیرت نے بجا طور پر پہلے طریقے کو پسند کیا اور امتحان لینے کے لیے دینیات کے طلبا پیش کیے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں نے خود ان کا امتحان لیا اس امتحان میں سبھی طلبا کامیاب رہے اور امیر نے ان سب کی تعریف کی۔ آخر میں ایک طالب علم نے خوش الحانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کی جس سے امیر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ امیر حبیب اللہ شعبۂ دینیات کی کارکردگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ محسن الملک نے جب کالج کی

طرف سے اُن کو سپاس نامہ پیش کیا تو امیر نے اسے صرف وہاں تک سنا جہاں تک دینی تعلیم کا تذکرہ تھا اور جواب میں امیر نے جو خطبہ دیا اس میں اپنے تاثر کا اظہار ان لفظوں میں کیا جو کالج کے شاہانہ عطیہ کی سند میں موجود ہے۔

"اگرچہ از زبان بعضے مردم در باب شاگردان
کالج موصوف شنیدہ بودم کہ در عقائد اسلامیہ
خود درست نمی باشند۔ اما خود من بحضور خود
بزبان خود از شاگردان کالج موصوف امتحان
بعضے عقائد ضروری اسلام و مسائل نماز و
روزہ را گرفتم۔ تمام سوالہائے مرا بطریق
عقاید اہل اسلام جواب گفتند۔ بعد ازاں کہ
اطفال اسلام بعقائد ضروری فرائض اسلام
دانستہ شوند ہر گاہ شروع درس مروجہ یورپ
رابکنند ہیچ عیبے نیست۔"

[اگرچہ میں نے بعض لوگوں سے اس کالج کے طلبا
کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے اسلامی عقیدے
میں صحیح نہیں ہوتے مگر خود میں نے کالج میں
اپنے سامنے اپنی زبان سے اس کالج کے کچھ
طلبا کا اسلام کے ضروری عقائد اور مسائل
نماز و روزہ کے متعلق امتحان لیا۔ طلبا نے
میرے تمام سوالات کا عقائد اسلام کی رو سے
صحیح جواب دیا۔ جب مسلمانوں کے بچے اسلام
کے ضروری عقائد اور فرائض اسلام سے واقف
ہوں تو چاہے جہاں مغربی تعلیم حاصل کریں
کوئی حرج نہیں ہے][۳۴]

ظاہر ہے کہ اس کامیابی میں مولانا عبداللہ انصاری کی ذاتی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ ان کی صلاحیت اور صالحیت ہی کی بنا پر سر سیّد نہ صرف ان پر اطمینان اور اعتماد کا اظہار کرتے تھے بلکہ اس کالج میں مولانا کی موجودگی پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے ایک مرتبہ سر سیدؒ کو لکھا:

"قبلۂ امم، آداب۔ مولانا انصاری
ماشاء اللہ جلیل القدر فاضل اور نہایت
بابرکت شخص ہیں۔ اب یہی بہتر معلوم ہوتا ہے
کہ قرآن مجید کا ترجمہ جو کہ خاکسار کالج کلاس
کے طلبا کو پڑھاتا ہے وہ مولانا صاحب ممدوح
کے حوالے کر دیا جائے۔ علاوہ عمدہ تعلیم پانے
کے طلبا کو ان کی برکت سے روزانہ مستفید ہونے
کا موقع ملے گا۔"[۳۵]

سر سید نے مولانا شبلیؒ کے اس خط کے جواب میں لکھا:

"مولوی شبلی صاحب! آپ نے اپنی طولانی
تقریر کو ایسے عنوان سے شروع کیا جس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ مجھ کو مولوی صاحب کے کام پر
اطمینان نہیں (حاشا و کلا) اگر ایسا ہوتا تو
ایسا عظیم الشان کام جو کہ کالج کی جان ہے ان
کے سپرد نہ کیا جاتا۔ مجھے ان پر بہت بڑا اطمینان
ہے۔ وہ صدہا علما میں سے اس جلیل القدر
کام کے واسطے منتخب کیے گئے ہیں۔"[۳۶]

بلکہ ایک موقع پر سر سیّد نے تو یہاں تک کہا کہ
'اگر اللہ قیامت کے دن مجھ سے پوچھے گا کہ
کیا لائے ہو تو میں مولانا عبداللہ انصاری کو
پیش کر دوں گا۔'

مولانا کی سرکردگی میں تجوید و قرأت کی کلاس کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا ابو الکلام آزاد ممتحن کی حیثیت سے بلائے گئے۔ مولانا انصاری باصلاحیت مدرس اور مدبر و منتظم ہونے کے ساتھ دور اندیش اور مشفق عالم دین تھے۔ ان کی ذات سے اس یونیورسٹی کو جو فائدہ پہنچا وہ تدریس و انتظام کے علاوہ یہ ہے:

۱۔ سرسید کے ذاتی خیالات کا سہارا لے کر علمائے امّت نے اس درس گاہ سے جو علیحدگی اختیار کر لی تھی مولانا انصاری نے اس پر ان کو نظرثانی کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اور اس طرح ایک بڑا خلیج جو کسی بھی صورت میں پٹ نہ سکتی تھی بہت حد تک کم ہو گئی۔

۲۔ ہندوستان اور اس کے باہر لامذہبی ادارے کی حیثیت سے اس ادارہ کا جو تعارف ہوا تھا وہ بڑی حد تک تبدیل ہوا اور اس طرح ایک مثبت رویہ ادارہ کے حق میں پیدا ہوا۔

۳۔ عوام کو یہ اطمینان حاصل ہوا کہ چوں کہ اس ادارہ سے علما بھی وابستہ ہیں اس لیے اس کے ساتھ تعاون کرنا اور وہاں اپنے بچوں کو برائے تعلیم بھیجنا دین کے مطابق ہے۔

۴۔ درس گاہ کی دینی فضا اور اسلامی ماحول کو بنانے میں جو بانی درس گاہ کے منصوبہ کا اہم حصّہ تھا مولانا نے زبردست حصہ لیا۔

مولانا کی علمی یادگاریں چار کتابیں ہیں ۱۔ شجرہ سلوک: یہ مولانا مرحوم کے شجرۂ تصوف پر مشتمل ہے۔ اس میں چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، شاذلیہ اور خلوتیہ سلسلوں سے تعلق کا شجرہ ہے۔ یہ ہنوز مخطوطہ ہے اور ایک نسخہ سنی تھیالوجی کی سمینار لائبریری میں موجود ہے۔ ۲۔ آغاز اسلام: یہ کتاب بدء الاسلام کا ترجمہ ہے اور اس کے ہر باب میں مولانا مرحوم کے اضافی نوٹ ہیں۔ یہ کتاب مطبع احمدی علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ (۳) عقائد اسلام — یہ شیخ العلماء طاہر بن صالح الجزائری کی عربی کتاب کا ترجمہ ہے اس میں بھی مولانا مرحوم نے اضافی مضامین شامل کیے ہیں یہ کتاب بھی مذکورہ مطبع سے شائع ہوئی تھی۔ (۴) درد نہانی یہ مولانا مرحوم کے عارفانہ کلام کا مجموعہ ہے اور اس کی تشریح بھی مولانا ہی کے قلم سے ہے۔ مولانا عبداللہ انصاری کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا اکبر الدین ابن نور الحسن کاندھلوی بھی دینیات کی تدریس سے وابستہ رہے۔ ابتدا میں عربی اور دینیات ایک ہی ساتھ پڑھائی جاتی تھی اور مولانا شبلی اصلاً عربی کے استاد تھے۔

کالج کا جو دستور ۲۰ دسمبر ۱۸۸۹ء کو منظور ہوا اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء تک ترمیم ہو کر شائع ہوا اس میں دینیات کی کمیٹی میں حسب ذیل علما کو شامل کیا گیا ۱۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سکریٹری ۲۔ حاجی محمد صالح خاں رئیس بھیکن پور (۳) محمد بدر الحسن کاندھلہ (۴) مولوی سید طفیل احمد منگلور (۵) مولوی محمد عبداللہ انصاری (ناظم دینیات) ۶۔ مولوی محمد امانت اللہ (۷) سید عبدالباقی (رجسٹرار) (۸) مولوی سید سلیمان اشرف (پروفیسر دینیات) ۹۔ مولوی رشید احمد (پروفیسر فارسی) ۱۰۔ حاجی محمد یونس خاں رئیس دتاؤلی۔ ۱۱۔ مولوی محمد عثمان صاحب (قاضی شہر علی گڑھ) ۱۲۔ مولوی محمد عبید اللہ (ناظم مدرسہ دائرۃ المعارف دہلی) ۱۳۔ مولوی سعید احمد فاروقی (علی گڑھ) ۱۴۔ شمس العلماء مولوی خلیل احمد صاحب (پروفیسر عربی) تھے

۱۹۲۰ء میں کالج نے یونیورسٹی کی شکل حاصل کی اور ۱۹۲۵ء میں یعنی مولانا ممدوح کی وفات کے بعد دینیات کا شعبہ دو حصّوں میں منقسم ہو گیا۔

۱۔ صدارت برائے عمومی تعلیم دینیات

۲۔ نظامت۔ برائے نگرانی مذہبی امور

صدر شعبہ کی ذمہ داری مولانا محمد سلیمان اشرف نے سنبھالی جب کہ ناظم دینیات کی حیثیت سے مولانا ابوبکر شیث جون پوری کا تقرر ہوا۔ مولانا شیث ایک کہنہ مشق، وسیع النظر اور جلیل القدر عالم دین تھے ان کا علم اور تقویٰ دونوں مثالی تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے مولانا کے سلسلہ میں بعض سبق آموز باتیں اپنی

یادوں میں لکھی ہیں۔ مولانا کی فیاضی، کسرِ نفسی، بے نیازی، اور تبحرِ علمی پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مولانا کی شرافتِ نفسی اور کشادہ دلی کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء میں ادہانگ کمیٹی کی رپورٹ کی بنا پر جہاں بہت سے اساتذہ ترقیوں سے ہٹائے گئے وہاں مولانا محمد سلیمان اشرف بھی ریڈر کے گریڈ سے لیکچرر کے گریڈ پر رکھ دیے گئے۔ اس زمانے میں مسٹر ہارن برو وائس چانسلر تھے۔ وہ مولانا ابوبکر شیث کو ریڈر اور صدر شعبہ بنانا چاہتے تھے مگر مولانا نے اصرار کے باوجود اس ترقی سے انکار کر دیا اور فرمایا "یہ زینہ مولانا سلیمان اشرف کا ہے، یونیورسٹی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔" مولانا ابوبکر نے اپنی ۱۵ سالہ مدت نظامت میں بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ دینیات کی لائبریری کی از سرِ نو ترتیب و تہذیب، جامع مسجد میں حوض کے علاوہ وضو خانہ کا انتظام، قبرستان میں مواقع سایہ دار درختوں اور دیگر سہولتوں کی فراہمی مولانا ہی کی خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے۔ مولانا کی علمی یادگار میں "موعظ نغز" کا تذکرہ ملتا ہے۔

مولانا سلیمان اشرف بھی ایک نامور عالمِ دین تھے۔ ان کا علمی وقار اور دینی جذبہ قابلِ تقلید تھا۔ ان کی قیام گاہ پر عصر کے بعد مجلس ہوتی جس میں بالعموم یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد اور اساتذہ شامل ہوتے تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی وائس چانسلر شپ کے زمانے میں انھوں نے دینیات کے نظام اور نصاب کے حوالے سے ایک نوٹ تیار کیا تھا جسے یونیورسٹی نے "السبیل" کے نام سے شائع کیا۔ مولانا نے النور اور المبین کے نام سے مزید دو کتابیں لکھی تھیں۔ علامہ اقبال جب ۱۹۲۹ء میں یونیورسٹی تشریف لائے تو مولانا سے ملاقات کے دوران ان کے رسالہ المبین کی خاص طور پر تعریف کی اور کہا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن کی طرف

میرا ذہن پہلے منتقل نہیں ہوا تھا۔ مولانا اپنی مجلسوں میں اور باہر بھی ہر کسی کو یہ حق نہیں دیتے تھے کہ وہ دینیات پر اظہارِ خیال کرے اور کوئی اپنی کسی حیثیت کا سہارا لے کر ایسا کرتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے تھے۔ مولانا یونیورسٹی کی جامع مسجد میں درسِ قرآن بھی دیتے جس میں اہلِ علم و فضل شریک ہوتے۔ مولانا کو یونیورسٹی کی عمومی اصلاح سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔

مولانا ابوبکر شیث کے بعد علی الترتیب مفتی محمد شفیع فرنگی محلی، مولانا وصی علی ملیح آبادی، مولانا مفتی محمد حفیظ اللہ، مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مقرر ہوئے۔ یہ حضرات اپنے وقت کے نمائندہ علما تھے۔ پھر ایک سال کے لیے یہ ذمہ داری ڈاکٹر حافظ عبدالحلیم خاں صاحب اور مولانا اسد اللہ صاحب نے سنبھالی اور ۱۹۸۰ء کو قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔

دوسری طرف مولانا محمد سلیمان اشرف کے بعد مولانا عبداللطیف رحمانی شاگرد استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ مولانا عبداللطیف صاحب اسلامیات کے نامور اسکالر تھے۔ حدیث و فقہ اور قرآن میں ان کو خصوصی درک حاصل تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبہ کی ذمہ داری قبول کرنے سے پہلے وہ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں بالترتیب مفتی و مدرس، صدر المدرسین اور صدر شعبہ کی حیثیت سے تعلیمی فرائض انجام دے چکے تھے۔ مولانا نے مکہ معظمہ کے علاوہ مصر و شام اور بیروت کا دورہ کر کے وہاں کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیا تھا، اس لیے آپ کے تعلیمی تجربات بھی پختہ تھے۔ اے ایم یو میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایم۔ فل کلاسیں آپ ہی نے شروع کی تھیں۔ شرح بخاری، شرح ترمذی، تذکرہ امام، تاریخ القرآن، صرف لطیف، نحو لطیف اور تکمیل الارشاد وغیرہ آپ کی علمی یادگار ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے آپ کی کتاب تاریخ القرآن کے بارے میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار

لکھا ہے: "محترم مصنف کو اسلامی علوم پر ایسا عبور حاصل ہے کہ عالم اسلام کے علمائے جدید بھی شاید نہ رکھتے ہوں۔"[11] ۱۹۴۴-۴۵ء میں دینیات کو فیکلٹی کی حیثیت ملی اور پہلے ڈین صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مقرر ہوئے جن کی خدمات اور علم دوستی پر ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔[12] ۱۹۶۰ء میں اس فیکلٹی کو ایک ایسا عالم دین میسر ہوا جو عصری اور ابدی دونوں علوم کا محرم راز تھا اور حلقۂ علم و ادب میں قدیم و جدید کا امتزاج سمجھا جاتا تھا، یعنی مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا تھا۔ متعدد کالج میں تدریسی فرائض انجام دیے اور ماہنامہ برہان کے تاحیات مدیر رہے۔ وہ ایک جید عالم ہونے کے ساتھ بالغ نظر محقق بھی تھے۔ فیکلٹی کو اُن کی آمد سے بڑا فائدہ پہنچا۔ فیکلٹی کو موجودہ عمارت ولایت منزل جو حبیب اللہ خاں مرحوم نے وقف کی تھی، مولانا نے ہی کرنل بشیر حسین زیدی صاحب سے حاصل کی اور سابق شیخ الجامعہ جناب سید ہاشم علی صاحب نے مزید دو کلاس روم کی تعمیر کی منظوری دے کر فیکلٹی کو وسعت دی ہے۔ مولانا اکبرآبادی نے پہلی مرتبہ اس شعبہ میں تحقیقاتی سرگرمیوں کا آغاز کیا جو دینیات فیکلٹی میں گویا ایک نئے باب کا آغاز تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے شعبہ سے ڈاکٹر حفیظ رضی اور ڈاکٹر رضوان اللہ مرحوم کو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ مولانا کا علمی کام اُن کی ایک درجن کے قریب کتابوں میں پنہاں ہے جن میں وحی الٰہی، فہم قرآن، الرق فی الاسلام، مسلمانوں کا عروج و زوال، ابوبکر صدیقؓ، عثمان ذی النورین، خطبات اقبال پر ایک نظر وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں مولانا صدر شعبہ اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں وفات پائی۔ اگر شعبہ مولانا مرحوم پر تحقیقی کام کرائے تو یہ حق شناسی کا اچھا اظہار ہوگا۔

۱۹۷۲ء میں قاضی مظہرالدین بلگرامی صدر شعبہ مقرر ہوئے قاضی صاحب مظاہر العلوم سہارنپور اور جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل تھے۔ آپ نے علوم القرآن، کنوز القرآن اور اسلامی کشکول نامی کتابیں لکھیں۔

قاضی صاحب کے بعد بالترتیب قاری محمد رضوان اللہ مرحوم، ڈاکٹر فضل الرحمن گنوری (گنوری صاحب بعد میں جامعۃ الامام محمد بن سعود الریاض میں حدیث و تفسیر کے پروفیسر مقرر ہوئے انھوں نے زمخشری کی تفسیر الکشاف کا تحلیلی مطالعہ اور تجارتی سود پر دو کتابیں لکھیں) مولانا تقی امینی (مولانا تقی امینی صاحب نے حدیث کا درایتی معیار، اسلام کا زرعی نظام، تہذیب کی تشکیل جدید، لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، فقہ کا تاریخی پس منظر، اجتہاد کا تاریخی پس منظر، حکمت القرآن اور احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت لکھیں) اور ڈاکٹر رؤف اقبال صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ یہ شخصیات ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی بھی رہیں۔

شعبہ کی علمی سرگرمیوں میں تدریس کے علاوہ توسیعی خطبات کا اہتمام بھی شامل رہا ہے۔ توسیعی خطبات کی شروعات سر یعقوب خاں کی تجویز سے ہوئی تھی اور علمائے کرام نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ مولانا مودودی کے پاس یونیورسٹی انتظامیہ نے جب یہ منصوبہ بھیجا تو انھوں نے اس کی پذیرائی کرتے ہوئے لکھا: "میں تو چاہتا ہوں کہ علی گڑھ کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام دنیائے اسلام کا دماغی مرکز بنا دیا جائے۔ آپ اکابر ہندوستان کے علاوہ مصر، شام، ایران، ترکی اور یورپ کے مسلمان فضلا کو بھی دعوت دیجیے کہ یہاں آکر اپنے خیالات، تجربات اور نتائج تحقیق سے ہمارے طلبا میں روشنی فکر اور روح حیات پیدا کریں۔ اس قسم کے خطبات کافی معاوضہ دے کر لکھوانے چاہییں تاکہ وہ کافی وقت، محنت اور غور و فکر کے ساتھ لکھے جائیں اور ان کی اشاعت نہ صرف یونیورسٹی کے طلبا کے لیے بلکہ عام تعلیم یافتہ پبلک کے لیے بھی مفید ہو۔"[13]

چنانچہ شعبۂ دینیات کی دعوت پر حسب ضرورت علمائے کرام

تشریف لاتے رہے اور اپنے مقالات وخطبات سے یونیورسٹی کی علمی تاریخ میں اضافہ کرتے رہے ان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید حامد علی، مولانا محمد تقی امینی، پروفیسر رفیع الدین، پروفیسر ستنگا سین سنگھ پروفیسر فضل الرحمٰن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۷۲ء سے شعبہ کی علمی سرگرمیوں کا ترجمان مجلہ علوم الدین (دراسات دینیہ) نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر بالترتیب مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی، محترم سید حامد صاحب (برمنائے دین) ڈاکٹر عبد العلیم خاں صاحب، پروفیسر کاظم نقوی اور راقم الحروف مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۵ء سے شعبہ میں علمی محاضرات Paper Reading کی نشستوں کا اہتمام کیا گیا جس میں شعبہ کے اساتذہ اور طلبا کے علاوہ دیگر شعبوں کے اساتذہ بھی شریک ہوئے ۱۹۸۲ء میں جناب سید حامد صاحب نے دینی درس گاہوں اور یونیورسٹی میں روابط کو فروغ دینے اور مضبوط کرنے کے لیے ایم۔اے کورس میں داخلے کے لیے مدارس عربیہ کی اسناد فضیلت کو منظور کیا۔ یہ شعبہ کی ایک اہم پیش رفت تھی۔ ۱۹۹۰ء میں باہتمام ناظم سنی دینیات قرآت پر ایک کل ہند سیمینار ہوا اور مقابلہ قرات کا اہتمام کیا گیا۔ سرسید کے عہد ہی سے یہاں قرات کی کلاسیں ہوتی رہیں اور یونیورسٹی قرات کا شوق دلانے کے لیے طلبا کو وظائف بھی دیتی رہی۔ چنانچہ قواعد وقوانین کے اسکالرشپ کے ذیل میں لکھا ہے۔ پانچ روپیہ ماہوار کے پانچ اسکالرشپ جو بارہ مہینے تک کالج کے طلبا کو دیے جائیں گے یہ وظائف ناظم دینیات صاحب کی سفارش پر سالانہ ملا کریں گے۔ ابتدا میں یہ اسکالرشپ سرفیاض علی خاں کے سی ایس آئی کے عطیہ برائے ترقی علم قرأت سے ملتے تھے۔ بعد میں لاؤش ممتاز بورڈنگ کے کمرے سالانہ چار سو اسی روپیہ سے دیے جاتے تھے۔

شعبۂ دینیات کی یونیورسٹی میں بڑی ضرورت اور اہمیت ہے اس کا اندازہ مولانا شبلی نعمانی کے نام سرسید مرحوم کے اس مکتوب سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے اس کام کو جلیل القدر، عظیم الشان اور کالج کی جان قرار دیا ہے یا علامہ حالی کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ بہت سی خامیوں کے باوجود جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل ہمیشہ اس کی سالانہ رپورٹ میں چھپتی ہے۔ ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود نہیں۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن U.G.C نے بھی اس شعبہ کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ چنانچہ کمیشن کی نمائندہ کمیٹی کے ۹ ممبران نے نومبر ۱۹۸۲ء کے آخری عشرہ میں یونیورسٹی کی زیارت کی اور اس کی رپورٹ کمیشن کو پیش کی اس میں دینیات کے بارے میں کہا گیا کہ "یونیورسٹی کی سماجی اور تعلیمی زندگی میں اس فیکلٹی کی بڑی اہمیت ہے"۔ یونیورسٹی میں دینیات کی قدر وقیمت کے اور بھی کچھ پہلو قابل ذکر ہیں ایک تو یہ کہ شعبہ یونیورسٹی اور ملت اسلامیہ کے درمیان رشتہ اتحاد اور نقطہ ارتباط ہے اور اسی لیے ہر دور میں یونیورسٹی کے ارباب انتظام یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ ملت کے نمائندہ علما یہاں آتے رہیں ان کے خطبات ہوں، بورڈ آف اسٹڈیز اور بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز میں ان کی نمائندگی ہو یہاں کی انتظامی ذمہ داری بھی سنبھالیں دوسرے یہ کہ دینیات کے تحت نظامت کا شعبہ بعض پہلوؤں سے گراں قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں مساجد و مقابر کی نگرانی اور انتظام بھی شامل ہے۔ مسجدیں مسلمانوں کی تربیت گاہ ہیں اور اسلامی معاشرے میں ان کو مرکزِ اعصاب Nerve Centre کا درجہ حاصل ہے۔ اس لحاظ سے اس شعبہ کا یونیورسٹی کے طلباء، اساتذہ اور ملازمین سے ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ پھر یہ کہ کیمپس میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے اور دینی ماحول کو سازگار بنانے میں اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ دینی سرگرمیوں میں مذہبی تقریبات

کے علاوہ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل میں قرآن و سنت کی رہنمائی کے لیے شعبہ سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اس لیے طلبا، اساتذہ اور عوام کی مرجعیت بھی اسے حاصل ہے۔ گویا یہ محض ایک شعبہ نہیں بلکہ دینی تعلیم اور مذہبی سرگرمیوں کا ایک ایسا مرکز ہے جو یونیورسٹی کے جملہ شعبوں سے کسی نہ کسی درجے میں مربوط ہے۔

دینیات یونیورسٹی کا قدیم ترین شعبہ بلکہ فیکلٹی ہے اور سرسید مرحوم کے زمانے ہی سے ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے دینیات پڑھائی جاتی رہی ہے اور دیگر مضامین کے ساتھ اس کا مساوی اعتبار بھی کیا گیا ہے۔ اے۔ ایم۔ او کالج کے دستور میں یہ صراحت دفعہ نمبر ۱۰ کے تحت موجود ہے کہ کل مسلمان بورڈروں کو پنجگانہ نماز کا ادا کرنا اور رمضان میں بجز حالت عذر معقول کے روزوں کا رکھنا اور جن بورڈروں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام ہوا ہو ان کو مقررہ گھنٹوں میں قرآن مجید پڑھنا لازم ہوگا۔ گویا یہ دینیات کی عمومی تعلیم کے علاوہ فرائض مذہبی میں شامل تھا۔ ۱۹۵۲ء سے دینیات اگرچہ لازمی مضمون کی حیثیت باقی رکھی گئی لیکن اس کے نمبرات محسوب نہ کیے گئے۔ عام احساس یہ ہے کہ اس سے دینیات کی افادیت محدود اور متاثر ہوئی اور اب صورت حال یہ ہے کہ یہ لازمی مضمون بھی اختیاری ہو گیا ہے۔ اولاً تو یہ پیشہ ورانہ تعلیم کے طلبا کے لیے لازمی نہیں ہے اور دوسرے طلبا کو بھی اختیار ہے کہ وہ ہسٹری آف ماڈرن سائنس، فلاسفی اور دینیات میں جس کو چاہیں منتخب کرلیں دینیات کو نظرانداز کر دینے کی وجہ سے طلبا میں حاضری کا بھی کوئی حتمی لحاظ نہیں پایا جاتا تھا لیکن سابق شیخ الجامعہ جناب سید ہاشم علی صاحب نے اس طرف توجہ دی اور دینیات کی کی حاضری طلبا کے لیے لازمی قرار دی۔ یہ ایک خوش آیند اقدام ہے اور اس سے طلبا میں دینی علوم حاصل کرنے کا رجحان بڑھا ہے۔ اب یہ ہم جیسے اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ اس رجحان کو آگے بڑھانے اور ان سے دینی علوم کی اشاعت میں مہمیز حاصل کرنے میں دلچسپی کے ساتھ اقدام کریں۔

اس وقت مغرب کی مادہ پرستانہ اصطلاحیات سے معرا تعلیم کا جو دور دورہ ہے اس نے نئی نسل کو اپنے مذہبی ورثہ اور ثقافتی سرمایہ سے محروم کر دیا ہے، جو نسل اپنی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے سرمایہ سے غافل ہو جائے وہ اپنی مذہبی زندگی کو تباہی سے نہیں بچا سکتی اس لیے وقت کا شدید تقاضا ہے کہ ہر کورس کے طلبا کے لیے دینیات کی تعلیم نہ صرف لازم بایں معنی قرار دی جائے کہ اس کے نمبرات بھی محسوب ہوں بلکہ نصاب کی ترتیب اس طرح کی جائے کہ وہ اپنے دامن میں اسلامی کلچر اور ماڈرن سائنس کو سمیٹ لے۔ پھر جس طرح اسلامی روایات کے مطابق مسلم گھرانہ میں پیدا ہونے والے ہر بچہ کے کان میں اللہ اور اس کے رسول کا کلمہ ڈالا جاتا ہے تاکہ اس کا لاشعور اس کو قبول کر کے شعور میں منتقل کر دے اور اس کی زندگی ایک مسلمان کی زندگی بنے اسی طرح اس یونیورسٹی میں داخل ہونے والے ہر مسلم طالب علم کو اسلام کے اصول و مبادی سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اپنے کورس میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ایک اچھا انسان اور عمدہ مسلمان بن کر نکلے اور غیر مسلم طالب علم کو کم از کم اتنا موقع دیا جائے کہ وہ اسلامی تعلیم کو قریب سے سمجھنے کی کوشش کرے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی کتاب "قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے" میں ایک عبرت آموز واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ علی گڑھ کالج کے تین طالب علم جو پکے دوست تھے اتفاق سے سنٹرل انڈیا کے مشن کالج میں تعلیم حاصل کرنے گئے۔ جب امتحان کا زمانہ قریب آیا تو روزانہ کے اسباق بند ہو گئے تاکہ طالب علم پوری طرح تیاری کر لیں لیکن بائبل کلاس روزانہ جاری رہی۔ خود پرنسپل صاحب بائبل پڑھاتے تھے ایک دن یہ تینوں

پرنسپل صاحب کے پاس گئے اور بولے اب امتحان بہت قریب آگیا ہے۔ دوسرے تمام گھنٹوں میں سبق نہیں ہوتا صرف بائبل کی کلاس کی وجہ سے ہمیں کالج آنا پڑتا ہے برائے مہربانی اسے بھی ملتوی کر دیجیے تاکہ پوری طرح امتحان کے لیے تیاری کریں۔ یہ سن کر پرنسپل صاحب نے جواب دیا۔ یہ تمام عمارتیں تم سب طالب علم اور تمام پروفیسر فقط اسی گھنٹہ کی بدولت یہاں موجود ہیں اگر یہ گھنٹہ نہ ہو تو یہ کالج نہ ہوتا"[۵۴]

میرے خیال میں اس اقتباس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بائبل جس کا کوئی استناد نہیں اور جو بار بار تحریف و ترمیم کے حادثات سے دوچار رہی جب اس کی تعلیم بلا لحاظ عیسائی و غیر عیسائی تمام طلبا کے لیے لازم کی جاسکتی ہے تو کیا اللہ کا آخری پیغام یعنی قرآن اس لائق بھی نہیں کہ اسے ان مسلم طلبا کے لیے لازم کیا جائے جو بنیادی طور پر اس کو مانتے ہیں اور اس کو اپنی زندگی کی اساس قرار دیتے ہیں۔ یونیورسٹی کے ہر بونا فائیڈ طالب علم پر قرآنی تعلیمات کو جبراً ٹھونسنا یقیناً دانشمندی نہیں لیکن اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم طلبا کو ان کے مذہبی اور تہذیبی سرمایہ سے واقف کرنا اور مقصد زندگی کا شعور پیدا کرنا از حد ضروری ہے۔ ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے ہوتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اگر کوئی افادیت، اہمیت اور انفرادیت ہوسکتی ہے تو صرف یہی ہے کہ اس کی ضمانت اس کے دستور کی دفعہ C-2-5 میں دی گئی ہے جس کی بدقسمتی سے ہمارے احباب عجیب و غریب تعبیر کرتے ہیں۔

ماضی میں ایسی کوششیں ہوتی رہی ہیں کہ ہر ممکن طریقے سے یونیورسٹی کے ماحول کو اسلامی رنگ دیا جائے اور نصاب تعلیم پر اسلامی نقطہ نظر سے نظر ثانی کی جائے۔ چنانچہ یونیورسٹی کورٹ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۶۳ء میں دینیات کے ناقص طرز تعلیم کی اصلاح اور یونیورسٹی کے طلبا میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور یہ اعلان کیا کہ "مسلم یونیورسٹی کے مقاصد اولیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طلبا میں اسلامی سیرت پیدا کرسکے"[۵۵] پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے سلسلے میں کورٹ نے سات اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ "وہ تمام صورت حال کا جائزہ لے اور دینیات و علوم اسلامیہ کی تعلیم کے لیے ایسے جدید اور ترقی یافتہ ذرائع اختیار کرنے کی سفارش کرے جو ضروریات زمانہ سے مناسبت رکھتے ہوں اور جن سے اسلامی تعلیمات کو زیادہ اطمینان بخش طریقہ پر پیش کیا جاسکے"[۵۶] کمیٹی نے صورت حال کا جائزہ لے کر ایک سوال نامہ مرتب کیا اور اس وقت کے نامور علما کی خدمت میں ارسال کیا۔ اس کے جواب میں جو تجاویز موصول ہوئیں افسوس ہے کہ ان میں سے بیشتر سرد خانہ کی نذر ہوگئیں اور شعبہ علوم دینیہ کی قسمت میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہ ہوسکی اور اب معاملہ یہ ہے کہ کل ہم جہاں کھڑے تھے آج بھی وہیں ہیں بلکہ کچھ اور پیچھے آگئے ہیں اور یونیورسٹی کے تعلیمی سفر میں ہم غبار کارواں بنے یا بنا دیے گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ شعبہ یا تو یونیورسٹی کا ایک ضمیمہ ہے یا آثار باقیہ ہے جو متبرک ہے مگر یکساں متحرک نہیں اور یہ نقصان اس شعبہ یا فیکلٹی کا نہیں بلکہ پوری یونیورسٹی کا ہے۔ اب پھر نئے تعمیری جذبہ اور عزم عمل کی ضرورت ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ دینی اور معاشی تحفظات سے پاک اور صرف اخلاص اور اشاعت حق کے احساس کے ساتھ ہو۔ شعبہ میں ایسے اساتذہ بلائے جائیں جو جدید نافع اور قدیم صالح کا حسین امتزاج ہوں سرسید نے کہا تھا

جب کہ میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے

کا حامی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کا اصلی نورانی چہرہ لوگوں کو دکھلاؤں، میرا کانشنس مجھ سے کہتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں تو خدا کے سامنے گناہگار رہوں گا۔[۲۱]

میں سمجھتا ہوں کہ شعبۂ دینیات کے لیے سرسید کا یہ طرز فکر مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔

حوالے

۱۔ حالی، الطاف حسین۔ حیات جاوید۔ ص ۲۱۲

۲۔ ایضاً ص ۲۱۳

۳۔ ضمیمہ تذکرہ محسن ص ۱۱ - ۱۰

۴۔ شمس تبریز خاں۔ صدر یار جنگ ص ۱۷۶

۵۔ ایضاً

۶۔ قواعد و قوانین ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء ص ۵۷

۷۔ مجلہ علوم الدین، اے ایم یو ۱۹۷۲ء

۸۔ صدیقی، رشید احمد۔ گنج ہائے گراں مایہ

۹۔ ایضاً ص ۳۸

۱۰۔ روزنامہ جنگ۔ لاہور ۲ اگست ۱۹۶۲ء

۱۱۔ تاریخ القرآن، پیش لفظ از ابوالحسن زید فاروقی

۱۲۔ ملاحظہ ہو صدر یار جنگ مؤلفہ شمس تبریز خاں

۱۳۔ مودودی، ابوالاعلیٰ۔ تعلیمات ص ۴۱

۱۴۔ قواعد و قوانین ٹرسٹیان ص ۹۷

۱۵۔ حالی، الطاف حسین۔ حیات جاوید ص ۲۴۸

۱۶۔ قواعد و قوانین ٹرسٹیان۔ ص ۴۳

۱۷۔ قرآن پاک کا املا کیسے کیا جائے ص ۱۰۹

۱۸۔ تعلیمات ص ۱۱

۱۹۔ ایضاً ص ۱۱

۲۰۔ حیات جاوید ص ۲۱

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۰، شمارہ ۴ (اپریل ۹۱)

علی گڑھ تحریک کا اثر حالی کی تنقید پر

شاہدہ بیگم ♡

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد ہندوستانی مسلمان تقریباً ڈیڑھ سو سال تک تذبذب وسوسہ اور تشکیک کی وادیوں میں سرگرداں رہے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کی تباہ کاریوں نے انھیں انگریزی حکومت اور فرنگی زبان و کلچر سے اس حد تک بدظن کر دیا کہ وہ مغربی علوم و فنون سے بھی بیزار ہونے لگے۔ اس عالم یاس میں مرد مجاہد سرسید نے اپنی بے مثل قیادت سے افسردہ قوم کے اندر زندگی کی نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں کا اعتماد بحال کیا بلکہ انگریزوں سے مفاہمت کر کے ان کی ترقی کے راستے بھی ہموار کیے۔ سرسید کی تحریک ہمہ گیر اور جامع تحریک تھی جس کے اثرات دور رس ثابت ہوئے۔ اس تحریک کے ذریعے زندہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے چند فرسودہ روایات سے بغاوت بھی کی گئی اور زمانہ کے نئے تقاضوں کے پیش نظر ادب اور معاشرے میں اخلاقی اور افادی پہلوؤں پر بھی زور دیا گیا۔ سرسید کے ادبی رفیقوں میں حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں مقصدی اور اصلاحی ادب کی ترویج و اشاعت میں زبردست کارنامے انجام دیے مگر حالی نے اپنی شاعری اور تنقید کے ذریعے اک نئی کلاسکیت کی بنیاد ڈالی جس کی اہم خصوصیات افادیت، اخلاقیت، اعتدال و توازن اور معروضیت ہیں۔ زیر نظر مضمون میں حالی کی تنقید پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی مخصوص تنقیدی بصیرت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حالی سے قبل ادبی جائزے اکثر و بیشتر تبصروں و تذکروں کی شکل میں ہوتے تھے اور ان میں تنقیدی بصیرت سے زیادہ سوانحی حالات اور ذاتی تاثرات نمایاں تھے۔ ان کا اسلوب بیان رنگین، شاعرانہ اور پُرتکلف ہوتا تھا اور اکثر اوقات لفاظی اور عبارت آرائی میں مطلب کی بات گم ہو کر رہ جاتی تھی۔ میر تقی میر کے "نکات الشعرا" سے لے کر لالہ سری رام کے "خم خانۂ جاوید" تک ہماری تنقیدی کائنات یہی تھی۔ اگرچہ محمد حسین آزاد "آب حیات" میں کہیں کہیں جدید انداز تنقید اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن جدید اصول تنقید سے ناواقفیت اور ذاتی مزاج و انشائی میلان کی بنا پر وہ تنقید کا حق ادا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لحاظ سے ہم بجا طور پر حالی کو جدید اردو تنقید کا بانی کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے مشرق و مغرب کے تنقیدی اصول کو مدنظر رکھ کر اردو

♡ حسن منزل، امیر نشاں، علی گڑھ

شاعری کے نظریات اور اس کے مختلف اصول و اسالیب مرتب کیے۔ اپنی ابتدائی تصانیف "حیات سعدی" اور "یادگار غالب" اردو کے مایۂ ناز شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کے حالاتِ زندگی اور شعری اکتسابات پر پہلا جامع اور بے لاگ محاکمہ ہے۔ اس کتاب کے تنقیدی حصے میں حالی نے مرزا کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے بقول، مرزا کی شاعری اکتسابی نہیں بلکہ فطری تھی اور انھوں نے طبیعت کی جودت اور فطری مناسبت سے شعر گوئی میں امتیاز حاصل کیا۔ حالی مرزا کے کلام کی جمالیاتی یا نفسیاتی تحلیل تو نہیں کر سکے لیکن انھوں نے ان کی شعری خصوصیات اور سحر نگاری کا والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ "جدتِ مضامین اور طرفگیٔ خیالات" کے علاوہ مرزا کی ندرت، اختراع و استعارہ و کنایہ اور متین ظرافت کے بڑے مداح ہیں۔ حالی غالباً پہلے نقاد ہیں جنھوں نے غالب کے پہلو دار اشعار کی طرف توجہ دلائی۔ مرزا کے یہاں جو تہ بہ تہ گہرائیاں اور "گنجینۂ معنی کا طلسم" ملتا ہے وہ واقعی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ "یادگارِ غالب" کے خاتمہ پر حالی نے ایک نہایت اہم تنقیدی مسئلہ سے بحث کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اپنے ادب میں نئے عناصر کو شامل کرنا امرِ مستحسن ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قدما کے فنی اور اپنے شعری روایات سے واقفیت بھی ہو۔ "جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کون سی بات اخذ کرنی چاہیے اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصل ترقی سے محروم رہے گا۔" حالی جو خود انگریزی زبان و ادب کے اتنے بڑے پرستار تھے اس بات کو بھول نہیں سکے کہ ہم اپنی بنیاد اور روایت سے بے نیاز ہو کر کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

"مقدمۂ شعر و شاعری" نہ صرف حالی کی تمام تصانیف میں منفرد و یکتا ہے بلکہ بیسویں صدی کی اردو تنقید میں اسے بنیادی ستون کی حیثیت حاصل ہے۔ حالی کے ذہن میں فنِ شعر سے متعلق جو نظریات و خیالات ایک عرصے سے تشکیل پا رہے تھے، منظم اور مربوط طور پر "مقدمہ" میں ظاہر ہوئے۔ "مقدمہ" ہمارے نزدیک اردو شاعری کا بوطیقا (POETICS) ہے۔ جس طرح ارسطو نے اپنے عہد کے مروجہ اصناف یعنی المیہ، رزمیہ اور غنائیہ پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے ہر صنف کی بنیادی خصوصیات اور اُن کی ماہیت سے بحث کی اور علمِ شاعری کے اصول مرتب کیے اسی طرح حالی نے اردو شاعری کی مروجہ اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی سے نہ صرف سیر حاصل بحث کی بلکہ ان کی اساسی خصوصیات اور سماجی اہمیت سے بھی ہمیں آگاہ کیا۔ حالی کے بقول اردو شاعری نہ صرف قدما اور متوسطین کے بعد رو بہ زوال تھی بلکہ اس میں ترقی کے امکانات ختم ہوتے جا رہے تھے اور لوگ غزل کی ظاہری دلکشی پر سر دھنتے تھے۔ اگر غالب جیسا کوئی شاعر اپنی ذہانت اور طباعی کا مظاہرہ کرتا بھی تھا تو روایتی شکنجے کی وجہ سے جدت وہاں بھی مفقود ہو جاتی تھی۔ اس لیے حالی نے بیباکانہ جرأت کے ساتھ مردہ ماضی اور غلط روایت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی۔

حالی "مقدمہ" میں شاعری کی اخلاقی قدروں کے بڑے حامی نظر آتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن و ادراک کے ذریعے سے اخلاق پر ہوتا ہے۔ پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاقِ فاضلہ کا اکتساب کر سکتی ہے۔ حالی کو شاعری کی وسعتوں اور خوبیوں کا احساس ہے۔ وہ محض روایتی اور تقلیدی شاعری اور اس کی بندشوں کے مخالف ہیں۔ ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ شاعری کو حقیقت اور واقعیت سے قریب لا کر اسے فطرت کی ترجمانی کا آلہ بنایا جائے۔ اسی لیے مبالغہ و اغراق، تخیل کی بے راہ روی اور ذہن کی بدعنوانی انھیں کبھی

گوارا نہیں۔ معنوی حیثیت سے قطع نظر وہ اردو شاعری میں شعر کو قافیہ اور ردیف کی زنجیروں سے بھی آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال بالکل صحیح ہے کہ شعر و نظم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ شعر ایک کیفیت، ایک احساس اور ایک تاثر کا لفظی پیکر ہے مگر نظم (VERSE) چند بے جان روایات کی پیروی بھی ہو سکتی ہے۔

"شعر کی ماہیت" اور شعری لوازمات پر اظہار خیال کے بعد حالی اپنے "مقدمہ" میں عمدہ شاعری اور اس کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے نیچرل شاعری کا معیار قائم کرتے ہیں۔ کچھ تو مغربی شاعری کے ساتھ عقیدت اور کچھ مشرقی روایتی شاعری سے بیزاری کے باعث انھوں نے قدیم معیار شعری سے انحراف کیا۔ ان کا خیال تھا کہ دیگر اصناف سخن کی طرح غزل بُری طرح روایات کے شکنجے میں گرفتار ہے اور زمانہ کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ چونکہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اردو زبان و ادب کو قومی و معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے لہٰذا حالی نے اردو شاعری کو عموماً اور غزل کو خصوصاً نئی نہج پر ڈالنے کی کوشش کی۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں انھوں نے مشرقی و مغربی شعری نظریات اور زمانۂ حال کے تقاضوں کے پیش نظر نیچرل شاعری کا جو نظریہ پیش کیا وہ بہت حد تک معاشرتی زندگی میں افراد کے ذہنی، جذباتی اور روحانی پہلوؤں پر محیط ہے۔ حالی جمالیاتی قدروں کے قائل ہیں لیکن نحافتی اور عریاں نگاری سے متنفر ہیں۔ وہ قدما کے کمالات کے معترف ہیں لیکن اس کی آڑ میں رسم پرستی، روایت پسندی اور فرسودہ شعری نظام کو پسند نہیں کرتے۔ اردو شاعری کے اہم اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی پر مفصل بحث کے دوران انھوں نے اس امر کی تلقین کی ہے کہ کسی بھی زندہ زبان کے لیے ایسے ادب کی تخلیق ضروری ہے جس سے مسرت و بصیرت کا سامان بھی یکجا نہ ہو بلکہ نئے زمانے اور روح عصر کی عکاسی بھی ہو سکے۔

حالی کو اس امر کا شدت سے احساس ہے کہ غزل کی شاعری اب رو بہ زوال ہے اور وہ محض ایک "بے سود اور دراز کار صنف" معلوم ہوتی ہے لیکن اس صنف کی مقبولیت کے پیش نظر اس کی اصلاح بھی ضروری ہے:

> "غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اس قدر دشوار بھی ہے۔ غزل میں جو عالم دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے جو کان پٹے ٹھمری سے مانوس ہو جاتے ہیں وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی۔ بوالہوسی اور سکا جوئی کی باتوں میں جو مزا ہے وہ خالص عشق و محبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ . . . جن مذاقوں پر ہزل و مطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سرمہ کاجل، کنگھی، چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں لیکن زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہو گی یا عمارت خود نہ رہے گی۔"

حالی اپنے تجربے، مشاہدے اور صنف غزل سے اپنے معاصرین کے جذباتی لگاؤ سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ اگرچہ وہ غزل کی قدر و قیمت کے معترف ہیں لیکن انھیں اس بات کا قلق ہے کہ یہ صنف اپنا اصلی رنگ کھو چکی ہے اور اس پر تصنع اور بوالہوسی کی چھاپ نمایاں ہے۔ وہ غزل پر بیجا تنقید یا غزل گویوں کی خردہ گیری

کے بجائے اس صنف سخن کی اصلاح کے لیے چند مشورے پیش کرتے ہیں جو ہمارے لیے کئی اعتبار سے اہم ہیں۔ اول یہ کہ حالی نے غزل کی تنقید اور اصلاح کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں خلوص و دردمندی ہے۔ دوم یہ کہ وہ اردو غزل میں انگریزی نظم کی خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے اور اس طرح وہ اردو کا دامن ایسے پھولوں سے بھرنا چاہتے تھے جو نئی مٹی اور نئی آب و ہوا کی پیداوار ہوں اور جن میں باسی پھولوں کی بُو یا کملاہٹ کا احساس نہ ہو۔ حالی غزل کی نزاکت و لطافت کے پیش نظر اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ عشقیہ مضامین غزل سے یکسر خارج کر دیے جائیں البتہ وہ اظہار کی شائستگی اور رمزیت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ بے حیائی اور لچّائی اُن کے نزدیک کسی طور پر اعلیٰ شاعری کی ضمانت نہیں۔

"مقدمہ" میں حالی غزل کے بنیادی تصورات و مشمولات سے اتنے بیزار نہیں جتنا کم مایہ شاعروں کے ہاتھوں اس صنف سخن کی درگت سے۔ وہ کلاسیکی اعتدال کے قائل تھے۔ لہٰذا جب انھوں نے غزل میں عشق و تعشق، ہوس جوئی، امرد پرستی اور شاہد بازی کا میلان غالب دیکھا تو اس رجحان کے خلاف آواز اُٹھانا اپنا ادبی فرض سمجھا۔ انھیں اس کا بخوبی اعتراف ہے کہ اس صنف سخن کو میر اور غالب جیسے عظیم شاعروں نے اپنایا کیوں کہ اس میں ترقی کے بے حد امکانات ہیں لیکن دوسری طرف جب اُن کی نظر دوم درجے کے شاعروں اور درباری بھانڈوں یا بازاری تک بندوں پر پڑی تو وہ اندیشہ ہائے دور دراز سے تلملا اُٹھے کہ مبادا غزل پر یہی عناصر نہ حاوی ہو جائیں۔

غزل کے سلسلے میں حالی نے زبان کا مسئلہ بھی اُٹھایا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جس طرح غزل کے مضامین محدود ہیں اُسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔ بمقابلہ دوسرے اصناف کے غزل کے لیے صاف اور سادہ زبان ضروری ہے۔ غریب اور اجنبی یا ثقیل و غیر مانوس الفاظ کی کھپت یہاں ممکن نہیں۔ حالی کو اردو غزل کی نزاکت کے پیش نظر یہ احساس ہے کہ "گلاب کے تختے میں کانٹے بھی پھولوں کے ساتھ نمو پاتے ہیں مگر گلدستہ میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے۔" اردو میں ولی سے لے کر استاد مصحفی تک عموماً سب کی غزل میں صفائی، سادگی، روزمرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لپک پائی جاتی ہے۔ غالب، مومن، شیفتہ وغیرہ کے یہاں فارسی ترکیبوں کے باوجود اردو محاورہ اور زبان کی سلاست کا خیال رکھا جاتا ہے۔ حالی کا خیال ہے کہ لکھنؤ اِسکول کے شاعروں نے اصلاح زبان کے زعم میں غزل کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس مدرسہ کے زیر اثر ہندی الفاظ رفتہ رفتہ متروک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے۔

حالی مدرسۂ سرسید کے ایک روشن خیال اور ذہین رکن تھے۔ انھوں نے سرسید کی علی گڑھ تحریک کی نہ صرف نظری حمایت کی بلکہ اس تحریک کی روح کو اردو کے اندر جذب کرنے کی پُرخلوص کوشش بھی کی۔ وہ بھی مصلح اعظم سرسید کی طرح اردو ادب کو زندگی کے دوش بدوش لانا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے نیچرل شاعری کے ساتھ سائنٹفک تنقید کی طرف بھی قدم بڑھایا۔ انگریزی یا غیر ملکی ادب کا مطالعہ کچھ اور ہے اور اردو، فارسی و عربی کے ساتھ جدید ادب کی پرکھ کچھ اور۔ حالی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور آج تک کوئی نقاد اصولی یا عملی تنقید میں اُن سے آگے نہیں جا سکا۔ بلاشبہ وہ جدید اردو تنقید کے بانی اور اردو شاعری بالخصوص غزل کے بالغ نظر نقاد ہیں۔ حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" آج بھی اردو تنقید کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

علوم ریاضی، جبر و مقابلہ، ہیئت اور طبیعیات میں

مسلمان فضلا کی خدمات

محمد اسلم صدیقی ○

اِن جملہ علوم وفنون میں مسلمان فضلا نے جو کارنامے اور خدمات انجام دی ہیں ان کی مکمل روئداد اور تفصیل کی گنجائش اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم بطور تعارف اُن کی چند خدمات پیش کی جاتی ہیں۔

ریاضی

اس فن کو محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے ایک منظم و مربوط اور واضح علمی حیثیت دی۔ چنانچہ خوارزمی نے دوسرے درجے کی مساوات کو سائنٹفک انداز میں حل کیا۔ عمر خیام جو ادبی دنیا میں بحیثیت ایک شاعر اور خمریات کا باغی نگار معروف اور مشہور ہے، وہ بہت بڑا ریاضی داں بھی تھا۔ اس نے مخروطات کی مدد سے تیسرے درجے کی مساوات کو حل کیا اور کہا جاتا ہے کہ ابوالوفا نے چوتھے درجے کی مساوات کو حل کیا تھا۔

وراثت کے مسائل میں فن ریاضی اور جبر و مقابلہ کی جو اہمیت ہے۔ اس کے پیش نظر بھی مسلمان فضلا نے اِس فن میں بڑی دلچسپی لی اور دقت نظری سے کام لیا اور بہت ترقی دی اگرچہ وراثت کا مسئلہ مذہبی اور دینی اہمیت کا حامل ہے لیکن فن تعمیر و نجوم وصیت میں بھی ریاضی میں مہارت کے بغیر چارہ نہیں۔ اس ضرورت کی بنا پر بھی مسلمانوں نے اس میں بڑی غوّاصی کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور مقولہ ہے:

> "تم کھیلو تو تیراندازی کی ذریعہ نشانہ بازی کی مشق کرو اور جب آپس میں گفتگو کرو تو فرائض یعنی متوفیوں کے ورثا کے حصوں کے تعین کے بارے میں گفتگو کیا کرو۔"

یعنی اس فریضہ کو حسن و خوبی انجام دینے کے لیے فن ریاضی میں تبحر حاصل کرو تاکہ ترکہ کی تقسیم صحیح ہو اور کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ تاریخ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ فضلائے اسلام نے حضرت عمرؓ کے اس عاقلانہ قول پر کس خلوص اور جانفشانی سے عمل کیا۔

جبر و مقابلہ

خوارزمی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کی کتاب "المختصر فی الحساب الجبر والمقابلہ"۔ ثابت بن قرہ کی کتاب "قول فی تصحیح مسائل الجبر بالبراھین الھندسیۃ"۔ ابوکامل کی کتاب "کتاب الطرائف فی الحساب"۔ غیاث الدین الکاشی کی کتاب "مفتاح الحساب"۔ ابوالوفا کی کتاب "ما یحتاج الیہ الکتاب والعمال"۔ شیخ بہاء الدین عاملی کی "خلاصۃ الحساب"۔ پھر استاد احمد معمار کے خاندان

○ غازی پور لاج۔ سرسید نگر۔ علی گڑھ۔ یو۔پی

بالخصوص عطاء اللہ رشدی، لطف اللہ مہندس، امام الدین ریاضی، خیر اللہ مہندس، میر فتح اللہ شیرازی کے حسابی کارنامے اور ان سے قدیم نجر بلی، جو صلب دانی میں مہارت و ملکہ کی بنا پر "حاسب" کہلاتا تھا اور الزرقادی جو نہ صرف ریاضی داں تھا بلکہ دیگر علوم و فنون میں بھی مہارت تامہ رکھتا تھا۔ ان لوگوں میں ان سب فضلا کے کارناموں اور خدمات سے تاریخ بھری ہوئی ہے اور مظلوم ابن الہیثم کے کارنامے بھی زریں حروف میں رقم ہونے کے لائق ہیں۔

اقلیدس

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں عراق کا زرخیز علاقہ فتح ہوا جس کو انھوں نے مقررہ خراج کے عوض مفتوحین ہی کے پاس چھوڑ دیا لیکن تشخیص خراج کے واسطے زمین کی پیمائش ضروری تھی جو آپ کے حکم سے کرائی گئی اور اسی مساحت یعنی پیمائش زمین نے مسلمانوں میں اقلیدس کے اصول الہندسہ سے واقفیت اور اس کے حصول کی ضرورت اور شوق پیدا کیا۔ خلیفہ منصور عباسی کی فرمائش پر شاہ روم نے کتابوں کا جو ذخیرہ بھیجا تھا، ان میں اقلیدس کی اصول الہندسہ بھی تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں، پھر اس کے لائق اور علوم و فنون کے شیدائی اور سرپرست فرزند المامون کے عہد میں حجاج بن یوسف بن مطر نے اس کتاب کا باضابطہ عربی میں ترجمہ کیا۔ المامون کے اس شوق و سرپرستی نے اس علمی ذوق و تحریک کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا اور یونانی علوم و حکمت کے جواہر پارے، اونٹوں پر لد لد کر دار الخلافہ بغداد میں آنے لگے اور بقول حالی

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے روم و یوناں کے دفتر

یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ فضلائے اسلام نے یونانیوں کے علوم و حکمت کی کتابوں کے صرف ترجموں کو اپنا منتہائے مقصود قرار دیا تھا ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی کاوش و فکر او تجسس سے خود مختلف علوم و فنون میں مستقل تحقیقات کیں جہاں ان کے پیشروؤں کا ذہن و علم نہیں پہنچ پایا اور مسائل کو لاینحل چھوڑا وہاں فضلائے اسلام نے سعی و تفتیش کر کے ان کو کامیابی کی حد تک پہنچایا۔ چنانچہ اقلیدس کے متوازی خطوط کے مصادرہ کا بدل، جس کی رو سے 'ایک دوسرے کو قطع کرنے والے دو خطوط مستقیم ایک ہی خط مستقیم کے متوازن نہیں ہو سکتے۔' یہ اصول ابن الہیثم کا انکشاف ہے ملاحظہ ہو رسائل طوسی جلد دوم لیکن حیرت اور ستم ہے کہ ابن الہیثم کے اس انکشاف کو برطانوی ریاضی داں پلے فیر نے اپنے نام سے منسوب کر کے شہرت دے دی اور "پلے فیر کے علوم متعارفہ" کے نام سے دنیا میں شہرت پائی لیکن اصل حقیقت کھل گئی۔ خلیفہ المامون نے خوارزمی مشہور مہندس سے اس فن میں ایک عام فہم کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی چونکہ اس فن کی پوری تشریح کے لیے اصطلاحات علمیہ کی وضاحت کرنی ہوگی جو ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس لیے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف چند اہم مسائل بطور تعارف بیان کیے جاتے ہیں۔ مثلاً علم مثلث کے حسابات میں بجائے جیب و قطر کے مماسہ کا استعمال کرنا، علم مخروطات کی عمیق تحقیق، علم مثلث کروی میں مثلثات حل کرنے کی چند ایسی شکلیں بنا دیں جن سے یہ علم بالکل تبدیل ہو کر آسان ہو گیا اور یہ اشکال اس وقت مستعمل ہیں۔ علم مثلث میں مماسہ کا داخل کرنا ایک اضافہ اور بہت گراں قدر ترقی تھی۔ چنانچہ موسیو شاسیل اپنی "تاریخ اقلیدس" میں رقم طراز ہیں کہ:

"اس عمدہ طریقے کے جاری ہونے سے وہ مشکل اور پیچیدہ اشکال، جن میں زاویہ نامعلوم کے جیب اور سہم ہوا کرتے تھے، متروک ہو گئیں اور ہم میں یہ طریقہ پانچ صدیوں بعد جاری ہوا۔ اس کا موجد جان ملر سمجھا جاتا ہے (جو صحیح نہیں

ہے) اور اس سے سو برس قبل کوپرنیکس بھی اس طریقے سے واقف نہیں تھا۔"

علم ہندسہ میں مثلثات کا مستقل علم قرار دینے والا ابو عبداللہ محمد بن جابر البتانی (م ۹۲۹ء) ہے۔

ہیئت:

یہ فن بھی منجملہ ان فنون کے ہے جس میں مسلمانوں نے نہ صرف کمال حاصل کیا بلکہ ان کے جانشینوں نے بھی اس میں بڑی ترقی کی اور اس فن کو چار چاند لگا دیے۔ علی الخصوص تیمور کے پوتے الغ بیگ نے جس کی زیج آج تک مشہور ہے۔ یہ گویا بغداد کی آخری تالیف میں ہے۔ بغداد کے مدرسۂ ہیئت کا قیام ۷۵۰ء سے ۱۴۵۰ء تک یعنی سات صدیوں تک رہا۔ بغداد اس فن کی تعلیم کا اگرچہ بڑا مرکز تھا مگر اور دوسرے مقامات میں بھی اس علم کی تحقیق و انکشاف کا کام جاری تھا۔ چنانچہ وسط ایشیا سے لے کر سواحل اٹلانٹک تک دمشق، سمرقند، قاہرہ، فاس، طلیطلہ اور قرطبہ ان تمام مقامات میں بکثرت ہیئت داں موجود تھے۔ بغداد اور دمشق کی رصدگاہوں میں جو مشاہدات کیے گئے تھے وہ ایک کتاب میں جس کا نام "زیجات ممتحنہ" تھا، درج کیے گئے تھے۔ افسوس وہ کتاب دستیاب نہیں ورنہ وہ بہت ہی مفید اور کارآمد تحقیق اور معلومات پر مشتمل تھی۔ اس کے تحقیقاتی مندرجات کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہیں کیونکہ وہ موجودہ دور کی تحقیقات کے بہت ہی قریب ہیں۔ مدرسہ بغداد کی دیگر تحقیقات میں ان کی وہ تقادیم تھیں جن میں سیاروں کے بروج درج تھے اور جن میں "استقبال معدلین" کو نہایت صحت کے ساتھ دریافت کیا گیا تھا۔ اس زمانے کے مہندسین میں ایک بڑا مہندس محمد ابن جابر البتانی تھا (اس کا زمانہ نویں صدی عیسوی تھا) اس کا مرتبہ مسلمان فضلا میں ویسا ہی ہے جیسا کہ بطلیوس کا یونانیوں میں۔ بوجوہ کل مسلمان مہندسین میں البتانی کا نام یورپ میں سب سے زیادہ معروف ہے۔ اس کی تصنیفات میں مشہور تصنیف "زیج البتانی" ہے۔ جو زیج البتانی نے بنائی تھیں اس کا ایک ناقص لاطینی ترجمہ "علم النجوم" کے نام سے یورپ میں شائع ہوا تھا۔ حالانکہ البتانی کی کتاب کا اصل نام "کتاب معرفۃ مطالع البروج" ہے۔ فاضل لالانیڈ البتانی کو منجملہ ان بیس ہیئت دانوں کے شمار کرتا ہے جو تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ ابن اماجور بھی ہیئت کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کی تصانیف بہت ہیں۔ ان میں مشہور ایک "کتاب الزیج" بھی ہے جو "البدائع" کے نام سے معروف ہے۔ اس کا لڑکا ابوالحسن بھی مہندس تھا۔ اس کی تحقیقات کا زمانہ ۸۸۳ء تا ۹۳۳ء تھا۔ اس نے کئی تقویمیں تیار کی تھیں۔ شیخ بہاء الدین عاملی کی کتاب "تشریح الافلاک" بھی اپنے فن میں مشہور ہے۔ موسیٰ بن شاکر اور اس کے تین لڑکے محمد و احمد اور حسن جو بنو موسیٰ کے نام سے مشہور تھے انھوں نے بڑے اہتمام اور سعی و جہد سے دور دراز مقامات سے اس فن کی کتابیں فراہم کی تھیں ان کی تصانیف علم ہندسہ و حیل و نجوم اور موسیقی میں بکثرت ہیں۔ یہ تینوں بھائی نویں صدی عیسوی میں تھے اور اپنے دور کے مشہور مہندسین میں شمار کیے جاتے تھے اور اس فن میں ان کی تحقیقات بھی مسلم اور قابل قدر تھیں۔ اس کے بعد جو مہندسین گزرے ان میں سب سے زیادہ ابوالوفا کی شخصیت اور علمیت بلند مرتبہ تھی۔ موسیو سدی یو کو ابوالوفا کی ایک کتاب دستیاب ہوئی تھی۔ اس کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مہندس نے بھی چاند کے تغیرات کو معلوم کر لیا تھا۔ اور اس نے بطلیوس کے بیان کردہ حرکت قمری کو ناقص اور خلاف واقعہ ثابت کیا تھا کہ اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ البیرونی نے دنیا کے بڑے بڑے مقامات کے طول و عرض بلد کی جدولیں تیار کی تھیں۔ اس کی تصانیف بھی بکثرت ہیں۔ یاقوت حموی نے وسط ایشیا کا سفر کیا تھا۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ:

"جامع مرو کے کتب خانۂ عام میں میں نے البیرونی کی فہرست کتب دیکھی تھی جو گنجان تحریر میں ساٹھ اوراق پر مشتمل تھی۔"

سید حسن برنی (علیگ) کی تصنیف "البیرونی" میں اس کی تصانیف کثیرہ کی پوری تفصیل درج ہے۔ ان میں سے اس کی تین کتابیں بہت مشہور ہیں جو یورپ میں شائع ہوئیں

۱۔ قانون مسعودی ۲۔ کتاب الہند

۳۔ آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ۔

اس کے علاوہ اس کی ایک اور چوتھی کتاب "استخراج الاوتار فی الدائرہ" فن ہیئت میں بہت عمدہ ہے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی کی کتاب "شکل القطاع" بھی اس فن میں بہت پُر از معلومات ہے۔ اس کی "زیج ایلخانی" کا ایک اہم مقام ہے۔

الغ بیگ جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اس کے آلات رصد کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس کے ربع کا دائرہ اس قدر بڑا تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کے سینٹ صوفیا کی بلندی کے برابر تھا۔ الغ بیگ کی تحقیقات نے زمانۂ قدیم و جدید کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ حالانکہ ان کے زمانے میں صرف ڈیڑھ سو برس کا فصل تھا۔

بغداد کے بعد قاہرہ اس کا مد مقابل تھا۔ چنانچہ خلیفہ الحاکم (۹۹۶ء تا ۱۰۲۱ء) کے عہد حکومت میں ابن یونس (م ۱۰۰۹ء) نے بڑی زیجیں تیار کی تھیں۔ جو "زیج حاکمیہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے مقابلے میں تمام زیجیں ہیچ تھیں۔ اور یہ زیج حاکمیہ ہر کتاب میں نقل کی جانے لگی۔ ابن السندی جو ۱۰۴۰ء میں قاہرہ میں مقیم تھا اس کا بیان ہے کہ

"اس شہر کے کتب خانہ میں دو کرۂ سماوی اور چھ ہزار کتابیں ریاضی اور ہیئت کی ہیں۔"

یہ اس کا چشم دید بیان ہے۔ اس کے اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں فن ریاضی اور ہیئت کس قدر اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں صرف قاہرہ کے ایک کتب خانہ میں اس فن کی اس قدر کتابیں اور دو کرۂ سماوی تھے۔ ابو الحسن مراکشی بھی بڑا ہیئت دان تھا۔ اس کی کتاب "ابتدا و انتہا" اس فن میں بہت مشہور ہے۔ اس کتاب کے ایک حصے کا ترجمہ موسیو سدی یو نے کیا تھا۔ اس کتاب میں اس فن اور مسلمانوں کے ایجاد کردہ آلات رصدی کے متعلق بیش بہا معلومات درج ہیں۔

ملک شاہ سلجوقی کے حکم سے البیرونی نے تحقیق کر کے تقویم میں ایسی اصلاحیں کیں کہ چھ سو برس بعد گریگوری کی اصلاح سے مختلف مدارج میں بہتر تھے۔ چنانچہ گریگوری کے دس ہزار سال کی مدت میں تین دن کا تفاوت ہوتا ہے۔ فضلائے اسلام میں سے ایک عباس فرناس نامی حکیم اندلسی نے ایک مکان کے اندر زمین و آسمان اور ستاروں کی ہیئت بنائی تھی جس میں رعد و برق اور باد باراں کی پوری کیفیت دکھلائی تھی اور بادلوں کے بننے اور برسنے کا مشاہدہ کرایا تھا۔ اسی اندلسی حکیم نے فضا میں پرواز کے لیے انسان کے واسطے سب سے پہلے ایسے پر ایجاد کیے جن کو بازوؤں میں باندھ کر ہوا میں پرواز کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس پر کے ذریعہ کئی گز بلند پرواز کا کامیاب تجربہ بھی کیا تھا۔ مسلمان فضلا نے فلکیات اور ہیئت کے علوم میں جو جو کارنامے انجام دیے کاش وہ سلسلہ برابر جاری رہتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ تسخیر فضا میں کامیاب ہو جاتے لیکن افسوس انھوں نے غفلت برتی اور یہ کارنامے دوسروں نے انجام دیا۔ ہندوستان میں بھی ایک آخری زیج دہلی میں محمد شاہ بادشاہ دہلی نے بصرف کثیر بنوائی تھی جو "زیج محمد شاہی" یا "جنتر منتر" کے نام سے دہلی میں آج بھی مشہور ہے۔

اصطرلاب

الزرقالی ابن عبدالرحمٰن، اندلس کا مشہور مہندس تھا۔ اس نے مامون خلیفہ کی فرمائش پر ایک اصطرلاب تیار کیا اور اس کا نام "مامونیہ" رکھا۔ اس نے آلات ہیئت پر ایک کتاب "العباریہ" لکھی تھی۔ اس کا زمانہ ۱۰۸۰ء تھا۔ الزرقالی نے آفتاب کے "نقطۂ اوج" کو دریافت کرنے کی غرض سے چار سو سے زائد مشاہدات کیے تھے۔ اس نے

انتہائی کاوش اور صحت کے ساتھ "معدل النہار" کا پچاس ثانیہ ہونا، جو موجودہ تحقیقات کے عین مطابق ہے معلوم کر لیا تھا۔ وہاں انکشافات و تجربات کے لیے اپنے خود ساختہ آلات استعمال کرتا تھا۔ اس نے کئی گھڑیاں بھی تیار کی تھیں جن کی طلیطلہ میں بڑی قدر کی جاتی تھی۔

زمین کی محوری گردش

زمین کی محوری گردش کی بحث بہت دلچسپ اور خاص توجہ کی مستحق ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس انکشاف اور نظریہ کا محقق کوپرنیکس ہے۔ لیکن مندرجہ ذیل بیان سے صحیح صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔ اس نظریہ اور تصور کے متعلق علی ابن عمر الکاتبی اور علامہ قطب الدین شیرازی نے کافی بحث کی لیکن تعجب ہوتا ہے کہ بغیر کسی معقول وجہ تردید زمین کی محوری گردش کو مسترد کر دیا۔ ان دونوں فضلا کے علاوہ ایک اور شخص سریانی ابوالفرج نے بھی زمین کی گردش کے متعلق بحث کی ہے۔ اس کے سوا ابوبکر محمد بن یحییٰ ابن باجہ اندلسی حکیم، جو متعدد علوم کا ماہر تھا اس نے بطلیموسی نظام شمسی پر تنقید کی اور اس کے اعتراضات اور تنقید سے متاثر ہو کر البطروجی نے اپنا "نظریۂ لولبی" پیش کیا ان سب کے علاوہ جابر بن فلاح جو اپنے دور کا سب سے سربرآوردہ ماہرِ ہیئت اور منجم تھا۔ اس نے بھی بطلیموسی نظام شمسی کے نظریہ پر اعتراض و تنقید کی تھی۔ اس نظریہ بطلیموسی پر ثابت بن قرہ اور ابن الہیثم نے بھی اعتراضات اور تنقیدیں کی تھیں۔ خواجہ نصیر الدین طوسی جو بہت بڑا ہیئت دان تھا، اس نے بھی اپنی کتاب "الحکمۃ العین" میں زمین کی روزانہ محوری گردش کے متعلق بحث کی ہے لیکن بحث کے اختتام پر وہ پرانے نظریۂ بطلیموسی پر قائم رہا۔ اگرچہ اس کے برسرِ حق ہونے کے متعلق کوئی ٹھوس دلیل نہیں پیش کی۔ ان تمام فضلا کے اعتراضات و تنقید اور شکوک کے سوا، بالکل واضح اور غیر مشکوک طور پر، ابو سعید سنجری کا نظریہ اور اس کا تیار کردہ "اصطرلاب زورقی" زمین کی گردش کے عین مطابق ہے وہ پہلا شخص ہے جس نے بطلیوسی نظام شمسی کو صاف اور واضح طور پر غلط اور مشکوک قرار دیا تھا اور اس پر آخر تک قائم رہا۔ ان تمام اعتراضات و تنقید اور ابو سعید سنجری کے اصطرلابِ زورقی کے صدیوں بعد کوپرنیکس کو اپنے خیال و نظریے کے لیے ٹھوس اور موثر دلائل ملے اور اس نے بھی واشگاف انداز میں بطلیوسی نظریہ کے غلط ہونے اور زمین کی محوری گردش کے نظریے کے صحیح ہونے کا اعلان کیا درامل اس نظریہ کا اصل محقق وہ نہیں بلکہ ابو سعید سنجری ہی ہے۔ البیرونی کا اس نظریے کے متعلق بیان ہے کہ

> "ابو سعید سنجری نے کرۂ ارض کو "متحرک" مان کر ایک اصطرلاب بنایا (موسومہ اصطرلاب زورقی) جس کے اعمال مجھے بہت پسند آئے اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ علمائے ہیئت کے لیے بہت مشکل ہے کہ اس کو رد کریں اور وہ اس کی مخالفت میں کوئی ثبوت نہیں لا سکتے تھے۔"

البیرونی خود بھی اس کو صحیح اور درست جانتا اور سمجھتا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں، بعد میں اس کے خیالات تبدیل ہو گئے اس کے خیال کی تبدیلی کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ بقول موسیو گستاؤلی بان،

> "مسلمانوں کے تیار کیے ہوئے اصطرلاب کی ساخت میں اعلیٰ درجے کی صنعت و جدت پائی جاتی ہے اور آج بھی ان سے بہتر اصطرلاب بنانا دشوار ہے۔ مسلمانوں کی تیار کردہ تین اصطرلاب، پیرس کے سرکاری کتب خانے میں موجود ہیں۔ مسلمان فضلائے ہیئت، زاویوں کو سطح دائرہ اور اصطرلاب کے ذریعہ ناپتے تھے۔ اس میں ان کو بے مثال مہارت حاصل تھی۔"

ان علوم و فنون میں مسلمان فضلا کے بے شمار کارنامے اور خدمات ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ انہیں میں سے ایک ابراہیم الفزاری بھی ہیں جن کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اصطرلاب تیار کیا تھا۔ ابو حامد ابن محمد اصفہانی الاصطرلابی بھی ماہر ریاضی و ہیئت اور مشہور موجد اصطرلاب ہیں۔ اس فن میں ان کی مہارت کی بنا پر اصطرلاب اُن کے نام کا ایک جزو بن گیا ہے اور اسی نام سے وہ مشہور ہیں۔ شرف الدولہ دیلمی کی رصدگاہ کے لیے انہی نے اصطرلاب تیار کیا تھا۔ ابو حامد اصطرلابی نے "تثلیث زاویہ" کی بھی تحقیق کی تھی۔ ابو الوفا بوزجانی کی "کتاب الہندسہ" میں فن تعمیر (آرکیٹکچر) مساحت اور انجینئرنگ سے متعلق امور کا خصوصی ذکر ہے۔ وہ غیر معمولی ذہن و دماغ اور صلاحیت کے حامل تھا۔ ابن حیان صاحب تصنیف "کتاب المقتبس فی التاریخ الاندلس" جو دس جلدوں میں ہے، اس نے میزان (ترازو) پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں مختلف اقسام کی ترازوئیں، ان کا استعمال، اوزان، پیمانے اور سکوں سے متعلق بحث کی ہے ــــــــ اس کی تاریخ اندلس میں جن اشیا پر بحث کی گئی ہے اس کا تعلق بہت کم تاریخ سے ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ فضلا کن صلاحیتوں اور علم و ذہانت کے حامل تھے۔ آج یہ بات یکسر مفقود ہے۔ ابو الوفا بوزجانی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ حکمائے اسلام میں بہت بلند مرتبہ اور ماہر ریاضی داں تھا۔ اس کی تصنیف "منازل" اور زیچ نیز دیگر تصانیف اس امر کی شاہد ہیں۔ بقول بیہقی اور ابن خلکان وہ علم ہندسہ میں امام کا درجہ رکھتا تھا۔ ابن ندیم نے اس کی تصانیف کی فہرست اپنی مشہور کتاب "الفہرست" میں دی ہے۔ مسلمان حکما میں سب سے پہلے ابو منصور نے رصدخانہ مامونی بنائی تھی۔ اس کے علاوہ المروزی و سند بن علی اور سعید بن الجوہری ان سب نے اس کے متعلق ایک زیچ مرتب کی تھی جو اس کی طرف منسوب ہے۔ یہ سب فضلا ریاضی کی تمام شاخوں میں ممتاز اور درجۂ کمال رکھتے تھے۔ سند بن علی فن تعمیر میں بھی بہت ماہر اور تجربہ کار تھا۔ اس کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ کتاب الحساب الہندی ۲۔ کتاب الجمع والتفریق

۳۔ کتاب جبر و المقابلہ۔ بنو موسیٰ یہ تینوں بھائی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ان تینوں بھائیوں کی ریاضی کی مختلف شاخوں میں تصانیف کا ذکر قفطی اور ابن ندیم کی مشہور کتابوں میں ہے۔ حکیم ابو محمد العدلی القائنی بہت ماہر ریاضی داں تھا۔ اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے محمد بن جابر البتانی کی زیچ کی ترتیب، تہذیب اور اصلاح کی حالانکہ البتانی خود بہت بڑا ریاضی داں تھا۔ العدلی نے خود بھی ایک "زیچ العدلی" مرتب کی تھی۔ بقول بیہقی صاحب "تتمہ صوان الحکمت" العدلی نے فن مساحت اور جبر و مقابلہ میں کتابیں لکھی تھیں۔ اسی کا یہ بھی قول ہے کہ

"وا انجینیر تو طلیموس تھا اور ثانی دو موجد البتانی اور

میرا درجہ سفیدی کرنے والوں کی طرح ہے۔"

اس کا یہ قول تتمہ صوان الحکمت میں ہے۔ ابن مسکویہ فضلا اسلام میں بڑا صاحب علم و فضل اور بلند مرتبت شخصیت کا مالک تھا اس زمانے کے تمام علوم مروجہ مثلاً طب، منطق، ریاضیات اور علم ہندسہ و طبیعیات، کیمیا، الہیات اور تاریخ وغیرہ میں اس نے اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھیں اور ان کا درس بھی دیتا تھا۔ وزرا، حکومت اور سلاطین وقت (آل بویہ) کے یہاں اس کی بڑی قدر و منزلت اور وقار تھا۔ حکیم میمون بن نجیب الواسطی اور حکیم اسفزازی کی بھی رصدگاہ ملک شاہی میں بڑی خدمات ہیں۔ اسفزازی کا یہ ایک یادگار کارنامہ ہے کہ اس نے عمر بھر کی محنت شاقہ کے بعد ایک ایسی میزان تیار کی تھی جس سے کھرے کھوٹے سکے کی شناخت ہوتی تھی اس کا نام "میزان الحکمۃ" تھا۔ اس کو اس نے اپنے مربی سلطان سنجر کو بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ ابو العباس اللوکری بھی رصدخانہ ملک شاہی کے بانیوں میں

شامل تھا۔ قطب الدین شیرازی کی "تحفۂ شاہیہ" میں اس کا نام لیا گیا ہے اور بقول شہزوری:

حکمت کے میدان میں وہ ہمسروں خیام، ابن کوشک
اور ابن نجیب واسطی سے گویا سبقت لے گیا اور
ان میں سے کوئی اس کی گرد کو نہ پہنچ سکا"

شہزوری کے اس بیان میں پوری سچائی نہیں ہے کسی قدر مبالغہ ہے۔ ابوالفتح کوشک کا بھی رصد خانۂ ملک شاہی میں کام کرنے والوں میں بقول مصنف نظام الملک نام لیا گیا ہے۔ یہ بڑا صاحب علم تھا۔ سلطان سنجر بن ملک شاہ کو اس سے بڑی عقیدت اور انس و وابستگی تھی۔ سلطان اس کی کتابوں سے بہت دلچسپی رکھتا تھا اور ان کو وہ مطالعے کے لیے اپنے کتب خانے میں رکھتا تھا۔ اس کا ذکر بیہقی اور شہزوری نے بھی کیا ہے۔ عبدالرحمٰن الخازنی اور اس کی کتاب "میزان الحکمۃ" کا بار بار ذکر آیا ہے اس نے "زیج سنجری" کے نام سے ایک زیج سلطان سنجر کے نام معنون کی تھی۔ رصد خانہ ملک شاہی سے اس کا بھی خاص تعلق تھا۔ ابوالفتح کوشک بڑا غیور اور زہد و قناعت میں بلند مرتبے کا مالک تھا۔ حتی کہ سلطان سنجر کے عطیات شاہانہ کو بھی قبول نہیں کرتا تھا۔ عبدالکریم مہندس (م ۱۲۰۳ء) عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا اس کی روداد زندگی بڑی دلچسپ اور حوصلہ افزا ہے۔ اس کا پیشہ بڑھئی کا تھا۔ وہ کچھ زیادہ لکھا پڑھا بھی نہ تھا مگر اپنے پیشے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ سلطان نورالدین زنگی نے جو عظیم الشان شفاخانہ بنوایا تھا۔ اس کے بیشتر حصے اسی کے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے۔ پھر اس کو خیال آیا کہ اپنے پیشے میں مزید عمدگی اور خوبی پیدا کرنے کے لیے اقلیدس پڑھنی چاہیے۔ جب یہ شوق بہت بڑھا تو اس وقت وہ مسجد خاتون میں کام کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے کام کی مصروفیت کے ساتھ یہ معمول بنا لیا کہ وہاں کام پر جاتے وقت راستہ بھر اقلیدس کی شکلیں حل کرتا جاتا تھا اور فارغ اوقات میں بھی اس کا یہی مشغلہ رہتا تھا۔ اس کی مسلسل سعی و کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے پوری اقلیدس کی کتاب حل کر لی اور اس پر پورا عبور حاصل کر لیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا، اس نے مجسطی پڑھنی شروع کی اور علم ہندسہ کی تحصیل و تکمیل میں ہمہ تن مشغول ہو گیا اور اس میں اس درجہ کمال حاصل کر لیا کہ مہندس کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ علم ہندسہ کے ساتھ اس کو فن ریاضی اور نجوم کا بھی علم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ غرضیکہ اپنے معمولی پیشۂ نجاری (بڑھئی) میں کمال اور مہارت کے حصول کے واسطے اس نے ریاضی و اقلیدس اور علم ہندسہ میں بھی کمال حاصل کیا اور اس سے اس نے بڑے بڑے کام کیے۔ اس نے جامع دمشق کے مشہور گھنٹے کی اصلاح کی اور اس کی نگرانی پر مامور رہا جس کے لیے اس کو مستقل وظیفہ ملتا تھا۔ انسان کی کاوش یاد لگن ضرور بار آور ہوتی ہے۔ عبدالکریم مہندس اس کی مثال ہے۔

عمر بن ابراہیم خیام نیشاپوری (م ۵۲۶ھ) مشہور ماہر ہیئت و نجوم اور طبیعیات اور صاحب تصانیف تھا۔ اس کی چند تصنیفات کے نام یہ ہے۔ ۱۔ رسالہ مختصر طبیعیات۔ ۲۔ میزان الحکم (فلزات کے وزن دریافت کرنے میں) ۳۔ رسالہ لوازم الامکنہ (انقلاب موسم اور مختلف اقلیموں کے اختلاف آب و ہوا کے بیان میں) ۴۔ رسالہ فی الاحتیال لمعرفۃ مقداری الذہب و الفضۃ (سکوں اور زیورات میں سونے چاندی کی مقدار دریافت کرنے میں) ۵۔ زیج ملک شاہی۔ ۶۔ رسالہ فی شرح ما اشکل من مصادرات کتاب اقلیدس۔ ۷۔ رسالہ فی الجبر والمقابلہ۔ ۸۔ کتاب البرہان علی طرق استخراج اضلاع المربعات والمکعبات۔ رسالہ جبر و مقابلہ اس نے بڑی محنت اور کوشش بلیغ صرف کر کے لکھا ہے۔ اس فن پر جس قدر کتابیں تھیں ان کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان میں جو غلطیاں تھیں ان کی اصلاح بھی کی۔ یہ اس کی اوائل کی تصنیف ہے۔ زیج ملک شاہی کا تذکرہ علامہ قطب الدین شیرازی نے "تحفۂ شاہیہ" میں کیا ہے اور پچھلی صدی میں ہندوستان کے مشہور ریاضی داں علامہ غلام حسین جونپوری نے اپنی کتاب "جامع بہادر خانی" (مطبوعہ ۱۲۵۰ھ کلکتہ)

میں اس زیچ ملک شاہی کا بہترین تعارف کرایا ہے۔ خیام کی مذکورہ آخری چار بعد کتابیں فن ریاضی سے متعلق ہیں: "میزان الحکم" اور "رسالہ مقداری النصب الفضہ"۔ اس فن میں عمر خیام کے معاصر مظفر اسفزاری کا نام زیادہ شہرت رکھتا ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسی فلزاتی ترازو کی تکمیل میں صرف کیا۔ اسفزاری کو علم جر ثقیل و آلات میں بھی بدرجہ کمال حاصل تھا۔ خیام و اسفزاری کے علاوہ عبدالرحمٰن الخازنی کی میزان الحکمۃ اس فن میں ان سب سے بہتر تسلیم کی گئی ہے۔ خیام کی زیچ ملک شاہی کے علاوہ الخوارزمی، ابن یونس، طوسی، سمرقندی اور خازنی کی زیچیں بہت مشہور اور معتبر ہیں۔ خازنی کی زیچ کا نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ خازنی نے اپنی کتاب میں "آلی ترازو" کے سابق محققین اور مصنفین کے نام گنائے ہیں اور یونانیوں کے بعد عہد اسلامی کے حکما کی نسبت بہت کچھ لکھا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

عمر خیام کے حالات پر مولانا سید سلیمان ندوی نے خیام کے نام سے ایک بہت مستند اور مفید کتاب تصنیف کی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

چند مشہور رصد خانے۔

۱۔ رصد خانہ مامونی تقریباً ۲۱۱ھ۔ ۲۔ رصد خانہ ابوحنیفہ دینوری ۲۳۵ھ اصفہان۔ ۳۔ رصد خانہ محمد بن جابر البتانی۔ رقہ و انطاکیہ ۲۶۴ تا ۳۰۶ھ۔ ۴۔ رصد خانہ محمد بن محمد بوزجانی م ۳۸۸ھ۔ ۵۔ رصد خانہ علی بن حسین بن اعلم م ۳۷۴ھ بعہد عضدالدولہ دیلمی بغداد میں۔ ۶۔ رصد خانہ شرف الدولہ دیلمی م ۳۷۹ھ بغداد۔ ۷۔ رصد خانہ حاکم بامراللہ فاطمی م ۴۱۱ھ مصر۔ ۸۔ رصد خانہ بوعلی سینا م ۴۲۸ھ۔ اصفہان۔ ۹۔ رصد خانہ ملک شاہی ۴۶۷ھ اصفہان بحکم ملک شاہ باہتمام نظام الملک طوسی۔ اس رصد خانہ کی تکمیل میں عمر خیام کے علاوہ بہت سے فضلا شریک تھے۔ مثلاً اسفزاری، میمون بن نجیب واسطی، ابوالعباس لوکری، محمد بن احمد معموری بیہقی، عبدالرحمٰن خازنی، ابوالفتح ابن کوشک، محمد خادن۔ بشمول نظام الملک ان فضلا کی تعداد آٹھ ہے۔ یہ سب فن ہیئت میں شہرت اور مہارت رکھتے تھے۔ ۱۰۔ رصد خانہ الغ بیگ وغیرہ

طبیعیات:

اگرچہ فن طبیعیات میں مسلمانوں کی بیشتر تصانیف تلف ہو گئی ہیں اور ہم تک محض چند بڑی تصنیفات کے نام ہی پہنچ سکے ہیں۔ مثلاً ابن الہیثم کی کتاب "علم المناظر" جس میں مستقیم منعکس اور منعطف شعاعوں اور مقعر آئینوں کی تماثیل سے بحث کی گئی ہے۔ "فن بصریات" میں یہ کتاب اس مرتبہ کی ہے کہ آج بھی اس کے مسلمات سے انکار مشکل ہے۔ ابن الہیثم بصرہ کا باشندہ تھا۔ خلیفہ الحاکم بامراللہ نے اس کو مصر بلایا۔ خلیفہ کو اس سے ملاقات کا اس درجہ اشتیاق تھا کہ خود اس کی پیشوائی کے لیے محل سے نکلا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے محل میں لایا۔ ابن الہیثم کی تصانیف کی تعداد پچاس سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ابن الہیثم کا ذکر فن ریاضی و اقلیدس کے بیان میں بھی آیا ہے۔ اس کی کتاب "علم المناظر" کا ترجمہ لاطینی اور اطالوی زبان میں ہوا تھا جس سے کیپلر نے اپنی کتاب "مناظر" میں بہت مدد لی تھی لیکن افسوس کہ اس نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ یہ کتاب مدتوں مغرب کی درسیات میں شامل رہی۔ راجر بیکن اس کتاب کا بہت معترف تھا۔

"روشنی آواز سے پہلے پہنچتی ہے" یعنی روشنی کی رفتار آواز سے تیز ہے۔ اس نظریہ کے محقق مسلمان ہیں۔ نیز "قوس و قزح" کے متعلق سب سے منکشف معلومات قطب الدین شیرازی نے اپنی مایہ ناز کتاب "نہایۃ الادراک" میں بیان کی ہے۔ "قوانین کشش" فضلائے اسلام نے معلوم کر لیا تھا۔ رازی اور ثابت بن قرہ اور خازنی البصری وغیرہ کی معلومات اور بیانات کی بنیاد پر بعد میں نیوٹن نے اپنے نظریۂ قانون کشش کی عمارت تعمیر کی۔ بقول فاضل ڈریپر کے "نیوٹن سے صدیوں قبل قوانین کشش مسلمان حکماء نے دریافت کر لیا تھا۔"

قطب الدین شیرازی کی کتاب "نہایۃ الادراک" اس فن اور علم میں پہلی معلوماتی تصنیف ہے۔ قوس و قزح کے متعلق بعد میں تھیوڈورکس نے جو توجیہ پیش کی وہ بالکل قطب الدین شیرازی کی توجیہ کی نقل تھی۔ تھیوڈورکس نے اس میں نہ کوئی اضافہ کیا اور نہ اس میں کوئی جدت پیدا کی۔

ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب "الجماہر فی الجواہر" میں "کثافت نوعیہ" کے سلسلے میں جو ضابطے وضع کیے ہیں آج بھی ان سے فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ خازن البصری کی کتاب "میزان الحکمۃ" میں جن محیرالعقول امور پر اس نے معلومات فراہم کی ہیں ان سے علمائے مغرب نے مدتوں فیض اُٹھایا۔ خازن البصری کی اس کتاب میں "جاذبۂ زمین" کا نظریہ بھی بیان کیا گیا ہے اور ٹھوس اور مائع اشیاء کی کثافت اضافی بھی بتلائی ہے۔ نیز شعری نالی میں پانی کا چڑھنا بھی بیان کیا ہے۔ "میزان الحکمۃ" ایک قسم کی ترازو ہوتی تھی جس سے کسی بھی زیور یا سکوں کے متعلق یہ دریافت کیا جا سکتا تھا کہ اس میں سونے چاندی کی مقدار کتنی ہے؟ یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد (دکن) سے شائع ہو چکی ہے اور دستیاب ہے۔ عبدالرحمٰن خازنی البصری صرف اپنے زمانے کا ہی نہیں قبل اور بعد دونوں میں طبیعیات کا تسلیم شدہ فاضل اور امام ہے۔ اس فن کے دوسرے ماہرین نے یہ بات تسلیم کی ہے۔ وہ ابن سینا اور البیرونی سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ خازنی کا کہنا ہے کہ اشیا کی کثافت اضافی سب سے پہلے مظفر الاسفزاری نے باضابطہ تحقیق کی۔ اگرچہ سند ابن علی کے متعلق بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ کثافت اضافی کا تعین اس نے کیا تھا۔ الخازنی کی میزان الحکمۃ میں مائعات کی سطحی تناؤ کا سرسری مشاہدہ اور ذکر بھی ہے۔ امیہ بن عبدالعزیز بن ابوالصلت (م ۱۱۴۱ھ) جو اندلس کا باشندہ اور ماہر ریاضی دان تھا، اس نے اسکندریہ کے پاس سمندر میں ایک ڈوبے ہوئے جہاز کو جر ثقیل میں مہارت اور تجربہ کو کام میں لا کر آلات کو اس ڈوبے جہاز کے متوازی دوسرے جہاز پر نصب کیا اور ریشم کے رسوں کے ذریعہ اس جہاز کو سطح سمندر تک کھینچ لایا لیکن اتفاق سے ریشم کے رسے اس کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکے اور ٹوٹ گئے اور جہاز پھر غرق ہو گیا۔ اس عمل میں بڑا سرمایہ صرف ہوا تھا۔ اس کے اس عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس فن میں مہارت اور پوری دستگاہ رکھتا تھا اور ان آلات کے استعمال کا تجربہ بھی رکھتا تھا۔ ابن الصلت ریاضی اور فن جر ثقیل میں مہارت کے علاوہ دیگر علوم و فنون کا بھی فاضل تھا۔ چنانچہ طب، موسیقی، ہندسہ اور ادب میں بھی اس کی تصانیف ہیں۔ البیرونی کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ فوارہ نما کنووں (آرٹیزن) کے متعلق اس نے بڑی مدلل توجیہ پیش کی ہے۔ اوقات کی تقسیم کا طریقہ ابوالحسن علی احمد نسوی کے ذہن کی اختراع ہے۔ وہ ایک گھنٹہ کو ساعت کہتا اور اس کو ساٹھ مساوی حصوں میں تقسیم کر کے اس کے ساٹھویں حصہ کو "دقیقہ" (منٹ) کا نام دیتا ہے اور پھر ایک دقیقہ کو بھی ساٹھ مساوی حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ کو ثانیہ (سکنڈ) سے موسوم کرتا ہے۔ اس طرح مروجہ اوقات گھنٹہ منٹ اور سکنڈ کی تقسیم علی احمد نسوی کی ایجاد و اختراع ہے۔

جر ثقیل

مسلمان حکماء کو جر ثقیل کا عملی علم اعلیٰ درجے میں حاصل تھا۔ وہ چند آلات جو پائے گئے ہیں ان سے نیز قدیم مصنفین کے بیانات سے ان کی صناعی کے اعلیٰ درجہ کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ علم الحیل (میکنزم) کے فن میں مسلمانوں نے عجیب و غریب کمالات حاصل کیے اور نادر اشیا ایجاد کیں۔ مثلاً گھڑی، پن چکی، فوارہ نما کنواں، ڈوبے جہاز کو نکالنا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ منجنیق و توپ، بندوق، آلات آب رسانی، مُہم اور آلات متحرکہ وغیرہ۔ اس فن کے ماہروں میں احمد بن موسیٰ (بنو موسیٰ تین بھائیوں میں سے ایک) اس فن میں بڑا ماہر تھا اس فن میں ایک مشہور کتاب "علم الحیل" ہے جس میں

مختلف قسم کے متحرک اور میکانک آلات کا بیان اور اس کے بنانے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ خلیفہ متوکل باللہ کو چونکہ خود آلات متحرکہ کا بیحد شوق تھا۔ اس لیے وہ اس فن کے ماہرین کا بڑا قدردان تھا۔ ابن رقیقہ اگرچہ ایک فاضل اور ماہر طبیب تھا لیکن اس کو فن حیل میں بھی بڑی دستگاہ اور مہارت تھی۔ اس نے بہت سے آلات ایجاد کیے تھے۔ فتح اللہ شیرازی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ بہت سے آلات و گاڑی اور حربی اشیاء توپ، آٹا پیسنے کی مشین وغیرہ بنانے میں ماہر تھا۔ موسیو سدی یو کا بیان ہے کہ "ہم کو اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے عہد میں میکنزم کا فن کمال کی حد تک پہنچ گیا تھا۔" موسیو لی بان نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ "عربوں کو میکزم کی خصوصاً عملی میکنزم کی بڑی واقفیت اور مہارت حاصل تھی۔ وہ آلات جو ان کے بنے ہوئے ہیں وہ آج بھی ہمیں دستیاب ہو سکتے ہیں۔" علامہ شبلی نے ایک مضمون "میکنکس اور مسلمان" کے عنوان سے لکھا تھا جو بہت مفید معلومات سے پُر ہے۔

عبدالعزیز اسمٰعیل ابن الرزاق بدیع الجزری کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اس نے میکانیات پر ایک کتاب موسومہ "کتاب فی معرفۃ الحیل والہندسہ" لکھی تھی اس میں خصوصیت کے ساتھ آبی تنصیبات (ہائیڈرولک) کی تشریح کی ہے۔ لیکن ابن الساعاتی کی کتاب اس فن میں سب سے بہتر اور اہم ہے۔ بدیع الجزری کی کتاب مذکورہ خالص سائنسی نقطۂ نظر سے بڑھ کر فنی اعتبار سے نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات و مفید سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کے ایک باب میں مختلف قسم کے پانی سے چلنے والی گھڑیوں کا ذکر کیا ہے جو ساعات یا پہر اور گھنٹے بتاتی تھیں۔ آکسفورڈ کے مشہور فاضل ڈاکٹر برنارڈ کا بیان ہے کہ "لنگر کا استعمال گھڑیوں میں پہلے مسلمانوں نے ہی نکالا ہے لیکن ان کے دلائل اس عظیم الشان ایجاد کو عربوں کی طرف منسوب کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں، نہایت قرین قیاس ہے کہ وہ گھڑی جو ہارون الرشید نے شاہ شارلیمین شہنشاہ فرانس کو بھیجی تھی وہ جو پیتل کے گولوں کے ایک فلزی دائرے پر گرنے سے بجتی تھی فی الواقع وہ پانی کی گھڑی تھی۔" آکسفورڈ کے فاضل موصوف کا یہ بیان کچھ عجیب سا ہے۔ پہلے تو اس گھڑی کے متعلق "نہایت قرین قیاس" کہا اور بعد میں "فی الواقع" فرما کر قطعی فیصلہ صادر کر دیا بغیر کسی ثبوت و شواہد کے۔ گویا ان کا فرمایا ہوا بالکل مستند ہے یعنی کہ وہ گھڑی فی الواقع پانی کی گھڑی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جامع دمشق میں یہ گھڑی ابن بطوطہ نے مسجد کے دروازے پر دیکھی تھی اور اس سے بھی پیشتر ابن جبیر نے بھی وہاں دیکھی تھی جس کا ذکر ان دونوں کے سفرناموں میں موجود ہے وہ پانی کی گھڑی نہیں تھی۔ ان کے علاوہ فرانسیسی موسیو لیبان فرماتے ہیں کہ "یہ امر یقینی ہے کہ عربوں نے اس قسم کی لنگردار گھڑیاں بنائی تھیں جو پانی کی گھڑیوں سے بالکل مختلف تھیں۔" مزید فرماتے ہیں کہ اس کا ثبوت ہمیں ان بیانات سے ملتا ہے جو اکثر سیاحوں اور علی الخصوص نوویل کے بنجمن کے اس مشاہداتی بیان سے ہوتا ہے کہ مسجد دمشق میں جو گھڑی اس نے دیکھی تھی وہ پانی کی نہیں بلکہ اس سے مختلف تھی جیسی کہ آج بھی پائی جاتی ہے۔ نوویل کے بنجمن بارہویں صدی عیسوی میں فلسطین گیا تھا۔ اسی سفر میں اس نے دمشق کی مسجد میں یہ گھڑی دیکھی تھی۔ جامع دمشق کی وہ گھڑی محمد بن علی الخراسانی الساعاتی کی بنائی ہوئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد اس کی دیکھ بھال اور مرمت کا کام اس کے ہونہار اور تجربہ کار بیٹے رضوان الساعاتی کے سپرد ہوا۔ رضوان نے فن گھڑی سازی میں ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ ان تمام شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ فاضل ڈاکٹر برنارڈ کا بیان محض قیاسی ہے اور نوویل کے بنجمن کا بیان مشاہداتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ابن بطوطہ اور اس سے قبل ابن جبیر نے بھی یہ گھڑی دیکھی تھی۔ عموماً فضلائے مغرب، مسلمانوں کی ایجادات و اکتشافات کو ہر ممکن طور پر بلا ثبوت و شواہد رد اور اس کی نفی کرنے میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں۔ اِلّا چند انصاف پسند

فضلا کے۔ گھڑی کا اصل موجد تو ابن فرناس اندلسی حکیم ہے۔ الجاحظ نے اپنی تصنیف "کتاب الحیوان" جو مختلف علوم و فنون کا خزینہ ہے۔ اس میں اس نے سب سے پہلے گھڑی کا ذکر کیا ہے۔ عبدالکریم مہندس کے ذکر میں اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جامع دمشق کی گھڑی کی اس نے اصلاح کی اور اس میں جدت پیدا کی تھی اور اس کی نگرانی اور دیکھ بھال اس کے سپرد تھی جس کے لیے اس کو سرکاری خزانے سے مستقل "وظیفہ" حق الخدمت" ملتا تھا۔

فارابی نے سائنسی اصول اور اس کی درجہ بندی پر اپنی کتاب میں تحقیقاتی نتائج درج کیے ہیں اور مسعود مظاہر نے سائنس کے سلسلے میں ۱۰۲۵ء کے زلزلے اور معدنی تحقیقات کے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ طبیعیات میں ابن سینا کی کتاب "شفاء النفوس" اور فن جر ثقیل میں اس کی کتاب "معیار العقول در علم جر ثقیل" اور خوارزمی کی "مفاتیح العلوم" بھی لائق ذکر ہیں۔

ابو یعقوب بن اسحق الکندی نے آنکھ اور روشنی کے "اعلاف" پر کئی محققانہ رسالے لکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے "کائناتی جیومیٹریکل ماڈل" بنا کر یہ اہم ثبوت فراہم کیے

۱۔ کائناتی جسم کا گول ہونا ضروری ہے
۲۔ زمین کا کسی قدر گول ہونا ضروری ہے اور یہ کائنات کے مرکز میں واقع ہے اور
۳۔ یہ ممکن ہے کہ پانی کی سطح چپٹی ہو۔

ان کاوشوں سے ثابت ہوتا ہے کہ الکندی کتنا طباع ذہین اور فاضل حکیم (سائنس داں) تھا۔ سلمان بن حسان نے لکھا ہے کہ

اسلام میں الکندی کے سوا کوئی شخص "فلسفی" کے لقب سے نہیں پکارا گیا اور بعض حکما نے اس کو ارسطو کا ہم پلہ بتایا ہے۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے قبل، نامناسب نہ ہوگا، اگر اہل مغرب کے چند انصاف پسند فضلا کے خیالات اور اعترافات بھی پیش کر دیے جائیں۔ چنانچہ فاضل موسیو ڈی لامر فرماتے ہیں کہ "یونانیوں میں علم کیمیا کا تجربہ کرنے والا کوئی نہ تھا بر خلاف اس کے عربوں میں سیکڑوں تھے۔" مشہور فرانسیسی فاضل موسیو سدیلو فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں نے ایشیا اور یورپ میں اس وقت علم اور سائنس کی روشنی پھیلائی جب یورپ میں جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔" فاضل استاد ڈیزیکی کا ارشاد ہے کہ نیوٹن سے صدیوں پہلے "قوانین کشش" فضلائے اسلام نے معلوم کر لی تھی۔ فاضل موسیو لی بری فرماتے ہیں کہ "اگر عربوں کا نام تاریخ سے نکال دیا جاتا تو یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ" کئی صدیوں تک پیچھے ہٹ جاتی۔" مشہور مستشرق فاضل کارادی کے چند اقوال ۱۔ "عرب (مسلمانوں) نے سائنس میں واقعی بڑے عظیم کمالات حاصل کیے۔" ۲۔ "وہ روزانہ کی زندگی کے علم الحساب کے موجد بن گئے۔" ۳۔ علم ہیئت میں انہوں نے بہت سے قیمتی مشاہدات کیے"۔

مذکورہ بالا چند اقوال و اعترافات بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کیے گئے ہیں ورنہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق مسلمانوں کے کارناموں کا انصاف پسند دنیا نے برملا اعتراف کیا ہے خصوصاً فاضل مورخ موسیو گستاولی بان کی مشہور کتاب تمدن عرب ان اعترافات اور اظہار حقیقت سے بھری ہوئی ہے۔

اس مضمون میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ تمدن عرب۔ موسیو گستاولی بان۔ ج ۲۔ مترجمہ علامہ امیر علی بلگرامی
۲۔ حکمائے اسلام۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ حصہ اول و دوم
۳۔ قرون وسطی کے مسلمانوں کے علمی کارنامے۔ عبدالرحمٰن خان ۱-۲
۴۔ خیام۔ مولانا سید سلیمان ندوی
۵۔ البیرونی۔ سید حسن برنی
۶ مجلہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی۔ جلد ۱۳ شمارہ ۱-۲ مقالہ اسلامی سائنس کی تاریخ کی تشکیل جدید۔ جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے

اترپردیش کے مزید دس مسلم گرلز انٹر و ہائی اسکولوں میں

بیالیس ۴۲ ہونہار طالبات کو شیروانی انعامات ۱۹۹۰ء

احمد رشید شیروانی

جولائی اگست اور شروع ستمبر تک اترپردیش کے چالیس انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پوزیشن لانے والے ایک سو انتیس ہونہار طلبا و طالبات کو انعامات کی بابت تین رپورٹیں جاری کی جا چکی ہیں۔

اب جیش میں اترپردیش کے ہی دس مسلم گرلز انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پوزیشن حاصل کرنے پر انعام جیتنے والی بیالیس ہونہار طالبات کے نام جن کو الحاج بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ و جیپ انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے دلی دعاؤں کے ساتھ انعامات بھیجے گئے۔

عبدالسلام مسلم گرلز انٹر کالج۔ بھٹی اسٹریٹ مرادآباد

ہائی اسکول: مس کماری ذکیہ پروین سلمہا دو سو پچاس روپیے

مس کماری ناہید صابر سلمہا۔ ایک سو پچاس روپیے

مس کماری قمر آرا سلمہا سو روپیے

انٹر:

مس کماری علیمہ پروین سلمہا دو سو پچاس روپیے

مس کماری عروسہ جمال سلمہا ایک سو پچیس روپیے

مس کماری پروین اختر سلمہا۔ ایک سو پچیس روپیے

اسلامیہ گرلز انٹر کالج۔ بریلی

ہائی اسکول

مس کماری یمن لتا سمین۔ دو سو پچاس روپیے

مس کماری گل ارم سلمہا۔ ایک سو پچاس روپیے

مس کماری گلشن سعید سلمہا۔ سو روپیے۔

انٹر:

مس کماری شبانہ خان سلمہا۔ دو سو پچاس روپیے

مس کماری عظمیٰ جمال سلمہا ایک سو پچیس روپیے

مس کماری تبینہ بیگم سلمہا۔ ایک سو پچیس روپیے

گورنمنٹ گرلز انٹر کالج۔ قلعہ۔ رام پور

ہائی اسکول:

مس کماری رچی گپتا سلمہا۔ دو سو پچاس روپیے

مس کماری دیپالی اگروال سلمہا۔ ایک سو پچیس روپیے

مس کماری مول شری جوہی سلمہا۔ ایک سو پچیس روپیے

انٹر:

مس کماری منیشا سکسینہ سلمہا۔ دو سو پچاس روپیے

مس کماری کلوندر کور رمانا سلمہا ایک سو پچاس روپیے

کناٹ پلیس، نئی دہلی۔

۳- کماری سنگیتا گوئل سلمہا۔ سو روپیے

حمیدیہ گرلز انٹر کالج۔ الہ آباد

ہائی اسکول:

۱- کماری شاہین اختر سلمہا دو سو پچاس روپیے

۲- کماری شبنم پروین سلمہا۔ ایک سو پچاس روپیے

۳- کماری نصرت مہ جبیں سلمہا۔ سو روپیے

انٹر:

۱- کماری قمر النساء سلمہا۔ دو سو پچاس روپیے

۲- کماری شہانہ انجم سلمہا ایک سو پچیس روپیے

۳- کماری شاہدہ مقصود سلمہا۔ ایک سو پچیس روپیے

بھدوہی گرلز انٹر کالج۔ وارانسی

ہائی اسکول

۱- کماری جہاں آرا سلمہا۔ دو سو روپیے

۲- کماری سیما آزاد سلمہا۔ دو سو روپیے

۳- کماری یاسمین بانو سلمہا۔ دو سو روپیے

۴- کماری شریفہ اعجاز سلمہا۔ سو روپیے۔

مندرجہ ذیل اداروں میں ۱ کو دو سو پچاس روپیے، ۲ کو ایک سو پچاس روپیے اور ۳ کو سو روپیے بطور انعام بھیجے گئے۔

امام باڑہ مسلم گرلز انٹر کالج۔ گورکھپور

ہائی اسکول:

۱- کماری شادماں سلمہا۔

۲- کماری نازیہ صدیقی سلمہا

۳- کماری سوانی موہن سلمہا

انٹر:

۱- کماری عظمیٰ کلیم سلمہا

۲- کماری حنا راشد سلمہا

۳- کماری علیہ سلمہا۔

ساجدہ گرلز انٹر کالج۔ جون پور

ہائی اسکول:

۱- کماری جبین نسیم واسلی سلمہا۔

انٹر:

۱- کماری زوبینہ پروین سلمہا

۲- کماری شہلا روبی سلمہا۔

مسلم نسواں ہائر سکنڈری اسکول۔ سیتاپور

۱- کماری عقیلہ بانو سلمہا۔

۲- کماری غزالہ انجم سلمہا۔

۳- کماری طیبہ بانو سلمہا۔

قدوائی بالیکا ہائر سکنڈری اسکول

انہماں شہید - ضلع اعظم گڑھ

۱- کماری سون متی یادو سلمہا

تعلیم گاہِ نسواں انٹر کالج۔ لکھنؤ

ہائی اسکول۔

۱- کماری خدیجۃ الکبریٰ سلمہا۔

گویا اس طرح اب تک اتر پردیش کے پچاس انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں میں ۱۹۹۰ کے بورڈ امتحانات میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ اپنے اپنے ادارے میں پوزیشن لانے والے ایک سو اکہتر ہونہار طلبا و طالبات کے نام پیش کیے جا چکے ہیں۔

ہمارے جن انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں سے اب تک ۱۹۹۰ کے نتائج نہیں بھیجے گئے ہیں، ان کے پرنسپلز اور دیگر ذمہ داران براہ کرم اب جلد از جلد توجہ عنایت فرمائیں۔ اور مزید تاخیر کیے بغیر اب نتیجہ بھیج ہی دیں تو بہتر ہوگا۔

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

D. No.- - - - Bldg Dated- - - - -

TENDER NOTICE

Sealed tenders on percentage item rate basis are invited t be received on 7-5-1991 upto 1 00 P. M. The tender will be opene on the same date at 3 30 P. M. Tender documents can be obtaine from the office of the University Enginer on any working day durin office hours

Sale of tender forms will be stopped 24 hours before the tim for receiving the tenders.

S. No	Name of work	Amount put to tender.	Earnest Money.	Cost of tender	Tin Co tion
	Re-roofing of Lunch Room, Reading Room, Canteen, Games Store and Indoor Games Room in Women's College, A M U. Aligarh.	Rs 1,06,915 -	2,675/-	20/-	Six mo

Estimated based on DSR-1985.

8/29

UNIVERSITY ENGINE

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

D. No.------/Bldg. **Dated.-----**

TENDER NOTICE

Sealed tenders on percentage/item rate basis are invited to be received on 7-5-1991 upto 1.00 P.M. The tender will be opened on the same date at 3-30 P. M. Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during office hours.

Sale of tender forms will be stopped 24 hours before the time for receiving the tenders.

S No	Name of work	Amount put to tender.	Earnest Money.	Cost of tender	Time of Completion.
	Reterracing over roofs of New Lecturer Qtrs. 24 Nos at Zakir Bagh, No. 10 & 7, Shibli Road & No. 4 University Road, PVC office & Servant Qtrs: A.M.U., Aligarh.	1,84,410/-	4,610/-	20/-	four Months

Estimates based on DSR.1985.

12/33

UNIVERSITY ENGINEER

[redacted]

BUILDING DEPARIMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

TENDER NOTICE

Sealed tenders on item rate basis are invited to be received on 27-4-91 upto 1.00 p.m. Tenders will be opened on the same date at 3.00 p.m. Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer, Building Deptt, A.M.U., Aligarh on any working day during office hours i.e. from 9.30 A.M. to 5.00 P.M.

Sale of tender forms will be stopped two days bofore the date for receiving the tender.

Contracters registered in Building Department in Class IInd. and above and the contractors of equivalent class registered in C. P. W. D., P. W. D., M. E. S., Railways and other such Goverment Departments and reputed firms and organisations who have carried out such three works of at least Rs. 15.00 lakhs each are eligible for tendering.

Intending tenderers who are not registered in this Depardment are required to produce proof of works carried out by them satisfactorily, credit worthiness certificats, Income Tax clearance certificate, datails of establishment regarding staff, and tools and plants etc. before tender papers can be issued to them.

S. No	Name of work	Amount put to tender Based on OSR 1989.	Earnest Money	Cost of Tender	Time of Completion.
1.	Construction of Girls Hostel in Womens College campus (Wahaedia Hostel), A.M.U. Aligarh	i) Civil work ii) Water supply & Sanitary Installation	11,30,103/- 98,840/- 12,28,943/-	20,000/-	100/-	six Mth

UNIVERSITY ENGINEER

MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ۱۰ — مئی ۱۹۹۱ء — شمارہ ۵

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

نائب مدیر

شباب الدین

تزئین ... سرفراز * * * * انچارج سرکولیشن ... مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ :
... تہذیب الاخلاق اینڈ نشاعت ،
... مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ
EDITOR : TAHZIB-UL AKHLAQ
ISHAAT
ALIGARH MUSLIM UNIVE

زر سالانہ :
انڈیا ... ... Rs. 45.00
بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک
عام ڈاک US $ 6.00

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ :
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشاعت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ، انڈیا

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق ایڈ
نشانت۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ۔ پریس: ایس کے آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

اداریہ

ہندوستانی قوم ایک بار پھر اضطراب وانتشار کا زہر پینے پر مجبور کردی گئی ہے۔ ہم کو ایک بار پھر اس زہر کو پی کر امرت نکالنا ہے تاکہ ملک میں ایک مستحکم، پروقار اور فعال حکومت کا قیام عمل میں آئے اور افراتفری کا ماحول ختم ہو، ملک پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہو اور ہر شخص اپنا دفاع کرنے کے بجائے خود کو کسی نہ کسی تعمیری اور رفاہی کام کے لیے وقف کردے لیکن اس وقت جو صورت حال ہماری نگاہوں کے سامنے ہے وہ تشویش ناک ہی نہیں بڑی حد تک مایوس کن بھی ہے۔ قومی پریس کی رپورٹوں کے مطابق اس وقت سارے ملک کی دستکار ناجائز اسلحہ فیکٹریوں میں دیسی ساخت کے اسلحے بڑی سرعت کے ساتھ ڈھلے جارہے ہیں اور اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جارہا ہے جس دن ووٹ ڈالے جائیں گے اور ان ناجائز اسلحوں کی مدد سے سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید بنانے کی پرتشدد کوشش ہی نہ ہوگی بلکہ اپنے خیالی منصوبے کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کیا جائے گا چاہے وہ رکاوٹ انسانی جان ہی کیوں نہ ہو۔

کسی بھی جمہوری ملک کے لیے انتخابات عجوبہ نہیں ہوتے۔ مختلف سیاسی افکار وخیالات کی حامل جماعتیں اپنے اپنے منشور عوام کے سامنے پیش کرتی ہیں اور اس بات کی بھی نشان دہی کرتی ہیں کہ اگر ان کی جماعت کو عوام نے حکومت بنانے کا موقع دیا تو وہ ملک کی پیش رفت اور عوام کی راحت کے لیے کیا کیا کریں گی؟ عوام انتہائی ہوش مندی اور سنجیدگی کے ساتھ ہر سیاسی پارٹی کے منشور کا جائزہ لے کر اپنے دل میں یہ بات طے کرلیتے ہیں کہ وہ کس سیاسی پارٹی کو ووٹ دیں گے۔ جس دن انتخاب ہونا ہوتا ہے اس دن لوگ جوق در جوق اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اپنے حق رائے دہی کا خاموشی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور بغیر کسی شورش وہنگامے کا اپنے اپنے کاموں پر یا گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ جو پارٹی جیت جاتی ہے وہ حکومت بنانے کے بعد اپنے منشور کو روبہ عمل لانے کے لیے مستعد ہوجاتی ہے اور حزب مخالف اس بات پر نظر رکھے رہتی ہے کہ حزب اقتدار کے قدم جہاں بھی جادۂ راستی سے ہٹیں وہ اس پر انگلی لگائے، اس طرح ملک پیش رفت کی راہوں پر گامزن رہتا ہے چونکہ ماحول اطمینان اور سکون کا ہوتا ہے اس لیے عوام کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں صرف ملک اور حکومت ہی کا نہیں بلکہ خود عوام کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔

ہم ہندوستانیوں کی ہر بات نرالی ہے اس لیے ہمارے یہاں کے انتخابات بھی دنیا جہان کے انتخابات سے یکسر نرالے ہیں، اس پر متعدد بار انگشت نمائی ہوچکی ہے اور ہم کو متعدد بار اقوام عالم کے روبرو اپنی نگاہیں بھی نیچی کرنی ی ہیں، مگر ہماری بے ڈھنگی رفتار اپنی جگہ اب بھی برقرار ہے۔

مئی ۱۹۹ء میں ہمارے ملک میں جو انتخابات ہونے جارہے ہیں ان میں دو باتیں ایسی نظر آرہی ہیں جو خاص

تشویش ناک ہیں۔ اس وقت دل بدلی کی جو گرم بازاری ہے اس کے خلاف کوئی بھی سیاسی پارٹی آواز اٹھاتی نظر نہیں آتی۔ سب ہی پارٹیاں "بندر بانٹ" سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس لیے دل بدلی کی "مہم" کو جرم نہیں "ضمیر کی آواز" قرار دے کر ساری کی ساری سیاسی پارٹیاں شوق و ذوق کے ساتھ دل بدلی کے زہر کو امرت قرار دے کر پی رہی ہیں حالانکہ سب ہی سیاسی پارٹیوں کو اس بات کا علم ہے کہ یہ سم قاتل رنگ لائے بغیر نہ رہے گا اور کوئی بھی سیاسی پارٹی اس کے مضر اثرات سے بچی نہ رہے گی لیکن وقتی فائدے کی ہوس نے ساری ہی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو اس طرح "اندھا" کر دیا ہے کہ وہ "سورج" جیسی نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی چیز کو بھی نہیں دیکھ پا رہی ہیں۔

اس الیکشن کی دوسری تشویشناک بات ہمارے نزدیک یہ ہے کہ بعض چنبل گھاٹی کے "شہرت یافتہ" افراد بھی بڑی آن بان اور زور شور سے انتخابی میدان میں کود پڑے ہیں۔ اس بات پر تو ہم کو کوئی حیرت نہیں ہے کہ یہ حضرات انتخابات میں حصہ لینے کے درپے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر کہ سیاسی پارٹیاں ان کو اپنے حلقۂ آغوش میں لینے کے لیے کس قدر اضطراب و اضطرار کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ گزشتہ انتخابات میں "قوت بازو" کا جو گھناؤنا مظاہرہ ہو چکا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ "قوت بازو" کے استعمال کے تمام ذرائع پر روک لگانے کی بات کہی جاتی، تمام سیاسی پارٹیاں مل جل کر کوئی ایسا لائحہ عمل مرتب کرتیں کہ اس انتخاب میں گزشتہ انتخاب کی تاریخ نہ دہرائی جائے اور انتخاب جیتنے کے لیے تشدد اور زور زبردستی کا طریقہ نہ اپنایا جائے لیکن حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ وقتی فائدہ حاصل کرنے کے چکر میں گرفتار تمام ہی سیاسی پارٹیاں ایسے لوگوں کو اپنا حلقہ بگوش بنانے کے لیے سرگرم عمل ہیں جن کا کوئی بھی عمل تشدد کی مدد لیے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ جب ایسے افراد انتخاب کے میدان میں کود پڑے ہیں تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس بار کے الکشن میں کیا کچھ دیکھنے کو نہ ملے گا۔

ہم ہندوستانیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد "غیر سیاسی" ہے مگر اس تعداد کی قسمت سیاسی افراد کے عمل اور رد عمل سے اس طرح جذب و پیوست ہے کہ اس کا خود کو "سیاست" سے جدا کر لینا بھی ایک امر محال سا ہے۔ ایسے عالم میں اگر "غیر سیاسی" افراد ہی جبر و تشدد کے خلاف منظم طور پر بلند عزائم کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کر دیں تو شاید حالات میں کچھ اصلاح ہو سکے۔ اس وقت تو صورت حال یہ ہے کہ جدھر نظر اٹھا کر دیکھیے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ روشنی اور امید کی کوئی کرن کہیں سے بھی پھوٹتی نہیں دکھائی دیتی، ہر طرف ایک ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہے کہ خود اپنا وجود بھی مشتبہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے "غیر یقینی" اور "مایوس کن" حالات میں کیا ہوگا۔ اس کی پیشین گوئی کرنے کی شاید ہی کوئی شخص ہمت کر سکے لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے بھی تو نہیں رہ سکتے۔ اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے گھر کو جلتے ہوئے بھی تو نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے اپنی اپنی جگہ پر ہم میں سے ہر شخص کو حالات کو بدلنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ شاید اس طرح بہتری کی کوئی شکل نکل آئے اور ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹنے والوں میں شمار ہونے سے بچ جائیں۔

کبیر احمد جائسی

اُمید

سرسید احمد خانؒ

موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بُری ہو، انسان کے دل کے مشغلہ کو کافی نہیں ہوتی۔ موجودہ رنج و خوشی، محبت و دوستی کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں؛ اسی لئے اس بڑے کاریگر نے، جس نے انسان کے پتلے کو، اپنے ہاتھ سے اور اپنی ہی مانند بنایا اس میں چند اور قوتیں دی ہیں جن کے سبب سے دل کے لیے کاموں کی کبھی کمی نہیں ہوتی در ہمیشہ و ہر وقت دل کے مشغول رہنے کا سامان مہیا اور موجود رہتا ہے۔ انہیں قوتوں کے ذریعے سے گزری ہوئی باتیں پھر دل میں آتیں اور آئندہ کی باتوں کا ان کے ہونے سے بیشتر خیال ہوتا ہے۔

وہ عجیب قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں، ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لیے نہیں ملتی تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بلا لاتی ہے اور اسی کے فکر کے فکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے۔ اس کی مثال جگالی کرنے والے جانوروں کی ہے کہ پہلے تو گھاس دانہ سب کھا لیتے ہیں اور جب ہو چکتا ہے تو ایک کونے میں بیٹھ کر پھر اسی پیٹ میں سے نکال کر چبائے جاتے ہیں۔

جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل میں مشغلہ کو بلا لاتی ہے، اسی طرح ایک اور قوت ہے جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے جس کا نام امید و بیم یا خوف و رجا ہے۔ انہی دونوں قسم کے خیالوں سے ہم آئندہ زمانے تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باتیں کہ دور زمانے میں شاید ہونے والی ہیں اور ظلمات کے پردوں میں چھپی ہوئی ہیں اور بڑے گہرے اندھیرے گڑھوں میں پڑی ہوئی ہیں، ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ ابھی ہو رہی ہیں؛ ان کے ہونے سے پہلے ان کی خوشی یا رنج اٹھانے لگتے ہیں؛ یہاں تک کہ اس زمانے کا بھی، جب نہ یہ زمین ہوگی اور نہ یہ آسمان اور ہر چہار طرف سے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ کی آواز آتی ہوگی، ابھی خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی، صرف موجودہ وقت پر محدود ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ میں اس تحریر میں صرف اسی کا کچھ بیان کروں جس کو امید کہتے ہیں۔ ہماری خوشیاں اس قدر کم اور چند روزہ ہیں کہ اگر وہ قوت ہم میں نہ ہوتی، جس سے انسان ان

عمدہ اور دل خوش کن چیزوں کا ان کے ہونے سے
پہلے مزہ اٹھاتا ہے جن کا کبھی ہو جانا ممکن ہے۔ تو
ہماری زندگی نہایت ہی خراب اور بدمزہ ہوتی۔
ایک شاعر کا قول ہے کہ

"ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے
کی امید رکھنی چاہیے کیوں کہ کوئی چیز
ایسی نہیں ہے جس کی امید نہ ہو سکے
اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہم کو
دے نہ سکے۔"

فارسی زبان کا مشہور قول ہے کہ

"تمنا را عیبے نیست۔"

ایک ظریف نے کہا کہ

"دنیا میں مجھے کسی چیز کا رنج نہیں
ہے، کیوں کہ امید مجھے ہمیشہ خوش
رکھتی ہے۔"

دوستوں نے پوچھا کہ

"کیا تم کو مرنے کا بھی رنج نہیں
ہے؟"

اس نے کہا کہ:

"کیا عجب ہے کہ میں کبھی نہ مروں،
کیوں کہ خدا اس پر بھی قادر ہے کہ
کہ ایک ایسا شخص پیدا کرے جس
کو موت نہ ہو اور مجکو امید ہے کہ
شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔"

یہ قول ایک ظرافت کا تھا مگر سچ یہ ہے کہ زندگی کی امید ہی موت کا رنج ہم سے مٹاتی ہے۔ اگر ہم کو زندگی کی امید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ بدتر حالت کسی کی نہ ہوتی۔

زندگی ایک بے جان چیز کی مانند ہے جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی، امید اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ امید ہی کے سبب سے انسان میں سنجیدگی اور بردباری اور خوش مزاجی کی عادت ہو جاتی ہے، گویا امید انسان کی روح کی جان ہے، ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے اور تمام تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے، محنت پر رغبت دلاتی ہے، اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے۔

امید سے ایک اور بھی فائدہ ہے، جو کچھ کم نہیں ہے، کہ ہم موجودہ خوشیوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے اور اسی میں محو نہیں ہو جاتے۔ سیزر (قیصر روم) نے جب اپنا تمام مال و اسباب اپنے دوستوں کو بانٹ دیا تو اس سے لوگوں نے پوچھا کہ،

"آپ نے اپنے لیے کیا رکھا؟"

اس نے کہا کہ

"امید۔"

اس کی عالی طبیعت ان چیزوں کی کچھ قدر نہیں کرتی تھی جو اس کے پاس تھیں بلکہ ہمیشہ اس کا خیال کسی بہتر چیز کی طرف رہتا تھا۔

اگلے زمانے کے لوگ بغیر امید کی زندگی کو نہایت ہی برا سمجھتے تھے۔ نقل ہے کہ خدا نے انسان کے پاس ایک صندوقچہ بھجوایا۔ جب اس کو کھولا تو اس میں سے ہر ایک قسم کی بلائیں اور مصیبتیں اور بیماریاں جو انسان کو ہوتی ہیں سب نکل پڑیں۔ امید بھی اسی صندوقچہ میں تھی وہ نہ نکلی بلکہ ڈھکنے سے چمٹ رہی اور صندوقچہ ہی میں بند

ہوگئی۔ تاکہ مصیبت کے وقت انسان کو تسلی دے۔

پس! جس زندگی میں امید ہے اس سے بڑھ کر کوئی خوش زندگی نہیں ہے، خصوصاً جب کہ امید ایک عمدہ چیز کی اور اچھی بنا پر ہو، اور ایسی چیز کی ہو جو امید کرنے والے کو حقیقت میں خوش کر سکتی ہو۔ اس بات کی حقیقت وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خوش حال آدمی کے لیے بھی زمانہ موجودہ میں کافی خوشی نہیں ہے۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مذہبی زندگی میں عمدہ عمدہ چیزوں کی بہت سی امیدیں ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں کی ہوتی ہیں جو ہم کو پورا پورا خوش کر سکتی ہیں۔ بلاشبہ امید کے ثمرے انسان کی زندگی نہایت شیریں ہو جاتی ہے۔ اگر وہ موجودہ حالت سے خوش نہیں رہتا تو اس پر صبر تو ضرور آجاتا ہے مگر مذہبی امیدیں اس سے بھی زیادہ فائدہ مند ہیں کیوں کہ ان میں عقل کے علاوہ مذہبی اعتقاد کی بھی نہایت قوت ہوتی ہے۔ مذہبی امید گویا مردہ کو زندہ کر دیتی ہے۔

میں ہمیشہ خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہوں۔ وہ میری دائیں طرف ہے، اسی لیے میں گھبراتا نہیں۔ میرا دل خوش ہے۔ میرا گوشت بھی اس امید میں رہے گا کہ تو میری روح کو جہنم میں نہ ڈالے! تو اپنی چیز کو خراب ہوتے ہوئے نہ دیکھے گا! تو ہی مجھ کو زندگی کے طریق دکھلائے گا! تیری ہی حضور میں خوشی کا کمال ہے! تیری ہی دائیں طرف ہمیشہ کی خوشی ہے۔

آمین!!

دنیا کی حسین ترین چیز جس کا ہم تجربہ کر سکتے ہیں پر اسراریت ہے یہی تمام علوم و فنون کا منبع ہے وہ شخص جو اس جذبے کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے، جو سے جسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور حیران و متحیر ہونا نہیں جانتا وہ بالکل مردہ ہے، اس کی آنکھیں بند ہیں۔"

آئن سٹائن

توازن

سید حامد ▽

ایک لمحہ کی غفلت سو سال پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ صدیاں گزریں جب شاعر نے یہ بات کہی تھی۔ اس وقت زندگی نسبتاً خوش خرام تھی اور اب پرشور سامان ہے اور تیز رو۔ اب یہ بات پہلے سے بھی زیادہ صادق آتی ہے۔ لہٰذا یہ مشورہ باطل ہے کہ زندگی کی بہرے فرد کو کاٹ لو تاوقتیکہ تعلیم کی کمی دور کرنے اور تعمیر کی تکمیل کرنے کے بعد زندگی کی دوڑ میں شرکت کے لائق ہو جاتے ہو۔ جماعت یا ملت ایک فرد تو نہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتی ہو۔ اور یوں تو فرد کو بھی اپنی نشو و نما کے لیے ایک ایک وقت میں بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ذہن کی جلا، جسم کی توانائی، روح کی پاکیزگی، دل کی وسعت سب ہی کی طرف دھیان دینا پڑتا ہے۔ کوئی سلیم الطبع، کوئی بھی ذی شعور آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ پانچ سال تک میں بس مشغلہ صرف ذہن پر صیقل کرنا ہوگا۔ وہ اپنے جسم کی پرداخت اور اپنی روح کے بلوغ کو تھوڑی دیر کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جب فرد کا یہ عالم ہے تو ملت کو کس قدر کثیر المشاغل ہونا پڑے گا۔ ملت کی بقا اسی میں ہے کہ وہ سارے ضروری مشاغل کو بہ یک وقت قابلیت، ہم آہنگی، توازن اور اعتماد کے ساتھ انجام دے۔ اگر وہ صرف تعلیم کے محاذ کو لے کر بیٹھ گئی، یا صرف معاشرے کی اصلاح یا محض اقتصادی بہتری سے عہدہ برآنے کو مدعائے حیات سمجھ بیٹھی اور اس نے اپنے حقوق کو حاصل کرنے اور سیاست میں دوسروں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی کوشش نہیں کی تو وہ حقوق سے تو محروم رہ ہی جائے گی، اسے تعلیم حاصل کرنے کے معقول اور تازہ ترین مواقع بھی نہیں ملیں گے اور معاشرے کی اصلاح اور اقتصادی بہتری اس کی دسترس سے دن بہ دن دور ہوتی چلی جائے گی۔

ملت دراصل ایک نامیاتی وحدت ہے۔ اس کی بقا اور فلاح اسی میں ہے کہ جسم و دماغ، روح اور شعور کے سارے اعمال جاری رہیں، کوئی بند نہ ہو، کسی کو معطل نہ کیا جائے، کسی کو دوسرے پر فوقیت نہ ہو۔ فکر اور غور و خوض کرتے وقت دوران خون کا عمل بھی جاری رہتا ہے، سانس کا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے، اسی وقت غذا جسم میں داخل ہوتی رہتی ہے جزو بدن بنتی چلی جاتی ہے۔ اسی وقت حواس خارجی دنیا کے حوادث و تجربات کے لیے اپنی کھڑکیاں کھولے ہیں اور جیوں ہی انھوں نے کھڑکیوں میں قدم رکھا ہونا

▽ سابق وائس چانسلر، اے ایم یو۔ علی گڑھ۔ ——— ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

اور پیاموں کا ایک سلسلہ دماغ کی طرف رہسپار ہو گیا۔ دماغ ان کی پہچان کرتا ہے، انھیں چھانتا ہے، چھانٹتا ہے اور پھر حسب ضرورت مناسب احکام صادر کرتا ہے۔

زندگی عبارت ہی دراصل متعدد اعمال کو بہ یک وقت آہنگ اور ترتیب کے ساتھ انجام دینے سے ہے۔ ترتیب ٹوٹی، یا کوئی ایک عمل رک گیا تو زندگی کا توازن برہم ہو جاتا ہے۔ اگر صرف دماغ کو تعلیم سے سنوارا گیا اور جسم کو نظرانداز کر دیا گیا تو جسم سوکھ جائے گا، بے نشوونما رہ جائے گا اور بالآخر دماغ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

سیاست مہذب زندگی کا ایک ضروری عمل ہے۔ اس کے پاکیزہ عمل ہونے سے تو انکار کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی اہمیت، تسلسل اور سخت گیری کا انکار کسی ذی ہوش انسان کے لیے ممکن نہیں۔ ہمیں اس کی ہمہ گیری کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ وہ اس ہوا کی طرح ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ ہوا میں آلودگی ہے، یہ ماننا پڑے گا، لیکن اس بنا پر اس میں سرے سے سانس ہی نہ لی جائے ایسا مشورہ خودکشی کی تبلیغ کرنے کے علاوہ کون دے سکتا ہے۔ مسلمانان ہند کے لیے نسخۂ کیمیا کنارہ کشی نہیں ہے، نہ گھر میں بیٹھ کر اپنی کمزوریوں کو دور کرنا ہے اور پھر جب کمزوریاں دور ہو جائیں تو رزم گاہ حیات میں با کودنا ہے۔ جی نہیں ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ منصوبہ تو ناممکن العمل ہے۔ زندگی کا سارا ساز حرکت کے لیے وضع ہوا ہے۔ زندگی کی بقا مقابلہ پر منحصر ہے۔ مقابلہ زندگی کی رگوں میں لہو کی طرح رواں ہے۔ جہد بقا اور بقائے اصلح چارلس ڈارون کی اختراعات نہیں ہیں، یہ اتنی ہی قدیم ایسی ہی دائم و قائم ہیں جتنی خود حیات ہے۔ ڈارون نے ان حقیقتوں کا انکشاف کیا، انھیں نظریہ کی شکل دی۔ یہ کہنا کہ سیاست کو ترک کر دو اور تعلیم میں رتن تک جاؤ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دوران خون بند کر دو، صرف سانس لیتے رہو یا غور و فکر میں مگن رہو اور جسم کو بھلا دو یا گھلا دو یا حواس کی کھڑکیاں بند کر دو اور ضمیر کا دروازہ کھول دو۔ سارے افعال، سارے عمل آپس میں گتھے ہوئے ہیں؛ ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ نشوونما اور پیش رفت، ان سب کو توازن کے ساتھ گرم عمل رکھنے میں ہے۔

اس تشریح سے مدعا یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت سورج سے زیادہ واضح ہے۔ پیچھے رہنا، سڑک کی پٹری پر پڑ جانا، گھسٹ گھسٹ کر چلنا یا چلنے سے انکار کر دینا، یہ ساری باتیں شرم ناک ہیں۔ اگر غیرت کی کوئی رمق باقی ہے، عزت نفس سے کوئی سروکار باقی رہ گیا ہے تو مقابلے کے لیے تیار ہونا پڑے گا، بے تاب ہونا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح بے تاب، اسی طرح تنا ہوا، اسی طرح مضطرب جیسے دوڑ شروع ہونے سے پہلے گھوڑا ہوتا ہے۔ مقابلہ زندگی کا دوسرا نام ہے، حرکت جینے کی علامت ہے، ریاضت ملت کو تاب و تواں عطا کرتی ہے۔ سرافرازی انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔ انسان تو انسان پیڑ بھی سر اٹھائے ہوئے بڑھتے ہیں۔ اسی طرح نگاہوں پر چڑھتے ہیں۔

زندگی اور سرافرازی کا سرچشمہ توازن ہے، ریاضت ہے، مقابلہ ہے۔ زندگی صرف عناصر میں ظہور ترتیب ہی نہیں، قوا اور اعضا صلاحیتوں اور حرکات کی ہم آہنگی بھی ہے۔ زندگی نشوونما ہے پیش رفت ہے، زندگی کا قافلہ دائم سفر میں رہتا ہے۔ اس کے لیے حرکت ضروری ہے اور سمت کا تعین بھی۔ زندگی اپنے لیے نشوونما اور حرکت اتنے عناصر سے اخذ کرتی ہے کہ اگر انھیں ایک مدار یا آربٹ میں نہ ڈالے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ جو بات کشش ثقل اجرام فلکی

کے ساتھ کرتی ہے وہی کام توازن افراد اور اقوام کے ساتھ کرتا ہے۔ توازن کا مفہوم ہی یہ ہے کہ تمام اجزاء، تمام صلاحیتوں، تمام طاقتوں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے حرکت میں رکھتے ہوئے وزن دینا اس طرح سے کہ انفرادی اور اجتماعی کے درمیان ایک صحت مند اور جیتا جاگتا تعلق برقرار رہے۔

افراد اور گروہ دونوں کی صحت، بقا اور نشو و نما اور پیشرفت کے لیے اگر کوئی نسخۂ کیمیا ہے تو وہ توازن ہے جسے اعتدال کا نام بھی دیا گیا ہے۔ لیکن توازن میں اعتدال کے ماورا انصاف، ہم آہنگی اور اشتراکِ عمل کا مفہوم بھی آجاتا ہے۔ زندگی کا جہاں تک تعلق ہے، توازن کے لیے ہمہ جہت پیش رفت اور پیہم ریاضت اور توانائی کی عادلانہ تقسیم درکار ہوتی ہے۔ حرکت اور توازن کا باہمی رشتہ بہت مضبوط ہے۔ ستارہ کو حرکت سے محروم کر دیجیے وہ توازن کھو بیٹھے گا، ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ سائیکل کو حرکت سے روک دیجیے وہ گر جائے گی۔ حرکت اور توازن کو ایک دوسرے سے الگ کرنا! گوشت سے ناخن کو جدا کرنا ہے۔ آپ نے اس کار کے موٹر یا انجن کو جسے تیل یا کرنٹ تناسب سے نہ مل رہی ہو جھٹکے لیتے دیکھا ہوگا۔ وہ جماعت جو آرام طلب ہو جاتی ہے سرگرم عمل نہیں رہتی وہ کار کے ہچکیاں لیتے ہوئے انجن کی کی طرح ہے کہ اب رکا اب رکا۔ توازن، عدل اور حرکت دونوں کا تقاضہ کرتا ہے! بقا اور نشو و نما دونوں کے لیے یہ کلیہ ہے۔

" یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا
اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین
رکھنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے
اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین
نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پس اگر
تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس
امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی
علم اور اسلام) کا نمونہ ہوگے اور
جبھی ہماری قوم کی عزت ہوگی!

سرسید"

آؤ پھر عہد وفا تازہ کریں

یہ خطبہ عید الفطر کے موقع پر اے ایم یو کی جامع مسجد میں دیا گیا

محمد مسعود عالم قاسمی *

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

مسلمان بھائیو!

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے رمضان المبارک کا ایک اور مہینہ اور عید سعید کا ایک اور موقع عنایت فرمایا۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے سارے مسلمانوں کے روزے، نماز، تلاوت اور اعمال حسنات قبول فرمائے اور تمام مسلمانوں کو عید الفطر کی خوشیاں عطا کرے۔ (آمین)

یہ عید سعید جو ہر سال رحمتوں اور مسرتوں کا پیام لے کر آتی ہے، نہایت خاموشی اور رازداری سے ہم سب کے لیے ایک لمحۂ فکر بھی چھوڑ جاتی ہے، یہ لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے احتساب ذات کا لمحہ ہوتا ہے جو احتساب کائنات کی منزل ہے۔ یہ تلافیٔ مافات کا لمحہ ہوتا ہے جو ترقی و ...ی کے لیے شرط اولین ہے اور یہ اللہ سے کیے گئے ...و پیمان کی تجدید و تازگی کا لمحہ ہوتا ہے جس پر دین و ... کی سعادت منحصر ہے۔ جو بھی شخص لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا صدق دل سے اقرار اور زبان سے کرتا ہے وہ بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ سے ایک معاہدہ ... ہے جس میں اپنی طرف سے وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ

"إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي
لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ
أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ" (الانعام ۱۶۲-۱۶۳)

[میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں]

اور خدا کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے

"فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ
بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" (النحل ۹۷)

[ہم اسے دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں ان کو ان کے بہترین اعمال کے مطابق اجر عطا کریں گے]۔

اس معاہدے کی رو سے ہر انسان اللہ کا بندہ اور بہ وقتی غلام ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنے عہد و پیمان کی پاسداری کریں، اپنے میثاق کو نبھائیں، نہ اسے پامال کریں اور نہ فراموش کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

* ناظم دینیات (سنی) اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

"وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ إِذَا عَاهَدْتُّمْ
وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَ
قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي
نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا
تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ
تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ

(النحل ۹۲-۹۱)

[اللہ کے عہد کو پورا کرو کہ جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو۔ جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے اور تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ذریعہ بناتے ہو اس لیے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے طاقت میں بڑھ چڑھ گیا ہے۔]

اللہ تعالیٰ خبردار کرتا ہے کہ تم نے جو عہد اللہ سے ایمان، اطاعت، تقویٰ، عدل و احسان، استقامت اخلاق، کردار، راست بازی اور بیدباری کا کیا ہے اس پر ڈٹے رہو، ہرگز اس سے پیچھے نہ ہٹو اور نہ اس عورت کی طرح بے وقوف ہو جاؤ جو دن بھر محنت و مشقت سے سوت کاتتی ہے اور پھر خود ہی اسے ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیتی ہے۔ اس طرح ایک لغو اور بے نتیجہ عمل میں اس کی توانائی ضائع ہو جاتی ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہر سال اس لیے آتا ہے کہ مومن اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرنے کی بھرپور تربیت حاصل کرے۔ نماز تراویح میں پورا قرآن اس لیے پڑھا جاتا ہے تاکہ مسلمان اللہ کے حکم اور وعدہ وعید کو سن اور سمجھ لے۔ شب قدر اس لیے آتی ہے کہ اس عہد و پیمان کو پورا کرنے میں اس نے جو کمی اور کوتاہی کی ہے اس پر نادم و پشیمان ہو کر توبہ و استغفار اور انابت و اخبات میں لگ جائے۔ گویا رمضان کا مبارک مہینہ اللہ سے کیے گئے عہد و پیمان کی تجدید کا مہینہ ہے اور صلوٰۃ الفطر اس تجدید عہد کا سجدۂ شکر ہے۔

سجدۂ شکر کے اس موقع پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب ہر مسلمان کو اپنے وجود، اپنے ضمیر اور اپنے دل سے حاصل کرنا ہے۔

کیا اس نے اللہ سے کیا ہوا عہد یاد کر لیا ہے؟
کیا وہ اس عہد کو پورا کرنے کے لیے تیار ہے؟
کیا وہ اس عہد کو اپنے مفادات، تعلقات، آل و اولاد اور موت و حیات سے زیادہ اہمیت دیتا ہے،
اگر ہاں تو ایسے خوش نصیب مسلمانوں کے لیے ایک ہی عید نہیں بلکہ

ع ہر روز روز عید ہے ہر شب شب برات

لیکن اگر معاملہ یہ ہے کہ اب بھی ہمیں اللہ کا میثاق یاد نہیں، اب بھی ہم اس میثاق کی پاسداری میں ناکامی پر پشیمان نہیں اور اب بھی ہم اس میثاق کو پورا کرنے کے لیے جی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار نہیں تو یاد رکھیے رمضان کا مقدس مہینہ آئے گا چلا جائے گا، قرآن پڑھا جائے گا ختم ہو جائے گا، عید آئے گی گزر جائے گی مگر ہماری قسمت اس سنگلاخ اور بنجر زمین سے مختلف نہ ہوگی جس میں نہ ہلکی پھوار سے نمی آتی ہے اور نہ موسلا دھار بارش ہی اس میں شادابی اور سیرابی لاتی ہے۔ ایسی بنجر زمین آدمیوں اور مویشیوں کے لیے غذا د

ہمارہ تو کیا اخلاق خسیس اور بےحیائی ہے۔

قرآن اس عہد وپیمان کو یاد دلانے اور اس کی وفاداری کی تاکید کرنے کے بعد ایک چونکا دینے والی بات کہتا ہے۔ ارشاد ہے:

"وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوءَ بِمَا صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ"

(النحل ۹۴)

[اور اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بناؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم کو اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ میں روکا برے نتیجے کا مزہ چکھنا پڑے اور بڑے عذاب کے سزاوار ہو] -

یعنی باہمی تعلقات اور معاملات میں بھی عہد وپیمان اور قول وقرار کا پورا پاس ولحاظ رکھو اور اپنی قسموں کو دھوکہ دہی اور مکر وفریب کے لیے استعمال نہ کرو کیونکہ جب تم اپنی قسم توڑو گے اور ایفائے عہد کا دامن ہاتھ سے چھوڑو گے تو نہ صرف تمہارا اعتبار اٹھ جائے گا بلکہ تمہارے دین کا وقار بھی مجروح ہو جائے گا اور تمہیں صرف بدعہدی اور حلف شکنی کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ دین کی غلط تصویر بنانے اور راہ خدا سے روکنے کی بھی سزا دی جائے گی۔ گویا اللہ تعالے مسلمانوں کو آگاہ کرتا ہے کہ تم اپنی غلط حرکتوں سے دوسروں کو اسلام سے روکنے کا ذریعہ نہ بنو۔ تم ایسی کوئی غیر اخلاقی اور غیر دینی حرکت نہ کرو جس سے اسلام پر جما ہوا قدم اکھڑ جائے یا اسلام کی طرف اٹھتا ہوا قدم رک جائے۔ لیکن ذرا پلٹ کر اپنی قوم کے افراد کی دینی واخلاقی حالت پر نظر ڈالیے کتنی جرأت وجسارت کے ساتھ ہم اپنے غلط کاموں کے ذریعے خدا کے دین سے روکنے کا ذریعہ بنتے جا رہے ہیں۔ کوئی برائی، کوئی گناہ اور کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس میں دنیا کی دوسری منحرف اور مبتذل قومیں اگر مبتلا ہیں تو ہم مسلمان اس سے الگ ہیں۔ جھوٹ، دھوکہ، فریب، خیانت، غیبت، چغلی، کینہ پروری، حسد، بدکاری، بے حیائی، شراب نوشی، حرام خوری، کام چوری، سود، جوا، بدعہدی، بدظنی، راہزنی، لوٹ مار، کسب وقسم، رشوت، ظلم وتعدی، دست درازی، مردم آزاری، سیاسی چالبازی، غداری اور اس طرح کے اخلاقی جرائم میں ملوث لوگوں کی جو بھی طویل یا مختصر فہرست بنائی جائے اس میں ہم مسلمان ضرور مل جائیں گے، یہاں تک کہ وہ برائیاں بھی ہماری سوسائٹی میں موجود ہیں جن کے ارتکاب کے باعث سابقہ امتیں عذاب الٰہی کی مستحق ٹھہری تھیں۔

غور کیجیے کہ ایک غیر مسلم جو مسلمانوں کے پاس پڑوس میں رہتا ہے، دن رات ہماری حرکات پر جس کی نظر ہے، جو ہمارے معاملات اور کاروبار میں شریک ہے، جو ہمارے سفر کا ساتھی ہے، جو ہماری مجلس و ملاقات اور نشست وبرخاست سے تعلق رکھتا ہے وہ ہماری موجودہ حالت کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ہم غیر مسلم جن برائیوں کا شکار ہیں یہ مسلمان بھی ان میں مبتلا ہیں تو بھلا ہم میں اور ان میں فرق کس بات کا ہے اور اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو ہمارے اندر کون سی تبدیلی آجائے گی۔ ہندوپاک اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی اکثریت اس نسل سے تعلق رکھتی ہے جو ظلمات کفر میں تھی یا کفر سے نکل کر دامن اسلام میں آگئی تھی۔ اس مذہبی سفر کے بعد بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے طرز فکر

اور طرز حیات میں، افکار و اعمال میں، اخلاق و کردار میں، معاملات اور رویوں میں، تہذیب اور تمدن میں واضح فرق نظر نہیں آتا تو برادران وطن کے اس دعویٰ کی کیوں کر تردید ہو سکتی ہے کہ :

"اے مسلمانو! تم ہندو آباد اجداد کی اولاد ہو، تم اسلام کا نام لے کر ہم سے الگ ہو گئے تھے مگر ہم میں اور تم میں نام کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں ہے اس لیے اپنے آباد اجداد کے مذہب میں واپس آجاؤ۔"

ہاں ذرا سنجیدگی سے سوچیے! کیا اپنے اخلاق و کردار اور طرز حیات کی غیر اسلامی تصویر پیش کر کے ہم دنیا کے انسانوں کو اللہ کے دین سے روکنے کا دانستہ یا نادانستہ ذریعہ نہیں ثابت ہو رہے ہیں اور اس کے بدلے میں وہ بُرا نتیجہ ہم نہیں بھگت رہے ہیں۔ قرآن جس کی وعید کر چکا ہے۔ کیا ہمارے اس جرم نے ہم خیر امت کو شر اُمت کی صف میں کھڑا نہیں کر دیا ہے۔ کیا ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہمارے خلاف سازش کے جال بچھائے نہیں گئے ہیں۔ کیا ہماری دولت کو ہمارے خلاف استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ کیا ہمیں باہم ٹکرایا نہیں جا رہا ہے۔ کیا ہمارا مال اور خون پانی کی طرح ارزاں نہیں ہو چکا ہے۔ کیا شاہراہ ترقی سے ہم پیچھے نہیں آگئے ہیں۔ کیا ہمارے گرد ذہنی و سیاسی غلامی کا حصار تنگ نہیں ہو رہا ہے، کیا ہمارا اجتماعی شیرازہ منتشر نہیں ہو چکا ہے۔ کیا ہماری آواز بے اثر اور ہماری تعداد بے وزن ہو کر نہیں رہ گئی ہے اور کیا ہم ذلت و پستی کی طرف مائل نہیں ہیں؟ تو پھر کیا یہ بِمَا صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہ کے قدرتی نتائج نہیں ہیں؟ جب بھی ہلال عید نظر آتا ہے تو شاعر مشرق کو ہماری یہی حالت یاد آتی ہے ؎

غرۂ شوال اے نور نگاہ روزہ دار
آ کہ تھے تیرے لیے مسلم سراپا انتظار
اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے
قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ ان کی گرفتاری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

ان کربناک حالات سے نکلنے کی اگر کوئی راہ باقی ہے تو صرف ایک ہے وہ دینی اور اخلاقی، سماجی اور سیاسی بگاڑ کی اصلاح اور پاکیزگی ہے اسی نقطے میں عظمت کا راز پنہاں ہے۔

بلاشبہ اسلام اللہ کا آخری اور پسندیدہ مذہب ہے۔ اس لیے اس میں رہتی دنیا کی رہنمائی کی صلاحیت اور اسے فیض یاب کرنے کی قوت موجود ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام اپنی اس قوت کی بدولت ہی قوموں اور گروہوں کے قلب و ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ اسلام کی اثر انگیزی جیرت ناک ہے اور قبول اسلام کے واقعات کا جو سلسلہ چودہ صدی پیشتر شروع ہوا تھا آج تک جاری ہے مگر آج مشرق و مغرب میں قبول اسلام کے انفرادی و اجتماعی واقعات کے پیچھے داعیانِ اسلام کی کوششیں کم اور اسلام کی تسخیری طاقت زیادہ کار فرما ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پاک نفوس اصحابؓ نے دنیا کو نہ اپنی تعداد سے متاثر کیا تھا اور نہ اپنی تلوار سے۔ لوگوں کو پیش کرنے کے لیے ان کے پاس جو چیز تھی وہ دعوت ایمان کے ساتھ اخلاق و کردار کی بیش قیمت دولت تھی۔ اس وقت ہمارے پاس تعداد بھی ہے اور تلوار بھی (اگرچہ کند سہی) مگر سیرت و کردار

کی مطلوبہ دولت نہیں۔ اس لیے اسلام کی حقانیت، صداقت،
خوبیوں اور محاسن کے اعتراف کے باوجود بہت سے
لوگوں کے قبولِ اسلام میں ہمارا غیر اسلامی رویہ اونچی
دیوار کی طرح حائل ہو جاتا ہے اور اسلام کی طرف
بڑھتے قدم ہمارے اخلاقی بگاڑ کی وجہ سے رُک
جاتے ہیں۔

اس عید سعید کے موقع پر آیئے تجدید
عہد کریں کہ

ہم اس دیوار کو ڈھائیں گے۔
ہم اپنے آپ اور اپنے سماج کو اسلام
کی تصویر بنائیں گے اور صرف یہی تصویر دنیا کی غیر مسلم
اکثریت کو دکھائیں گے ؎

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا
اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ
وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ

"جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور
زینت و آرائش ہے اور تمہارے آپس میں
فخر و ستائش اور مال و اولاد کی ایک دوسرے
سے زیادہ طلب ہے (اس کی مثال ایسی ہے)
جیسے بارش کے نتیجے میں کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی
ہے، پھر وہ خوب زور پر آتی ہے پھر تو دیکھتا ہے
کہ وہ زرد پڑ جاتی ہے۔ پھر چورا چورا ہو جاتی ہے
اور آخرت میں کافروں کے لیے عذاب شدید اور
مومنوں کے لیے خدا کی طرف سے بخشش اور
خوشنودی ہے۔"

(سورۃ الحدید)

تعلیم

ریاض الدین احمد *

آج ہم قطر کے تعلیمی حالات کا کچھ ذکر کریں گے مگر پہلے ہوسٹن (Houston) چلتے ہیں جہاں ہماری پیاری بیٹی صوفیہ کمال نے تعلیمی مقابلے میں پورے صوبہ ٹکساس (Teksas) میں اول مقام حاصل کیا ہے اور اب ریاست ٹکساس کے صدر مقام آسٹن (Austin) جاکر اپنا انعام حاصل کرنے والی ہے۔ دوسرا انعام اس کو خود اپنے شہر ہوسٹن میں پیش کیا جائے گا جس کے لیے اس نے صوبائی اعزاز کمایا ہے۔ اس سے پہلے اسے اعلیٰ تعلیمی کارکردگی کے لیے ایک سرٹیفکٹ سابق صدر امریکہ ریگن کے دستخطوں سے مل چکا ہے مگر سب سے پہلے اس نے اللہ جل شانہٗ کے دربار سے قرأۃ القرآن کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور ۸ سال کی عمر میں ہمارے خاندان کی سب سے پہلی قاریہ بن گئی اور برکتوں کا خزانہ لے کر زندگی کے نئی ذینے چڑھنے لگی۔ دعا ہے کہ تا عمر اس سرزمین کفر میں ایمان کی شمع جلاتی رہے۔ ہم نے سنا ہے کہ اولاد کا قرآن والدین کے لیے باعث نجات بنتا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ پڑھنے میں آیا کہ انھوں نے اپنے عالم بیٹے کو بلا کر فرمایا میں نے تم کو عالم بنایا تمہاری فلاح کے لیے اس علم کا حق ادا کرنا مگر قرآن پڑھایا اپنی نجات کے لیے، میری اس امانت کو سینے سے لگائے رکھنا۔ تو اب مجھے یقین آرہا ہے کہ صوفیہ کا کمال اس کے مرحوم نانا کی روح کے لیے باعث طمانیت ہوگا اور اس پیاری بچی کا قرآن اس کے لیے اور دادا دادی کے لیے باعث نجات ہوگا۔ جو بھی نجات کا طالب ہو اسے اپنی اولاد کو قرآن پڑھانا چاہیے۔

آئیے اب دوحہ چلیں۔ یہ دولت قطر کا صدر مقام ہے۔ یہاں کی ترقیات کو ہم اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کی آزادی کی عمر نے ابھی دو دہائی بھی پوری نہیں کی ہے خلیج عرب کے وسط میں یہ ایک جزیرہ نما ، ۱۴۳ ہزار مربع کلومیٹر رقبے کا ہے۔ یہاں کی کل آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔ حکومت تعلیم کی طرف کافی توجہ دے رہی ہے۔ قطری طلبا کے لیے مفت تعلیمی انتظام کے علاوہ کتابیں، تعلیمی ضروریات کی مختلف چیزیں، سواری کا کمل کا لباس سب مفت ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ترغیبات مثلاً انعامات، تعلیمی سفر کی سہولتیں، وظیفے، بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات کی فراہمی وغیرہ کثیر مقدار میں موجود ہیں مگر سب سے زیادہ طرفہ جو تصویر نظر آرہی ہے وہ تعلیمی میدان میں لڑکیوں کا حصہ ہے۔ دن کے اسکولوں

---

* حال مقیم الدوحہ، قطر

میں طلبا، اور طالبات کی مجموعی تعداد ۲۶،۹۱۱ ہے۔ اس میں تقریباً نصف لڑکیاں ہیں۔ ثانوی سطح پر سائنس پڑھنے والی قطری لڑکیوں کی تعداد ۱۹۳ اور لڑکوں کی ۱۶۱ ہے آرٹس کے درجات میں لڑکیاں بہت آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ ۱۵۰۰ میں ۵۲۹ لڑکیاں ہیں اور باقی لڑکے۔ قطر یونیورسٹی میں لڑکیوں نے دھوم مچا رکھی ہے۔ یہاں ان کی تعداد ۳،۶۴۴ ہے جب کہ لڑکے صرف ۱۰۰۳ ہیں۔ غیر ممالک میں جاکر تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کے لیے ذرا مشکل ہے لیکن اس سطح پر بھی ۱۱۸۰ میں ۳۰۷ لڑکیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں ہر ملک کے سفارتی انتظام کے تحت تقریباً ۱۱۱ اسکول چل رہے ہیں۔ ان میں بھی لڑکیاں بھاری تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں یعنی ۱۶،۵۲۵ میں لڑکیاں ۱۲،۴۰۵ ہیں۔ ان اعداد سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس ملک کی تعلیمی ترقیات میں خواتین ایک کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔ مذہبیات میں بھی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں لڑکیاں ۳۹۰ ہیں جب کہ لڑکے ۱۱۱۔ شعبۂ تعلیمات میں ان کی تعداد ۵۱۳ رہی ہے جب کہ لڑکے صرف ۵۴ ہیں۔ یہاں تک کہ شعبہ ایڈمنسٹریشن میں لڑکیاں ۱۳۰ ہیں اور لڑکے ۱۱۰۔ مگر ثانوی سطح کے خالص مذہبی اداروں میں جن کی تعداد نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ لڑکیوں کا کوئی داخلہ نہیں ہے۔ حالانکہ قطر کی وزارت نظم و نسق میں خواتین کی تعداد ۲،۲۹۸ ہے جو مجموعی تعداد کی ۵۰۸،۴۴ فیصدی ہے۔ اس کے برخلاف وزارت تعلیمات میں خواتین صرف ۸ فیصدی ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قطری خواتین اسکولوں کی چہار دیواری میں محبوس رہنے کے بجائے اب کھلی دنیا میں قدم اٹھانا چاہتی ہے۔

یہاں کی کثیر الاقوام برادریوں نے اپنی اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے ثانوی سطح کے پرائیویٹ اسکول کھول رکھے ہیں۔ ان میں دو ہندوستانی اسکول ہیں۔ ایک مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کیرالہ کا ایم۔ ای۔ ایس کے نام سے ہے دوسرا انڈین آئیڈیل اسکول کے نام سے مشہور ہے تعریف ہے کیرالہ مسلم سوسائٹی کی کہ انھوں نے اس دور افتادہ مقام پر اپنے عزم کا جھنڈا گاڑ دیا ہے ان کے پاس ایک وسیع عمارت ہے جو چار ہزار بچوں کے لیے اب چھوٹی پڑ رہی ہے۔ چالیس بسیں ہیں جو بچوں کو روزانہ لاتی اور لے جاتی ہیں اور اساتذہ کی ایک فوج ہر چند کہ درجات میں بچے معیاری تعداد سے کہیں زیادہ ہیں اور کمرے بھی روز افزوں تعداد کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں مگر بچے جو مرکزی تعلیمی بورڈ کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں سو فیصد کامیاب ہو رہے ہیں۔ یہاں فیس بھی کم ہی ہے یعنی ۴،۵۰۰ ریال سالانہ اور تنخواہوں کی شرح بھی کم ہی ہے یعنی ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ ریال تک اس کے باوجود نتائج اتنے شاندار ہیں تو اس سے اساتذہ کی کارکردگی پر روشنی پڑتی ہے جو کہ اپنے وطن کے تعلیمی اداروں اور اساتذہ کے لیے باعث تقلید اور ترغیب ہے۔

ان کے مقابلے میں یہ دوحہ کالج ہے جہاں ہماری تینوں بیٹیاں پڑھ رہی ہیں۔ یہ ایک برطانوی اسکول ہے جو یورپی روایات کے مطابق چل رہا ہے۔ چار ہزار کے بجائے یہاں بچوں کی تعداد صرف چار سو ہے اور کلاسوں میں پچاس کی جگہ صرف بیس بچے۔ ہر چیز نپی تلی ہر کام معیاری۔ مگر فیس وہاں کے ۴۵ سو کے مقابلے میں صرف ۴۵ ہزار۔ اس میں درسی کتابوں کی قیمت شامل ہے مگر بس کا کرایہ الگ دینا پڑتا ہے۔ ٹھیک سات بجے صبح کو بچوں کو لے کر بس روانہ ہو جاتی اور ۱½ بجے سہ پہر میں پہنچا دیتی ہے (اس وقت میری گھڑی میں ٹھیک ۱½ بجے ہیں اور بچوں نے گھر میں قدم رکھ دیا

ہے)۔ یہاں صرف دو مضامین - انگریزی اور ریاضی لازمی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ باقی مضامین کیسے چنیں۔ یہ لیجیے - میرے سامنے میز پر ایک ایسا جاذب نظر رسالہ پڑا ہوا ہے جس کو نہ دیکھنا بدذوقی میں شمار ہو سکتا ہے اس میں اُن مضامین کی فہرست ہے جن میں سے آپ چُن سکتے ہیں، ہر ایک کے نفس مضمون پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے کیا صلاحیت متوقع ہے۔ کیا کام اور کیسی محنت کرنا پڑے گی یہ تمام باتیں تفصیل سے درج ہیں۔ ہوم ورک کا رواج بالکل نہیں ہے ہر کام اسکول ہی میں ہوتا ہے اور کاپیاں بھی اسکول ہی میں محفوظ رہتی ہیں۔ گھر پر غیر درسی کام کیجیے۔ اپنی ہابی (Hobby) پر وقت صرف کیجیے۔ اسکولی مقابلوں اور مظاہروں کے لیے تیاری کیجیے۔ ہماری بڑی بیٹی آرٹسٹ نکل رہی ہے اور اس کی دوسری ہابی کتابوں کو ہضم کرنا ہے۔ جب بازار جائے گی تو کچھ کتابیں خرید لائے گی۔ دوسری صاحبہ ڈرامے میں اپنے حصے کی تیاری کر رہی ہیں اور تیسری فرانسیسی سیکھ رہی ہیں۔ اسکول کے اوقات کے باہر بھی اسکول میں مختلف پروگرام ہوتے رہتے ہیں، اس کا ٹائم ٹیبل شائع کر کے بچوں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ وقت مقررہ پر والدین بچوں کو لے جاتے ہیں اور واپس لاتے ہیں۔ ایک ڈرامہ میں ہماری شرکت بھی ہو گئی۔ اس میں قصہ ان جنگلی جانوروں کا تھا جنہوں نے ایک انسانی بچے کو پال لیا تھا۔ بچوں نے جنگلی جانوروں کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا اور انسانی بچہ جسے بگھیر نے پال لیا تھا ہماری بھتیجی ڈاکٹر شہلا اور ڈاکٹر قوی کا بیٹا تھا۔ داخلہ ٹکٹ سے تھا۔ ٹکٹ کی شرح شاید ۲۵ ریال تھی۔

یہ لوگ خدمت خلق کی ترغیب بھی دلاتے رہتے ہیں

ایک مرتبہ ہڈی کے کینسر پر ریسرچ پروجیکٹ کی امداد کے لیے ایک نادر طریقہ اختیار کیا گیا۔ اساتذہ کی طرف سے ایک اعلان ہوا کہ ہم اپنے کو ایک دن کے لیے بیچ رہے ہیں جو طالب علم چاہے خرید لے۔ چنانچہ بچوں نے اپنے استاد اور استانیوں کی قیمت لگا کر خرید لیا۔ مگر ایک شوخ طالب علم نے ایک کتے کی زنجیر لا کر اپنی استانی کے ہاتھ میں تھما دی اور کہا: آج میں آپ کا باس (Boss) ہوں۔ آپ کے سپرد یہ کام ہے کہ اس کتے کو نہلاتی رہیے۔"

مگر کرسچین اسکولوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام بھی کسی نہ کسی نہج سے ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔ پہلے تو یہی بات ہمارے لیے گراں تھی کہ بچوں سے پیغمبرانہ کردار ادا کروایا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس قصے کی ترتیب انجیل کے مطابق رکھی گئی تھی جو قرآنی بیان سے ٹکراتا تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ والدین پر اس کا کیا ردّعمل ہوا۔

یہاں والدین اور اساتذہ کے درمیان بھی گہرا رابطہ قائم رکھنے کی کوشش ہوتی ہے کبھی کبھی والدین کو بچوں کے اساتذہ سے ملاقات کے لیے ایک خاص پروگرام بنتا ہے۔ قبل ملاقات یہ پروگرام شائع کر دیا جاتا ہے جس میں ملاقات کی تاریخ کا اعلان ہوتا ہے۔ کس استاد/استانی کی کس وقت ملاقات ہوگی اور کس کمرے میں ہوگی اور اسکول کی عمارت کا ایک نقشہ ساتھ ہوتا ہے تاکہ حسب ضرورت کمروں کے جائے وقوع سے آگہی ہو جائے۔ ملاقات کے وقت آپ کے بچے کے تعلیمی کردار پر پوری روشنی ڈالی جاتی ہے۔ بچوں کی کاپیاں آپ کے سامنے ہوں گی اور آئندہ ترقی کے لیے تبادلۂ خیال اور مشورے۔ یہ ملاقاتی پروگرام والدین کے لیے

ایک لازمی کورس کی طرح ہوتا ہے اور توقع یہ کی جاتی ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لیے والدین اچھا خاصا وقت فراہم کریں گے۔

ہر بچے کے لیے ایک تفصیلی پروگریس رپورٹ ہوتی ہے جس میں ہر استاد اپنے شاگرد کے حسن و قبح پر روشنی ڈالتا ہے۔ اچھے بچوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے میڈیا بھی بچوں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ مخصوص کامیاب بچوں کی تصویریں اور انٹرویو چھاپتا ہے۔ ٹی۔ وی پر تصویریں آتی ہیں۔ بچوں کے بہت سے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ اخباروں کے مخصوص شمارے بچوں کے لیے نکلتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے خلیج ٹائمس کا ہفتہ واری ضمیمہ ویکنڈ (week end) پڑا ہے۔ اس کا موضوع ہے "کھیل سے زیادہ" یعنی کھلونے جو صرف کھیل نہیں ہیں بلکہ تدریسات بھی ہیں۔ اس سے متعلق رنگین عکسی تصویروں سے پورا رسالہ بھرا ہوا ہے۔ اس طرح سے ایک پورا مخصوص رسالہ اس سال کے ٹاپ پر (on the Top) بچوں پر ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ ٹاپ کی فہرست میں مسلمان بچے بچیوں کے نام مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔ اس سال کی ایک لڑکی جس نے پورے خلیج میں ٹاپ کیا ہے اس کا نام "بیجل" ہے۔ ویک اینڈ۔ week end نے ایک پورا شمارہ اس پر شائع کیا جس میں ان کی تصاویر کے ساتھ فیملی کی تصاویر اور انٹرویو وغیرہ ہیں۔ اس طریقہ عمل سے بچوں کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

تصحیح

ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے اپریل ۱۹۹۱ء کے شمارے میں حکیم محمد اسلم صدیقی صاحب کے مقالے " علوم ریاضی جبر و مقابلہ، ہیئت اور طبیعیات میں مسلمان فضلا کی خدمات " میں کچھ سطور سہواً رہ گئی ہیں۔

صفحہ ۲۴ کالم نمبر ۲ سطر ۲ میں جملہ اس طرح پڑھا جائے:

" چنانچہ گریگوری کے دس ہزار کی مدت میں بھی ۳ دن کا تفاوت ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کے سال کی اسی مدت میں صرف دو دن کا تفاوت ہوتا ہے۔"

ادارہ

بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۳۶

کی جا رہی ہیں۔

ایٹم کے متعلق ایک نسبتاً جدید ماڈل کوارک ماڈل ہے جس سے ایٹمی ذرات کی کئی خصوصیات کی تشریح ممکن ہوتی ہے۔ چنانچہ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمام قسم کے بنیادی ذرات تین قسم کے ذرات سے بنتے ہیں۔ یہ ذرات کوارک اور ضد کوارک ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہی اور علوم جدیدہ

ظفر الاسلام ٭

مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۳ - ۱۹۳۰ء) ایک گوناگوں شخصیت کے مالک اور مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے۔ مولانا فراہی کی تعلیم وتربیت اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے اہم رول ان کے ماموں زاد بھائی علامہ شبلی نعمانی کا رہا ہے۔ مولانا فراہی نے ترجمہ وتفسیر قرآن، عربی وفارسی ادب، انگریزی زبان، علم کلام وفلسفہ اور تعلیم وتربیت جیسے مختلف میدانوں میں اپنے فضل وکمال کے نقوش ثبت کیے لیکن ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو قرآن کریم اور قرآنی علوم سے گہرا شغف تھا۔ انھوں نے قرآن کے مطالعہ اور اس میں غور وفکر کو اپنا خصوصی و مستقل مشغلہ بنایا اور قرآن ہی کو اپنی ساری علمی مصروفیت کا محور قرار دیا۔ مولانا فراہی کے معاصر اور دبستان شبلی کے ایک دوسرے ممتاز خوشہ چین مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ الفاظ واضح طور پر ان کی شخصیت کے اس پہلو کی عکاسی کرتے ہیں: "وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم وتدبر اور درس وتعلیم میں محو ہر شے سے بیگانہ اور ہر شغل سے ناآشنا تھی گئی" اس حقیقت کے باوجود کہ مولانا فراہی کی تعلیمی وتدریسی مصروفیات اور تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں دینی علوم بالخصوص علم قرآن کے میدان میں مرکوز تھیں، وہ جدید علوم یا عصری فنون کو شجر ممنوعہ نہیں تصور کرتے تھے گرچہ وہ انھیں مقصود بالذات بنانے اور ان کے لیے اسلام کے اساسی علوم کی تعلیم کو قربان کرنے کے سخت مخالف تھے۔ علوم وفنون کے تئیں ان کا واضح نقطۂ نظر یہ تھا کہ اصل علم تو قرآن کا علم ہے اس لیے اس کی تحصیل کو مقصود اصلی بنایا جائے اور باقی علوم کو اس اصلی علم کے حصول کے لیے وسیلہ وآلہ کے طور پر سیکھا جائے اور انھیں قرآن سے حاصل کردہ علم کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس طرح مولانا فراہی قدیم و جدید کی تفریق کے بغیر ان تمام علوم کی تحصیل کو مفید وضروری تصور کرتے تھے جو قرآن کریم کے معنی ومفہوم کو سمجھنے اور اس کے علوم ومعارف کے بتانے سے دوسروں کو مستفید کرنے میں کسی بھی نوعیت سے ممد ومعاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

مولانا فراہی کی تعلیمی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ وہ تعلیم کے قدیم وجدید دونوں دھاروں کے بہترین سنگم تھے۔ گرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے پہلے اپنی تعلیم کے مختلف مراحل متعین کیے اور اسی کے مطابق انھوں نے رفتہ رفتہ یہ مراحل طے کیے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے قدیم وجدید

٭ لیکچرر شعبۂ علوم اسلامیہ، اے ایم یو علی گڑھ

دونوں راہوں سے استفادے میں دلچسپی لی اور مسلم
نظام تعلیم کی مروجہ درسیات کی تکمیل کے ساتھ انھوں نے
انگریزی نظام تعلیم سے بھی خوشہ چینی کی۔ یہاں یہ وضاحت
دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس زمانے کے ایک معروف
طریقے کے مطابق مولانا فراہی کی مشرقی تعلیم مختلف علوم وفنون
کے ماہرین یا علم دین کے انفرادی مراکز کے ذریعے تکمیل کو
پہنچی۔ جب کہ جدید علوم کی تحصیل کافی حد تک اسکول، کالج
اور یونیورسٹی کی رسمی تعلیم کی مرہون منت تھی۔ مولانا فراہی
نے ناظرہ قرآن و حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد فارسی زبان
کی ابتدائی تعلیم مولوی مہدی حسن چتاردی سے حاصل کی
اور اپنے قریبی عزیز علامہ شبلی نعمانی سے فارسی زبان
کی تعلیم کی تکمیل کے علاوہ عربی زبان وادب اور اسلامی
علوم کے میدان میں کسب فیض کیا۔ مزید براں اسی مرحلے
میں انھیں ممتاز عالم اور علامہ شبلی کے استاد مولانا
فاروق چریا کوٹی کی عالمانہ صحبتیں نصیب ہوئیں جن سے
ان کی صلاحیتوں میں اور نکھار پیدا ہوا۔ مقامی طور پر ان
ساتذہ سے فیض یاب ہونے کے علاوہ مولانا فراہی نے
سلمانوں کی دیرینہ روایت کے مطابق طلب علم کے لیے
سفر بھی اختیار کیا۔ انھوں نے لکھنؤ میں کچھ عرصے مولانا عبدالحی
رنگی محلی کے درس میں شرکت بھی کی اور ان سے بالخصوص
قہ اسلامی کے میدان میں استفادہ کیا اور آخر میں لاہور
کر مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے عربی ادب کی درسیات
تکمیل کی۔ اس طریقے سے عربی، فارسی ادب اور دینی علوم
، مہارت حاصل کرنے کے بعد مولانا فراہی نے جدید علوم
جانب توجہ دی اور سب سے پہلے انگریزی زبان سیکھنا
دع کیا۔ یہ وہ زمانہ (انیسویں صدی کا آخری حصہ)
جب بقول مولانا سید سلیمان ندوی "انگریزی
نا کفر سمجھا جاتا تھا"۔ اپنے طور پر انگریزی کی کچھ شد بد
ل کرنے کے بعد انھوں نے باقاعدہ جدید تعلیم کے مختلف

مراحل طے کیے۔ پہلا مڈل اور پھر انٹرنس پاس کیا۔ یہ مرحلہ
کرنل گنج اسکول الٰہ آباد سے پورا کیا۔ مزید عصری تعلیم کے
لیے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء
میں اسی کالج سے بی۔ اے کا کورس مکمل کیا۔ اس زمانے
میں یہ کالج الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا اور امتحان وغیرہ کی
رسمیات وہیں سے پوری ہوتی تھیں۔ اس سے عام طور پر یہ ذکر
کیا جاتا ہے کہ مولانا فراہی نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے
پاس کیا۔ مولانا فراہی کو علی گڑھ قیام کے دوران رسمی و غیر رسمی
دونوں طریقے سے جدید علوم کی تحصیل کا موقع ملا۔ اس زمانے
میں ایم۔ اے۔ او کالج کے طلبہ کے لیے عربی و فارسی مضمون
لازمی تھا لیکن مولانا پہلے ہی سے ان دونوں زبانوں کے ماہر
تھے۔ اس لیے انھیں ان دونوں مضامین کے پیریڈ سے مستثنیٰ
قرار دیا گیا۔ اس سے دوسرے مضامین میں انہماک کا انھیں بہتر
موقع فراہم ہوا۔ مولانا نے یہاں جدید علوم میں خاص طور سے
انگریزی زبان اور فلسفہ جدید کی تحصیل میں کافی توجہ دی۔
اس وقت کالج کے اسٹاف میں فلسفہ کے ممتاز عالم اور
نامور مستشرق پروفیسر آرنلڈ تھے۔ اس میدان میں ان سے
مولانا نے بھرپور استفادہ کیا اور عام روایت کے مطابق
ان میں فلسفہ جدیدہ کا ذوق پروفیسر آرنلڈ کے درس اور
علمی مذاکرات سے ہی پیدا ہوا۔ بی۔ اے کے بعد مولانا
فراہی کا ارادہ ایم۔ اے کرنے کا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ
ایل ایل بی کا امتحان بھی دینا چاہتے تھے لیکن تیاری شروع
کرنے کے باوجود دونوں میں سے کسی کے امتحان میں شریک
نہ ہو سکے۔ کم از کم انگریزی زبان کی حد تک یہ یقینی طور پر کہا
جا سکتا ہے کہ بی۔ اے کی تکمیل کے ساتھ مولانا نے اس کی
اچھی خاصی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ اس کا ایک ثبوت اس سے
ملتا ہے کہ ۱۸۹۶ء میں جب پروفیسر آرنلڈ نے عربی گرامر
کی ایک کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کرانا چاہا تو اس کام کے
لیے ان کی نظر انتخاب سب سے پہلے مولانا فراہی پر پڑی،

جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے[5] مزید یہ کہ وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں عرب امراء اور سرداروں سے ملاقات کے لیے عرب و خلیج فارس کے سفر کا پروگرام بنایا تو ان کے ساتھ وفد میں شریک ہونے کے لیے ایک ایسے ترجمان کی ضرورت پیش آئی جو عربی و انگریزی دونوں زبانوں کا ماہر ہو۔ اس کے لیے بھی مولانا فراہی کا انتخاب عمل میں آیا۔[6] گرچہ وہ اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے اس پیش کش کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے لیکن علامہ شبلی نعمانی کے اصرار پر انھوں نے اس سفر میں وائسرائے کے ترجمان کے فرائض انجام دیے —

مولانا فراہی نے علی گڑھ کے طالب علمی ہی کے زمانے سے قرآن کریم میں غور و فکر کا سلسلہ شروع کر دیا تھا[7] اور بعد میں تدریسی مشاغل کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی آغاز کیا لیکن ان مصروفیات کے ساتھ انھوں نے ان علوم کی تحصیل جاری رکھی جنھیں وہ اپنے مطالعہ و تحقیق کے اصل میدان کے لیے مدد معاون سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر جب وہ ۱۹۰۷ء کے اوائل سے مئی ۱۹۰۸ء تک ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر عربی منسلک رہے تو انھوں نے اپنے شعبے کے سربراہ جرمن عالم پروفیسر جوزف ہوروویز۔ Josef Horovitz سے عبرانی زبان سیکھی اور اس مختصر سے عرصے میں اس زبان کی اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ وہ براہ راست عبرانی کتابوں سے استفادہ کرنے لگے جیسا کہ تفسیر اور قرآنی علوم سے متعلق ان کی کتابوں کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے یہ ادعا مقصود نہیں ہے کہ مولانا فراہی پہلے ہندوستانی عالم تھے جنھوں نے قدیم و جدید دونوں علوم حاصل کر کے مشرقی و مغربی تعلیم کے امتزاج کا ایک بہترین نمونہ پیش کیا بلکہ ان کی روشنی میں یہ واضح کرنا ہے کہ دینی علوم سے خصوصی شغف رکھنے کے ساتھ مولانا فراہی نے ضرورت اور اپنی دلچسپی کی حد تک جدید تعلیم بھی حاصل کی اور اس سے اہم یہ کہ اس میدان میں جو کچھ بھی صلاحیت پیدا کی وہ دینی اور علمی کاموں بالخصوص علم قرآن کی ترویج و اشاعت میں استعمال ہوئی جیسا کہ ذیل کے مباحث سے عیاں ہوگا۔

جہاں تک انگریزی زبان سے بخوبی واقفیت کا تعلق ہے مولانا فراہی نے اس سے کام لیتے ہوئے اپنے مطالعہ و تحقیق کے دائرہ کو وسیع کیا اور قرآنی علوم سے متعلق مختلف موضوعات پر تصنیفی کام انجام دیتے ہوئے یورپین اسکالرس کی نگارشات سے بھی ناقدانہ استفادہ کیا خاص طور سے قرآن کریم میں مذکور تاریخی مقامات کے بارے میں تحقیق کے دوران بعض ماہرین جغرافیہ کی کتابوں کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا اور بائبل ڈکشنری بھی ان کے مطالعے میں آئیں۔ مزید برآں مولانا نے انگریزی میں ایک رسالہ نصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت و کفارہ کی تردید میں تحریر کیا تھا۔ گرچہ یہ رسالہ دستیاب نہیں ہے لیکن اس کا ذکر مولانا کی عربی تصنیف "امعان فی اقسام القرآن" پر مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمہ میں صراحۃً ملتا ہے[8] اس واقعہ کی روشنی میں کہ ۱۹۱۲ء میں مولانا کے ہاتھ پر ایک انگریز نے اسلام قبول کیا تھا۔[9] اس زبان کے ذریعے ان کی تبلیغی مساعی کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب کے علاوہ مولانا فراہی کی انگریزی زبان کی صلاحیت ترجمہ کے کاموں میں بھی صرف ہوئی۔ قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ اور انگریزی کی اہم و مفید کتابوں کے اردو ترجمہ کے بعض اہم منصوبوں کا مختصر بیان یہاں بے موقع نہ ہوگا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ایک مستند انگریزی ترجمۂ قرآن کی سخت ضرورت محسوس کی گئی۔ تاکہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اسے استعمال کیا جا سکے اور خود مسلمانوں میں سے نئے تعلیم یافتہ

اس سے مستفید ہوسکیں۔ اس ضرورت کا احساس خاص طور سے اس سیاق میں پیدا ہوا کہ اس وقت تک دستیاب قرآن کے تمام انگریزی تراجم عیسائیوں کے تھے۔ اسی ضرورت کے تحت مارچ ۱۹۱۰ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں علامہ شبلی نے ندوہ کے زیر اہتمام انگریزی ترجمۂ قرآن کی تیاری کی تجویز پیش کی جو متفقہ طور پر منظور ہو گئی۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ایسے اہل دانش حضرات کی خدمات درکار ہوئیں جو عربی و انگریزی زبان کی مہارت کے ساتھ قرآن فہمی کا خصوصی ذوق رکھتے ہوں۔ اس کے لیے ایک سہ رکنی کمیٹی تشکیل پائی جس میں مولانا فراہی، نواب عماد الملک (حیدرآباد) اور مولانا محمد صالح (بہاولپور) شامل تھے۔ طریقۂ کار کے طور پر یہ طے کیا گیا کہ پہلے نواب صاحب ترجمہ کریں گے اور باقی دونوں حضرات اس پر نظر ثانی اور اس کی اصلاح کا کام انجام دیں گے۔ نواب صاحب نے ۲۴ پارے تک ترجمہ مکمل کیا اور جب مولانا فراہی دار العلوم کے پرنسپل کی حیثیت سے حیدرآباد منتقل ہوئے تو نواب صاحب نے مولانا فراہی کے ساتھ مل کر چار پاروں کے ترجمہ پر نظر ثانی کی لیکن ۱۹۱۷ء میں مولانا فراہی کے وہاں سے واپس آجانے کے بعد نواب صاحب اپنی بیماری اور نگاہ کی کمزوری کے باعث تنہا اس کام کو آگے نہ بڑھا سکے یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ترجمہ کے اس اصلاح شدہ مسودے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ اس کے علاوہ ایک روایت کے مطابق ریاست بھوپال میں انگریزی ترجمۂ قرآن پر حاشیہ لکھنے کی تجویز زیر غور آئی تو اس کام کے لیے بھی مولانا فراہی کا نام تجویز ہوا۔ ترجمہ کا دوسرا اہم منصوبہ ں سے مولانا فراہی منسلک ہوئے وہ ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ ں قایم شدہ 'انجمن مترجمین' کی زیر نگرانی مفید انگریزی کتابوں کی اردو میں منتقلی کا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کی علمی خدمات سے عوام بھی آسانی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ دسمبر ۱۹۰۷ء میں اس کے بارہ ممبر تھے۔ مولانا فراہی اور مولانا وحید الدین سلیم اس کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ ترجمہ کی تصحیح و اصلاح کے علاوہ ان کے ذمہ یہ بھی کام تھا کہ وہ ایک ایسی لغت تیار کریں جس میں انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات کی اردو میں تشریح کی گئی ہو اور ان اصطلاحات کا اردو متبادل بھی فراہم کیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ جب ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے لیے نصاب کی تیاری کا کام شروع ہوا تو انگریزی درسیات کے اردو ترجمہ اور مختلف علوم و فنون کی انگریزی مصطلحات کے اردو متبادل کی فراہمی کے لیے ایک مجلس قائم کی گئی۔ مولانا فراہی بھی اس کے رکن تھے اور اس کی ذمہ داریوں کو انجام دینے میں انھوں نے اپنی انگریزی استعداد سے بھرپور کام لیا۔ مزید براں انھوں نے حکیم آصف کی نصیحت آمیز حکایات کا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا جو "امثال آصف الحکیم" کے نام سے عربک ریڈر کے طور پر مختلف مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

اس سے قبل یہ مذکور ہو چکا ہے کہ مولانا فراہی عبرانی زبان سے بھی واقف تھے۔ گرچہ اس زبان کا تعلق علوم جدیدہ سے نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے اس کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کی تعلیم اس زمانے میں علوم مشرقیہ کی مروجہ درسیات میں شامل نہیں تھی۔ مولانا فراہی نے اسے خود اپنی دلچسپی سے سیکھا تھا اور اسے دین و دینی علوم ہی کی خدمت میں استعمال کیا۔ مولانا فراہی قرآن کریم کی تفسیر میں دیگر آسمانی کتب و صحائف کے مطالعے کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ عبرانی زبان سے واقفیت کی وجہ سے مولانا کو تورات و انجیل کے اصل متن سے رجوع کرنے کا موقع ملا۔ قرآن

میں مذکور اعلام و مصطلحات کے معنی و مفہوم کو متعین کرنے اور تاریخی مقامات کی جغرافیائی تحقیق میں تورات و انجیل سے استفادہ کے علاوہ اپنی تصنیفات میں مختلف مسائل میں اہل کتاب کے خلاف خود ان کی کتابوں سے حجت قایم قایم کرکے حق کو واضح کیا ہے۔ سورۃ والتین کی تفسیر[15] میں لفظ تین کی تحقیق اور الرای الصحیح فی من ھو الذبیح[16] میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کے ثبوت میں تورات سے استشہاد کی واضح مثالوں کے علاوہ مختلف سورتوں کی تفسیروں اور مفردات القرآن[17] میں تورات و انجیل کے اصل متن سے استفادہ کی متعدد مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مزید براں مکاتیب شبلی میں بھی تورات، انجیل و زبور کی روشنی میں قرآن کریم کے بعض الفاظ و مقامات کے معنیٰ و مفہوم کی تعیین میں علامہ شبلی اور مولانا فراہی کے مابین تبادلہ خیال کی مثالیں ملتی ہیں[18] مولانا فراہی کے غیر مطبوعہ نامکمل مسودات میں "الاکلیل فی شرح الانجیل" اور "الطریف فی التحریف" نامی رسائل بھی شامل ہیں۔ اول الذکر میں اناجیل کی شرح پیش کی گئی ہے جب کہ موخر الذکر میں تورات و انجیل کی تدوین اور ان کے مختلف نسخوں سے بحث کرکے ان کی تحریفات کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے[19] مزید یہ کہ مولانا فراہی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے امثال و مواعظ کا عبرانی سے خالص فارسی زبان (دری) میں منظوم ترجمہ کیا تھا جو "خرد نامہ" کے نام سے ان کے حیدرآباد قیام کے دوران (۱۹۱۴ — ۱۹۱۹ء) وہیں سے شایع ہوا۔

عصری علوم میں فلسفہ جدیدہ مولانا فراہی کی دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ علامہ شبلی اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبتوں نے ان میں اس کے ذوق کو پروان چڑھایا اور ان کے اپنے ذاتی مطالعے نے انھیں اس فن کی گہرائیوں تک پہنچایا۔ مولانا فراہی کو اس فن میں جو امتیاز حاصل تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خود علامہ شبلی اس کے معترف اور قدر دان تھے۔ علامہ شبلی کی معتمدی کے دوران جب ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم اصلاح و ترمیم کے مرحلے سے گزرا تو جدید فلسفہ کی ایک کتاب الدروس الاولیہ فی العلوم الطبیعیہ (مطبوعہ بیروت) داخل نصاب کی گئی[20] علامہ شبلی نے اس کے پڑھانے کے لیے بار بار مولانا فراہی پر زور دیا۔ اس وقت مولانا فراہی مدرسۃ الاسلام کراچی سے منسلک تھے۔ اس لیے علامہ شبلی نے یہ تجویز رکھی کہ وہ کچھ عرصے کے لیے رخصت لے کر ندوہ اس کام کے لیے آجائیں یا تعطیل کے دوران دو تین مہینے یہاں مقیم رہ کر طلبا کو اس کا درس دے دیا کریں اس سے آگے بڑھ کر علامہ شبلی نے یہ بھی پیش کش کی تھی کہ اگر وہ کراچی میں اس کتاب کو پڑھانے کے لیے کچھ وقت نکال سکیں تو یہاں سے دو ایک طالب علم بھیج دیے جائیں جو وہاں جانے کے لیے تیار ہیں[21] مزید براں انھوں نے مولانا فراہی کو ایک بار یہ بھی لکھا کہ وہ کراچی سے اعظم گڑھ جاتے ہوئے ندوہ ہو کر جائیں اور وہاں سے دو تین ہوشیار طلبا کو اپنے ساتھ گھر لیتے جائیں اور وطن میں قیام کے دوران اپنی تفسیر اور اس کتاب کا درس دیتے رہیں[22] مولانا سید سلیمان ندوی کے بیان سے اس کا قطعی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ مولانا فراہی ندوہ جا کر کسی نہ کسی صورت میں طلبا کو قرآن کریم کا درس دینے کے ساتھ الدروس الاولیہ بھی پڑھاتے رہے۔ خود سید صاحب کے اپنے الفاظ میں "انھیں (علامہ شبلی) کے اصرار پر وہ (مولانا فراہی) کئی دفعہ ندوہ میں آکر رہے اور طلبا کو کبھی فلسفہ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھاتے۔ میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب علم تھا مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا[23]"۔ مولانا فراہی جب ۱۹۰۷ء میں کراچی سے علی گڑھ چلے آئے اور ایم۔ اے۔ او کالج

میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے تو مولانا شبلی نے ندوہ کی مجلس انتظامیہ میں یہ تجویز منظور کرائی کہ ایک طالب علم کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بھیجا جائے تاکہ وہ مولانا فراہی سے الدروس الاولیہ اور ہیئت جدیدہ کا درس لے اور وہاں بیت الآلات میں متعلقہ آلات سے استفادہ کرکے عملی تجربہ بھی حاصل کر سکے۔ اس تجویز پر عمل بھی شروع ہوا لیکن بعد میں مولانا فراہی کے میور کالج الٰہ آباد منتقل ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا[۲۲] ان تفصیلات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی کس قدر خواہش مند اور مُصر تھے کہ مولانا فراہی ہی ندوہ کے طلبا کو فلسفہ جدیدہ کی یہ کتاب پڑھائیں۔ اس میدان میں مولانا فراہی کے امتیاز پر مزید شہادت اس سے ملتی ہے کہ ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی کی تحریک پر "مجلس علم کلام" کا قیام عمل میں آیا۔ اس مجلس کی تشکیل سے علامہ شبلی کا مطمح نظر یہ تھا کہ مسلمانوں میں نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں جو فلسفہ سے دلچسپی اور اسلام سے تڑپ رکھتے ہوں ان میں سے کچھ حضرات منتخب کیے جائیں اور علما میں سے بھی ایسے لوگ چنے جائیں جو قدیم فلسفہ میں مہارت اور جدید تعلیم سے انس رکھتے ہوں اور اسی کے ساتھ فلسفۂ جدیدہ کے اعتراضات کو رد کرنے کی صلاحیت کے بھی مالک ہوں۔ ایسے افراد پر مشتمل یہ مجلس غور کرکے فلسفۂ جدیدہ کے ان مسائل کی نشان دہی کرے جو مذہب کے مخالف ہیں اور اسی کے ساتھ ان اعتراضات کا جواب معلوم کرے گی جو ان مسائل کی وجہ سے مذہب پر وارد ہوتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ شبلی نے اس مجلس کے لیے علما میں سے مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا شیر علی حیدر آبادی اور سید رشید رضا مصری کو منتخب کیا اور نئے تعلیم یافتہ حضرات میں سے ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا عبد القادر بھالپوری کو چنا[۲۳] گرچہ اس مجلس کی کارکردگی کے بارے میں کوئی تفصیل نہ مل سکی لیکن اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

عصری علوم کے میدان میں مولانا فراہی کی یہ خدمت بھی قابل ذکر ہے کہ ان کے صدارت کے دوران دارالعلوم حیدرآباد میں سائنس کی تعلیم کا فیصلہ کیا گیا اور اس سے اہم یہ کہ اسی اثنا میں انھوں نے ریاست کے ارباب حل و عقد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ عصری علوم و فنون کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دینیات کے علاوہ باقی تمام علوم کے لیے اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔ اس تجویز کا پس منظر یہ ہے کہ اس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے زیر اہتمام دارالعلوم کو ترقی دے کر ایک مشرقی یونیورسٹی بنانے کی کوشش جاری تھی اور اس کے لیے خاکہ بھی تیار ہو رہا تھا۔ مولانا فراہی نے اپنے تخیل کے مطابق اس کا ایک تفصیلی خاکہ بنا کر ریاست کے تعلیمی امور کے ذمہ داروں کے سامنے پیش کیا اور مشہور روایت کے مطابق اسی کی عملی شکل جامعہ عثمانیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی[۲۴]۔

یہاں یہ وضاحت بھی بے موقع نہ ہوگی کہ مولانا فراہی نے علم کے میدان میں قدیم و جدید دونوں راہوں سے اخذ و استفادہ کیا لیکن اس ضمن میں ان کا طرز عمل محض مقلدانہ نہیں بلکہ محققانہ و ناقدانہ رہا ہے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے یہاں مختلف النوع مآخذ کا استعمال، تحقیقی و تنقیدی انداز بحث اور علمی و استدلالی پہلو صاف طور پر نظر آئے گا۔ مولانا فراہی کا تحقیقی و تنقیدی انداز یہ تھا کہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل وہ مختلف مآخذ کا مطالعہ کرتے لیکن ایک ناقد جوہری کے روپ میں ان کو اچھی طرح جانچنے پرکھنے کے بعد ہی کچھ قبول کرتے۔ وہ کسی خیال یا رائے کو اس وقت تک پیش نہیں کرتے

تک کہ غور و فکر اور شواہد و دلائل کی روشنی میں اس کے تمام پہلوات کے سامنے واضح نہ ہو جاتے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنی کتاب "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت کیا ہے اس ضمن میں انھوں نے متعدد متعلقہ مآخذ سے استفادہ کیا یہود کے خیالات و اعتراضات کا ناقدانہ جائزہ لیا اور ان کی من گھڑت باتوں کو بے نقاب کیا۔ اپنی رائے کی تائید میں پہلے خود تورات سے تیرہ دلیلیں فراہم کیں اور پھر اتنی ہی دلیلیں قرآن کریم سے پیش کر کے اپنی رائے کو مزید مستحکم کیا۔ مولانا فراہی کا یہ محققانہ اسلوب اقسام القرآن، مفردات القرآن اور ان کی دیگر کتب و تفسیری اجزا میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نامور مفکر اسلام اور ممتاز مفسر قرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مولانا فراہی کے معیار تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "علامہ فراہی ایک بڑے درجے کے محقق تھے۔ انھوں نے اپنی تفسیروں میں تحقیق کا ایسا خاص مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا ہے جو دوسرے مفسرین کے اسالیب سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اس اسلوب خاص سے انھوں نے جو مطالب اخذ کیے ہیں اور آیات کے جو معانی متعین کیے ہیں ان میں اختلاف کی ایسی ہی گنجائش ہے جیسی دوسرے مفسرین کے نتائج تحقیق میں لیکن ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ناظر کے زاویۂ نظر کو وسیع کرتا ہے اور قرآن مجید کے معانی و مطالب کو سمجھنے کے لیے تحقیق و تفحص اور مواد علمی کے وسیع تر میدانوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ کوئی شخص ان کے نتائج تحقیق سے کلی اتفاق نہ رکھتا ہو مگر وہ ان کا چھوڑا ہوا ایسے بیش بہا علمی خزانہ پاتا ہے جس سے کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

مولانا فراہی نے اپنی نگارشات میں نہ صرف یہ کہ تحقیق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا بلکہ قرآن کی روشنی میں مختلف علوم و فنون کا (بالخصوص ان کا جن سے قرآن کے سمجھنے میں مدد لی جاتی ہے) ناقدانہ جائزہ لیا اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ یہ علوم اپنی موجودہ صورت میں فہم قرآن کی راہ میں صحیح طور پر ممد و معاون نہیں بن سکتے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن ہی کی روشنی میں ان کو از سر نو مرتب و مدون کیا جائے۔ مولانا فراہی درحقیقت اس انقلابی تصور کے ترجمان و داعی تھے کہ قرآن کو بنیاد اور مرکز بنایا جائے اور باقی دیگر تمام علوم کو اس کے ماتحت کیا جائے تاکہ تمام علوم کا رشتہ اصل منبع علوم و معانی سے جڑ جائے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مولانا فراہی کا یہ نرا تصور ہی نہیں تھا بلکہ اسے عملی شکل دینے کے لیے انھوں نے ایک جامع منصوبہ و وسیع پروگرام بنایا تھا اور اس نہج پر انھوں نے کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا گرچہ وہ اس کام کو مکمل نہ کر سکے لیکن علم نحو، علم بلاغت، اصول فقہ، منطق، علم کلام و فلسفہ، سیاسیات وغیرہ سے متعلق ان کی جو کچھ مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف ملتی ہیں ان سے قرآن کی روشنی میں علوم کی تدوین نو اور اس کی اہمیت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں لیکن اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علوم و فنون کی تدوین نو سے متعلق مولانا فراہی کا نقطۂ نظر اس سیاق میں کافی اہمیت رکھتا ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے مسلمانوں کے بعض علمی حلقوں میں اسلامی اصول و مناہج کی روشنی میں علوم و فنون کی تشکیل جدید

Islamization of knowledge کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اس موضوع پر کتب و مضامین لکھے جانے کے علاوہ اب سیمینار و مذاکرات میں اس پر بحث و مباحثہ کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ آج سے تقریباً اسی نوے سال قبل مولانا فراہی نے قرآن مجید کی روشنی میں علوم و فنون کی تجدید اور تدوین نو کا نعرہ بلند کیا۔ اس کے بنیادی اصول و رہنما خطوط واضح کیے اور اس کا ابتدائی عملی خاکہ بھی پیش کیا۔ اس لیے اس سمت سفر میں مولانا فراہی کو بجا طور پر پیش رو کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا فراہی کی تحقیق و تنقید اور علوم و فنون کی تدوین نو کے لیے ان کی کاوشیں محض ذہنی ریاضت اور علمی شوق نہیں تھی بلکہ ان سب کے پیچھے ایک بلند جذبہ کارفرما تھا اور وہ تھا ملت کی فکری اصلاح کا جذبہ۔ مولانا کے خیال میں اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تمام علوم کا رشتہ قرآن کریم سے استوار کیا جائے مختلف راستوں سے ان کی ذہنی و فکری دنیا میں جو غلط تصورات و نظریات گھس آئے ہیں انھیں محو کیا جائے اور فہم قرآن کے لیے نئی راہیں ہموار کی جائیں تاکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اس سے رہنمائی حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ مولانا فراہی کے اس جذبے کی ترجمانی موجودہ دور میں فکر فراہی کے سب سے بڑے ترجمان اور صاحب "تدبر قرآن" مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں "وہ محض ایک اکیڈمک طرز کے مصنف اور محقق نہیں تھے بلکہ ان کی تمام فکری کاوشوں کے اندر ایک گہرا جذبہ اصلاح کام کر رہا تھا۔ وہ علمی اصلاح سے پہلے فکری اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے اور اس فکری اصلاح کی بنیاد انھوں نے قرآن پر رکھی تھی۔ وہ قرآن کی روشنی میں مسلمانوں کے تمام علوم و افکار کا جائزہ لے کر ایک طرف تو یہ چاہتے تھے کہ فکر و نظر کے مختلف گوشوں میں جو باطل تصورات و نظریات گھس چکے ہیں ان کو بے دخل کریں اور دوسری طرف ان کی کوشش یہ تھی کہ زندگی کے تمام پہلوؤں اور اس کے تمام مسائل پر غور کرنے کے لیے قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی راہیں کھول دیں"[4]

حواشی و مراجع

[1] ملاحظہ کریں راقم کی مرتب کردہ "کتابیات فراہی" (قسط اول) مطبوعہ ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ) ۵/۱ جنوری - جون ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۰ - ۱۴۶ اور ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کا مقالہ "تصانیف فراہی کا غیر مطبوعہ سرمایہ" علوم القرآن ۵/۲ جولائی - دسمبر ۱۹۹۰ء

[2] الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن، آہ مولانا حمید الدین فراہی (شذرات) معارف ۲۶/۵، نومبر ۱۹۳۰ء ص ۳۲۳

[3] ملاحظہ کریں سید صاحب کا مقالہ مولانا حمید الدین فراہی، معارف، ۲۷/۱ جنوری ۱۹۳۱ء، ص ۱۰

[4] مولانا فراہی کی تعلیمی زندگی اور ان کی سوانح سے متعلق دوسری تفصیلات کے لیے رجوع فرمائیں۔ مختصر حیات حمید (مشتمل بر مقالات مولانا سید سلیمان ندوی و مولانا امین احسن اصلاحی) مرتبہ عبدالرحمن ناصر اصلاحی، دائرۂ حمیدیہ (مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ) ۱۹۷۳ء۔ محمد عنایت اللہ سبحانی، علامہ حمید الدین فراہی، مکتبہ اصلاح سرائے میر، ۱۹۷۸ء، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ترجمان القرآن

مولانا حمید الدین فراہی، معارف، ۱۴۷/۲، فروری ۱۹۹۱ء، ص ۸۵-۱۰۹

۵ـہ مکاتیب شبلی۔ مطبعۃ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۲۷ء، ۲/۲

۶ـہ مختصر حیات حمید (مقالہ مولانا امین احسن اصلاحی) ص ۳۵

۷ـہ تفسیر نظام القرآن (ترجمہ امین احسن اصلاحی)، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ۹۰ء ص ۳۰ (مقدمہ تفسیر نظام القرآن)

۸ـہ ان سے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے راقم کا مقالہ "جوزف ہورویز" سہ ماہی فکر و نظر کے خصوصی شمارہ نامورانِ علی گڑھ (تیسرا کارواں) ۱۹۹۱ء میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۹ـہ اعجاز فی علوم القرآن، دار القرآن الکریم، کویت، ۱۹۸۰ء، ص ۸۔ ۱۰ـہ مکاتیب شبلی، ۲/۴۱

۱۱ـہ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء، ص ۵۰۲-۵۰۴۔ نیز دیکھیے مکاتیب شبلی ۲/۳۲-۳۳۔

۱۲ـہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، محولہ بالا مقالہ، معارف، فروری ۱۹۹۱ء، ص ۹۰ ۱۳ـہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۴ دسمبر ۱۹۰۴ء

۱۴ـہ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۳۹، ۴۴، ۴۵، ۵۲-۵۴

۱۵ـہ مطبوعہ مطبعۃ معارف، اعظم گڑھ (بلا تاریخ) اس کا اردو ترجمہ (از مولانا امین احسن اصلاحی) تفسیر نظام القرآن میں شامل ہے۔

۱۶ـہ مطبوعہ مطبعۃ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۱۹ء اس کا اردو ترجمہ "ذبیح کون ہے" کے نام سے دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر سے شائع ہوا ہے۔ ۱۷ـہ مطبوعہ مطبعۃ اصلاح، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر ۱۹۲۹ء

۱۸ـہ مکاتیب شبلی ۳۰/۳۱، ۴۰، ۴۱، ۴۳، ۴۹، ۵۰۔

۱۹ـہ ان دونوں رسالوں پر مختصر تعارف کے لیے ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کا محولہ بالا مقالہ تصانیف فراہی کا غیر مطبوعہ سرمایہ ۲۰ـہ حیات شبلی ص ۴۱۵، ۴۳۱

۲۱ـہ مکاتیب شبلی ۲۰/۲۰، ۲۲، ۲۳، حیات شبلی ص ۴۳۱

۲۲ـہ مکاتیب شبلی ۲/۲۲ ۲۳ـہ مختصر حیات حمید ص ۱۰

۲۴ـہ مکاتیب شبلی، ۲/۲۶، حیات شبلی ص ۴۳۲، موخر الذکر ماخذ میں مولانا فراہی کے علی گڑھ آنے کا سن ۱۹۰۸ء لکھا ہوا ہے جو صحیح نہیں ہے، وہ یہاں ۱۹۰۷ء کے اوائل میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو کر آ چکے تھے۔ ۲۵ـہ حیات شبلی، ص ۵۸۴، ۵۸۵

۲۶ـہ حیات شبلی، ص ۵۰۵-۵۱۵۔ مکاتیب گیلانی (مرتبہ مولانا منت اللہ رحمانی) ص ۲۹۳-۲۹۴، ۲۹۹

۲۷ـہ مختصر حیات حمید ص ۴۰

۲۸ـہ ترجمان القرآن، ۸/۱ محرم الحرام ۱۳۵۵ھ ص ۹۶

۲۹ـہ مقدمہ تفسیر نظام القرآن ص ۴۲-۴۴۔ مختصر حیات حمید ص ۵۱ نیز دیکھیے خالد مسعود۔ مولانا فراہی کی علمی خدمت ماہنامہ تدبر (لاہور) سلسلہ ۳۲، اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۴۰-۴۶

۳۰ـہ مختصر حیات حمید ص ۵۱

اسراف بے جا و فضول خرچی

محمد مختار اصلاحی علیگ ٭

دولت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اسے ضرورت کے مطابق احتیاط کے ساتھ خرچ کیا جائے تاکہ آمدنی و خرچ میں توازن قائم رہے۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ خرچ ہمیشہ آمدنی کے حساب سے کم ہی ہو تاکہ ناگہانی آفات و ضروریات کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچتا رہے۔ جو لوگ بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے خرچ کیے جاتے ہیں اور اپنی آمدنی پر دھیان نہیں رکھتے، ایسے لوگ ہمیشہ پریشان و مقروض رہتے ہیں۔ خرچ تو ایک سخی بھی کرتا ہے لیکن وہ آمدنی پر نظر رکھتے ہوئے ضرورت مندوں، غریبوں، محتاجوں، بیکسوں، نیک کاموں اور بہتر علمی یادگاروں پر اپنی دولت صرف کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک فضول خرچ زیادہ تر شکم پروری، نمود و نمائش، ٹھاٹ باٹ، نفسانی خواہشوں اور رنگ رلیوں ہی میں اپنی ساری رقم بے تحاشا اُڑا دیتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اسی وجہ سے ایک فضول خرچ کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ بڑھاپے کا زمانہ جسے آرام و راحت میں بسر ہونا چاہیے یہ زمانہ اس کا سخت اذیت و تکلیف اور نہایت مفلسی و بے بسی میں گزرتا ہے۔ اس لیے کہ فضول خرچ کا ہاتھ خالی ہوتا ہے اور اس عمر میں کچھ کرنے دکھانے کی قوت و سکت بھی نہیں ہوتی اور اس کی عیاشی و فضول خرچی کی وجہ سے لوگ اس کے ساتھ ہمدردی بھی نہیں رکھتے۔

تمام مذاہب نے فضول خرچی کو بُرا کہا ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ اسراف بے جا کی کھل کر مذمت آئی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل-۳ میں ہے کہ:

"فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔"

فضول خرچ خدا اور اس کے بندوں کا صحیح حق ادا نہیں کر پاتا اس لیے کہ حقوق کی ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان ہمیشہ اپنی ضروریات و خواہشات کے معاملے میں احتیاط و اعتدال اور کفایت شعاری سے کام لے۔ جو شخص فضول خرچ اور خواہشات کا غلام ہوگا جب اس کے اپنے ہی شوق پورے نہیں ہوتے تو وہ دوسروں کے حقوق کہاں سے ادا کر پائے گا؟ شیطان مال والوں پر سب سے پہلے اسی راہ سے حملہ کرتا ہے۔ وہ اسے طرح طرح کی آرزوؤں و خواہشوں میں پھنساتا ہے۔ پھر وہ مال کو اپنی جاگیر سمجھ کر بے دھڑک الٹے تلّے اُڑاتے ہیں اور اس حالت کو پہنچتے ہیں کہ ان کے پالے ہوئے کتے تو مزے کرتے ہیں لیکن ان کے عزیز و اقارب اور پڑوسی بھوکے

سوتے ہیں۔

عموماً بے وقوف اور شیخی بگھارنے والے اس بری عادت میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ چالاک اور عیار لوگ ان کو اپنا آلۂ کار بنا کر مختلف بہانے ان سے رقمیں اینٹھتے ہیں۔

باپ کی کمائی والے جنھیں بغیر محنت و مشقت کے دولت یا دولت کے ذرائع بآسانی حاصل ہو جاتے ہیں وہ بھی دولت کو نہایت بے دردی سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ انسانی کمزوری ہے کہ جو چیز مفت یا آسانی سے مل جاتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی لیکن جو سخت محنت اور گاڑھی کمائی سے حاصل کی جاتی ہے اس کی ہر طرح سے حفاظت کی جاتی ہے۔

وہ لوگ جو شروع میں خستہ حالی و تنگ دستی کی زندگی گزارتے ہیں انھیں جب کہیں سے نعمت غیر مترقبہ ہاتھ لگ جاتی ہے تو وہ نام و نمود اور بڑے پن کے اظہار کے لیے شادی بیاہ اور رسم و رواج کے دوسرے مواقع پر دل کھول کر روپیوں کا بے جا اسراف کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی رقم اگر وہ رفاہ عام کے کاموں میں لگاتے تو وہ بھی نام پاتے اور عوام کو بھی فائدہ پہنچتا۔

بہت سے نئے مال داروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے گھروں اور کمروں کی آرائش و زیبائش میں بلا ضرورت لاکھوں روپیے بلا دریغ ضائع کر دیتے ہیں۔ صرف یہ کہلانے کے لیے کہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں حالانکہ آدمی کبھی فضول خرچی سے بڑا نہیں ہوتا بلکہ اچھے اور بڑے کام کرنے سے بڑا کہلاتا ہے۔ یہ لاکھوں کی رقم جو صرف دکھاوے کے لیے کمروں کی سجاوٹ میں لٹائی گئی ہے۔ اسی رقم سے اپنے کسی بھائی کے لیے ایک اور مکان تیار ہو سکتا تھا۔

وہ لوگ جو غلط اور ناجائز طریقے سے دولت جمع کر لیتے ہیں ان میں بھی فضول خرچی کی عادت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ایک بینک کی ڈکیتی میں ڈاکوؤں کو لاکھوں روپیے ہاتھ لگے۔ خوش ہو کر انھوں نے عوام کے لیے ایک نہایت پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا۔ ایک درگاہ کے سامنے درجنوں بکرے کٹ گئے۔ سیکڑوں دیگیں چڑھ گئیں اور ہزاروں پیٹ کے بندوں نے اس غیر متوقع بخشش سے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی لیکن سراغ رسانوں کو یہ شاہی دعوت کھٹکی کہ یہ محنت کی کمائی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس طرح سے تو کوئی لوٹی ہوئی دولت ہی لٹائی جا سکتی ہے۔ اس کھٹک کے ساتھ جب وہ دان دینے والوں کے پاس پہنچے تو اُن کا یہ خیال صحیح نکلا اور ڈکیتی کے یہ مجرم نہایت آسانی سے گرفتار کر لیے گئے۔

ذاتی طور پر میں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جن کے اسراف بے جا نے ان کی کمر توڑ دی اور بڑھاپے میں بڑی تنگ دستی و بے چارگی سے زندگی گزری۔

تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ فضول خرچی نے افراد ہی کو نہیں بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔ رنگیلے شاہ اور واجد علی شاہ کی عیاشی و فضول خرچی اور ان کے عبرت ناک انجام سے تو آپ سب ہی واقف ہیں۔ قدیم مصر کی مشہور ملکہ "قلو پطرہ" جو نصف صدی قبل مسیح ملکہ مصر بنی تھی اس کی فضول خرچی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس زمانے میں اس کا ذاتی خرچ یومیہ دس ہزار ڈالر تھا۔ سمندر کی سیر کے لیے اس نے جو جہاز تیار کیا تھا وہ سونے اور جواہرات سے مزین و آراستہ تھا پُر تکلف کھانوں کے ساتھ وہ نہایت قیمتی شراب پیتی اور پلاتی تھی مگر اس فضول خرچی کی وجہ سے اس کے ملک کی حالت جب بہت زیادہ خراب ہو گئی تو عوام نے پریشان ہو کر اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ ملکہ نے اپنے پر خطر انجام سے گھبرا کر پُر اسرار طور پر خودکشی کر لی۔

میری اینٹونیٹی (Mary Antoinette) فرانس کے سولہویں شہنشاہ لوئی کی بیوی تھی۔ یہ نہایت فضول خرچ اور جوے وسٹے کی بُری عادت میں بھی مبتلا تھی۔ بادشاہ

نے اس کے ذاتی اخراجات کے لیے اس وقت ڈھائی لاکھ پونڈ سالانہ مقرر کیے تھے لیکن وہ اس سے بھی زیادہ رقم صرف کر دیا کرتی تھی۔ عوام نے اسی لیے اس کا نام ہی "میڈم ڈیفیسٹ" یعنی "بیگم خسارہ" رکھ دیا تھا۔ بالآخر اس کی فضول خرچی کے نتیجہ میں جب ملک کی مالی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی اور لوگ بھوکے مرنے لگے تو ایک زبردست انقلاب آیا۔ میری انٹونینٹ گرفتار ہوئی اور انقلابیوں نے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس طرح لوئی خاندان کی بہت پرانی و مضبوط حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

فضول خرچی جب عادت ثانیہ بن جائے اور رقم بھی برابر ملتی رہے تو اس کا چھوڑنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ تاہم ناصحانہ باتوں، مخلصانہ کوششوں اور نیک صحبتوں کی مدد سے اس بری عادت کو روکا جا سکتا ہے۔ سینما اور ریڈیو والوں سے یہ کہنا کہ وہ فضول خرچی کے خلاف آواز اٹھائیں فضول اور بے سود ہے۔ اس لیے کہ جس کی بنیاد ہی فضول خرچی پر ہو اس کی بات کا لوگوں کے ذہن و دماغ پر کبھی اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔ البتہ ہمارے اخبارات و رسائل اس خدمت کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے موقع پر ہی فضول خرچی کے نقصانات واضح کیے جائیں اور ماں باپ خود احتیاط برتیں اور بچوں کو بھی سمجھاتے رہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ جو ماں باپ خود فضول خرچ ہوتے ہیں ان کے بچے بھی زیادہ تر ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس لیے اگر ماں باپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اس بری عادت کو نہ اختیار کریں تو انھیں پہلے خود اسراف بے جا سے اپنا ہاتھ روکنا چاہیے۔ بچوں کو فضول خرچی کے نقصانات بتلاتے ہوئے اس بات کو خاص طور سے دھیان میں رکھا جائے کہ وہ اسے چھوڑ کر بخل اور کنجوسی کی حد میں داخل نہ ہونے پائیں۔ انھیں دونوں ہی کے نقصانات بتا کر اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے۔

یہ بات ہر شخص کو ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جس ملک میں، جس معاشرے میں، جس گھر میں اور جس فرد میں بھی فضول خرچی راہ پاتی ہے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔

"دورِ وسطیٰ کا خاص کارنامہ اور ایسا کارنامہ کہ جس کی طرف نظر کم جاتی ہے، یہ ہے کہ اس دور نے تحقیقات کا شوق پیدا کر دیا اور اس عمل کا سہرا بارھویں صدی تک مسلمانوں کے سر بندھا رہا۔"

سارٹن

ایٹم اور ایٹمی مرکزہ

ھاشم دریادل ▽

ایٹوموس، یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے 'وہ جو تقسیم نہ ہو سکے' جس طرح ایٹم کا لفظ یونانی لفظ سے نکلا ہے، اسی طرح ایٹمی نظریے کی بنیادی تلاش ہمیں قدیم یونان میں لے جاتی ہے۔

ایٹمی نظریہ کہتا ہے کہ تمام قسم کے مادے ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہیں جو مزید اور ذرات میں بانٹے نہیں جا سکتے ہیں۔ ان ذرات کا نام ایٹم ہے چونکہ ایٹم بے شمار طریقوں سے مجموعے بنا سکتے ہیں' اس لیے بے شمار قسم کی اشیا موجود ہیں۔

ایٹمی نظریے کے ابتدائی پیش کار لوسی پس اور ڈیموکرائٹس تھے۔ یہ آج سے کوئی ۲۵۰۰ سال پہلے کے آدمی تھے۔ ڈیموکرائٹس کہتا تھا کہ ایٹم ایسے ذرات ہیں جن میں خود مختاری سے حرکت کرنے یا شکل بدلنے کی خوبی موجود ہے۔ یعنی وہ خود سے حرکت کر لیتے ہیں اور کسی اور کے محتاج نہیں ہوتے۔

لوسی پس اور ڈیموکرائٹس کے نظریے اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل معنوں میں ایٹمی نظریے کے معمار انیسویں صدی کے کیمیا دان تھے۔ ان کیمیا دانوں کے نام انٹونی لیوائزیے، جوزف پروسٹ اور جان ڈالٹن ہیں

لیوائزے نے ۱۷۸۹ء میں اپنی کتاب "کیمیا کے عناصر" شائع کی۔ اس کتاب نے کیمیا کو الکیمیا (سونے کی سائنس) کے اندھیروں سے باہر نکالا اور کیمیا کو جدید حقیقت پسندانہ اور مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ لیوائزے کا سب سے بڑا کارنامہ یہ اعلان تھا کہ کسی بھی عمل کے دوران، مادے کی کل مقدار تبدیل نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور کارنامہ یہ واضح کرنا بھی تھا کیمیائی اشیاء کو بنانے والے کیمیائی عناصر کی تعداد بہت کم ہے جب کہ کیمیائی مرکبات بے شمار ہیں۔

پروسٹ نے کیمیائی تناسبوں کا قانون پیش کیا یہ قانون بیان کرتا ہے کہ کیمیائی عناصر، صرف تب ہی کیمیائی مرکب بنائیں گے جب ان کو وزن کے لحاظ سے خاص تناسب میں ملایا جائے گا۔ پروسٹ کو اپنے اس قانون کا کافی دفاع کرنا پڑا اس لیے کہ اس وقت کا سب سے بڑا کیمیا دان، کلاڈ برتھولٹ یہ

▽ معرفت ماہنامہ طالب علم کراچی۔ پاکستان

کہتا ہے کہ کیمیائی عناصر کو کسی بھی نسبت سے ملا سکتے ہیں۔

جان ڈالٹن نے ۱۸۰۸ء میں تناسبوں کے قانون کی مدد سے ایٹم کے وجود کا نظریہ اخذ کیا۔ اسی نے مجموعی نسبتوں کا قانون پیش کیا۔ اس نے کہا کہ مختلف گیسوں کے ایک جتنے حجم میں ذرات یا ایٹموں کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ تعداد کے اس فرق کو اس نے ایٹموں کے وزن کی بنیاد پر پیمائش کیا۔ اسی طرح اس نے "ایٹمی وزن" کا تصور پیش کیا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ایٹم مختلف تناسب سے مل کر مرکبات بناتے ہیں۔

ایٹمی نظریے کی طرف ایک اور فیصلہ کن قدم فرانسیسی کیمیادان جوزف لوئیس گے لوساک اور اطالوی نواب کاؤنٹ ایماڈیو ایووگاڈرو نے اٹھایا۔ گے لوساک نے دریافت کیا کہ دو گیسیں ایک دوسرے کا تعامل کر کے تیسری گیس بناتی ہیں۔ پہلی دو گیسیں مکمل عددی تناسب سے ملتی ہیں۔ ایووگاڈرو نے ایٹم اور مالیکیول کی اصطلاحات کو مزید واضح کیا۔ اس نے عددی اور حجمی تناسب کو باہم مربوط کیا۔ اسی نے یہ بنیادی مفروضہ بھی پیش کیا کہ ایک ہی دباؤ اور درجۂ حرارت پر گیسوں کے ایک جتنے حجم میں مالیکیولوں کی ایک جتنی تعداد موجود ہوتی ہے۔

ایووگاڈرو کے مفروضے کی تصدیق تو جلد ہی ہو گئی لیکن اسے پوری طرح سمجھنے میں نصف صدی یعنی ۵۰ سال کا عرصہ لگا۔ اس مفروضے نے الگ الگ مالیکیولوں کی مختلف گیسوں میں شرح معلوم کرنے میں مدد دی۔ اس لیے کہ اگر کسی حجم میں مالیکیولوں کی تعداد معلوم ہو تو فرد مالیکیولوں کا وزن بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

مختلف عناصر کا ایک جتنا حجم لیا جائے تو حجم مساوی ہونے کے باوجود مالیکیولوں کی تعداد مختلف حاصل ہو گی۔ اس طرح عناصر کی ایک ایسی پیمائشی اکائی بنا سکتے ہیں جس میں $۶٫۰۲۳ \times ۱۰^{۲۳}$ مالیکیول ہوں۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑا عدد ہے۔ اسی عدد کو ایووگاڈرو کا عدد بھی کہتے ہیں۔

ایووگاڈرو کا عدد کسی بھی عنصر کے ایٹمی وزن کو بیان کرنے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے ایٹمی وزن معلوم کرنے کے کئی طریقے موجود ہیں۔ ان سب میں سے اطالوی کیمیادان سٹینس لاس کینیزارو کا طریقہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔

ایٹم کے بارے میں کی جانے والی مذکورہ بالا تحقیق کی اہمیت میں شک نہیں لیکن اس تحقیق کو اس بات کا مکمل ثبوت نہیں کہہ سکتے کہ مادے کے بارے میں ایٹمی نظریہ درست ہے۔ ایٹمی نظریے کے متعلق آخری شکوک بیسویں صدی ہی میں دور ہو سکے۔ ان شکوک کو دو بنیادی دریافتوں نے دور کیا۔ ایک دریافت تھی "الیکٹرون" اور دوسری تھی تابکاری۔ الیکٹرون اور تابکاری کی دریافت کے بعد تیزی سے یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ الیکٹرون، مادے کے بنیادی اجزا ہیں اور یہ ایٹموں سے الگ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایٹم کو ناقابلِ تقسیم سمجھنے کا تصور ختم ہونے لگا۔ ایٹم کے اندرونی نمونے پر مختلف ایٹمی ماڈل پیش ہونے لگے۔

۱۹۰۰ء میں یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ کسی بھی الیکٹرون کی کمیت ہائیڈروجن ایٹم سے ۱۸۳۷ گنا کم ہوتی ہے اور یہ کہ وہ بجلی کا منفی بار رکھتے ہیں۔ چونکہ ایٹم برقی بار کے لحاظ سے اعتدال پر ہوتا ہے (نہ منفی نہ مثبت) اور ایٹم کے اندر منفی اجزا (الیکٹرون) ہوتے ہیں۔ اس لیے ایٹم میں ضرور مثبت اجزا ہوں گے۔ جے جے تھامسن نے جو الیکٹرون کو دریافت کرنے والا قرار دیا جاتا ہے یہ خیال پیش کیا کہ ایٹم ایسے مثبت ذرات ہیں جن کے

اندر منفی ذرات بھی موجود ہیں۔

یہ ہے تھامسن کا ایٹمی ماڈل ردرفورڈ کے تجربات سے صحیح ثابت نہ ہو سکا۔ ردرفورڈ نے تجربات میں ایسی شعاعیں استعمال کیں جو اس زمانے میں دریافت ہوئی تھیں۔ ان شعاعوں کو اب الفا، بیٹا اور گاما شعاعیں کہا جاتا ہے اور تاب کار جسموں سے خارج ہوتی ہیں۔

ان شعاعوں کی دریافت ۱۸۹۶ء میں اتفاقاً ہوئی۔ فرانسیسی طبیعات داں ہنری بیکورل نے ان کو دریافت کیا۔ پھر دوسرے طبیعات داں بھی اس طرف متوجہ ہو گئے ان میں ماری کیوری اور اس کے شوہر پیری کیوری کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے۔

یورینیم نمکیات کے کئی ٹن مادے پر تجربات سے ماری کیوری نے دو نئے تاب کار عناصر دریافت کیے یہ عناصر ریڈیم اور تھوریم ہیں۔ یہ یورینیم سے بھی زیادہ تاب کار نکلے۔ ماری کیوری ہی وہ پہلی سائنس داں بھی تھی جو تاب کاری کا شکار ہوئی۔ وہ تاب کاری شعاعوں کی وجہ سے لیوکیمیا سرطان میں مبتلا ہو گئی اور سرطان کی وجہ سے مرنے والی پہلی سائنس داں تھی۔

ماری کیوری اور تاب کاری کے اس مختصر ذکر کے بعد ہم پھر ایٹمی ماڈل کی طرف آتے ہیں۔ ردرفورڈ نے تجربات سے دریافت کر لیا کہ الفا شعاعیں دراصل وہ ہیلیم کے وہ مرکزے ہیں جو بہت تیز رفتاری سے سفر کرتے ہیں۔ اس نے ان کی بمباری کے ذریعے ایٹمی ساخت معلوم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۱۱ء میں ردرفورڈ نے الفا ذرات خارج کرنے والی پتریوں کو سونے کی پتریوں کے اندر احتیاط سے رکھا الفا ذرات کے انحراف کے زاویے ناپنا اس کے لیے ممکن تھا۔ اگر تھامسن کا ایٹمی ماڈل، حقیقی ہوتا تو انحراف بہت کم ہونا چاہیے تھا، لیکن ردرفورڈ نے دیکھا کہ بعض جگہوں پر انحراف بہت زیادہ رہا ہے۔ بہت سی جگہوں سے ذرات واپس بھی لوٹ آئے تھے۔ اس تجربے سے حاصل کردہ مشاہدات کی بنیاد پر اس نے ایٹم کے قلب یا مرکز کا تصور پیش کیا جسے نیوکلیس کہا جاتا ہے۔

ردرفورڈ کے دریافت کردہ ایٹمی مرکزے میں ایٹم کی زیادہ ترکیت، مرتکز ہوتی ہے۔ اس مرتکز کمیت کے گرد الیکٹرون یوں گردش کرتے ہیں جیسے سورج کے گرد سیارے۔ ردرفورڈ کے ایٹمی ماڈل کو آج تسلیم شدہ ایٹمی ماڈل کی ابتدائی شکل تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ردرفورڈ ہی کے زمانے میں بلکہ ردرفورڈ سے بھی ذرا پہلے، ایک ایسا ایٹمی ماڈل جاپانی طبیعات داں ناگاؤکا نے پیش کیا تھا لیکن چونکہ فیصلہ کن ثبوت ردرفورڈ نے پیش کیے اس لیے ردرفورڈ ہی کو اس ایٹمی ماڈل کا پیش کرنے والا قرار دیا گیا۔

ردرفورڈ کے ساتھ بہت سے پرجوش اور نوجوان طبیعات داں بھی کیمبرج یونیورسٹی کی کیونڈیش لیبارٹری میں کام کرتے تھے۔ کیونڈش لیبارٹری ہی دنیا میں ایٹمی تحقیق کا پہلا مرکز تھی۔ اہم دریافتوں میں سے ایک انتہائی اہم دریافت ۱۹۳۲ء میں جیمز چاڈوک نے کی۔ اس نے یہ وضاحت کی کہ ایٹمی مرکزے میں صرف مثبت نہیں بلکہ معتدل اجزا کی موجودگی بھی تسلیم کر لی جائے تو کئی تجرباتی مشاہدات اور نظریاتی حقائق میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ ایٹمی مرکزے میں موجود یہ معتدل اجزا "نیوٹرون" کہلائے۔ اس طرح ایٹم ایک ایسا ذرہ قرار پایا جس کے مرکز میں "نیوکلی اس" نام کا خول ہے یہ خول اندر سے کھوکھلا نہیں بلکہ ٹھوس ہے۔ اسے ٹھوس بنانے میں دو ذرات کا حصہ ہے۔ یہ ذرات جو اس کے اندر موجود ہیں، پروٹون اور نیوٹرون ہیں۔ نیوکلیس سے بہت بڑے ایٹمی فاصلے پر موجود منفی ذرات الیکٹرون

مرکزے کے گرد گردش میں ہیں۔ بہت بڑے ایٹمی فاصلے سے مراد یہ ہے کہ نیوکلیس سے الیکٹرونوں کا فاصلہ نیوکلیس کے قطر سے کوئی دس ہزار گنا بڑا ہے۔

ایٹمی ساخت سے اس بات کی وضاحت بھی ممکن ہو گئی کہ قدرتی عناصر ایک دوسرے سے مختلف خوبیوں کے مالک کیوں ہوتے ہیں؟ عناصر کی خوبیوں کا انحصار ایٹمی ساخت پر ہوتا ہے۔ پروٹونوں یا الیکٹرونوں کی تعداد ان خصوصیات کا تعین کرتی ہے۔ پروٹون یا الیکٹرون کی تعداد سے ہی ایٹمی عدد متعین ہوتا ہے. جب کہ نیوٹران کی مختلف تعداد کی وجہ سے ہمجا عناصر (آئسوٹوپ) بنتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ردرفورڈ نے جو ایٹمی ماڈل پیش کیا، اس سے الفا ذرّات کے انحراف کی تشریح ممکن ہو گئی۔ اسی طرح اور کئی ایٹمی مناظر کی وضاحت ممکن ہو گئی اس کے باوجود یہ ایٹمی ماڈل ان خیالات کی وضاحت نہیں کر سکتا تھا جن پر روایتی برق مقناطیسیت قائم تھی۔

بوھر کا ایٹمی ماڈل

ردرفورڈ کے ایٹمی ماڈل کے مطابق الیکٹرون، مرکزے کے باہر گردش کرتے ہیں۔ میکس ویل کے قوانین کے مطابق انہیں مسلسل برق مقناطیسی موجوں کی صورت میں توانائی خارج کرنی چاہیے جس سے منفی ذرات یعنی الیکٹرون کی توانائی کم ہو جانی چاہیے اور ان پر نیوکلیس کی کشش حاوی ہو جائے گی جس کی وجہ سے ایٹمی توازن بگڑ جائے گا۔

ایٹمی توازن بگڑ جائے گا تو دنیا کی مادی اشیا کا توازن بگڑ جائے گا۔ اس طرح ایٹم کی زندگی ایک سکنڈ کا صرف دسواں لاکھ حصّہ رہ جائے گی۔

ردرفورڈ کے ایٹمی ماڈل کے سامنے آنے سے یہ سوالات جب ابھر کر سامنے آئے تو صرف یہی نظر آتا تھا کہ صرف ایٹمی سطح پر کلاسیکی برق مقناطیسیت کا نفاذ ناممکن قرار دیا جائے۔ یہ کام یورپ کے طبیعات دان نیلز بوہر نے کیا۔ نیلز بوہر ردرفورڈ کا شاگرد بھی کہا جاتا ہے اور اچھا قریبی دوست بھی۔

بوہر کے نقطۂ نظر میں ایٹم کے اندر الیکٹرونی گردش کے دوران توانائی خارج نہیں ہوتی۔ توانائی خارج یا جذب ہونے کا عمل صرف تب ہوتا ہے جب الیکٹرون ایک مدار سے دوسرے میں جاتے ہیں۔

بوہر کا ایٹمی ماڈل جسے بعد میں سمرفیلڈ نے بہتر بنایا مختلف عناصر کی ایٹمی طیف کی تشریح میں کامیاب رہا۔ یہ ایٹمی طیف کافی عرصے سے دریافت ہو چکی تھیں لیکن ان کی تشریح کا کوئی آسان اور حقیقی نظریہ سامنے نہ آ رہا تھا

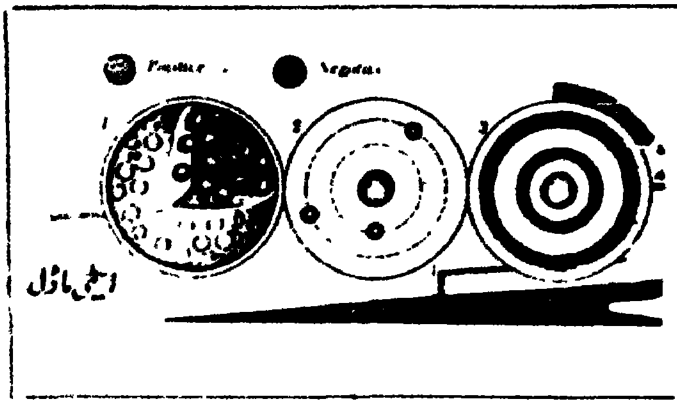
آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بوہر کا ایٹمی ماڈل ایک پرانا ایٹمی ماڈل ہے۔ لیکن اس پرانے ایٹمی ماڈل کی مدد سے 'کوانٹم میکانیات' کا ایک اہم حصّہ تشکیل پاتا ہے جو زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوانٹم میکانیات ابھی پوری طرح بچلی سطح پر کبھی نہیں جا سکی۔ اس لیے نظریاتی طبیعات اور کیمیا میں 'بوہر کا ایٹمی ماڈل آج بھی ایک کامیاب نظریہ ہے

بوہر کے ایٹمی ماڈل کا خلاصہ اگر چند فقروں میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو یوں ہے۔ ہر الیکٹرون ایک خاص مدار میں رہتا ہے۔ یہ مدار دراصل توانائی کی سطح ہوتی ہے۔ جب الیکٹرون E_2 توانائی والے مدار سے E_1 توانائی والے مدار میں جاتا ہے تو E_1 کی توانائی E_2 سے کم ہوتی ہے۔ کم توانائی والے مدار میں جانے کے لیے الیکٹرون کو بھی اپنی توانائی کم کرنا پڑتی ہے۔ توانائی کم کرنے کے لیے الیکٹرون مختصر لمحے کے دوران توانائی خارج کرتا ہے۔ توانائی کا یہ اخراج روشنی کی شکل میں ہوتا ہے۔ روشنی کے ذرّات یعنی فوٹون خارج ہوتے ہیں۔

پلانک کی مستقل شرح، جو توانائی اور تعدد کے درمیان پائی جاتی ہے، ذہن میں رکھی جائے تو اخراجی طیف کی روشنی اور انجذابی طیف کی سیاہ دھاریوں کی وضاحت ممکن ہو جاتی ہے۔ اخراجی طیف میں روشنی کی وجہ فوٹون کا اخراج ہے جب کہ انجذابی طیف میں سیاہ دھاری کی وجہ فوٹون کا انجذاب ہے۔

بوہر کے ایٹمی ماڈل کی بنیاد پر ایک اور بڑی کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ عناصر کے جدول کی واضح حدبندی سامنے آ گئی۔ اس حدبندی کے ضمن میں اہم کردار جرمن طبیعیات داں وولف گینگ پالی نے ادا کیا۔ اس نے اصول استثنا، Exclusion Principle پیش کیا۔ اس اصول کے مطابق کسی بھی مدار میں دو سے زیادہ الیکٹرون (یا کوانٹم ذرات) نہیں ہو سکتے۔ جب ایک مدار مکمل طور سے پُر ہو جاتا ہے تو الیکٹرون دوسرے مدار میں ترتیب پانے لگتے ہیں۔ جب یہ مدار بھی پُر ہو جاتا ہے تو وہ اس سے اگلے مدار میں ترتیب پاتے ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر یہ مفروضہ بھی سامنے آیا کہ الیکٹرون نہ صرف نیوکلیس کے گرد گھومتے رہتے ہیں بلکہ وہ اپنے محور پر بھی اس طرح گھومتے ہیں جیسے لٹو گھومتا ہے۔ اسی لیے الیکٹرون کو منفی باربردار نہیں بلکہ ایسا ذرہ سمجھا جانا چاہیے جس کے اندر بھی کوئی ساخت موجود ہے۔

ردر فورڈ کے ایٹمی ماڈل اور پھر اس کی مدد سے بوہر کے زیادہ حقیقی ایٹمی ماڈل۔ دونوں کی بنیاد تجربات پر تھی اور یہ کسی جامع نظریے کو پیش نہیں کرتے تھے۔ اصل پیش رفت اروِن شروڈنگر نے کی۔ شروڈنگر نے بروگلی کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اور یہ تصور سامنے رکھتے ہوئے کہ ہر الیکٹرون کے ساتھ ایک موج وابستہ ہے۔ اس موج کی حرکت کو ایک مساوات سے ظاہر کیا۔ یہ مساوات اس مساوات سے ملتی جلتی ہے جو روایتی طبیعیات میں موجی حرکت سے ظاہر کرتی ہے۔



ایٹمی ماڈل

جس طرح روشنی میں موجی اور ذراتی خواص بیک وقت موجود ہیں، اسی طرح الیکٹرون میں بھی بیک وقت موجی و ذراتی خواص موجود ہیں۔ شروڈنگر کی پیش کردہ "مادی موجوں" ہی سے اس بات کا بھی ثبوت ملا۔ ۱۹۳۰ء میں انگریز طبیعیات داں ڈیراک نے مکمل نظریاتی خیالات پیش کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ الیکٹران حرکات سمجھنے کے لیے نظریۂ اضافیت سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس بنیاد پر ڈیراک نے جو مساواتیں پیش کیں ان سے ایک نئے ذرّے "پوزی ٹران" کی موجودگی سامنے آئی۔ پوزی ٹران ایک "ضد" ذرہ ہے اور ذرّات کے ساتھ ساتھ ضد ذرات کی موجودگی بھی طبیعیات تسلیم کر چکی ہے۔

ان مدارج سے گزرتے ہوئے ایٹم اب ایک اکائی اور بنیاد نہیں رہا۔ بالخصوص اس کے نیوکلیس پر تحقیقات ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس تحقیقات پر مامور طبیعیاتی شاخ جسے ایٹمی طبیعیات یا نیوکلیئر طبیعیات کہتے ہیں، مسلسل مصروفِ عمل ہے۔ پروٹون، الیکٹرون، نیوٹرون، میزون، نیوٹرینو اور ہائپرون جیسے بہت سے ذرّات پر تحقیق جاری ہے اور اس غرض سے خاص قسم کی مشینیں استعمال

باقی صفحہ نمبر ۱۹ پہ ملاحظہ فرمائیں

سلام ہو نجد پر اور نجد میں رہنے والوں پر

رشید احمد صدیقی کی روح سے معذرت کے ساتھ

الطاف حسین خاں شیروانی ★

۳۰۔ اگست ۱۹۴۷ء کی رات ہم سب نئے طلبا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلے کے لیے فتح پور سے روانہ ہوئے راستے میں شہادت کا درجہ ملتے ملتے رہ گیا۔ ہوا یہ کہ ملک آزاد ہوتے ہی پنجاب جلنا شروع ہو گیا تھا اور اس کا اثر دوسرے صوبوں میں بھی پڑنے لگا۔ مغربی پنجاب کے شرنارتھی مسافر گاڑیوں میں گھس آتے تھے اور دوسرے مسافروں کی ہمدردیاں حاصل کر کے اقلیتی فرقے پر حملہ کر دیتے تھے لیکن ہمارے یو۔پی کے شریف ہندو اکثریت کے افراد کے لیے سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ یہی صورت ہم لوگوں کے ساتھ ہوئی۔ ہم سب شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ پہلے تو ان لوگوں نے ماحول گندہ کرنے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ معاملہ آگے بڑھے ہمارے ڈبے کے ایک ہندو کھڑے ہوئے اور انھوں نے بہ آواز بلند کہا کہ جس نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے جاؤ اس سے بدلہ لو ہمارے یو۔پی میں تم یہ ظلم نہیں کر سکتے۔ پھر وہ شریف انسان ہم لوگوں سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا، آپ لوگ جانتے ہیں کہ یہ لوگ پاگل ہو رہے ہیں۔ اپنے مسلمان ڈبے میں سفر کیا کیجیے۔" دوسرے اسٹیشن میں ہم لوگوں نے ڈبہ بدل دیا۔ آج بھی اس شریف آدمی کی شکل نگاہوں کے سامنے ہے لیکن افسوس پھر اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

ہم لوگ صبح علی گڑھ پہنچے۔ اسٹیشن سے ہوسٹل تک کا سفر تانگہ میں طے ہوا۔ غالباً اس زمانے میں رکشا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میرے ہم سفر ہمدرد اور علی گڑھ آنے کے محرک مولانا عبدالعزیز صاحب ایم۔اے ایل ایل بی، بی ٹی موریسن کورٹ کے کمرہ نمبر ۵۴ میں مجھے لائے۔

اس وقت یونیورسٹی کے حالات بڑے ناگفتہ بہ تھے علی گڑھ یونیورسٹی پر پاکستان بنانے کا الزام تھا۔ نواب اسمٰعیل خاں وائس چانسلر تھے۔ ہوسٹل میں رات کا وقت بڑی وحشت سے گزرتا تھا۔ صرف ڈھائی ہزار طلبا رہ گئے تھے۔ کبھی یہ خبر اڑتی کہ ہزاروں دیہات کے لوگ وی ایم ہال پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب اپنی ناعاقبت اندیشی کا احساس تھا جو اس شکل میں ذہنوں پر مسلط تھا۔

داخلے کے لیے جدوجہد سخت رہی۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسٹریچی ہال میں داخلے کے مراحل طے ہوئے۔ مختار صاحب (استاد شعبۂ جغرافیہ) کا جوش کے ساتھ جوش میں ہم نئے طلبا کو پیچھے ہٹانا اور ساتھ ساتھ بڑی تلخ پھٹکار

★ ڈائرکٹر ڈاکٹر تارا چند میموریل ریسرچ سینٹر۔ ۸۳-بی- فتح پور (یو۔پی)

بتاتے جانا آج بھی یاد ہے لیکن ان کے سر کی ترکی ٹوپی (جو ان کے انتقال کے وقت استادوں میں آخری ٹوپی تھی) کو دیکھ کر اپنائیت کا ایک سمندر موجزن ہو جاتا تھا

اُن ایام میں سینیر طلبا کا بڑا احترام کیا جاتا تھا نوابوں، تعلقداروں اور زمین داروں کے لڑکے علی گڑھ آتے تھے اور بڑی شان کی زندگی گزارتے تھے۔ ہر کمرے میں قالین اور فرشی حقّہ لازمی ہوتا تھا۔ ایس۔ ایس ہال رئیس زادوں کا مرکز تھا۔ سینیر طلبا میں منن خاں رام پوری اپنے عہد کے بڑے مشہور علی گیرین تھے۔ کبھی شیروانی اور کبھی پتلون پہنتے تھے۔ ٹوپی میں چاند بنا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ یونیورسٹی کی سڑکوں پر ٹہلتے نظر آتے تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ بابِ اسحاق کے سامنے والی سڑک کے ایک پل سے چند دستیاب ہوئے لڑکے جمع ہو گئے۔ نواب اسمٰعیل خاں بھی موقع پر پہنچ گئے منن خاں صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ آئے اور وائس چانسلر صاحب کے قریب ٹھہر گئے۔ پھر یہ کہتے ہوئے کہ "چلنے کا وقت ہو گیا" اپنے دوستوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔

سیشن ۴۸-۱۹۴۷ء میں میرا داخلہ الیف اے کے پہلے سال میں ہوا۔ اس زمانے میں آرٹس کے سارے شعبہ جات ایس ایس ہال میں تھے۔ باب اسحاق سے داخل ہوتے ہی شعبۂ فارسی تھا جس کی دوسری منزل میں میرا فارسی کا کلاس ہوتا تھا۔ معاشیات کے کلاس اُن کمروں میں ہوتے تھے جن کے برابر سے راستہ یونین ہال کی طرف نکلتا ہے۔ انگریزی کے کلاس کے لیے ہم لوگوں کو شعبۂ جغرافیہ سے ملحق شعبۂ انگریزی میں جانا پڑتا تھا اپنے ساتھیوں میں صرف عرفان حبیب یاد رہ گئے۔ انگریزی ان کی بڑی اچھی تھی۔ ان سے یوں تعلق قائم ہوا کہ میرے کمرے کے ساتھی اور ہم وطن مولانا عبد العزیز صاحب عرفان حبیب کو فارسی پڑھانے پروفیسر حبیب صاحب کی کوٹھی (جس میں کانگریسی جھنڈا لہراتا رہتا تھا) جاتے تھے میں بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ میں نے حبیب صاحب کو کبھی انگریزی لباس میں نہیں دیکھا سوائے شیروانی چوڑی دار پاجامہ اور جاڑوں میں گرم شیروانی پر اوور کوٹ پہنتے تھے اور ہر وقت سگار پیتے رہتے تھے۔ بڑے شریف آدمی تھے اور ہندوستان کے چوٹی کے مورخین میں سے ایک تھے۔ ان کے شاگرد ہندوستان، پاکستان اور افغانستان وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یونیورسٹی میں جمعہ کے دن چھٹی ہوتی تھی شعبۂ اردو رشید احمد صدیقی صاحب کے زیر سرپرستی اور شعبۂ فارسی ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی سربراہی میں ترقی کی راہیں طے کر رہے تھے۔ شعبۂ اردو سے ہمارا زیادہ تعلق نہ تھا لیکن شعبۂ فارسی کے چند استاد یاد رہ گئے ہیں۔ جناب حاذق صاحب ہم لوگوں کو فارسی پڑھاتے تھے ان کے خشک قہقہے آج بھی یاد ہیں۔ کرنل عبد الحمید خاں صاحب ہمارے والد جناب محمود حسن خاں شیروانی کے بھی استاد تھے۔ شیروانی پہنے ترکی ٹوپی لگائے فوجی بوٹ میں شعبہ آتے تھے۔ مولوی ضیاء احمد بدایونی بڑے قابل اور نیک استادوں میں تھے۔ شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب بڑے حسین جامہ زیب اور قابل ترین استاد تھے۔ ان کی کون کون سی خوبیاں بیان کی جائیں۔ شیروانی کالی ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ ایک آنکھ میں کھلے شیشہ کا چشمہ لگا، ایک بڑی کار میں شعبہ میں آتے تھے۔ سر وجئی نائیڈو گورنر یو۔پی اور راج گوپال اچاریہ گورنر جنرل ہندوستان مختلف اوقات میں یونیورسٹی آئے تھے ان مہمانوں کی آمد پر ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی اسٹریچی ہال کی تقریر آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ انگریزی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ایسی تقریر کرتے

تھے کہ معلوم ہوتا تھا ایک دریا ہے جو امنڈتا چلا آرہا ہے۔ علی گڑھ ہسٹری کانگریس کے ایک اجلاس میں جنوبی ہندوستان کے ایک مورخ نے ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی تقریر پر کہا تھا:

"It appears that someone dances upon his lips"

اس عہد میں یونیورسٹی میں چار شخصیتیں زیادہ مشہور تھیں:

۱۔ ڈاکٹر بابر مرزا۔ صدر شعبۂ حیوانات۔ جن کا تذکرہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں درج ہے۔

۲۔ ڈاکٹر ہادی حسن۔ صدر شعبۂ فارسی۔ بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے۔

۳۔ پروفیسر محمد حبیب۔ صدر شعبۂ سیاسیات و تاریخ۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔

۴۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ صدر شعبۂ اردو۔ اردو دنیا کے مشہور ترین انشاپرداز اور استاد تھے۔

فیکلٹی آف سائنس میں اور بھی استاد مشہور تھے لیکن شعبہ جغرافیہ کے استادوں میں ڈاکٹر مظفر صاحب اور ڈاکٹر قاضی سعید الدین صاحب نے دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ بعد میں ڈاکٹر مظفر صاحب ساگر یونیورسٹی بحیثیت صدر شعبۂ جغرافیہ ہو کر چلے گئے۔ ڈاکٹر قاضی سعید الدین صاحب پاکستان چلے گئے اور ڈاکٹر نفیر خاں صاحب الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے۔

میں اور مولانا عبدالعزیز صاحب میرے پارٹنر روزانہ چھپ کر انگریزی کے لکچرر مولانا جلیل صاحب کے گھر ریڈیو پاکستان سننے جاتے تھے جو موریس کورٹ کے قریب کالونی میں رہتے تھے جہاں تک تعلیم کا سوال تھا ہر استاد بڑی محنت سے سبق دیتا تھا اور ہم طالبعلم بھی دیانت داری کے ساتھ علم سیکھنے کا شوق رکھتے تھے۔

صبح نماز سے پہلے غسل ہوتا۔ دوران غسل اقبال علیہ الرحمہ کے اشعار گنگناتے جاتے۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

موریس کورٹ کے ایک کمرے کو نماز کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا لیکن ایس۔ ایس ہال کی مسجد قرطبہ میں نماز پڑھنے میں کچھ لطف ہی دوسرا آتا تھا۔ چنانچہ ایس ایس ہال کی جامع مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا ہوتی۔

صبح کی نماز کے بعد جمنیزیم کی طرف رخ ہوتا راستہ کے میدان میں (جہاں اب مولانا آزاد لائبریری اور شعبۂ جغرافیہ کی عمارتیں بن گئی ہیں) تھرو کرنے والے ڈسکس تھرو گھماتے نظر آتے تھے۔

نمائش کا وقت آتا تو حسرت موہانی کا پچاس سال پرانا شعر زبان پر آجاتا ہے

وہ حسرت علی گڑھ کا عہد فراغت
وہ راتیں نمائش کی دن فروری کے

یہاں پر حسرت موہانی کا نام آگیا تو یہ بھی سنتے چلیے کہ علی گڑھ نے حسرت سے بڑا انسان نہیں پیدا کیا۔ بقول مولانا جمال میاں فرنگی محلی:

"گاندھی جی سے پرانے کانگریسی اور جناح صاحب سے پرانے مسلم لیگی تھے۔ ہندوستان کے سارے اشتراکیت پسندوں سے پرانے اشتراکی اور سارے آزادی چاہنے والوں سے پہلے مبلغ آزادی تھے۔"

مولانا علی گڑھ یونیورسٹی کے پہلے طالب علم تھے جو جنگ آزادی میں جیل گئے۔ مولانا پہلے ایڈیٹر تھے جن کو قید با مشقت کی سزا ملی۔ یہ مولانا ہی تھے جنھوں نے ترک موالات کی تحریک پیش کی اور جسے نامنظور کیا گیا۔ مولانا پہلے مجاہد آزادی تھے جنھوں نے کانگریس کے ایک جلسہ میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی تجویز پیش کی۔ ترک موالات کی راہ مولانا حسرت ہی نے دکھائی جس کا اعتراف خود گاندھی جی نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں کیا ہے[۷] تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ شہید بھگت سنگھ کو حسرت موہانی کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا اور اس درویش اور مرد قلندر کے خیالات اور زندگی سے بہت متاثر ہوئے تھے[۸]

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی بات ہے ہم چند طلبا شام کے وقت مارلین کورٹ میں گھاس کے میدان میں بیٹھے تھے کہ ناوقت یونیورسٹی کا سائرن بجا سب لڑکے گھبرا کے باب اسحاق کی طرف دوڑے (سائرن باب اسحاق سے بالکل قریب لگا تھا) دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گاندھی جی کو گولی ماردی گئی۔ ایک امید کی ٹمٹماتی شمع تھی وہ بھی بجھادی گئی۔ یونیورسٹی میں چند گھنٹوں کے لیے عجیب بدحواسی، بے بسی اور مایوسی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی لیکن جب رات کو ریڈیو سے یہ معلوم ہوا کہ ناتھو رام گوڈسے نامی شخص نے گاندھی جی کو گولی ماری ہے تو مایوسی غم میں بدل گئی۔ میں نے وہ رات نصر اللہ ہوسٹل میں گزاری جہاں میرے پھوپی زاد بھائی ڈبلو خالق صاحب رہا کرتے تھے۔

ان ہی ایام میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سابق وائس چانسلر کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ ان کی میت ان کی وصیت کے مطابق علی گڑھ لائی گئی۔ جاڑے کے ایام تھے کرکٹ پویلین کی عمارت میں ڈاکٹر صاحب کے جسد خاکی کو دیدار عام کے لیے رکھا گیا تھا۔ آج بھی وہ منظر نظروں کے سامنے ہے کہ طلبا، اساتذہ، عوام، شہر کے لوگ ضلع کی انتظامیہ کے لوگ وغیرہ آتے تھے اور آنسوؤں کا نذرانہ ڈاکٹر صاحب کو پیش کرتے تھے۔ ایک مہینہ قبل انتقال ہوا تھا لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ ابھی رخصت ہوئے ہیں۔ پورا جنازہ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ میں نے بہت قریب جا کر دیکھا چہرہ پر نور برس رہا تھا۔ مرنے کے بعد انسان کے دنیوی اعمال کا مشاہدہ اس کے چہرے کے نور یا سیاہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کیسی پُرخلوص خدمت مسلم یونیورسٹی کی کی ہے اس کا اندازہ یوں ہوا کہ رشید احمد صدیقی اپنے ایک خط میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کو لکھتے ہیں:

> "کبھی اس پر بھی غور کیجیے گا کہ چھوٹے بڑے روزگار اور ملازمتوں سے مسلمانوں کو لگا دینے کی جو خدمت ڈاکٹر ضیاء الدین نے مسلسل چالیس سال تک ہر طرح کی ہر دقت رسوائی جھیل کر انجام دی اس کا ہندوستان کی مسلمانوں کی حیثیت بنا دینے میں کیا حصّہ رہا ہے۔ کیا آپ کی نظر سے ایسا کوئی اور شخص موجودہ صدی میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے ۱۸۵۷ء کے آشوب کے بعد مسلمانوں کی آبادکاری میں سرسید کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین ہی کا درجہ آتا ہے۔ طلبا نے تو اپنی عقیدت کا حق اپنے طور پر ادا کر دیا۔ چاہتا تھا کہ اس جوبلی میں ہم آپ بھی اپنی عقیدت و احترام کا حق ادا کر دیتے! یہ کافی نہیں ہے کہ مرحوم کو سرسید کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔"[۹]

رام پور اور شاہ جہاں پور کے طلبا علی گڑھ کے کچھ اور سینیر طلبا مثلاً منن خاں اور منظر عالم وغیرہ نیز ڈاکٹر

صاحب مرحوم کے خاص خاص شاگرد اُن کو سر سید ؒ کے بغل میں دفن کرنا چاہتے تھے لیکن یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اُن کو نواب محسن الملک کے مزار کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ قبر بھی کھودلی گئی تھی۔ وہ طلبا جو سر سید کے بغل میں دفن کرنا چاہتے تھے اُن کا پلڑا بھاری تھا۔ بڑے جوش میں تھے اور ہر مقابلے کے لیے تیار تھے۔ شہر سے پتھر کاٹنے والے کاریگر پہلے سے بلا لیے گئے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب کا جنازہ جامع مسجد میں لایا گیا تو اتفاق سے میں وہاں موجود تھا۔ جامع مسجد کا بڑا حصہ اور خاص طور سے قبروں والی سمت طلبا کا بڑا مجمع تھا۔ الغرض وہی ہوا جو طلبا چاہتے تھے۔ قبر سر سید کے پہلو میں جانب مغرب کھودی گئی اور ۱۳ فروری ۱۹۴۸ء ڈاکٹر صاحب کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ بقول وکٹر ہیوگو:

"زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم ہو، لیکن
تاریخ اپنے فیصلے کے لیے موت کی
منتظر رہتی ہے۔"

کچھ عرصے کے بعد ذاکر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ اس وقت زمانے کے حالات کے تحت نواب اسمٰعیل خاں صاحب کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ذاکر صاحب کی ضرورت تھی۔ ذاکر صاحب نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا اور اچھے اور ایمان دار کام کرنے والے لوگ علی گڑھ بلائے۔ مثلاً انہوں نے ایک خط خان بہادر عبدالروف صاحب ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس کو لکھا جس میں درخواست کی کہ اس وقت علی گڑھ میں اُن کی شدید ضرورت ہے۔ خط طویل تھا۔ آخر میں لکھا کہ علی گڑھ آپ کے لیے چشم براہ ہے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کی تحریک پر عبدالروف صاحب الٰہ آباد سے ۱۹۵۵ء میں علی گڑھ تشریف لائے۔ اللہ والی کوٹھی (دودھ پور) میں استقبالیہ رسم ادا ہوئی جس میں ذاکر صاحب نے بڑی پرجوش تقریر کی۔ ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے سات محکمہ جات ان کے سپرد کیے۔ اس پیکرِ عمل نے علی گڑھ کے سنوارنے میں اپنی ساری توانائی اور صلاحیت صرف کردی۔ ان کے سپرد کروڑوں روپیے کی تعمیر عمارات ہی کا کام نہ تھا بلکہ ان کے سپرد باغات، فارم، شعبۂ اسٹورز، یونیورسٹی کے قانونی مشیروں کی سرپرستی، اس کے علاوہ وہ یونیورسٹی کے نائب خزانچی بھی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم کے علاوہ جملہ شعبہ جات ان کے سپرد ہیں۔ ترکی ٹوپی لگائے۔ شیروانی پہنے۔ ہاتھ میں چھاتہ پکڑے ہر وقت چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی کی ہزاروں ایکڑ زمین و جائداد جو سر ضیاءالدین احمد مرحوم کے دورِ وائس چانسلری میں دوسروں کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ ان سب کو عبدالروف صاحب نے بذریعہ مقدمات یونیورسٹی کو واپس دلایا آج جس زمین پر میڈیکل کالج کی عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں وہ اُن ہی کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ قلعہ تک کی ہزاروں ایکڑ زمین اور اس کا زراعتی فارم ان ہی کی حاصل کردہ زمین پر قایم ہے۔ ویمنس کالج کے لیے زمین حاصل کرنا اور سروہی (راجستھان) کی لاکھوں روپیہ آمدنی کی جائیداد کو یونیورسٹی کو دلوانا ان کے عظیم کارنامے ہیں۔ یونیورسٹی کی نئی عمارتیں (مولانا آزاد لائبریری۔ فیکلٹی آف آرٹس، جنرل ایجوکیشن، فیکلٹی آف سائنس کی بہت سی عمارتیں اور یونیورسٹی پالی ٹکنیک وغیرہ) اور قلعہ کے نزدیک لہلہاتے ہوئے شاداب باغات آج بھی ان کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔

عبدالروف صاحب کہا کرتے تھے کہ میری سات اولادوں میں (وہ شعبہ جات جو ذاکر صاحب نے ان کے سپرد کیے تھے) فارم سب سے زیادہ لائق اولاد ہے اور جب اس پر کوئی مصیبت آتی تو اُن کو معافی

صدمہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فارم کے کھلیان میں آگ لگ گئی تھی تو مرحوم بدحواسی کے عالم میں ملازمین کے ساتھ خود بھی پانی ڈال رہے تھے۔ ایک مرتبہ ان کو روحانی صدمہ اس وقت بھی پہنچا جب فارم کی کھیتی پانی دیر میں ملنے کی وجہ سے سوکھ گئی۔ ۱۹۷۲ء میں عبدالرؤف صاحب کا ۱۸۔ میور روڈ سول لائن الٰہ آباد میں انتقال ہوا۔ اور ہسوہ (ضلع فتح پور) کے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

علی گڑھ میں رہ کر مرحوم نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور کرنل بشیر حسین زیدی کے عہد میں کیسے کیسے کارنامے انجام دیے جس کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا چپہ چپہ گواہ ہے۔ کاش علی گڑھ میں ان کے نام کی کوئی یادگار قایم ہوتی۔

اس زمانے میں بدر باغ نفیس منزل میں پروفیسر خلیق احمد نظامی قیام پذیر تھے۔ نظامی صاحب ہمیں منزل تشریف لایا کرتے تھے۔ عبدالرؤف صاحب ان کی قابلیت کے قائل تھے۔ یہیں نظامی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ علمی حیثیت سے ڈاکٹر ہادی حسن، پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور پروفیسر نذیر احمد نے علی گڑھ کا نام دنیا میں روشن کیا ہے۔ ان چاروں حضرات (جن سے میرا نزدیکی تعلق رہا ہے) نے اسلامی تاریخ، تصوف، فارسی ادب اور علمی تحقیق پر دیرپا و درانہ کام کیا ہے۔

یہاں پر ایک ایسی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے، میری مراد علی گڑھ کے نول کشور یعنی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی مرحوم سے ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ علی گڑھ کی ہر مطبوعہ کتاب پر "باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شیروانی" لکھنا لازمی سا ہے لیکن ان کے مضامین اور خسرو کی مثنوی (مطلع الانوار ۱۹۲۶ء) کی تصحیح دیکھ کر معلوم ہوا کہ

مرحوم اس میدان کے بھی مرد تھے۔ پھر بھی انکساری کا یہ عالم تھا کہ فرماتے ہیں؛

"کوئی مجھے "مولوی" کہتا کوئی "ماسٹر"
مگر درحقیقت میں نہ منشی ہوں، نہ مولوی
نہ مسٹر نہ ماسٹر۔ وہی مثل ہے کہ پڑھے
نہ لکھے نام میاں محمد فاضل"

آئیے اب رشید احمد صدیقی مرحوم کی باتیں ہو جائیں کیونکہ ان کا تذکرہ کیے بغیر علی گڑھ کی بات نامکمل رہتی ہے۔ ارسطو نے کسی موقع پر کہا ہے؛

"عظیم انسانوں کی فطرت بنیادی طور
سے یاس و حزن کی طرف مائل ہوتی
ہے۔"

چونکہ ہم کو رشید صاحب کی زندگی کے آخری ایام سے واسطہ رہا ہے اور ان ایام میں ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ موصوف آخر عمر میں یاس اور حزن کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن ان کا دل معصوم تھا اور زندگی کی رعنائیوں سے پیار کرتے تھے۔ وہ کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ کسی کا دل توڑیں گے تو اُن کا اپنا دل ٹوٹ جائے گا۔ دوسروں کی خطاؤں پر مجلہ کرم ان کی فطرت تھی۔ ان سب چیزوں کے باوجود سب کے درمیان ان کی روح تنہا تھی۔ پہلے وہ دنیا کو ہنساتے تھے اور زیر لب مسکراتے تھے لیکن جب زندگی کے خزاں کا موسم قریب آگیا تو رونے اور رُلانے لگے۔ ان کو اپنے گھر سے محبت تھی اور علی گڑھ سے تو والہانہ عشق تھا۔ بقول ڈاکٹر ظ۔ انصاری:

"رشید صاحب نے عالی شان مکان
بنایا۔ گلاب کے تختے لگائے، دیوان خانے
اور مہمان خانے کی آرائش کی۔ مگر دمجروح
کو برسوں مہمان رکھا۔ گھریلو زندگی میں

بقول خود SYMPHONY ساتھ ان کا وہ تناسب قائم کیا اور اپنے گھر بار کو اتنا چاہا، اتنا چاہا کہ بالآخر وہ بھی ایسی چاہت میں ان کے گلے کا ہار بن گیا۔ انھیں چھاتی سے لگا کر بھینچ لیا۔"

رشید صاحب کی مثال دانتے سے اور اس کے شہر فلارنس کی علی گڑھ سے دی جا سکتی ہے۔ دانتے جب اپنی کوئی تخلیق پیش کرتا اور اس کے شہر فلارنس کا تذکرہ آجاتا تو وہ بے تاب ہو جاتا تھا۔ جنت ہو یا جہنم دانتے کی آنکھوں سے فلارنس کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ یہی کیفیت رشید صاحب کی تھی۔ علی گڑھ ان کا فلارنس تھا۔ علی گڑھ کے لیے جیتے رہے اور اس کی داستانیں سنانے میں ساری عمر گزار دی۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"میرا تو یقیناً اب یہی مصرف رہ گیا ہے کہ اس دانش کدے کے رستم و اسفندیار اور قیس و فرہاد کی رزم و بزم کی داستانیں سنایا کروں لیکن اس خیال سے ڈرتا بھی رہتا ہوں کہ ایسا تو نہیں کہ اس یونین اور ارباب یونین کا بھی یہی وظیفہ رہ گیا ہو کہ وہ داستانیں سنا کریں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ آج اپنی ہی داستانیں سننے کے لیے اکٹھا ہو جاتے ہیں۔"

ایک موقع پر علی گڑھ کے طلبا کا تذکرہ کرتے ہیں:

"علی گڑھ کا طالب علم بحیثیت مجموعی دوسرے اداروں کے طلبا سے آج بھی زیادہ معتبر و ممتاز ہے۔"

مرحوم کہا کرتے تھے کہ مجھے جو شے یا شخص اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہو جائے۔ علی گڑھ کے بارے میں ان کے یہ ارشادات ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

رشید صاحب کبھی کبھی تو علی گڑھ کا مقام اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ سننے والا یہ سوچنے لگتا ہے کہ علی گڑھ کی محبت میں نامعتبر بات کہہ دی گئی ہے:

"تمام دنیا کی اقوام اور ممالک کا اعتبار بالعموم اور مسلمان قوم اور ممالک کی خوشنودی و خیر اندیشی بالخصوص آسان و ارزاں حاصل کرنے کا سکۂ رائج الوقت یا امریکی ڈالر (علی گڑھ) ہمارے ملک کے سوا شاید ہی کسی اور ملک و قوم کو نصیب ہو لیکن اس سے جتنا نفع اٹھایا جاتا ہے اس تناسب سے نفع میں ہم کو شریک نہیں کیا جاتا۔"

"... لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ جہاں تک مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے مسلمان ہونے کا تعلق ہے، ہندوستان کے مسلمان ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ معتبر اور قابل تقلید ہیں نہ کہ اس کا عکس! اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے معتبر نمائندگی علی گڑھ کرتا ہے کچھ اور نہیں اس شعر کی منطق کی رو سے

نگویم درین گلشن گل و باغ و بہار از من!
بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من"

آخر میں بات ختم کرنے سے پہلے رشید صاحب کی
ایک چھوٹی سی تحریر پر قلم بند کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:
" کالج کی گزرگاہوں سے جب کبھی گزرتا
ہوں تو بے اختیار نجد اور یاران نجد یاد
آتے ہیں اور اس نجد کا کون ساقیس
ایسا ہوگا جو یہاں سے "سلام علی نجد ومن
حل بالنجد" کہے بغیر گزر جاتا ہوگا۔[19]

حواشی وحوالہ جات

۱ پہلے اس کا بڑا پھاٹک یونین ہال کی طرف تھا اور ایک پتلا سا راستہ ممتاز ہاؤس والی سڑک کی طرف نکلتا ہے۔

۲ نواب اسمٰعیل خاں وائس چانسلر کے والد بزرگوار نواب اسحاق خاں کے نام سے یہ گیٹ باب اسحٰق کہلاتا ہے۔

۳ ڈوڈلے اسٹیپ نے اپنی مشہور کتاب میں قاضی صاحب کا تذکرہ کیا ہے۔

۴ نگار، حسرت نمبر۔ جنوری۔ فروری ۱۹۵۲ء ص ۸۸

۵ دیکھیے The story of my experiment with truth P 482

۶ نگار۔ کراچی، حسرت نمبر ۱۹۷۶ء ص ۴-۲

۷ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشہور علی گیرین ہیں۔ مسلم انٹر کالج فتح پور میں اردو کے لکچرر رہے۔ اب پنشن لے لی ہے اور باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔

۸ مکاتیب رشید احمد صدیقی۔ مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی' دہلی ۱۹۷۸ء، ص ۱۴۱-۱۴۲

۹ منظر علم گوالیار کے رہنے والے تھے اور وہاں کے راجہ کے خلاف بغاوت کے جرم میں ریاست بدر کر دیے گئے تھے۔ شادی نہیں کی تھی بعد میں پاکستان چلے گئے۔

۱۰ ان پر ایک تفصیلی مضمون نامورانِ علی گڑھ نمبر (رسالہ فکر ونظر) کے لیے لکھا گیا ہے۔ مضمون ابھی شائع نہیں ہو سکا نیز دیکھیے خاکسار کی تصنیف تاریخ وتحقیق (لکھنؤ ۱۹۸۴ء) ص ۲۸۳۔

۱۱ خط ۱۸ میور روڈ سول لائن الٰہ آباد میں محفوظ ہے

۱۲ تفصیل سے دیکھیے: تاریخ وتحقیق، لکھنؤ ۱۹۸۴ء، ص ۵۳

۱۳ المقبول (مجموعہ مضامین محمد مقتدیٰ خاں شیروانی) اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۹ء

۱۴ شاعر۔ بمبئی جلد ۱/۴۴ شمارہ ۱

۱۵ فکر ونظر علی گڑھ اپریل ۱۹۶۱ء

۱۶ ایضاً

۱۷ ایضاً

۱۸ ایضاً

۱۹ ایضاً

عربوں کے عادات و اطوار

اور ان کا رہن سہن

شاہد قمر آفریدی (علیگ) ◇

عرب قوم جدید تہذیب سے بے حد متاثر ہوئی ہے لیکن اس نے اپنی تہذیب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے گو کہ ان کی عورتیں جدید ترین فیشن کرتی ہیں، پھر بھی برقعہ عربوں کی تہذیب کا ایک قدیمی نشان ہے، معاشرے میں عورتوں کا بے حد احترام ہے۔ بے پردگی کو معیوب ہی نہیں بلکہ معاشرے میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے پیش نظر مستورات کھلے پاؤں اور ہاتھوں پر سیاہ دستانے اور موزے کا استعمال کرتی ہیں مگر ہاتھوں میں مہندی لگانے کی بہت شوقین ہیں سونے جواہرات کا بھی عام رواج ہے اور چپلیں پہننے سے زیادہ اونچے چپل یا سینڈل پہننا پسند کرتی ہیں روزمرہ کے کپڑوں میں میکسی کا رواج ہے جو خوبصورت رنگین ہوتی ہیں اور اپنی پسند کے کپڑے درزی کی دکان پر جاکر سلواتی ہیں۔ اس کے لیے خیاط المرجانی اور خیاط سا، لیڈیز اور جینٹس درزیوں کی بڑی بڑی دکانیں مختلف شاہراہوں کے کنارے ہیں ایسی ہی بگوڈ نام کی ایک دکان پر بہت سی عورتوں کو کھڑا دیکھا جو کھڑکی نما جگہ سے مرد درزیوں سے باتیں کر رہی تھیں جب کہ اپنے یہاں کے درزی بغیر عورت کے ناپ کے کپڑا سیتے ہی نہیں ہیں۔ یہاں چھ سات سال کی لڑکی کو شروع سے ہی برقعہ اوڑھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ عورتیں گوشت کھانے کی بہت شوقین ہیں۔ دکانوں پر مرغی، بکرے، اونٹ کا گوشت روسٹ (بھنا) ملتا ہے جس کو سینڈوچ میں پیٹ کر کھایا جاتا ہے۔ یہاں کی عورتیں اپنے گھروں میں روٹیاں نہیں بناتیں بلکہ بازار سے خبز، تمیز منگواتی ہیں جو عرب روٹی کا نام ہے یہ روٹی ایک ریال کی آتی ہے اور اتنی بڑی ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا شخص بھی پوری روٹی نہیں کھا سکتا ــــ عموماً چھری سے اس کے ٹکڑے کر لیے جاتے ہیں اور یہاں ایک خاص قسم کی دال جو "فول" کہلاتی ہے، اس میں زیتون کا تیل ڈال کر بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ کھانے کے دوران ایک سبز قسم کی پتی خضار سلاد کے ساتھ پسند کرتے ہیں۔ گوشت کے علاوہ سبزیاں ٹماٹر، آلو، لیمو، پیاز اور پیاز کی پتیوں کا بھی استعمال ہوتا ہے اور چاول تو بہت پسند کیا جاتا ہے گو کہ امریکہ اور ادھر ادھر سے چاول یہاں بہت آتا ہے مگر جو باسمتی چاول ہمارے یہاں کا ہوتا ہے وہ سب پر

◇ ص ب ۲۷۰۳ - مدینہ منورہ - سعودی عربیہ -

غالب ہے۔ عرب لوگ اسی چاول کو بہت پسند کرتے ہیں کھانے کے دوران یہ خوبی دیکھی کہ ایک بڑے طباق میں سب لوگ ایک جگہ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ بریانی میں اونٹ، بکری اور شکاری جانوروں کا گوشت مرغوب ہے۔ کھانے کے دوران مشروبات پیپسی، میرنڈا، تیما جو مشروبات کے نام ہیں گھونٹ گھونٹ پیتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب عورتیں شادی کے بعد بہت موٹی ہوجاتی ہے۔

قہوے کے یہ لوگ بہت شوقین ہیں۔ ہر گھر میں ہر فرد بغیر قہوہ پیے نہیں رہ سکتا۔ چائے بھی عام ہے جو بغیر دودھ کے پی جاتی ہے اور کھجور تو یہاں کا مشہور میوہ ہے، جس کی کاشت بھی کی جاتی ہے اور کھجور کے موسم کے علاوہ دوسرے مہینوں میں ریفریجریٹر میں رکھ رہتے ہیں۔ کھجور کی بہت سی قسمیں ہیں جس میں سے اجوہ کھجور بہت مہنگی ملتی ہے اور امراض میں نافع ہے۔

عرب کے ریگستانی ماحول میں جہاں گھوڑے اور اونٹ کے بغیر سفر مشکل تھا اب اس کی جگہ ایئر کنڈیشنڈ غیر ملکی کاروں نے لی ہے۔ ہر فرد کے پاس کار ضرور ہے۔ چاہے وہ صحرا یا شہر میں رہتا ہو۔ اونٹ گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں، مرغیاں بھی عرب لوگ پالتے ہیں لیکن شہری آبادی سے دور مزرع میں یہ نظر آتے ہیں۔ ایک دن تو مجھے حیرت ہوئی کہ قدیم سواری جدید سواری کے ذریعہ دوڑ رہی تھی۔ میں ٹیکسی کے انتظار میں شارع عیون پر کھڑا تھا تو دیکھا ایک بدو عربی اپنی پک اپ مزدا میں 'اونٹ' کو لیے جارہا ہے۔ اونٹ بیچارہ معصومیت سے پک اپ کے پچھلے حصے میں جکڑا بیٹھا بڑے آرام سے جگالی میں مصروف تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بدو کے اس انداز پر ہنسی آئی۔

عرب لوگ عام طور پر خوش رہتے ہیں کہ فکر معاش کی پرواہ نہیں۔ یہ انگریزی لباس کم پسند کرتے ہیں۔ مردوں میں ایک لمبا کرتہ جو میکسی سے مشابہ ہوتا ہے اور ٹخنوں تک نیچا ہوتا ہے وہ پہنتے ہیں جس کو ثوب کہا جاتا ہے اور سر پر ایک بڑا رومال جس کو شماغ کہا جاتا ہے عقال سے باندھ کر اوڑھتے ہیں۔ شماغ سرخ رنگ کے رومال کا نام ہے اور ابیض' سفید رنگ کے رومال کو کہتے ہیں جس کا استعمال عام ہے۔

شام میں مرد اور عورتیں' بچے" حدیقہ" گھومنے ضرور جاتے ہیں جہاں بڑے بڑے خوبصورت گھاس کے لان ہوتے ہیں اور بچوں کے لیے جھولے وغیرہ کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ ہری ہری گھاس پر بیٹھے بیٹھے تھرماس سے قہوہ جس کو "گہوا" بولا جاتا ہے پی کر خوشی خوشی زندگی کے مزے لیتے ہیں۔

مذہبی اعتبار سے یہاں کے لوگ نماز روزہ کا اہتمام کرتے ہیں اور ہر عرب کی کار میں ایک مصلیٰ نماز پڑھنے کا ضرور ہوتا ہے کہ جب کہیں سفر میں ہو تو اسی کو بچھا کر نماز پڑھ سکیں۔

ریت تو ان کا محبوب ترین دوست ہے۔ ریت پر بیٹھنے میں یہ کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے۔ اکثر شاہراہ سے ہٹ کر بکھری ریت پر بیٹھے بہت سے عرب خاندان نظر آئیں گے۔ کار پاس ہی کھڑی ہوتی ہے اور رات گئے تک صحرائی فضا سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تمباکو کے بہت شائق ہیں۔ ہر عرب سگریٹ، سگار اور حقہ ضرور پیتا ہے اور حقہ پینے کے لیے شہری آبادی سے ہٹ کر جہاں نخلستان ملیں گے وہاں پر منتزہ بنے ہوتے ہیں۔ حقہ کو عربی زبان میں "شیشہ" یا "مجر" کہا جاتا ہے اور منتزہ' حقہ گھر نام ہے جہاں لوگ بیٹھ کر حقہ پیتے ہیں۔ یہ جگہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے بڑی بڑی قالینوں پر گاؤ تکیہ سلیقے سے رکھا ہوا شطرنج تاش اور کیرم کا کھیل بھی وقت گزاری کا ایک مشغلہ

ہے۔ منتزہ السمر، منتزہ الشلال، منتزہ استراحتہ الامہ دیکھے اور جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں عرب احباب کے ہمراہ خوش وخرم نظر آتے تھے۔ چونکہ یہاں دولت کی فراوانی ہے تو ہر شخص خوش حال ہے اس کے لیے وقت کاٹنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اکثر کاروں میں دور دور تک کا صحرائی سفر کرتے ہیں اور کار خطرناک حد تک تیز رفتاری سے چلاتے ہیں۔

عربوں کا قومی کھیل کبھی تیر اندازی اور شتر سواری ہوا کرتا تھا جس کی جگہ فٹ بال کو خاص اہمیت مل رہی ہے۔ فٹ بال کے میچ میں بڑی بڑی شرطیں لگاتے ہیں جس طرح گھوڑ دوڑ میں جیتنے کے لیے ایک دوسرے سے شرطیں طے کرتے ہیں۔ فٹ بال تو بچے بچے سڑکوں پر کھیلتا ہوا ملے گا۔ بچے اتنے نڈر اور بے خوف ہیں کہ اگر بال سڑک کے درمیان جا گرتی ہے تو بے پروائی سے دوڑتے چلے جاتے ہیں کیونکہ کار چلانے والے کو سخت توہین کا نہ کیے ہوئے خود ہی کار احتیاط سے چلانا پڑتی ہے۔ بجلی جیسی تیز رفتاری اور بے احتیاطی دیکھی کہ اکثر ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ جدہ جانے کے دوران ایک جگہ کار ایک سو بیس کی رفتار سے جا رہی تھی کہ ٹریفک جس کو مرور کہتے ہیں اس نے سپاہیوں نے کمپیوٹر انٹینا سے چیک کر لیا اور چیک پوائنٹ سے پہلے روک کر جرمانہ شیٹ تھما دی پولیس (شرطہ) ٹریفک پولیس (مرور) جدید ترین ہتھیاروں سے لیس رہتی ہے اور غلطی کرنے پر ان کے یہاں معافی کا کوئی خانہ نہیں ہوتا۔ اگر خدانخواستہ ایکسیڈنٹ میں الجھاؤ ہو گیا تو بس کوئی داد و فریاد نہیں۔ سر موند داکر جیل بھیج دیتے ہیں بعد میں جو بھی فیصلہ ہوتا ہے! فیصلہ کا دار و مدار مدعی اور مدعا علیہ پر ہے اگر آپس میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو رعایت برتتے ہیں ورنہ ضمانت بھی منظور نہیں ہوتی ہے۔

یہاں کے لوگ فن موسیقی کے بہت شوقین ہیں۔ موسیقی تو بس ان کی جان ہے۔ کاروں میں، گھروں میں ٹی وی، ریڈیو پر عربی نغمے گونجتے رہتے ہیں اور خود بھی مست ہو کر تالیاں بجا بجا کر لے الاپتے رہتے ہیں۔ اکثر دفتر میں کام کرنے کے دوران بھی گنگنانے کی دھن چھیڑ دیتے ہیں اور کھڑے ہو کر دو ایک بار رقص کر کے مسکرا دیتے ہیں بہرحال وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ ان کے گھروں پر بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے مہمانوں کے ساتھ کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع کا اظہار نہیں کرتے۔

رات رات بھر نغمے، موسیقی اور ویڈیو پروگرام دیکھتے سنتے ہیں اور ان دنوں تو مصری رقص ویڈیو پر ہر عرب دیکھنے لگا ہے۔ یہاں دفتروں میں جمعہ کی چھٹی رہتی ہے لیکن جمعرات کی شام ان کے لیے بے حد خوشی لاتی ہے اور ہر جگہ پکنک مناتے ہیں۔ عربوں کی گھریلو اور ذاتی زندگی میں یک رنگی نہیں ہوتی۔ تین چار بیویوں کا رواج ان کے یہاں زیادہ ہے لیکن وہ لوگ بیویوں کے حقوق کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی بیویوں کو شکایتیں بھی ہوتی ہیں لیکن وہ کبھی کورٹ کچہری نہیں جاتیں۔ بلکہ بزرگ آپس میں مل بیٹھ کر خاموشی سے مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہاں کے قانون کے تحت کوئی بھی سعودی عورت کسی بھی غیر سعودی شخص سے شادی نہیں کر سکتی جب کہ سعودی مرد کسی بھی غیر ملکی عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ جو سعودی تین تین چار چار بیویاں رکھتے ہیں کیا وہ آپس میں خوش رہتی ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے عربی دوست سے معلوم کیا تو وہ بے حد ہنسا اور بولا کہ جب ہم انھیں خوش رکھتے ہیں تو ان کا فکر مند ہونا کیسا ؟ ؟ عرب عورتیں اچھے کھانے کی بے حد شوقین ہونے کے علاوہ شاپنگ کی بھی بے حد رسیا ہیں۔ ان کے گھروں

میں قیمتی Modern luxury پسند ہر چیز ملتی ہے، چاہے وہ چرواہا کیوں نہ ہو۔ دیہی علاقوں میں خود میں نے مشاہدہ کیا ہے۔

تمباکو اور قہوہ کی شوقین مزاجی سے عربوں کی آئندہ آنے والی نسل متاثر ہو رہی ہے۔ نئی نسل کے نوجوان اور کم عمر بچے تک سگریٹ اور چائے کے بید عادی ہیں۔ دولت کے نشے نے ان کو عیش پسند ہی نہیں بلکہ کاہل بنا دیا ہے۔ جس دفتر میں آپ اُن کو دیکھیں گے تو اُن میں سے دو ایک کرسیوں پر اونگھتے ہوئے ملیں گے۔

غیر ملکی پرائیویٹ کمپنیاں مقامی لوگوں سے کچھ کچھ ویسے ہی ڈرتی ہیں اور مزدور سے مزدور قسم کا عرب شہری یہاں کے قوانین سے واقف ہے۔ سیدھا وزارۃ العمل والشؤون الاجتماعیہ ۔ (Ministry of Labour) پہنچتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ایک ملکی پرائیویٹ کمپنی میں پیش آیا کہ ایک بدو عرب جو غیر پڑھا لکھا سواق (ڈرائیور) تھا اپنی تنخواہ میں سے کچھ گھنٹے کم ہونے کی وجہ سے منسٹری آف لیبر کے عملے کو کمپنی میں لے کر آ گیا۔

سعودی عرب میں دیہات کی آبادیاں شہری آبادیوں سے قدرے مختلف نظر آتی ہیں جو قدیم عرب آبادی پر مشتمل ہیں۔ ان میں زیادہ تر بدو قبائل اور دیگر قبیلے رہتے ہیں جو صرف تجارت کرتے ہیں اور کھیتی باڑی بھی۔ طویل رقبے میں پھیلی زمینوں پر ان کے مزروع کھجوروں اور انار کے باغات پر مشتمل نظر آتے ہیں اور سبزیوں کی بھی کاشت کرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے مقصد سے مدینہ منورہ کی زمین بید زرخیز اور قابل واقع ہوئی ہے۔

جانوروں کی سواری کے علاوہ ٹیوٹا، مزدا، کریسیڈا پک اپ استعمال کرتے ہیں جس میں سبزی وغیرہ بھر کر سوق الخضرا، سوق التمور نام کی منڈیوں میں لے جاتے ہیں۔

یہاں سونا اور پٹرول بہت سستا ہے۔ پٹرول ایک ہلاہ لیٹر جو تقریباً ہندوستانی ڈھائی روپے کے برابر ہوتا ہے اور سونے کی بڑی بڑی دکانوں پر خوبصورت جواہرات سے مزین زیورات ملتے ہیں۔ ان دکانوں پر عورتوں کی بہت بھیڑ دیکھنے میں آتی ہے۔

عرب کا قانون قرآن و حدیث ہے جس کی روشنی میں ہی سارے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں، جن کے لیے شرعی عدالتیں موجود ہیں۔ اذان ہوتے ہی دکانیں اور بازار بند کر دیے جاتے ہیں اور پھر نماز کے بعد کھل جاتے ہیں۔

رمضان کے دنوں میں یہاں تمام دن بازار بند رہتے ہیں صرف رات کو ہی بازار، بنک، ڈاک خانے اور دفاتر کھلتے ہیں۔ یہاں رمضان المبارک کا بید احترام کیا جاتا ہے اور ہر فرد ان مقدس دنوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ غیر ملکی کمپنیوں کے غیر مسلم ملازم بھی بےحد پاس ادب کرتے ہیں۔ دفتروں میں صرف چھ گھنٹے ڈیوٹی کر دی جاتی ہے۔

عرب انتظامیہ اپنے شہریوں کو شناختی کارڈ جاری کرتی ہے۔ ہر شہری شناختی کارڈ رکھتا ہے غیر مقیم باشندوں کو پاسپورٹ اور اقامہ رکھنا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر کوئی پوچھ تاچھ نہیں۔ سیدھے حوالات اور جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہاں شرطہ (پولس) کے نہایت سخت قوانین ہیں۔ ہر سپاہی کے گلے میں چھوٹی قسم کی آٹو میٹک ٹاکی ہی لٹکی رہتی ہے۔ رشوت اور کرپشن سے معاشرہ پاک ہے جس کی وجہ سے مجرم کو فرار

ممکن نہیں۔

یہاں ہر جگہ عربی زبان بولی جاتی ہے لیکن دفتروں میں زیادہ تر عملہ انگریزی بولنا سمجھتا ہے۔ پھر بھی بازاروں، دکانوں، دفتروں میں مختلف النسل لوگ ملازم ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعاون و خلوص کے ساتھ کام انجام دیتے ہیں۔

عرب شہریوں میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حکومت کے وفادار ہیں۔ شاہ فہد بن عبدالعزیز پر جان چھڑکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ نے ہر سعودی باشندے کو ہر قسم کی سہولت دے رکھی ہے۔

نہ یہاں جلسے جلوس ہوتے ہیں اور نہ وعظ و تقریریں اور نہ جھگڑے و فساد۔ جب کہ یہاں کے خوشگوار ماحول میں غیر ملکی باشندے مقامی لوگوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہے ہیں اور نہ ہی کسی بات کی ان کو پریشانی ہے۔

ہندو اور مسلمان ہندوستان کی خاک سے اُٹھے ہیں اور اسی کی مٹی میں جاکر دم لیں گے۔ اُن کی صورت حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بھائی چارہ اور خیر سگالی کے انداز پر رہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اور دونوں سے ہندوستان کو اور ہندوستان سے نوع انسانی کو تقویت ہو۔ شانہ سے شانہ ملا کر حال کی کی مشکلات سے (جن کی فہرست کوئی مختصر نہیں) نبرد آزما ہوں چہ جائیکہ ماضی کے جھگڑوں اور عصبیتوں کے موجودہ اختلافات کو اور پیچ در پیچ بنانے کے لیے طلب کریں۔

سید حامد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۰ شمارہ ۵ (مئی ۱۹۹۱ء)

عفونت اور نظریۂ جراثیم

فراست علی *

سائنسی تحقیقات نے جہاں زندگی کے دوسرے میدانوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے وہیں طبی دنیا کو بھی بہت سے نئے نظریات اور نئی معلومات سے نوازا ہے۔ ان جدید نظریات میں سے ایک "نظریۂ جراثیم" ہے۔ خوردبین کی ایجاد نے اس کو عملی اور تجرباتی طور پر ثابت کر دیا ہے۔

عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ جدید سائنس کی دین ہے اور طب قدیم میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، لیکن یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جراثیم کا اتنا واضح تصور اطبائے قدیم کے یہاں نہیں ملتا ہے جتنا کہ دورِ جدید میں خوردبین کی ایجاد کے بعد ہوا ہے لیکن اس کا مطلق انکار غیر منصفانہ ہے۔ اطباء نے واضح طور پر کہا ہے کہ بہت سے امراض اخلاط میں عفونت پیدا ہونے کی وجہ سے لاحق ہوتے ہیں۔

یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ آج کے خوردبینی دور سے سیکڑوں اور ہزاروں سال پہلے اطبا نے بعض امراض خاص طور سے متعدی امراض کے بارے میں کافی حد تک تفصیلی معلومات دی ہیں اور ان کا سبب آب و ہوا میں فساد اور آلودگی قرار دیا ہے۔ خاص طور سے ابن سینا نے صاف لفظوں میں اجسام ارضیہ خبیثہ کا نام لیا ہے اور ان کو عفونت اور آب و ہوا میں فساد و آلودگی پیدا کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ جدید سائنس نے ان کے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی، اور بتلا دیا کہ آب و ہوا میں آلودگی جراثیم کے ذریعے ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں مختلف اطباء کے اقوال و نظریات میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ رازی (متوفی ۳۱۲ھ ۹۲۵ء) نے اپنی کتاب الحاوی کی مختلف جلدوں اور مختلف مقامات پر عفونت اور متعدی امراض کے بارے میں اپنی معلومات، تجربات اور مشاہدات کا ذکر کرتے ہوئے جالینوس، قسطا اور طبری کے اقوال و نظریات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً

"جالینوس نے اصناف حمیات کے پہلے مقالے میں لکھا ہے:

"موتان کے مریض کے ساتھ رہنا خطرناک ہے اس لیے اسے تعدیہ کا اندیشہ رہتا ہے۔ اسی طرح جرب و رمد اور دق ریوی کے مریضوں کے ساتھ رہنا اٹھنا اور بیٹھنا

---

* ایم ڈی۔ سال دوم، شعبہ کلیات، اجمل خان طبیہ کالج، اے ایم یو علی گڑھ

[redacted]

بھی خطرناک ہے۔ حاصل یہ کہ ہر ایسے شخص
کے ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں جس سے
تنفس میں خارج ہونے والی ہوا میں عفونت
ہو۔ یہ لوگ جن گھروں میں رہتے ہیں ان
کی فضا میں بھی آلودگی آجاتی ہے)

اسی طرح قسطا کا قول ہے

"جرب اور سل کا تعدیہ ہوتا ہے اس
لیے کہ جو ہوا ایسے مریضوں کے ارد گرد
ہوتی ہے، اس میں دوسرے سانس
لیتے ہیں۔"

آشوب چشم کے متعلق خود رازی کا قول ہے:

"آشوب چشم کا تعدیہ اس شخص کو ہوجاتا
ہے جو دیر تک اس مرض میں مبتلا شخص
کو دیکھتا ہے۔"

اسی باب میں طبری کے قول کا ذکر کرتے ہوئے رازی
کہتا ہے کہ

"جدری کا تعدیہ ہوتا ہے۔"

طبری نے اپنی کتاب معالجات بقراطیہ میں خارشتی
کے کیڑوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ

"خارشتی میں چھوٹے چھوٹے کیڑے
پائے جاتے ہیں جس طرح کہ دانت، کان
اور عرق مدنی میں کیڑے پائے جاتے
ہیں۔"

اطبائے قدیم کے جراثیمی تصور کے سلسلے میں طبری کے اس
تعجب خیز مشاہدہ اور انکشاف کا ذکر کرتے ہوئے علامہ
کبیرالدین اپنے رسالہ "جراثیم اور طب قدیم" میں ایک
جگہ لکھتے ہیں:

معالجات بقراطیہ ایک قدیم تاریخی کتاب ہے
اس کے مصنف کا نام ابوالحسن احمد بن محمد
طبری ہے اور جس کو مختصراً ہمیشہ طبری کہا جاتا
ہے۔ ان کی کتاب میں جرب کے کیڑوں کا
ذکر ہے۔ یہ ذکر اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ
میں نے اس کا تذکرہ طب کی تاریخ میں
بھی پڑھا جو یورپی مورخین کی لکھی ہوئی ہے
اہمیت کا پہلو یہ ہے کہ اتنی باریک چیز
کے مشاہدہ کا ذکر اس سے پہلے کسی
تصنیف میں نہیں ملتا۔ یہ دنیا کی پہلی
کتاب ہے جس میں ایسی دقیق چیز کے
چشم دید معائنہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔

مذکورہ اقوال و بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ
عفونت طبی دنیا کی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس حقیقت
نے اس وقت ایک نیا موڑ لیا جب عہد وسطی میں
ابن سینا نے عفونت اور اس کے ذمہ دار اجسام
خبیثہ کے متعلق اپنے نظریات و خیالات کو نئے اور
واضح انداز میں پیش کیا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ عفونت
کو امراض متعدیہ اور حمیات وبائیہ کا ذمہ دار قرار
دیا ہے۔ بلکہ عام بخارات اور جسم میں نکلنے والے
اورام کو بھی عفونت کا نتیجہ بتلایا ہے۔ اخلاط میں عفونت
کے اسباب و عوامل، خراب و ردّی غذاؤں کا استعمال
عروق میں سدہ کی موجودگی خراب آب و ہوا کو بتلاتے ہوئے
اس کی مثال خمیر سے دی ہے اور کہا ہے کہ جس
طرح انگوری جوس میں تخمیری عمل ہوتا ہے، اسی طرح
کا عمل عفونت الدم میں بھی ہوتا ہے۔ یہ بات ذہن کو
لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ عفونت الدم یا۔ بعد
Licaemia میں خون کا P.H کم ہوجاتا
ہے اور اس کی تیزابیت بڑھ جاتی ہے۔

لوئس پاسچر (Louis Pasteur) جس کو جراثیم اور
Originator of Microbiology

کہا جاتا ہے۔ شراب کے عمل تخمیر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شراب کیمیاوی ردّ عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا تعلق زندہ اجسام اور yeast cell سے ہے ان Globules کے منتظم ہونے کے نتیجے میں شراب بنتی ہے۔ گرو دنیک شینک (Cruickshanks) اپنی کتاب Microbiology and Medecine میں پاسچر کے نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> He concluded his paper in 1857 with these words "Alcoholic fermentation is an act correlated with the life and with organization of these globules and not with their death or their putrefaction"

۱۸۶۷ء میں جوسف لیسٹر (Joseph Lister) نے جو ایک انگلش سرجن تھا پاسچر کے خیالات کو دیکھتے ہوئے Compound fracture اور amputation کے مریضوں کو Carbolic acid اور Phenolic dressing کے ساتھ علاج کرنا شروع کیا۔ اس طرح اس نے ہلاکت کی شرح کو کم کر دیا۔ پھر اس نے بھی یہی کہا کہ تعفن یا sepsis عمل تخمیر کی طرح ہوتا ہے جس کے ذمّہ دار غیر مرئی زندہ اجسام ہوتے ہیں جنکو ۱۶۷۵ء میں لیون ہک little animal نے leeuwenhoek کہا ہے۔ کروکشینک اس کے متعلق لکھتا ہے:

> " He prevented bacterial growth in the exudate and so satisfied himself that putrefaction or sepsis was caused like fermentation by these invisible but living microbes which leeuwenhoek (1676) two centuries earlier had called his little animals"

ان سطور سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پاسچر اور لیسٹر دونوں نے عمل تعفن کو ابن سینا کی طرح عمل تخمیر قرار دیا ہے، ساتھ ہی ان دونوں نے عملی اور تجرباتی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ تخمیر یا تعفن پیدا کرنے میں غیر مرئی زندہ اجسام حصّہ لیتے ہیں۔ انھیں نظریات سے ملتے جلتے، کسی تجربہ گاہ میں تعفن اجسام ارضیہ خبیثہ کی وجہ سے ہوتا ہے، غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے وہ تعفن کے اسباب وعوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے: -

> " پانی بسیط یعنی پاک وصاف ہونے کی حالت میں متعفن نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے ساتھ اجسام ارضیہ خبیثہ مل جایا کرتے ہیں اور وہ مل کر سارے اجسام میں ردی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہوا کا بھی حال ہے۔ بسیط ہونے کی حالت میں متعفن نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے خراب بخارات مل جایا کرتے ہیں اور ہوا میں ردی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔"

یہاں خراب بخارات سے مراد متعفن مقامات سے اٹھنے والی گیسیں ہیں جن کے ساتھ اجسام خبیثہ

کی ہیئات ہوتی ہے۔

تعفن اور آب و ہوا میں آلودگی کے اسباب و عوامل کی یہ تشریح دور جدید کے نظریات کی توضیح اور ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ اسی صفحہ پر آگے چل کر وہ مزید لکھتا ہے:

"کبھی زمین کے اندر ایسے اسباب سے تعفن لاحق ہوتا ہے کہ ہم اس کے جزئیات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ پھر وہ اسباب ہوا پانی کی طرف منتقل ہو کر ان کو بھی متعفن کر دیتے ہیں۔"

ابن سینا نے جن چیزوں کو جزئیات سے تعبیر کیا ہے وہ آج کے جراثیم ہیں۔ یہ قول آنے والے اطباء کرام اور دانشوروں کے لیے سوالیہ نشان اور ان کے ذہنی دریچوں پر دستک دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنی وسعت علمی کے مطابق ان جزئیات کا پتہ لگائیں لیکن طبی دنیا کے ساتھ یہ عجیب سانحہ ہے کہ بعد کے ادوار میں ابن سینا اور دوسرے متقدمین کے نظریات و تصورات میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علاج و معالجہ تشخیص اور ادویہ کے باب میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوا ہے لیکن طب کے بنیادی اصول و قوانین جن کو ہم آج بھی طب کا بنیادی فلسفہ گردانتے ہیں، تبدیلی اور اضافات سے محروم ہے۔

مراجع

۱؎ محمد بن زکریا رازی الحاوی فی الطب۔ جلد ۲۳ ص ۲۶۸۔
۲؎ ایضاً " " ص ۲۶۶
۳؎ ایضاً " " ص ۲۶۳
۴؎ ایضاً " " ص ۲۶۹۔
۵؎ حکیم کبیر الدین۔ جراثیم اور طب قدیم۔ حیدرآباد، دفتر المسیح، نور الامراء ۱۹۵۴ء ص ۱۵
۶؎ حکیم کبیر الدین ترجمہ کلیات قانون۔ دہلی، دفتر المسیح بلی ماران، ۱۹۵۹ء ص ۴۱
۷؎ کرونک شینک مائکرو بایولوجی اینڈ میڈیسن ج ۱، بارہواں ایڈیشن لندن ص ۱
۸؎ ایضاً " " " "
۹؎ ابن سینا۔ الحمیات۔ القانون فی الطب مطبع لکھنؤ ترجمہ، ۱۲۹۴ھ ص ۱۴۰
۱۰؎ ایضاً "

"کمزوروں کا بوجھ ڈھونا نماز کے برابر اور راستے سے مضر چیزوں کا ہٹانا ایک نماز کا ثواب رکھتا ہے۔" - ابن تیمیہ۔

ہم کہاں اور وہ کہاں

خالد یوسف خاں*

تیز رفتار روشنی جب تیزی سے سفر کرتے ہوئے دیکھنے والے کی طرف آتی ہے تو روشنی کا طیف یا اسپیکٹرم (Spectrum) نیلا یا نیلے رنگ کا سا معلوم ہوتا ہے اور جب ناظر سے دور جا رہی ہوتی ہے تو روشنی کا اسپیکٹرم سرخی مائل یا آتشی سرخ رنگ کا معلوم ہوتا ہے"۔

انسان کو نظر آنے والے روشنی کے اس عمل کو سائنسی اصطلاح میں ڈوپلر افیکٹ (Doppler Effect) کہتے ہیں اور سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہمارے خلا کے ستاروں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ستارے قریب آنے کے بجائے دور جاتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔ یعنی خلا دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

مسلمانوں میں خاص کر مسلم نوجوانوں میں تعلیم بالخصوص سائنسی تعلیم کی طرف سے عدم توجہی کا اگر ڈوپلر افیکٹ سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد تعلیم کی طرف سے جو خلا بننا شروع ہوا تھا وہ دن بہ دن بڑھ رہا ہے اور اب حالات اور ماحول نے اس میں تیزی بھی پیدا کر دی ہے۔

نویں اور دسویں درجے کے طلبا سے اگر پوچھو کہ تم نے سائنس کیوں نہیں لی؟ تو جواب ملتا ہے کہ بڑی مشکل ہے، سمجھ میں نہیں آتی۔ انگریزی اس لیے نہیں لی کہ فیل ہونے کا ڈر ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ فیل وہ ہوتا ہے جو امتحان کی تیاری اچھی طرح نہیں کرتا ہے۔ فیل ہونے کی شرط کم پڑھنا یا نہ پڑھنا نہیں ہے بلکہ اچھی طرح تیاری نہ کرنا ہے، سمجھ میں نہ آنا، دل کا نہ لگنا، فضول کی باتیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ اپنے مقصد (امتحان، تلاش معاش، ڈپارٹمنٹ میں ترقی، نجی کاروبار شروع کرنا، انڈسٹری یا فیکٹری لگانا) کے لیے کیا کیا ضروری ہے؟ یہ ضرورتیں کہاں کہاں سے پوری کی جا سکتی ہیں۔ ان کے لیے کتنا وقت درکار ہے؟ آیا ہم یہ ضرورتیں مہیا کر سکیں گے، درکار وقت صحیح معنوں میں لگا سکیں گے؟ اگر جواب مثبت ہے تو یہ ضروری ہے کہ انسان فوراً کام میں لگ جائے، حصولِ مقصد کو اوڑھنا بچھونا بنا لے اور اپنے مقابل یعنی ویسے ہی مقاصد میں لگے دوسرے لوگوں سے زیادہ معلومات رکھے اور ان کا صحیح معنوں میں استعمال کرے۔ ان تینوں میں سے سب سے زیادہ اہم کام ہے کام کا فی الفور شروع کر دینا۔ کیونکہ کسی بھی کام کی شروعات ہونے کے بعد

---

* ۱۲۸ - ۱۲۷ الف خاں سرائے، بدایوں۔ اتر پردیش۔

بوسفش اور محنت سے گھنے پر کام تیزی پکڑتا جاتا ہے
اور دن بہ دن آسان ہوتے لگتا ہے اور وقت معینہ پر اور
کبھی کبھی اس سے پہلے پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ اسی کا نام
کامیابی ہے۔ ہر کامیابی انسان کو تقویت عطا کرتی ہے
اور دوسرے مقاصد کے حصول میں حوصلہ افزائی کرتی ہے
کسی بھی کام کو بُرا نہ سمجھنا چاہیے اور نہ کسی بھی منزل
کو آخری۔ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی دھن میں لگے رہنا ہی زندگی
ہے۔ زندگی کو گھڑی کی مانند چلتے ہی رہنا ہے۔ یہی فلسفہ
حیات ہے جاں بازوں کا اور کامیاب لوگوں کا۔

"کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی
جب تک وہ یہ نہ سمجھ لے کہ ایک غزل کے
کہنے میں جتنی شان اور عظمت ہے اتنی ہی
ہل کے جوتنے میں"

پنے اس قول میں پوکر لی۔ واشنگٹن نے عیش و عشرت
۔ام پسند و تن آسان اقوام کو للکارا ہے۔ محنت، ہر
میدان میں محنت ― فخر کے ساتھ، عزم کے ساتھ، بکثرت
ت ارادی کے ساتھ اور کامیابی کے یقین کے ساتھ۔

۱۸ ویں صدی عیسوی کے بعد سے یورپ کی جہاں گیری
کا جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ ۱۸ ویں صدی عیسوی تک
ان کے پاس وسائل ہم سے کم تھے۔ تکنیک میں وہ
ہم سے پیچھے تھے۔ کھیتی کی پیداوار ایک بیج پر ۱:۲ء۲ تھی
انھوں نے کچھ تکنیک کے بعد ۱:۲ء۵ تک بڑھالی تھی۔ جب
اس وقت ہمارے یہاں پیداوار کی در 12 : 1 تھی۔
ہمارے وسائل ان سے زیادہ تھے اور ہماری تکنیک
بھی ان سے بہتر تھی۔ لیکن ۱۹ویں۔ ۲۰ویں صدی میں
وہ کہاں پہنچ گئے اور ہم کہاں ہیں۔ آج ہم پچھڑے ہوئے
تیسری دنیا کے (THIRD WORLD) ملکوں میں
ایک ہیں اور وہ ترقی یافتہ۔
وجہ صرف ایک۔ ریاضی اور سائنس سے

ہماری بے رغبتی جو نت نئی ایجادات کا موجب بنی۔ اسکڈ
میزائل ہو یا پیٹریٹ، بحری بیڑہ ہو تارپیڈو ہو آئی جہاز،
ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ سب سائنس کی دین ہیں
اور سائنس میں ہندوستان پیچھے رہ گیا اور ہندوستانی
مسلمان دوسرے ہندوستانی بھائیوں سے اور بھی پیچھے
ہو گئے جب کہ تاریخ کچھ اور کہتی ہے۔

بحری فوج حضرت عمرؓ اور ان کے جانشینوں کے
زمانے ہی میں نہایت منظم ہو گئی تھی۔ جہاز سازی کا
پہلا کارخانہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت
میں مصر میں قائم ہوا تھا اور ۵۰۰ بحری جہازوں کا بیڑا
حضرت عثمانؓ کے زمانے ہی میں تیار ہو گیا تھا۔

منجنیق یعنی پتھر برسانے والی مشین جس کا بہتر
کیا ہوا ([illegible]) روپ گولے برسانے والی
توپیں اور راکٹ لانچر ہیں، اسلامی حکومت میں ساتویں
صدی میں موجود تھیں۔

پولس کا انتظام ایسا چست تھا کہ جرائم کا تقریباً خاتمہ
ہو گیا تھا۔ عام آدمی بے فکری کے ساتھ دروازہ کھلا
چھوڑ کر سو جایا کرتا تھا۔ پولس کی چوکسی کا یہ عالم تھا
کہ کوفہ سے لے کر خراسان تک کوئی چیز سڑک پر گر پڑتی
تھی تو پولس کو اس کی اطلاع ہو جاتی تھی۔ سڑک
پر پڑی چیز کو (بہ وجہ اعلیٰ ایمان داری اور بہ وجہ خوف
راز دال پولس C.I.D) کوئی نہیں چھوتا تھا۔ مگر
آج ――――― کہاں غلطی ہوئی؟ کس نے
غلطی کی؟ آج اپنی حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو
روتا ہے

"لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی"
اور مسلم نوجوان آج بھی بے فکر ہے۔ تعلیم میں بھی محنت
سے بھاگ رہا ہے۔ وقت سے تیز نہیں تو وقت کے
ساتھ تو چلنا ہی ہوگا۔

بقول رویندر ناتھ ٹیگور :

" سمندر کے کنارے پر کھڑے رہ کر
تم سمندر کو عبور نہیں کر سکتے "

جارج برنارڈ شاہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ
" جب میں جوان تھا تو محسوس کیا کہ اگر میں
دس کام کرتا ہوں تو بمشکل ایک پورا
ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی محنت
میں دس گنا اضافہ کر دیا "

ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہمیں کہاں پہنچنا ہے؟ اس
کے لیے ہمیں اپنی محنت میں کتنے گنا اضافہ کرنا ہے؟ یہ فیصلہ
ہر ایک کو کرنا ہے اور خود کرنا ہے۔

کامیابی کے راز و طاقت کے سرچشمے سب
کے اندر ہیں۔ ان کے نام ہیں قوت ارادی اور
خود اعتمادی۔

ضرورت ہے ان اجزا کو اپنے اندر سمونے کی اور
علم اور محنت سے فروغ دینے کی۔

" عامۃ الناس بالخصوص ہمارے زیادہ تر
سیاسی قائدین ان بنیادی مسائل کے بارے میں
غور ہی نہیں کرتے بلکہ فروعات میں الجھے رہتے
ہیں جس کی وجہ سے ہماری ترقی شاید ممکن نہ ہو سکے
نتیجتاً ہم تیزی سے تنزلی کی طرف جا رہے ہیں۔
جب تک ہم میں جہالت رہے گی، تعلیم کا فقدان
رہے گا اور غربت رہے گی ہم کبھی ترقی نہیں
کر سکتے۔ اس لیے ہم کو آئندہ ایک سو سال تک
خاموشی سے محنت کرنی ہے اور اگر ہم خاموشی
سے آپس میں مل کر کام نہیں کریں گے تو خدا
ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ سچ تو یہ ہے خدا
برسوں سے ہمارا ساتھ چھوڑ چکا ہے اور
ہم اس خام خیال میں مبتلا ہیں کہ خدا ہمارے
ساتھ ہے "

سید ہاشم علی

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۰ | جون ۱۹۹۱ء | شمارہ ۶

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

نائب مدیر

شباب الدین

تزئین — سرفراز   * * *   * انچارج سرکولیشن — مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ:

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ ثقافت،

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR, TAHZIBUL AKHLAQ &

[illegible]

ALIGARH MUSLIM UNIVERSI

زر سالانہ:

انڈیا ... ... Rs. 45.00

بیرونی ممالک US $ 20.00 بحری ڈاک

ہوائی ڈاک US $ 8.00

خط و کتابت کا پتہ:

پروفیسر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ ثقافت

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، انڈیا

مندرجات

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو
مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر، پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پریس: ایس۔ کے آفسیٹ پریس، دہلی۔

[redacted]

اداریہ

آزاد ہندوستان میں کردارکشی اور مردم کُشی کی جس وبا نے ۱۹۴۸ء میں سر اٹھایا تھا اور جس کا پہلا شکار اپنے زمانے کی مشہور عوامی شخصیت مہاتما گاندھی ہوئے تھے، وقت اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اب ایسی شدت اختیار کر گئی ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ تباہی اور تاراج کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اس وبا کا جو شخص بھی شکار ہوتا ہے، وہ نہ تو بیمار ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے جسم پر کسی وبائی مرض کی علامت نمودار ہوتی ہے، بس ایک سنسناتی ہوئی گولی، ایک پرشور دھماکے سے پھٹنے والا بم ایک جیتے جاگتے، ہنستے بولتے اور زندگی سے بھرپور شخص کا چراغِ حیات ایک ہی وار میں نیست و نابود کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وبا کا ایک المناک پہلو یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کے شکار ہوتے ہیں ان سب کے بارے میں ہم کو علم بھی نہیں ہو پاتا ہے۔ اگر کوئی "بڑا آدمی" اس وبا کا شکار ہوتا ہے تو کچھ دنوں کے لیے سماج میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اخبارات تشدد کی سیاست کی مذمت کرنے لگتے ہیں، نیتا لوگوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حکومت تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کرتی ہے اگر بہت مستعدی دکھلائی گئی تو چار چھ برسوں میں اس کی تحقیقات مکمل ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی کچھ لوگوں کو سزائے موت بھی سنا دی جاتی ہے مگر اس وقت تک سماج سب کچھ بھول چکا ہوتا ہے کردارکشی جس کا انجام اکثر مردم کشی پر ہوتا ہے، پہلے ہی کی طرح عام رہتی ہے، لوگ اپنے اپنے غم و غصہ کو فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔ نیتا حضرات اپنے بیانات بھول چکے ہوتے ہیں، زندگی پہلے ہی کی طرح ایک پرشور سیلِ رواں کی صورت میں ابد کے سرے کو چھونے میں مشغول رہتی ہے اور مرنے والوں کی یادیں دلوں سے محو ہو چکی ہوتی ہیں۔ تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ اگر شائع ہوئی اور اس کو قابلِ عمل سمجھا گیا تو دو ایک افراد دار کے تختے پر لٹکا دیے جاتے ہیں مگر بسا اوقات اتنا بھی نہیں ہوتا۔ تشدد کی سیاست اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اور اس کو نیچ دیتی

سے اکھیڑنے کی طرف نہ عوام ہی توجہ دیتے ہیں نہ ہی عوام کے منتخب کردہ نمائندے اور نہ ہی حکومتِ وقت، بلکہ ضرورت محسوس کرنے پر اِس "ارجن بان" کو چلانے سے کوئی گریز نہیں کرتا۔

۲۱ مئی ۱۹۹۱ء کو سانگریس (آئی) کے صدر اور سابق وزیراعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی کا قتل بھی تشدد کی سیاست کی قربان گاہ پر ایک تازہ بھینٹ ہے۔ کچھ دنوں تک اس کا بھی چرچا رہے گا، پھر ان کی سمادھی بنوانے کے بعد لوگ اس بات کو بھول جائیں گے کہ اُن کا قتل کیوں ہوا تھا، ممکن ہے لوگ ہر سال ان کی سمادھی پر جمع ہو کر اپنی "شردھانجلی اَرپت" کریں، لیکن اُس جڑ پر کوئی بھی کلہاڑی نہ چلائے گا جس کا ثمرہ سیاسی تشدد کے آتشیں برگ و بار ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورتِ حال کا خاتمہ کب ہوگا؟ کب تک اختلاف و مخالفت کی وجہ سے لوگوں کا کشت و خون جاری رہے گا، کب تک ماؤں کی گودیں سونی، بیویوں کی مانگیں اجڑتی اور بہنوں، بیٹیوں کی دنیائے آرزو اجڑتی رہے گی اور کب تک سماج کا ہر فرد اس صورتِ حال کے باوجود سر بہ درگلو رہے گا؟

تقریریں تو بہت ہو چکیں، اِس تازہ واردات کے بعد تو سیاسی تشدد کو ختم کرنے کا کوئی عملی کام شروع کیا جائے۔ یہ عملی کام سب کے اشتراک کے بغیر شروع نہ ہو سکے گا۔ اِس میں ساری سیاسی پارٹیوں ہی کو نہیں بلکہ سماج کے ہر فرد کو عملی تعاون کرنا ہوگا اور اُس ضابطۂ اخلاق پر سختی سے عمل پیرا ہونا ہوگا جو سیاسی تشدد کو ختم کرنے کے لیے سب لوگ مل جل کر بنائیں۔ ہندوستانی قوم اگر اب بھی نہ چونکی، اگر اب بھی اس نے سیاسی تشدد کو ختم کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام نہ کیا تو اب وہ دن دور نظر نہیں آتا جب ہر طرف کُشتوں کے پشتے نظر آئیں گے اور ملک کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے گا۔ قانونِ قدرت یہ ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جایا کرتی ہے، ہم کو اس دن سے پناہ مانگنی چاہیے جب ہماری حالت چھوٹی مچھلی جیسی ہو جائے اور کوئی بڑی مچھلی آکر ہم کو نگل جائے۔ سیاسی تشدد کا جو لوگ شکار ہو چکے ہیں اُن کی تعداد پہلے ہی سے بہت زیادہ ہے، اب تو ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے کہ اس تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر "میر و وزیر" کوئی بھی اِس وبا سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ اب تو اِس بات کا فیصلہ ہو ہی جانا چاہیے کہ ہندوستان کے لوگ امن و امان کی صاف ستھری زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا سیاسی تشدد کی چیختی چنگھاڑتی اور بستیوں کی بستیاں جلا کر خاکستر کر دینے والی زندگی؟

کبیر احمد جائسی

۲۷/۵/۱۹۹۱ء

رسم و رواج

سرسید احمد خاںؒ

کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ "انسان کی زندگی کا منشاء یہ ہے کہ اس کے تمام قویٰ اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور اُن میں باہم نامناسبت اور تناقض نہ ہو بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو"۔ ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے، ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے۔

بس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم و رواج پر مبنی ہے تو وہاں انسانوں کی خوش حالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے! اور جو کہ خوش حالی ہر فرد بشر کی اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی ناپید ہوتا ہے۔

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہیے اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بات بھی کرنی نہ چاہیے۔

سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں، ان کے فوائد سے مستفید ہو؛ اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے۔

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے، گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں، آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدائے تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے کی بھی ضرورت ہے ایسی ہی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے وہ شخص اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی، بلکہ ایسے شخص کے لیے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت

نہیں۔ البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔ زمانۂ حال پر نظر کرنے کے لیے اس کو قوتِ تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لیے قوتِ تجویز اور اس کا استقرار کرنے کو قوتِ استقرا، اور بھلا برا ٹھہرانے کو قوتِ امتیاز اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اس پر قائم رہنے کے لیے قوتِ استقلال اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔

آدمی مثل ایک کَل کے نہیں ہے کہ جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے، اسی کو انجام دیا کرے، بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو اُن اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے، ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے، پھلے اور پھولے۔

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں۔ یعنی جو عمدہ و مفید ہیں ان کو اختیار کریں، جو قابلِ اصلاح ہوں اُن میں ترمیم کریں اور جو بُری اور خراب ہوں ان کی پابندی چھوڑ دیں، نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کَل کی مانند ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی ان کو روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے، پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی نہیں کی، بلکہ یہ باعث ہے کہ اس نے رسومات کی ضروری پابندی کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے؛ اور دوسری قسم کی قوتوں کو اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو، یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو تو وہ عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانے میں ہر شخص، اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند کے لائق کوئی بات ہے یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں، ان کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے؟ اور کون سی بات ان کی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے؟ بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبے کے کون سی چیز مناسب ہے؟ میرے رتبہ اور مقدور کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں؟ اور کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا، تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے اور یوں پوچھتا ہے کہ لوگ جو مجھ سے برتر ہیں، اور رتبے اور مقدور میں زیادہ ہیں، وہ کن رسموں کو بجا لاتے ہیں؟ تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کر ان ہی کی سی شان میں شامل ہو۔

اپنے اوپر ترس کھانا

سید حامد *

بظاہر تو ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن غور کیجیے تو یہ بہت سی برائیوں کی جڑ ہے، ام الامراض ہے۔ سب سے بڑی خرابی تو اس عادت میں یہ ہے کہ یہ حوصلے اور حرکت کو ختم کر دیتی ہے۔ عمل کی قوت کو سلب کر دیتی ہے انسان کو زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔ خود پر جس کو ترس آتا ہو اس کی نظر میں بے عملی، بے حرکتی، بے حسی کی ہر شکل جائز ہے۔ کیونکہ وہ خود کو بیچارا، محروم، مظلوم، مفلوج سمجھتا ہے۔ معذوری کا احساس، بیڑی بن جاتا ہے، ہتھکڑی بن جاتا ہے۔ نہ قدم اٹھانے دیتی ہے، نہ ہاتھ کو حرکت میں لانے دیتی ہے اور دیکھیے تو اپنے اوپر ترس کھانا بادی النظر میں ایک بے ضرر سی چیز ہے۔

یہ "بے ضرر" سی عادت آگے دیکھنے، مستقبل کے لیے منصوبہ بنانے، اعتماد کو ساتھ رکھنے کی صلاحیت سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ مستقبل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا در کنار حال کی الجھنوں سے عہدہ برآ ہونا بھی پہاڑ لگنے لگتا ہے۔ آنکھوں کو ماضی کے دھندلکے میں سکون ملے تو ملے، ٹھنڈک پہنچے تو پہنچے۔ رجائیت جو عام انسانوں کو زندہ، تابندہ، بشاش اور سرگرم رکھتی ہے، اپنے اوپر ترس کھانے والے کے پاس نہیں پھٹکتی۔ قنوطیت اس کے پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ یاس اس کے دل و دماغ کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسے انسان کو زندہ کہا جائے یا زندگی کا کیری کیچر، اس کی مضحکہ خیز اور حقارت انگیز تصویر۔ جو انسان زندگی کی برکتوں، رحمتوں اور بشارتوں سے ناتا توڑ لیتا ہے، وہ ذوقِ زندگی سے محروم رہ جاتا ہے، جینے کے آداب کھو بیٹھتا ہے۔ ارادے، نیت، مدافعت اور مزاحمت کا جہاں گزر نہ ہو وہاں آدمی باڑھ میں خس و خاشاک کی طرح بہتا ہوا نظر آتا ہے۔

خود پر ترس کھانے کی عادت ایک اور اخلاقی بگاڑ بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ وہ دوسروں پر ترس کھانے اور رحم کرنے سے روکتی ہے۔ جو شخص خود کو قابلِ رحم سمجھتا ہو وہ رحم کے سارے ذخائر اپنی ذات پر صرف کر دیتا ہے اور پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ کولہو کے بیل کی طرح وہ دائرہ وار گھومتا رہتا ہے۔ اپنی ذات کے گرد۔ اس دائرے سے وہ نکل پائے تو

---

* سابق وائس چانسلر اے ایم۔ یو۔ علی گڑھ ——— ہمدرد نگر - نئی دہلی -

سے دوسروں کی تکلیفوں کا احساس ہو، ان ہمدم آسے
ن کی پریشانیوں سے نے اذیت ہو۔ اس کے دل کی زمین
بیں ہونے رحمی اور بے حسی سے بنجر ہو چکی ہے، ہمدردی
ور انسان دوستی کی کھیتی لہلہانے لگے۔ جو خود پر ترس
کھاتا رہتا ہے، اسے دوسروں کے دکھ کا احساس ہی نہیں
ہوتا۔ اس کے پاس دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا
وقت کہاں؟ جس طرح وہ اپنی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو بڑھا
چڑھا تا ہے، اسی طرح دوسروں کی بڑی بڑی مصیبتوں کو
گھٹا کر دیکھتا ہے۔ اضافہ کا یہ عمل اور تخفیف کی یہ روش
لازم وملزوم ہیں۔ ایک ہی سکے کے یہ دو رخ ہیں۔ دوسروں
کے دکھ درد تک وہی پہنچے گا جو خود ملوانی کے طلسم کو توڑے
گا اور خود نگری کے تاسف خیز دائرے سے باہر نکلے
گا۔ اپنے اوپر ترس کھانے کا سب سے بڑا نقصان یہ
ہے کہ انسان کے دل میں بنی نوع انسان بلکہ خلق خدا کی
ہمدردی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ اس کا سارا وقت
اپنے دکھ کو سہلانے، سنوارنے اور سجانے میں صرف ہو جاتا
ہے۔

خود پر ترس کھانے والے ایک اور بری عادت میں
مبتلا ہو جاتے ہیں۔ گلے شکوے کو وہ اپنا اوڑھنا بچھونا
بنا لیتے ہیں۔ اپنے اوپر ترس کھانے کے لیے انھیں سہارے
اور مواقع کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا کی بے مہری، احباب و
اقارب کی بے التفاتی، شناساؤں کی بے توجہی، رقیبوں
کی دشمنی، حاسدوں کی عداوت، مقدر کی خرابی، آسمان
کی ستم گری، لیل و نہار کی ستم ظریفی۔ غرضیکہ شکایتوں کے
انبار میں وہ لوٹتے رہتے ہیں۔ ایک اضافی تسکین انھیں
اس طرح حاصل ہو جاتی ہے، جہاں شکایت کی گنجائش
نہیں۔ وہ شکایت کا جواز ڈھونڈھ لیتے ہیں۔

شکایت کرتے رہنا جواں مردی اور عالی ظرفی سے
بعید ہے۔ شکایت کرنے والے سے لوگ کنارہ کشی کرنے

لگتے ہیں، وہ اسے عادی شکوہ ساز سمجھ کر اس کی شکایتوں
کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ جو شخص شکایت کرتا رہتا ہے
لوگ اسے اچھلا، بے تہا اور کم حوصلہ جانتے ہیں۔ جو خود
پر ترس کھائے گا، وہ شکایتوں سے ہی دل بہلائے
گا۔ اس کا جھکاؤ اسی طرف ہوگا کہ ذمہ داری اپنے
اوپر سے ہٹا کر دوسروں کو اوڑھا دی جائے۔ غور
کیجیے کیا یہ کھلی ہوئی بزدلی اور صریح ناانصافی نہیں ہے۔

خود پر ترس کھانا اخلاقی بیماری ہی نہیں ذہنی بے توازنی
بھی ہے۔ یہ ایک مریضانہ ذہنیت ہے۔ کبھی کبھی اس
اخلاقی مرض کی سرحدیں اس ذہنی بیماری سے مل جاتی
ہیں جیسے ڈپریشن یا امید بیزاری یا حوصلہ باختگی کہہ سکتے
ہیں۔ اس مرض میں خود کو طول دینے کی خاصیت ہے۔
یہ مرض جڑ پکڑے تو مریض علاج کرنے کا حوصلہ باقی
نہیں رہتا۔ انسان بے ریڑھیا ہو جاتا ہے کیڑے مکوڑوں
کی طرح۔ قوت ارادی مفلوج ہو جاتی ہے۔ آپ نے کبھی
سوچا کہ اس بیماری کی شروعات کیسے ہوتی ہے۔ بعض
لوگوں کی ساخت شروع سے ایسی ہوتی ہے کہ وہ
حالات کا جم کر مقابلہ نہیں کر پاتے، مشکلات اور مراحل
سے گریز کرتے ہیں اور گریز نہیں کر پاتے تو آہیں بھرتے
ہیں، شکوہ کرتے ہیں اور خود پر ترس کھاتے ہیں۔
بخت یاوری نہیں کرتا تو یہ خو گہری ہو جاتی ہے لیکن
اس بیمار انداز گروہ میں زیادہ لوگ وہ ہوتے ہیں جنھیں
زمانے نے بے دردی سے کچل ڈالا ہے، وہ محبت
اور ہمدردی کو ترستے ہیں، ہمدردی نہیں ملتی تو خود پر
ترس کھانے لگتے ہیں۔ دنیا جو کچھ نہیں دیتی، وہ ہم خود
کیوں نہ فراہم کریں۔ ایسے اخلاقی مریضوں کی مدد کیجیے
انھیں پیروں پر کھڑا کیجیے لیکن ان پر رحم نہ کھائیے۔

بعض اوقات یہ بیماری افراد سے آگے بڑھ کر
جماعت کو لاحق ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہے آوے کا

ادا کرنا پڑتا ہے۔ جماعت خود پر ترس کھانے لگے تو افراد
کے حوصلے اور عمل کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اور شکایت اور
غم و غصہ کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ ارادہ مفلوج ہو جائے
تو کامیابی ہو تو کیسے بنے جو افراد یا جماعتیں اپنے اوپر ترس
کھاتی ہیں وہ اس طرح خود کو بے قصور ٹھہراتی ہیں اور
اپنی بربادی یا بدحالی کی ذمہ داری دوسروں کے
شانوں پر ڈال دیتی ہیں۔ یہ کائرتا نہیں تو کیا ہے
کائرتا بھی ہے اور خود فریبی بھی۔ خود پر ترس کھانے
میں خود کو دھوکا دینے کا مفہوم بھی شامل ہے۔
ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا رزم گاہ ہے:

شکایت کدہ نہیں۔ جو لڑنا نہیں جانتے، جو ہتھیار ڈال
دیتے ہیں وہ زندہ رہنے کے لائق نہیں رہتے۔
زندگی ان پر حقارت سے نظر ڈالتی ہے جینے کا
اصول تو یہ ہے کہ انسان ٹیم ٹام سے مرعوب نہ
ہو، آسائش اور عیش و عشرت و مایوسی سے خود
کو دور رکھے، جفاکشی کا خود کو عادی بنائے اور
اسلحے سے لیس ہو کر اس میدان حرب میں کود
جائے جس کا نام زندگی ہے۔

"اے کامیاب طالب علمو! تمہیں جاننا چاہیے کہ
جب تم عملی زندگی میں قدم رکھو گے اس وقت تمہیں
سخت نکتہ چینیوں سے واسطہ پڑے گا اور تمہاری
ڈگریوں کی قیمت کی جانچ تمہارے اس اخلاقی اور
ذہنی اثاثہ سے ہوگی جو تمہاری طرف سے بازار عالم میں
پیش کیا جاوے گا۔ اس لیے ان ڈگریوں کی ساکھ
اور اس یونیورسٹی کی نیکنامی کلیتاً تمہارے اخلاق
اور تہذیب پر منحصر ہے۔"

صاحبزادہ آفتاب احمد خان

پروفیسر ابوبکر احمد حلیم

جلیل قدوائی *

پچھلے دنوں پروفیسر ابوبکر احمد حلیم کا ہمارے درمیان سے دیکھتے دیکھتے اُٹھ جانا پاکستان کے سرپرجس کی حالت اہل علم وفن کے لیاظ سے کسی طرح قابل رشک نہیں کہی جاسکتی قیامت کا گزر جانا ہے۔ گرچہ ہمارے ملک میں خودرَرد اور خود ساختہ قسم کے "پروفیسروں" کی کمی نہیں لیکن حلیم صاحب پروفیسروں کے پروفیسر اور پیروں کے پیر تھے۔

مرید آپ کے اہل صفائے پیر ہوئے۔ (حسرت)

ابھی ڈاکٹر ممتاز حسن اور ڈاکٹر محمود حسین خاں کی موت پر قوم کے آنسو خشک نہ ہوئے تھے کہ اسے اس سانحہ عظیم سے دوچار ہونا پڑا۔ نواب محسن الملک کے مرثیے میں چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے کس قدر حسب حال لکھا تھا ؎

انسوس ہم سے چھینے بے مہری قضا نے
وہ علم کے دفینے وہ عقل کے خزانے

اس شام میرے صاحب سے چھوٹی بیٹی تزئین کی مہندی کی رسم تھی اور دوسرے دن اس کا نکاح تھا جس میں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ ہمارے ہاں کی تقریبوں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ میرے بیٹے کپتان خالد قدوائی کے نکاح میں پچھلے ہی دنوں شریک ہوئے تھے۔ تزئین سلمہا کی مہندی میں شرکت کی غرض سے میرے ایک عزیز اپنی خواتین کو لے کر آئے تو میرے پاس بیٹھتے ہی آہستہ سے بولے:

"پیچھے ہمارا ایک ستون اور گر گیا"

میں سمجھا نہیں تو فرمایا:

"آپ نے پانچ بجے ریڈیو پر نہیں سنا کہ حلیم صاحب کا انتقال ہوگیا اور آج ہی رات انھیں پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں دفن کر دیا جائے گا۔"

میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور دل پر کیا کہوں کیسی اداسی چھا گئی۔

اس کے جاتے ہی یکایک جو اداسی کا سماں
چھا گیا رات کو محفل پہ اسے کیا معلوم

حافظ کے مشہور شعر کا صحیح صحیح مفہوم اس وقت واضح ہوا۔

درین چمن کہ بہار وخزان ہم آغوش است
زمانہ جام بدست وجنازہ بردوش است

---

* 5/C کونشا ہومز، گلشن اقبال، کراچی، پاکستان

کس حال میں وہ شام اور رات بسر ہوئی اور کس طرح
دوسرے روز نکاح کی تقریب انجام کو پہنچی! کچھ کچھ میں
۱۰ آنا تھا کیا ہو رہا ہے، کیا ہو گیا۔ سارا میرا حال ع

دل داند و من دانم و داند دل من

کے مصداق رہا۔ میت و جنازہ میں شرکت ناممکن تھی۔ سوم
میں ان کے سابق دولت کدہ پر گیا۔ ایک پارہ پڑھ کر
اُن کی روح کو بخشا۔ ان کی کوٹھی پر ان کی زندگی میں
از خود یا اُن کی طلبی پر جاتا ہی رہتا تھا اور سرہانے میں
بیٹھ کر ان سے باتیں کر کے چلا آتا تھا مگر آج وہاں کا
حال ہی کچھ اور تھا۔ سوگواروں کا اژدہام تھا جیسے بقول
ریاض ع

حشر کے روز امنڈ آئی ہے دنیا ساری

کراچی کے تعلیمی و ثقافتی حلقوں، سرکاری حکام، سوشل کارکن
یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کا ہر طرف ہجوم تھا اور خاص
طور پر حلیم صاحب کے ہماری حلقے کے احباب اور کم و بیش
سارے ہی مقامی قابل ذکر علی گڑھ اولڈ بوائز جمع تھے
نڈھال، نگار با چشم پر آب! مگر زندگی میں پہلی بار
علی گڑھ والوں سے بھی ملنے کی جی میں کوئی امنگ پیدا
ہوئی۔ خیر نظر پڑی ملیں تو جلد جلد ڈاکٹر احسان رشید، پروفیسر
مجتبیٰ کریم، ایس ایس جعفری، میجر آفتاب حسن، میجر اسرار
حسن خان اور ابرار حسن خاں وہ دو چار چار باتیں کر تا
نہ جانے کتنوں سے آنکھیں چراتا، چپکے سے وہاں سے چل
دیا اور برادرم اشتیاق اظہر صاحب کے ساتھ ان کی موٹر
پر اپنے گھر واپس آ گیا۔

تری محفل سے ہم آئے مگر با حال زار آئے ز حسرت

مرحوم کے پس ماندگان یا دیگر اعزا سے پرسش احوال کی
ہمت نہ ہوئی۔ دو ہی تین دن پہلے ان کی دریافت خیریت
کے سلسلے میں ہسپتال گیا تھا۔ ان کی بی بی نے بتایا کہ حالت
اطمینان بخش ہے اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ دو دن

بعد گھر واپس چلے جانے کی اجازت دے دیں گے
بھارت سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں اپنے چچا
محمود حسین خاں مرحوم کی تعزیت کے سلسلے میں آئے ہوئے
تھے۔ انھیں لے کر ڈاکٹر احسان رشید انجمن ترقی اردو
میں آئے۔ حلیم صاحب کا ذکر آیا اور میں نے ان کی
صحت کا حال بتایا۔ اس پر مسعود کی جناب اختر حسین
نے فرمایا وہ گھر واپس تشریف لے آئیں تو ہم ان سے
ملاقات کرنے جائیں گے۔ . . .

مگر کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔

دراصل ان کے دل پر حملے کا سان گمان بھی نہ
تھا۔ کبھی بلڈ پریشر کی شکایت بھی سننے میں نہ آئی تھی۔ یہ
شاخسانہ یکایک نہ جانے کہاں سے نکل آیا۔ احباب کو
علم ہے کہ ان کے ٹخنوں اور پنڈلیوں میں تکلیف رہنے
لگی تھی۔ درد ہوتا تھا اور سنبھل سنبھل کر چلتے تھے۔
عرصے سے جسم قدرے بھاری ہو گیا تھا۔ حال ہی میں اپنی
زمینوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں اندرون سندھ
گئے تھے۔ واپسی پر تکلیف بڑھ گئی۔ ڈاکٹروں نے چلنے
پھرنے کو منع کر دیا بلکہ بستر پر لٹا دیا تھا۔ اسی کا علاج
ہو رہا تھا، ورنہ بس۔

میرے ساتھ ان کی وفات کی وجہ سے
جگر صاحب کے الفاظ میں سے

جب سے اس نے پھیری نگاہیں، تک تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی، آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہیے

والا معاملہ خاص طور سے اس لیے ہے کہ کم لوگوں کو معلوم
ہو گا کہ کئی سال سے حلیم صاحب، سید راس مسعود مرحوم
کی لائف اور کارناموں پر ایک کتاب کی تیاری میں مصروف
تھے۔ وہ مسعود مرحوم کو مسلمانان برصغیر کی تعلیم کے میدان
میں سر سید کا جانشین اور اردو زبان میں ذریعۂ
تعلیم کے اصول کا سب سے پہلا اور بہت بڑا منادی سمجھتے

تھے۔ مسعود سے بھی ان کی عقیدت تھی جس کی بنا پر حکیم صاحب موصوف کی کتاب "سفرنامۂ جاپان" (انگریزی) پر جسے ۱۹۶۸ء میں راس مسعود سوسائٹی نے مرکزی حکومت کی امداد سے شائع کیا تھا، شاندار مقدمہ لکھا تھا۔ اسی سلسلے میں پروفیسر ایم۔ ایم۔ احمد کی وفات کے کچھ عرصے بعد انھوں نے فون پر مجھ سے بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کہ

"زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور میں نے کچھ نہ کیا اگر اپنے مرنے سے پہلے راس مسعود مرحوم پر کتاب مکمل نہ کی۔"

نیز راس مسعود سوسائٹی کے اعزازی معتمد کی حیثیت میں انھوں نے اس کام میں مجھ سے اشتراک چاہا۔ وہ خود سوسائٹی کے ایسوسی ایٹ ممبر تھے۔ چنانچہ میں نے نہ صرف سوسائٹی کی جملہ مطبوعات بلکہ موضوع متعلقہ کے بارے میں جو کچھ بھی مسالا میرے پاس تھا، ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

کام شروع ہوا تو ایک لمبی فہرست پاکستان اور بھارت میں مسعود مرحوم کے قدردانوں اور نام لیواؤں کی تیار ہوئی۔ کئی صفحات کا ایک مفصل سوالنامہ بنا جو حکیم صاحب کے مراسلے کے ساتھ ان سب حضرات کو بھیجا گیا۔ کچھ جوابات موصول ہوئے۔ جنھوں نے نہیں بھیجے انھیں یاددہانی کے خطوط لکھے گئے۔ کم و بیش دو درجن آن مطبوعہ کتابوں کی فہرست تیار ہوئی جن میں مسعود کے حالات زندگی متفرق اور منتشر طور پر لکھے ہوئے ملتے تھے۔ پرانے اخبارات کے تراشے اور بعض مطبوعہ مضامین جو مسعود پر کتاب کی تیاری میں مدد دے سکتے تھے، جمع کیے گئے۔ ان سب کا مطالعہ کر کے نوٹ لینے یا ان کے خلاصے بنانے کا کام جاری تھا۔ مسعود کے بعض مقامی متعلقین اور اہل خاندان، بیگم جہتاری (سابق لیڈی مسعود) سید اکبر مسعود (اب مرحوم)، سید انور مسعود، ہاشم محمد علی، ڈاکٹر احسان رشید، جناب ہارون رشید نیز بھارت سے جناب ڈاکٹر سید محمود اور خواجہ غلام السیدین پاکستان تشریف لائے تو ان ہر دو سے بھی تفصیلی انٹرویو لیے گئے۔ ہاشم محمد علی صاحب (اب مرحوم) نیز بھارت کے پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے اپنے بیانات قلم بند کر کے عطا کیے۔ ان سب کے خلاصے تیار ہو رہے تھے۔ بیگم اکبر مسعود کے ہاں جا کر خاندان سر سید کے دیگر بیش قیمت نوادر کے علاوہ رجسٹری شدہ دستاویز دیکھی گئی جس کی رو سے سر سید نے راس مسعود کو ان کی رسم بسم اللہ کے موقع پر کلام پاک، دیوان حافظ اور بعض وظائف کی قلمی نسخوں کی ایک ایک جلد ہبہ کی تھی یہ نسخے بھی دیکھے گئے اور آخری علالت سے کچھ دن پہلے یہ پروگرام تھا کہ حکیم صاحب اور میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اتوار کے دن بیگم جہتاری اور احسان رشید کے دولت کدے پر جاتے اور راس مسعود مرحوم کے چھوڑے ہوئے کاغذات سے اپنے مفید مطلب دستاویزات برآمد کرتے۔

دراصل انھیں اس کام سے اس قدر شغف تھا کہ دیر تک ملاقات نہ ہونے کی صورت میں دیر دیر تک مجھ سے فون پر باتیں کر لیتے تھے اور مجھے تفویض کیے ہوئے معاملات کے بارے میں رفتار کار کی رپورٹ مانگتے تھے۔ کوئی نیا نکتہ ذہن میں آتا یا کسی معاملے میں یاددہانی کرنی ہوتی تو اس سلسلے میں باتیں کرتے اور یہ باتیں خاصی طولانی ہوتیں۔ وہ بڑی تفصیل میں جاتے یہاں تک کہ بعض دفعہ بلکہ اکثر نہایت دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی۔ جیسا کہ احباب کو معلوم ہے ان کی کوٹھی ریلوے لائن سے ملی ہوئی تھی اور مقامی ٹرینیں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جلد آتی جاتی رہتی تھیں ان کی وجہ سے شور ہونے لگتا تھا اور گفتگو کے درمیان

یکایک وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں فرماتے:

"ذرا ٹھہر جائیے۔ ٹرین آ رہی ہے!"

اور ہماری گفتگو کا سلسلہ چند منٹ کے لیے رک جاتا۔ ٹرین نکل جانے کے بعد پھر باتیں شروع ہوتیں مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ سابق کی طرح فرماتے:

"ٹھہر جائیے۔ اب ایک اور ٹرین آ رہی ہے۔"

وغیرہ۔ ان کے فون عموماً بعد مغرب میرے گھر پر بھی آتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ مجھے گھر پر ان کے علاوہ پوچھنے والا کوئی دوسرا نہ تھا الّا ماشاءاللہ! اور جب شام کو گھر پر فون کی گھنٹی بجتی میں سمجھ جاتا حلیم صاحب ہوں گے اور یہ خیال واقعی صحیح نکلتا۔ افسوس اب شام کو میرے گھر پر شاید ہی کوئی فون آتا ہو۔

حلیم صاحب کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ ان سے کام لینا بہت مشکل تھا مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، میں نے ان سے "سفر نامۂ جاپان" پر مقدمہ لکھایا تھا۔ بے شک وہ کام ختم کرنے میں بہت وقت لیتے تھے مگر اس کی ایک وجہ تو ان کی عمر اور ہمہ جہتی مصروفیات تھیں، دوسرے وہ لکھنے سے پہلے اپنے موضوع کے ہر پہلو کے بارے میں پورا پورا اطمینان کر لینا چاہتے تھے۔ اِدھر اُدھر سے سنے ہوئے واقعات یا غیر ذمہ دار لوگوں کے بیانات کا اعتبار نہ کرتے تھے۔ وہ ہر چیز مطبوعہ دیکھنی چاہتے تھے۔ پھر راوی یا مصنف کی حیثیت کو جانچتے۔ بیان کے سیاق و سباق پر غور کرتے اور جس موضوع یا شخص پر وہ لکھنے والے ہوتے اس کے ساتھ اپنی عقیدت اور لگن کی رو سے اس کا جو تصور یا معیار ان کے ذہن میں ہوتا اس میں اور بیان زیرِ غور کے درمیان تطبیق یا عدم تطبیق پر غور کرتے اور اس طرح مطمئن ہو جانے کے بعد قلم اٹھانے کا ارادہ کرتے۔ تحقیق کے سلسلے میں ان کی جاں فشانی کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ بابائے اردو کی "چند ہم عصر" اور مولوی عبدالرزاق کانپوری کی "یادِ ایام" میں متفرق طور پر اِدھر اُدھر راس مسعود کی رسم بسم اللہ کے بعد اور ان کے لیڈی اور سر تھیوڈر ماریسن کو سپرد کیے جانے کے درمیانی زمانے میں بعض استادوں کا ذکر ملتا ہے جو مسعود کی ابتدائی گھریلو یا مذہبی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے مگر حلیم صاحب آخر تک اس سلسلے میں مطمئن نہ ہوئے اور مفصل اور معتبر معلومات کی جستجو میں رہے۔

اسی طرح علی گڑھ سے راس مسعود کے مستعفی ہونے کا مسئلہ تھا۔ حلیم صاحب مسعود صاحب کے زمانے میں ان کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے۔ مسعود صاحب سے اور ان سے قریبی تعلقات بھی رہے تھے۔ انھیں اس زمانے کے حالات اور یونیورسٹی کی سیاست کا پورا اچھا علم تھا۔ مجھ سے جس نے "مرقع مسعود" شائع کردہ راس مسعود سوسائٹی میں پہلی بار اس مسئلہ پر کھل کر کچھ لکھا تھا اور علی گڑھ کے اس عہد کے بعض با اختیار اصحاب سے بھی اس مسئلے پر ان کی باتیں ہو چکی تھیں۔ مگر معلوم ہوا کہ مسعود صاحب کے ایک عزیز کے پاس وہ خط موجود ہے جو اپنے استعفیٰ کے سلسلے میں مسعود صاحب نے ان کے والد کو لکھا تھا اور جس میں مستعفی ہونے کے کچھ اور اسباب لکھے ہیں۔ چنانچہ حلیم صاحب نے اس خط کو دیکھنے اور مسعود صاحب کے ان عزیز سے ملاقات کے لیے کے سلسلے میں خاصا وقت اور زر صرف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ہر ایسے محتاط اور ذمہ دار محقق کو جیسے کہ حلیم صاحب تھے، اپنے کاموں کی تکمیل میں ہمیشہ دیر لگتی ہے مگر معاملے کی کامیابی اور گوہرِ مقصود ہاتھ آنے کی امید میں اس ناگوار تاخیر کو گوارا کرنا پڑتا ہے بلکہ

حیرت ہوتی تھی کہ اپنی دیگر کثیر مصروفیات کے باوجود شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو کہ انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز اور موتمر عالم اسلامی، پاکستان کے جن دونوں کے وہ صدر تھے، دفتروں سے نپٹنے کے علاوہ شہر میں وہ کسی نہ کسی جلسۂ عام میں صدارت یا اس میں شرکت نہ کرتے ہوں) اس عمر میں وہ مسعود مرحوم کے کام کے لیے کس طرح وقت نکال لیتے تھے۔ راس مسعود صاحب کے کم و بیش ایک درجن اسٹیل کے بڑے بڑے بکسوں میں سے BOX ابھی صرف دو ہی بکس دیکھے جا سکے تھے۔ مگر انھیں میں سے بڑے بڑے نوادر ہاتھ آئے سر سید، نواب محسن الملک، جسٹس سید محمود، نواب امداد امام اثر، مولانا محمد علی، علامہ اقبال، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری، سر شاہ محمد سلیمان، سر تیج بہادر سپرو، آفتاب احمد خاں، سر کیلاش نرائن ہکسر، نواب اسمٰعیل خاں، مارشل ولی خاں و شاہ محمود خاں (افغانستان) ایوب خاں (بعد میں فیلڈ مارشل، صدر پاکستان)، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، مولوی عبدالباری ندوی، ڈاکٹر عبدالجبار خیری، سر تھیوڈر ماریسن، مسز محمد مارما ڈیوک پکتھال، لوی فشر، ای۔ ایم۔ فاسٹر، ڈاکٹر کزنکاؤ سر مالکم ہیلی، سر ہیری ہیگ، سر کرینگ لوانس وغیرہم کی تحریریں اور خطوط، سر آغا خاں مرحوم کی سرکردگی میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے فراہمی چندہ کے وفد کی کراچی میں آمد اور خود راس مسعود مرحوم کو کراچی میونسپلٹی کی طرف سے پیش کیے گئے خطبۂ استقبالیہ کے بارے میں یادداشتیں، چودھری خوشی محمد خاں ناظر کا سر سید کی وفات پر لکھا ہوا ایک نادر مرثیہ، غرضیکہ کہاں تک تفصیل لکھی جائے۔ ان سب سے کام لیا تھا اور مسعود مرحوم کے بقیہ بکسوں سے کاغذات کی تلاش جاری تھی کہ ناگہاں حلیم صاحب کو خدائے تعالیٰ نے شاید اس دنیا کے کاموں سے بھی زیادہ بڑے کاموں کو سرانجام دینے کی غرض سے اپنے پاس بلا لیا۔ افسوس کہ

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

سمجھ میں نہیں آتا مسعود کے بارے میں مرحوم کا یہ منصوبہ اب کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ انھوں نے تو اپنی وفات سے پہلے مجھ سے صرف دس بارہ دنوں کے لیے آرام کی "مزید اجازت" چاہی تھی اور اس کے بعد اس کام پر تبادلۂ خیال کرنے اور کام کی بعض تفصیلات طے کرنے کے بارے میں باتیں کرنے کی غرض سے قطعی طور پر ہم سب یعنی بیگم مختاری، احسان رشید اور ہاشم محمد علی کو اور مجھے نام بہ نام اس بار اپنے گھر پر بلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب یہ وعدہ انھیں کیوں کر یاد دلایا جائے اور وعدہ خلافی کی شکایت کیسے کی جائے۔

میں نے اس مضمون کی ابتدا میں حلیم صاحب کو پروفیسروں کا پروفیسر اور پیروں کا پیر کیا غلط لکھا ہے؟ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں پاس ہوا اور یونیورسٹی کی بالکل ابتدائی تقرریوں میں ۱۹۲۱ء میں وہ بحیثیت پروفیسر و صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات تعلیمی عملہ میں شامل ہوئے یعنی لکچرر یا اسسٹنٹ پروفیسر یا ریڈر کی اسامی سے ترقی کر کے پروفیسری پر نہیں پہنچے۔ بلکہ ابتدا ہی سے پورے پروفیسر رہے (یہ بھی واضح ہو کہ یہ شعبہ اتنا بڑا تھا کہ بعد میں اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کی پروفیسری حبیب صاحب کے سپرد کی گئی) حتیٰ کہ رحمت اللہ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے علی گڑھ یونیورسٹی کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر چلے جانے کے بعد راس مسعود مرحوم کے بحیثیت وائس چانسلر علی گڑھ آنے پر اساتذہ کی

قابلیت، کارکردگی اور تجربہ پر نظر ثانی و تحقیقات مزید کے نتیجے میں جو شکست و ریخت ہوئی اس میں بھی انھیں کوئی نہ ہلا سکا۔ حالانکہ ملازمت سے برطرفی کے ساتھ ساتھ بعض سینیر اساتذہ کی کم از کم عہدوں سے تنزلی کی مثالیں میری نظر کے سامنے ہیں۔

۱۹۲۳ء میں میں نے علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے سے میری اُن سے نیازمندی رہی۔ ابتدائے ملازمت سے ایک مقتدر اور برگزیدہ استاد بلکہ ایک مثالی مرد مومن کی جو روایت انھوں نے قائم کی بقول اقبال ؎

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اسے مرتے دم تک ہمواری کے ساتھ نباہا۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیمی قابلیت اور حسین و دلنواز شخصیت و سیرت کے فیض سے برصغیر کے مسلمانوں کی کم از کم دو نسلوں کی تربیت کی۔ ہزارہا طلبا کی رہبری اور دستگیری کی اور اپنی مثال سے اعلیٰ شوق رکھنے والی زندگی کا نصب العین دکھایا۔ انھوں نے سیکڑوں اعلیٰ حکام اور منتظمین اپنی نگرانی میں علی گڑھ سے نکالے اور ان کے اثر و سایہ میں آنے والے طلبا میں سے دو تو پاکستان اور بھارت کے صدر مملکت بھی ہوئے کتنے ہی پروفیسر بھی ہوئے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ قائداعظم کی رہبری میں پاکستان کے لیے خود ان کی اپنی خدمات کے علاوہ علی گڑھ کی وہ نسل جس نے مسلمانوں کی اس مملکت کے حصول کے لیے جنگ کی وہ ساری کی ساری ان کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی۔

علی گڑھ میں وہ ایک دبلے پتلے چھریرے جسم کے جوان تھے شیروانی پہنتے تھے لیکن زیادہ تر انگریزی لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ وہ انگریزی زبان کے ایک خوش گفتار مقرر تھے۔ پاکستان میں انھوں نے مستقل طور پر شیروانی پہنی شروع کی اور شستہ و رفتہ زبان اردو میں تقریر کرنے لگے۔ اردو سے انھیں عشق ہو گیا تھا۔ پروفیسر میاں محمد شریف (شعبۂ فلسفہ مرحوم) کے بعد وہ علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہوئے۔ انھیں کے زمانے میں ۱۹۳۳ء میں شعبۂ اردو میں میرا تقرر ہوا اور انھیں کی اجازت سے میں ۴۳ء میں حکومت ہند کی ملازمت پر گیا۔ میں اسے کیسے بھلا دوں بلکہ انھوں نے میری زندگی بہتر بنانے کے خیال سے یونیورسٹی سے پہلے طویل رخصت دلائی اور پھر میرا استعفیٰ منظور کرانے میں کتنی آسانیاں مہیا کیں۔ میں نے یونیورسٹی سے رخصت ہوتے وقت نہایت عزیز ذخیرۂ کتب اپنی مادر علمی کی نذر کیا تھا۔ انھوں نے اس واقعے کا اپنی سالانہ رپورٹ میں خاص طور پر ذکر کیا اور اس عطیہ کی بنا پر مجھے یونیورسٹی کورٹ کے الیکشن کا حق دار بنانے کے لیے میرا نام معطیان کے حلقے میں شامل کر دیا۔ اگر سر سید راس مسعود نے میری زندگی سدھارنے کے لیے راہ ہموار کی تو پروفیسر حلیم نے مجھے اس راہ پر چلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

پھر تقسیم ہند سے قبل کراچی آ کر انھوں نے تن تنہا سندھ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد کراچی کی فیڈرل یونیورسٹی کا ڈول ڈالا۔ وہ اُن دونوں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہے مگر ان کی سادگی اور منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ کراچی یونیورسٹی نے خود کو معزز بنانے کے لیے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی تو انھوں نے اس کی خاطر شکنی سے بچنے کے لیے قبول تو کر لی مگر اپنے نام کے ساتھ اسے کبھی شامل نہ کیا۔ میرے بڑے اصرار پر مرحوم

کی مذکورہ کتاب "سفر نامہ جاپان" کے سرورق پر مقدمہ نگاری کے اعلان کے سلسلے میں اپنے نام کے ساتھ ڈی لٹ کے اضافے کی اجازت دی۔

جب ہم پروفیسر حلیم جیسے پاک باطن، خوش صفات وضع دار اور بلند کردار علما و فضلا کی رحلت پر آنسو بہاتے ہیں تو دراصل ایک فرد کے اُٹھ جانے پر نہیں بلکہ اُن اقدار کے زوال پر بہاتے ہیں جن کی یہ بزرگوار یہ خوبصورت علامت ہوتے ہیں اور ان چراغوں کے گل ہو جانے پر بہاتے ہیں جن کی روشنی نے ایک غریب قوم کی پوری پوری نسلوں کی رہنمائی کی ہوتی ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کو آگے بڑھایا ہوتا ہے، گرتے ہوؤں کو تھام لیا ہوتا ہے

؎ مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی! (اقبال)

اور اس لیے افسوس کرتے ہیں کہ جیسا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، زمانے کا عفریت لمبے لمبے ڈگ بھرتا، ان بیش بہا قدروں کو توڑتا پھوڑتا، گرتا، پامال کرتا، روندتا چلا آتا ہے اور آہ! کہ وہ وقت دور نہیں جب انھیں نیست و نابود کر کے ہی دم لے گا ؎

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کبھی
(حسرت)

حواشی

۱ے پروفیسر محمد محمود احمد، حلیم صاحب کے بھانجے تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر و ڈین فیکلٹی آف آرٹس۔ عارضی وائس چانسلر بھی رہے۔ علی گڑھ میں مجھ سے جونیئر مگر میرے بڑے مخلص دوست تھے۔ شعبۂ فلسفہ میں لکچرر تھے۔

۲ے کچھ عرصے سے ماہنامہ "قومی زبان" کراچی میں میرے حواشی کے ساتھ ان میں سے بعض کاغذات کی اشاعت جاری ہے۔

۳ے یہ اور بات ہے کہ ان صاحب نے مذکورہ خط کے علاوہ بعض دوسری اہم متعلقہ دستاویزات کو دکھانے کا وعدہ کرنے اور حلیم صاحب کو اور مجھے پیہم انتظار اور تقاضے کرانے کے باوجود وعدے سے بھی ان چیزوں کی جھلک نہ دکھائی۔ نہ لکھ ہی کر کچھ دیا۔ افسوس مسعود مرحوم کے چند دیگر اعزا اور اہلِ خاندان نے بھی ہمارے نیک کام میں بالکل امداد بہم نہ پہنچائی۔

۴ے اس سلسلے میں ... آج کل کے "تحقیق" کی سہل انگاری اور "کاتا اور لے دوڑی" کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ ایک خاصے معروف صحافی اور ادیب نے ایک خاص موضوع پر کتاب تیار کی۔ بعض امور میں میرے مرتب کردہ ایک مجموعے سے بھی حاصل کیے۔ کتاب ایک نامور ادارے نے شائع کی۔ بڑی دھوم دھام سے "ہونے نقاشوں" کے مطابق کتاب کی رونمائی ہوئی۔ "دانشوروں اور اخبار نویسوں" تالیاں بجائیں جلسے کی خبریں چھپیں تصویریں شائع ہوئیں وغیرہ۔ میں نے کتاب دیکھی تو مرتب صاحب سے پوچھا کہ آپ نے فلاں خط کا مسودہ اس میں شامل نہیں کیا نہ اس کا حوالہ دیا جو آپ کے موضوع پر صرف آخر تھا اور آپ کے پیرے کو بنیادی بخشی دیتا حالانکہ مسودہ مذکور میں اپنے دوسرے مرتب کردہ مجموعے میں آپ کی کتاب چھپنے سے تین چار سال پہلے شائع کر دیا تھا۔ فرمایا ضرور آپ نے وہ مجھے مجھے دیا ہی کب تھا؟ حالانکہ کتاب ریویو کے لیے ان کے یہاں حسبِ معمول بھیجی گئی تھی۔ نہ بھی بھیجی گئی ہوتی تو تحقیق کی ذمہ داری ان کی تھی ؎
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ بعد میں ان مرتب یا محقق صاحب کی کتاب کا ایک کل پاکستان انعام بھی ملا۔

۵ے مثلاً ارشاد علی صاحب مرحوم اول الذکر ذیل میں آتے ہیں اور پروفیسر ایم ایم شریف مرحوم دوسری ذیل میں جو ریڈر بنا دیے گئے تھے۔

۶ے منجملہ دیگر خدمات کے حلیم صاحب نے ہندوستان بالخصوص پاکستانی علاقوں کی اقتصادی و صنعتی ترقیاتی منصوبہ بندی کے سلسلے میں قائد اعظم نے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کی مستقل حیثیت سے ایک جامع رپورٹ تیار کی تھی۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ پاکستان بننے کے بعد اس رپورٹ سے کوئی فائدہ اُٹھایا گیا یا نہیں مگر اس کی ایک نقل راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

سلام کے دو عشق — مذہب اور سائنس

[" یہ تحریر ایک اطالوی اخبار "کوریئر دیلا سیرا" کے ۱۳ رنومبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک خاکے کا ترجمہ ہے ۔"]

اسرار احمد *

نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنس داں عبدالسلام کی شخصیت کسی قسم کے تعارف سے بالاتر ہے۔ ان کی ذات عظمتوں کا سنگم ہے۔ وہ سائنس کے تاریخ ساز ہیں اور عالمی امن میں تاریخ بنا رہے ہیں۔ ساتھ ہی وہ انتہائی کامیاب منتظم بھی ہیں، لیکن جو چیز ان کو دیگر معتدد سائنس دانوں سے بالاتر کرتی ہے وہ ہے ان کی اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے گہری وابستگی۔ مغرب کے مادہ پرست ماحول میں رہنے کے باوجود مشرق کی روحانیت ان کی زندگی کی بنیاد ہے اور اس پر انھیں فخر بھی ہے تبلیغ اسی روحانیت نے ان کو رواداری، منکسر المزاجی اور دردمندی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچایا ہے اور ان کی شخصیت کو مقناطیس بنا دیا ہے ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ تیسری دنیا بالخصوص عالم اسلام کی علمی پسماندگی ہے جس کے سبب وہ مغرب کی عیارانہ درندگی کا معمول سے شکار ہے۔ اس دکھ کے مداوا کے لیے انھوں نے خود کو وقف کردیا ہے۔

[مترجم]

انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس (آئی۔سی۔ٹی۔پی) بنیادی طبیعیات کا ایک اہم مرکز ہے جو ایک نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنس داں عبدالسلام کی سربراہی میں چل رہا ہے۔ یہ مرکز ۱۹۶۴ء میں انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے تحت قائم ہوا۔ ۱۹۷۰ء سے یونیسکو بھی اسے چلانے میں شریک ہے، لیکن اس کے بجٹ کا بیشتر حصہ جو ایک کروڑ ڈالر کے قریب ہے اٹلی کی گورنمنٹ پورا کرتی ہے (جس کے ایک شہر ترلیستے، میں یہ مرکز

* چیرمین ڈپارٹمنٹ آف فزکس ۔ ڈائرکٹر سینٹر فار پروموشن آف سائنس، اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ

قایم ہے)

اس مرکز کو سپر یونیورسٹی کہنا بے جا نہ ہوگا یہاں نظریاتی طبیعیات میں اعلیٰ سطح کی تعلیم و تدریس کا خصوصی انتظام ہے۔ حال ہی میں یہاں دو تجربہ گاہیں بھی قایم کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک مائیکرو پروسسر (MICRO-PROCESSOR) کی ہے اور دوسری ہائی ٹمپریچر سپر کنڈکٹر کی۔ اس مرکز سے ایک سو اکتالیس ممالک کے سائنس داں مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ سائنس داں یہاں اعلیٰ سطح کی تعلیم و تحقیق کے لیے آتے ہیں اور اس طرح سائنس دانوں کی بین الاقوامی برادری سے رابطہ قایم رکھتے ہیں۔ ان سائنس دانوں میں زیادہ تر ترقی پذیر ممالک کے ہوتے ہیں۔

اس مرکز کے بانی عبدالسلام ہیں جو ۱۹۵۷ء سے امپیریل کالج لندن میں پروفیسر ہیں۔ وہ اسے انتہائی خوش اسلوبی اور رچابک دستی سے چلا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس انتظامی ذمہ داری سے کبھی بھی پہلوتہی نہیں کی۔ اس کے باوجود انھوں نے بین الاقوامی سائنس میں اپنے اعلیٰ مقام کو برقرار رکھتے ہوئے اعلیٰ معیاری تحقیقی کام جاری رکھا اور ۱۹۷۹ء نوبل انعام حاصل کیا۔ یہ انعام انھیں خفیف نیوکلیائی اور برق مقناطیسی قوتوں کی وحدت کے انکشاف پر دیا گیا۔

نظریاتی طبیعیات کے میدان میں عبدالسلام کی تحقیقات، جنیوا میں واقع سرن (CERN) کے تجرباتی طبیعیات کے متعدد سائنس دانوں سے پنگ پانگ کھیل کے مترادف ہے۔ پہلے عبدالسلام نے ویک نیوٹرل کرنٹ (WEAK NEUTRAL CURRENT) کے وجود کی پیشین گوئی کی۔ سرن کے سائنس دانوں نے اپنے تجربات سے اس پیشین گوئی کو ۱۹[illegible]ء میں صحیح ثابت کیا۔ اس کے بعد عبدالسلام نے انٹرمیڈیٹ وکٹر بوزان کے وجود کے وجود کی پیشین گوئی کی جسے پھر ۱۹۸۳ء میں سرن کی تجربہ گاہوں میں صحیح پایا گیا۔ آخرالذکر تجربے پر اٹلی کے کارلو روبیا (Carlo Rubbia) اور سائمن وان ڈے میر (Simon Van der Meer) کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔

طبیعیات کے میدان میں گزشتہ بیس سالوں میں ہونے والے یہ انتہائی اہم تخلیقی کارنامے ہیں جنھیں عبدالسلام نے بڑی خوب صورتی سے اپنی ایک حالیہ کتاب دی یونی فیکیشن آف فنڈامنٹل فورسز (The Unification of Fundamental Forces) میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں یورپ کے دو مشہور سائنس دانوں ہائزن برگ اور ڈیراک کے لکچرز بھی دیے گئے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی طبیعیات کس طرح درجہ بدرجہ آگے بڑھی ہے اور عبدالسلام نے کس طرح اپنے اعلیٰ تخلیقی کارناموں کا محل تعمیر کیا ہے۔ عبدالسلام کی یہ کتاب جو گزشتہ دہائیوں میں بنیادی طبیعیات کے میدان میں ہونے والے انکشافات کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں جگہ جگہ ایسے بیانات ملتے ہیں جن سے ان کی اسلام سے گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

عبدالسلام کی زندگی میں ۱۹۶۰ء کے آس پاس کے واقعات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اٹلی کے نیوکلیر سوسائٹی کے صدر کارلو سالویٹی کے بقول یہ بین الاقوامی سیاست کی آنکھ مچولی کا دور تھا۔ جنیوا میں ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۸ء میں اٹامک انرجی برائے امن کے موضوع پر ہونے والی کانفرنسوں کے بعد عوامی سطح پر کنٹرولڈ نیوکلیر فیوژن (Controlled Nuclear Fusion) کی اہمیت کا انکشاف ہوا۔ توانائی کے اس وافر ذخیرے

کے حصول کی امید کے ساتھ ہی نئی صدی یہ خواہش ابھرا
کہ دنیا کی دو سپر طاقتیں نیوکلیئر انرجی کے سلسلے میں ایک
دوسرے سے تعاون کریں۔ انٹرنیشنل اٹامک انرجی
ایجنسی نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس مسئلے پر دونوں
سپر پاور باہمی تعاون سے کام لیں مگر ان کے درمیان
اختلافات اور عدم اعتماد کی اتنی وسیع خلیج حائل تھی
کہ یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ اس لیے انٹرنیشنل اٹامک
انرجی ایجنسی کے کرتا دھرتاؤں نے ذراتی طبیعیات کے
میدان کے مسئلے پر ان دونوں بڑی طاقتوں کے مابین
باہمی تعاون کی بات سوچی۔ نظریاتی طبیعیات کے میدان کا
انتخاب فطری تھا کیوں کہ اس میدان کا تعلق بنیادی
تحقیق سے ہے اس سے کسی کے فوجی یا صنعتی راز
کے منکشف ہونے کا خطرہ درپیش نہ تھا۔ اس منصوبے
کو متعدد ماہرین طبیعیات کی ایک کمیٹی نے منظوری دی
اس کے بعد کا مرحلہ مستقبل کے مرکز کی جگہ کے انتخاب کا تھا
اٹلی کے مندوب نے اپنے ملک کے ایک شہر تریستے
(TRIESTE) کا نام پیش کیا جسے اولاً سبھی نے ناپسند
کیا لیکن مختلف طریقوں سے اٹلی کی کوششیں جاری
رہیں اور وہ بالآخر اپنی تجویز پر منظوری حاصل کرنے
میں کامیاب رہا۔ اس طرح مجوزہ مرکز اٹلی
میں قائم ہوا اور عبدالسلام متفقہ طور پر اس مرکز کے
ڈائرکٹر منتخب ہوئے۔

عبدالسلام کی کتاب ان کی اسلامی تہذیب
سے گہری وابستگی کی آئینہ دار ہے۔ یہ کتاب ان
دریچوں کو کھولتی ہے جن سے مشرق کا شاندار ماضی نظر
آتا ہے۔ وہ دور نظر آتا ہے جب مشرق علم و ہنر
اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا اور جب یورپی
اقوام، علم کے حصول کے لیے عربوں کے سامنے زانوئے
تلمذ تہ کیا کرتی تھیں۔ مختلف علوم کو عربی سے اپنی زبان
منتقل کرتی تھیں۔ اسی طرح عبدالسلام کی طبیعیات
میں تحقیقات پر بھی اسلام کی گہری چھاپ ہے۔ فطرت
میں پایا جانے والا تشاکل، بظاہر مختلف نظر آنے
والی قوتوں میں وحدت اور ذرات و ضد ذرات
کی وسیع دنیا میں عبدالسلام کو مشرق کے روحانی
فلسفے کی صداقت کی دلیل نظر آتی ہے۔ یہی سبب
ہے کہ عبدالسلام کی اعلیٰ سائنسی کاوشیں مذہب سے
ان کے تعلق کو اور مضبوط کرتی گئیں۔ اس لیے اس بات
پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ جب لندن میں سلام
کو نوبل انعام کے لیے منتخب کر لیے جانے کی خبر ملی
تو انھوں نے سب سے پہلے نماز شکرانہ ادا کی۔ سلام
انتہائی منکسر مزاج ہیں اور اپنی ذاتی زندگی کے بارے
میں گفتگو کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات
ہے کہ ان کی ذات سے وابستہ چند داستانیں عام
ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کی ایک لڑکی امتحان میں صرف
اس وجہ سے فیل کر دی گئی کہ اس نے ایک سوال
کے جواب میں عبدالسلام کے ایک نظریہ کو بیان
کیا تھا یا یہ کہ وہ انتہائی کفایت شعار ہیں جس کا ایک
سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کا ماضی رئیسانہ ٹھاٹ باٹ
سے کافی دور رہا تھا۔ اسی طرح اٹلی میں زندگی کا
ایک بڑا حصہ گزارنے کے بعد بھی وہ اطالوی زبان
نہیں بول سکتے اور وہ اتنے لمبے عرصے تریستے میں رہنے
کے باوجود بھی وہاں کی آب و ہوا سے مطابقت نہ پیدا کر سکے
ایسا لگتا ہے کہ عبدالسلام کو ٹھنڈ بہت لگتی ہے
جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ اگست کے مہینے
میں بھی خود کو اوورکوٹ میں لپیٹے رہتے
ہیں۔

غریب طلبا اور تعلیم

محمد اسحاق ★

حیدر آباد میں کاچی گوڑہ اسٹیشن روڈ پر ایک محلہ نگر پی ہے جس کے ایک کونے پر میونسپلٹی کا ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔ "ڈاکٹر کبیر منا لین" ان کا انتقال ہوئے کوئی دس پندرہ برس ہو چکے ہوں گے۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ سارے شہر میں ان کا چرچا تھا۔ دوائیں مفت دیتے۔ معلوم نہیں فیس یا خرچ کس سے لیتے۔ میں خود بھی اپنے کالج کے زمانے میں ان کے پاس سے دوائیں لاتا کیوں کہ مفت کا سودا تھا۔ سنتے تھے کہ ہاتھ میں شفا ہے۔ ان کا بچپن بڑی غربت اور تنگی کا تھا۔ ڈاکٹر حامد نواز جنگ کہتے تھے کہ یہ اپنے اسکول کے زمانے میں راتوں کو اسٹریٹ لائٹ کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

ساتویں جماعت سے ایک طالب علم باریڈی میرے ہم جماعت تھے، وہ اپنے دیہات سے چھ دن کے لیے جوار، باجرہ کی روٹیاں اور کچھ چٹنی، اچار ساتھ لا کر تعلقہ مستقر کے مڈل اسکول کے ایک ٹیچر کے مکان میں رہتے۔ ان ہی خشک روٹیوں پر ان کا گزارہ تھا۔ ڈسٹرکٹ کے ایک ہائی اسکول میں جب نویں جماعت میں شریک ہوئے سارے طلبا اور اساتذہ پر ان کی ذہانت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ابھی یہ نویں جماعت میں تھے میٹرک کی جنرل اور اعلیٰ ریاضی کی کتابوں کا پورا حل اپنی نوٹ بک میں تیار کر رہا تھا۔ انگلش اردو چیمبرز ڈکشنری انہیں پوری زبانی یاد تھی۔ کم از کم تین ہزار لفظ تو ہوں گے۔ کہیں آپ کوئی لفظ پوچھ لیں۔ اس کے معنی، مطلب، استعمال سب حاضر۔ اس میموری کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اپنی غرض کے مارے ہم سب اس کی دوستی کا دم بھرتے۔ میٹرک کے امتحان میں اول آنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ ملا۔ تیسرے سال، مسلسل غربت اور فاقوں کا شکار ہو کر یہ ذہین طالب علم دق کے مرض میں گرفتار ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر کو سن کر کچھ دیر مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ یہ اگر زندہ رہتا تو ہندوستان کا مشہور انجینئر ہوتا یا پھر دوسرا "سر وشیشوریا" ہوتا جن کا مجسمہ راج بھون روڈ پر کھڑا ہوا ہے،

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

نہ معلوم غریب ماں باپ پر کیا گزری ہو گی۔ یہ اگر زندہ رہتا تو اس کے خاندان اور چھوٹے سے گاؤں کی قسمت بدل جاتی۔ نہ معلوم اس کی ہستی ملک اور قوم کے

★ ہیڈ ماسٹر، ایمبسی اسکول آف انڈیا، الجبیل، سعودی عربیہ۔

لیے کتنی فیض رساں ہوتی ۔

ایک اور غریب ذہین طالب علم سے اپنی گاڑھی چھنتی تھی جو چھٹی جماعت میں تھے ۔ ہیڈ ماسٹر ڈسپلن کے بہت پابند تھے ۔ انھوں نے پانچویں جماعت سے سب طلبا کے لیے نیلی شیروانی یا کوٹ اسکول یونیفارم لازمی کر دیا ۔ یہ دراصل عثمانیہ یونیورسٹی یونیفارم کی نقل تھی ۔ اس زمانہ میں شیروانی دو روپے آٹھ آنے میں سلوائی کے خرچ کے ساتھ تیار ہو جاتی تھی ۔ اسی زمانہ میں ریاست حیدرآباد کے ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) ، جناب سید علی اکبر کے معائنہ کا پروگرام آگیا ۔ پھر کیا تھا سب طلبا نے جلد جلد شیروانی سلوائیں جس دن انسپکشن تھا یہ ایک طالب علم وہی سادہ لباس میں تھا ۔ ٹیچر نے دیکھا کہ یہی ایک ساری کلاس کا شو ، بگاڑ رہا ہے ۔ اسے اسکول سے باہر چلے جانے کے لیے کہا ۔ وہ سر جھکائے کلاس میں کچھ دیر کھڑا رہا ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور وہ باہر چلا گیا ۔ دور بیٹھے ہوئے ڈائرکٹر کو آتے ہوئے اور جاتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ اگر مبالغہ نہ ہو تو اس طالب علم نے عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی منزل پیٹ کے بل گھسیٹتے ہوئے پار کیا ۔ یہ چاہتا تھا کہ اعلیٰ ریاضی مضمون اختیاری کے طور پر لے تو ٹیچر نے کہا کہ انجینئرنگ کالج میں ایک کیاس خریدنا پڑتا ہے جس کی قیمت ستر روپے ہوتی ہے تم خرید نہیں سکتے اس طرح اس کی زندگی کی لکیر درمیان ہی سے کٹ گئی ۔

میرے ساتھ ایک اوسط طالب علم نائی برادری کا پڑھتا تھا جو اپنے ساتھیوں کی اور اسکول کے طلبا کی حجامت بناتا تھا ۔ ایک آنے دو آنے میں ہماری اچھی حجامت ہو جاتی تھی ۔ اس قابل فخر طالب علم نے حجامت کے پیشے کے سہارے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ۔ پھر ہم بچھڑ گئے ۔ بہت دن بعد کاچی گوڑا اسٹیشن پر ایک پولس انسپکٹر مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھ رہا تھا ۔ دیکھا یہ وہی اپنا ساتھی ہے جو کلاس میں ہم سب کے مذاق کا مرکز تھا ۔ ہندوستان آزاد ہو چکا تھا ۔ آٹھ اضلاع میں کوئی ایک بھی نائی برادری یا بیک ورڈ کلاس میں میٹرک کامیاب نہ تھا ۔ بس انھیں پولس عہدہ دار کے طور پر منتخب کر لیا گیا وہ اسسٹنٹ کمشنر پولس کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے ۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک سینئر طالب علم تھے ، جو ایم ۔ ایس سی اچھے درجے سے کامیاب ہوئے تھے ان کے والد ایک لکڑی کی ٹال پر مزدور تھے ۔ یہ محض ٹیوشن کی آمدنی پر اتنا سب کچھ کر چکے تھے ۔ جب یہ پاس ہو گئے تو حیدرآباد کے بہت سے امیر کبیر انھیں اپنی دامادی کا شرف عطا کرنے کے لیے تیار ہو گئے ۔ ان کی شادی ایک اونچے گھرانے میں ہوئی ۔ ریاست حیدرآباد کے اسکالرشپ پر انگلینڈ گئے ۔ کوئی اچھی ڈگری لے کر واپس ہوئے جب تک ملک دو ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا ۔ یہاں ان کی پذیرائی نہیں ہوئی ۔ پاکستان چلے گئے ۔ وہاں پر بہت بڑے عہدے پر فائز ہوئے ۔ کوٹھی پر تین کاریں اور سترہ نوکر چاکر تھے ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے ایک دلچسپ مضمون "نذیر احمد کی کہانی ، میری زبانی" میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ

"نذیر احمد ایک نہایت ہی غریب طالب علم تھے ۔ تعلیم کا شوق تھا ۔ دہلی کی کسی مسجد میں کوئی مولوی صاحب بچوں کو پڑھاتے تھے ۔ یہ بھی وہیں بیٹھ گئے ۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ لڑکا غریب ہے اور ذہین بھی ہے ، اپنی خدمت میں رکھا ۔ وہ دن رات مولوی صاحب

کی خدمت میں رہتے۔ مولوی صاحب کے لیے ایک امیر کے گھر سے کھانا مقرر تھا۔ جب نذیر احمد ان کے گھر جاتے تو ان صاحب کی لڑکی کو شرارت سوجھتی۔ وہ اُن کے کان پکڑ اُنھیں چٹنی مسالے پیسنے کے لیے بٹھا دیتی قدرت کی کرنی ایسی ہوئی کہ جب یہ بڑے ہوئے تو اُن کے علم و فضل کی سارے شہر دہلی میں دھوم مچ گئی اور پھر اسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی جو اُن سے بچپن میں مرچ مسالہ پیسنے کی مشقت لیتی۔"

یہی حال ہر غریب طالب علم کا تھا جو کچھ پڑھ لکھ کر اوپر آ گیا تو صاحب ثروت و شوکت، نواب اور زمین دار اپنی دامادی کا شرف عطا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے بلکہ اس کو پھانسنے کے لیے جال بچھائے جاتے۔ اکبر الہ آبادی نے اس حال کی بھی تصویر کھینچی ہے۔

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا گر تو کر لے تو بی۔ اے پاس

اس طرح یہ غریب طالب علم ایک ہی جست میں غریبی کے غار کو پار کر جاتا لیکن اس کا ایک بڑا نقصان تو یہ ہوتا کہ وہ بڑے گھر کی بیوی کے احسانات میں دب جاتا اور پھر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے خاندان ہی سے کٹ گیا لیکن بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے ماضی کو "ایاز" کی طرح یاد رکھا اور اپنے خاندان کی بھلائی کے لیے بہت کچھ کیا۔

گزشتہ دو سال سے مدینہ ایجوکیشن سوسائٹی (حیدرآباد) کے سکریٹری جناب کے۔ ایم عارف الدین نے ایک نہایت ہی قابل تعریف کام شروع کیا ہے۔ وہ ہر سال ایسے مسلم طلبا کو جنھوں نے کسی اعلیٰ امتحان میں اعزاز کے ساتھ کامیاب حاصل کی ہو، انھیں گولڈ میڈل دیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے بہت اعلیٰ پیمانے کی تقریب منعقد کی جاتی ہے جس میں ملک کے دانش ور مدعو کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں ضلع کرنول کے ایک تلگو میڈیم رزیڈنشیل اسکول سے ایک مسلمان طالب علم ریاست آندھرا پردیش کے میٹرک پبلک امتحان میں اوّل درجے سے کامیاب ہونے والے طلبا کی فہرست میں، سرفہرست تھا۔ یہ جب اپنے باپ بھائی کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کے لیے آیا تو اس کے پیر میں چپل بھی نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ خاندان کی آمدنی کا ذریعہ صرف ڈھائی ایکڑ زمین ہے۔ اس کے لیے مدینہ ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کے لیے معقول وظیفہ بھی جاری کر دیا گیا۔

جو حضرات اس مضمون کو پڑھ رہے ہوں گے ان میں بعض خود بھی اپنے زمانۂ طالب علمی میں اس دور عسرت سے گزر چکے ہوں گے۔ بعض کے تجربے میں ایسے غریب ذہین طلبا کی بھیانک تصویریں ضرور ہوں گی۔ افسانوں اور تاریخ کے صفحات پر ایسی سیکڑوں مثالیں مل جائیں گی۔ ان سب کا حال سن کر فطرتاً سب کو رحم بھی آتا ہوگا لیکن یہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں کسی کے رحم و کرم کے طالب نہیں ہوئے۔ اپنی خودداری کو قایم رکھا اور زمانہ کے بے حس سماج اور گردش ایام کی چکی میں پس گئے اور زندگی میں اپنے لیے کچھ مقام پیدا کر لیا۔

لیکن ان میں بہت سے ایسے بھی تھے جو منزل کا پتہ نہ پا کر راستہ ہی میں تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ کس حسرت سے وہ دوسروں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے رہے پھر ان کا کیا ہوا، وہ کہاں غائب ہو گئے، کچھ نہیں معلوم ان میں کچھ ہیرے، جواہرات بھی تھے جو سماج کے کنکر پتھر میں گم ہو گئے۔ بس ہمیں اپنی کامیابی اور زندگی میں ترقی پر ترقی کی فکر رہی۔ وہ ہمیں دور سے دیکھ کر اپنی محرومیاں پر غمزدہ ہوتے رہے۔ کبھی وہ ہم سے ملے تو ایسے کہ کبھی

ہمارے ساتھ نہ تھے اور نہ انھیں وہ دھول دھپا یاد رہا۔ وہ
ہم کو اونچا معیار سمجھتے اور اپنے کو اس کا سایہ بس

انہی میں گو ہر تہوار بجا ایسے رہے ہیں گے
کہ جن کی خوبیاں سب چھپ گئی ہیں سندر کی
(طباطبائی)

خشونت سنگھ نے "سنڈے" ماہ دسمبر ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں صفحہ ۱۹ پر "برہمن طاقت" Brahmin Power کے عنوان سے چند دلچسپ اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہر محفل میں مجھے اس کی کچھ کھوج سی رہتی ہے کہ یہاں کس ذات کے کتنے لوگ جمع ہیں۔ جہاں کہیں دیکھتا ہوں برہمن کا بول بالا ہے:

"whatever be the sphere of curiosity, literary, scientific, bureaucratic, the brahmin remains the top dog..."

۱۹۸۲ء کے ایک سروے کے مطابق آبادی میں ان کا تناسب صرف ساڑھے تین فیصد ہے لیکن یہ ملک کی اعلیٰ ترین ۷۰ فی صد جائیدادوں پر قابض ہیں۔ سینیئر سول سروس آفیسرس میں جو ڈپٹی سکریٹری اور پھر اس سے اوپر کی ۵۰۰ جائیدادوں میں ۳۱۰ برہمن تھے۔ ۲۶ اسٹیٹ چیف منسٹرس میں ۱۹ برہمن، ۲۷ گورنرز اور لفٹیننٹ گورنرس میں ۱۳ برہمن، سپریم کورٹ کے ۱۶ ججوں میں ۹ برہمن، ہائی کورٹ کے ۳۳۰ ججس میں ۱۶۶ برہمن ۱۴۰ سفیروں میں ۵۸ برہمن، ۹۸ وائس چانسلرس میں ۵۰ برہمن، ۴۳۸ ڈسٹرکٹ ججس میں ۲۵۰ برہمن، ۳۳۰۰ آئی اے ایس آفیسرس میں ۲۳۷۶ برہمن، پارلیمنٹ کے ۵۳۰ ممبروں میں ۱۹۰ برہمن، راجیہ سبھا کے ۲۴۴ ممبروں میں ۸۹ برہمن۔

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ
اور میکدہ میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

اقبال نے شیخ و برہمن کا موازنہ ایمان و عقیدہ کی پختگی کی میزان میں ضرور کیا ہے لیکن علم کے میدان میں شیخ جی کو برہمن کی ہمسری کے لیے کوئی ایک سو برس لگ جائیں گے۔ اس وقت تک وہ پختہ زناری کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا نہیں معلوم۔

بظاہر برہمن طبقہ دان دھرم پر ہی زندہ رہا۔ ان کا شمار آزادی سے پہلے غریب طبقات ہی میں ہوتا تھا لیکن انھوں نے علم کو اپنے سینے سے لگائے رکھا حکومت و شوکت (چھتری)، دولت و معاش (ویش) جیسی پرکشش چیزوں کو دوسرے طبقات کے لیے چھوڑ دیا۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو حکومت کے کل پرزے یہی پڑھے لکھے اور قابل لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ آزادی کے ساتھ ہی ہر محکمہ میں ہزاروں جائیدادیں کھل گئیں اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہی اور برہمن رہ گئے جو ساری آبادی کا بس دو تین فی صد تھے اس میدان میں کوئی ان کا رقیب ہی نہ تھا اور تعلیم میں ان کا اوسط سو فی صد کے قریب تھا۔

وہ لوگ ان کے مقابلے پر آ ہی نہیں سکتے جو بڑی دیر سے بیدار ہو کر آنکھیں مل رہے ہیں اور کچھ چلنے بھی لگے ہیں۔ یہ جو کچھ مسلم طبقے کا حشر ہوا وہ ہمارے دولت مند طبقہ، لیڈر، رہنمایان قوم اور علمائے دین کی بے حسی اور سخت غفلت کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۱ء ہی میں ہوشمند کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ ہندوستان پچاس برس میں آزاد ہو جائے گا۔ آزادی کے بعد صرف اسی طبقے کو فائدہ پہنچے گا جو حکومت کی مشنری چلا سکے۔ اگر ایسا کوئی پلان پچاس برس پہلے بنایا جاتا کہ قوم کا کوئی فرد ان پڑھ نہ رہنے پائے تو آج مسلمان اس زبوں حالی میں گرفتار نہ

رہتے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط فی صد دس
سے بھی کم تھا۔ تقسیم کے بعد حکومت کی میں بھی ان کا حصہ
ہمیشہ کے لیے تقسیم ہوگیا۔ یہ نوشتہ افلاس تقدیر کا نہیں
بلکہ تعلیم سے دوری، جہالت اور غفلت کا نتیجہ ہے۔
ساڑھے تین فی صد برہمن آبادی کا ملک کی ۹۰ فی صد
اعلیٰ ترین جائیدادوں پر آزادی کے بعد سے مسلسل
قابض رہنا ان کی تعلیمی پیشرفت کا حیرت انگیز کرشمہ ہے
اب اس زنجیر کے ٹوٹنے کی توقع بہت کم ہے۔

پنڈت نہرو سے کسی نے پارلیمنٹ میں شکایت
کی کہ حکومت میں جنوبی ہند کی نمائندگی بہت کم ہے۔
پنڈت جی نے جواب دیا کہ ہمارے سنٹرل سکریٹریٹ
میں ٹائپسٹ سے سکریٹری تک ساری جگہوں پر
سب کے سب مدراسی اور جنوب کے لوگ قابض ہیں۔ سچ
پوچھو تو حکومت ان ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

غریب امیر طالب علم کا فرق محض ظاہری احساس
اور چند آسائشوں سے ہے لیکن جہاں تک تعلیم کا تعلق
ہے، وہاں سب برابر ہیں بشرطیکہ ان غریب طلبا کو
تعلیم حاصل کرنے کی ساری سہولتیں نصیب ہوں۔ ہمارے
سماج نے بڑی ہوشیاری سے انہیں جاہل رکھا۔ ہمارے
علم میں بعض ایسی مثالیں ہیں کہ بعض دیہات میں سرکاری
اسکول کھولے گئے، وہاں کے دبنگ مکھیا، زمین داروں
نے اسکول ٹیچر کو گاؤں سے بھگا دیا۔ البتہ اس کی تنخواہ
کا انتظام کر دیا کہ ہر مہینہ آ کر وہ اپنا وظیفہ حاصل کر لے
انہیں یہ خوف تھا کہ یہ غریب بچے پڑھ لکھ کر ہوشیار
ہو جائیں گے تو پھر یہ جانور ہمارے قابو سے باہر
ہو جائیں گے، جن کی دُم صدیوں سے ان کے ہاتھ
میں رہی تھی۔

۱۹۴۱ء میں گورنمنٹ کی جانب سے ایک کشمیری
پنڈت مورخ کو کشمیر کے دیہات کے اعداد و شمار
جمع کرنے کا موقع ملا۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"سارے ہی دیہات مسلمانوں سے
آباد ہیں لیکن ان میں ایک بھی پڑھا لکھا
نہیں ہے۔ حیرت تو اس بات پر
ہے کہ بعض مسلمان جو دس بارہ کے
عدد تک اپنی بھیڑوں کو گن بھی نہیں
سکتے۔"

آج بھی ان میں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط ۲ فی صد ہے
جب کہ یہ آبادی کا ۸۵ یا ۹۰ فی صد ہیں۔ ۱۰ فی صد
دوسرے پڑھے لکھے لوگ ۶۰ فی صد جگہوں پر قابض
ہیں۔

"اندھیرا ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں"

ہمارے اطراف و اکناف میں بہت سے غریب
اور ذہین طلبا تھوڑی سی تلاش کے بعد مل جائیں گے
انہیں ایک مہم اور پروگرام کے تحت اسکولوں میں شرکت
کروانا، ان کے لیے کاپی کتابوں کا انتظام کرنا ضروری
ہے۔ یہ کام ایک فرد یا ایک طالب علم کیوں نہیں کر سکتا؟
یا پھر تعلیمی اداروں کے توسط سے بھی اس کا
انتظام ہو سکتا ہے۔ ایجوکیشن سوسائٹی اور مسجد کی کمیٹیاں
صاحب ثروت لوگ ایک محلہ کے پیمانے پر یہ کام کر سکتے
ہیں۔ ذاتی تجربے میں یہ بات آئی ہے کہ غریب لوگ اپنے
بچوں کو اسکول لے جا کر فارم بھرنے اور شریک کروانے
سے گھبراتے ہیں، انہیں سمجھانے اور اس میں کام کرنے
کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں بہت سی دینی، سیاسی اور
ملّی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ان سب کے ہاں
لازماً ایک تعلیم کا شعبہ ہونا ضروری ہے۔ جو چند
مخلص، ہمہ وقتی کارکنوں کے ہاتھ میں ہو۔
ریاستی اور مرکزی سطح پر "مسلم ایجوکیشن

ٹرسٹ" قائم کرنے کی سخت ضرورت ہے جس کا ایک بنیادی مقصد غریب اور ذہین طلبا کی تعلیم کا بھرپور انتظام کرنا ہوگا۔ دوسرے اور کئی تعلیمی کام بھی ہیں جن کی افادیت سے انکار نہیں۔

نجی اعلیٰ تعلیم کے کالج اور پیشہ ورانہ فنی تعلیمی ادارے، جیسے میڈیکل اور انجینئرنگ کالج یا ٹریننگ کالج ہیں ان میں غریب طلبا کے لیے درسی مدد کی مدتک نشستیں محفوظ کر دیں اور انھیں فیس وغیرہ کی اخراجات سے آزاد کر دیں تو ان میں بہت سے قابل لوگ نکل آئیں گے۔ تعلیم ہی ایک ایسی جوہری طاقت ہے جو فرد کی اعلیٰ صلاحیتوں کو پوری قوت سے آزاد کر دیتی ہے جیسے کسی پہاڑی چٹان سے چشمے پھوٹ پھوٹ کر جاری ہو جاتے ہیں۔

اے زبان!

"اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر تیری طاقت نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کر اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت اور روح کے پیغام پر حاشیہ نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا لقب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔"

حالی

بے پردگی و بے شرمی

محمد مختار اصلاحی علیگ *

نہایت افسوس و شرم کی بات ہے کہ موجودہ زمانے میں بے پردگی و بے شرمی نے حد سے بڑھ کر اب وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ پرانی تاریخوں میں بھی کچھ شرمناک واقعات ضرور ملتے ہیں لیکن شاید تاریخ کے کسی دور میں بھی مغرب سے مشرق تک مجموعی طور پر بے پردگی و بے شرمی نے کبھی ایسی بھیانک شکل اختیار نہیں کی تھی جو آج نظر آ رہی ہے۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے پھیلانے اور عام کرنے کے جو ذرائع ہیں وہ بہت تیز رفتار اور نہایت موثر ہیں۔ سینما، ٹی۔ وی، ریڈیو، ویڈیو اور فحش لٹریچر وغیرہ کے برے اثرات سے اب شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جو محفوظ ہو۔ شاعر مشرق نے تو بہت پہلے ہی یہ پیشن گوئی کر دی تھی

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوش مند
غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

آج مرد و عورت دونوں اس بے حیائی میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں لڑکوں اور جوانوں میں پہلے سر سے ٹوپی غائب ہوئی پھر لمبے کرتے کی جگہ قمیص نے اور پائجامہ اور دھوتی کی جگہ پتلون نے لی۔ اس کے بعد قمیص چھوٹی اور پتلون تنگ ہو گئی۔ پھر بڑی تیزی کے ساتھ نہ جانے کس بے حیا کے اشارے سے چھوٹی سی قمیص کو بھی تنگ پتلون کے اندر ڈال دیا گیا ہے اور پچھلے حصہ کی ایسی شرمناک نمائش شروع کر دی گئی کہ شرم و غیرت کو بھی پسینہ آ رہا ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ بہت سے لوگ اسی برہنگی کے عالم میں عبادت بھی کیا کرتے ہیں اور بے شرمی کا ایسا کھلا مظاہرہ کرتے ہیں کہ شرم سے گردن جھک جاتی ہے۔ عورتوں کا حال بھی بد سے بدتر ہے۔ سر پر دوپٹوں کا تو اب سوال ہی کیا؟ وہ تمام نسوانی اعضا جو ان کے شوہر کی امانت ہیں۔ دوسروں کو بھی لطف اندوز ہونے کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ دیہاتوں میں حیا و شرم ابھی کہیں کہیں کچھ باقی بھی ہے لیکن شہروں اور خاص طور سے بڑے شہروں کا حال نہایت برا ہے۔ یہاں جان بوجھ کر عورتیں ایسے نیم برہنہ کپڑے زیب تن کرتی ہیں جن میں ان کے پوشیدہ اعضا صاف نظر آ کر ہوس پرستوں کو دعوت نظارہ

* اصلاحی دوا خانہ، محمد علی روڈ، بمبئی۔

دیتے ہیں۔ آج عیاشی و بدکاری میں جو روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس میں اس بے پردگی و بے حیائی کا خاص حصہ ہے۔ سب سے پہلے فلموں نے اس بے پردگی و عریانیت کو ہوا دی۔ اب جو رہی سہی کسر باقی تھی وہ ٹیلی ویژن پوری کر رہا ہے۔ لڑکے لڑکیاں جب ہیرو اور ہیروئینوں کو عریاں دیکھتے ہیں تو ان کو بھی یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی انہیں کی طرح بن جائیں۔ باہر سے ہپیوں نے آکر اس لعنت کو اور زیادہ ہی بڑھا دیا ہے۔ اسی بے حیائی و بے پردگی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب چھوٹے بڑے شہروں میں خواتین کے فیشن ایبل کپڑے مرد سینے لگے ہیں اور ان کی دکانوں پر جوان بچیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ درزی کی انگلیاں ادھ ننگے نسوانی نشیب و فراز ناپنے میں مشغول ہیں۔ بچیوں کی عموماً فرمائش یہ ہوتی ہے کہ سلے ہوئے کپڑے بالکل چست ہوں اس لیے پیمائش کے وقت درزی کو جو مواقع حاصل ہو جاتے ہیں وہ بہت سے شرمناک واقعات و حادثات کا سبب بنتے ہیں۔ اس بے پردگی اور بے غیرتی نے کیا کیا گل کھلائے ہیں اور معاشرے کا بگاڑ کہاں تک پہنچ چکا ہے؟ آسانی سے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

دنیا کے ہر مذہب نے بے پردگی و بے حیائی کو برا کہا ہے۔ سارے دانشمند اس بات پر متفق ہیں کہ یہ صاف ستھرے معاشرے کو خراب و تباہ کر دیتی ہیں۔ قرآن مجید میں بھی معاشرے کو پاک و صاف رکھنے کے لیے عورتوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی سج دھج کو بھی ظاہر نہ کیا کریں (النور - ۳۱) گیتا میں ہے کہ خدا پردے میں ہے اور وہ پردے کو پسند کرتا ہے۔ مہاتما بدھ کا یہ قول مشہور ہے کہ "پردہ حسن و عفت کا محافظ ہے"۔ جس معاشرے میں معقول پردہ اور حیا و شرم کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور کھل کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی وہاں بے پردگی اور بد چلنی بھی نہیں پائی جاتی۔ اس کے برخلاف جہاں عریانیت و بے شرمی عام ہے وہاں لاکھوں کنواریاں شادی سے پہلے ہی حاملہ ہو جاتی ہیں۔ "امریکی ادارہ ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ" کی حالیہ رپورٹ کے مطابق تقریباً ہر سال قانونی و غیر قانونی طور پر دنیا بھر میں پانچ کروڑ حمل گرائے جاتے ہیں اور اس اسقاط کے دوران کم از کم بیس لاکھ خواتین موت کا شکار ہو جاتی ہیں اور تقریباً اسی لاکھ عورتیں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہتی ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ بے پردگی و بے شرمی کہاں جا کر رکے گی اور اس کا کیا انجام ہوگا؟

نقصانات: بے پردگی و بے شرمی کی وجہ سے عموماً جو نقصانات ہوا کرتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- نمائش کا شوق اور فیشن پرستی بڑھ جاتی ہے۔
۲- بناؤ سنگھار اور طرح طرح کے فیشن اپنانے میں فضول خرچی راہ پاتی ہے۔
۳- فضول خرچی کے باعث مالی حالت بگڑ جاتی ہے اور گھر میں پریشانی و بدحالی کا بسیرا ہو جاتا ہے۔
۴- بن ٹھن کر بازار میں نکلنے سے بوالہوسوں کی ہوس پرستی کو موقع ملتا ہے۔
۵- خاندانی اور عائلی نظام میں بگاڑ اور طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔
۶- عیاشی و زناکاری کے مواقع فراہم کرتی ہے۔

۷۔ حمل روکنے کی تدابیر کے بہانے نسل کشی کی جاتی ہے۔

بے پردگی و بے شرمی کا علاج اُسی وقت ممکن ہے جب مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا بھرپور احساس کریں اور اپنے فرائض کے ادا کرنے کی پوری کوشش کریں۔ قدرت کی طرف سے مرد اور عورت کی حدیں مقرر ہیں اور دونوں کی ذمہ داریاں بانٹ دی گئی ہیں۔ گھر سے باہر کے معاملات مردوں کے ذمہ اور اندرونی معاملات عورتوں کے سپرد ہیں اور انھیں ذمہ داریوں کے مطابق دونوں کو الگ الگ صلاحیتیں بھی دی گئی ہیں۔ زندگی کی دوڑ دھوپ، انتھک محنت، مقابلہ آرائی اور پنجہ آزمائی کے لیے مردوں کو قوت بازو، مضبوط اعضا، عزم و ہمت اور غور و فکر کی بہترین صلاحیتیں بخشی گئی ہیں۔ امورِ خانہ داری کو سنبھالنے، رفیقِ حیات کو رجھانے، تقرب کرنے اور بچوں کی دیکھ بھال و پرورش کے لیے عورتوں کو سلیقہ، کشش، محبت، تحمل اور صبر و برداشت کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی گئیں۔ دونوں میں کسی کی اہمیت کم نہیں ہے لیکن ایک کا کام دوسرا بہتر ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جس گھر میں عورتیں گھر کی ذمہ داریوں سے الگ تھلگ ہو کر دفتروں اور بینکوں میں اپنا وقت صرف کرتی ہیں۔ اس گھر کا نہ تو نظام درست رہتا ہے نہ بچوں کی صحیح پرورش ہو پاتی ہے۔ احتیاط اور پردہ عورت کے لیے نہ تو بوجھ ہے نہ معصیت، بلکہ وہ ایک فطری تقاضا ہے اور ایک لازمی ضرورت۔

معمولی پیسوں کو جیب میں یوں ہی رکھ چھوڑا جاتا ہے اور اگر کبھی وہ ضائع بھی ہو جائیں تو ان کی کوئی فکر نہیں کی جاتی لیکن سونے اور جواہرات کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے مضبوط سے مضبوط تجوری اور محفوظ سے محفوظ جگہ کی تلاش کی جاتی ہے پھر خدا کے اس حسین و جمیل شاہکار کو جو سونے اور جواہرات سے کہیں زیادہ قیمتی ہے حفاظت سے رکھنے کی بات کہی جاتی ہے تو کچھ حلقوں سے انتہائی ناگواری و ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے حالانکہ خفگی و ناراضگی کے مستحق تو وہ لوگ ہیں جو اُسے بازار کا مال سمجھ کر اس کی کھلی ناقدری کرتے ہیں۔ یہ حقیقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب تک مرد کو اپنی ذمہ داریوں کا اور عورت کو اپنی قدر و قیمت کا صحیح احساس نہ ہوگا، بے پردگی و بے حیائی سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔

"ہمارے یہ نئے مدرسے نوجوانوں کی
خود مختار آبادیاں ہوں گے، جن میں نئی نسل اپنی
جماعتی زندگی کی تشکیل کا عملی تجربہ حاصل کرے
گی اور ایک آزاد قوم کے نوجوان آزادی کو
قائم رکھنے اور برتنے اور ترقی دینے کے لیے
تیار ہوں گے۔"

ذاکر حسین خاں

خوف کا بھوت

سلمیٰ تمنائی *

کیا آپ اپنی پرچھائیوں سے ڈرتے ہیں؟ گھپ اندھیرے میں آپ کے عزیز دوست محترم شیطان، بھاری بھرکم جن اور مسٹر بھوت کے نظر آنے والی بات کرتے ہیں؟ اندھیرے میں جب کہ سڑک پر نہ آدم نہ آدم زاد، آپ مرزا علی حسین المعروف بہ تان سین بنے اپنی بے سُری آواز کو بے داد دی سمجھ کر فلمی سُروں میں الاپتے ہوئے تیز تیز قدم بڑھاتے ہیں؟ پھر گھر والوں کے بیارے کو قریب دیکھ بگٹٹ بھاگ کر زور زور سے پھونکنے لگتے ہیں؟ اور گھر میں قدم رکھ، بچھونے پر دراز ہو، اپنے آپ کو کالی کملی میں چھپا پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں؟ ہاں تو پھر آپ کو خوف کے ناگ نے بچپن میں ڈس لیا ہے اور اس ڈسنے میں مدد آپ کے پیارے والدین نے کی ہے اور آپ بھی اپنے بچوں کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر واٹسن کی تجربہ کار زبان نے کہا کہ بچے کی پیدائش سے تین برس تک والدین اپنی تربیت سے بچے کو ایک متوازن شخصیت والے نڈر بالغ کی صورت میں ڈھال سکتے ہیں یا اس کی شخصیت کی بوتل میں وہم عقدہ اور بزدلی کی شراب بھر کر خوف کے شیطان کے حوالے کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جان جاہی نے کہا کہ حیاتی زندگی میں پلنے اور پھلنے پھولنے والے دو قوت بچوں کو بچپن میں نہ صرف نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ جوانی و بالغ زندگی میں بھی خوشی، توازن، مسابقت و کامیابی کو بھی آنکھوں سے اوجھل اور دل و دماغ سے دور کر دیتے ہیں۔

ابتدائی تربیت میں آپ والدین ہوں یا معلم آپ کو لوہار بننا پڑتا ہے۔ لوہار لوہے کو گرم کر کے اپنی من پسند چیزیں گھڑ اور بنا لیتا ہے۔ ادھر لوہا ٹھنڈا ہوا کہ بات بگڑی۔ من چاہی شئے بن نہ سکی۔

آپ بچے کو گرم و نرم لوہا سمجھیے، من پسند صورت رنگ اور روپ دیجیے لیکن لوہار بننے سے کہیں زیادہ آپ کو محنت و احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اوائلِ عمر میں تربیت کے سانچے میں وہ گرم و نرم لوہا ڈھل نہ گیا تو ٹھنڈا لوہا کوئی من چاہا روپ اختیار نہ کر سکے گا خوف کی پرچھائیاں ابتدائی تربیت ہی میں مٹ سکتی ہیں۔

ہم سب حادثات اور موت سے بے حد خوف کھاتے ہیں۔ بلند و بالا عمارتوں، جیسے قطب مینار اور مسجد اعلیٰ سری رنگ پٹن کے مینار سے نیچے نظر دوڑاتے

---

* دودھ پیر مکان، عیدگاہ، میسور،

ہوئے ہمارا بچّا پانی اور سر ٹکرا جاتا ہے۔ اندھیرا ہمارے لیے شیطان بھوت اور جن سے کم نہیں۔ بس دم ناک میں آٹھہرتا ہے۔ سانپ بچھو سے دم نکلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بہادر ایسے ہیں جو بے ضرر چپ چپ کرنے والی چھپکلی، الٹی لٹکنے والی چمگادڑ، زرگھر کی مرغی وال برابر وغیرہ سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ ہمارے دلوں کو بجری بری اور فضائی حادثوں سے کیلے کے نو خیز پتوں کی طرح لرزا اور تھرتھرا رکھا ہے۔ آگ، بجلی، پوری ڈالکے سے بھی دل لرزتے ہیں۔ آخر یہ خوف، یہ ڈر کیوں؟

ڈاکٹر واٹسن کا کہنا ہے کہ چھوٹی عمر میں ناقص تربیت اور ناساز گار ماحول کی یہ کرامات ہیں۔ ننھا منا دودھ پیتا بچّہ ابتدا میں صرف کرخت آوازوں سے سہم جاتا ہے ایک دن مسٹر واٹسن نے ایک نو ماہ کے ننھے منے بچے کو بغور دیکھا جو بجلے مینڈک، ننھے پرشاد کا ناچ نگلنے والی مچھلی، غٹرغوں کرنے والے شریر نامدار حضرت کبوتر، گدھے کے کان رکھنے والے خرگوش سے بے خوف و خطر کھیلتا رہا اور ان سے بے حد مانوس اور بے تکلف ہو گیا۔ اب تجربے نے یہ سوچ کر کہ بچّہ اونچی آوازوں سے ڈرتا تو ہے ہی، یہ تجربہ کیا کہ ایک آلہ نصب کر کے اس سے کرخت آواز اس وقت نکالی جب کہ بچّا ان بے ضرر جانوروں سے کھیل رہا تھا۔ اب اس آواز نے اسے سہما دیا اور اب اس کے بے تکلف جانور دوست، دشمن نظر آنے لگے۔ یہ اُن سے بھرپور خوف کھانے لگا۔

جب واٹسن نے اپنے تجربوں میں یہ بھی دیکھا کہ خرگوش کی سی کھال والے جانوروں کے ساتھ ساتھ ہر کھال اور کھال دار اشیا سے بھی بچّے ڈرتے ہیں، دودھ کے جلے چھاچھ پھونک کے پیتے ہیں تو فرمایا۔ بھائی یہ سب کچھ بچپن کی ناقص تربیت کا نتیجہ ہے۔ اندھیرے میں بچّہ بھیانک اور کرخت آواز پر چونکتا ہے۔

آواز اور اندھیرے کو ایک سمجھتا ہے نتیجے میں اندھیرا اس کے لیے بھوت پریت سے کم نہیں ہوتا۔

محترم والدین کے قدموں میں جنت اور پیارے سب کچھ سہی مگر ان کے غلط رویے سے سوچنا پڑتا ہے کہ بھولے بوجھ نہ سہی، ان جانے میں اپنے بچوں کے دشمن ہیں۔ "اسکی پیارا لاڈلا نظر نہیں آتا۔ کہیں شوہر محترم کے سر پہ تو سوار نہیں کرا دیا؟" "وہ اسے رہ سکی! وہ میرے ہی سر چڑھ موٹنگ دلنے لگتا ہے۔ اُس لیے اسکول بھیج دیا ہے۔

"اچھا تو لاڈلے کی شرارت سے تنگ آکر شریر کو استاد سے چپکا دیا؟ میں نے بھی اسی نسخے کو آزمایا ہے۔"

شرارت سے بچنے کا مجرب نسخہ آپ نے سن لیا اب بے چارے استاد کے لیے دعائے مغفرت کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے۔

اس نسخۂ کیمیا کے ساتھ ایک اور نسخہ بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی اپنی کوکھ سے جنم دینے والے پیارے والدین بار بار ٹوکتے ہیں کہ ایسا مت کرو، ویسا مت کرو۔ خبردار! ہوشیار! ڈائن چڑیل، بھوت پریت پکڑ لے جائیں گے۔

اب نانی اماں کی زبان کیوں چپ رہتی۔ فرمایا رات کو پیڑ کے پاس جانا اچھا نہیں۔

آخر کیوں نانی اماں؟ نانی سے حیرت سے پوچھا۔

"چپ رہ" نانی اماں نے ڈانٹا "میں کیا جانوں بڑوں نے کہا اور بغیر چوں و چرا کے ہم نے مانا اور عمل کیا۔ شاید بلاؤں کا بسیرا ہوتا ہوگا۔

اسی طرح انجانے طور پر خوف اُن کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگتا ہے۔

بچہ نہر کی طرف بڑھتا ہے۔ بہتا پانی، اٹھتی لہریں، تیرتی اچھلتی مچھلیاں اسے نہر کی طرف کھینچتی ہیں۔ ماں نے دیکھ لیا ۔ آپ کی نظر پڑ گئی۔ بس ایک چیخ فضا میں گونجی۔ نا نا نا! ایک ہزار ایک سو ایک "نا"۔ بچہ اس سے گھبرانے، کترانے اور دور بھاگنے لگا۔ خوف اسے بجھائے لیے جاتا ہے۔ دریا اور سمندر سے بھی غیر معمولی خوف کھاتا ہے۔ پانی یا تو اسے کاٹ کھائے گا۔ کشتی اس کی نظر میں اب ڈوبی کہ تب۔ بے چارہ تمام عمر کنارے ہی بیٹھا رہا اور ساتھی غوطہ لگا موتی پاتے اور تیر کر دریا پار کرتے گئے۔

بچہ ہر خوب صورت اور چمکتی چیز کو چھونا چاہتا ہے کوئی ایسی چیز اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے جس کے ٹوٹنے یا خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو والدین فوراً ایک بھرپور چیخ کا گولہ داغتے ہیں اور وہ شے چھین کر کہیں چھپا دیتے ہیں بچے کی نظر تیز نکلی اور اس کا ہاتھ وہاں تک بھی پہنچ ہی گیا تو محترم والدین نے ایک اچھی خاصی چپت رسید کر دی اس غیر متوقع سزا یا چپت نے بچے کے دماغ کو ہلا کے رکھ دیا۔ اب وہ سزا کے ساتھ اس چیز سے بھی گھبرانے لگا جس کی وجہ سے اُسے مار کھانی پڑی تھی۔

ماں باپ اپنے کارناموں پر خوش ہیں کہ انہیں سکون مل گیا مگر لاڈلے کی جذباتی زندگی بگڑ کر رہ گئی اس قسم کی ننھی منی باتوں سے خوف کا قبضہ مضبوط ہوتا رہتا ہے۔

بجلی چمکی۔ بچے کے ہونٹ تبسم سے آشنا ہوئے لیکن بجلی کڑکی اور سانس خطا ہوئے۔ آندھی طوفان، بادل کی گرج، اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ آخر اس سے نجات کس طرح دلائی جائے۔

پیارے والدین کو چاہیے کہ ان بچوں کو کرخت اور ڈراؤنی آوازوں سے دور رکھا جائے۔ ان کے کھیل اور ان کی سونے کی جگہوں کے قریب ایسی آوازوں کو پھٹکنے نہ دیا جائے۔ آندھی طوفان سے پہلے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہوں تاکہ ہوا ان سے ٹکرا کر شور نہ پیدا کرے اور یہی شور، ڈر اور خوف کا باعث ہو۔ آندھی طوفان کو بھی ایک بلا سمجھنے پر مجبور نہ کر دے۔

معصوم بچے نندیا رانی کی گود میں کسی پری کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ اتنے میں آس پاس کے شور و غل سے ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس سے محفوظ رکھا جائے

"عزیز بیٹے ذرا دس نئے پیسوں کی پیاز لے آنا" ماں نے پیار سے کہا۔

"ڈر لگتا ہے امی اندھیرا ہے" بچے نے جواب دیا۔

"اتنے بڑے ہو گئے۔ شرم نہیں آتی، ایسا کہتے ہوئے ماں نے ڈانٹا۔"

ماں یا باپ کی ڈانٹ یا اصرار اور بچے کا ڈر کی وجہ سے انکار پر انکار، انکار ہی انکار اور اس انکار پر تڑا تڑ تھپڑ جڑ دیے ہمارے والدین نے۔

ایسی غلط باتوں سے پرہیز ضروری ہے، ورنہ خوف کے ساتھ اس مار کی دہشت، اس کے ننھے منے دماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی بلوغت کے ساتھ خوف کا بلونگڑا موٹا تازہ بلا یا بلی سے تبدیل ہو جائے گا جن، بھوت چڑیل، ڈائن وغیرہ کی دھمکیوں سے اسے دور رکھنا چاہیے ورنہ بچہ خوف و دہشت کے علاوہ توہمانہ ذہنیت کا شکار بھی بن جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بے جا خوف کا علاج کیوں کر ہو؟

کیا آپ زبان کی تلخی ترشی کے علاوہ اس کی شیرینی کے بھی قائل ہیں؟ اگر ہیں تو اس کا بھرپور استعمال بھی ضروری ہے۔ صبر نام کی چڑیا سے آپ اگر واقف ہیں تو اسے ضرور اپنے دل و دماغ کے پنجرے میں بٹھا لیجیے

[illegible] ماں باپ ہیں اور ہم، دکھ زیادہ ہیں
آپ بہو ہیں تو ساس ابھی نہیں ملی۔ مگر جب ساس بنی ہیں تو یہ شکوہ نوکِ زبان پر نہ ہونا چاہیے کہ بہو ابھی نہیں ملتی جو طعن و طنز اندر بنی کی باتیں ساس سے بہو کی صورت میں سُنی تھیں لاشعور میں بسائی تھیں، وہی آپ نے ساس بن کر اپنی بہو پر آزمائیں۔ یہی حال والدین اور بچے کا بھی ہے۔

دانشور نے اس خوف کو دور کرنے کا ایک طریقہ بتلایا ہے، ہم بھی اس پر غور کریں۔

بلی سے بچہ ڈرتا ہے اور یہ خوف اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ میٹھا میٹھا جب جب کے شغل بجا و بے جا میں مشغول ہو تو اس کے کچھ فاصلے پر پالتو بلی کو رسی سے باندھ دیا جائے اور ہر دن بچے کی نظر بچا کر بلی کو قریب، قریب تر اور قریب ترین لایا جائے۔ اگر خدانخواستہ خوف کھانے کے موڈ میں ہو تو بلی کو دور لے جائیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ صاحبزادے کھانے کی لذتوں میں کھوئے ہوئے ہیں اور ان کے نظر ان کے ننھے منے دل و دماغ سے کہتی ہے کہ محترم دشمن رسی میں جکڑے ہوئے ہیں — شیر بندھا ہو تو ہم بھی شیر ہیں۔ خوف کا کوئی سوال نہیں اس طرح خوف، ہمالہ کی بڑی چوٹی سے چھوٹی چوٹی اور آخر میں گھٹتا ہوا صفر بن جاتا ہے۔ اب شیر کی خالہ کو رسی سے آزاد کر دیا جائے، اس کے سر اور جسم پر پیار سے ہاتھ پھیریں، سہلائیں۔ اب بچہ بلی سے دوستی بڑھا کر اس سے کھیلے گا اور آگے چل کر اس قابل ہوگا کہ گھڑ سوار بن جائے۔

اس طرح بتدریج تربیت سے خوف دور کیا جاسکتا ہے۔ ناقص نگہداشت اور غلط تربیت سے بیماری پیدا کر کے علاج کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ بچپن ہی میں اپنانے کے مواقع پیدا نہ کریں۔

بچپن میں خوف، دیوانگی کی صورت جوانی میں اختیار کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر رینڈ کے ایک مریض کو تنگ گلیوں سے ڈر لگتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں یہ کسی کبابیے کی دکان سے لوٹ رہا تھا جب وہ محلے کی تنگ و تاریک گلی سے گزر رہا تھا کہ کتا اس کا راستہ روک کے زور زور سے بھونکنے لگا۔ اب اس کا خوف سے برا حال تھا۔ بڑی مشکل سے کتے سے پیچھا چھڑا کر گھر پہنچا۔ کتے کا خوف تنگ گلی سے چپک گیا۔ اب ہر تنگ مقام سے وہ ڈرنے لگا۔

"جناب!" ایک مریض اپنی گردن بار بار ایک طرف موڑتے ہوئے مخاطب ہوا: "میں اس عادت سے چھٹکارا نہیں پا رہا۔"

نفسیاتی معالج نے بچپن کے واقعات پوچھے تو مریض نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا۔

وہ جب چھوٹا تھا تو بازار کے راستے میں ایک میوہ فروش نظر آیا جس کے پاس مونگ پھلی کا ڈھیر تھا۔ اس میں آتے جاتے ایک مٹھی بھر مونگ پھلی اٹھا کر چل دیتا تھا۔ ایک دن وہ یہ حرکت کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ میوہ فروش نے اس کی گردن بری طرح دبوچ لی یہ اس کے صدمے سے بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس کی گردن پکڑ رہا ہے۔

نفسیاتی معالج نے اس واقعہ کی یاد دلا کر اس کی تکلیف دور کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ اکثر ذہنی الجھنوں اور بیماریوں کے پیچھے اس کا بچپن ہوتا ہے اور اس بچپن میں خوفناک حادثات سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھے ہیں۔ وقت وقت پر پھن کھولے ڈستے ہیں

بظاہر ان کی آنکھوں پر پھیلی ہوتی ہے۔

ماں باپ سپیروں سے ہٹ کر ان کے سر کچل دیتے تو سانپ ہرگز ساری عمر نہ ڈستے۔ لاشعور ان کی بانی ہے۔ وہیں بیٹھے ہماری جذباتی زندگی میں زہر بھر دیتے ہیں۔

کیا بچے کو بالکل ہی نڈر بنا دیا جائے؟

یقیناً نہیں۔ کچھ خوف ایسے ہیں جن کا بچوں میں ہونا ضروری ہے۔

مسکراتے لبوں، ہنستی آنکھوں اور میٹھی زبان میں بچوں سے کہا جائے کہ بچو! یہ بجلی کے تار ہیں جن کے چھونے سے آدمی مر جاتا ہے۔ یہ سانپ ہے جس کے ڈسنے پر آدمی اث کو بیمار ہو جاتا ہے۔ یہ گندگی ہے، جس سے صحت خراب ہوتی ہے۔

شیریں زبان اور محبت سے بگڑے کام بھی بن جاتے ہیں۔ ہاتھی بھی رام ہوتا ہے۔ بچہ تو آخر اشرف المخلوقات کا معصوم نمائندہ ہے۔

جو تعلیم بچے کو اصلی حقیقت کے قریب لائے ماحول سے روشناس کرے، خود اعتمادی اور یقین پیدا کرے۔ وہ تذبذب در خوف سے بھی نجات دے سکتی ہے۔ آج ایسی تعلیم اور بچے کی صحیح تربیت اسے سارے خطرات سے دور کر دیتی ہے۔ خوف اور وہم پرستی کی دنیا میں برف کی طرح ٹوٹ کر پگھل جاتی ہیں۔

خاص اسٹنڈرڈ

یہ امر بلاشبہ غور طلب ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو انگریزی تعلیم پاتے ہیں ایک خاص اسٹنڈرڈ تک پہنچنے کے بعد آئندہ زندگی کے واسطے کیا بہتر ہوگا..... گورنمنٹ کے کے پاس اس قدر نوکریاں نہیں ہیں کہ ان سب لوگوں کو دے سکے جو انگریزی تعلیم پاتے ہیں۔

سرسید ؒ

پرائمری تعلیم

مظفر حسین غزالی

آزادی سے پہلے عام طور پر بچوں کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوتی تھی، بچوں کو پڑھانے کے لیے مولوی صاحب یا منشی جی کو مقرر کیا جاتا تھا۔ پہلے بچوں کو قرآن پڑھایا جاتا پھر عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھا دی جاتیں اس کے بعد ہی اسکول یا مدرسہ میں داخل کیا جاتا۔ یہ منزل بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس منزل پر جو لسانی عادتیں بچوں میں پیدا کی جائیں گی وہ بہت راسخ ہوں گی۔ شخصیت کی نشو و نما یعنی جذبات، خیالات، احساسات اور رجحانات کے معاملات میں بھی یہ منزل بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ شاید انہیں نزاکتوں کے پیش نظر بچوں کی ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل کرائی جاتی تھی۔ بچے گھر کے ماحول میں بہت سی باتیں آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ اگر انھیں گھر پر اچھا ماحول فراہم کیا جائے تو بولنے میں انھیں آواز پر قدرت ہو جاتی ہے۔ الفاظ کی ادائیگی کی صلاحیت تلفظ کے ساتھ بولنے کی مشق، آہنگ اور لہجے پر قدرت بھی ہو جاتی ہے لیکن زمانۂ قدیم میں تعلیم کا یہ نظم عام لوگ نہیں کر پاتے تھے اور نہ اُن میں ایسا کرنے کی معاشی سماجی اعتبار سے قوت ہی تھی۔ معاشی اعتبار سے کمزور

وہ لوگ جن میں تعلیم کے تئیں بیداری ہوتی تھی، اپنے بچوں کو مسجد میں چلنے والے مکتب میں بھیجتے تھے۔ ان مکتبوں میں رٹائی اور پٹائی پر زور ہوتا تھا جس کے نتیجے میں بچوں کی قابل ذکر تعداد پرائمری منزل کے اختتام سے پہلے یا اختتام پر تعلیم سے دست کش ہو جاتی تھی۔

اس کی ایک وجہ جہاں معاشی بدحالی تھی وہیں تعلیمی بیداری اور تعلیم کے مقصد سے آگہی کی بھی کمی تھی۔ اسی عدم توجہی کی وجہ سے زیادہ تر بچے دس بارہ سال کی عمر میں اپنی ابتدائی تعلیم شروع کرتے تھے۔ نتیجتاً ابتدائی تعلیم مکمل کرتے کرتے ان کی عمر سن بلوغ کو پہنچ جاتی تھی۔ اس عمر میں ان کی معاشی بہتری کی فکر والدین کو ہونا لازمی تھی۔ اس لیے بچوں کو پڑھائی سے ہٹا کر کسی کام میں لگایا جاتا تھا۔ زمین دارانہ نظام بھی اس راستہ میں حائل تھا۔ زمین دار، تعلق دار اپنے علاقے کے مائی باپ ہوتے تھے۔ وہ یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ عام رعایا کا بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ کیونکہ عام طور پر زمین دار اور اُن کے بچے معمولی پڑھے لکھے ہوتے تھے گاؤں والوں کو اپنا غلام تصور کرتے تھے۔ اگر گاؤں کا

یا ان کے علاقے کا کوئی بچہ مڈل تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو زمین دار صاحب اسے اپنے یہاں نوکر رکھ لیتے تاکہ وہ ان کے چنگل سے باہر نہ جا سکے۔

اس اعتبار سے قدیم پرائمری تعلیم کے نظام کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک نجی تعلیم کا نظم اور دوسرا مکتب کا عام تعلیم کا نظم۔ آزادی کے بعد حکومت نے پرائمری تعلیم کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کو محسوس کیا۔ تعلیم کے میدان میں عوام کے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے دستور ہند کی دفعہ ۴۵ میں تحریر کیا گیا۔

" مملکت اس آئین کی تاریخ نفاذ سے
دس سال کی مدت کے اندر سب بچوں کو
چودہ سال کی عمر پوری کرنے تک مفت اور
لازمی تعلیم دینے کی توضیح کرنے کی کوشش
کرے گی"

دستور میں اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے چلانے ان کا بہتر نظم کرنے کا حق دیا گیا۔ تاکہ اقلیتیں اپنی مرضی کے مطابق اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکیں۔ دستور میں یہ حق اقلیتوں کو خواندہ بنانے نیز انھیں تعلیم کے لیے بیدار کرنے کے لیے ہی دیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل دستور کی دفعہ ۳۰ (۱-۲) میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

" تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی
بنا پر ہوں یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی
ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے
کا حق ہوگا۔"

اقلیتی اداروں کو مالی مدد دینے کے بارے میں دستور میں لکھا گیا ہے:

" مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے
میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا
پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت
کے زیر انتظام ہے خواہ وہ اقلیت
مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی۔"

تعلیم کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہندوستان کے ہر پانچ سالہ منصوبے میں اسے جگہ دی گئی ہے اور تمام سیاسی پارٹیوں نے اپنے منشور educational manifesto کے کام کو شامل کیا ہے۔ یہاں موضوع بحث یہ نہیں ہے کہ سرکاری امداد دینے میں دستور کی صریح خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ اقلیتوں کو اپنے اداروں میں علم نصاب پڑھانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کو اپنے اداروں میں کیے جانے والے تمام کاموں کے لیے سرکاری افسروں کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ امداد حاصل کرنے کے لیے رشوت دینی ہوتی ہے۔ دوسرے بجٹ منظور ہی نہیں ہوتے۔ اس کی کہانی اقلیتوں کے اداروں کی زبوں حالی سے سنی جا سکتی ہے۔ یہاں اس بات پر بھی بحث نہیں کرنی چاہیے ہمارے سالانہ بجٹ میں تعلیم کا کتنے فی صد کوٹہ ہوتا ہے اور یہاں یہ بھی موضوع نہیں ہے کہ سیاسی پارٹیوں نے اپنے دعوے کس حد تک پورے کیے اور اپنے منشور کے مطابق کس حد تک عمل کیا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے لیے الگ مقالے کی ضرورت ہے۔ یہاں تو صرف پرائمری تعلیم کی اہمیت، ضرورت، مسائل اور وسائل کے تعلق سے گفتگو کرنی ہے۔

بیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان کا تعلیمی نظام مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ شہری آبادی کے متوسط طبقہ کے ارد گرد گھومتا ہے۔ اس طبقہ نے پرائمری تعلیم کو سب کے لیے ضروری کرنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ تعلیم سے اقتصادی مساوات لائی جا سکے شروع میں متوسط طبقے کے مقاصد انتظامیہ اور دانشوران منش... تک محدود تھے لیکن صنعتی ترقی

سے سر تھا اسکولی تعلیم میں صنعتی و پیشہ ورانہ تعلیم شامل کیے جانے کی بات کی جانے لگی۔ تاکہ وہ طلبا کو پیشہ ورانہ زندگی کے لیے تیار کر سکے۔ درمیانی طبقے نے کیونکہ غریبوں اور امیروں کے درمیان ایک پل کا کام کیا ہے۔ اس لیے ممکن ہے اقتصادی پس منظر میں پیشہ ورانہ تعلیم کی بات ٹھیک ہو۔ اس وقت ایک کروڑ ساٹھ لاکھ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد روزگار دفاتر میں مندرج ہیں۔ اگر انھیں پیشہ ورانہ تعلیم دی گئی ہوتی تو شاید یہ فہرست اتنی طویل نہ ہوتی لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ پرائمری تعلیم کیسی ہونی چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ اس میں پیشہ ورانہ تعلیم ہو یا نہ ہو۔ پرائمری تعلیم کے ذیل میں دو باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ اول یہ کہ بنیادی تعلیم سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہونی چاہیے۔ دوم یہ کہ آئندہ تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کے حصول میں معاون بھی ہو۔

۱۹۵۱ء ـــــ ۱۹۸۷ء کے درمیان پرائمری سطح پر طلبہ کی تعداد میں ۴٫۴ فی صد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہوا ہے لیکن بچوں کی فی صد تعداد جو ۱۹۵۱ء میں ۴۳ فی صد تھی، ۱۹۸۷ء میں ۹۶ فی صد ہو گئی۔ جب کہ ایک خاص عمر میں ان کے اضافے کی شرح صرف ۲٫۳ فی صد رہی ہے۔ وہ طلبا جو ۶ سے ۱۱ سال کی عمر کے ہوتے ہیں اور پرائمری درجات میں داخلہ لیتے ہیں پرائمری تعلیم کے چار سال بھی پورے نہیں کر پاتے۔ اس عمر کے بچوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جنھیں اسکول میں ہونا چاہیے وہ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر مزدوری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت تعلیم محض اتفاقی اور منتشر عمل کا نام نہیں ہے اور نہ ہی محض اطلاع و آگاہی کی منتقلی کا ذریعہ ہے بلکہ ایک فعال تنظیم اور مربوط عمل کا نام ہے۔ جس میں فکر، نظریۂ حیات، طرز زندگی، استعداد اور فنون کے پیہم فروغ کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی لیے گروپوں سے متعلق تعلیمی ادارے، کانونٹ اور چرچ مشن اسکول قایم ہوئے۔ ان میں تعلیم پانے والے بچوں اور نوجوانوں میں ایک بڑی تعداد اُن کی ہے جن کے سرپرست سیاسی تہذیبی اور معاشی قوتوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر کے خود بھی شریک اقتدار بننے کے متمنی ہیں۔ یا ایسے لوگوں کے بچے ہیں جو اقتدار میں شریک ہیں اور اُن کی خواہش ہے کہ ان کے بچے بھی آئندہ اقتدار میں شریک ہوں۔

اس طرح تعلیم دو حصوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ ایک وہ ادارے جو سرکار نے عام لوگوں کے لیے قایم کیے یا قومیائے گئے ہیں۔ دوسرے نجی تعلیمی ادارے (PUBLIC SCHOOLS)۔ نجی یا پرائیوٹ ادارے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انگریزی میڈیم کا بورڈ لگا کر صرف فیس وصول کرتے ہیں۔ ان کا اسٹاف زیادہ تر خواتین پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہندوستانی سماج میں خواتین روزگار فیشن کے طور پر اپناتی ہیں یا کسی مشغلے میں مصروفیت کی وجہ سے۔ بہت کم ایسی خواتین ہیں جو ضرورتاً روزگار میں شریک ہوتی ہوں۔ پرائیویٹ اسکولوں کے مالکان کا خصوصی ہدف کم پڑھی لکھی غیر تربیت یافتہ ہی خواتین ہوتی ہیں۔ انھیں سے کام چلایا جاتا ہے۔ اس طرح بھاری فیسوں کے باوجود بچوں کو غیر معیاری تعلیم نصیب ہوتی ہے ان اسکولوں کی تقاریب اشتہاری و مخلوط ہوتی ہیں۔ تعلیم کا نظام بھی مخلوط ہوتا ہے۔ تقریبات کو اشتہاری بنانے کی وجہ سے انہیں رنگا رنگ بنایا جاتا ہے۔

دوسرے خالص انگریزی ذریعہ تعلیم کے ادارے ہیں۔ ان کا معیار بلند اور تعلیم مخلوط ہوتی ہے۔ ڈریس نیم عریانیت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ان اسکولوں میں بچے تعلیم کے ساتھ اور بھی بہت سی نظریاتی چیزیں حاصل

کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ عیسائیت کا دلدادہ اور اپنے مذہب، تہذیب، تمدن سے دور ہو جاتا ہے۔ اسے اپنا مذہب غیر فطری لگنے لگتا ہے جس کی وجہ سے وہ الحاد کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی تعلیم نجی شعبہ میں ہوگی وہاں آبادی کے مختلف معاشی طبقات کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف طرح کے ادارے وجود میں آجائیں گے۔ سرکاری اسکولوں میں عام طور پر غریب اور متوسط گھرانوں کے طلبا داخلہ لیں گے۔ معاشرے کا دولت مند اور اعلیٰ عہدوں پر فائز طبقہ نفسیاتی طور پر اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے بچے ان تعلیمی اداروں میں علم حاصل کریں جہاں غریب اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بچے بھی زیر تعلیم ہوں۔ پھر حکومتی تعلیمی اداروں کی بہ نسبت نجی تعلیم اداروں میں ظاہری طور پر بچوں کی کردار سازی، اچھی عادات، صفائی اور نفاست کی طرف توجہ دی جاتی ہے کھیل کا میدان، معقول کھلونے، تربیت یافتہ (یا غیر تربیت یافتہ انگریزی بولنے والے) اساتذہ، یہ باتیں اکثر والدین کے لیے پرکشش ہوتی ہیں۔ اس کے لیے وہ زیادہ فیس ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے نتیجے میں طبقاتی اونچ نیچ کی جڑیں معاشرے میں مستحکم ہو رہی ہیں جو انسانی وجود کے لیے انتہائی مہلک ہیں۔

نام نہاد انگریزی میڈیم پرائیوٹ اسکولوں میں نصابی کتابوں کا معیار اس پر ناپا جاتا ہے کہ پبلشر نے کتنا کمیشن دیا ہے۔ کئی بار نامناسب کتابیں بھی لگائی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس سرکاری اسکولوں میں ایسی کتب پڑھائی جاتی ہیں جن میں ہندو دیو مالا کی کہانیاں ہندو کلچر کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں ہندو تہذیب کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ بچوں کو بزرگوں کے نام پر ایسے خیالی لوگوں کی کہانیاں پڑھائی جاتی ہیں جن کا دنیا میں وجود تھا بھی یا نہیں مشکوک ہے۔ پبلک اسکولوں میں عیسائی ذہن کی تبلیغ کرنے والی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ موجودہ کتابیں بچوں میں تجسس پیدا نہیں کرتیں، جس کی وجہ سے بچے میں خود سے پڑھنے اور سیکھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو پاتی۔ وہ کس طرح ایک اچھا انسان بن سکتا ہے۔ سماج میں لوگوں کی بھلائی کے لیے کس طرح معاونت کر سکتا ہے، ایک انسان کی حیثیت سے اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ایک ورکر کی حیثیت سے اسے کیا کرنا چاہیے۔ ایک شہری کا رشتہ اسے کیسا ہونا چاہیے۔ تعلیمی نظام میں ان چیزوں کی بہ نسبت کتابی علم پر زیادہ زور ہے۔ اسی وجہ سے بچے کی شخصیت کی نشوونما اس انداز سے نہیں ہو پاتی جس طرح ہونی چاہیے۔

درسی کتب میں بچوں کی نفسیات کے مطابق سفر کے طریقے، ایجادات، سائنسی معلومات، نیز اہم شخصیات کی زندگی کے حالات، آرٹ اینڈ کلچر نظم وغیرہ کو شامل کرنا بچے کی جبلی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔ نصابی سرگرمیں میں طلبا کی PASSIVITY توڑنے، جسمانی طور پر ACTIVE کرنے اور ذہنی طور حاضر رہنے کے لیے ان ذو رگیمز کی ضرورت ہے۔ مثلاً پی۔ ٹی ڈرامہ۔ تقریری مقابلہ، کوئز وغیرہ۔

وہ بچے جو پرائمری تعلیم مکمل نہیں کر پاتے ان کے پیچھے معاشی مسئلہ بھی ایک وجہ ہے لیکن جن کے ساتھ معاشی مسئلہ نہیں ہے ان کی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ کے اندر یہی راز کارفرما ہے۔ اول تو وہ کتابوں اور نصابی مشاغل سے اکتا جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے اسکول میں ان کا دل نہیں لگتا۔ پھر اساتذہ بھی پیچھے رہ جانے

والے طلبا تو پچھڑی جگہ کر ان پر توجہ نہیں دیتے جب کہ اگر ان بچوں کی پریشانی کو معلوم کیا جائے اور ان میں دلچسپی لی جائے تو وہ بہت آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اساتذہ کے نظر انداز کیے جانے والے بچے احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی پڑھائی سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ لیول بھی پڑھانے سے زیادہ وقت گزاری اور تنخواہ میں دلچسپی رکھتے ہیں، نہ یہ کہ بچوں کو کس طرح تعلیم دے کر آگے بڑھایا جائے۔ اساتذہ کی اسی بے توجہی کی وجہ سے سرکاری اسکولوں کا معیار گرتا جا رہا ہے نوبت یہ آگئی ہے کہ گورنمنٹ اسکول معیاری سے غیر معیاری قرار پا گئے ہیں اور پرائیوٹ اسکول غیر معیاری سے معیاری بن گئے ہیں۔

گورنمنٹ اسکولوں میں اکثر والدین اپنے بچوں کو بھیجنا گوارہ ہی نہیں کرتے اور جو بھیجتے ہیں انھیں اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں پریشانی لاحق ہوتی ہے غریب لوگ تو اپنے بچوں کو اسکول کی بے راہ روی سے پریشان ہو کر واپس بلا کر کسی کام میں لگا دیتے ہیں کیونکہ یہاں بچے کا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ کام سے وقت کا استعمال بھی ہوتا ہے اور اپنے گھر کی آسودگی میں معاونت بھی کرتا ہے۔ بعض لوگ غیر مذہبی تعلیم اپنے بچوں کو دلوانا نہیں چاہتے اور بعض مخلوط تعلیم کو پسند نہیں کرتے۔ متوسط طبقے کے لوگ اس سستی کی یہ سزا بھگتے ہیں کہ انھیں کوچنگ سینٹروں اور ٹیوشن کی مددوں میں فیسوں سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ ان اسکولوں کے اساتذہ کو ٹیوشن کی ایسی چاٹ منہ کو لگی ہے کہ وہ اسکول میں پڑھانے سے زیادہ ٹیوشن پڑھانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کیونکہ غریب لوگ اپنے بچوں کے لیے ٹیوشن کا انتظام نہیں کر پاتے اس لیے متوسط طبقے کے بچوں کے مقابلے ان کے بچے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس نظام سے ایک طرف بچے اپنی تعلیم مکمل نہیں کر پاتے، دوسری طرف شروع ہی سے وہ تعلیم کے حصول سے مایوس ہو جاتے ہیں۔

پرائمری اسکولوں میں عام طور پر لائبریری کا رواج نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے بھی بچوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

پرائمری تعلیم کو بہتر بنانے نیز طبقاتی اونچ نیچ کو دور کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر غور کرنا چاہیے:

۱۔ تحصیل اور ضلعی سطح پر تعلیمی افسران کے علاوہ ماہرین تعلیم، اساتذہ اور طلبا کا ''ہماری پرائمری تعلیم کیسی ہو'' کے موضوع پر مذاکرہ کرایا جائے۔ اس میں اس بات پر بھی تبادلہ خیال ہونا چاہیے کہ وسائل کا صحیح استعمال کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تعلیم کے میدان میں وسائل کا استعمال سے زیادہ اصراف ہو رہا ہے۔

۲۔ پرائیوٹ اداروں کے اعداد و شمار جمع کیے جائیں اور اس تعلیم کے معاشرتی اور نفسیاتی اثرات کا جائزہ لیا جائے اس کی روشنی میں سرکاری اسکولوں کی ترتیب نو کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ اسکولوں میں بچوں کی صحت، صفائی اور طہارت کی طرف دھیان دینے کے علاوہ نصاب تعلیم پر بھی غور کیا جائے کہ وہ بچوں کی نفسیات کے مطابق ہے یا نہیں اور کس حد تک وہ بچوں کی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ نیز اس پر کسی

خاص مذہب کی چھاپ نہ ہو۔

۴۔ جائزہ و احتساب کے نظام کو کڑا کیا جائے نیز پرائمری تعلیم پر ایک رسالہ بھی جاری کیا جائے تاکہ اساتذہ کو روز افزوں بچوں کی تعلیم کے بارے میں ہونے والے تجربات سے روشناس کرایا جائے۔ پرائمری ٹیچرس کے لیے KIT بھی تیار کرانے چاہییں تاکہ استاد جو مضمون پڑھاتا ہے اس کا ORIENTATION مضمون کے مزاج کے مطابق ہو سکے کیونکہ ضروری نہیں کہ کوئی تربیت یافتہ شخص بچوں کو پڑھانے میں بھی اتنا ہی کامیاب ہو جتنا وہ اپنے مضمون پر عبور رکھے۔ اس KIT کی مدد سے استاد اپنے اندر بچوں کے مزاج کے مطابق پڑھانے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے۔ اساتذہ کو حکام کے احکامات کم سے کم دیے جائیں لیکن تعلیم کے میدان میں کمی کو برداشت نہ کیا جائے۔

۵۔ بچوں کو اسائنمنٹ ورک کرائے جائیں جو سائنسی یا تفریحی نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ اس سے بچوں کے اندر تعلیم سے دلچسپی پیدا ہوگی۔ نیز دوسرے بچوں سے مل کر وہ بہت کچھ آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ سائنس ورکس میں انھیں وہ باتیں معلوم ہو سکتی ہیں جو سائنس پڑھتے وقت ان کی معاون ثابت ہوں گی۔

۶۔ حکومت عوام کو اس بات کے لیے پابند کرے کہ پرائمری تعلیم اپنے رہائشی مقام کے کسی قریبی سرکاری اسکول میں ہی ہو سکتی ہے۔ اسکول میں جگہ نہ ہونے کی صورت میں ہی بچے کو کہیں اور تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔ اس طرح سے ایک طرف بہت سی اسکیمیں ختم ہوں گی دوسری طرف دولت مند اور با اثر لوگوں کے بچے ان اسکولوں میں آئیں تو ان کی حالت بآسانی درست ہو سکے گی۔

۷۔ والدین کے لیے رہنما کتاب تیار کرائی جائے جس میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں والدین کی رہنمائی ہو۔ نیز پرائمری تعلیم کے دوران والدین کے لیے رہنمائی دے کہ جب بچہ اسکول جاتا ہو اور پانچویں جماعت تک پڑھے تو والدین کا رویہ گھر میں کیا ہونا چاہیے۔

۸۔ تعلیمی صورت حال پر سالانہ دستاویز وزارت تعلیم کے اہتمام تیار کی جائے۔ اس میں مکمل اعداد و شمار ہوں۔ تعلیمی سرگرمیوں اور مختلف پالیسیوں اور تجاویز کی وفاقی اور صوبائی سطح پر تکمیل کی رپورٹ بھی ہو۔ یہ رپورٹ ایک طرح سے تعلیمی سروے بن جائے گی اور عوام کے اندر تعلیمی مسائل کے بارے میں بیداری و آگہی پیدا کرے گی۔ ان دونوں کتابوں کے سمعی (ضمیمہ ۶) اور بصری (ضمیمہ ۷) کیسٹ بنائے جائیں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اس کے اجزا کو نشر کیا جائے تاکہ ناخواندہ

افراد کی اپنی اولاد کی اپنی کے معاملے میں موثر رہنمائی ہو سکے۔

۹۔ اساتذہ میں سزا اور انعام کا تصور عام کیا جائے تاکہ وہ Motivate ہو سکیں۔

۱۰۔ تعلیم کو طبقہ درایت سے بالاتر کیا جائے اور اسے سب کے لیے اجتماعی تحریک کے طور پر فروغ دینے کی سعی کی جائے۔

حوالہ جات

۱۔ بھارت کا آئین حصہ چہارم مطبوعہ ترقی اردو بیورو ۔ نئی دہلی ۔ دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۵ء ص ۴۷

۲۔ بھارت کا آئین ۔ حصہ چہارم ۔ مطبوعہ ترقی اردو بیورو ۔ نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۵ء ص ۴۷

۳۔ بھارت کا آئین ۔ حصہ چہارم مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۵ء ص ۴۸

۴۔ Statistical outline of India Table 21- Published by Tata Service Ltd. 1989-90.

سب سے بڑا استاد

"انسان آپ اپنے لیے سب سے بڑا استاد ہے۔ دنیا کے تمام واقعات اس پر گزرتے ہیں اور ان کے اثروں سے جیسا وہ واقف ہوتا ہے، دوسرا کوئی واقف نہیں ہوتا اور ان سے اس کو عبرت پکڑنے کا سب سے زیادہ موقع ہوتا ہے۔"

مو سید ؟

مولانا ابوالکلام آزاد اور سرمد

ابو علی اثری *

ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے جن مضامین نے شہرت حاصل کی اور وقت کے بڑے بڑے ارباب کمال کو ان کی طرف متوجہ کر دیا، اُن میں ایک مضمون سرمد پر بھی ہے۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اس کا قتل خلاف شریعت وضع اختیار کرنے اور کفر کے کلمات زبان سے ادا کرنے پر نہیں، جیسا کہ عام طور سے مشہور ہے، پولیٹکل مصالح کے تحت ہوا ہے۔ اس طرح سے مولانا نے اورنگ زیب عالمگیر کے جرائم میں ایک اور جرم کا اضافہ کر دیا ہے جس کی مدافعت میں غالباً اب تک ایک حرف نہیں لکھا گیا ہے۔ مولانا کی یہ تحقیق کس حد تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ تو عالمگیر کے معاصر مورخین ہی کر سکتے ہیں۔ مولانا شبلی نے عالمگیر پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو الندوہ میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا جو بعد میں انہی کے زمانہ حیات میں "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا تھا۔ یہ اتنا زیادہ مقبول ہوا اور اہل علم و تحقیق کے حلقے میں اتنا وقیع اور مستند سمجھا گیا کہ ایک صاحب نے اس کا انگریزی میں ترجمہ اور اس میں کچھ اور اضافہ کر کے تاریخ میں لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس میں مولانا شبلی نے مستند تاریخی حوالوں سے اورنگ زیب عالمگیر پر عائد کردہ الزامات کی ایک ایک کر کے تردید کی ہے۔ ہم نے اس کتاب کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالا لیکن اس میں ہم کو کہیں سرمد کا ذکر نہیں ملا۔ اگر اس کی فرد قرارداد جرم میں قتل سرمد بھی ہوتا تو یقیناً مولانا اس سے بھی تعرض کرتے اور اس پر دل کھول کر اظہار خیال فرماتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اپنی سنگینی اور ہولناکی کے لحاظ سے مولانا ابوالکلام کے نزدیک جیسا بھی رہا ہو لیکن اس وقت اس کو کچھ زیادہ اہم نہیں سمجھا گیا اور نہ اورنگ زیب کے دشمنوں نے اس کے جرائم میں شمار کیا۔

مولانا شبلی کی نظر سے مولانا ابوالکلام کا یہ مضمون گزرا تو اس واقعہ کی تردید میں تو ایک حرف نہیں کہا لیکن مضمون کے متعلق ارشاد ہوا کہ ابوالکلام نے اس کو پھیلا بہت دیا ہے، اگر میں لکھتا تو دو صفحے سے زیادہ نہ لکھتا۔ اصل مواد تو دو صفحوں میں آگیا ہے باقی ابوالکلام کی ادبیت ہے۔

مولانا سنجیدہ تاریخی مضامین میں ادب پسند نہیں کرتے تھے اور مولانا ابوالکلام اس کے خوگر

* دار المصنفین، اعظم گڑھ

کا ایک ہی بیان ہی کی ملاقات سرمد سے ہوئی تھی۔ مولانا نے اس سے بھی ایک آدھ باتیں اخذ کی۔ غرض گلدستہ تو بن گیا لیکن مولانا کو حسرت رہ گئی کہ اس کو جیسا بننا چاہیے تھا ویسا نہ بن سکا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ

"ان ہی چند بتوں اور ٹکڑیوں کو میں
نے اپنے دامن میں لے لیا کہ مشہد سرمد
میں جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں۔"

اس مضمون کی پہلی سرخی سرمد کی قومیت اور مذہب ہے جس کے لیے مولانا نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں پر اعتماد کیا ہے۔ دوسری خاندانی نام، تیسری تحصیل علم، چوتھی ابتدائی پیشہ۔ سرمد اس پیشہ کے سلسلے میں پورے مشرق وسطیٰ کا چکر لگاتا ہوا ہندوستان آیا اور یہاں کی خاک ایسی دامن گیر ہوئی کہ یہیں رہ پڑا اور یہیں پیوند خاک ہو گیا۔

سبزۂ نورستہ اس گمر کی نگہبانی کرے

پانچویں سرخی بیاباں نوردی و بادیہ پیمائی ہے جو عشق کی شورش انگیزیوں کا نتیجہ تھی۔ چھٹی سرمد کی شہادت ہے جس کو مولانا نے سب سے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے اور انشا پردازی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ حسب روایت تذکرۃ الخیال سرمد کی اس رباعی:

ہر کس کہ سر حقیقتش باور شد
او پہن تر از سپہر مینا در شد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمد
سرمد گوید کہ فلک با احمد در شد

پر جبہ پوشان شرع کے کان کھڑے ہو گئے اور انھوں نے اسے کفر قرار دیا۔ جس سے معراج جسمانی سے انکار لازم آتا ہے۔

لیکن سرمد کو فقیہانہ جنگ و جدل سے کیا سروکار تھا۔ وہ تو اس عالم میں تھا، جہاں اقرار و انکار کی گونجوں کی آواز نہیں پہنچ سکتی

در محاسب ہلے نور عشق حکمتا کم است
عشق را با مصلحت اندیشی مجنون چہ کار

لیکن مولانا کے نزدیک اس کا سب سے بڑا جرم عالمگیر کے خلاف دارا شکوہ کی محبت تھی اور اس بنا پر وہ کسی بہانے اس کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس کی عریانی و برہنگی کو خلاف شرع قرار دیا اور پھر مذکورہ رباعی سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ معراج جسمانی کا منکر ہے۔

قاضی القضاۃ ملا قوی کو عالمگیر نے سرمد کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں۔ سرمد نے کہا کیا کروں کہ شیطان قوی ہے۔ اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔

خوش بالائے کردہ چنین پست مرا
چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش
دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

قاضی القضاۃ نے اس ملاقات کی رپورٹ بھیجی لیکن عالمگیر جو مرتے سرمد کی مقبولیت کے سبب نفرت سے مطمئن نہیں ہوا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ علما و فضلائے عصر کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور اس میں سرمد کو بلایا جائے۔ چنانچہ سرمد آیا۔ پہلے تو خود عالمگیر ہی مخاطب ہوا اور کہا کہتے ہیں کہ سرمد نے دارا شکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا۔ سرمد نے کہا کہ وہ مژدہ صحیح نکلا کہ اسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ علما نے کہا برہنگی خلاف شرع ہے۔ اس کا جواب اگرچہ سرمد پہلے ہی دے چکا تھا۔

دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

بادشاہ نے کہا کہ برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔ سرمد

تھے۔ مولانا اکثر فرمایا بھی کرتے تھے کہ میں ایجاز کا بادشاہ ہوں اور ابوالکلام اطناب کے۔ اس مضمون کے متعلق یہ کہہ کر کے اس میں ادبیت زیادہ ہے اس کی تاریخی حیثیت کو بالکل مشکوک کر دیا۔ یہ روایت تو دوسرے ثقہ راویوں کی ہے۔ مگر ان دونوں بزرگوں میں اس مسئلے پر کچھ تبادلۂ خیال ہوا یا نہیں، اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ مولانا ابوالکلام نے یہ مضمون مولانا شبلی کے اورنگ زیب پر سلسلہ مضمون کے شائع ہونے کے کئی برس کے بعد ۱۹۱۰ میں رسالہ نظام المشائخ دہلی کی فرمائش پر اس کے شہید نمبر کے لیے لکھا تھا۔ جس کی مولانا شبلی کو خبر نہیں تھی۔ حیرت ہے کہ خود مولانا ابوالکلام نے جو انہی کے ساتھ دہلی میں ایک ہی کوٹھی میں برابر کے ایک کمرے میں ٹھہرے تھے اور ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ کی شرکت کے لیے جو ان دنوں حکیم اجمل خاں کے اہتمام میں دلی میں ہو رہا تھا، آئے تھے مولانا شبلی سے اپنی اس تحقیق کا تذکرہ کیوں نہیں کیا۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اطناب بہت تھا جس کو مولانا شبلی پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرے اورنگ زیب پر ایک پر زور اور مدلل مضمون لکھ کر مولانا نے اورنگزیب کو تمام الزامات سے جو اس کے دشمنوں نے اس پر عائد کیے تھے بری کر دیا تھا، شاید اسی لیے اُن کو مولانا شبلی سے براہ راست اس کے ذکر کرنے کی ان کو جرأت نہیں ہوئی۔

سرمد کی شخصیت، شاعری، فضل و کمال اور اس کے واقعۂ قتل کے متعلق خود مولانا شبلی کی کیا رائے تھی اس کا پتہ ان کی کسی تحریر سے نہیں چلتا۔ اس کا ذاتی فضل و کمال اور اس کی رباعیات ان کو اس کی طرف متوجہ کر سکتی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا علاوہ فضل تو الگ رہا خیام اور سحابی استرآبادی کی رباعیات کے مقابلے میں اس کی رباعیوں تک کی ان کی نگاہ میں چنداں کوئی اہمیت نہیں تھی، ورنہ فارسی شاعری کی تاریخ، اور اس کے تمام صنفات پر تبصرے کے سلسلے میں شعر العجم میں یا کسی مضمون میں اس کا ذکر وہ ضرور کرتے مگر انھوں نے سرے سے اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ سحابی نجفی پر الندوہ میں مضمون لکھا تو اس میں کسی بھی مشہور رباعی گو شاعر کا نام نہیں آیا تو بھلا سرمد کا کیا آتا۔ مولانا ابوالکلام غالباً پہلے آدمی ہیں جنھوں نے فارسی تذکروں کو کھنگالا اور جو کچھ مواد ان کے ہاتھ آیا ایک مضمون لکھ کر سرمد کو اردو داں طبقے سے روشناس کرایا۔

اس مضمون کے لکھتے وقت دو کتابیں ان کے پیش نظر تھیں۔ ایک تو مرأۃ الخیال جس کا مصنف شیر خاں لودھی ہے جس نے بغیر کسی واسطے کے عالمگیری عہد کے واقعات لکھے ہیں۔ دوسری تذکرۂ ریاض الشعراء جس کا مصنف علی قلی خاں داغستانی ہے جو عہد محمد شاہی کے امراء میں سے ہے۔ اس نے نہایت تفحص و احتیاط سے فارسی شعراء کا یہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ مصنف کے قلم سے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں اُس وقت موجود تھا۔ مولانا نے زیادہ تر حالات اسی سے لیے ہیں۔ یہ تذکرہ اگرچہ عہد محمد شاہی میں لکھا گیا ہے لیکن پھر بھی اس میں صرف ایک واسطہ ہونے کی وجہ سے سرمد کے حالات کے لیے اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور تذکروں میں سرمد کے متعلق جو کچھ موجود ہے وہ سب اس وقت مولانا کے حافظہ میں محفوظ تھا۔ مولانا نے اس سلسلہ میں اپنے اس ذہنی خزانے سے بھی کام لیا۔ اس کتب خانہ میں عہد عالمگیر ثانی کے ...

پورا کلمہ نہیں پڑھتا تھا۔ صرف لا الٰہ پر آکر رک جاتا تھا۔ علما نے کلمۂ طیبہ پڑھنے کے لیے کہا تو اس نے حسب معمول صرف لا الٰہ کہا۔

علما نے کہا یہ تو کفر ہے۔ اس سے توبہ کرو۔ سرمد نے اس سے انکار کیا تو علما نے بے تکلف فتویٰ قتل صادر کر دیا۔

جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرایا اور ایک جملہ کے بعد یہ شعر پڑھا

شورے شد از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

اور مردانہ وار سر تلوار کے نیچے رکھ دیا اور جان دے دی۔

اور یہی مضمون کا ماحصل ہے اور اسی پر یہ مضمون ختم ہو گیا ہے۔ مضمون تو بظاہر تاریخی ہے، لیکن بحث کا انداز مولانا شبلی کی طرح مورخانہ نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد صاحب آب حیات کی طرح یکسر انشا پردازانہ، ادیبانہ اور شاعرانہ ہے جس میں جذباتیت زیادہ، واقعات کا تفحص کم ہے۔ اسی لیے وہ مولانا شبلی کو کچھ زیادہ اپیل نہ کر سکا۔

تحصیل علم کا عنوان بے حد تشنہ ہے۔ لکھا ہے کہ تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ وہ علم و فضل اور عربیت میں درجۂ کمال رکھتا تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ علم کی تحصیل اس زمانے کے تعلیمی نصاب کے مطابق کامل ہوگی۔ •

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عربی ہی نہیں عبرانی بھی جانتا تھا۔ توریت اور دوسرے صحائف آسمانی کا مطالعہ اس نے ان کی زبان میں کیا تھا۔ بلکہ توریت اور یہودی مذہب کا وہ بڑا زبردست عالم تھا، اسی کے ساتھ وہ شاعر بھی تھا اور یہ حیثیت اس پر اتنی غالب ہو گئی کہ آج دنیا اس کو ایک باکمال رباعی گو شاعر ہی کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ فارسی زبان میں جو دو چار رباعی گو شاعر گزرے ہیں ان ہی میں اس کا بھی شمار ہے مولانا نے اس مضمون میں جا بجا اس کی رباعیات کا ذکر تو کیا ہے اور کہیں کہیں ان سے استدلال بھی کیا ہے لیکن اس کی شاعری کمال رباعی گوئی اور اس کی رباعیات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔

مجھے اس بات کی امید ہے کہ اس یونیورسٹی کے ودیارتھی، پروفیسر صاحبان اور منتظم اپنے تاریخی فرض کو سمجھتے ہیں اور ان کو پورا کرنے میں کوشاں ہیں اور مجھے پورا بھروسہ ہے کہ ان کی اس لگن کے نتیجے کے طور پر اس یونیورسٹی کا مستقبل اس کے پچھلے دنوں سے بھی زیادہ شاندار ہوگا

راجندر پرشاد

بنگال میں فارسی کتبے اور سکّے

جی۔ ایس۔ فرید | مترجم | خالدہ حسینی *

یہ مقالہ بنگال کے مسلم حکمرانوں کے کتبات سے تعلق رکھتا ہے، جو مسجدوں، مقبروں، عمارتوں، دروازوں، توپوں اور سکّوں پر ملے ہیں۔ ان کتبوں میں کثرت سے قرآن شریف کے اقتباسات اور حکمراں سلطان، گورنر یا عطیہ دہندہ کے نام، تاریخ و سنہ اور دوسری اطلاعات موجود ہیں۔

فارسی کتبے تعداد میں محدود ہیں لیکن عربی کتبات بکثرت ہیں۔ اس لیے نہیں کہ عربی درباری زبان تھی یا اس کی مقبولیت تھی بلکہ اس لیے کہ عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی چنانچہ اس زبان میں کتبہ نویسی کا چلن تھا مگر یہ حقیقت کہ فارسی زبان بنگال میں عام طور سے سمجھی جاتی تھی، اس بات سے ظاہر ہے کہ پتھر کی بعض سلوں پر عربی آمیز فارسی الفاظ، عبارات اور اشعار پائے گئے ہیں۔ شروع میں فارسی کتبوں کی عبارتیں نثر میں ہوتی تھیں، لیکن بعد میں منظوم عبارتیں عام ہو گئیں۔

فارسی کتبات اور عربی آمیز فارسی کتبات کا تجزیہ حسب ذیل ہے:

سلاطین بنگال کے عہد سے تعلق رکھنے والے کتبات۔

فارسی ۵ : عربی آمیز فارسی ۱۰

مغلیہ دور حکومت سے تعلق رکھنے والے کتبات :

فارسی ۲۴ : عربی آمیز فارسی ۷

قبل از دورِ مغلیہ کے کتبات میں سے بعض عربی میں ہیں، مگر بکثرت عربی آمیز فارسی میں ہیں اور مغلیہ عہد کے حکمرانوں، شہزادوں اور گورنروں کے کتبات فارسی میں ہیں۔ ان کتبات کے جائزے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلا فارسی کتبہ سلطان سکندر شاہ کے دورِ حکومت کا ہے جو دیناج پور میں دیوی کوٹ کے ایک درویش شاہ عطا کی درگاہ میں نصب ہے۔ یہ ۷۶۵ھ/۱۳۶۳ء کا ہے۔

سلہٹ سے حاصل شدہ بنگال کے سلطان شمس الدین فیروز شاہ کا کتبہ مورخہ ۷۰۳ھ/۱۳۰۳ء غلطی سے ان سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ اصل میں سلطان علاء الدین حسین شاہ کا ہے اور ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء

---

* معرفت قاسمی دواخانہ، ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ۔

کا ہے۔ اس ضمن میں اس بات پر نظر رہنی چاہیے کہ ایک اہم اور سب سے پرانا فارسی کتبہ وہ ہے جو دہلی میں مسجد قوت الاسلام کے مشرقی دروازے کی محراب پر کندہ پایا گیا ہے، جس کو قطب الدین ایبک نے ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں تعمیر کرایا تھا۔

مندرجہ بالا کتباتی شواہد کی روشنی میں یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستان میں فارسی چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں متعارف ہوئی لیکن اس کا استعمال عام طور سے کتبے کے مقاصد کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ بعض عربی آمیز فارسی کتبات کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتبوں میں فارسی کا استعمال بتدریج اور آہستہ آہستہ ہوا یہ بات مغلیہ دور کی ہے کہ کتبہ نویسی کے میدان سے عربی غائب ہو گئی اور دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں فارسی نے اس کی جگہ لے لی۔

عربی کتبات کے نمونے مغلیہ دور میں نسبتاً کم ہیں مسکوکاتی شواہد سے بھی سولہویں صدی عیسوی/دسویں صدی ہجری میں فارسی کا غلبہ ثابت ہوتا ہے۔ بنگال کے سلاطین کے سکوں پر تمام کے تمام عربی کتبے ہیں اور مغل بادشاہوں کے سکوں پر فارسی کتبے ہیں۔ شہنشاہ ہمایوں کے دور کا چاندی کا ایک سکہ شاید ٹانڈہ کی ٹکسال میں ڈھالا گیا تھا اور ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں اس وقت جاری ہوا تھا جب اس نے شیر شاہ سے چھین کر گوڑ پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے جانشینوں نے بنگال کی مختلف ٹکسال سے سکے جاری کیے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی شروع میں مغل حکمرانوں کے نام پر فارسی میں سکے جاری کیے تھے۔ اس قسم کے آخری سکے ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم کے دور حکومت کے پینتالیسویں سال میں جاری ہوئے تھے۔ یہ ۱۸۳۴ء کی بات ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تقریباً پورے ملک میں پھیل چکی تھی اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت صرف لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ سکوں میں یکسانیت پیدا کرنے کا مسئلہ کلکتہ کی ٹکسال کمیٹی کے زیر غور آیا۔ جس کے نتیجے میں شہنشاہ ولیم چہارم کے سکے ۱۸۳۵ء میں متعارف ہوئے ان سکوں کے سیدھے رخ پر بادشاہ کی تصویر اور الٹے رخ پر شیر اور کھجور کے درخت کی تصویر کے ساتھ ساتھ انگریزی میں کتبہ تھا۔

طرز تحریر

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جاندار چیزوں کی تصویریں پیش کرنا چونکہ اسلام میں ممنوع ہے اس لیے فن کاروں کی تخلیقی قوت نے عربی رسم خط کی طرف اپنا رخ موڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوش نویسوں نے مختلف خط مثلاً خط کوفی، خط نسخ، خط ثلث، خط بہاری، خط نستعلیق وغیرہ کو خوب خوب ترقی دی۔ فارسی تحریر کے لیے خط نستعلیق اختیار کیا گیا اور اسے بابر نے سولہویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان میں متعارف کیا۔ اس کے جانشینوں کے دور میں یہ خط انتہائی حسن و کمال کے درجے کو پہنچ گیا۔

بنگال کے شروع کے فارسی کتبات کے سرسری جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتابت کا معیار عام طور پر پست تھا۔ یہ شاید ہنرمندوں اور ماہر کاریگروں کی کمی کی وجہ سے تھا لیکن سکندر شاہ کا مذکورہ بالا کتبہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کتبہ میں فارسی نظم و نثر کی ملی جلی چار سطریں بہت خوبصورت

خط ثلث میں لکھی ہوئی ہیں۔ حروف واضح طور پر کندہ ہیں اور یہ کتبہ بہت ہی شاندار حالت میں محفوظ ہے[5] شہنشاہ اکبر کے کتبات میں سے ایک کتبہ شیرپور (بوگرا) کی ایک مسجد کا ۱۵۸۲/۹۸۹ھ کا ہے، جو شاندار خوشنویسی کی دوسری مثال ہے[6]۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ حرفوں کے تمام نقطے اور دیگر حذف کر دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ خط شکستہ میں ہوتا ہے۔ متعدد ایسے کتبے ملے ہیں جو شاندار خط نستعلیق میں فارسی کے کتبے ہیں۔ مثلاً معصوم خان کی بنوائی ہوئی مسجد چٹ مہر کا کتبہ، چٹ گام میں ت… خان کی اندرون قلعہ مسجد کا کتبہ مورخہ ۱۰۷۸ھ، بردوان کی انجلا بانار مسجد کا کتبہ مورخہ ۱۱۱۵ھ ڈھاکہ میں جہانگیر نگر کے چوک کا کتبہ وغیرہ[7]

انیسویں صدی میں مغلیہ حکومت کے خاتمے کے بعد فارسی درباری زبان نہیں رہی، حالانکہ ہندوستان کے مسلم دورِ حکومت میں اس شاندار زبان کا بول بالا تھا جس نے اردو، ہندی، سنسکرت، بنگالی، گجراتی اور دوسری مقامی زبانوں کو مالا مال کیا تھا اس زبان کو اب ایسے دن دیکھنے پڑے ہیں کہ وہ تاریخ کی چیزوں میں شامل ہوتی ہے اور ریسرچ اسکالروں کے مطالعہ تک محدود ہے یا عوام کے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی اب گھر کی ایک چیز بن گئی ہے

حواشی

1. Shamsuddin Ahmad, Inscription of Bengal V 4, AH Dani; Analysis of Inscriptions, Journal of the Asiatic Society of Pakistan, 1956 – H Blochmann contributions to the Geography and History of Bengal
2. A H Dani op cit
3. Shamsuddin Ahmad op cit introduction. P. xii
4. N K Bhattasali Habibur Rahman Collection of Coins in the Dacca Museum

   N K Bhattasali: Tayfoor collection of coins in the Dacca Museum
5. Shamsuddin Ahmad, op cit
6. Ibid

مسلمان اساتذہ کی تربیت

سید راشد اکبر*

دنیا کے زیادہ تر ممالک میں اساتذہ کی تربیت کے لیے یا تو کالج قائم ہیں یا یونیورسٹیاں یہ کام کرتی ہیں مگر ان کو صرف جنرل ایجوکیشن دی جاتی ہے اور جس مضمون کا استاد اُن کو بننا ہوتا ہے اس کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ چاہے عام اساتذہ کے لیے مناسب ہو مگر مسلمان اساتذہ کو خصوصی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اُن کی جنرل ایجوکیشن بھی ایسی ہونی چاہیے جو اُن کے اندر ایسی اقدار کو فروغ دے جو اسلام پر مبنی ہوں۔ تاکہ وہ اپنے طالب علموں میں ان اقدار کو فروغ دے سکیں جو قرآن اور سنت پر مبنی ہوں۔ یہ کافی نہیں ہے کہ ہم ان کو اسلامی اخلاقیات اور الٰہیات سے واقف کرائیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان کے تمام ہی مضامین کو اسلامی نقطۂ نظر سے پڑھایا جائے یعنی جس کو جنرل ایجوکیشن کہا جاتا ہے وہ اسلامی جنرل ایجوکیشن کہلانی چاہیے۔

مسلم تعلیم کی پہلی عالمی کانفرنس جو مکہ معظمہ میں ۱۹۷۷ء میں ہوئی تھی اس نے اس کام کے لیے مندرجہ ذیل اصول مرتب کیے تھے۔

۱۔ اساتذہ کی تربیت کا نصاب اسلامی نظریہ پر مبنی ہونا چاہیے اور اساتذہ کی تربیت کے جدید نظام میں جو کچھ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے فراہم کیا جانا چاہیے۔

۲۔ مستقبل میں ہونے والے اساتذہ میں ملی خدمت کے نظریے کی روح پھونک دی جائے اور جو اساتذہ پہلے ہی سے کام کر رہے ہیں ان کو ملی خدمت میں مشغول ہونے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ مستقبل میں ہونے والے اساتذہ کو ضروری لیاقت، ہنر اور فہم و ادراک کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ وہ مفید اساتذہ ثابت ہو سکیں۔

یہ اصول گو بہت اچھے ہیں مگر ان سے نہ تو اُن لوگوں کو خاص رہنمائی حاصل ہوتی ہے جو اساتذہ کی تربیت کے نصاب کو نظرثانی کرنا چاہتے ہوں اور نہ اُن کو جو اُن اساتذہ کے لیے درسی کتب یا منصوبہ بندی کے اسباق لکھنا چاہتے ہوں اس کام کے لیے جو رہنما اصول ہوں وہ بہت واضح ہوں۔

اساتذہ کی تربیت کے کام کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک حصے کو مضمون کی تعلیم کہتے ہیں جو اس مضمون پر مبنی ہوتی ہے جس کا اس کو استاد بنایا جانا ہے۔ دوسرے حصے کو پیشہ ورانہ تعلیم کہتے ہیں

---

* لیکچرر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

اساتذہ کی تربیت میں یہ بہت اہم ہے کہ ان کو اس طرح کی تعلیم فراہم کی جائے کہ وہ اپنے مضمون کو اسلامی نقطۂ نظر سے پڑھا سکیں۔ اس بات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ مضمون کا مواد طلبا کی ذہنیت کو نہ تبدیل کر سکتا ہے اور نہ ان کو بہت زیادہ متاثر ہی کر سکتا ہے بلکہ تدریسی راہیں اس کام میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اساتذہ کی تربیت کے اداروں اور شعبوں کو تدریسی راہوں سے ہو کر گزرنے والے اساتذہ کو بہتر طور پر روشناس کرانا ہوگا۔ ہر مضمون کے لیے ایک مشترک تعلیمی راہ اختیار کرنی ہوگی جو اس خصوصی مضمون کا بھی خیال رکھے جس کا اس کو استاد بننا ہے۔ حالانکہ وہ تدریسی راہ قرآن اور سنت کی روشنی میں ہوگی مگر ہر مضمون کے اپنے کچھ علیحدہ اثرات بھی ہوں گے۔ موجودہ طور پر ایسی اسلامی راہ ہر مضمون کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے ہر استاد کو اپنے مضمون کو اسلامی شکل دینے کے لیے اپنی تدریسی راہ خود ہی مرتب کرنی ہوگی۔

اساتذہ کی تربیت کے اداروں اور شعبوں کو تدریسی طریقۂ کار کو تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ کسی مضمون میں لادینی راہ پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہم کو اپنے اساتذہ کو ایسی تعلیم دینی چاہیے کہ وہ ہر مضمون کو اس طریقے سے پڑھا سکیں کہ ان کے طلبا اسلامی طرزِ زندگی کو شعار بنا لیں اور اسلامی اقدار کو روزمرہ کی زندگی میں استعمال کر سکیں۔ یہ طریقۂ کار عقیدتمندانہ نہ ہو کر حقیقی معانی میں بنیادی اسلامی خصوصیات پیدا کرنے کے لائق ہو۔ ظاہر ہے یہاں ہونے والے اساتذہ کو معیاری تعلیم فراہم کریں گے۔ مثال کے طور پر یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اپنے طلبا کو اس طرح پڑھائے گا کہ وہ اردو زبان و ادب سے اچھی طرح واقف ہو سکیں اس کے لیے وہ تنقیدی اصول مرتب کرے گا اور اردو زبان سے ایسا مواد منتخب کرے گا جو ہماری روایات و اقدار کا حامل ہو۔ اسی طرح شعبہ تعلیم کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اُن طلبا کو اردو زبان و ادب کی تدریس کے لیے طریقے بتائے کہ وہ مسلم معاشرے کے لیے سودمند ہوں اور اردو زبان و ادب کی تدریس کا طریقہ طلباء میں ہماری ثقافت کی بنیادی اقدار کو پیدا کرنے کا سبب بنے اور یہ کام اسی وقت ممکن ہے کہ جب شعبۂ تعلیم اور یونیورسٹی کے دوسرے شعبے مل کر اپنے اپنے مضامین کے اساتذہ کی تیاری کے لیے ایسے طریقۂ کار ایجاد کریں۔

شعبۂ تعلیم میں پڑھے جانے والے نصاب کا دوسرا حصہ وہ ہے جو پیشہ ورانہ نصاب سے تعلق رکھتا ہے جس میں فلسفۂ تعلیم، تعلیمی نفسیات، تاریخ تعلیم، تعلیمی نظم و نسق اور ان کے جدید مسائل شامل ہیں۔ دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں یہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ مضامین کسی مسلم یونیورسٹی میں پڑھائے جا رہے ہیں یا غیر مسلم یونیورسٹی میں سب جگہ ایک ہی مواد یعنی مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ مسلم اداروں نے اگر بڑی رعایت کی تو ایک دو کورس مسلم تعلیم یا اسلامی تعلیم کے نام سے شامل کر لیے۔ اگر ہم فلسفۂ تعلیم پڑھائیں گے تو افلاطون اور ارسطو سے شروع کریں گے اور اگر بڑی عنایت کی تو کچھ معلومات ابن سینا، الفارابی اور الغزالی کے بارے میں فراہم کر دیں گے مگر بنیادی طور پر مغربی مفکرین تعلیم کو ہی اپنی تعلیم کی بنیاد بنائیں گے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ جب ہم مسلم اساتذہ تیار کر رہے ہیں تو فلسفۂ تعلیم کا نصاب اسلامی تصورِ تعلیم سے شروع ہونا چاہیے اور جب اسلام کا فکری ارتقا پڑھائیں تو افلاطون اور ارسطو کا بھی ذکر کرنا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ کس طرح مسلم مفکرین نے یونانی فلسفہ

کا مقابلہ کیا اور کس طرح اس کو اسلامی ڈھانچہ میں تبدیل کیا۔ اُن کو یہ بھی بتائیں کہ کس طرح الغزالی اور دیگر فلاسفروں میں اختلاف ہوا اور کس طرح الغزالی نے اسلامی تصور کو پیش کیا۔ اس کے بعد ابن خلدون سے واقف کرائیں اور ابن خلدون کے وقت سے موجودہ زمانے تک اسلامی فلسفہ میں جو ارتقا ہوا اس سے پوری واقفیت کرائیں۔ زیر تربیت اساتذہ کو یہ نہ پڑھایا جائے کہ کس طرح مسلم اندازِ فکر زوال پذیر ہوا اور نہ یہ کہا جائے کہ قرآن اور سنت کی روشنی میں کوئی فلسفۂ تعلیم مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی فلسفۂ تعلیم کو اسلامی فلسفۂ تعلیم کے ساتھ موازنہ کر کے پڑھایا جائے اور اس ضرورت سے ان کو آگاہ کیا جائے کہ مغربی فلسفہ سے اسلامی فلسفہ کو کس قسم کا مقابلہ کرنا ہے۔ مغربی فلسفۂ تعلیم میں جو بے ترتیبی ہے طلبا کو اچھی طرح سے اس سے روشناس کرایا جائے۔ اسی وقت طلبا کو ہمارا نقطۂ نظر واضح ہوگا اور اسلامی فلسفۂ تعلیم کی جانب مثبت رویہ اختیار کریں گے۔ ان فلسفیانہ خیالات کو دیگر مضامین پڑھانے میں استعمال کرنا ممکن ہوگا۔ اسی طرح تعلیمی نفسیات کے نصاب میں ہم وہ چیزیں پڑھاتے ہیں جو مغربی مفکرین نے بچوں کے بارے میں اپنے طریقے سے حاصل کی ہیں مگر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مغربی نفسیات اس طریقے سے متاثر ہے جو انسانی دماغ کا مطالعہ کرنے کے لیے انھوں نے وضع کیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کے تمام نتائج ہی غلط ہیں مگر ان کی تشریحات اکثر غلط ہیں۔ اسلام میں انسان کا کیا تصور ہے، انسانی نشوونما کا کیا مطلب ہے اور مسلم مفکرین نے عملی طور پر کس طرح محسوس کیا ہے ان سب کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔ اس لیے شعبۂ تعلیم کے اساتذہ کو چاہیے کہ وہ تمام مسلم مفکرین کے خیالات سے ان چیزوں کا انتخاب کریں جو انھوں نے نفسیات کے متعلق لکھی ہیں ا[illegible] جو انسانی جذبات، خواہشات، احساسات اور رجحا[illegible] میلانات کی بصیرت رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ طریقۂ کار مغر[illegible] ماہرینِ نفسیات سے زیادہ منظم ہوگا۔ مسلم مفکرین انسانی دماغ کا وہ تصور پیش کریں گے جو قرآن پر مب[illegible] ہوگا اور کھرے کھوٹے کو علیحدہ کر سکے گا۔

تاریخِ تعلیم میں بھی ہم اس پر غور کرتے ہیں جو مغرب نے تیار کی ہے۔ ہم مغرب و مشرق دونوں ک[illegible] تاریخ سے واقفیت چاہتے ہیں مگر ہماری بنیادی فکر [illegible] اس طریقۂ تعلیم کی تاریخ پر ہے جس کو مسلمانوں نے مرتب کیا ہے۔ جب ہم دورِ جدید کا ذکر کریں گے تو اپنے ہونے والے مسلم اساتذہ کو یہ بتائیں گے کہ مغربی حملوں کی تاریخ کیا ہے اور کس طرح مسلمانوں پر اس کا تسلط ہوا۔ ہم ان کو اپنے اور مغربی طریقے کے اختلافات سے بھی واقف کرائیں گے تب ہی ان اساتذہ میں اپنے نظریات اور اقدار کے بارے میں صحیح تصور قائم ہوگا۔ ہمارے طالب علم محسوس کریں گے کہ نصاب ہماری ثقافت کی اسا[illegible] اور روح کا خارجی اظہار ہے جس طرح جان ڈیوی نے امریکی اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب کے لیے یورپین نصاب کو قبول نہیں کیا، کیوں کہ اس کی بنیاد یورپ کی ثقافت اور تاریخ تھی اسی طرح ہمارے طلبا پر یہ بات واضح ہونا چاہیے کہ ہمارا نصاب اپنی تہذیب و ثقافت پر مبنی ہونا چاہیے۔ تقابلی تعلیم بھی ایک اہم نصابی جزو ہے جو تمام مسلم طلبا کو پڑھنا چاہیے۔ اس کے ذریعے وہ مختلف طریقہ ہائے تعلیم کے بنیادی اصولوں سے واقف ہوں گے اور یہ محسوس کر سکیں گے کہ کس طرح کون نظریہ یا مذہب معاشرہ کو کس طرح کی اقدار فراہم کرتا ہے۔ کس طرح مختلف سماجی گروہوں میں اختلاف پیدا کرتا ہے اور کس طرح مختلف طریقہ ہائے تعلیم

نصاب اور طریقۂ تدریس وضع کرتا ہے۔ تعلیمی نظم و نسق کے تعلق کے ذریعے ہم ایسے اساتذہ و منتظمین تیار کر سکتے ہیں جو تعلیمی اداروں میں اسلامی ماحول پیدا کریں، برقرار رکھیں اور فروغ دیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تربیت کے دوران اُن کے اندر اسلامی خیالات اور اقدار کو سمو دیا گیا ہو۔

اساتذہ کی تربیت کو اسلامی اقدار سے فراہم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی بنیادوں پر درسی کتابیں بھی ترتیب دی جائیں۔ ایسا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر توجہ ضروری ہے

۱۔ مسلم تعلیم کے اغراض و مقاصد: ـ جب درسی کتب کا اسلامی مواد تیار کیا جائے تو مسلم تعلیم کے ان اغراض و مقاصد کو مد نظر رکھا جائے جو مکہ میں منعقدہ پہلی عالمی تعلیمی کانفرنس میں منظور کیے گئے۔

ثقافتی پس منظر: جہاں بھی ممکن ہو سکے درسی کتب کے مواد میں ثقافتی پس منظر شامل کیا جائے جو حقیقی زندگی کی مثالیں دی جائیں وہ مسلم ثقافت سے متعلق ہوں۔ یہ طریقۂ کار طلبا کو تدریسی مواد سے ہم آہنگ ہونے میں مدد دیتا ہے اور سیکھنے کے عمل کو آسان اور دلچسپ بنا دیتا ہے۔

۳ مواد کی عمومی ترتیب: درسی کتاب کا ایک حصہ دوسرے حصے سے مربوط ہو اور گذشتہ حصے سے پیوست کیا جائے۔

۴۔ طلبا کی سطحِ بالیدگی: طلبا کی جسمانی، سماجی، دماغی اور دیگر بالیدگی کے پہلوؤں کو درسی کتب کے مواد کو اسلامی طرز پر ڈھالتے وقت ذہن میں رکھا جائے۔ مثلاً اسکول کے اساتذہ کی تربیت کی درسی کتاب تیار کی جائے تو ان کو ان باتوں کی ضرورت ہوگی جو ایک ایک لیڈر، ایک ایک شوہر/بیوی، ایک باپ/ماں کو اسلامی فرائض کی ادائیگی میں ضروری ہوتی ہیں۔

۵۔ ہر حصے کے خاتمہ پر خلاصہ: ہر باب کے آخر میں ہر باب کا خلاصہ دیا جائے جس میں اس پر خصوصی زور دیا جائے جو اسلامی مواد سے متعلق ہو۔

۶ ہر حصے کے آخر میں سوالات: ہر حصے کے آخر میں ایسے سوالات پوچھے جائیں جو طلبا کو اسلامی مواد فراہم کرنے کے لیے مجبور کر دیں۔

۷۔ مزید مطالعے کے لیے مجوزہ اسلامی مواد: جہاں بھی ممکن ہو مصنف کو مزید مطالعے کی ایسی مجوزہ فہرست فراہم کی جائے جو قرآن اور حدیث سے متعلق ہو اور کسی مسلمان مصنف کی تصنیف کردہ ہو جو طلبہ کو اسلامی معلومات بڑھانے میں مددگار ثابت ہو۔

۸۔ اشاریہ: کتاب کے مواد سے متعلق اور ناموں سے متعلق اشاریہ تو تمام کتابوں میں دیے جاتے ہیں مگر ان درسی کتابوں میں ان اسلامی اصطلاحات کا اشاریہ بھی دیا جائے جو کتاب کے مواد کو اسلامی بنانے میں استعمال کی گئی ہوں

۹۔ جب قرآن اور حدیث کو مواد کو اسلامی رنگ دینے کے لیے استعمال کیا جائے تو مصنف کو قرآن اور حدیث کے بارے میں اپنی رائے دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ قرآن کے الفاظ اور رسولؐ کے الفاظ ہی استعمال کیے جائیں۔

۱۰ ۔ وہ مضامین جن کو اسلامی بنانے میں دقت پیش آئے۔ سر دست ان کتابوں میں قرآن کی آیتیں اور احادیث بیان کرنے پر اکتفا کی جائے تاکہ طلباء نفس مضمون کو سمجھ سکیں۔

۱۱ جزوی کوشش: یہ ممکن نہیں کہ مکمل مواد کو ایک معیار پر اسلامی بنا دیا جائے۔ لہٰذا اگر یہ کام جزوی طور پر بھی شروع کر دیا جائے تو آئندہ اس کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

۱۲ اعتماد کے ساتھ تیاری: جب درسی کتابوں کو اسلامی طرز پر تیار کیا جائے تو یہ کام صرف وہ مصنف کریں جن کو اسلام کے اصول اور عمل پر اعتماد ہو۔ وہ حضرات جو مغربی خیالات کی بلندی سے مرعوب ہوں وہ درسی کتب کی تیاری کا کام نہ کریں۔ یہ کام اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں اسلام کی برتری کا احساس ہو یقین محکم ہو۔

۱۳- جدید طرز کا استعمال: سیکھنے اور سکھانے کا ایک اصول یہ ہے کہ تدریسی مواد میں زیادہ سے زیادہ تصویریں، خاکے، علامات اور نشانات کا استعمال کیا جائے۔

۱۴- کتاب لکھنے سے پہلے اس کا خاکہ تیار کیا جائے۔ وہ خاکہ قدرتی طور پر نفس مضمون کا ہوگا مگر اس نفس مضمون کو اسلامی نقطۂ نظر سے تیار کیا جائے۔ تاکہ اسلامی بنیاد پر جو کتاب لکھی جائے اس میں اسلام پیوند کا کام نہ کرے بلکہ اس کی روح اس میں کارفرما ہو۔

۱۵- آسان سے مشکل کی جانب: اول ان مضامین کی کتابیں تیار کی جائیں جن کا تیار کرنا یا تو اس لیے آسان ہو کہ نفس مضمون ہی ایسا ہے یا اس مضمون کے ایسے مصنف موجود ہیں جن کے لیے اسلامی طرز پر کتاب لکھنا آسان ہے یہ ایسے ہی لوگ ہو سکتے ہیں جو ایک طرف تو مضمون سے خوب واقف ہوں اور دوسری طرف قرآن اور حدیث پر گہری نظر رکھتے ہوں اور طلبا کی نفسیات سے خوب واقف ہوں تاکہ کتاب درسی کتاب کے انداز پر لکھی جا سکے۔ اس کی ابتدا زبان کے مضامین سے ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد سماجی علوم لیے جا سکتے ہیں۔ سائنس کو سب سے آخر میں لیا جائے

۱۶- اگر ایسے مصنف موجود نہ ہوں جو اسلام اور مضمون دونوں پر مہارت رکھتے ہوں تو یہ کام مشترکہ طور پر بھی کیا جا سکتا ہے جس میں مضمون جاننے والا بھی ہو اور اسلامی معلومات رکھنے والا بھی۔ ضرورت پڑنے پر درسی کتب کے لکھنے کی تربیت کا کام بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ اچھے مصنفوں کی کمی محسوس نہ ہو۔

۱۷ اگر ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے سے مستفید ہونا چاہتے ہوں تو بجائے درسی کتب تیار کرنے کے درسی مواد تیار کیا جائے اور ہر علاقہ اپنے نصاب کے مطابق درسی مواد منتخب کر کے اپنے علاقے کی درسی کتب تیار کرے۔ اس میں بیشتر مواد تو مشترک ہوگا اور جو نصاب میں فرق ہوگا اس کو مزید مواد ملا کر علیحدہ درسی کتب کی شکل میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے کام جلدی بھی ہوگا اور معیاری بھی۔

۱۸ درسی کتب کے ساتھ اساتذہ کی رہنمائی کی کتابیں ضروری فلمیں اور فلم اسٹرپ بھی تیار کیے جائیں تاکہ شعبۂ تعلیم کے اساتذہ اس بات کا مظاہرہ بھی کر سکیں جس کی وہ اپنے طلبا کو زبانی ترغیب دیتے ہیں۔ اسلامی طریقہ ہے کہ زبانی جمع خرچ کی جگہ ذاتی زندگی سے عملی نمونہ پیش کیا جائے۔

۱۹- درسی کتاب میں جانچ و پیمائش کے لیے مواد فراہم کیا جائے۔ تاکہ جن مقاصد کے لیے کوئی یونٹ لکھا گیا ہے۔ اس کی فہم و ہنر کی جانچ کی جا سکے۔

اے۔ ایم۔ یو اسکولس

نوٹس برائے داخلہ ۹۲-۱۹۹۱ء

اے۔ ایم۔ یو۔ کے اسکولوں میں مندرجہ ذیل درجات میں داخلے کیے جائیں گے

۱۔ ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول

(ا) درجہ اول (اردو اور انگریزی میڈیم)

(ب) درجہ ششم (انگریزی میڈیم) (اردو میڈیم میں بہت محدود تعداد میں)

(ج) درجہ نہم (انگریزی میڈیم) (اردو میڈیم میں بہت محدود تعداد میں)

۲۔ گرلس ہائی اسکول

(ا) درجہ اوّل (اردو اور انگریزی میڈیم)

(ب) درجہ ششم (انگریزی میڈیم) (اردو میں بہت محدود تعداد میں)

(ج) درجہ نہم (انگریزی میڈیم) (اردو میڈیم میں بہت محدود تعداد میں)

۳۔ سٹی ہائی اسکول

(ا) درجہ ششم (انگریزی، اردو، ہندی میڈیم)

(ب) درجہ نہم (جگہ خالی ہونے پر بذریعہ اخبارات اعلان کیا جائے گا)

۴ سٹی برانچ اسکول

(ا) درجہ اول (اردو میڈیم)

(ب) درجہ ششم (اردو میڈیم۔ صرف طالبات کے لیے)

پراسپیکٹس مع فارم داخلہ مبلغ دس روپیہ ادا کرکے یکم جون ۱۹۹۱ء سے متعلقہ اسکولوں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔
داخلہ امتحان میں شامل ہونے کے لیے درخواستیں جمع کرنے کی آخری تاریخ ۲۲ جون ۱۹۹۱ء ہے

پرنسپل سٹی ہائی اسکول

ہماری کچھ ایجنسیاں

۱- میسرز بک امپوریم
سبزی باغ،
پٹنہ - بہار۔

۲- میسرز محمد الیاس
نیوز پیپر ایجنٹ
۹۱ کولو ٹولہ اسٹریٹ
کلکتہ مغربی بنگال

۳ میسرز مکتبہ معارف الاسلام
ریاض الدین امیر محمد۔
جمعیۃ کالونی، انصار محلہ، روم نمبر ۹۸ -
فورتھ نظام پورہ، بھیونڈی، ڈسٹرکٹ تھانہ
مہاراشٹر۔

۴- میسرز آزاد کتاب گھر
ساکچی بازار،
جمشید پور - بہار۔

۵- میسرز طالب حسین
ایف ڈی ہائر سکنڈری اسکول
کاٹھ دروازہ، مراد آباد، یو-پی

۶ میسرز صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ
وارث پورہ، کامٹی، مہاراشٹر۔

۷- میسرز احمد حسینی
جمال بک ڈپو
باری روڈ، گیا - بہار۔

۸ میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ
پرنس بلڈنگ
ای-آر روڈ بمبئی، مہاراشٹر۔

۹ میسرز مکتبہ عمر
بک سیلر اور نیوز پیپر
مدینہ مسجد کمپلکس
میناکشی سرکل
بیجاپور

۱۰ میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ بغیہ
فیروز آباد- یو-پی

۱۱- میسرز جنتا بک ڈپو
مین روڈ
رانچی - بہار۔

۱۲ میسرز ثنائی بک ڈپو
پرانا قلعہ
سیوان - بہار۔

۱۳- میسرز ایجوکیشنل بک ہاؤس
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۴ میسرز الحفار بک ڈپو
شمشاد مارکیٹ
اے- ایم یو علی گڑھ۔

۱۵- میسرز کتاب سینٹر، شمشاد مارکیٹ
اے-ایم-یو- علی گڑھ- یو- پی۔

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

D. No.— — — —/Bldg. **Dated.— — — —**

TENDER NOTICE

Sealed tenders on percentage/item rate basis are invited to be received on 12-6-1991 upto 11 A.M. The tender will be opened on the same date at 1.00 P. M. Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during office hours.

Sale of tender forms will be stopped 24 hours before the time for receiving the tenders.

S. No.	Name of work	Amount put to tender.	Earnest Money.	Cost of tender	Time of Completion.
	Reterracing over roofs of New Lecturer Qtrs. 24 Nos at Zakir Bagh, No. 10 & 7, Shibli Road & No. 4 University Road, PVC office & Servant Qtrs; A.M U., Aligarh.	1,84,410/-	4,610/-	20/-	four Months

Estimates based on DSR.1985.

87/206

UNIVERSITY ENGINEER

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

D. No.------Bldg. Dated--------

TENDER NOTICE

Sealed tenders on percentage/item rate basis are invited to be received on 8-6-1991 upto 11 A. M.. The tender will be opened on the same date at 1.00 P. M. Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during office hours.

Sale of tender forms will be stopped 24 hours before the time for receiving the tenders.

No.	Name of work	Amount put to tender.	Earnest Money.	Cost of tender	Time of Completion.
	Re-roofing of Lunch Room, Reading Room, Canteen, Games Store and Indoor Games Room in Women's College, A. M. U. Aligarh.	Rs 1,06,915/-	2,675/-	20/-	Six months

Estimated based on DSR-1985.

77/196

UNIVERSITY ENGINEER

SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۰ جولائی ۱۹۹۱ء شمارہ ۷

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

نائب مدیر

[illegible]

ترتیب - سر ورق [illegible] *** * انچارج کمپوزنگ - [illegible]

ترسیل زر کا پتہ:
[illegible] تہذیب الاخلاق اینڈ ٹرسٹ،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
EDITOR: [illegible]
[illegible]
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ:
انڈیا ... ... Rs. [illegible]
بیرون ممالک [illegible]
[illegible]

خط و کتابت کا پتہ:
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ ٹرسٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ [illegible]

مندرجات

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق ہو

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ : پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارۂ تہذیب الاخلاق
اینڈ انشا انسٹی ٹیوٹ. ایم یو علی گڑھ پریس۔ ایس کے آفسیٹ پریس: دہلی۔

اِداریہ

زندگی بجائے خود ایک تجربہ ہے اور ہر تجربہ زندگی کے درد و داغ اور سوز و ساز کا عکاس۔ تجربہ کا تسلسل ہی زندگی کو نئی نئی جہتوں سے آشنا کرتا ہے، انجانی اور ان سوچی وادیوں تک پہنچاتا ہے۔ خواب کو حقیقت اور حقیقت کو خواب کے پیکر میں ڈھالتا ہے، خوب کو ناخوب اور ناخوب کو خوب کے پیکر میں جلوہ گر دیکھتا اور دکھلاتا ہے۔ اگر تجربہ کا تسلسل نہ ہو تو انسانی زندگی ایک ایسا اجاڑ صحرا ہو جائے جس کا وجود تو مسلّم مگر فیض معدوم۔ تجربے کی اس بوقلمونی اور رنگا رنگی نے آج ہندوستان کی جمہوریت کو ایک ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جس پر اس سے پہلے وہ کبھی نہ تھی۔

الیکشن کا شور و ہنگامہ تمام ہوا، اس سے پہلے کے الکشنوں میں جو کچھ ہوتا تھا وہ سب بھی ہوا لوگ مارے بھی گئے، زخمی بھی ہوئے، گروہوں میں تقسیم ہوئے ایک دوسرے کی جان کے پیاسے بھی بنے لیکن یہ سب مراحل تمام ہوئے۔ انسان کی تجربہ پسند فطرت نے اس بار کے الکشن میں یہ گل کھلایا کہ مرکز میں کسی بھی سیاسی پارٹی کو اتنی اکثریت حاصل نہ ہونے دی کہ وہ مطلق العنان بن کر حکومت کرے۔ ہندوستانی عوام نے کچھ اس انداز سے ووٹ دیا ہے کہ مرکز میں جو بھی سیاسی پارٹی حکومت بنائے گی وہ اپنے حلیفوں کی دست نگر رہے گی اور جب کسی بات پر ناراض ہو کر اس کے حلیف اس سے کنارہ کش ہو جائیں گے تو اس کی حکومت کا وجود باقی نہ رہے گا۔

اگر دور رس نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ صورت حال ہندوستان کے عوام کے حق میں مفید ہی ثابت ہوگی، مکمل اکثریت حاصل کرنے کے بعد سیاسی پارٹیاں شتر بے مہار بن جاتی ہیں اور اپنی اکثریت کے بل پر بعض اوقات ایسے قانون وضع کر لیتی ہیں جو عوام میں "کالے قانون" کے نام سے معروف ہوتے ہیں۔ گزشتہ بیتالیس برسوں میں اکثریت کے بل بوتے پر ہندوستانی عوام کو جن عذابوں میں مبتلا کیا گیا تھا ان کو ابھی تک لوگ بھول نہیں سکے ہیں۔ مکمل اکثریت کا سب سے غلط بلکہ ناجائز استعمال اس وقت ہوا تھا جب ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے ہزاروں افراد کو سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا۔

"اقلیتی حکومت" کے جہاں بہت سے نقصانات ہیں وہیں اس کے فواید بھی ہیں۔ نقصانات کا تعلق زیادہ تر سیاسی پارٹیوں سے ہے اور فواید کا عوام سے۔ ہم ایک عامی کی حیثیت سے "اقلیتی حکومت" کا اس لیے خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس میں شتر بے مہار ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، جس دن اس نے شتر بے مہار بننے کی کوشش کی اسی دن اس کا شیرازہ بکھر جائے گا اور اس کی ہستی، نیستی میں تبدیل ہو جائے گی۔

اس وقت ہندوستان جن مسائل سے دوچار ہے ان کی وجہ سے نہ تو جان، مال، عزت اور آبرو محفوظ ہے اور نہ ہی پیٹ کی روٹی۔ جب معاملہ روٹی تک پہنچ جائے تو حالات بہت سنگین ہو جاتے ہیں۔ کشمیر، پنجاب، آسام اور اتر پردیش کے بعض علاقوں میں تشدد کے ایسے جھکڑ چل رہے ہیں جن کی تندی و تیزی میں کوئی فرق آتا دکھائی نہیں دیتا۔ مذکورہ تشدد کو ختم کرنے کے لیے افہام و تفہیم اور زور بازو سب ہی کا استعمال کر کے دیکھ لیا گیا، مگر یہ مسئلہ اب بھی ایک عقدۂ لاینحل بنا ہوا ہے۔ ایک طرف تو ہندوستانی عوام ان حالات کا شکار ہیں اور دوسری طرف اشیاء کی قیمتیں روز افزوں ہیں۔ کل تک ایک عام آدمی جن چیزوں کو بہ آسانی خرید لیتا تھا آج ان کو خریدنے کے لیے اس کو دس بار سوچنا پڑتا ہے اور ذہن میں یہ حساب کرنا ہوتا ہے کہ اگر یہ چیز خریدی گئی تو اس کے گھریلو بجٹ پر اس کا کتنا اور کیا اثر پڑے گا؟

بہ ہر حال مرکز میں ایک پارٹی کی حکومت ہے اور ریاستوں میں دوسری پارٹیوں کی، اگرچہ اس سے پہلے بھی ایک آدھ صوبے میں یہ صورت حال رہتی تھی مگر اس بار کی صورت حال پہلے کی صورت حال سے قطعاً مختلف ہے۔ پھر بھی نا امیدی ہمارے مشرب میں کفر ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں ایک دوسرے کی ممد و معاون بنیں گی اور ایسے تعمیری کام کریں گی جن سے ہندوستان کا غریب سے غریب شہری بھی مستفید ہو سکے گا۔ یہ حکومتیں مل جل کر ایسی حکمت عملی اختیار کریں گی جس سے ملک خسارے کے بحران سے نجات پا سکے گا، بیرونی دنیا میں سرفراز و سربلند ہوگا اور مجموعی طور پر ملک کی پیش رفت اطمینان بخش ہوگی۔

الزام اور جوابی الزام کا زمانہ ختم ہوا۔ اب عمل کا دور آیا ہے، اگر ہماری سیاسی پارٹیاں اور مرکزی اور ریاستی حکومتیں ایمان داری کے ساتھ اپنے فرائض نبھانے میں لگ جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان پیشرفت کی راہوں پر گامزن نہ ہو سکے اور دلوں کے غبار نہ چھٹ سکیں۔

کبیر احمد عباسی

عورتوں کے حقوق

سر سید احمد خاں

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے۔ اگر تمثیلاً کہا جاوے کہ عورت انسان کے لیے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے اور مرد بمنزلہ روپیے کے تو بھی اس پر راضی نہیں ہوسکتے۔ باینہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے، اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ انگلینڈ جو عورتوں کی آزادی کا بڑا حامی کار ہے جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں ہے نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لایعقل اور لاشے سمجھا ہے۔

انگلینڈ کے قانون کے بموجب شادی کرنے کے بعد معدوم الوجود متصور ہوتی ہے اور ذات شوہر سے مہمل ہو جاتی ہے۔

وہ کسی قسم کے معاہدے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور اس لیے وہ کسی دستاویز کی جو اس نے خود اپنی مرضی سے بلا شوہر کی مرضی کے لکھی ہو ذمہ دار نہیں ہوسکتی۔

جو ذاتی اسباب اور مال و نقد و جائداد قبل شادی عورت کی ملک ہو وہ سب بعد شادی بتصرف شوہر آجاتی ہے۔

جو جائداد کہ عورت کو وراثتاً قبل شادی کے یا بعد شادی کے ملی ہو، اس سب پر اس کا شوہر تا حین حیات قابض ہو جاتا ہے اور وہی اس کا حاصل لیتا ہے۔

وہ مثل لایعقل شخص کے نہ کسی پر دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی دعویٰ رجوع کر سکتا ہے۔

وہ بلا اجازت شوہر کے کوئی اسباب نہیں خرید سکتی اور کوئی چیز بیع نہیں کر سکتی۔

وہ بجز روٹی کھانے اور کپڑا پہننے اور ایک مکان میں رہنے کے خرچ کے جو ضروریات زندگی کے لیے درکار ہے اور کوئی خرچ بغیر مرضی شوہر کے نہیں کر سکتی۔

۱۸۵۵ء میں پارلیمنٹ میں حکومہ عورتوں کی جائداد کا ایک بل پیش ہوا تھا۔ اس میں صرف یہ بات چاہی گئی تھی کہ وہ قانون جس کے ذریعے سے بعد شادی کے عورت اپنی جائداد سے محروم ہو جاتی ہے، منسوخ کیا جاوے۔

آخر بل مسٹر رسل گرنے ممبر پارلیمنٹ نے یہ مسودہ قانون کا پیش کیا تھا۔ اس وقت انھوں نے نہایت لطیف بات یہ کہی تھی کہ حال کے قانون کے بموجب جو کچھ جائداد عورت کے پاس قبل شادی ہوتی ہے اور بعد شادی ملتی ہے اور جو کچھ کہ وہ اپنی محنت و لیاقت سے کماتی ہے، بعد شادی کے

وہ اس کا نہیں رہتا۔ سب پر شوہر مالک ہو جاتا ہے۔ پس شادی کا اثر اس عورت پر ایسا ہوتا ہے جیسا کہ کسی جرم قابل ضبطی جائداد کا اثر ہوتا ہے۔

اس گفتگو پر تمام ہوس آف کامنز ہنس پڑا اور اکثر ممبروں نے آنریبل مسٹر رسل گرنے کی تائید کی۔ پس انگلستان کے قانون کا عورتوں کی نسبت یہ حال ہے اور غالباً کوئی قانون اس سے زیادہ خراب اور مضرت رساں اور ناانصاف نہ ہوگا۔

ذکر مسلمانی قانون کا نسبت حقوق عورتوں کے

اب خیال کرو کہ مسلمانی قانون میں عورتوں کو کس طرح عزت دی گئی ہے اور مردوں کے برابر ان کے حقوق اور اختیار تسلیم کیے گئے ہیں:

حالت نابالغی میں جس طرح مرد اسی طرح عورت بے اختیار اور ناقابل معاہدہ متصور ہے۔ البتہ بعد بلوغ وہ بالکل مثل مرد کے مختار اور ہر ایک معاہدے کے لائق ہے۔

جس طرح مرد اسی طرح عورت اپنی شادی کرنے میں مختار ہے جس طرح کہ مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح عورت کی بلا رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا۔

وہ اپنی تمام ذاتی جائداد کی خود مالک اور مختار ہے اور ہر طرح اس میں تصرف کرنے کا اس کو اختیار کامل حاصل ہے۔

وہ مثل مرد کے ہر قسم کے معاہدے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی ذات اور اس کی جائداد ان معاہدوں اور دستاویزوں کی بابت جواب دہ ہے جو اس نے تحریر کی ہوں۔

جو جائداد قبل شادی اور بعد شادی اس کی ملکیت میں آئی ہو وہ خود اس کی مالک ہے اور خود اس کے تمام حاصل کی لینے والی ہے۔

وہ مثل مرد کے دعویٰ کر سکتی ہے اور اس پر دعویٰ ہو سکتا ہے۔

وہ اپنے مال سے ہر ایک چیز خرید سکتی ہے اور جو چاہے اس کو بیع کر سکتی ہے۔ وہ مثل مرد کے ہر قسم کی جائداد کو ہبہ اور وصیت اور وقف کر سکتی ہے۔

وہ رشتہ داروں اور شوہر کی جائداد میں سے بترتیب وراثت ورثہ پا سکتی ہے۔

وہ تمام مذہبی نیکیوں کو جو مرد حاصل کر سکتا ہے، حاصل کر سکتی ہے۔

وہ تمام گناہوں کے عوض میں دنیا اور آخرت میں وہی سزا پا سکتی ہے جو مرد پا سکتا ہے۔

کوئی قید خاص عورت پر بجز اس کے جو خود اس نے بسبب معاہدہ نکاح کے اپنے پر قبول کی ہیں یا اس قدر ستر عورت میں جو نیچر یعنی قدرت نے دونوں میں مختلف طور سے بنایا ہے ایسی نہیں ہے جو مرد پر نہ ہو۔ پس حقیقت میں مذہب اسلام میں جس طرح کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا ہے ویسا نہ کسی مذہب میں ہے اور نہ کسی قوم کے قانون میں ہے۔

مگر تعجب اور کمال تعجب اس بات میں ہے کہ تمام تربیت یافتہ ملک مسلمانوں کی عورت کی جو حالت ہے اس پر بہت کچھ نام رکھتے ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ملک کی عورتوں کی حالت مسلمانوں اور مسلمان ملک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے۔ حالانکہ معاملہ بالعکس ہونا چاہیے تھا۔

عورتوں کی حالت کی بہتری جو تربیت یافتہ ملکوں میں ہم نے تسلیم کی ہے اس میں کچھ بھی خیال ہم نے پردہ کی آزادی کا نہیں کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں ہندوستان میں اس باب میں جس قدر کہ تشدد ہے اسی قدر تربیت یافتہ ملکوں میں افراط ہے اور جب تک شرع نے نظر بکی

ہے اور جہاں تک کہ انسان اس پر غور کر سکتا ہے اور اپنی عقل کو کام میں لا سکتا ہے بلاشبہ یہ امر نہایت درست اور ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس مقام پر ہم یہ کو بحث ہے وہ صرف مردوں کے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور حسن معاشرت اور کا ضبع اور خاطرداری اور محبت اور پاس خاطر اور ان کی آسائش اور آرام اور خوشی اور عزت کی طرف متوجہ ہونا اور ان کو ہر طرح پر خوش رکھنا اور یعنی اس سے کہ عورتوں کو اپنا خدمت گزار تصور کریں ان کا اپنا انیس اور جلیس اور رنج و راحت کا شریک اور اپنے کو ان کی اور ان کو اپنی باعث مسرت اور تقویت کے سمجھے پر بحث ہے بلاشبہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ یہ مراتب بخوبی برتے جاتے ہیں اور مسلمان ملکوں میں دیسے نہیں برتے جاتے اور ہندوستان میں تو ایسی نالائقی اور خاک اڑتی ہے کہ نعوذ باللہ منہا

جو لوگ کہ ان خرابیوں کو مذہب اسلام کی طرف نسبت کرتے ہیں یقیناً ان کی غلطی ہے، بلکہ ہندوستان میں جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے، صرف اس کا باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے۔ اگر ان کی پابندی نہ کی جاوے تو بلاشبہ یہ تمام خرابیاں دور ہو جاویں۔ لہٰذا بڑا باعث اس کا ان سویلزڈ یعنی نامہذب ہونا مسلمانوں کا ہے۔ مہذب قوموں نے باوجود یہ کہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا۔ اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجے کی ترقی پر پہنچایا ہے اور مسلمانوں نے باوجودیکہ ان کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے اور ان کی حالت کی بہتری کے تمام دنیا کے قانون سے زیادہ بہتر اور عمدہ تھا، مگر انہوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے جس کے سبب تمام قوموں میں ان کی حالت بدبختی ہیں اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے الا ماشاء اللہ، اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کی غیرت نہ کریں اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھائیں۔

"سر اندازی بہادروں کا شیوہ نہیں ہوتا ہمیں وقت کے سب سے بڑے اس فتنے کے خلاف محاذ آرا ہونا چاہیے اور ابھی ہونا ہے۔ اپنے بچوں کو دین سے آگاہ کرنا ہے دین کی تعلیم دینی ہے۔ ہر شہر ہر قریہ، ہر محلہ اور ہر گھر میں۔"

سیّد حامد

چاندی ہی چاندی

خوشہ چیں

خوشہ چیں: کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ شگفتگی غائب ہے جو تم سے منسوب کیا کرتا تھا۔ جب دیکھو منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟

جریا: بھائی صاحب! کیا بتاؤں، آپ ہی سوچیے انسان ہوا کھا کر تو جی نہیں سکتا۔ میں یہاں ایک نوکری کر رہا تھا۔ وہ صاحب چھٹی ختم کرکے لوٹ آئے۔ میری نوکری بھی ختم ہو گئی۔

خوشہ چیں: کوئی اور نوکری ڈھونڈ کیوں نہیں لیتے؟

جریا: جی ہاں نوکریاں پیڑوں پر لگتی ہیں۔ جب جی چاہے توڑ لیجیے۔ کن ہی مفروضوں کی جنت میں رہتے ہیں آپ۔ اول تو بے روزگاری ہر طرف پھیلی ہوئی ہے؛ دوسرے، اندھے ریوڑیوں کی جگہ نوکریاں بانٹتے ہیں تو بھی اپنوں ہی کو دیتے ہیں بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے، پھر برادری پھر مذہب، اس کے بعد جان پہچان اور دوستی اور ان سب کے ساتھ ساتھ اور ان سب سے بالاتر وہ روپیہ جسے حلِ مشکلات کہتے ہیں جس کی بڑی خوبی طرزِ مساوات ہے کہ وہ اپنے پرائے اور رنگ و نسل میں امتیاز نہیں کرتا۔

خوشہ چیں: کہتے تو ٹھیک ہو بھیا۔ ان کے پاس زیادہ روپیہ نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کے بہت سے کام اس دیس میں روپیہ کے ذریعے نکل آتے ہیں ورنہ کون سنتا۔ دفاتر کی موٹی مسلوں پر روپیہ دیے بغیر کام ہی نہیں نکلتا گاڑی ہی نہیں چلتی۔ ماسکو میں دیکھا تھا کہ ٹیوب کے کسی اسٹیشن میں داخل ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مشین کے سوراخ میں ایک روبل ڈال دیجیے اور جب چاہے تو گاڑی میں دن بھر سفر کرتے رہیے۔

جریا: جی ہاں، ہندستان میں چونکہ مشین کا چلن اس حد تک نہیں ہوا ہے۔ اس لیے یہاں سکۂ رائج الوقت ہاتھ میں ڈالا جاتا ہے اور کام رواں ہو جاتا ہے لیکن ایک سکے سے یہاں کام نہیں چلتا۔ مزاروں اور مندروں کی طرح ہر چند قدم کے بعد نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔

خوشہ چیں: کہیں کچھ روپیہ دینا پڑتا ہے تو اس میں متفکر ہونے کی کیا بات ہے۔ ہماری اقتصادی خوش حالی کے باوجود ہمارے سکے کی قیمت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ ہمارے پاس روبل ہوتا تو کثرتِ سوال سے ہم بھی محفوظ رہتے۔

جویا: انھیں تو غلط انداز میں گھسیٹا گیا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ رعونت صاحب ہی کے لیے بیکار ہے۔ بھلا اسلام الدین کے لیے دعوت تو دیکھتے ہیں انھیں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔

خوشہ چیں: یہ بھی تذکرہ میں آگیا تو بدل گئے۔ جیب میں پہنچ جاتا تو خدا ہی نظر آتے۔

جویا: بھائی صاحب خدا نہ کرے کہ کسی کے بُرے دن آئیں۔ اب آپ بھی میری مفلسی کا مذاق اڑانے لگے؟

خوشہ چیں۔ ماشاء وکلّا۔ میں اور تمہارا مذاق اُڑاؤں ہاں، تھا ضرور مذاق۔ تم پڑھے لکھے کو دار آدمی۔ ہاتھ پیر کے جڑ سے درست پھر بھی بے روزگاری اور تنگ دستی کی شکایت کر رہے ہو۔

جویا: تو آپ ہی ملازمت دلوا دیجیے۔

خوشہ چیں: ملازمت میں رکھا کیا ہے۔ پہلے رعب داب تھا۔ وہ کبھی کا ختم ہو گیا۔ سرکاری ملازم صوفی کا تختہ ہو گیا ہے کہ صبح سے شام تک اس پر چوٹ پڑتی رہتی ہے اور پھر بندھی ٹکی تنخواہ۔ البتہ بالائی آمدنی کی اب کوئی کمی نہیں۔ لیکن آپ جو صوفی بنے بیٹھے ہیں خدمت کریں گے لیکن حق خدمت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ کیسا تضاد ہے آپ کے رویے میں۔

جویا: مجھے طعنے دے رہے ہو بھائی! پیسے کے معاملے میں تم خود مجھ سے زیادہ کمزور اور بے لچک ہو۔

خوشہ چیں: یاوہ گوئی سے کیا فائدہ، کام کی بات کرو یا سنو۔ میں جو راستے بتاؤں اس پر چلو، تو ہاتھ میں چاندی ہے۔ پانچوں انگلیاں گھی میں

چل نکلی۔

جویا: بتاؤ تو آخر وہ نسخہ کیا ہے؟

خوشہ چیں: ایک چھوٹا سا اخبار یا رسالہ نکال لو۔ افراد کو بلیک میل کرو ہر طرف سے ہن کی بارش ہوگی

جویا: خدا سے ڈرو بھائی صاحب! میں سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے ہمدردی کرو گے، مجھے راہ دکھاؤ گے، تم نے تو ایسا لگتا ہے، گمراہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ بلیک میل کیوں کروں، کس طرح کروں۔ میں تو ہدایت یہ ہے کہ اگر کسی میں برائیاں دیکھو تو ان کا ذکر کسی سے نہ کرو انھیں اپنے گہرے پیٹ میں چھپا لو، اپنے فراخ سینے میں دفن کر دو۔

خوشہ چیں: بہت خوب برائیوں اور کمزوریوں کو طشت از بام نہ کرو گے تو لوگ برائیاں پھر چھوڑیں گے کیسے؟ برائی کو بھی دنیا اچھالے گی اور نیک و بد اور خیر و شر کا امتیاز ہی مٹ جائے گا۔ میرا کہنا مانو کھرے کو کھرا کہو اور دل کھول کر کہو۔ لوگوں کی بد عملی کا بھانڈا پھوڑنا ہے کہ بیچ چوراہے کے بیچ پھوڑ دو۔ پھر دیکھو تمہاری صحافت کیا چمکتی ہے، تمہارے اخبار کی بکری آسمان کو نہیں تو چھت کو تو چھو ہی لے گی۔ لوگوں کو اپنے ہم جنس کی برائی اور پردہ دری سے بڑی لذت حاصل ہوتی ہے۔ زیرک اخبار نویس انسان کی اس فطری کمزوری کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جویا: مان لیا کہ میں نے یہ راہ اختیار کر لی تو خود میں کب تک بچا رہوں گا۔ آئینہ خانے میں

بڑھ کر دوسروں پر برتر ہونے کا انہماک دیکھنے والے بارہا دیکھا ہے جو اپنی عمل شخصیت کو فیکا چور کر کے ہی دیتا ہے۔ اس کا سکہ بھی منہدم ہو جاتا ہے آپ نے دیکھا نہیں۔ جو اخبار یا رسالے بلیک میل پر جیتے ہیں وہ چھچھورے کہلاتے ہیں۔ لوگ انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بلیک میل کا یہ کاروبار زیادہ دن چل نہیں پاتا اور جو لوگ اس کاروبار کو پیشہ بناتے ہیں، انھیں لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔

خوش چیں: شاید ابھی فاقہ کی نوبت نہیں آئی۔ بھوک کی آواز پر کان لگا رہے ہو۔ ہمت سے کام لینا ہر کس و ناکس کے اختیار میں نہیں ہے۔ تمہیں اسلاف کی اقدار اور اپنے وقار کی آہنی بیڑی بن کر آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔

جمیا: کچھ بھی سمجھو۔ لیکن پہلے میری اس بات کا جواب تو دیتے چلو کہ لوگوں کی ذاتی برائیوں کی کھوج لگانا چھچھور اور کمینہ پن کا کام ہے۔ مجھے اپنی سطح سے گر کے ان لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پڑے گا جو ناپ دان کے کیڑے ہیں۔ بھلے مانس اور صاف ستھرے اور برسر روزگار لوگ دوسروں کے آنگن میں کیوں جھانکنے لگے۔ اور پھر اگر ان لوگوں کی برائیاں، جو معروف ہیں اور جو عوام کی نگاہ میں رہتے ہیں، نہ معلوم ہو پائیں یا انکشافات کے درمیان وقفہ ہو گیا تو میں تو فاقے سے مر جاؤں گا اگر اس سے پہلے شرم سے نہیں مرا۔

خوش چیں: پھر وہی جھجک، پھر وہی سنکوچ جو لوگ اس پیشے میں قدم رکھتے ہیں وہ ضمیر کو بیچ کر زادِ راہ لیتے ہیں جنھیں اخلاقیات اور اقدار سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ان کا مقصود اور معبود صرف زر ہوتا ہے۔ لیکن تم نے ایک بار اگر اس کوچے میں قدم رکھ دیا تو ایک بات کی ضمانت میں لیتا ہوں۔ ذلیل و خوار رہو گے لیکن بھوکے کبھی نہیں مروگے۔ تمہارا ذہن اس راہ پر ابھی چل نہیں رہا؛ کسی کہنہ مشق سے مشورہ کرتے تو وہ تمہیں بتا دیتا کہ یہ ضروری نہیں کہ جن برائیوں اور کمزوریوں کی پردہ دری تم کرنے چلے ہو وہ واقعی تمہارے ہدف کے اندر ہوں۔ تخیل کو مہمیز دو اور ایسی برائیاں اس کے ساتھ منسوب کر دو جو اس کے عام حالات اور دنیا کی حالیہ روش کی روشنی میں اس کے بارے میں قیاس کی جا سکتی ہیں۔ مانتا ہوں کہ یہ برائیاں اس میں نہیں ہیں لیکن اگر وہ صاحب اقتدار ہے یا عزت اور شہرت رکھتا ہے تو اس کے کچھ کھلے ہوئے دشمن اور بہت سے ڈھکے چھپے بدخواہ ہوں گے۔ وہ اس اخبار کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے جس میں اس پر الزامات لگائے گئے ہیں اور اخبار نویس کی قوت افتراء اور صلاحیت افترا کو دل کھول کر داد دیں گے۔ روپیے کی ریل پیل ہوگی

جمیا: آپ کو کیا ہو گیا ہے آج سے پہلے تو آپ نے مجھے غیبت کا درس دیا اور اب سبق بتان کا پڑھا رہے ہیں۔ اگر اصول سے تھوڑی دیر کے لیے انحراف کر بھی لیا اور عافیت اور مصلحت کو معیار بنا لیجیے تو بھی دوسری تجویز اس سے زیادہ پرخطر ہے۔ الزام اگر

[illegible] برداشت کر لینا ہے
خریدیں کہ خوشی کی بات ہے، کتے کا منہ
لقمے سے بھر دینا بہتر ہے۔ لیکن اگر الزام کا
دھبہ صرف اخبار نویس کے ذمہ ہے تو
اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے جن لوگوں
پر اس نے حملے کیے ہیں وہ کتنے ہی ٹھنڈے
مزاج کے کیوں نہ ہوں اس کی جان کے دشمن
بن جائیں گے۔ ان سے بچ کر وہ دریدہ قلم
جائے گا کہاں۔

خوشہ چین: ہاں یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو ضمیر
کے اطمینان اور قلم کی آبرو کو بیچنا ہے تو کسی
زرِ خطیر کے لیے تو بیچا جائے اور ہر خطرے سے
دور رہا جائے۔ ایک گراں قدر شے کو
بیچیے احساسات کی نیند میں اپنے اوپر حرام کر لیجیے
یہ تو والی لٹنے کا سودا ہے۔ خدا تو ہاتھوں
سے گیا ہی صنم کے وصال سے بھی محروم رہ گئے۔
لیکن اگر خطرہ ہی سد راہ ہے تو اس کا بھی اہتمام
ہو سکتا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر کام بنتا نہیں
تم نے دیکھا ہوگا کہ آج کل صنعت و حرفت
میں وہی لوگ پھولتے پھلتے ہیں جو اپنی قلیل
پونجی کو یکسر فراموش کر کے ایسا پروجیکٹ
بناتے ہیں جس میں کروڑوں روپیہ درکار
ہوتا ہے۔ ان کی اس عالی ظرفی اور بلند
پروازی کا انعام انھیں ضرور ملتا ہے۔ جوگیا
تم بھی ایسا کام کرو جو بڑے پیمانے پر ہو اور
جس میں خطرے کا شائبہ بھی نہ ہو، اور جس سے
کسی کے دل کو جراحت بھی نہ پہنچے۔

جوگیا: (بے تابی کے ساتھ) بتایئے وہ صاف ستھرا
کام کون سا ہے؟

خوشہ چین: تم ابھی تک قیاس ہی نہیں کر سکے۔ بجائے کسی
فرد کو ملامت اور اتہام کا نشانہ بنانے کے
الزام ساری ملت کے سر پر تھوپ دو۔
مسلمانوں میں سے کوئی فرد جسے ملت کی
فکر ہو یا جو ملت پر الزام سہ نہ سکے تو تلملا اٹھے
اگر کوئی ہے بھی تو گوشۂ عافیت میں پڑا
ہوا ہے۔ یہاں صرف الزام تراشی سے
کام نہیں چلے گا۔ الزام لگانے تو پڑیں گے
لیکن ملت کو نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ
کام کرنا پڑے گا کہ کسی اصلی یا مفروضہ
واقعہ یا حادثہ کو لے کر ملت کے جذبات
کو جتنا بھڑکا سکتے ہو بھڑکاؤ۔ اختراع،
افترا، دروغ، نیم دروغ، الزام اور غلو
اور افواہ میں بڑی طاقت ہے۔ یہ ملت
ہمیشہ سے جذباتی ہے۔ اس کو اکسانا،
ورغلانا، اشتعال دلانا، اسے گھروں سے
نکال کر بازار میں لے آنا آسان کام ہے
اسے کسی چھوٹے اور غیر اہم مسئلہ پر ایک
طرف اکثریت اور دوسری طرف انتظامیہ
سے ٹکرا دو۔ اور اس کے بعد اس پر جو
مظالم ہوتے ہیں، اس کی جو گت بنتی ہے
اسے شاہ سرخیاں دے کر، اسے سنسنی
کا پیرہن پہنا کر مزید اشتعال کا باعث
بنا دو۔ اس ملت کے جو گیا تو ان پڑھ
ہے یا نیم خواندہ ہے طیش دلا دینا اور سولی
پر چڑھا دینا اہلِ ہنر اور خود غرض اخبار
نویسوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ طیش
دلانے کی ہر منزل اور ظلم و ستم پر فریاد
کے ہر موڑ پر اشتعال دلانے والے

[illegible] ... والے
اخبار نویس کی چاندی ہی چاندی ہے۔ اس
کا اخبار ہر کوڑی دہ بازار میں بکنے لگے گا۔
اس کی تو بارہ ہوگی۔ یہی نہیں ساری ملت
اسے ملت کے غم خوار اور ہمدرد کی حیثیت
سے پہچانے گی، اس کی احسان مند ہوگی؛
اور ان اخبار نویسوں کو بزدل اور ایمان باختہ
سمجھنے لگے گی جنھوں نے نہ مسلمانوں کی غیرت
سے اپیل کی، نہ انھیں انتقام پر اکسایا، نہ
انھیں ٹکراؤ کی تلقین کی، نہ انھیں مرنے
مارنے کا درس دیا۔ ایسے ماحول میں
کوئی بات سنجیدگی، توازن، اعتدال
ضبط اور ہوش مندی سے زیادہ ملت
کو نہیں کھٹکتی۔

اشتعال پرداز اور مبالغہ آرا اور
فتنہ انگیز صحافی ملت کو ہی نہیں، ارباب
اختیار کو بھی شرمندۂ احسان کر بیٹھتا ہے
اسے اپنے قلم کی طاقت کی قیمت ہر طرف
سے ملنے لگتی ہے۔ کہیں خریداری کے چندے
کی شکل میں، کہیں بھیس بدل بدل کر۔ اور جو
آؤ بھگت اور سمان اس کا ہوتا ہے اس کا
تو ذکر ہی کیا، سماج کے اونچے طبقے اس کی
جولانگاہ ہوتے ہیں۔ ملت کے بارے میں اس
کی رائے مانگی جاتی ہے اور احترام سے قبول کی
جاتی ہے اور بڑے بڑے سورما اس کے ساتھ
ہنستے بستے دیکھے جاتے ہیں۔ سفر میں اسے ان
لوگوں کی رفاقت نصیب ہوتی ہے جن کے در تک
بڑے بڑوں کی رسائی نہیں ہوتی۔
تمہیں سوجھ بوجھ جویا اگر دولت عزت، شہرت

اور طاقت اس طرح دامن بھر کے حاصل
ہو جائے تو کیا برا ہے؟

جویا: لیکن اس ملت کا کیا حشر ہوتا ہوگا جو
ایسے صحافیوں کو پیدا کرتی ہے، قبول کرتی ہے
انھیں دولت کے وسائل اور عزت کی جگہ دیتی
ہے۔ ان کو فاسد مادہ کی طرح اپنے بدن سے
نکال نہیں پھینکتی۔ جو ملت صالح پر طالح، اعلیٰ
پر ادنیٰ، افضل پر اسفل کو ترجیح دیتی ہے جو
اپنے جسم کو مسموم ہوتے دیکھتی ہے اور اف
نہیں کرتی جو اپنے اعضا کو کٹ کٹ کر گرتے
ہوئے دیکھتی ہے، پھر بھی اپنی صحت وعافیت
اور بقا کی طرف سے مطمئن رہتی ہے۔

خوشہ چیں: اس کا جواب سننا ہے تو بانیان
فساد سے سنو؛
"ملت جائے چولہے بھاڑ میں۔ ہم نے
کوئی ملت کی ضمانت لی ہے۔ ہم نے کوئی
ملت کا ادھار کھایا ہے۔ جب دیکھو ملت
ملت ملت، ملت نہ ہوئی وبال جان
ہو گئی جو جینے سے جینے بھی نہ دے گی، یہ
نامراد ملت۔"

جویا: استغفر اللہ" ہم بھوکے ہی جی لیں گے
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا باحسرت و یاس

دیوانہ بکار خویش ہشیار

مختار الدین احمد★

میں جب اکتوبر ۵۳ء میں آکسفورڈ پہنچا تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ علی گڑھ میں وہ میرے معاصر تھے آفتاب ہوسٹل میں رہتے تھے اور یہاں کے ذہین طلبا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ایم ایس سی کر کے ڈھاکا چلے گئے تھے اور وہاں یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہو گئے تھے۔ وہیں سے روڈس اسکالرشپ پر لئے ہوئے تھے اور سائنس میں ڈی فل کر رہے تھے۔ بڑے ہنس مکھ اور دلچسپ آدمی۔ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے اور ہمیشہ اپنے خیالات میں مستغرق۔ کالج کے پورٹر سے لے کر ان کے سپروائزر تک کسی کو صحیح اطلاع نہ تھی کہ حضرت رہتے کہاں ہیں اور اُن کے مشاغل کیا کیا ہیں۔

۱۷ر اکتوبر کے ہفتے عشرے کے بعد جب تنہائی بڑھی اور اپنے کو انگوں اور بہوؤں کی دنیا میں محصور پایا تو فطری طور پر ایک شناسا کی تلاش شروع ہوئی۔ ان کے بارے میں علم تھا کہ وہ یہاں موجود ہیں۔ ان کی جستجو میں پہلے بیلیل کالج گیا۔ پورٹر سے معلوم ہوا، کالج کی سکونت چھوڑ چکے ہیں اور اب ڈکس میں رہتے ہیں اسی سے پتہ لے کر اس جگہ پہنچا تو لینڈ لیڈی نے بتایا وہ کالج سے یہیں آئے تھے لیکن اب وہ یہ مکان چھوڑ کر چلے گئے ہیں تم فلاں جگہ جاؤ۔ اس نے ایک چٹ پر پتا لکھ کر دے دیا جہاں وہ اُن کے نام آئے ہوئے خطوط بھیجا کرتی تھی۔ وہاں بھی کچھ ایسا ہی جواب ملا۔ جہاں بھی گیا یہی معلوم ہوا کہ وہ یہاں پہلے رہتے ضرور تھے لیکن اب وہ دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ سہ پہر شام کے سات بج گئے۔ کالے گاؤن میں ملبوس ایک لمبا مفلر گلے میں ڈالے ہوئے ایک انڈر گریجویٹ ملے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اس مضمون کا فلاں جگہ معمل ہے وہاں پتا لگ جائے گا۔ وہاں پہنچا تو خوش خبری سنی وہ یہاں آئے تھے ضرور ان کا بریف کیس اور دستانے یہیں رکھے ہوئے ہیں۔ ڈنر لینے گئے ہوں گے۔ ایک رقعہ لکھ کر چھوڑ آیا۔ احتیاطاً نو بجے وہاں ٹیلی فون کیا۔ اس وقت تک واپس نہیں آئے تھے۔ معلوم نہیں کس زمین دوز خفیہ سیاسی پارٹی سے متعلق ہو گئے تھے۔

ہفتوں کے بعد اچانک وائی ایم سی اے میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ دیکھ کر خوش ہوئے لیکن اس طرح ملے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میں نے خود چھیڑا

★ سابق صدر شعبۂ عربی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

تو بولے، اس رات دس بجے اپنے محل واپس آیا دیر ہو چکی تھی اس لیے آپ کے پاس نہ آیا اور آپ نے جس لینڈ لیڈی کا پتا لکھا تھا وہ تو بڑی خوفناک بڑھیا ہے میں تو دو دن میں اس کے پاس سے چلا آیا آپ وہاں کس طرح ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کہیے تو کہیں آپ کا انتظام کر دوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ بتلایے آپ میرے کالج کیوں نہیں آگئے۔ بولے کاموں میں ایسا مصروف ہوا کہ بالکل بھول گیا۔ وہ کہیں لنچ کے لیے پر تول رہے تھے۔ میں نے سوچا اب کی یہ چھپنے تو ہاتھ سے گئے برٹش کونسل میں اس زمانے میں لنچ اور چائے کا انتظام ہوتا تھا۔ میں نے فوراً انھیں مدعو کر لیا۔ میں لنچ میں انھیں بڑے چاؤ سے کھلاتا رہا اور وہ خشوع و خضوع سے کھاتے رہے اور بڑی دل جمعی سے علی گڑھ ڈھاکا اور آکسفرڈ کا ذکر کرتے رہے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ جب آخر میں کافی کا دور چلا تو ہم دونوں پھر علی گڑھ پہنچ چکے تھے تقسیم ہند سے پہلے کے علی گڑھ میں۔

لوگ ان پر رشک کرتے تھے کہ انھیں روڈس اسکالرشپ ملی ہوئی ہے۔ اسکالرشپ ان پر نازاں تھی کہ اسے ایسا ذہین، محنتی اور فرض شناس اسکالر ملا تھا۔ لکھنا پڑھنا ان کی زندگی کا مقصد تھا اور یہی اس کا حاصل۔ انھوں نے ریسرچ عبادت کی طرح کی۔ زندگی کے دوسرے معاملات سے ہمیشہ بے پروا رہے۔ اپنے کپڑے وہاں کسی درزی سے نہیں سلواتے تھے۔ کہتے تھے یہ لوٹ لیتے ہیں۔ آکسفرڈ میں کارفیکس کے چوراہے کے قریب ایک دکان تھی جس میں سلے سلائے کپڑے سستے مل جاتے تھے۔ اس کا نام "ففٹی شلنگ" تھا۔ وہیں سے وہ ایسے رنگ کے کپڑے خرید لاتے تھے جو ان کے بدن پر ٹھیک ہو کر بھی ڈھیلے معلوم نہ ہوتے تھے۔ یہ ان کا حسن ظن تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ بغیر پہنے ہوئے بھی وہ بہت میلے اور گندے معلوم ہوتے تھے۔ ہاں قمیص میں البتہ کچھ رعایت ضرور مل جاتی تھی۔ "گلیم بعلت و ازار حکمت" کی فارسی مثل ان کے کپڑوں کو دیکھ کر سمجھ میں آئی۔ ان کی پتلون پر کریز کبھی نہیں دیکھی۔ کیا دیکھتا جب وہی دن کے کپڑے پہن کر وہ رات کو بستر میں چلے جاتے تھے۔

کھانا وہ ایسے طعام خانوں میں کھاتے تھے جن پر دور سے تہ خانوں اور قدیم سراؤں کا دھوکا ہوتا تھا۔ ایک بار کئی ماہ بعد اچانک مل گئے۔ کوئی تجربہ کامیاب ہو گیا تھا، بہت خوش تھے اور بہت اچھے موڈ میں۔ چھوٹتے ہی انھوں نے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دے دی۔ ان کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا۔ چلتے چلتے ہم میگڈلین چرچ کے پاس ایک ایسی عمارت کے سامنے رک گئے جس سے میں واقف نہ تھا اور جہاں حد نظر تک کسی ریستوراں کا پتا تک نہ تھا۔ میں نے انھیں حیرت سے دیکھا تو بولے۔ سامنے کا دروازہ کھول کر نیچے اتریے۔ سپر سینما کے پاس ایک نانبائی کی دوکان تھی۔ انھوں نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا اور وہ ایک لامعلوم اور نسبتاً تاریک گوشے کی طرف بڑھے اور پھر کٹا کٹ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ایک تہ خانے میں آ گئے۔ متوسط طول و عرض کا ایک ہال ملا جس میں کچھ لوگ بیٹھے اور زیادہ تر کھڑے اکل و شرب میں مصروف تھے۔ میں اس عجیب و غریب کیفے ٹیریا سے مطلق واقف نہ تھا۔ Q میں کھڑے ہو کر انھوں نے میرے لیے ٹرے میں ایک کافی کی پیالی رکھی اور اپنے لیے بیل کی دم کا شوربا

[illegible] الیاس صاحب کا ایک گلاس ہے۔ میں نے کہا خیر، ٹوسے گیارہ بج چکے ہیں اب لنچ کا وقت کہاں ملے گا۔ سوچا یہ قصہ بھی چلتا ہی چلے۔ چنانچہ وہ وقت جانے سے پہلے اس دوران میں اپنی لینڈ لیڈی (مالکۂ مکان) کے قصے سناتے رہے، کچھ گفتنی کچھ ناگفتنی۔

میرے کرم فرما اور علی گڑھ میں ایک زمانے میں میرے وارڈن، لندن سے اپنی ریسرچ کے سلسلے میں آکسفورڈ آئے ہوئے تھے اور میرے ساتھ ہی قیام پذیر تھے۔ ایک شام میں انھیں ان سے ملانے لے گیا۔ وہ اس زمانے میں وڈ اسٹاک روڈ پر رہا کرتے تھے۔ کئی منزلیں طے کر کے ان کے کمرے تک پہنچے۔ دروازے پر دستک دی۔ خاموشی رہی۔ پھر دستک دی، صدائے برنخاست۔ لینڈ لیڈی نے کہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں موجود ہیں۔ خاموشی پر حیرت ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوا جیسے شیکسپیر کا کوئی کردار مونو لوگ میں مشغول ہو۔ خود ہی دروازہ کھول کر ہم دونوں داخل ہوئے تو عالم ہی دوسرا نظر آیا۔ کمرے کی ہر چیز بے ترتیب۔ فلیٹ میٹ، باسی روٹیوں کی آغوش میں۔ کافی، جام کے ڈبوں اور دودھ کی بوتلوں سے شاخ پیچاں کی طرح پیوست 'بیلٹیو' پر کتابوں اور اخبار و رسالوں کا انبار، کمرہ کاغذات سے بھرا ہوا، بستر بے ترتیب، خط بڑھائے ہوئے، ڈریسنگ گاؤن پہنے، ایک ہاتھ جیب میں دوسرے میں ایک کتاب لیے ہوئے، کمرے میں چہل قدمی کر رہے تھے اور بآواز بلند کچھ پڑھ رہے تھے۔ معلوم ہوا تحقیقی مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر چکے ہیں اور زبانی امتحان (وائیوا) کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

انھوں نے کئی بار معذرت کی کہ افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کو کافی نہیں پلا سکتا۔ کافی کا ڈبہ ختم ہو گیا ہے اور اتوار کی وجہ سے دکانیں بند ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے میں متعدد قومی اور بین الاقوامی مسائل پر گفتگو ہوئی لیکن سرسری سی۔ پھر [illegible] بالخصوص علی گڑھ کا ذکر چلا اور خوب بھرپور۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ علی گڑھ کے تین [illegible] ایک جگہ وقتی طور پر بھی جمع ہو جائیں اور علی گڑھ کا ذکر نہ آئے۔ بہت باتیں ہوئیں اور خوب خوب غیبتیں بھی ہوئیں۔ اس لیے کہ یہ ہمارا ملی شعار ہے اور وقت گزاری کا بہترین مشغلہ۔

وہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ انگلستان میں میرے دوران قیام علی گڑھ کے تعلیم یافتہ خاصے اصحاب جمع تھے جو مختلف جامعات میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لندن میں شہاب الدین محمد مثنی، انور انصاری (نفسیات)، حفیظ زیدی (فلسفہ)، غزالہ انصاری مسز جمیلہ مجیب (تعلیمات)، محمد شفیع (جغرافیہ)، ابوالاعزاز ضیاء الحسن (انجینئرنگ)، ابوصالح، عبدالمجیب، سائرہ عرفان (اقتصادیات)، سید ظہور قاسم، شاہ مشہود عالم، سید عبدالعزیز (حیوانیات)، قمر الحسن فاروقی (تجارت)، اڈنبرا یونیورسٹی میں سید رضا حسین زیدی (جو ہر وقت سگار پیتے رہنے کی وجہ سے سگار زیدی کے نام سے مشہور تھے)، کیمبرج میں ریاض الاسلام (تاریخ)، آکسفورڈ میں احمد شفیق (حیوانیات)، عرفان محمد حبیب (تاریخ) اور سید متین الزماں (سیاسیات) اور راقم الحروف (عربی و اسلامیات)۔ خورشید الاسلام بھی اس زمانے میں لندن میں مقیم تھے لیکن طالب علم کی حیثیت سے نہیں۔ وہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو کے استاد تھے۔ ان علیگ حضرات میں

بہ وقت (اینڈیسے) ہر طرف سے چلتے ملتے، دونوں کی بزم منعقد کرنے والے پارٹیوں میں شریک ہونے والے، کچھ سنجیدہ اور متوازن، کچھ بڑے مجلسی اور لپ باز۔

آکسفرڈ میں اس دن جب ہم تینوں علی گڑھ کی باتیں کرکے تھک گئے تو دوپہر کا وقت ہو گیا اور بھوک چمک اٹھی۔ انھوں نے ہم دونوں کو لنچ کی دعوت دی جو معمول سے رسمی انکار کے بعد فوراً قبول کرلی گئی۔ ایک لمبی دوڑ کے بعد جس میں بھوک اور زیادہ جاگ اٹھی، ہم لوگ ہائی اسٹریٹ پہنچے۔ دیر تک وہ ریستورانوں کے دروازوں اور دیواروں پر فریم کی ہوئی فہرست طعام (مینو) پڑھتے رہے۔ کہیں بیل کی دُم کا شوربا نہ تھا۔ تو کہیں سانپ کے چھاتے کا سوپ موجود نہ تھا۔ کہیں یارک شائر کی پڈنگ غائب تھی تو کسی ریستوران کا "ایٹ موسفیر" انھیں پسند نہ تھا۔ اچھی خاصی ریاضت اور وقت صرف کرنے کے بعد قرعۂ فال 'کونٹی نینٹل ریستوران' کے نام پڑا۔ اس کی زیارت کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن ایک کمرے کے جوکر کو کورنیکس کے چوراہے پر ایک قدآدم کا ڈبہ لیے اکثر چلتے پھرتے دیکھ چکا تھا جس پر جلی قلم سے لکھا ہوتا تھا:

Polite and friendly service
25% reduction for under-graduates. Lunch for 1/6

لنچ کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں لیکن یہاں اس قدر لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ جب کھانے کے بعد بل چکانے کا وقت آیا تو انھوں نے ڈسکور کیا کہ بٹوا تو اُن کے کمرے ہی میں چھوٹ گیا ہے۔

پتا نہیں کہ وہ کون سرگزشتۂ خمار رسوم و قیود تھے جنھوں نے ایک بار انھیں آکسفرڈ مجلس کا ٹریژرر

[illegible] مجلس کا کیا رکھتے، بلکہ پلیٹ فارم کو چندے کے لئے اراکین کو یہ علم نہ ہو سکا کہ مجلس کے کتنے پونڈ اُن دوستوں اور کنفیوزڈ ممبروں کو ادھار دیے جا چکے ہیں یا دوستوں کی کلاس کی فیس چلا دی ہے اور کتنی ان کی جیب سے فاضل نکل کر مجلس کے جلسوں اور الیکشن ایونٹس میں آئے ہوئے لندنی فنکار کی نذر ہو گئی ہے۔

تھیٹر اور اوپیرا کا کیا ذکر، عام جلسوں میں بھی وہ شاید ہی کبھی جاتے ہوں۔ کبھی میں نے انھیں آکسفرڈ مجلس، انجمنوں میں سے جانا بھی چاہا تو صاف مکر گئے لیکن اگر بار تیار بھی ہوئے تو آدھی راہ چل کر انھیں اچانک یاد آگیا کہ یا تو انھیں اپنے پروفیسر سے ملنا ہے یا کوئی کام انھوں نے معمل میں ایسا شروع کر رکھا ہے کہ اگر وقت پر جاکر سوئچ آف نہیں کرتے تو اُن کا کیا ہوا پوری لیباریٹری دھماکے کی نذر ہو جائے گی۔

ان سے آخری ملاقات نیومین سوسائٹی میں ہوئی جو میرے کالج کے بالکل سامنے واقع تھی۔ میں سوسائٹی کے کیفے میں لنچ لے رہا تھا کہ وہ اچانک داخل ہوئے ہاتھ میں تین بنڈل لیے ٹیلی فون کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے دیکھتے ہی میرے پاس لپکے اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ موڈ ہمیشہ خراب نہ تھا بلکہ بے حد افروختہ بھی تھے۔ بار بار کہتے کہ میں اسے مار ڈالوں گا۔ غنیمت یہ ہے کہ وہ گفتگو اردو میں کر رہے تھے ورنہ کیا عجب کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سادہ لباس لوگ ہم دونوں کے پیچھے لگ جاتے۔ بہت گرم ہو رہے تھے۔ میں نے بمشکل انھیں کولڈ ڈرنک کرا کے کچھ ٹھنڈا کیا۔ معلوم ہوا لینڈ لیڈی سے سخت جھگڑا ہو گیا ہے اور اس ظالم نے انھیں ایک ہفتہ میں کمرہ خالی کر دینے کا نوٹس دے دیا ہے۔ بہت کچھ تو وہ اسے سنا آئے

ہیں ایسا لگتا ہے کہ اب دیکھ کر انھیں یاد آتی ہیں بند یہ محلی فون اس کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔ اسی زمانے میں محلی فون کی ایک کال پر تیس پیسے خرچ ہوتے تھے۔ میں نے یہ سکے ان کے ہاتھ سے لے کر اپنے پاس رکھ لیے۔ انھیں باتوں میں لگایا اور انھیں پھر کتا ملے ان کے خیال کے مطابق بات کچھ اہم نہ تھی۔ ہوا صرف یہ تھا کہ انھوں نے غسل خانے جا کر نہانے کی غرض سے گرم پانی کا نل کھول دیا تھا کہ ٹب بھر جائے۔ ابھی کپڑے اتارنے نہیں پائے تھے کہ نل کھلا دیکھ کر انھیں یاد آیا کہ ممل میں (جو قریب ہی واقع تھا) گیس کھلی رہ گئی ہے وہ لرزاں ترساں اپنے ممل پہنچے۔ وہاں گیس کی نالی بند دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا۔ ممکن ہے کوئی دوسرا ریسرچ اسکالر بند کر گیا ہو۔ یا واقعۃً انھوں نے گیس کھولی ہی نہ ہو اور یہ سب ان کے واہمے کا کرشمہ ہو۔

بہرحال دوڑتے بھاگتے جب وہ اپنے ڈگس پہنچے تو دروازہ کھولتے ہی انھیں عجب نقشہ دکھائی دیا۔ ہال، گیلری اور کمرے کا سارا سامان پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ قالین اور فرش سب اٹھا دیے گئے تھے اور ان کی لینڈ لیڈی سخت بیزاری اور بدحواسی کی حالت میں ادھر ادھر پھر رہی تھی اور دروازے اور سامان پٹک رہی تھی۔ اور برابر پولش لہجے میں انگریزی بڑبڑا رہی تھی۔

میں نے پوچھا آخر یہ سب ہوا کس طرح۔ بولے مجھے کیا معلوم۔ لینڈ لیڈی کہتی ہے کہ جب وہ گروسری کی دکان سے، جو قریب ہی تھی، واپس آئی تو دروازہ کھولتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے گھر میں سیلاب آ گیا ہو۔ ہوا یہ کہ پہلے ٹب بھرا (ٹب کہنہ اور از کار رفتہ تھا) پھر فاضل پانی چھلک چھلک کر غسل خانے کے فرش پر گرا۔ پھر باہر پھیلا کہ دالان تک پانی ہی پانی تھا۔

کہنے لگے احمد صاحب اب آپ ہی بتائیے اس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں تو چند لمحوں کے لیے باہر گیس بند کرنے چلا گیا تھا۔ سوچا جتنی دیر میں ٹب بھرے گا، اتنی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔ میں چپ چاپ اور خاموشی سے انھیں دیکھتا رہا تو بولے۔ اب میں کہاں تک یاد رکھوں کہاں کون سا نل کھلا ہے اور کہاں کون سی گیس کھلی رہ گئی ہے۔ یہ کہہ کر وہ بڑی بے چارگی اور معصومیت سے مسکرائے۔

یہ احمد شفیق تھے علی گڑھ اور آکسفورڈ میں میرے معاصر۔ یہاں وہ آفتاب ہوسٹل میں رہتے تھے جہاں بہت اچھے اور ذہین طالب علموں کو جگہ ملتی تھی۔ ۴۹ء میں انھوں نے حیوانیات میں ایم ایس سی کا امتحان دیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ بابر مرزا (متوفی ۱۹۷۶ء)، افضال حسین قادری عبدالبصیر خاں (م ۱۹۶۶ء) اور شاہ مشہود عالم (جو متقاعد ہونے کے بعد میڈیکل کالج روڈ پر "مشہود کدہ" میں فروکش ہیں) جیسے ممتاز اور شفیق اساتذہ کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ اسی سال وہ اپنے شعبہ میں لکچرر مقرر ہو گئے لیکن وہ وسیع تر دنیا کی تلاش میں پر تول رہے تھے انھوں نے سائنس میں ریسرچ کے لیے فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے واقفیت ضروری خیال کیا۔ چنانچہ انھوں نے کوشش کر کے قلیل عرصے میں خاصی دست گاہ پیدا کر لی۔ وہ ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) جا کر ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبۂ حیوانیات میں لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۵۲ء میں انھیں روڈس اسکالرشپ مل گئی اور وہ

[illegible] پروفیسر [illegible]
نامور سائنس داں اور رائل سوسائٹی کے فیلو تھے
ممتاز استاد کی نگرانی میں انھوں نے تحقیقاتی کام شروع
کیا۔ سنہ ... میں انھیں آکسفرڈ سے ڈاکٹریٹ
تفویض ہوئی۔ وہ انگلستان میں رہ کر مزید ریسرچ
کرنا چاہتے تھے لیکن ڈھاکا یونیورسٹی سے انھوں
نے واپس آکر وہاں پانچ سال تعلیم دینے کا معاہدہ
کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ ڈھاکا واپس چلے گئے۔ میعاد
پوری ہوتے ہی سنہ ۱۹۶۰ء میں فل برائٹ اسکالرشپ
پر وہ [illegible] واشنگٹن اسٹیٹ پہنچے۔ ایک
سال کے بعد نیویارک کے [illegible]
کے انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ فیلو مقرر ہو گئے۔ یہاں
دس سال مقیم رہ کر ۷۰-۱۹۷۱ء میں وہ [illegible] اسٹیٹ
یونیورسٹی نیویارک میں ایسوسی ایٹ پروفیسر مقرر ہو گئے
یہاں تک کی تو مجھے اطلاع ہے۔ اس بیس سال کے عرصے

میں [illegible]
بہت [illegible] ہو گئے تھے [illegible] سائنس [illegible]
میں انھوں نے فزکس [illegible]
کے مضامین یورپ اور امریکہ کے ممتاز جرنلوں میں شائع
ہوتے چلے گئے۔ سرسری انھوں نے امریکی شہریت اختیار
کر لی ہے۔ وہ اپنے مضمون کے امریکی سائنس دانوں میں
عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور کیا عجب علی گڑھ
کا یہ فرزند ایک دن امریکہ کے ممتاز سائنس دانوں
میں شمار ہونے لگے۔

میرے اس مضمون کا عنوان "دیوانہ بکار خویش ہشیار" رکھا ہے۔ علی گڑھ اور ہماری ملت کو ایسے ہی دیوانوں کی ضرورت ہے۔ اور اب موجودہ حالات میں، پہلے سے کہیں زیادہ۔

[یہ مضمون میں نے یورپ سے واپس آکر ۵۶ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیا تھا۔ اس زمانے میں ساغر نظامی مرحوم اردو سیکشن کے سربراہ تھے۔ انھوں نے لیڈر، اخبار نویس، طبیب، شاعر، پروفیسر وغیرہ پر نیم مزاحیہ تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ میری تقریر کا موضوع "اسکالر" تھا۔ ۴۵ سال کے بعد اس ہفتہ اتفاق سے اس تقریر کا مسودہ کاغذات میں مل گیا جو قارئین کی نذر ہے۔ تہذیب الاخلاق کی مناسبت سے اب آخری حصے کا میں نے اضافہ کر دیا ہے]

حسینی کردار: فکر و عمل کے بعض گوشے

قمرالہدیٰ فریدی ★

انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ دوست پر حملہ ہوتا ہے تو دوست سے دیکھا نہیں جاتا، بیٹے پر وار ہوتا ہے تو باپ سے سہا نہیں جاتا، بھائی پر تلوار چلتی ہے تو بھائی سے برداشت نہیں ہوتا، بھانجے پر نیزہ چلے تو ماموں اپنے آپ کو روک نہیں سکتا، بے اختیار سامنے آجاتا ہے لیکن رحمۃ للعالمین کے نواسۂ عالی وقار نے انسانی فطرت کے اس تقاضے کو بھی ایثار و قربانی کی زنجیر پہنا دی۔ احباب حقِ رفاقت ادا کرتے گئے، وہ دل تھامے بیٹھے رہے۔ ایک ایک کر کے اہلِ بیت شہید ہو گئے، سب کی لاشیں اپنے کاندھے پر اٹھا کر لاتے رہے۔

قتل ہونے والے تو ایک بار قتل ہو کر ملکِ عدم کو سدھارتے، حسین ہر بار قتل ہو ہو کر اسی کارزارِ حیات میں جیتے رہے۔ خنجر دوسروں کے جسم پر چلتا رہا زخم آپ کے سینے پر ابھرتا رہا۔ عزیز و اقارب کے گلے کٹتے رہے، کلیجا ابنِ حیدر کا چھلنی ہوتا چلا گیا، خون ہو کے جگر آنکھوں سے ٹپکتا رہا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ پلکوں کو بھی خبر نہ ہوئی، زخموں کی ٹیسیں نالہ بن کر ابھرتی رہیں مگر اس طرح کہ ہونٹ صدائے درد سے آشنا نہ ہو سکے۔

کربِ ذات کا وہ سانحہ جسے سیدہ کا لال ہنستے ہنستے جھیل گیا، دشمنوں نے سہا ہوتا تو سمجھتے درد کیا ہوتا ہے۔ صبر و رضا کس کا نام ہے، ایثار و قربانی کسے کہتے ہیں؟

ملت کے کام آنے کا سلیقہ کوئی حسین ابن علی سے سیکھے۔ ایک وہ لوگ ہیں جو اپنے منہ میاں مٹھو بن کر ہی خوش ہو لیتے ہیں بلکہ اس دنیا میں تو اوروں کے کارناموں کو اپنے نام سے منسوب کر کے اترانے والوں کی بھی کمی نہیں اور ایک حسین ہیں کہ راہِ خدا میں سب کچھ لٹا دینے کے باوجود فخر کی کوئی لکیر اُن کے چہرے کا حصہ نہ بن سکی۔

عزمِ حسین نے ہمیں بتا دیا کہ وہ کم ظرف ہوتے ہیں جو اپنے کارناموں کا اشتہار خود بانٹتے ہیں۔ ظرف والے تو راہِ وفا میں چلتے چلتے منزلِ دار تک پہنچ جاتے ہیں مگر پلٹ کر اتنا کہنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ دیکھو ہماری قربانی کتنی عظیم ہے۔ ملت کی کی آبرومندانہ زندگی کے حصول کے لیے ہم جان دے رہے ہیں، ہمارا شکریہ نہیں ادا کرو گے؟

سلام اُن پر کہ جنہوں نے نہایت

★ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

[illegible] کے ساتھ قربان گاہ پر ایثار و قربانی کا عظیم الشان مظاہرہ فرما کر ملت کی خدمت کا حق ادا کر دیا اور دشت نینوا کی بے انتہا مصیبتوں کو سہنے کے باوجود ثابت قدم رہ کے زمانے کو یہ ذہن دے دیا کہ ہمارا یہ اقدام خدا و رسول کی خوشنودی کے لیے ہے، ہم جان دے سکتے ہیں، ہاتھ نہیں دے سکتے۔ مخالفین کو توبہ کی تلقین کر سکتے ہیں لیکن ان کی بالادستی تسلیم نہیں کر سکتے۔ عظمتِ حسین کا یہ پہلو بھی ملاحظہ ہو —

اہل بیت اطہار کی شہادت کے بعد حضرت سیدنا امام گھر والوں سے رخصت ہو کر میدان جنگ میں تشریف لاتے ہیں اور یزیدی لشکر کو آخری بار تنبیہ فرماتے ہیں:

"نادانو! میرے قتل سے باز آؤ۔
خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرو
اب بھی وقت ہے، ہوش میں آ جاؤ!"

اگرچہ یہ بات یقین کی منزل تک پہنچ چکی ہے کہ مخالفین میں سے کوئی راہ راست پر آنے والا نہیں مگر چوں کہ معاملہ حق و باطل کا ہے۔ اس لیے حضرت امام اس عالم میں بھی ان لوگوں کو سمجھانے سے باز نہیں آتے بھلائی کی امید رکھنا پاک نفسوں کا شیوہ رہا ہے — رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی جان کے دشمنوں کو ہر آن ہدایت کی تھی۔ حسین بھی یہ فرض ادا کر دینا چاہتے ہیں۔ انھیں اپنی فکر نہیں دشمنوں کی عاقبت کی بربادی کا خیال ہے۔ اپنی فکر ہوتی تو وہ کربلا آتے ہی کیوں؟ منع کرنے والے تو مکہ میں ہی روک رہے تھے۔ موت کا خوف ہوتا تو ان کی درخواست کیوں ٹھکراتے؟ اور پھر میدان کارزار میں بھی تو گنجائش تھی لیکن انھوں نے ایک طرف تو بیعت سے انکار کر کے بتا دیا کہ ہم حق کے لیے مرنے سے نہیں ڈرتے، دوسری طرف یزیدیوں کو قبول حق کی دعوت دے کر یہ ثابت کر دیا کہ حسین اتنا دنیا والے ہے کہ آپ [illegible] قاتلوں کو بھی معاف کر سکتا ہے!

ذاتیات سے بلند ہو کر، خدا اور رسول، حق و انصاف اور امن و امان کے لیے جو جنگ لڑی جاتی ہے اس کا انداز یہی ہوا کرتا ہے۔

جناب حسین نے قدم قدم پر یہ تاثر دیا ہے کہ ہمیں جنگ سے نفرت ہے لیکن امن کے لیے اگر جنگ ضروری ہے تو پھر جنگ ہی سہی۔

حضرت امام نے مجبور ہو کر جام شہادت نوش نہیں فرمایا۔ وہ آخر وقت تک با اختیار رہے۔ فیصلہ ان ہی کو کرنا تھا اور انھوں نے ہی کیا۔ ان کی مصالحانہ کوشش اور پیش کش سے یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ اتمام حجت کے طور پر کہہ رہے ہیں۔ جان عزیز ہوتی تو بیعت کر لیتے پھر کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ چوں کہ آپ نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا عقل سلیم کا فیصلہ یہی ہوگا کہ حسین نے واقعات کے کسی موڑ پر حمایتِ حق سے منہ نہیں موڑا ہے البتہ انھوں نے جنگ سے گریز ضرور کیا ہے لیکن اس کا خیال رکھتے ہوئے کہ حق کی آواز مجروح نہ ہو۔ جب حق پر ضرب پڑنے کا اندیشہ ہوا تو آپ نے تلوار اٹھائی کہ نہیں؟ ایسا تو نہیں ہوا کہ ہتھیار ڈال دیے اور بیعت کر لی۔

دنیا کی تاریخ میں ایسی دو چار مثالیں بھی مشکل سے ملیں گی جب تنہا ایک شخص پوری فوج سے نبرد آزما رہا ہو اور وہ بھی کس شان سے —— جسم زخموں سے چور ہے، قدم ڈگمگا رہے ہیں لیکن تلوار کے قبضے پر گرفت برقرار ہے۔ گویا وہ ہمیں سبق دے رہے ہیں کہ اگر تم حق پر ہو تو جب تک جان میں جان رہے حوصلہ نہ کھونا، باطل کے آگے گھٹنے مت ٹیکنا، کیونکہ

عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔
محرم الحرام ۶۱ھ کی دسویں تاریخ گواہ ہے، حضرت سیدنا امام حسین اس وقت بھی بے جگری سے لڑ رہے تھے جب امیدوں کے سارے چراغ ایک ایک کر کے بجھ چکے تھے۔ یزیدی فوج کے ایک لشکری عبیداللہ ابن عمار کا بیان ہے کہ:

"خدا کی قسم! میں نے کسی شکستہ دل کو جس کا سارا خاندان اس کی نگاہوں کے سامنے قتل کر دیا گیا ہو، ایسی جرأت دلیری اور بے فکری سے لڑتے نہیں دیکھا۔ امام حسین کے حملے سے ان کے دائیں بائیں کے لوگ اس طرح بھاگتے تھے، جس طرح بھیڑیے کو دیکھ کر بکریاں بھاگتی ہیں۔"

(تاریخ طبری، جلد ۶۔ ص ۲۵۹)

بلاشبہ حضرت حسین نے میدانِ جنگ میں بے پناہ عزم اور بے مثل شجاعت کا مظاہرہ فرمایا لیکن انسان لاکھ صبر سے کام لے دل تو دکھتا ہے تابعین کے سینے میں بھی درد تو ہوتا ہوگا؟ عزیز و اقارب کی شہادت کا صدمہ تو ہوتا ہی ہوگا۔ کسی کے یہاں ایک میت ہو جاتی ہے تو سارا گھر ماتم کدہ بن جاتا ہے اور دشتِ کربلا میں تو حسینی گھر والوں پر گویا سارے جہاں کا غم ٹوٹ پڑا تھا۔ کسی کا سہاگ لٹا تھا، کسی کی امیدوں کا سفینہ اس کی نگاہوں کے سامنے ڈوبا تھا۔ ایک ایک دل پر ہزار ہزار زخم لگے تھے کس کے لیے؟ یہ سب کس کے لیے سہا تھا انھوں نے؟ ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے۔

محرم ہر سال آتا ہے۔ غمِ حسین میں آنسو بھی بہتے ہیں اور ذکرِ شہادتین کی مجلسیں بھی منعقد ہوتی ہیں لیکن کیا حق و باطل کی اس کہانی کو سننے کے بعد ہم نے حرص و ہوس سے توبہ کیا؟ بغض و کینہ سے دور رہنے کا فیصلہ کیا؟ ضد اور خود پرستی سے کنارہ کیا؟ اگر نہیں کیا ہے تو آئیے آج ہم عہد کریں کہ سوچیں گے تو ذاتیات سے بلند ہو کر اور بولیں گے تو حق و انصاف کے تقاضوں کا خیال رکھ کر۔ لوگ کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں، اسے چھوڑیے۔ یہ دیکھیے کہ ہم کیا ہیں اور ہمارا کردار کیا ہے۔ دنیا میں اکثر و بیشتر بہ ظاہر باطل قوتوں کا غلبہ رہا ہے لیکن حق پرستوں کے اطمینان کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ خدا و رسول کی خوشنودیاں اُن کے ساتھ ہیں۔ اگر ہم سچے محبِ حسین ہیں تو ہمیں اس حسینی پیغام پر عمل کرنا ہوگا۔

ہماری تدبیرِ منزل، یعنی انتظام خانہ داری ایسا ابتر و خراب ہے جس میں نہایت درجے کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

سرسید

مرض کی شناخت اور بے علاج

محمد اسحاق *

ہفت روزہ ندائے ملت" (لکھنؤ) ۷ / مارچ ۹۱ء کا سامنے ہے۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے رشحات قلم اکثر پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہوتے ہیں مندرجہ ذیل نوٹ پڑھ کر بہت دیر تک سوچ میں ڈوب گیا۔

" خدا معلوم اسلام کی وہ کونسی تعلیمات ہیں جس کے نتیجے میں اچھے بھلے انسانوں کو معذور اپاہج اور بے مصرف و بے توفیق بنانے کا جواز حاصل ہوگیا ہے۔ دین کے لیے طاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اسلام کے ابتدائی دور میں دونوں چیزوں کو عمومیت حاصل رہی.....

مسلمانوں کے پاس سب سے بڑا ایٹم بم کفر کا فتویٰ ہے۔ کسی مسلمان نے جدید علوم سیکھنے کی بات کی اس پر یہ ایٹم بم داغ دیا۔"

ڈاکٹر صاحب نے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بڑی گہری حقیقت کا اظہار کردیا ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں کہ آپ مرض کی شناخت کرلیں اور کوئی نسخہ کیمیا اس مرض سے نجات کے لیے تجویز نہ کریں۔ اس مرض کے آثار اب اتنے واضح ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی حکیم امت اس مرض سے شفا پانے اور نجات حاصل کرنے کے نسخے بھی بتلادے تو شاید بہت جلد اس افسردہ قوم میں پھر سے کچھ زندگی کے آثار پیدا ہوجائیں اور وقت کا شدید ترین تقاضا بھی یہی ہے۔

علامہ شبلیؒ نے دیار مغرب کی سیر کے بعد کسی جگہ کچھ اس طرح اس گہری حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ وہ کیا بات ہے کہ مغربی اقوام سارے عالم پر اپنی برتری قایم کیے ہوئے ہیں اور ساری دنیا میں عزت سے دیکھی جاتی ہیں۔ علامہ کا بیان ہے کہ ہمارے اسلامی مدارس سے جو طلبا نکلتے ہیں انھیں کچھ اس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ بہت ہی مسکین، شرمیلے، صابر و قناعت پسند اور دنیا سے کنارہ کش رہنے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کے برخلاف انگریز قوموں میں جدوجہد، اشیاء کی کھوج، سائنس اور علوم میں کمال حاصل کرنے

* ہیڈ ماسٹر، ایمبسی اسکول کف انڈیا، الجبیل، سعودی عرب

کا جذبہ، جدت پسندی اور مہم جوئی کا حوصلہ اور جوش بےحد پایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان قوموں نے سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ میں اتنا کمال حاصل کر لیا کہ ساری دوسری قومیں ان کی ایجادات اور کمالات پر نہ صرف حیران ہیں بلکہ ان کی سائنس اور علوم کی طاقت کے سامنے ساری دنیا زیر و زبر ہے کسی دانش ور کا یہ کہنا درست ہے کہ دراصل اسلامی طاقت کا زوال سترھویں صدی کے وسط سے انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد سے شروع ہوا۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں مذہب اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے علوم و فنون میں ترقی کا بڑا دخل ہے۔ پروفیسر مجیب نے "دنیا کی کہانی" میں یہ بات لکھی ہے کہ انگریز ویل کا کہنا ہے کہ بے شک مسلمانوں نے مغرب کو بہت سے علوم و فنون سے روشناس کرایا لیکن مسلمانوں نے مزدوروں کا سا کام کیا۔ وہ ان سارے علوم و فنون کا بوجھ سر پر لاد کر لائے اور یورپ میں منڈیوں میں اتار کر دور بیٹھ گئے۔ کوئی چھ سو برس سے اس قوم پر جمود طاری ہے۔ اس کی کوئی ایجاد ہے اور نہ کوئی کارنامہ کسی علم و سائنس میں دیکھنے یا سننے میں آیا۔ اب اس کے دریا میں نہ تلاطم ہے نہ طوفان۔

ان کے ذہن و فکر کی سمت زیادہ تر خانقاہی نظام زندگی کی طرف ہے۔ اپنے آپ کو سمیٹنے اور پیچھے رہ جانے پر زیادہ زور ہے۔ یہ زیادہ تر اب رحم و کرم کے طالب ہیں۔ یہ ذہن مسلمانوں میں برسہا برس میں تیار ہوا ہے۔ سنتے ہیں کہ جب نیا نیا لاؤڈ اسپیکر ایجاد ہوا تو اس کے مساجد میں استعمال کے خلاف فتوے دیے گئے۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید اپنی تقاریر میں کہتے تھے کہ یہ لایعنی بحث پانچ برس تک جاری رہی۔ جب کہ اس مدت میں روس نے اپنا ایک پانچ سالہ منصوبہ مکمل کر لیا۔

ایک اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلمان نوشتۂ دیوار پڑھنے سے بہت کتراتے ہیں۔ آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند رکھتے ہیں سب کچھ کانوں سے سنتے ہوئے بھی سننا نہیں چاہتے قریب قریب دنیا کے اکثر مسلم ملکوں کا یہ حال تھا کہ صدام حسین کی تائید میں زبان خشک نہیں ہوتی تھی وہ سالار اعظم دوسرا سلطان صلاح الدین ایوبی ہوگا جو امریکہ اور اسرائیل کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ جنگ ہرگز ہرگز نہیں ہوگی۔ اگر ہوگی تو دس برس جاری رہے گی اور تب تک امریکہ خاک میں مل جائے گا۔ جب یہ غبارہ ۴۲ دن کی جنگ کے بعد ہی پنکچر ہو کر شرمناک شکست سے دوچار ہو گیا تو سارے مسلمانوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں اب کوئی اس عنوان کا تذکرہ بھی نہیں کرتا اور ہر طرف خاموشی ہے۔ حقائق کی دنیا میں مسلمان جینا نہیں چاہتے وہ حد سے زیادہ بھولے پن کا ثبوت دیتے ہیں اور ہر بڑے واقعہ کا بہت سرسری تجزیہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ جس نے اپنی سخت ناعاقبت اندیشی، ضد اور عناد سے لاکھوں کے جان و مال کو برباد کیا، اپنے ملک اور اپنی قوم کو افسوسناک تباہی سے دوچار کر دیا اس کے خلاف کوئی چند جملے بھی سننے کے لیے تیار نہیں۔ یہی حال چھوٹے پیمانے پر حیدرآباد کے نادان لیڈر قاسم رضوی کا تھا۔

فسادات کا چکر ایک مستقل روگ بن گیا ہے۔ یہ فسادات کوئی اتفاقی حادثات نہیں بلکہ بہت سوچے سمجھے پلان کے تحت یہ فسادات کروائے جاتے

ہیں۔ اس کے لیے یہاں بچپن سے تیاریاں ہو رہی ہیں چھوٹے چھوٹے بچوں کے سینے میں نفرت کی آگ بھر دی جاتی ہے۔ یہی بچے اب بڑے ہو کر ہر شعبۂ زندگی اور ہر محکمہ میں موجود ہیں۔ ہر منزل پر مسلمان کو ان کی نفرت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ باتیں اب کھل کر ہر اسٹیج سے سننے میں آتی ہیں کہ مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا جو اسپین میں ہو چکا ہے۔ ان سب باتوں کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو ہماری تیاریاں صفر کے برابر ہیں۔

اکثر مسلمان تائیدِ غیبی کے منتظر ہیں۔ تائیدِ غیبی کے سب سے زیادہ مستحق مولائے کائنات حضور اکرمؐ تھے۔ آپؐ کو نہ تو جنگ بدر میں جانے کی ضرورت تھی نہ جنگ احد میں ۷۰ صحابہ شہید ہوتے اور نہ اس جنگ میں شکست اٹھانی پڑتی اور نہ جنگ خندق کی تیاریوں کے لیے مدینہ کے باہر خندقیں کھودنی پڑتیں۔ رسول اکرمؐ نے اپنی امت کے لیے زندگی کے ہر ہر پہلو کے لیے ایک زندہ نمونہ پیش کر دیا ہے۔ ورنہ کیا عجب تھا کہ آپ کفار و مشرکین کے لیے بددعا کر دیتے اور وہیں پر دشمن کا لشکر تباہ ہو جاتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ جنگ بدر میں فرشتوں کی مدد میدان جنگ میں آئی۔ جنگ سے پہلے مدد نہیں کی گئی۔ مولانا یعقوب بھوپالی" کا کہنا تھا کہ انسان اپنی والی پوری جد و جہد کرے اور پھر جب وہ اپنے ہر سہارے اور کوشش سے مایوس ہو جاتا ہے تب اللہ کی مدد آتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو شمشیر زنی، شہسواری اور تیر اندازی میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے رہے اور جہاد کے لیے سامان تیار کرنے کا حکم دیتے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حاجیوں کو 'رمل' کرنے کی ہدایت دی۔ طواف کعبہ کے پہلے تین چکر اکڑ کر، سینہ تان کر شانے اچھال کر چلنے کا حکم آج بھی ہر حاجی کے لیے ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کفار پر رعب طاری ہو جائے اور انھیں یہ گمان نہ ہو کہ مسلمان کمزور، نحیف و لاچار ہیں۔ یہ سب اسی لیے تھا کہ دین کی طاقت کا اظہار ہو۔ آج دین کی طاقت کے اظہار کے پیمانے بدل چکے ہیں، لیکن رسول اکرمؐ کے اصل متن کی اسپرٹ اور روح وہی ہے۔ آج سائنس، فن، ٹکنالوجی، ریسرچ، علم و دانش و بصیرت کا دور ہے۔ جو قوم ہر لحاظ سے محتاج و اپاہج ہو چکی ہو، دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہنے کے لیے تیار ہو جائے تو ظاہر ہے کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ کہلانے کا مستحق سمجھ سکتی ہے۔ نہ تو یہ دین اسلام کی تعلیم ہے اور نہ اسلام کا اصلی روپ ہے۔ کسی طرح لشتم پشتم زندگی بسر کر لینا مسلمان کی خودداری اور مذہب کی روح کے خلاف ہے۔

اب اس مرض کا تریاق بھی صاحب مسندِ ارشاد کے پاس ہی ہے۔ علمائے دین ہی اس ذہن کو نیا موڑ اور مثبت پہلو دے سکتے ہیں۔ کاش کوئی حکیم امت اس پہلو پر غور کرے اور اس مردہ و افسردہ قوم میں نئی روح پھونکے اور انھیں جدید تقاضوں سے آشنا کر دے۔

علم، فہم و تفقہ اور حکمت

محمد سعود عالم قاسمی *

انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات و انعامات ہیں اگر انسان اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔ ان نعمتوں کی شکر گزاری تو الگ ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا

[اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ان کا احاطہ نہ کر سکو]

یہاں تک کہ وہ سانس جو ہم لیتے ہیں اور یہ دم جو ہم دیتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی خاص نعمتوں میں سے ہے مگر چونکہ یہ نعمت ہر لمحہ ملتی رہتی ہے اس لیے ہمیں اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں۔ اللہ اگر چاہے تو یہ سانس روک لے اور ہماری زندگی کا سارا نظام موت کی تاریکی میں گم ہو کر رہ جائے۔

اللہ کی کچھ نعمتیں مادی ہیں اور کچھ علمی و روحانی کچھ نعمتیں انسانی زندگی کے بقاء سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ ارتقاء سے۔ جو نعمتیں مادی ہیں وہ علمی نعمتوں کے مقابلے میں زیادہ عام ہیں۔ عالم و جاہل، شہری اور دیہاتی عقل مند و بیوقوف توانا اور کمزور سبھی تمیز کے بغیر مادی نعمتیں تمام انسانوں کے لیے پھیلا دی گئی ہیں مگر علمی نعمتیں اتنی عام نہیں ہیں بلکہ وہ انسان کے ظرف کے مطابق عام ہوتی ہیں۔ چنانچہ جتنے انسانوں کو اللہ نے دولت اور ثروت سے نوازا ہے، اتنے لوگوں کو علمی نعمتوں سے آراستہ نہیں کیا۔ پھر علم میں بھی مدارج مقرر کیے گئے۔ جتنے انسانوں کو علم دیا گیا اتنے لوگوں کو فہم و تفقہ سے نہیں نوازا گیا اور جتنے لوگوں کو فہم و تفقہ عطا کیا گیا ان سب کو لازماً حکمت سے سرفراز نہیں کیا گیا

علم اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ یہ علم ہی ہے جو انسان کو دوسری تمام مخلوق سے ممتاز کرتا ہے یہ علم ہی ہے جو انسان کو خلیفۃ الارض کی سعادت عطا کرتا ہے اور یہ علم ہی ہے جو انسان کو ذمہ دار، خود مختار اور باوقار بناتا ہے۔ یہ علم کائنات، انسان اور خدا کی پہچان، ان کے حقوق کی معرفت اور ان کے باہمی ربط و تعلق کا علم ہے۔ یہ علم مجرد ہے۔ اس میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔ اس علم کا سرچشمہ خدائے وحدہ لاشریک کی ذات ہے۔ یہ علم وہبی بھی ہوتا ہے

---

* ناظم شعبۂ سنی دینیات، اے ایم یو۔ علی گڑھ

اور کسبی بھی۔ اس علم کا مال و دولت سے کوئی فطری تعلق نہیں۔ بہت سے مال و دولت والے جاہل ہوتے ہیں اور بہت سے اہلِ علم کی مال و دولت اور ثروت میں قابلِ ذکر حیثیت نہیں ہوتی۔

یوں تو قرآن میں علم کو مجرد بھی استعمال کیا گیا ہے اور صفات کے ساتھ بھی، علم کی ایک ظاہری اور ابتدائی منزل ہے، دوسری منزل اس کی منتہا اور نقطہ ہے۔ علم اپنے دوسرے معنی کے لحاظ سے خاص ہے اور وہ تفقہ اور حکمت کی قبیل سے ہے مگر اپنے عموی اور ظاہری معنی کے لحاظ سے وسیع ہے۔ علم مومن و کافر، منافق و ملحد اور مشرک و مستشرق ہر کسی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ شیطان لعین کو بھی یہ علم حاصل تھا۔ اس علم کی مثال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موسلا دھار بارش سے دی ہے کہ جو آسمان سے نازل ہوتی ہے تو تین قسم کی زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ ایک قسم کی زمین وہ ہے جو پانی ملتے ہی ہلہلا اٹھتی ہے۔ اسے آپ نے "نقیۃ" فرمایا ہے۔ دوسری زمین نشیبی ہے جو بارش کے پانی کو جمع کر لیتی ہے۔ خود تو فائدہ نہیں اٹھاتی مگر دوسرے لوگ اس سے خود سیراب ہوتے، جانوروں کو پانی پلانے اور کھیتی کو سیراب کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے اسے "اجادب" کہا ہے۔ تیسری زمین بنجر ہے۔ جو اس بارش سے نہ تو خود فائدہ اٹھاتی ہے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ آپ نے اسے "قیعان" کہا ہے۔ اسی طرح علم کے حاملین تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس علم سے خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔ کچھ لوگ خود تو فائدہ نہیں اٹھاتے مگر دوسرے لوگ ان کے علم سے فائدہ حاصل کر لیتے ہیں اور تیسرے لوگ نہ تو خود فائدہ حاصل کرتے اور نہ دوسروں کو استفادہ کا موقع دیتے ہیں۔

علم کے مقابلے میں فہم و تفقہ خاص ہے۔ جن لوگوں کو علم دیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ ان سب کو فہم و تفقہ بھی عطا کیا جائے۔ فہم و تفقہ کے معنیٰ یوں تو سمجھ ہیں مگر فہم سے مراد فہمِ دین ہے اور تفقہ سے مراد دینی بصیرت ہے۔ اس فہم کے لیے دینی وابستگی اور نیت اور اجتہادی صلاحیت ناگزیر ہے۔ یہ فہم مستشرق کو نہیں دیا جاتا۔ یہ فہم شیطان اور اس کے متبعین کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ فہم اللہ کی خاص نعمت ہے اور وہ اسی کو دیتا ہے جس کو اس کا اہل سمجھتا ہے اور جس کے ساتھ انعام خاص کا معاملہ کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

"من یرد اللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین"

[اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے، اسے فہمِ دین عطا کر دیتا ہے]۔

اس فہم و تفقہ میں بھی مدارج و مراحل ہیں جن میں سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ سارے انبیا اس فہم میں برابر نہیں ہوتے اور نہ سارے صحابۂ کرام برابر ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایک واقعہ مذکور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام کے پاس دو فریق اپنا مقدمہ لے کر آئے۔ مدعی نے کہا کہ میرا کھیت تھا، اس میں رات کے وقت دوسرے فریق کی بکریاں گھس آئیں اور ساری کونپلیں کھا گئیں۔ داؤد علیہ السلام نے فریقین کا بیان سن کر فیصلہ کر دیا کہ مدعا علیہ اپنی ساری بکریاں مدعی کے حوالے کر دے۔ سلیمان علیہ السلام کو جب فیصلہ معلوم ہوا تو وہ حضرت

داؤد علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ اس فیصلے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ صحیح فیصلہ یہ ہوگا کہ مدعا علیہ کی بکریاں مدعی کو صرف اس وقت تک کے لیے دے دی جائیں جب تک اس کی کھیتی ویسی ہی نہ ہو جائے جیسی کہ چرنے کے وقت تھی اور یہی فیصلہ نافذ العمل ہوا۔ قرآن اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

" وداؤد وسلیمان اذ یحکمان فی الحرث اذ نفشت فیہ غنم القوم وکنا لحکمہم شاہدین ففہمنہا سلیمن وکلا اتینا حکما و علما (الانبیاء ۷۸ - ۷۹)

[اور داؤد اور سلیمان کا حال بھی سن لو کہ جب وہ ایک کھیتی کا مقدمہ فیصلہ کرنے لگے جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت موجود تھے تو ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے دونوں کو حکم اور علم بخشا تھا]۔

علم اور حکمت دونوں کو عطا کی گئی تھی مگر فہم تفقہ سلیمان علیہ السلام کو عطا کی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نضر اللہ عبداً سمع مقالتی فحفظہا ووعاہا وادّاہا فرب حامل فقہ غیر فقیہ ورب حامل فقہ الی من ہو افقہ منہ (ابوداؤد، مسند احمد، ترمذی)

[اللہ اس بندے کو تروتازہ رکھے جو حدیثِ رسول کو سنکر یاد رکھتے اور دوسروں تک اسے پہنچاتے ہیں کیونکہ بہت سے راویانِ فقہ خود فقیہ نہیں ہوتے بلکہ سننے والے بیان کرنے والے سے زیادہ فقیہ ہوتے ہیں]

اسی لیے امت میں ہمیشہ ایسے گروہ کا پایا جانا ضروری ہے جو تفقہ فی الدین کے حامل ہوں اور خود قرآن نے بھی ایک ایسا گروہ تیار کرنے کا حکم دیا ہے جو تفقہ فی الدین کا حامل ہو۔

" فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ لیتفقہوا فی الدین (التوبہ ۱۲۲)

صحابہ کرام سب کے سب عالم تھے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس پر جہالت کا اطلاق کیا جا سکے مگر وہ سب فہم و تفقہ میں یکساں نہ تھے۔ چنانچہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بکثرت روایت کرنے والوں میں ابوہریرہؓ انس بن مالکؓ، ابوسعید خدریؓ وغیرہم کا نام آتا ہے مگر حدیث رسول کے مفاہیم و مصداق اور تقاضا کو زیادہ سمجھنے والوں میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ حضرات وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام کے مابین فہم و تفقہ میں تفاوت کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک وفد کسی قبیلہ کی طرف بھیجا وہاں پہنچ کر حضرت خالد نے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے صاف لفظوں میں اسلام قبول کرنے کے بجائے کہا:

" صبانا صبانا۔"

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے

" ہم آپ کی بات تسلیم کرتے ہیں "

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

" ہم اپنے آبائی مذہب کو اچھا سمجھتے ہیں "۔

حضرت خالد نے جب یہ دیکھا کہ ان حضرات نے میری

بات نہیں مانی تو ان سب کو گرفتار کرنے کا حکم دیا اور پھر اپنے وفد کے ہر فرد سے کہا کہ وہ اپنے قیدیوں کو تہہ تیغ کرے۔ اس پر عبداللہ بن عمرؓ نے تعمیل حکم سے معذرت کر دی اور کہا بخدا ہم اپنے قیدیوں کو قتل نہیں کریں گے۔ جب یہ حضرات واپس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کو پوری روئداد سنائی تو آپؐ نے فرمایا:

"اے اللہ جو کچھ خالد بن ولید نے کیا ہے۔ میں اس سے بری ہوں۔" [۳۳]

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وفد تبلیغ اسلام کے لیے ایک انصاری صحابی کی سرکردگی میں کسی علاقے میں بھیجا۔ وہاں پہنچ کر امیر جماعت کسی بات پر اپنے ساتھیوں سے ناراض ہو گئے تو انہوں نے سب سے پوچھا: کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں اپنے امیر کی اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے۔ اس پر سب نے کہا بے شک ہمیں اطاعت امیر کا حکم دیا گیا ہے۔ تب امیر جماعت بولے تم سب لوگ لکڑیاں اکٹھی کرو۔ چنانچہ حسب حکم لکڑیاں جمع کی گئیں۔ پھر حکم ملا کہ اب اس میں آگ لگاؤ تو آگ بھی لگا دی گئی۔ اب حکم ملا کہ تم سب اس میں کود پڑو۔ اب ہر شخص نے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا کہ پہلے کون آگ میں کودتا ہے۔ اتنے میں ایک صحابی نے کہا: "ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر آگ کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہی ایمان لائے تھے۔ کیا ہم ایمان لانے کے بعد بھی آگ میں ڈالے جائیں گے۔" یہ سن کر امیر جماعت کی آتش غضب بجھ گئی اور انھوں نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ واپس آکر جب لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا ماجرا سنایا تو آپؐ نے فرمایا:

• اگر تم آگ میں داخل ہو جاتے تو بخدا کبھی نہ نکل پاتے۔

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک خاتون آکر اپنے شوہر کے متعلق ایک رپورٹ پیش کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میرا شوہر قائم اللیل اور صائم الدہر ہے یعنی رات بھر نفل پڑھتا ہے اور ہمیشہ روزہ رکھتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے سمجھا کہ یہ عورت اپنے شوہر کی تعریف کر رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے خاتون کے شوہر کی اس عبادت کو پسند کیا۔ حضرت اکثمؓ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا: امیر المومنین! کیا آپ نے سمجھ لیا خاتون کیا کہہ رہی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ اپنے شوہر کی تعریف کر رہی ہیں۔ حضرت اکثمؓ نے کہا نہیں وہ اپنے شوہر کی شکایت کر رہی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا وہ کیسے حضرت اکثمؓ نے فرمایا اگر اس کا شوہر رات بھر نوافل میں مشغول رہتا ہے اور دن میں روزہ رکھتا ہے تو حقوق زوجیت کب ادا کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اب تم یہ بھی بتاؤ کہ اس کا علاج کیا ہونا چاہیے۔ حضرت اکثمؓ نے فرمایا کہ اس کے شوہر کو حکم دیا جائے کہ وہ تین دن تک اپنے نوافل و صیام میں مشغول رہے اور چوتھا دن ازدواجی حقوق کی ادائیگی میں صرف کرے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: تین اور ایک کی تقسیم کی بنیاد کیا ہے۔ حضرت اکثمؓ نے فرمایا کہ قرآن کہتا ہے

فانکحوا ما طاب لکم من النساء
مثنیٰ وثلث وربٰع (النساء ۳)

ایک مسلمان بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے، یہ شخص چار بیویاں رکھتا ہے تو ایک بیوی کو چوتھا دن ہی مل سکتا ہے اور

رت ایک بیوی کی صحبت میں اس کو تین دن اور کنواری
زائل کے لیے دیے جائیں اور جو تھا دن ادا ئیگی
حقوق کے لیے۔

حضرت عثمان غنیؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک
شخص نے قبیلۂ جہینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا اور
اس کے یہاں نکاح کے کل چھ ماہ بعد ہی ایک بچہ پیدا
ہوا جبکہ عام طور پر بچہ کی ولادت استقرار حمل کے نو
ماہ بعد ہوتی ہے۔ اس شخص نے حضرت عثمانؓ کے سامنے
یہ معاملہ رکھا اور بچہ کو غیر قانونی قرار دے کر منکوحہ
کو زانیہ ٹھہرایا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے بھی اسے غیر قانونی
قرار دے دیا۔ حضرت علیؓ کو جب یہ بات معلوم ہوئی
تو انھوں نے کہا کہ یہ بچہ قانونی ہے اور اسی شوہر کا
ہے۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو فیصلہ پر نظر ثانی
کے لیے کہا اور اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ قرآن
میں حمل اور رضاعت کی مشترکہ مدت تیس مہینے بتائی
گئی ہے۔

حمله وفصاله ثلثون شهرا۔

(احقاف)

در قرآن ہی میں دوسری جگہ مدت رضاعت دو سال
یعنی چوبیس مہینے مقرر کی گئی ہے۔

"وفصاله فی عامین"۔

(لقمان ۱۴)

اور تیسری جگہ کہا گیا ہے:

والوالدات یرضعن اولادهن
حولین کاملین لمن اراد ان
یتم الرضاعة (البقرة ۲۳۳)

اور جب تیس مہینوں میں سے چوبیس مہینے رضاعت
کے نکال دیے جائیں تو حمل کی کم سے کم مدت صرف
چھ ماہ بچتی ہے۔ لہٰذا اگر چھ ماہ کے بعد کوئی بچہ تولد
ہوتا ہے تو اسے غیر قانونی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد
حضرت عثمانؓ نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔[۴]

حکمت علم و فہم کے مقابلے میں زیادہ خاص اور
بلند ہے۔ یہ حکمت طبیبوں کا پیشہ اور طریقۂ علاج
نہیں اور نہ یہ حکمت عام معنی میں بولی جانے والی
حکمت عملی ہے بلکہ یہ حکمت فن و بصیرت کی پہچان کے
ساتھ ان کے ساتھ مناسب رویہ اختیار کرنے اور
استنباط کے وقت صحیح نقطۂ نظر اپنانے کا نام ہے
یہ حکمت نور بصیرت ہے جو کسبی نہیں بلکہ وہبی چیز ہوتی
ہے اور ہر کس و ناکس کو عطا نہیں کی جاتی۔ یہاں تک
جو علم و فہم میں معروف ہیں ان میں بھی خاص لوگوں کو
عطا کی جاتی ہے اور یہ علم و فہم ان سے صلاحیت و
صلاحیت ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں کہا گیا

یؤتی الحکمة من یشاء ومن یؤتی
الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا۔
وما یذکر

(البقرة ۲۶۹)

[وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے
اور جس کو حکمت ملی بے شک اسے بڑی
نعمت ملی اور نصیحت تو وہ لوگ قبول
کرتے ہیں جو عقل مند ہیں]۔

گویا حکمت روحانی اور معنوی عطیات خداوندی
کا ارفع و اعلیٰ حصہ ہے اور اسے مادی انداز میں سمجھا
اور سمجھایا بھی نہیں جا سکتا۔ حکمت کے لیے جہاں ایک
طرف علم و فہم شرط ہے وہاں اللہ کی ذات و صفات اور
اس کی مرضیات کے ساتھ وابستگی بھی ضروری ہے۔
اسی لیے فرمایا گیا:

"راس الحکمة مخافة الله"

گویا حکمت کے لیے عالم باللہ اور عالم بامر اللہ دونوں

ہونا لازم ہے۔ قرآن کریم میں بعثت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقاصد میں بالعموم چار چیزیں بیان کی گئی ہیں :

۱۔ تلاوت آیات
۲۔ تزکیہ
۳۔ تعلیم کتاب
۴۔ تعلیم حکمت۔

تعلیم کتاب کے بعد الگ سے تعلیم حکمت کو بیان کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ تعلیم حکمت احکام کی تعلیم سے یقیناً کوئی شے مختلف شے ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک طبیب حاذق اپنے شاگرد رشید کو صرف دواؤں اور غذاؤں کے خواص و اثرات ہی نہیں بتاتا بلکہ وہ طریقہ علاج اور تشخیص و تجویز کی باریکیاں بھی سمجھاتا ہے جس کے ذریعے نظام جسمانی کے توازن اور اعتدال کو برقرار رکھا جا سکتا ہے اور دواؤں اور غذاؤں کے مضر اثرات کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح احکم الحاکمین اپنے خاص بندوں کو علم و فہم کے ساتھ ان نزاکتوں اور باریکیوں کا شعور بھی عطا کرتا ہے جو انسانی زندگی کے بقاء وارتقاء میں نفع و ضرر کے میزانیہ کا ادراک کرتا ہے۔

حواشی

۱۔ بخاری کتاب العلم
۲۔ ایضاً
۳۔ بخاری۔ کتاب الاحکام
۴۔ ایضاً
۵۔ ابن کثیر۔ تفسیر سورۂ لقمان۔

"ہم بلاشبہ اپنی قوم کو اپنے ہم وطنوں کو سویلزڈ قوم کی پیروی کی ترغیب کرتے ہیں مگر ان سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان میں جو خوبیاں ہیں اور جن کے سبب وہ معزز اور قابل ادب سمجھی جاتی ہیں اور سویلزڈ شمار ہوتی ہیں، ان کی پیروی کریں نہ اُن کی ان باتوں کی جو ان کے کمال میں نقص کا باعث ہیں۔"

سرسید

حکیم محمد مختار صدیقی

سید ظل الرحمٰن *

یونانی طب کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں عام طور پر دو باتیں منسوب کی جاتی ہیں۔ ایک تحقیق و تصنیف کی طرف توجہ دوسرے حاذق و کامیاب طبیبوں کی کثیر تعداد۔ جہاں تک تحقیقی و تصنیفی کام کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پیش رفت کا سلسلہ کسی حد تک اطمینان بخش ہے۔ گذشتہ بیس برس کا اگر جائزہ لیا جائے تو تحقیق کا کام نمایاں طور پر آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ ادویہ، معالجات اور نظریات پر مختلف جہتوں سے کام انجام دیا جا رہا ہے۔ تحقیقی مراکز کے قیام اور پوسٹ گریجو[یٹ تعلیم] نے علمی سرگرمیوں میں جو اضافہ کیا ہے اور اُن کی [وجہ] سے جو تحقیقی دلچسپیاں بڑھی ہیں، اس کا ثبوت ان تعداد میں منعقد ہونے والے علمی مذاکروں اور سمیناروں کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح کے ان معیاری مجلات میں دیکھا جا سکتا ہے جو ملک اور بیرون ملک سے شائع ہو رہے ہیں۔ نئی قائم شدہ طبی درس گاہوں اور طبی اداروں نے اس میں کوئی شک نہیں کہ طب میں ایک نئی روح پھونکی ہے اور طب کی خاموش فضا میں زندگی کے نئے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں تک یونانی مطب و معالجہ کا تعلق ہے اس کی روایت آگے بڑھنے کے بجائے تشویشناک حد تک تنزل کا شکار ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ہر قصبہ اور ہر شہر میں خاصی تعداد میں یونانی مطب قائم تھے۔ یونانی معالجے کی دھوم تھی اور پڑھے لکھے طبیب شہروں اور قصبوں میں اپنی مسیحائی اور معجز نمائی کی وجہ سے وہاں کی طبی و سماجی زندگی میں ممتاز مرتبہ رکھتے تھے لیکن اب پوری کی پوری آبادیاں یونانی معالجین سے خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ مطبوں کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے اور حاذق طبیب کی تلاش میں لوگوں کو دور دور کے سفر کی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

بھوپال جو ہندوستان میں طب کا ایک گہوارہ تھا اور جہاں چند برس قبل حکیم سید ضیاء الحسن، حکیم عبدالمجیب، حکیم محمد مقتدر خاں، حکیم ابراہیم ندوی، حکیم لطافت حسین فاروقی، حکیم سید قمر الحسن، حکیم کوثر چاندپوری، حکیم عبدالمنان خاں، حکیم عبدالجبار خاں طب کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے اور جہاں بیسیوں طبیبوں کے علاجی کارنامے آج بھی مقامی باشندوں کی زبان پر ہیں وہاں اس کی آخری صف کے لوگوں

---

* پروفیسر و سابق صدر شعبہ علم الادویہ، و ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن ۔ طبیہ کالج، اے ایم یو۔ علی گڑھ

میں ایک ممتاز شخصیت حکیم محمد مختار صدیقی کی تھی، جن کا مطب بھوپال کے اطبا کی روایتی شان کا آئینہ دار تھا۔ ان کے مطب میں مریضوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ قرب و جوار سے متلاشیان صحت وہاں پہنچتے تھے اور عسیر العلاج بیماریوں سے شفایاب ہوتے تھے۔ ان کی ذات سے بھوپال میں فن کا بھرم اور اعتبار قائم تھا۔ میں نے ان میں عظمتِ فن کا وہ احساس دیکھا ہے جس کے لیے علم و یقین بطور شرط اولین ضروری ہے۔ ان کا نسخہ اگرچہ روایتی طرز کا ہوتا تھا اور چند مفردات اور مرکبات کی الٹ پھیر سے وہ فرائض معالجہ انجام دیتے تھے لیکن وہ جو ایک اعتماد انھیں اپنی تجویز اور تشخیص پر ہوتا تھا اور جس یقین اور بہتر نتیجہ کی توقع سے وہ نسخہ لکھتے تھے اس میں دراصل ان کی کامیابی اور شفا بخشی کا راز پنہاں تھا۔ فن پر یہ اعتماد آسانی سے نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بڑے علمی و تجرباتی ریاض کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس کے پس پردہ علم و تجربہ کی وسعت و گہرائی ہوتی ہے اور ذہن و فکر کی وہ مناسبت جو تشخیص مرض اور انتخاب دوا میں اثر کرتی ہے۔

حکیم محمد مختار صدیقی کو فن کا یہ شعور وراثت میں ملا تھا۔ ان کے دادا شیخ محمد مصطفیٰ (تاریخی نام ہے ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۶ء کے اعداد برآمد ہوتے ہیں) اپنے زمانے کے ممتاز علما اور اطبا میں تھے۔ عملیات سے خاص تعلق تھا۔ ۹۳ برس کی عمر میں ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں فوت ہوئے۔ محمد مصطفیٰ خلد آشیانی' سال وصال ہے۔ ان کے بزرگوں میں شیخ محمد سلطان ابراہیم لودھی کے عہد میں ہندوستان آئے۔ شیخ محمد کے صاحبزادے خواجہ جلال نے مضافات لکھنؤ میں بجنور نام کے ایک قصبہ میں سکونت اختیار کی۔ جس محلہ میں ان کا قیام تھا وہ آج بھی محلہ خواجہ جلال کے نام سے موسوم ہے۔

حکیم محمد مختار کے والد حکیم محمد محسن جن کا تاریخی نام مختار احمد ہے، بجنور ضلع لکھنؤ میں رجب ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد اور برادر اکبر مولوی عبدالمجیب کے زیر سایہ ہوئی۔ درسیات کی تکمیل اپنے دوسرے بھائی حاجی محمد شفیع بجنوری کے ساتھ ہو(آگے چل کر ایک بلند پایہ عالم اور ماہر عملیات ہوئے)، جامع العلوم جامع مسجد منکلپور کانپور سے کی اور مولانا اشرف علی تھانوی کی شاگردی میسر آئی۔ طب کی تعلیم جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے نامور استادِ طب حکیم عبدالعزیز سے حاصل کی۔ لکھنؤ کے دوران قیام شمس العلما مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ کچھ عرصے والد کے ساتھ مطب کیا۔ ۱۹۰۰ء میں نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں بھوپال پہنچے اور یونانی شفاخانہ میں بحیثیت سرکاری طبیب ملازم ہوئے۔ مبداء فیاض سے دست شفا عطا ہوا تھا۔ تشخیص میں ملکہ حاصل تھا۔ اعلیٰ درجے کے نباض تھے۔ انھوں نے معالجہ کو خدمت خلق اور دینی فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں آصفیہ طبیہ کالج کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ جلد ہی وہ اس سے وابستہ ہوئے اور آخر میں صدر الاطبا کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں ان کے جوان العمر بیٹے حکیم محمد منعم جو قصبہ دیگاؤں میں بحیثیت طبیب ریاست مامور تھے۔ دبیلۃ الکبد میں مبتلا ہو کر بھوپال پہنچے۔ ہر چند علاج ہوا مگر جانبر نہ ہو سکے۔ اس صدمے کے بعد اکثر آنکھوں سے آنسو جاری رہے رفتہ رفتہ روشنی جاتی رہی اور آخر عمر میں حکیم نابینا کے نام سے مشہور رہے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنی رہائش گاہ واقع محلہ ریت گھاٹ میں مطب کا سلسلہ جاری کیا

چھوٹے صاحبزادے حکیم محمد مختار نسخہ نویسی اور معائنہ مریض کے واسطے ہمراہ رہتے تھے۔ قوتِ حس اس قدر بڑھ گئی تھی کہ قدموں کی آہٹ سے ملاقاتیوں اور مخصوص مریضوں کو پہچان لیتے تھے۔ ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں دو برس استسقا میں مبتلا رہ کر عالمِ جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ سال وصال "غفرلہ اللہ" ہے۔

حکیم محمد مختار (تاریخی نام ... ۱۳۳۷ھ) ۱۳ دسمبر ۱۹۱۸ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے والد قلعہ دار صاحب کے مکان نزد موتی مسجد میں سکونت پذیر تھے۔ مدرسہ احمدیہ میں درسی کتابیں پڑھیں۔ میٹرک کے امتحان کے بعد الہ آباد بورڈ سے عالم اور پھر ۱۹۴۳ء میں فاضل طب کی سند حاصل کی۔ مولانا قاضی وجدی الحسینی مرحوم اور مولانا عبدالعلی موجودہ قاضی شہر بھوپال ان کے مدرسہ احمدیہ کے ساتھیوں میں ہیں۔

ابتدا میں اپنے والد کے ساتھ ان کے مطب میں بیٹھے۔ والد کے انتقال کے بعد ۴ نومبر ۱۹۴۰ء کو بحیثیت جونیئر مدرس آصفیہ طبیہ کالج ملازمت اختیار کی۔ تقریباً دس برس طبیہ کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم رہا اسی کے ساتھ شفاخانہ یونانی میں مطب سے بھی منسلک رہے۔ ۱۹۵۰ء میں آصفیہ طبیہ کالج کے بند ہونے کے بعد صدر یونانی شفاخانہ میں بحیثیت طبیب خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۷ء میں سپرنٹنڈنٹ ہاسپٹل مقرر ہوئے لیکن بعض حالات سے بددل ہو کر ۳۰ ستمبر ۱۹۷۰ء کو اپنی خواہش پر ملازمت سے علیحدگی حاصل کی جب کہ ان کی سبکدوشی میں ابھی سات برس کی مدت باقی تھی۔ اس کے بعد گھر پر مستقل مطب کا سلسلہ شروع کیا۔

حکیم صاحب کا اصل میدان مطب و معالجہ تھا۔ دوسرے امور میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ بھوپال میڈیکل کونسل کے رجسٹریشن بورڈ کے ممبر تھے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک مدھیہ پردیش سے سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن نئی دہلی کے ممبر رہے۔ کونسل کی طرف سے طبیہ کالج برہان پور اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی معائنہ کمیٹی میں شامل رہ کر ان کالجوں کا الحاق یونیورسٹی سے کرائے جانے کی سفارش کی۔ طبیہ کالج لکھنؤ کا معائنہ ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو کیا تھا۔ کمیٹی کے دوسرے ممبر حکیم عبد... تھے۔

حکیم صاحب نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۹۱ء تک پچاس برس سے زیادہ بھوپال میں مطب کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے اس فن کا فنی حق ادا کیا وہ بھوپال میں طب کی شناخت تھے۔ انھیں وہاں کے لوگوں کا غیر معمولی اعتماد حاصل تھا۔ وہاں کے قدیم گھرانوں میں جہاں یونانی طب کا سلسلہ رہا ہے شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کے افراد ان کے زیر علاج نہ رہے ہوں۔ حکیم صاحب کا مطب لکھنؤی انداز کا تھا مفردات پر مشتمل۔ یونانی شفاخانے سے وابستگی کے زمانے میں وہ کہا کرتے تھے کہ مفردات کے نسخے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس طرح شہر میں مفرد ادویہ کی دوکانیں قائم رہیں گی۔ ان دوکانوں سے جہاں شفاخانے میں مفردات کی فراہمی ہوتی ہے، وہاں عوام کو بھی ان کی خریداری کا موقع ملتا ہے۔ اب اس طرح کی دوکانیں جو کم ہوتی جا رہی ہیں، اس کی وجہ مرکبات کے استعمال کی کثرت ہے۔

حکیم صاحب بڑے نستعلیق اور وضع دار انسان تھے۔ بہت سلیقے سے رہتے تھے۔ ان کی شخصیت بھوپال کی شریفانہ تہذیب اور روایت سے عبارت تھی۔ ایک زمانہ میں ان کے ہاں شام کو مخصوص حضرات کی نشست رہتی تھی۔ قاضی وجدی الحسینی، قاضی عبدالعلی، مولوی عشرت حسین، اسرار مسعود، محمد احمد

زمنی، عبدالمالک وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ اس نشست میں بیشتر علمی اور دینی موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ بھوپال کے سفر میں مجھے بھی ان کی خدمت میں اکثر حاضری کا موقع ملا۔ طبی مسائل اور ہندوستان میں رونما ہونے والی نئی سرگرمیوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے اور بڑے تعلق اور شفقت سے ملتے۔ مذہبی اور ملی مسائل سے دلچسپی تھی۔ جمیعۃ العلماء بھوپال کی مجلسِ منتظمہ کے رکن رہے۔ اردو ایجوکیشن سوسائٹی سے بھی تعلق تھا۔ ۱۹۷۰ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ان کے والد حکیم محمد محسن بھی حج سے مشرف ہوئے تھے۔

حکیم صاحب ۱۹ر مارچ ۱۹۹۱ء کو حسب معمول مطب سے مریضوں کے ملاحظہ کے بعد تقریباً ۲ بجے گھر میں اندر گئے۔ اچانک چکر اور بے ہوشی طاری ہو گئی۔ قلب کی حرکت اور نبض کی رفتار غیر منتظم تھی۔ خود ان کی تشخیص کے مطابق فالج کا خفیف حملہ ہوا تھا جس سے اندرونی اعضاء خصوصاً قلب اور جگر دے کی کافی متاثر تھے۔ اس سے قبل ۱۹۸۷ء میں بھی ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ لیکن چند روز کے علاج کے بعد شفایاب ہو گئے تھے۔ اس دوسرے حملہ میں کوئی دوا کارگر نہیں ہوئی اور سات روز بیمار رہ کر ۲۶ر مارچ ۱۹۹۱ء رمضان کے عشرۂ رحمت میں ۹ر تاریخ کو بارہ بجے دوپہر ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ۱۱ بجے شب سیفیہ کالج سے متصل قبرستان میں اپنے والد گرامی کے قریب سیکڑوں اشک بار آنکھوں سے انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ تراویح کے بعد اتنا بڑا مجمع ان کی مقبولیت کا ثبوت تھا۔ قاضی شہر مولانا عبدالعلی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ تین صاحبزادے حکیم محمد اظہر صدیقی (حلیگ)، محمد انور صدیقی، محمد منظہر صدیقی اور ایک صاحبزادی ان کی یادگار ہیں۔

"جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

سرسید

البیرونی ــــ گیارھویں صدی کا ایک عظیم محقق

عرفان احمد *

۱۹۷۰ء کی دہائی میں پوری دنیا میں ابوریحان محمد بن احمد البیرونی پر بہت سے انٹرنیشنل سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ مثلاً نئی دہلی (۱۹۷۳ء)، طہران (۱۹۷۳ء)، کراچی (۱۹۷۳ء)، استنبول (۱۹۷۴ء)، کولمبیا یونیورسٹی (۱۹۷۴ء)، نیویارک (۱۹۷۵ء) وغیرہ وغیرہ بہت سے ممالک نے البیرونی کی ہزار سالہ برسی بھی منائی اور ہزاروں مضامین، کتابیں اور رسائل البیرونی کے متعلق شائع ہوئے۔ کئی درجن بلیوگرافی وجود میں آئیں جن سے البیرونی پر تحقیق کرنے والوں کو بہت مدد ملی۔ مثال کے طور پر سید حسین نصر کی بلیوگرافی جس میں ۱۹۷۰ء سے پہلے البیرونی پر شائع مضامین کی لسٹ دی گئی ہے۔ احمد سعید خاں کی بلیوگرافی ۱۹۸۲ء تک شائع مضامین کی لسٹ فراہم کرتی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والی محمد صابر خاں کی بلیوگرافی جو صرف روسی زبان میں البیرونی کے متعلق شائع ہونے والی کتابوں اور مضامین کے متعلق ہے۔ ابھی حال ہی میں خاں صاحب کی دوسری بلیوگرافی شائع ہوئی ہے۔ اس میں روسی زبان کے علاوہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک البیرونی پر شائع کتابوں اور مضامین کی لسٹ دی گئی ہے۔ خاں صاحب کی روسی زبان میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۰ء تک البیرونی پر شائع مضامین کی بلیوگرافی بہت جلد شائع ہونے والی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی بلیوگرافی مختلف زبانوں میں منظر عام پر آئی ہیں۔

البیرونی کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جارج سارٹن نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ سائنس کا تعارف" میں گیارہویں صدی عیسوی کو "البیرونی کا زمانہ" قرار دیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم انسان جس کے متعلق تمام دانشوروں کا اتفاق ہے کہ آزادی رائے اور تحقیقات علمی میں وہ دنیا کے بلند ترین حکماء میں سے ایک ہے، کے حالات زندگی اور اس کے کارناموں کا مختصراً ذکر کیا جائے۔

البیرونی خوارزم کے قریب ایک دیہات میں ۹۷۳ء میں ایک نہایت غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق ہوئی۔ ناداری اور ناسازگار حالات کے باوجود اس نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ پھر وہ شب و روز اپنے علمی مشاغل اور تحقیق و مشاہدہ میں مصروف ہوگیا۔ وہ بہت بلند علمی ذوق رکھتا تھا۔ علم ہیئت اور علم نجوم میں اس

* شعبۂ طبعیات، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ

کا کوئی ہم پلّہ نہ تھا۔ بہت جلد ہی اس کی قابلیت کا چرچا عوام میں ہونے لگا۔ کچھ ہی دنوں بعد البیرونی خوارزم شاہ کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ شاہ خوارزم علی بن مامون اہل علم کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس کے دربار میں دور دور سے اہل علم اور صاحب کمال افراد جمع ہو گئے تھے جن میں البیرونی کے علاوہ عالمی شہرت کے حامل شیخ بوعلی سینا اور ابو نصر فارابی بھی تھے۔ خوارزم شاہ البیرونی کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب محمود غزنوی نے خوارزم کو فتح کر لیا تو البیرونی کو محمود کے دربار میں جانا پڑا۔ وہ ۱۰۱۹ء تک غزنی میں رہا اور محمود کی بنوائی ہوئی رصد گاہ میں فلکیات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا لیکن سلطان سے الگ ہو کر وہ یہاں ٹھہر گیا۔ البیرونی نے تقریباً بیس سال ہندوستان میں گزارے۔ پورے ملک کی سیر و سیاحت کی۔ ہندوستانی علوم و فنون سے اسے اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ ہزاروں مشکلات کے باوجود اس نے بھیس بدل کر سنسکرت زبان سیکھی اور پھر یہاں کی فلسفیانہ اور مذہبی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا۔ اس نے ہندوستان میں بہت سی تحقیقات کیں۔ یہیں اس نے زمین کے محیط اور قطر — circumference and diameter کی پیمائش بھی کی۔ یہ تجربہ اس نے ضلع جہلم پاکستان کی تحصیل پنڈدادن خاں کے ایک پہاڑی گاؤں کے اس مشہور نندنا ٹیلہ پر کیا تھا جس سے ہیر رانجھا کی کہانی وابستہ ہے۔ البیرونی کے مطابق زمین کا محیط ۲۴۷۷۹ میل ہے۔ آج کل کی تحقیق کے مطابق یہ ۲۴۸۵۸ میل ہے۔ اس طرح البیرونی کی پیمائش میں صرف اعشاریہ ۳ فی صد (0.3%) کی غلطی ہوئی جو تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ زمین کے محیط کی اتنی صحیح پیمائش کر لینا البیرونی کے کمال کا ایک واضح ثبوت ہے۔

غزنی واپس آکر البیرونی نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الہند" لکھنا شروع کی جو قدیم ہندوستان کے علمی، تہذیبی اور معاشرتی حالات پر سب سے پہلی مستند، جامع اور بے نظیر کتاب مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب اصل عربی میں لیپزگ ([illegible]) سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۸ء میں لندن سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں البیرونی نے جو کچھ براہ راست ہندوستان میں دیکھا مطالعہ کیا اور پنڈتوں سے سمجھا اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

> "اہل ہند کی بیگانگی، اجنبیت اور باہم ذات پات کی شدت کی وجہ سے ایک دوسرے سے نفرت، نیز ان کی مذہبی اور قومی روایات، ان سب باتوں نے ان کو الگ تھلگ اور ایک دوسرے سے دور کر رکھا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں ہندوستان کے سوا نہ کوئی اور ملک ہے، نہ ہندوؤں کے سوا اور کوئی قوم ہے اور نہ ان کے راجا کے سوا اور کوئی دوسرا راجا ہے۔ وہ اپنے سوا دوسروں کو ملیچھ کہتے ہیں۔ ان کے رسم و رواج، عادات و اطوار اور معاشرت مسلمانوں سے قطعی مختلف ہیں۔ بیگانگی اور غیریت کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگ اپنے بچوں کو مسلمانوں سے ڈراتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور قوم کے پاس علم نہیں۔ جب کبھی ان

لوگوں سے دیگر ممالک کے علماء اور حکماء کا ذکر کیا جاتا ہے تو سخت تعجب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جھٹلا دیتے ہیں اور کسی طرح اس کو صحیح نہیں مانتے۔"

وہ مزید لکھتا ہے —

"ہندوستان کے لوگ اظہار خیال کے لیے عموماً نظم کے طریقے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ لوگ نثر کی عبادت کو پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ نثر کا سمجھنا آسان ہے۔ ان کی کتابیں زیادہ تر اشلوک میں ہیں۔"

اہل ہند کے عقائد کے متعلق وہ لکھتا ہے —

"اہل ہند کی عام مذہبی حالت سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب مشرک اور بت پرست ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ درحقیقت ہندوؤں میں دو طبقے ہیں۔ عوام اور خواص۔ ایک اونچی ذات اور ایک پست ذات عوام کا مذہب بت پرستی ہے۔ ان کے عقائد اور خیالات مشرکانہ ہیں۔ لیکن خواص اور محققین صرف توحید کے قائل ہیں اور یہ طبقہ خدا کے سوا اور کسی کی پرستش سے قطعی بری ہے۔"

البیرونی کی دوسری کتاب "آثار الباقیہ" ہے جو دنیا کی مختلف اقوام کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب اصل عربی میں لیپزگ (Leipzig) سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہوئی اور اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۷۹ء میں لندن سے شائع ہوا جو بہت پسند کیا گیا۔ ان دو کتابوں کے علاوہ البیرونی نے جیومٹری، ہیئت اور ریاضی پر بے شمار کتابیں لکھیں جن کی تعداد ایک سو چودہ[۱۱۴] بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے "قانون مسعودی" اور "التفہیم فی اوائل صناعات التنجیم" بہت مشہور ہیں۔ "قانون مسعودی" فن ریاضی پر بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں البیرونی نے ریاضی کے بعض اہم ترین مسئلے حل کیے ہیں۔ اسی کتاب میں اس نے دنیا کے مختلف شہروں کے درمیان طول البلد Longitude کا فرق معلوم کرنے کے اصول اور قاعدے بتائے ہیں جن میں کروی ٹرگنومیٹری Spherical Trigonometry کے بعض مسائل استعمال کیے ہیں جو بلاشبہ خاصے پیچیدہ ہیں۔ اس نے اپنی اس کتاب کا نام سلطان مسعود کے نام پر رکھا جو سلطان محمود غزنوی کے بعد جانشین ہوا۔ سلطان مسعود بڑا ذی علم، سنجیدہ اور علم پرور تھا۔ اسے علم نجوم سے انتہائی دلچسپی تھی۔ "قانون مسعودی" اصل عربی میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

البیرونی کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ ہر مسئلہ کو تحقیق و تجسس کی نظر سے دیکھنے اور اس کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی تھا۔ علم نجوم میں کمال مہارت حاصل کرنے کے باوجود وہ قدرت کو تسلیم کرتا تھا۔ عملی تجربے کے میدان میں بھی اسے کمال مہارت حاصل تھی۔ اس نے مختلف اٹھارہ قسم کی دھاتوں اور غیر دھاتوں کی کثافت اضافی Specific Gravity معلوم کی۔ اس نے پتھروں کی کثافت پر بھی تحقیق کی۔ مندرجہ ذیل ٹیبل TABLE اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جس سمت کے ساتھ اس نے پتھروں، دھاتوں اور

غیر دھاتوں کی کثافت معلوم کی آج تک اس کی تردید نہیں ہو سکی ہے۔ ٹیبل ملاحظہ فرمائیے۔

ٹیبل ۔ مختلف دھاتوں، غیر دھاتوں اور پتھروں کی کثافت

نام اشیاء		کثافت البیرونی کے مطابق	کثافت موجودہ زمانے کے مطابق
سونا	Gold	19.26	19.26
پارہ	Mercury	13 59	13.59
تانبہ	Copper	8.83	8.85
پیتل	Brass	8 85	8.40
لوہا	Iron	7.74	7.79
رانگا	Tin	7.22	7.29
سیسہ	Lead	11.40	11.35
نیلم	Sapphire	3.90	3.90
یاقوت (روبی)	Ruby	3.60	3.52
زمرد (پنا)	Emerald	2.73	2.73
موتی	Pearl	2.73	2.75
بلور	Quartz	2.58	2.58

البیرونی نے مائعات کی تپش کا اندازہ بذریعہ آب پیما کیا۔ دنیا میں پہلی بار اس نے ثابت کیا کہ وہ قدرتی چشمے جو سورج کی وجہ سے نکل آتے ہیں دراصل پانی میں برقی کیمیائی (Electro - Chemical) عمل کے زور سے اُبھرتے ہیں۔

البیرونی جامع علوم و فنون تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا اور ہمہ وقت تصنیف و تالیف اور غور و فکر میں ڈوبا رہتا۔ مختلف موضوعات پر اس نے ڈیڑھ سو ۱۵۰ سے زائد کتابیں لکھیں جن کے صفحات کا اندازہ بیس ہزار سے زیادہ ہے۔ البیرونی وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوؤں کے قدیم مذہبی لٹریچر مثلاً پران، بھگوت گیتا، رامائن، مہابھارت منو شاستر وغیرہ کو خود پڑھا اور ان کے اقتباسات کو عربی زبان میں ڈھالا اور اپنی تصانیف کے ذریعے ساری دنیا کے سامنے اہلِ ہند کے لٹریچر کو پیش کیا ہندو پنڈت البیرونی کو "ودیا ساگر" کے لقب سے پکارتے تھے۔ ایک مورخ البیرونی کے بارے میں لکھتا ہے کہ

"اس کا ہاتھ قلم کو، اس کی آنکھ مطالعہ کو اور اس کا دل غور و فکر کو صرف کھانا کھانے کے اوقات میں چھوڑتا تھا۔"

کہتے ہیں کہ زندگی کے آخری لمحات میں جب کہ اس پر نزع کا عالم طاری تھا وہ ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ جب اسے اس کا حل معلوم ہو گیا تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کی وفات غزنی میں ۱۰۴۸ء میں ستتر سال کی عمر میں ہوئی۔

حوالہ جات

1 Sayyed Hossein Nasr
An annotated Bibliography of Islamic Sciences with the collaboration of William C Chittick Vol I. (Tehran Imperial Iranian Academy of Philosophy, 1975) pp 198 _ 200
Vol II (1978) Item Nos 2772, 4 3691_2,3766-6

Sayeed Ahmad Khan
A Bibliography of the works of Abul — Raihan al - Biruni (New Delhi Indian National Science Academy, 1982) pp 77

3 M.S Khan
A Selected Bibliography of Soviet publications on al - Biruni, Janus, 62 (Amsterdam, 1975) pp 279 - 88

4 M S Khan
A Classified Bibliography of recent publications on al - Biruni.
Muslim World Book Rev. Vol 10 No 3(1990) pp 65 - 77

5. George Sarton
An introduction to History of Science"
Vol I pp 693.

6. Ibrahim Imadi Nadvi
" Muslim Scientist and their Contributions" (in urdu) Maktaba al Hasnat, Delhi, (1985) pp 188 – 189.

7 Hakim Mohd Said and Dr Ansar Zahid Khan al Biruni – His times, life and works". Renaissance Publishing House, Delhi (1990) pp

8. Attash Durrani.
Contributions of Muslims in Science" (in urdu)
Firdaus publications, Delhi (1982) pp 47

" بدن اور گھر اور لباس سب کی صفائی
تہذیب میں داخل ہے۔ انگریزی مثل ہے کہ
خدا اور خدا کے بعد صفائی۔ مسلمانوں کے ہاں
بھی حدیث ہے "الطہور شطر الایمان"
(پاکیزگی نصف ایمان ہے) مگر ہم مسلمان بہت
کم اس کی طرف متوجہ ہیں۔ صورت دیکھو تو
واہ واہ۔ گھر دیکھو تو سبحان اللہ۔ اس لیے
ہم کو صفائی پر توجہ کرنے کی بھی بڑی ضرورت ہے۔"

سرسید

آسمان کا بادشاہ
عقاب

انگریزی کے شہرۂ آفاق شاعر ورڈز ورتھ نے کہا تھا "عقاب آسمان کا بادشاہ ہے"۔ میں گزشتہ بارہ سال سے اس عظیم اور پروقار پرندے کی زندگی کا مطالعہ کر رہا ہوں اور میرا یہ شوق مجھے ہمیشہ پہاڑوں کی وسعتوں میں گم رکھتا ہے لیکن مجھے اس کی قوت، ذہانت اور شجاعت کو بیان کرنے کے لیے آج تک مناسب الفاظ نہیں ملے۔ چنانچہ میں ورڈز ورتھ کے مذکورہ قول پر قناعت کرتا ہوں۔ جس طرح شیر جنگل کا بادشاہ ہے اسی طرح عقاب فضا کا مطلق العنان حکمراں ہے۔ ہوا اس کے حکم سے چلتی ہے، تمام پرندے اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ وہ اپنے نشیمن سے نکلتا ہے تو چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی جابر شہنشاہ اپنے دربار میں داخل ہو رہا ہے اور درباریوں کی آنکھیں اس کے رعب سے زمین پر گڑی ہوئی ہیں۔

عقاب صدیوں سے قوت، ذہانت، شجاعت صداقت اور آزادی کی علامت بنا ہوا ہے۔ آج سے پانچ ہزار سال قبل بھی دنیا اس کی پروقار زندگی کو اپنے لیے باعث تقلید سمجھتی تھی۔ دنیا کے عظیم ترین شہنشاہ اور جنرلوں نے فرماں روائی اور جہاں بانی کا فن شاید اس عظیم پرندے سے سیکھا ہے۔ پانچ ہزار سال قبل میسوپوٹیمیا میں عقاب کی پرستش کی جاتی تھی اور اس مقصد کے لیے نے لاگاش شہر میں ایک عظیم مندر بنایا گیا تھا حتیٰ دیومالا میں عقاب کو سورج دیوتا کے ایلچی کی حیثیت حاصل تھی اور اس کی جی داری کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ قدیم روم میں عقاب کو فوجی فتوحات کی علامت سمجھا جاتا تھا اور فوجی دستے لڑائیوں کے دوران بھی عقاب کے سنہری مجسمے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس وقت وہ رومیوں کا قومی پرندہ بن گیا تھا۔ اس سے پہلے قدیم مصر میں بھی اسے یہ قدر و منزلت حاصل ہو چکی تھی۔ نپولین نے بھی عقاب کو فرانس کے قومی نشان کا درجہ دیا تھا۔ اس کے بعد جرمن سلطنت نے اسے قومی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ روس اور آسٹریا کی سلطنتوں نے بھی اپنے جاہ و جلال، شان و شوکت کے اظہار کے لیے اسی بے مثل پرندے کا انتخاب کیا۔ تاہم روس اور آسٹریا کے قومی پرچموں پر ایسا عقاب بنا ہوا تھا جس کے دو سر تھے۔ آج بھی عقاب کا علامتی نشان متعدد ممالک کے قومی پرچموں پر دمکتا نظر آتا ہے۔

عقاب انتہائی پھرتیلا اور حوصلہ مند شکاری ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے اب تک وہ شکاریوں کا محبوب پرندہ رہا ہے اور اسے بڑے رکھ رکھاؤ

کے ساتھ پالا جاتا ہے۔ دیومالائی کہانیوں، لوک کہانیوں اور گیتوں میں اکثر اس کا ذکر ملتا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں بہادری اور عزم کا ذکر ہوگا، وہاں عقاب کا ذکر ناگزیر ہوگا۔ وہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ ہرن اور بھیڑ کے چھوٹے بچوں تک کو اپنے پنجوں میں دبا کر اُڑ سکتا ہے۔ اس کے ہر پَر کا وزن ایک چھوٹے پرندے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ بہت پھرتیلا ہوتا ہے۔ جھپٹنا، پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا اس کا شیوہ ہے اور وہ اس بہانے اپنا لہو گرم رکھتا ہے۔ عقاب روزانہ اپنے پر ٹھیک کرتا رہتا ہے جو پرانے بےکار اور بیکار ہوتے ہیں انھیں اپنی نوکیلی چونچ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اس کی دم کے ایک غدود سے ایک خاص قسم کا تیل خارج ہوتا رہتا ہے جو جاندار پروں کو اور زیادہ مضبوط بناتا ہے۔

عام طور پر فروری کے مہینے میں مادہ عقاب گھونسلا بنانا شروع کر دیتی ہے اور اگر گھونسلا پہلے سے موجود ہوتا ہے تو اسے مزید سنوارنے، سجانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سال بہ سال یہ گھونسلا پہلے سے زیادہ بڑا اور گہرا ہوتا جاتا ہے اسکاٹ لینڈ کے ایک پہاڑ پر عقاب کا ایک ایسا گھونسلا بھی دیکھا گیا جس کی اونچائی ۲۰ فٹ اور قطر ۶ فٹ تھا۔

اپریل میں مادہ عقاب انڈے دیتی ہے جو عام طور پر دو سے زیادہ نہیں ہوتے۔ انڈوں پر بھی وہی بیٹھتی ہے۔ باپ صرف غذا مہیا کرتا ہے اور گھونسلے کی محافظت کرتا ہے۔ نوے دن بعد بچے نکلتے ہیں۔ ماں انھیں غذا کا نرم ترین حصہ اپنی چونچ سے کھلاتی رہتی ہے اور پھر وہ رفتہ رفتہ زیادہ سخت گوشت بھی کھانے لگتا ہے۔ پہلا مہینہ وہ کھانے اور سونے میں گزار دیتا ہے اور جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے تو شور مچانے لگتا ہے۔ ساتویں ہفتے میں اس کے پر نکلنے لگتے ہیں اور گیارہویں ہفتے کے اختتام تک مکمل اور بھرپور شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح وہ گھونسلے سے نکل کر آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔



مادہ عقاب جو اپنے آشیانے کی حفاظت کر رہی ہے

میں گزشتہ بارہ سال سے عقاب کی زندگی کا بہت قریب اور گہرائی سے مشاہدہ کر رہا ہوں اور شاید میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اسکاٹ لینڈ کا سنہرا عقاب اپنی برادری میں سب سے

منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں سنہری عقاب کی زندگی کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے جس سے اس کے شب و روز کی دلچسپیوں اور مصروفیات کا اندازہ ہو سکے گا۔

میں ایک بلند پہاڑ پر ایک سنہری عقاب کے گھونسلے سے چند فٹ کے فاصلے پر اپنے کیمرے سنبھالے بیٹھا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد مادہ عقاب اڑتی ہوئی آئی اور گھونسلے کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مشکوک نظروں سے اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں جس سوراخ سے لگا رکھی تھیں اگرچہ وہ بہت چھوٹا تھا پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں مجھے ڈھونڈ ہی نہ نکالے۔ اس کی آنکھیں میرے کیمروں کے لینسوں پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں اس کا جیون ساتھی پرواز کر رہا تھا اور اچھل کر گھونسلے کے قریب آ گئی اور اس کے اندر جھانکنے لگی۔ اندر اس کا ننھا گہری نیند سویا ہوا تھا۔ میں نے اسٹل کیمرے کا بٹن دبا دیا اور یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ بٹن دبنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی اس نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور غور سے اس کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اس کے تمام پر براؤن رنگ کے تھے لیکن گردن کے گرد اس کی رنگت سنہری تھی۔ سورج کی روشنی میں اس کی آنکھیں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے بڑے بڑے خوفناک پنجے چونچ کی طرح زرد رنگ کے تھے۔ میں نے اپنی پناہ گاہ کے گرد چاروں طرف درختوں کی شاخیں اور جھاڑیاں بکھیر دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے

دکھائی نہ دے سکی۔

تھوڑی دیر کے بعد بچے کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ گھونسلے کے درمیان ایک پرندے کا آدھا جسم پڑا ہوا تھا۔ ماں دوڑ کر اس کی طرف گئی اور اپنی چونچ سے اس کے جسم میں کاٹ دی۔ پھر وہ اپنی چونچ سے نرم گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر بچے کی طرف بڑھی اور اس کا پیٹ بھرنے لگی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک یہ عمل جاری رہا۔ اس میں سے موویز کیمرا اسٹارٹ کرنے کا خطرہ مول لینے کی ٹھان لی۔ جب کیمرے کی ٹک ٹک شروع ہوئی تو ماں نے نہ تعجب سے ٹھٹھک کر کیمرے کی طرف دیکھا اور پھر سے اپنے بچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اسٹل کیمرے سے بھی تصویریں کھینچتا رہا۔ مجھے بہت دنوں بعد یہ موقع نصیب ہوا تھا اور میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

بچے کا پیٹ بھر گیا تو ماں خود اپنی شکم پری میں مصروف ہو گئی۔ جب اس کا دل بھر گیا تو اس نے چٹان سے رگڑ کر اپنی چونچ صاف کی۔ اپنے بازوؤں کو تولا اور ایک ہی جھٹکے سے اوپر کی طرف اڑ گئی۔



تقریباً پندرہ منٹ بعد فضا میں سیٹیاں بجنے لگیں اور نر عقاب اپنے پنجوں میں ایک گراؤس دبائے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے پرندے کو گھونسلے کے قریب ڈال دیا اور فوراً واپس چلا گیا۔ وہ جسامت میں اپنی مادہ سے چھوٹا لیکن صاف ستھرا دکھائی نظر آ رہا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ مادہ عقاب بہت جلد واپس آئے گی۔ کیونکہ اسے بچے کی نگہداشت

کرتی تھی۔ وہ واقعی دس منٹ بعد واپس آ گئی۔ اس کے
پنجوں میں تنکوں اور گھاس پھوس کا ایک گچھا موجود تھا
جسے اس نے گھونسلے پر ڈال دیا، اور اپنے ننھے کی طرف
متوجہ ہو گئی۔ پھر وہ اپنی چونچ سے گھاس پھوس اُٹھا
اُٹھا کر بچے کے اوپر ڈالنے لگی حتیٰ کہ وہ اُس کے نیچے
چھپ گیا۔ یہ میرے لیے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔
اس نے اپنے بچے کو زندہ دفن کر دیا تھا۔ بچہ باہر نکلنے
کی کوشش کرتا تو وہ
اس پر اور زیادہ
تنکے ڈال دیتی۔ بعد
میں مجھے معلوم ہوا کہ
بچوں کو دشمنوں سے
بچانے کے لیے یہ
ترکیب استعمال
کی جاتی ہے۔ اس
کے علاوہ وہ سردی سے
بھی محفوظ رہتے ہیں
اس حفاظتی انتظام
سے فارغ ہو کر ماں
ایک بار پھر گھونسلے کو آراستہ کرنے میں مصروف
ہو گئی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سب ٹھیک
ٹھاک ہے تو اس نے گراؤس کا بچا ہوا پاؤں اپنے
پنجوں میں دبایا اور سامنے والی کھائی کی طرف اُڑ
گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد بچے پر غنودگی طاری ہونے
لگی۔ وہ شام چھ بجے تک سوتا رہا اور جب وہ جاگا
تو مجھے چٹانوں پر کسی کے قدموں کی گونج سنائی دی۔
یہ میرا ساتھی ڈنکن تھا۔ اس کی مدد کے بغیر میں یہ
کام نہیں کر سکتا تھا۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ چنانچہ
میں اس کے ساتھ واپس چلا گیا۔





اگلے روز صبح سویرے پھر اپنی "پناہ گاہ" میں
جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت نر اور مادہ دونوں گھونسلے
میں موجود تھے۔ کچھ دن بعد مادہ نے بچے پر الوداعی
نظریں ڈالیں اور آسمان کی طرف اُڑ گئی۔ وہ پونے دو
گھنٹے بعد واپس آئی اور حسب سابق ننھے کو گراؤس
کا گوشت کھلانے لگی۔ جب بچے کا پیٹ بھر گیا اور
وہ چوں چوں کر کے بے زاری کا اظہار کرنے لگا تو وہ
ایک بار پھر کھائی
کی طرف اُڑ گئی۔
اس بار وہ اپنے
ساتھ سبز رنگ کے
بہت سے پتے لائی
تھی، جسے اس نے
گھونسلے پر بچھا دیا
اکثر پرندے اپنے
گھونسلوں میں تازہ
پتے بچھاتے رہتے
ہیں۔ اس طرح
گھونسلہ صاف ستھرا
اور آرام دہ ہو جاتا ہے۔ اتنے میں بچہ سو گیا اور
ایک بار پھر وہ آسمان کی طرف اُڑ گئی لیکن چند منٹ
بعد وہ پھر گھونسلے میں موجود تھی۔ تھوڑی دیر بعد
نر عقاب بھی واپس آ گیا۔ اس کے پنجوں میں ایک
خرگوش کا بچہ نظر آ رہا تھا جسے اس نے گھونسلے پر
پھینکا اور واپس پلٹ گیا۔ چند ہی لمحوں کے اندر
وہ آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔ اس کی پرواز میں
جو وقار اور دبدبہ تھا اسے دیکھ کر فضا ساکن
ہو گئی تھی۔

میں نے ایک بار پھر بچے پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

اب وہ جاگ چکا تھا۔ چوں چوں کر رہا تھا گویا اسے پھر بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ماں خرگوش کی طرف گئی اور اس پر اپنے پنجے گاڑ کر چونچ سے نرم نرم گوشت نکال کر کھلی ہوئی چونچ میں ڈالنے لگی



اس کی آنکھوں میں ممتا کا سمندر موجزن تھا۔ یہ ایک ایسا پُرحسین منظر تھا جسے میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ بچے کا پیٹ بھر گیا تو ماں نے اپنا پیٹ بھرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ بچے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اس عالم میں آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ وہ مجسمے کی طرح بے حس و حرکت اپنے ننھے کی طرف دیکھتی رہی۔ میں مسلسل سوراخ پر نظریں جمائے رہا لیکن اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ محسوس ہوا جیسے وہ مراقبے میں چلی گئی ہے۔ یہ منظر دیکھتے دیکھتے خود میری آنکھیں پتھرا گئیں، حتیٰ کہ میرے اعصاب جواب دینے لگے اور پھر اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ دراصل وہ اپنا کھانا ہضم کر رہی تھی۔

میں کئی روز تک آڑ میں چھپا رہا۔ اس خاندان کی گھریلو زندگی کا مشاہدہ کرتا رہا لیکن اب موسم بدلنے لگا تھا۔ دھند اور بارش کے باعث فوٹوگرافی کا شوق پورا کرنا مناسب نہیں رہا۔ بہرحال ان تمام مشکلات کے باوجود مجھے بچے کو قریب سے دیکھنے اور اس کی تصویریں کھینچنے کا موقع مل ہی گیا۔ اسی دوران ڈنکن نے عقابوں کے ایک دوسرے گھونسلے کا پتہ لگا لیا اور ہم اس طرف جا نکلے۔

گزشتہ سال کسی بدمعاش نے اس گھونسلے میں سے انڈے چرا لیے تھے۔ وہ پکڑا گیا اور اس پر محکمہ جنگلات نے جرمانہ کر دیا۔ اس کے بعد سے محکمہ جنگلات کے ملازمین اس گھونسلے کی کڑی نگرانی کرتے رہے تھے حتیٰ کہ خصوصی اجازت نامہ حاصل کیے بغیر فوٹو بھی نہیں کھینچے جا سکتے تھے۔ تاہم مجھے یہ اجازت نامہ حاصل کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

یہ گھونسلہ ایک دو سو فٹ اونچی چٹان پر بنا ہوا تھا۔ میں محکمہ جنگلات کے گارڈ نیل کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ راستے میں نیل نے مجھے بتایا کہ ایک روز میں گھونسلے سے ذرا دور ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ میں نے دوربین سے دیکھا کہ اوپر سے ایک بھیڑ لڑھکتی ہوئی سیدھی عقاب کے اس گھونسلے پر آ گری۔ اس وقت مادہ عقاب گھونسلے میں انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بھیڑ کو دیکھتے ہی وہ اٹھی اور اپنی چونچ اور پنجوں سے اس پر حملہ کر دیا۔ بھیڑ ڈر گئی اور پیچھے کی طرف ہٹنے لگی لیکن پیچھے ایک گہری خندق تھی۔ اس لیے اس پر سراسیمگی طاری



تھی۔ آگے وہ بڑھ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرف مادہ عقاب اس پر پنجے تانے کھڑی تھی۔ اس کے اوسان جواب دینے لگے۔ گھبراہٹ میں وہ اور پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ میں نے یہ منظر دیکھا تو جلدی سے اٹھا اور اس کی

مدد کرنے کے لیے دوڑ پڑا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے قریب پہنچتا وہ دو دست کبری کھڈ میں گر چکی تھی۔ بھیڑ کے کرنے سے عقاب کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا۔ چنانچہ اب وہاں صرف ایک ... موجود ہے۔ یہ ... سانس لیتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا۔ چند روز بعد میں نے کھڈ میں ایک دوسری جھڑپ کی ... بھی دیکھی۔



شاید اس ... نے اس قسم کا حادثہ پیش آیا تھا۔ ہم گھونسلے کے قریب پہنچے اور میں نے ٹھیک اس جگہ اپنے کیمرے کا اسٹینڈ کھڑا کر دیا جہاں سے پھسل کر وہ دونوں جھڑپ نیچے کھڈ میں جا گری تھیں۔ بہرحال مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نیل نے میرا ایک بازو تھام رکھا اور میں اطمینان سے عقاب کے بچے کی تصویریں کھینچنے لگا۔

جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ مادہ صرف دو انڈے دیتی ہے۔ اس کے باوجود دونوں میں سے صرف ایک بچہ زندہ بچتا ہے۔ کیونکہ جو بچہ مضبوط ہوتا ہے وہ عام طور پر کمزور بھائی یا بہن کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ ایک بار میں اپنے دوست کے ساتھ پہاڑوں پر گھوم رہا تھا کہ ہمیں عقاب کے ایک گھونسلے میں دو بچے نظر آئے۔ ہم چھپ کر ان کا مشاہدہ کرنے لگے۔ اچانک ایک بچے نے اچھل کر دوسرے بچے پر حملہ کر دیا۔ کمزور بچہ اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں تھا اور مسلسل مار کھائے جا رہا تھا۔ دو ہفتے بعد ہمارا پھر وہاں سے گزر ہوا تو کمزور بچے کی لاش نظر آئی۔

عام طور پر مادہ بچہ جسامت میں بڑا ہوتا ہے نر بچہ چھوٹا ہوتا ہے۔ چھ ہفتوں تک یہ نر بچہ مسلسل مادہ بچے کے حملوں کی زد میں رہتا ہے اور وہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ کسی قسم کی مزاحمت تک نہیں کرتا۔ اگر نر بچہ مادہ بچے سے تین چار روز قبل انڈے سے نکلا ہو تو جسامت میں چھوٹا ہونے کے باوجود وہ اپنے خلاف حملوں کی مزاحمت کر لیتا ہے اور زندہ بچ نکلتا ہے لیکن اگر مادہ بچہ نر سے پہلے انڈے سے نکلا ہو تو پھر نر بچے کی موت یقینی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نر عقاب کے مقابلے میں مادہ عقاب زیادہ تعداد میں پائی جاتی ہیں۔

اگر پہلے چھ ہفتے کے دوران مادہ بچہ نر بچے کو ہلاک کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس کے بعد اس بات کا امکان تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد مادہ بچہ سست اور کاہل ہو جاتا ہے جب کہ نر بچہ روز بروز زیادہ سے زیادہ مستعد اور سرگرم ہو جاتا ہے اور عام طور پر اپنے ساتھی سے پہلے ہی پرواز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

بڑے عقابوں کے درمیان آپس میں لڑائی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ میں نے آج تک

ایسی لڑائی نہیں دیکھی۔ تاہم میرے ایک دوست نے پہاڑوں پر گھومتے ہوئے ایک بار دو مردہ عقاب دیکھے تھے جو ایک دوسرے کے چنگل میں جکڑے ہوئے تھے۔ شاید وہ آخری سانس تک لڑتے رہے تھے۔ حتیٰ کہ دونوں ہلاک ہو گئے۔

دوسرے پرندوں کے ساتھ عقاب کی لڑائی کے مناظر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں نے ایک ایسی لڑائی بھی دیکھی ہے جب کہ دو کوّے مل کر ایک عقاب پر حملہ کر رہے تھے۔ یہ واقعہ پرتھ کے ایک دو ہزار فٹ اونچے پہاڑ پر پیش آیا۔ میں سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ مجھے اوپر شور سا اٹھتا محسوس ہوا میں نے دیکھا کہ ایک کوّا تیزی سے اڑتا ہوا اوپر کی طرف گیا اور اس نے غوطہ لگاتے ہوئے ایک عقاب پر جو اس سے کم بلندی پر پرواز کر رہا تھا حملہ کر دیا لیکن عین وقت پر عقاب پھرتی کے ساتھ ایک طرف ہٹ گیا اور کوّا اپنی جھونک میں نیچے چلا گیا۔ عقاب بڑی شان سے اپنے بازو لہرانے لگا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ کوّا ایک بار پھر اڑتا ہوا عقاب کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے تیزی سے غوطہ لگایا اور عقاب پر جھپٹ پڑا لیکن اس بار بھی عقاب نے ایک طرف ہٹ کر اس کا وار ناکام بنا دیا۔ کوّا جھنجھلا گیا اور اس نے کائیں کائیں کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا اور پھر میرے دیکھتے دیکھتے ایک غضبناک کوّی اڑتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ اب میاں بیوی دونوں مل کر عقاب کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک گھنٹے تک ان کے درمیان یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ کوّا اور کوّی غضب آلود تھے لیکن عقاب آخر تک پُرسکون رہا۔ آخر تھک ہار کر کوّی اپنے گھونسلے کی طرف چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد کوّے نے بھی میدان چھوڑ دیا۔

عقاب اسی شان بے نیازی کے ساتھ اپنے لمبے پر پھیلائے پرواز کرتا رہا۔

(ماخوذ)

" انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے، مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہیے۔"

سر سید

زہرا بیگم

محمد اسلم صدیقی ★

زہرا انصاری، ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ انصاری سابق سفیر سوڈان اور ریاست اڑیسہ کے گورنر کی اہلیہ تھیں۔ یہ دونوں مشہور رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے قریبی عزیز تھے۔ شوکت اللہ ان کے حقیقی بھانجے اور زہرا انصاری ان کے چچا زاد بھائی نواب اصغر یار جنگ جج ہائی کورٹ حیدر آباد دکن کی بیٹی تھیں۔ زہرا انصاری کے بڑے بھائی محمد احمد انصاری اڑیسہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔

ڈاکٹر انصاری نے شوکت اللہ شاہ اور زہرا انصاری کو اپنی زیر پرورش رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ زہرا نہایت مخیر، خلیق، ملنسار اور خدا ترس خاتون تھیں گھر میں ہر قسم کے سامان آسائش و راحت کے باوجود، وہ بہت سادہ اور جفاکش زندگی بسر کرتی تھیں۔ ڈاکٹر انصاری کے یہاں ترکی کی خالدہ ادیب خانم کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی رہنماؤں کی ہمیشہ آمد اور قیام کا سلسلہ رہتا تھا۔ گاندھی جی دہلی میں انھیں کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ ان تمام معزز ، مقتدر مہمانوں کی پذیرائی اور آرام و آسائش کا اہتمام، زہرا بیگم کے سپرد تھا جس کو وہ پوری تندہی اور ذمہ داری کے ساتھ انجام د تھیں۔ ان رہنماؤں سے گفتگو اور تعلق کی بنا پر ا کے قلب و ذہن میں انقلابی اثرات اور وسعت ن پیدا ہوئی لیکن گھر کے اندر دینی ماحول تھا۔ ڈا انصاری اور ان کی اہلیہ شمس النساء بیگم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے تعلق بیعت رکھتی تھیں حضرت شیخ الہند مرض وفات کے ایام میں ڈ انصاری کے زیر علاج اور انھیں کے یہاں قیام تھے۔ زہرا بیگم نے حضرت کی بڑی خدمت انج دی۔ زہرا بیگم کا اس ماحول سے متاثر ہونا لاز تھا۔ چنانچہ وہ پوری طرح اس سے متاثر ہوئیں پھر جب ان کے نیک نہاد شوہر ڈاکٹر شوکت شاہ کا انتقال ہوا تو ان کا بیشتر وقت عبادت خدمت خلق میں گزرتا تھا۔ ان کے شوہر جو سفی اور گورنر جیسے ممتاز عہدوں پر فائز تھے، کے انتقال کے بعد جب بینک میں ان کا حسا جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ مرحوم نے بہت معمولی ر چھوڑی ہے۔ حالانکہ بقول زہرا بیگم اسی س مرحوم نے چند ماہ قبل ایک بڑی رقم پر انکم ٹیک

★ غازی پور لاج، سرسید نگر، علی گڑھ

ادا کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ نہایت خاموشی اور رازداری سے حاجت مندوں کی مدد کرتے رہتے تھے۔

زہرا بیگم بھی کارِ خیر اور دینی اداروں کی برابر خدمت کرتی رہتی تھیں۔ غازی پور شہر میں گنگا کے کنارے ایک بڑی وسیع حویلی جو اُن کی ملکیت تھی جس کی مالیت لاکھوں روپیے تھی، انھوں نے وہ پوری حویلی مدرسہ دینیہ غازی پور کو وقف کر دی تھی۔ اس مدرسے سے ان کو ذاتی اور گہری دلچسپی تھی۔

۱۹۸۸ء میں وہ اپنے بڑے لڑکے ڈاکٹر بہجت مختار انصاری جو لندن میں کامیاب معالج ہیں، کے یہاں گئی ہوئی تھیں وہیں ۲۹ جولائی ۱۹۸۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کا وطن ضلع غازی پور کا مشہور مردم خیز قصبہ یوسف پور تھا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ان کے بڑے بھائی اور ہندوستان کے مشہور طبیب حکیم نابینا بھی وہیں کے رہنے والے تھے۔

"جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم نے کسی سولزڈ قوم کی عمدہ خصلتوں اور عادتوں میں پیروی کی تو ہم کو بہت خوشی ہوتی ہے اور جب یہ سنتے ہیں کہ اس نے ان کی بُری عادتوں کی پیروی کی اور شراب پینی شروع کی اور بیگا متوالا ہو گیا اور جوا کھیلنا سیکھا اور بے قید ہو گیا تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری قوم عمدہ باتوں کو سیکھے گی اور بُری باتوں کو ہمیشہ بُرا سمجھے گی۔"

سرسید

آزادی اور خود مختاری ــــ تقابلی مطالعہ

ــ ــ ــ قرآن کے نقطۂ نظر سے

واجد میاں *

آزادی اور خود مختاری کا تعلق گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ہے۔ جس طرح گاڑی کا ایک پہیا نکال دینے سے اس کا توازن بگڑ جاتا ہے، اسی طرح افراد کو صرف خود مختاری دینے سے سماج میں عدم توازن پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سماج میں عدم توازن افراد کے اندر خود غرضی حسد کا جذبہ، آزادانہ جنسی میل ملاپ کے تصورات کیلیے رہنے کی عادت، غیر انسانی حرکات، مکر و فریب اور قوانین سے انحراف و نفس کا غلام رہنے کی عادت پیدا کردیتا ہے۔ لہٰذا سماج میں توازن برقرار رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ پہلے افراد کو آزادی کے دائرے سے واقف کرایا جائے اس کے بعد ان دائروں میں عمل کرنے کی خود مختاری دی جائے تب ہی سماج صراط مستقیم پر قایم رہ سکتا ہے۔ آزادی اور خود مختاری میں توازن اور تناسب پیدا کرکے سماج کو خود غرضی جیسے مہلک مرض سے نکال کر مفاد پسند بنایا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔ خود غرضی اور مفاد پسندی میں نمایاں فرق ہے۔ خود غرض انسان اپنی ہی غرض اور مقصد کو مدّ نظر رکھتا ہے اور اپنے مدّ مقابل کے مفاد کو بالکل نظر انداز کردیتا ہے۔ جب کہ مفاد پسند انسان اپنے مفاد کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مفاد کو بھی مدّ نظر رکھتا ہے۔

عام طور سے زیادہ تر لوگ آزادی اور خود مختاری کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں الفاظ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے جس کو ہم آگے چل کر بتائیں گے اس سے قبل کہ ہم آزادی اور خود مختاری کا قرآن کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان دونوں الفاظ کے معنی و مفہوم کو واضح کردیں۔

آزادی ــــ معنی و مفہوم

آزادی فارسی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی وہ دائرہ ہے جس میں افراد کو بغیر کسی روک ٹوک کے عمل کرنے کی خود مختاری دی جائے۔ اپنے دائروں کو ہم لفظ آزادی سے ظاہر کرتے ہیں۔ انگریزی زبان میں آزادی کو ہم فریڈم Freedom کہتے ہیں۔ لفظ فری ڈم دو الفاظ کا مرکب ہے۔ "Free" اور "Dom" ـ Free بغیر روک ٹوک عمل کرنے والے دائروں کو کہتے ہیں اور ڈم کے معنی دائرہ یا جگہ کے ہیں۔ یعنی Freedom کے معنی میدان عمل کے ہوتے ہیں۔ اسی ڈم Dom سے Kingdom بنا ہے یعنی بادشاہ کا دائرہ یا بادشاہ

* شعبۂ قانون لائبریری، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

کی سلطنت کے حدود بادشاہ کا اسی دائرہ یا ملک تک حکم چلے گا جہاں تک سلطنت کی حد ہے۔ حد سے آگے اس کا حکم نہیں چلے گا۔ اسی dom سے Kingdom، Wisdom، Freedom، Officialdom، Martyrdom اور Random وغیرہ وغیرہ بنتے ہیں۔ مختصراً آزادی ایک قسم کا دائرہ ہے جس کی حدود میں انسان بغیر روک ٹوک عمل کرنے کے لیے خود مختار ہوتا ہے۔ اب ہم آپ کو خود مختاری کے معنی و مفہوم بتاتے ہیں۔

خود مختاری ـــــ معنی و مفہوم

خود مختاری فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ دو لفظ خود اور مختاری کا مرکب ہے۔ خود کے معنی اپنے آپ Self کے ہوتے ہیں اور مختار کے معنی بااختیار کے۔ خود مختاری وہ قوت ہے جو انسان کے عمل کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ ایک ایسا جوہر ہے جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے لہٰذا ہر انسان اپنی پسند کے مطابق عمل کرنے میں بااختیار ہوتا ہے۔ خود مختاری کو انگریزی میں لبرٹی LIBERTY کہتے ہیں۔ لبرٹی LIBERTY لفظ LIBER سے بنا ہے۔ LIBER کے معنی بغیر روک ٹوک کے ہیں۔ مختصراً خود مختاری کا تعلق انسانی قوت اور جوہر سے ہے جب کہ آزادی کا تعلق دائرے سے ہوتا ہے۔ خود مختاری کی حیثیت فاعل Subject کی ہے جب کہ آزادی کی حیثیت مفعول Object کے مانند ہے۔ چنانچہ خود مختاری اور آزادی کا تعلق فاعل اور مفعول کا ہے۔

قرآن اور آزادی

دنیا کے اندر اسلام ہی واحد دین ہے جس نے انسانوں کو آزادی بھی عطا کی ہے اور اس پر عمل کرنے کے لیے خود مختاری بھی دی ہے۔ ورنہ اسلام سے قبل تمام لوگوں میں یہ تصور تھا اور اب بھی ہے کہ نہ جانے خدا کس ادا سے خوش ہو جائے اور کس بات سے ناراض۔ چنانچہ اس کو راضی کرنے کے لیے نئے نئے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں تاکہ وہ خوش ہو جائے۔ افراد کے دلوں میں ہمیشہ خوف بنا رہتا ہے لیکن اللہ نے قرآن میں دنیا کے تمام انسانوں کو بتا دیا کہ میں کن باتوں سے خوش اور راضی رہتا ہوں اور کن باتوں سے ناراض۔ لہٰذا اللہ نے انسانوں کے دل و دماغ سے خوف نکالنے کے لیے دائرے بنائے جن میں بغیر روک ٹوک کے عمل کیا جا سکتا ہے اور وہ ان میں خود مختار ہے۔ جو لوگ بھی ان دائروں کی حدود سے نکلتے ہیں، آخرت میں ان کے لیے عذاب ہے اور دنیا میں بھی سزا ملے گی۔ اب ہم مختصراً چند دائروں کے بارے میں بتاتے ہیں جو قرآن نے انسانوں کی ترقی کے لیے متعین کیے ہیں۔

تجارت کی آزادی

Freedom of Trade & Commerce

اللہ نے مناسب بندش کے ساتھ تجارت کرنے کو حلال قرار دیا ہے تاکہ لوگ تجارت کر کے اپنی ضروریات زندگی کو بہ آسانی پورا کر سکیں اور سماج میں بے روزگاری نہ پھیل سکے۔ اللہ نے اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے"۔

(سورہ البقرہ ۲۷۵)

لیکن ناپاک چیزوں کی تجارت اہل ایمان کے دائرے میں نہیں ہے۔ کیونکہ ناپاک چیزوں کی تجارت کرنے سے سماج میں شر پھیلتا ہے اور خیر ختم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک
بہر حال یکساں نہیں ہیں۔ خواہ ناپاک کی
بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی
ہو۔ پس اے لوگو جو عقل رکھتے ہو
اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو۔ امید
ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔"
(سورۃ المائدہ۔ ۱۰۰)

سود، سور کا گوشت، شراب اور مردار وغیرہ کی تجارت ناپاک ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کو اس سے بچنا چاہیے۔

مذہبی آزادی

Freedom of Religion

اللہ نے مناسب بندش کے ساتھ دنیا کے لوگوں کو مذہبی آزادی عطا فرمائی۔ تاکہ وہ اپنے اپنے مذہب پر جو ان کو پسند ہو چل سکیں۔ لہٰذا اللہ نے اس سلسلے میں اہل ایمان کو حکم دیا:

"دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی
نہیں ہے۔"
(سورۃ البقرۃ۔۔ ۲۵۶)

اس کے ساتھ اہل ایمان پر بندش بھی عائد کر دی۔

"یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن معبودوں
کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو۔"
سورۃ انعام۔۔ ۱۵۹

علم کی آزادی۔

"Freedom of Education"

اللہ نے انسان کو موزوں ترین ساخت میں پیدا کیا۔ اسے حواس خمسہ Sense of Organ دیے تاکہ وہ علم حاصل کر سکے، بغیر علم کے انسان و جانور میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا اللہ نے علم حاصل کرنے کی آزادی ہر انسان کو دی۔ اللہ نے اس بارے میں حکم دیا:

"پڑھو تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم
کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ
علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"
(سورۃ العلق۔۔۳۔۴۔ ۵)

چنانچہ وہ علم جو سماج میں شر پیدا کرے اس کو حاصل نہیں کرنا چاہیے اور وہ علم جو سماج میں خیر پیدا کرے اللہ نے اس کو حاصل کرنے کی پوری آزادی انسانوں کو دی ہے۔

زبان کی آزادی

Freedom of speech and expression

اگر انسان کو زبان کی آزادی نہ دی جائے تو وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ انسانوں کو خیالات کے اظہار کی آزادی ملنی چاہیے۔ تب ہی خیر کے پہلوؤں پر بحث و مباحثہ ہو سکتا ہے۔ بدنصیبی سے زیادہ تر اپنے آپ کو مسلم ممالک کہلانے والے حکمرانوں نے یہ دائرۂ اختیار عوام کو نہیں دیا اور اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو فرمان خداوندی کا درجہ دیتے ہیں۔ کوئی بھی ان کے الفاظ پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ عمل قرآن کے لحاظ سے غلط ہے۔ قرآن نے اہل ایمان کو خیالات کی آزادی دی ہے لیکن مسلم حکمرانوں نے اس کو عوام سے چھین لیا اور ان لوگوں کو نگا بہرہ بنا کر چھوڑ دیا۔ مغربی ممالک نے تو یہ حق ۱۸ ویں صدی میں اپنے عوام کو دیا تھا جبکہ قرآن نے یہ حق ۱۴۰۰ سال قبل اہل ایمان کو دے دیا تھا

"اے نبی! میرے بندوں سے کہہ
دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں
جو بہترین ہو۔"
(سورہ بنی اسرائیل۔ ۵۳)

چنانچہ سچی، اچھی اور حقیقت پر مبنی ہی باتوں کو زبان اور قلم سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ جھوٹی لغو اور بے بنیاد باتیں جو سماج میں شر پھیلائیں ان پر بندش لگانے کا حکم دیا

"اللہ بُرائی پر زبان کھولنا پسند نہیں کرتا۔"

(سورۃ النساء ۔۔ ۱۴۸)

آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ اور اخبارات بُرائی کے نظریے سے جھوٹی خبریں شائع کر کے اور افواہیں پھیلا کر سماج میں شر پیدا کرتے ہیں۔ یہ تحریر و تقریر کا ناجائز استعمال ہے۔ درحقیقت ایسے لوگ اور ایسے اخبارات شیطان ہیں اور نفس کے غلام۔

چلنے پھرنے کی آزادی

Freedom of Movement.

آج کل پاسپورٹ بنوا کر کوئی فرد ایک ملک سے دوسرے ملک جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں کسی ملک میں جانے کی پابندی عائد ہے۔ آنے جانے کی آزادی اِسلام نے تمام افراد کو عطا کی ہے تاکہ وہ ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکیں۔ کیوں کہ "درحقیقت زمین اللہ کی ہے۔" سورۃ الاعراف ۱۲۸۔ "وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں۔" سورۃ البقرہ ۲۹۔

لہٰذا اللہ کے بندوں پر زمین پر چلنے اور گھومنے پھرنے پر کون پابندی لگا سکتا ہے۔ ہاں باہر جانے کے لیے اللہ نے مردوں اور عورتوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر دیا ہے جو گھر سے باہر نکلتے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ نے اہلِ ایمان کو اس بارے میں حکم دیا:

"اے نبی مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظر بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔" (سورۃ النور ۔ ۳۰)

اسی طرح اللہ نے عورتوں کے لیے ضابطہ مقرر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اے نبی! مومن عورتوں سے کہدو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔" (سورۃ النور ۔ ۳۱)

چنانچہ اللہ نے عورتوں اور مردوں کو موومینٹ کی آزادی دی ہے۔

تنظیم بنانے کی آزادی

Freedom of Association

اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم خیال افراد مل کر تنظیم بنا کر کام کر سکتے ہیں۔ اتحاد میں جو طاقت ہے وہ منتشر اور بکھرے ہوئے لوگوں میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ تنظیم تشکیل دینے کا پیمانہ اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کو بنایا۔ تاکہ خیر شر کو سماج سے ختم کر دے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔" (سورۃ التوبہ ۔ ۷۱)

جو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔"

سورۃ التوبہ ۷۱۔"

اسی طرح سے

"منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔"

(سورۃ التوبہ ۔ ۶۷)

جو "بُرائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے

منع کرتے ہیں:۔

(سورۃ التوبہ - ۶۷)

ہم نے مختصراً ان دائروں کی حقیقت آپ کے سامنے پیش کر دی جن میں انسان بغیر روک ٹوک کے عمل کر سکتا ہے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے دنیا میں ترقی اور خوش حالی لا سکتا ہے۔ اب آپ کے سامنے آزادی اور خود مختاری کا تعلق بیان کرتے ہیں تاکہ دونوں الفاظ کا مفہوم آسانی سے واضح ہو سکے۔

آزادی اور خود مختاری کا تعلق

جیسا کہ ہم مذکورہ بالا سطروں میں تحریر کر چکے ہیں کہ آزادی کا مطلب بغیر روک ٹوک ہوتا ہے جبکہ خود مختاری کا مطلب با اختیار ہے۔ انسان کو اللہ نے پورا اختیار نہیں دیا ہے۔ اس کو یہ خود مختاری مناسب بندش کے ساتھ دی گئی ہے۔ تاکہ سماج صراط مستقیم پر قائم رہ سکے۔ مثلاً قرآن نے تجارت کی آزادی دی ہے چاہے وہ زیورات کی تجارت کرے یا کل پرزوں کی۔ چاہے ہوٹل کی تجارت کرے یا کمانے کی۔ چاہے وہ فیکٹری کھولے یا جینی مل لگائے وغیرہ وغیرہ۔ وہ تجارت کرنے میں خود مختار ہے لیکن حرام چیزوں کی تجارت کرنے میں وہ خود مختار نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن نے ایسی تجارت سے باز رکھا ہے جو ناپاک ہیں۔ جیسے سور کے گوشت کی تجارت شراب کی تجارت اور سود کی تجارت وغیرہ۔ اس کے علاوہ اللہ نے انسانوں کو زبان کی آزادی دی ہے وہ اس دائرے میں رہ کر اسی وقت تک خود مختار ہے جب تک کہ وہ زبان کا استعمال حق اور سچ کے لیے کرتا ہے اس کی خود مختاری وہاں ختم ہو جاتی ہے جب وہ زبان کا استعمال جھوٹ اور شر کے لیے کرتا ہے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے مذہبی آزادی ملی ہوئی ہے:۔

"دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔"

(سورۃ البقرہ - ۲۵۶)

لہٰذا وہ کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے میں خود مختار ہے لیکن دیگر مذاہب کو برا کہنے کی خود مختاری نہیں ہے۔ چنانچہ انسان اپنے مذہب پر عمل کرنے میں خود مختار ہے لیکن دیگر مذاہب کو برا نہیں کہہ سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن معبودوں کو پکارتے ہیں، انھیں گالیاں نہ دو"

(سورۃ الانعام ۱۵۹)

مختصراً یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور جو

"اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں"

سورۃ البقرہ ۲۲۹ -

یعنی اللہ کی نگاہ میں وہی عمل صالح ہیں جو اللہ کے متعین کردہ حدود میں رہ کر کیے جائیں۔ کیونکہ انسان نہ بالکل خود مختار ہے اور نہ بالکل مجبور ہے بلکہ وہ کچھ دائروں میں خود مختار ہے اور کچھ میں مجبور۔ اللہ ہی کی ذات کلی با اختیار ہے۔

"اللہ ہی کے ہاتھ اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔"

(سورۃ الروم - ۴)

۱۹۹۱ء کا پہلا نتیجہ اور شیروانی انعامات

احمد رشید شیروانی ○

۱۹۹۱ء کا نتیجہ سب سے پہلے اتر پردیش کے ضلع غازی آبادی بپیڑا جونیر ہائی اسکول سے آیا الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ و جیپ انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے اس اسکول کے پانچ ہونہار ترین طلباء طالبات کے لیے انعامات دلی دعاؤں کے ساتھ بھیجے جا رہے ہیں۔ ان ہونہار بچوں کے نام ہیں

۱۔ حامد علی سلمہٗ ڈیڑھ سو روپیے
۲۔ نوشاد علی سلمہٗ سو روپیے
۳ تبسم ناز سلمہا اسی روپے
۴۔ رقعی ارم سلمہا ساٹھ روپیے
۵۔ فوزیہ کرمانی سلمہا ساٹھ روپیے

اتنی مستعدی سے نتیجہ بھیجنے کے لیے ہم اس موقر اسکول کے ہیڈ ماسٹر محترم غفران عظیم صاحب کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ انھوں نے فارموں کا بھی انتظار نہیں کیا۔ نہایت دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انھوں نے گذشتہ سال کے خالی فارموں کی فوٹو کاپیاں کر کے رکھ لی تھیں اور ان کو اس سال کا نتیجہ بھیجنے کے لیے استعمال کیا۔ اگر دیگر مدارس کے ہیڈ ماسٹر صاحبان و صاحبات بھی اسی طرح دور اندیشی سے کام لیں یعنی سادہ فارموں کی فوٹو کاپیاں کرا کے رکھ لیں تو جو رزلٹ نکلتے ہی ایک اسکول کے ہیڈ یا پرنسپل (خود یعنی ہمارے فارموں کا انتظار کیے بغیر) نتیجہ ہم کو بھیج سکتے ہیں۔ اس سے بہت وقت بچے گا اور ہونہار ترین بچوں کو انعامات بھی جلد از جلد بھیجے جا سکیں گے۔ محترم غفران عظیم صاحب کی بیداری، مستعدی اور دور اندیشی قابل ستائش اور قابل مبارک باد ہے۔

پچھلے سال یعنی ۱۹۹۰ء میں اس اسکول سے کل بائیس بچے بورڈ امتحان میں شریک ہوئے تھے سب کے سب یعنی سو فیصد پاس ہوئے تھے اور گیارہ یعنی قریب پچاس فیصد فرسٹ ڈویژن لائے تھے۔ اس سال یعنی ۱۹۹۱ء میں بیالیس بچے شریک ہوئے۔ سب کے سب یعنی سو فی صد پاس ہوئے اور بیس یعنی اڑتالیس فی صد

○ کناٹ پیلیس، نئی دہلی۔

فرسٹ ڈویژن لائے۔ یعنی فرسٹ ڈویژن کا تناسب پچھلے سال کی بہ نسبت اس سال کافی بہتر ہوا۔ اس بہتری کے لیے بھی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب اُن کے ٹیچر ساتھیوں اور دیگر متعلقین کو دلی مبارکباد۔

مسلمانوں کا تناسب دیکھ کر اور زیادہ خوشی ہوئی۔ پچھلے سال یعنی ۱۹۹۰ء میں اس اسکول سے جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے بتیس بچوں میں سے بیس یعنی باسٹھ فیصد مسلم تھے۔ اس سال یعنی ۱۹۹۱ء میں شریک امتحان والے بیالیس میں سے چونتیس یعنی اکیاسی فی صد مسلم ہیں۔ یعنی مسلم بچوں کا تناسب باسٹھ فی صد سے بڑھ کر اکیاسی فی صد ہو گیا۔

پچھلے سال بیس مسلم بچے شریک ہوئے تھے۔ اس سال چونتیس شریک ہوئے۔ چودہ عدد کا یہ اضافہ ستر فی صد ہے۔ کسی بھی اعتبار سے یہ ترقی کی طرف ایک لمبا قدم مانا جائے گا۔ ہم اس علاقے کے مسلمانوں کو صحیح سمت میں ایک لمبا قدم بڑھانے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید و دعا کرتے ہیں کہ ترقی کی طرف بڑھتے ہوئے یہ قدم آئندہ تیز تر ہو جائیں۔

موازنہ

کس نے زیادہ ترقی کی؟ مسلم لڑکوں نے؟ یا مسلم لڑکیوں نے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم لڑکوں کی تعداد سولہ سے بڑھ کر پچیس ہوئی۔ نو عدد کا یہ اضافہ چھپن فی صد ہے۔ مسلم لڑکیوں کی تعداد چار سے بڑھ کر نو ہو گئی۔ پانچ عدد کا یہ اضافہ ایک سو پچیس فی صد ہے۔ یعنی مسلم لڑکیوں کی ترقی کی رفتار مسلم لڑکوں کی ترقی کی رفتار سے تیز تر ہے۔

لیکن اب بھی مسلم لڑکیاں آٹھویں کلاس کی سطح پر مسلم لڑکوں سے پیچھے ہیں۔ پچھلے سال ۱۹۹۰ء میں چار مسلم لڑکیاں اور ۱۶ مسلم لڑکے بورڈ امتحان میں شریک ہوئے تھے۔ یعنی لڑکیاں لڑکوں سے چار گنا پیچھے تھیں۔ اس سال یعنی ۱۹۹۱ء میں نو مسلم لڑکیاں اور پچیس مسلم لڑکے شریک ہوئے۔ یعنی اب مسلم لڑکیاں مسلم لڑکوں سے صرف پونے تین گنا پیچھے ہیں۔

طریقۂ زندگی — یہ تو ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریق زندگی ہمارے طریقۂ زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

سر سید

BUILDING DEPARTMENT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH

D. No.... ..../Bldg. Dated ... .

TENDER NOTICE

Sealed tenders on percentage/item rate basis are invited to be received on 6th August 91 upto 1-00 P.M. The tender will be opened on the same date at 3-30 P M Tender documents can be obtained from the office of the University Engineer on any working day during office hours

Sale of tender forms will be stopped 24 hours before the time for receiving the tenders

No.	Name of work	Amount put to tender	Earnest Money	Cost of tender	Time of Completion
	Reterracing over roofs of New Lecturer Qtrs. 24 Nos at Zakir Bagh, No 10 & 7, Shibli Road, & No 4 University Road, PVC office & Servant Qtrs. A M.U.. Aligarh.	1,84,410/-	4 610/-	20/-	four Months

Estimates based on DSR.-1985.

132/457

(Lt. Col. Hasan Muzaffar)
UNIVERSITY ENGINEER

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ۱۰ — اگست ۱۹۹۱ء — شمارہ ۸

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر

شباب الدین

تزئین ... ممتاز

انچارج سرکولیشن ... مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ:
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
EDITOR: TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ:
انڈیا .. ... Rs. 45.00
بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک
US $ 8.00 عام ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ:
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا۔

مندرجات

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق ہو ۔

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ ظفات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۔ پریس۔ اے۔ ایم۔ یو۔ پریس۔ علی گڑھ

اداریہ

قارئین تہذیب الاخلاق کو یوم آزادی مبارک ہو۔ آزادی بہرحال آزادی ہے خواہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہم کو کتنے ہی سنگین مسائل کا سامنا کیوں نہ ہو۔ یہ درست ہے کہ ہمارے معاشرے میں فرقہ وارانہ جذبات و احساسات آگ لگایا کرتے ہیں۔ علیحدگی پسندی کے رجحانات کی وجہ سے اکثر خون خرابہ ہوتا رہتا ہے۔ صارفیت نے ملکی معیشت پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ وہ سسکنے لگی ہے افراطِ زر کا کالا ناگ ہم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ بدعنوانی اور بے ایمانی ہماری زندگی کا معمول بن گئی ہے اور فرض ناشناسی ہم ہندوستانیوں کا طرۂ امتیاز۔ یہ سب کچھ ہے مگر ہم آزاد ہیں۔ کسی کے غلام نہیں۔ اپنی سمت سفر خود متعین کرنے والے ہیں کسی کے محتاج نہیں۔ اپنے مفادات کی حفاظت خود کرنے والے ہیں کسی کے دست نگر نہیں۔

آزادی ایک نعمت ہے اور اس کی حفاظت ہمارے معاشرے کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے یہ نہیں ہے کہ اس کی ذمہ داری صرف حکومت پر عائد ہوتی ہو اور عوام اس کی حفاظت سے بے نیاز ہوں۔ آزادی کی حفاظت کی ذمہ داری عوام پر بھی اتنی ہی ہے جتنی حکومت پر۔ حکومت قوانین بنا سکتی ہے لائحہ عمل دے سکتی ہے۔ سمت سفر کی طرف اشارہ کر سکتی ہے، اپنی ترجیحات متعین کر سکتی ہے مگر قوانین پر عمل کرکے ان میں زندگی کی روح پھونکنا، لائحہ عمل کو بامقصد و بامعنی بنانا، آغاز سفر کرنا، ترجیحات کو قبول یا مسترد کرنا ہمارا کام ہے۔

وہ مسائل جن کو آج تک کی حکومتیں حل نہیں کر سکی ہیں، اُن کے رد عمل ہونے کی ذمہ داری صرف حکومتوں پر ہی عاید نہیں ہوتی ہم پر بھی عاید ہوتی ہے۔ رشوت خوری، اقربا پروری، فرض ناشناسی جیسے امراض کا رونا تو رویا جاتا ہے مگر ان کو ختم کرنے کے لیے کوئی مثبت عوامی اقدام نہیں کیا جاتا۔ اگر ہمارے معاشرے کا ہر فرد یہ طے کر لے کہ وہ رشوت نہیں دے گا تو رشوت خوری کی وبا کو ایک دن میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہر فرد و بشر اقربا پروری کے خلاف متحد ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس لعنت کو ختم نہ کیا جا سکتا ہو۔ کچھ ایسا ہی حال فرض ناشناسی کا بھی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص یہ بات

طے کرلے کہ اس کے ذمے جو کام ہے اس کو وہ ایمان داری کے ساتھ ضابطے کے مطابق کرے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ فرض ناشناسی کو حرفِ غلط کی طرح مٹایا نہ جاسکتا ہو اور موجودہ حالات کو نہ بدلا جاسکتا ہو۔

جب ہم معاشرے کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد صرف عوام سے نہیں ہوتی۔ میر و وزیر، شاہ و گدا، مرد و زن، افسر و ماتحت سب ہمارے معاشرے کی اکائیاں ہیں اور یہی اکائیاں مل جل کر معاشرہ بناتی ہیں۔ کسی قوم میں جس طرح کی اکائیوں کا غلبہ ہوگا، اُس قوم کا معاشرہ اُسی طرح کا ہوگا۔ اکائیوں کو درست کر دیجیے، راہِ راست پر لے آئیے، جفاکش، محنتی اور فرض شناس بنا دیجیے معاشرہ خود بخود بدل جائے گا اور مسائل کے حل نگاہوں کے سامنے آنے لگیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ اکائیوں کے اندر قلبِ ماہیت ہو، ان کا اندازِ کار، نقطۂ نظر، اندازِ فکر تبدیل ہو، صارفیت کے خوشنما اور دلکش سراب سے نگاہیں پھر جائیں۔

یہ عمل ایک دن میں انجام نہیں دیا جاسکتا، اس کے لیے سخت جد و جہد کی ضرورت ہے۔ اس راہ پر چلنے کے لیے پتھر کا جگر چاہیے اور ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ سعیِ مسلسل چاہیے جو قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ اگر ہم کو کوئی کام کرنا ہو تو اس کی ابتدا آج بلکہ ابھی سے کرنی چاہیے۔ اس لیے ہم کو یومِ آزادی کے مبارک موقع پر یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہم سب مل جل کر، ایک قدم اور ایک زبان ہوکر اپنے قول، فعل اور عمل سے اپنی آزادی کی حفاظت کریں گے اور اس پر کسی طرح کی کوئی ہلکی سی بھی آنچ نہ آنے دیں گے۔ آزادی نعمتِ خداوندی ہے اور اس کی حفاظت نہ کرنا کفرانِ نعمت۔ ہم سب متحد ہوکر آج ہی سے اس بات کی کوشش کریں کہ ہم کفرانِ نعمت کے مرتکب نہ ہوں تاکہ ہماری آزادی برگ و بار لاتی رہے اور ہم اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا معاشرہ چھوڑ جائیں جس میں مسائل کے خارزار کم تر ہوں اور پیشرفت کی راہیں بیشتر۔

[illegible]

خیر دائم

سر سید احمد خاں

غالباً تمام دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ نیکی بلا شبہ نیک ہے اور اس لیے اس بات کا ماننا بھی لازم آتا ہے کہ ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل اور اعلیٰ نیکی ہو۔

انسانوں میں نیک وہی ہوگا جس نے بہت سی نیکیاں کی ہوں گی مگر سب سے زیادہ نیک وہی ہوگا جس نے ایسی نیکیاں کی ہوں جو سب نیکیوں سے افضل اور اعلیٰ ہوں۔

مسلمانوں کے عقائد کے مطابق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نیک ترین بندگان خدا ہیں اور اس لیے ضرور ہے کہ وہ ایسی نیکیوں کے منبع یا مخزن ہوں جو تمام نیکیوں سے اعلیٰ اور افضل ہوں۔ ورنہ ترجیح بلا مرجح ہوگی۔ اس لیے ہر ایک انسان کو ایسی نیکی جو ہمیشہ رہنے والی ہے تلاش و تجسس لازم ہے۔

بعضوں نے پل اور مسجد، چاہ و مہمان سرائے چند روزہ رہنے والی چیزوں کو خیر دائم سمجھا اور بہت بڑی غلطی کی۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں ادنیٰ حادث سے فنا اور معدوم ہونے والی ہیں۔ اب کہاں ہے وہ چاہ یوسف اور کہاں ہے وہ مسجد اقصیٰ، سب معدوم ہو گئیں اور اسی طرح ہزاروں بنیں گی اور معدوم ہوں گی۔

نہایت فہمیدہ اور دقیقہ رس لوگوں نے خیر و خیرات میں زہد و تقویٰ اور عبادت کو خیر دائم خیال کیا مگر اس کی صحت بھی مشتبہ ہے۔ تمام اعمال حسنہ آنکھیں موندیں اور منقطع ہوئے جب کہ انسان موت کی خواب راحت میں استراحت فرماتا ہے تو اعمال حسنہ کا انقطاع ہو جاتا ہے۔ زاہد کی تسبیح ہر تن دانہ اشک بن کر روتی ہے کہ وہ کیا ہوا جو مجھ کو شمار وظائف سے زندہ رکھتا تھا۔ مصلیٰ محراب مسجد میں چیت پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا کہ وہ کہاں ہے جو اپنی پیشانی سے مجھ کو جان تازہ بخشتا تھا۔ منبر فراق واعظ سے دل شکستہ ہے کہ میرا واعظ کہاں ہے۔ ملائکہ مقربین جو اس کے ذکر و شغل کی مجلس کی خیر و برکت لینے کو آتے تھے اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور یہ یک مشت خاک ہزاروں من مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ نہ اپنی کچھ کہتے ہیں اور نہ کسی کی سنتے ہیں صرف زبان حال ان میں باقی ہے۔ سو وہ یہ کہتی ہے کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا اور جو کرنا تھا سو کر لیا۔

غرض کہ ہر ایک قسم کی نیکی کو جب خیال کرو گے تو وہ اسی شخص کی ذات پر منحصر ہوگی۔ اور اس کی فنا کے ساتھ ہی منقطع ہو گی۔ اس لیے زہد و تقویٰ عبادت و سخاوت خیر دائم نہیں ہو سکتی۔

اگر غور سے دیکھا جاوے اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جاوے تو بجز رفاہ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔ انسان کی بھلائی نہ نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اس زمانے کے انسانوں کے فنا ہونے سے فنا ہوتی ہے بلکہ نسل در نسل اور پشت در پشت آئندہ انسانوں میں چلی آتی ہے اور قیام دنیا تک قایم رہتی ہے اور اس لیے صرف وہی ایک نیکی ہے جس کو خیر دائم کہہ سکتے ہیں۔

یہی نکتہ تھا جس کے سبب خدا تعالیٰ نے انسان کی بھلائی چاہنے کی خدمت انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام کو دی تاکہ برترین بندگان خدا نیک ترین نیکیوں کے منبع اور مخزن ہوں اور خیر دائم ان میں باقی رہے پس انسان کی بھلائی میں سعی کرنا انبیاء کا ورثہ لینا ہے اور تمام نیکیوں میں افضل اور اعلیٰ نیکی کا اختیار کرنا ہے۔ پس فلاح عام کے کاموں کو عبادات دینی میں سے نہ سمجھنا اور صرف نوافل اور مندوبات اور تسبیح و تہلیل ہی کو عبادت سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔

یہ خیر دائم جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور بھی زیادہ نیک تو اس وقت ہو جاتی ہے جب کہ اس کی ضرورت ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں اور بالتخصیص مسلمانوں کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے اور اس لیے میری خواہش مسلمانوں سے یہ ہے کہ وہ صرف تسبیح و تہلیل و زہد و تقویٰ پر ہی تکیہ نہ فرمادیں اور صرف ادائے زکوٰۃ و نماز ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ تھوڑا سا وقت اور چار درم رفاہ و فلاح حال مسلمانان کے لیے بھی نکالیں اور خیر دائم کی نیکی کو بھی حاصل کریں کہ صرف یہی ایک نیکی ہے جو ہمیشہ رہے گی۔

"اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو لوگ ظلم ہونے کا بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (الشوریٰ۔ ۳۹-۴۲)

دو آتشہ

سید حامد *

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوانِ شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

غفلت میں پاؤں کسی کاسۂ سر پر پڑ جائے، یہ بات تصور میں آسکتی ہے (حالانکہ جس کا پیر اس طرح پڑ جاتا وہ خود لرزہ براندام ہو جاتا) لیکن جو خبر آج (۱۳ رمئی ۹۰ء) کے ٹائمز آف انڈیا کے دہلی ایڈیشن میں کاسۂ سر کے موضوع پر نظر سے گزری اسے تصور ایک لمحہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ واضح ہو کر حقیقت کا سفر تصور کے دائرہ میں محدود نہیں رہتا۔

ماسکو میں چند نوجوانوں نے مردہ گھر سے تین آدمیوں کے سر چرائے اور گھر پر لاکر انھیں کھولایا۔ مقصد سروں کے سرِ قد اور طباخی کا یہ تھا کہ کاسہ ہائے سر سے راکھ دانیاں یا ایش ٹرینز بنائی جائیں۔ ہونہار نوجوانوں نے بہ یک وقت دو جگہ آگ لگانے کا اہتمام کیا۔ ایک سگریٹ پی کر اپنے پھیپھڑوں کو پھونکنے کا، دوسرے سر کو تنِ مردہ سے جدا کر کے اور پانی میں اُبال کر تہذیبی قدروں اور روایتوں کو خاکستر کر دینے کا۔ تہذیب کی ایک نشانی مرے ہوؤں کا احترام ہے۔ مرنے والوں کی تحقیر خود زندگی کی توہین ہے ایسی بے دردی اور بہیمیت کا ارتکاب جانور بھی نہیں کرتے۔ لیسے نوجوانوں سے تو آدم خور انسان بہتر ہیں۔ ان کے فعل میں ایک مقصد ہے، اشتہا کی تشفی۔ یہاں کوئی مقصد ہی نہیں۔ اور اگر ہے تو نوعِ انسان کی تحقیر اور تذلیل کا بھیانک مقصد۔

تہذیب دشمنی کی ایسی حرکات کسی ایک خطے یا مکتبِ سیاست کی جاگیر نہیں۔ اقدار شکنی اور تہذیب سوزی کی وبا سے روئے ارض کا کوئی خطہ نہیں بچا۔ فرق صرف درجے کا ہے۔ اس حمام میں اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں ننگے ہیں۔

جو لوگ حیات بعد موت کے قایل نہیں ان سے یہ امید ہی کیوں کی جائے کہ اس جسم کو جو بے جان ہو گیا ہے حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ ہمارے دور میں یہ ہنر کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ان چیزوں کو جو ردی سمجھ کر پھینک دی گئی ہیں، نئی شکلیں دے کر کارآمد بنا دیا جائے۔ مثلاً خالی ڈبوں، شیشیوں، بوتلوں، کارکوں، جوتوں، شیشے کے ٹکڑوں، کپڑے کے چیتھڑوں، انڈوں کے چھلکے سے روزانہ استعمال یا زیبائش کی اشیا بنائی جاتی ہیں۔ اگر ردی اور کوڑے پر پھینکی ہوئی چیزوں کو نئی زندگی اور نئی سج دھج دی جا سکتی ہے تو غریب آدمی نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کے بے جان سر اور دھڑ کو استعمال میں نہ لایا جائے؟ ہنر کی اس دور میں اگر دوڑ شروع ہو گئی تو کیا عجب کہ اس مشتِ خاک کو کارآمد بنانے والوں کو اولیت کا نشان

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

مل جائے اور ان کا نام "گنیس بک"
میں نوعِ انسانی کی (عبرت نہیں) ستائش کے لیے رقم ہو جائے۔
غور کیجیے تو کاسۂ سر کو ایک بار کھولانے اور پھر
تا اختتامِ حیاتِ ثانی، سگریٹ کے جلتے ہوئے ٹکڑوں اور گرم راکھ
کا مسکن بنانے میں ایک رعایت اور علامت پنہاں ہے۔ جو
کاسۂ سر تیز رو اور شعلہ افشاں زندگی کی پیچیدگیوں سے تا حیات
دہکتا رہا ہے، اسے وہ سکون، وہ اُداسی، وہ ٹھنڈک جو
موت اپنے ساتھ لاتی ہے، کیوں راس آنے لگی۔ جلنے اور
تپنے کا حق تو جب ادا ہوگا کہ کاسۂ سر ہمیشہ جلتا اور تپتا ر...
عام اس سے کہ اس میں زندگی ہے یا نہیں۔ سگریٹ کے جلے
ہوئے ٹکڑوں کی دھیمی آنچ میں اسے تپنے، پکنے اور پختہ ہو
دیجیے۔ تاکہ اگر کوئی غافل پاؤں اس پر پڑ بھی جائے (تا
کے ٹوٹنے اور چور چور ہو جانے کی نوبت
نہ آئے۔

غیرت اور عزت یہ دونوں آپس میں ایسی ملی
ہوئی ہیں کہ کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ جس کو عزت ہے
اس کو غیرت ہے اور جس کو غیرت ہے اس کو
عزت ہے۔ اب مسلمانوں میں ان دونوں چیزوں
کی کمی کیا، بلکہ وہ معدوم ہو گئی ہیں۔ اگرچہ میری
اس بات سے لوگ متعجب ہوں گے کہ مسلمان کیونکر
ایسے ہیں۔ اگر ابھی ان کو کوئی گالی دے جان
نکال لیں، مرجائیں پر اپنی شان نہ جانے دیں۔
شادی بیاہ میں ہرگز ناک کٹائی نہ ہونے دیں
روپیہ قرض لیں اور شادی دھوم سے کریں۔ اگر
باوا مر گیا ہے تو اس کی فاتحہ اور چہلم کی تورہ بندی
میں کبھی دریغ نہ کریں، پھر کیوں کر ان کو اپنی عزت
یا غیرت کا خیال نہیں ہے۔"

۲۰ ستمبر ۹۱

ایجادات اور ان کا پس منظر

محمد زکریا ورک *

ذہانت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب مختلف ادوار میں مختلف لوگ اپنی اپنی قابلیت کے مطابق دے چکے ہیں مگر آج تک کوئی متفقہ اور فیصلہ کن جواب نہ دے سکا۔ دنیا کے نامور سائنس دانوں (آئن سٹائن اور نیوٹن) اور موسیقاروں موزارٹ (MOZART) فلاسفروں افلاطون ارسطو اور برٹ رانڈ رسل کے عظیم کارناموں کو ذہانت کے ماسوا کیا کہا جا سکتا ہے یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ ایسے عظیم انسانوں کو خدا نے زبردست ذہنی طاقت BRAIN POWER سے نوازا تھا اور مزید یہ کہ ایسے لوگ یقیناً GIFTED تھے۔

ذہانت کو بیان کرنے کے لیے دنیا میں اس وقت دو رائے پیش کی جاتی ہیں۔ ایک مکتبۂ خیال کا یہ کہنا ہے کہ ذہانت ہر انسان کے اندر ایک مقرر مقدار میں ودیعت ہوتی ہے۔ دوسرے مکتبۂ خیال کا کہنا ہے کہ ذہانت، محنت اور کاوش سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں امریکہ کے مشہور سائنسداں اور موجد تھامس ایڈیسن (EDISON) کا مقولہ بہت موزوں ہے۔ ایڈیسن نے کہا کہ ایجاد دراصل خون پسینے سے ہوتی ہے نہ کہ القاء سے

"INVENTION IS MORE A PRO-DUCT OF PERSPIRATION THAN INSPIRATION."

برطانیہ کی مشہور درس گاہ یونیورسٹی آف ایکسٹر (UNIVERSITY OF EXTER) میں کیے جانے والے تجربات کے مطابق یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اوسط درجے کی ذہانت والے لوگ صحیح تربیت ملنے پر حیران کن کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ مثلاً چند ایک معمولی ذہانت کے اشخاص نے ۸۰ عدد کا ہندسہ آسانی سے ذہن نشین کر لیا۔ ایسے ہونے والے تجربات و مشاہدات میں یہ بات صاف کھل کر سامنے آئی ہے کہ بعض لوگ صحیح تربیت اور ماحول کے ملنے پر ناقابل یقین کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

نیوٹن کو دنیائے سائنس میں ایک مانا ہوا ذہین ترین انسان تسلیم کیا جاتا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ وہ خود کو اتنا ذہین و فطین انسان نہیں سمجھتا تھا حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے ایک مرتبہ اس بات کا اقرار کیا کہ وہ مشکل سے مشکل مسائل کا حل ان مسائل

---

* کنگسٹن، کینیڈا۔

اس مسئلہ کے حل ہونے سے ہوانگ نے دنیا کا پہلا آپٹیکل کمپیوٹر بنایا جو دو فٹ لمبا تھا اور اس کی ذہانت intelligence واشنگ مشین سے زیادہ نہ تھی لیکن ہوانگ نے ان لوگوں کو جو اس کی دریافت پر شک کرتے تھے یہ بات ثابت کر دکھلائی کہ ایک ڈبے کے اندر لیزر کی شعاعیں انفارمیشن کو پروسس کر سکتی ہیں، نیز حساب کتاب بھی کر سکتی ہیں۔

ہوانگ کے ماتحت اس وقت اے ٹی اینڈ ٹی بیل لیبارٹری میں بارہ کہنہ مشق سائنس دان کام کر رہے ہیں۔ وہ اُن کو تاکید کرتا ہے کہ بعض دفعہ لاشعور unconscious mind سے جو پیغام آتے ہیں اُن کو غور سے سنو۔ بعض مسائل کے حل لاشعور سے خوابوں کے ذریعے آتے ہیں لیکن بعض دفعہ انسان جہاز کی کھڑکی یا گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہوتا ہے تو کسی مسئلہ کا حل بجلی کی چمک کی طرح ذہن میں آجاتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ایسے آنے والے لمحات میں جو Images ذہن میں ابھریں یا جو Associa-tion بنے اس کو فوراً کسی کاغذ پر نوٹ کر لے۔ شاید یہ کسی بڑے پیچیدہ مسئلہ کا حل ہو۔

(۴)

اس ضمن میں فرانس کے مشہور سائنس دان لوئیس پاسچر (Louis Pasteur) کا ذکر کیے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۸۵۰ء میں ڈاکٹر پاسچر ایک روز افسردگی کی حالت میں ہسپتال کسی کام سے گیا۔ اس کو یہ بات ذہن میں بہت بے چین کر رہی تھی کہ بچے چھوٹی عمر میں انفیکشن سے اس دنیا سے کوچ کیوں کر جاتے ہیں حتیٰ کہ چھوٹے سے زخم یا گمنٹ Abrasion سے بھی بعض لوگ موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں سائنس دانوں کا خیال تھا کہ انفیکشن جسم کے اندر جو گوشت پوست کا مادہ ہے اس کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے مگر پاسچر کے دل کو یہ بات نہیں لگتی تھی اور وہ اس بات سے بالکل متفق نہ تھا۔ چنانچہ اس بات کو ایک روز پرکھنے کے لیے وہ ہسپتال میں بچوں کے وارڈ میں گیا، جہاں ایک لڑکی کی ٹانگ پر انفیکشن تھا۔ ڈاکٹر پاسچر نے اپنی ناک اس کے زخم کے بالکل پاس لا کر اسے سونگھا تو اسے مردہ قسم کی بو آئی وہ تب فوراً اپنی لیبارٹری کی طرف بھاگا وہاں پہنچتے ہی اس نے اپنے ماتحت Assistant کو بڑے فرط جذبات میں بتلانا شروع کیا

" ایک بچے کے جسم کے اندر کوئی بدبخت چیز پیدا ہوتی ہے جب جسم کے باہر کے حصے کو کچھ ہوتا ہے، جیسے کھال میں زخم تو میرے دوست یہ بات تمہیں کسی اور بات کی طرف متوجہ کرتی ہے یا نہیں؟

اس کا نائب بولا:

ہاں جناب انگور۔

نائب کے ذہن میں یہ بات بجلی کی چمک کی طرح آئی کہ انگور کچلے جا چکے ہوں وہ پہلے Rot ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کچھ سال پہلے فرانس میں انگور کی فصل کو وبا پڑی تو ڈاکٹر پاسچر نے ثابت کیا کہ Rott-ing اور Fermentation انگور کے اندر سے نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ باہر سے کچھ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جوں ہی انگور کی کھال کو کچھ ہوا تو فوراً اس کے اندر انفیکشن پیدا ہو گیا۔ یہی حال بچوں کے انفیکشن کا تھا انفیکشن جسم کے باہر سے آتا ہے۔ اگر زخم کو صاف رکھا جائے اور اسے ہوا نہ لگنے دی جائے تو یہ انفیکشن جلد مندمل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر پاسچر نے یوں ایک مفروضے کو حقیقت میں

ثابت کر دیا اور آج لاکھوں انسان اس کے اس آئیڈے
کے رہین منت ہیں اور یوں ہسپتالوں میں آپریشن کرنے
کے لیے Anaesthesia دوائیں بکتی ہیں۔

(۵)

واضح رہے کہ دنیا میں ہونے والی کئی ایجادات
ان کے موجد کے ذہن کی پیداوار نہیں تھیں بلکہ یہ اس سے
پہلے ہونے والی ایجاد یا دریافت میں (improvement)
تھیں۔ مشہور امریکی موجد تھامس ایڈیسن کے بارے
میں کہا جاتا ہے کہ اس نے بجلی کا بلب ایجاد کیا۔ حقیقت
یہ ہے کہ ۱۸۶۰ء میں سر جوزف سوان Sir Joseph Swan
نے ایک کاغذ پر کاربن لگایا۔ یہ کاغذ بہت ہی پتلا
تھا۔ اس نے اس کاغذ کو تار کی صورت دی اور پھر اسے
ایک Vaccum Tube میں رکھ دیا۔ اس
کے بعد اس نے اس ٹیوب میں سے بجلی کی کرنٹ گزارا
یہ کاغذ چند سیکنڈ کے لیے روشن ہو گیا۔ ۱۸۷۰ء میں
تھامس ایڈیسن نے بانس کے ایک ٹکڑے کو carbonised کیا اور پھر اسے ایک "ویکوم ٹیوب" میں
رکھ دیا۔ جب اس نے ٹیوب میں سے بجلی کا کرنٹ گزارا
تو یہ کئی گھنٹے تک روشن رہا۔ اس کے بعد ۱۸۸۵ء میں
ایڈیسن نے پہلا کمرشیل بلب بنایا اور یوں اس کا نام
بلب کی ایجاد سے ہمیشہ کے لیے روشن ہو گیا حالانکہ اس
کا سہرا جوزف سوان کے سر ہے

(۶)

اس ضمن میں ٹیلی فون کی ایجاد کی کہانی بھی بہت دلچسپ
ہے۔ عموماً لوگ ٹیلی فون کی ایجاد کا سہرا کینیڈین موجد
الیگزانڈر بیل (Alexander Bell)
کے سر باندھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۷۶ء میں
ایک امریکن نوجوان الیکٹریشن ایلیشا گرے Elisha
Gray نے کئی سالوں کے تجربات کے بعد ٹیلی فون
کے Patent کے لیے سرکاری محکمہ میں درخواست
دائر کی مگر اس کو بدقسمتی کہیے یا کچھ اور کہ صرف دو گھنٹے
قبل ایک پروفیسر جس کا نام گراہم بیل Graham
Bell تھا اس نے پیٹنٹ کے لیے درخواست
دائر کر دی تھی۔ اگرچہ دونوں موجدوں نے امریکہ میں
ٹیلی فون پر تحقیق ایک دوسرے سے الگ اور
independent کی تھی مگر گراہم بیل نے دو گھنٹے
کے عرصے سے ایک عظیم ایجاد کا سہرا اپنے نام کر لیا اور یوں
جو بھی دولت بعد میں رائیلٹی کی صورت میں اسے ملی
وہ تمام کی تمام اس کی ہو گئی۔ آج امریکہ میں گراہم بیل
کا نام ٹیلی فون سے یوں وابستہ ہے جیسے سورج
سے روشنی۔ کینیڈا کی سب سے مشہور فون کمپنی کا
نام ہی "بیل کینیڈا" ہے۔

(۷)

اب ذرا سلائی مشین Singer Machine
کی دلچسپ کہانی سنیے
۱۸۵۴ء میں ایک امریکی شہری Elias Howe
نے مسٹر سنگر کے خلاف رائیلٹی کا مقدمہ دائر کیا۔ کیونکہ
کپڑے سینے والی مشین جس کا سہرا مسٹر سنگر اپنے سر
لے رہے تھے وہ دراصل مسٹر ہَو "Howe" کی ایجاد
کردہ مشین کی ہی نقل تھی۔ چنانچہ مسٹر سنگر نے مقدمہ
کے فیصلے پر پندرہ ہزار ڈالر کی خطیر رقم مدعی کو ادا کی
اور سنگر کپڑے سینے والی مشین اور صنعت کے نام
سے سنگر وابستہ ہو گیا۔ آج کپڑے سینے والی مشین کا
نام سنتے ہی ذہن سنگر کا لفظ ذہن میں قدرتی طور
پر ابھرتا ہے۔

(۸)

۱۸۱۳ء میں ایک امریکی موجد جتھرو ووڈ
Jethro Wood نے لوہے کا ایک ہل Plow

پنے نام سے پیٹنٹ کیا۔ یہ ہل امریکہ کی شمالی ریاستوں بں بہت مقبول عام ہوا مگر مڈویسٹ کی ریاستوں بں یہ زیادہ عام نہ ہوا کیونکہ یہاں کی مٹی چپکنے والی تھی۔ اس کے بیس سال بعد ریاست ایلی نائس Illinois کا ایک لوہار جس کا نام جان ڈیر John Deer تھا، اس نے ایک آرے کی مشین یں saw mill میں ایک حیران کن بات دیکھی کہ جب لوہے کے ایک بلیڈ کو کسی چیز سے رگڑا جائے تو وہ بلیڈ چمک جاتا تھا۔ جان ڈیر کو کہیں سے ایک گول صورت کا دانتری جیسا بلیڈ مل گیا اور اس نے اس سے ہل بنایا جب اس ہل کو مڈویسٹ کی امریکی ریاستوں میں استعمال کیا گیا تو یہ بہت مفید ثابت ہوا۔ مٹی کے بڑے بڑے تودے Mud masses اس بلیڈ سے بالکل نہ چپٹے اور یوں مٹی کو الٹنا آسان ہو گیا۔ اس کے بعد جان ڈیر کا ہل ان ریاستوں میں کاشت کاری کا بنیادی آلہ ثابت ہوا اور بہت ہی مقبول عام ہوا۔ آج جان ڈیر کا نام کاشتکاری کے آلات سے یوں جڑا ہوا ہے گویا جان ڈیر کاشتکاروں کا باوا آدم تھا۔

(۹)

امریکہ کے پرانے مصنفین میں سے Russell Conwell کا نام نہ صرف بہ حیثیت استاد، مقرر بلکہ مصنف کی اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مولفہ کتاب Acres of Diamond مطبوعہ 1915 کا ایک ایک لفظ سنہری الفاظ میں لکھنے کے قابل ہے اس کتاب کے صفحہ ۸ پر مندرجہ ذیل واقعہ درج ہے۔

امریکہ کی ریاست میساچوسٹ Massa-chusetts کا ایک باشندہ جو ایک ایسے کارخانے میں کام کرتا تھا جہاں کیبل بنائے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کام پر اس کی انگلی میں چوٹ لگ گئی۔ اس کی عمر اڑتیس سال تھی۔ اس کے بعد اس کو ایک دفتر میں کام مل گیا، جہاں امریکی کرنسی کے نوٹوں پر سے لیے گندے نشان مٹانے ہوتے تھے۔ اس کام کے لیے وہ ایک چھوٹا سا ربر استعمال کرتا تھا اور رندے plane کی طرح اس ربر کو نوٹوں پر رگڑتا تھا۔ ایک روز جب وہ یوں ربر کو گھستے گھستے تھک گیا تو اس نے یہ ربر ایک لکڑی کے کونے پر چپکا دیا اور یوں ربر کو استعمال کرنے لگا۔ ایک روز اس کی بیٹی نے اس کو یوں کام کرتے ہوئے دیکھا تو بولی:

"ابو جی امید ہے آپ کے پاس اس انوکھی ایجاد کا پیٹنٹ ضرور ہوگا۔"

اس نے بیٹی سے جواباً کہا:

"واہ رے میری بیٹی! تو نے میرا دماغ اس طرف متوجہ کیا۔ ورنہ میں بوڑھا انسان یوں ہی کام کرتے کرتے انگلیاں ختم کر لیتا۔"

چنانچہ اگلے ہی روز یہ شخص بوسٹن Boston شہر گیا اور سرکاری دفتر میں جا کر اس ایجاد کا پیٹنٹ اپنے نام کر لیا۔ اس پیٹنٹ کے رجسٹر کرانے میں اس کا سرمایہ ذرا بھی نہ لگا مگر بعد میں اس کو جو رائلٹی ملی اس سے وہ کروڑپتی بن گیا۔ آج پنسل کے ساتھ ربر لگا ہوا دیکھ کر آپ کو اس کی اہمیت اور افادیت کا احساس ہوا ہوگا۔

(۱۰)

دنیا کے بڑے بڑے موجد کس قسم کے لوگ تھے کیا وہ بڑے قابل ذہین و فطین سائنس داں اور

ماہر فلکیات تھے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں سے
بعض تو معمولی انسان تھے مگر ایک ایجاد یا تھیوری
نے ان کو فوراً عظیم بنا دیا۔ بعض دفعہ سننے میں آتا
ہے کہ عورتوں میں کوئی موجد پیدا نہیں ہوا، یہ بات
بالکل غلط ہے۔ ذرا مندرجہ ذیل واقعہ پر غور
فرمائیں۔

امریکہ کی ریاست کنکٹی کٹ۔ Conn
ecticut کے شہر نیو برٹن New
Britain میں ایک عورت رہتی
تھی۔ ایک دفعہ جب وہ اپنی نئی قمیص
کو اتار رہی تھی تو گلے کا بٹن اس
کے کاج میں پھنس گیا اور اس کو
سخت غصہ آیا۔ چنانچہ ایک روز
اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ ایک
روز ضرور میں ایسا کالر یا بٹن بنا دوں
گی جس سے بٹن کاج میں الجھے نہیں۔
اس کے خاوند نے اس کی حوصلہ افزائی
کی چنانچہ کچھ عرصے کے بعد اس عورت
کے ذہن میں ایک خاص بٹن کی تصویر
بن گئی اور اس نے ایسا بٹن بنایا
جو کاج کے اندر جانے کے بجائے انگوٹھے
کے دبانے سے دو بٹن آپس میں مل
جاتے تھے اور یوں کالر کے گرد ایسا
بٹن لگنے کا رواج شروع ہو گیا۔ برصغیر
ہندوستان میں اس قسم کے بٹن کو
"پچ بٹن" کہتے ہیں۔ بعد میں اس
خاتون نے پچ بٹن کا پیٹنٹ حاصل کر لیا
اور یہ عورت امریکہ کے امیر ترین افراد
میں شمار ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ کپڑے سینے والی مشین بھی ایک
عورت Elias Howe نے ایجاد کی تھی۔
اس کے علاوہ سوت بنانے والی مشین
Jacquard Loom ایک عورت
مسز جے کارڈ Mrs Jacquard نے ایجاد کی تھی
پھر Cotton-Gin امریکہ کی ایک عورت
نے ایجاد کی جس کا نام مسز گرین Green تھا
سائنس کی دنیا میں فرانس کی خاتون
میڈم کیوری Madame Curie وہ سائنسدان
ہے جس کی فزکس کی تھیوریز پر اس کو نوبل پرائز
دو دفعہ عطا کیا گیا۔

۱۱

امریکہ کے ایک کثیر الاشاعت اخبار نیشنل
انکوائرر (Enquirer) نے
۳۱ جولائی ۱۹۹۰ کی اشاعت میں ایک خبر کی سرخی
یوں لگائی

INVENTOR OVER SLEPT
SO DREAMED UP ALARM CLOCK

خبر کے متن میں تفصیل اس کی بیان ہوتی
ہے کہ ایک نوجوان گھڑی ساز سیوی حیمن Levi
Hutchins ۱۷۸۷ میں ایک رات سوتا
ہی رہ گیا تو اس بات پر اس کو اس قدر غصہ
آیا کہ اس نے الارم کی گھڑی ایجاد کر دی۔ اس
کے بعد وہ ہمیشہ وقت پر جاگتا رہا۔
دوربین Telescope کی
ایجاد بھی بڑی معنی خیز ہے لیکن ۱۶۰۸ء میں ہالینڈ
کا باشندہ جو عینک ساز تھا اس کا نام
ہنس لیپرشائی Hans Lippershey
تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک شیشے کا ٹکڑا تھاما

اور دوسرے ہاتھ میں دوسرا ٹکڑا لے لیا۔ اتفاقاً ان دونوں شیشوں کو اس نے ایک لائن میں رکھا تو اس نے دیکھا کہ تصویر یا ایک چیز کا ٹکڑا لینز (LENS) میں اپنی حقیقت سے بڑا نظر آنے لگا۔ چنانچہ اس نے ایک ٹیوب لی اور ایک کونے پر ایک شیشہ لگایا، دوسرے کونے پر ایک اور شیشہ نصب کر دیا۔ یوں دوربین ایجاد ہو گئی۔

کتابیات

1. Acres of Diamond

2. National Enquirer July 1990. USA

3. Inventing for Fun & Profit, N.York 1978. By Hallock.

طریقۂ تعلیم

"ہمارے لیے صرف طریقۂ تعلیم معین کرنا ہی کافی نہ ہوگا، بلکہ آپس کی مدد اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سامان بھی مہیا کر دینا ضروری ہوگا۔"

سرسیدؒ

سرمد، شبلی اور آزاد

ابوعلی اثری کی تحریر کے آئینے میں

ریاض الرحمٰن خاں شروانی ♡

جناب ابوعلی اثری کا مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد اور سرمد" (تہذیب الاخلاق، جون ۱۹۹۱ء) انتشارِ فکر، غلط استدلال اور ژولیدہ بیانی کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ سرمد پر مولانا آزاد کے مضمون کے بارے میں وہ ابتدا ہی میں لکھتے ہیں کہ اس میں بقول ان کے مولانا نے اورنگ زیب کے جرائم میں ایک اور جرم کا اضافہ کر دیا ہے، جس کی مدافعت میں غالباً اب تک ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ یہ اعتراف خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس باب میں مولانا آزاد کا استدلال اتنا قوی تھا کہ اس کا رد کوئی بھی، یہاں تک کہ اورنگ زیب کے سب سے بڑے حامی مولانا شبلی بھی، نہ کر سکا۔ ان کا یہ بھی ارشاد ہے کہ

> "مولانا شبلی کی "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" میں کہیں سرمد کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ حال آں کہ انھوں نے اورنگ زیب پر عائد کردہ الزامات کی ایک ایک کر کے تردید کی ہے"

کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب پر یہ "الزام" یا اُن کا یہ "جرم" واقعی ناقابلِ تردید اور ناقابلِ دفاع تھا۔ اِس لیے شبلی جیسے حامی اورنگ زیب کو بھی اس معاملے میں خاموشی اختیار کیے بغیر چارہ نہیں تھا

جناب ابوعلی صاحب کے مضمون کی اسی قسط میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

> "مولانا شبلی کی نظر سے مولانا ابوالکلام کا یہ مضمون گزرا تو اس وقت اس کی تردید یا تائید میں تو ایک حرف نہیں لکھا لیکن مضمون کے متعلق ارشاد ہوا کہ ابوالکلام نے اس کو بہت بڑھا دیا ہے، ورنہ اصل کاغذ تو دو صفحے سے زیادہ نہ تھے"

ابوعلی صاحب نے مولانا شبلی کے اس جملہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

> "اس مضمون کے متعلق یہ کہہ کر کہ اس میں اضافہ کر دیا ہے اس کی تاریخی حیثیت کو بالکل مشکوک کر دیا۔"

اور پھر خود ہی یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ

> "یہ روایت تو دوسرے ذرائع سے بھی ملتی ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں اس مسئلے پر کچھ تبادلۂ خیال ہوا یا نہیں ہی

♡ حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ

اس کا پتہ نہیں چل سکا۔"

اس پوری عبارت کو ایک مرتبہ پھر پڑھیے اور ابوعلی صاحب کے طرز منطق و طرز استدلال پر کف افسوس ملیے۔ ابوعلی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ مولانا شبلی کو مولانا آزاد کے مضمون میں سوائے اطناب کے کوئی اور خامی نظر نہیں آئی اور اسی کا انھوں نے اظہار کر دیا ورنہ وہ اس کی "تردید میں ایک حرف" بھی کیوں نہ کہتے؟

مولانا شبلی کا یہ ارشاد کہ:

"اگر میں لکھتا تو دو صفحے سے زیادہ نہ لکھتا"

بھی بہت معنی خیز ہے یعنی یہ نہیں کہا کہ اگر میں لکھتا تو اس مسئلے کو بالکل دوسرے رنگ میں پیش کرتا بلکہ صرف یہ کہا کہ ساری بحث صرف دو صفحے میں سمیٹ لیتا۔ گویا مولانا آزاد کا تھیسس تو بالکل درست تھا۔ البتہ انھوں نے اسے پھیلا بہت دیا تھا۔ یہ بات ابوعلی صاحب نے اپنی طرف سے محض زیب داستاں کے لیے لکھ دی ہے کہ

"اس میں ادبیت بہت زیادہ ہے"

اور نتیجۃً اس کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے۔ ورنہ مولانا شبلی نے، خود ابوعلی صاحب کے نقل کردہ الفاظ کے مطابق، کہیں نہیں کہی ہے اور جو بات انھوں نے مولانا شبلی کی طرف منسوب بھی کی ہے وہ بعض "ثقہ راویوں" کے حوالے سے، نہ کہ شبلی کی کسی تحریر کی روشنی میں۔ یہ "ثقہ راوی" کون حضرات تھے یہ قیاس کرنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے اور مولانا آزاد سے متعلق معاملات میں وہ واقعی کتنے ثقہ تھے یہ بھی عام طور سے معلوم ہے۔

ابوعلی صاحب کا مضمون قیاسات اور ان قیاسات سے غلط نتائج اخذ کرنے کا شاہکار ہے۔ کہاں تک ان کی عبارتیں نقل کی جائیں اور ان سے اخذ کردہ نتائج کی غلطیاں اجاگر کی جائیں۔ لکھتے ہیں کہ

"دہلی میں حکیم اجمل خاں کے وہاں دوران قیام مولانا آزاد نے مولانا شبلی سے اپنے اس مضمون کا ذکر نہیں کیا"

اور پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ

"اس کا سبب مضمون کا اطناب، جسے شبلی پسند نہیں کرتے تھے، یا پھر شبلی کا حامی اور رنگ زیب ہونا ہو سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ابوعلی صاحب کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ مولانا آزاد نے اپنے اس مضمون کا ذکر ان سے نہیں کیا اور اگر نہیں بھی کیا تو آخر یہ کیوں ضروری تھا کہ مولانا شبلی سے اپنی تمام عقیدت کے باوجود وہ اس کا ذکر ان سے ضرور کرتے۔ کیا آدمی کو جس کسی سے عقیدت یا تعلق خاطر ہوتا ہے وہ اپنی ہر تحریر کا اس سے لازماً ذکر کرتا ہے؟

ابوعلی صاحب کا کہنا ہے کہ سرمد کے علم وفضل اور واقعۂ قتل کے بارے میں مولانا شبلی کی رائے کا اظہار ان کی کسی تحریر سے نہیں ہوتا ہے۔ اپنے وقت کے بہت سے اہل کمال کے بارے میں مولانا شبلی نے کچھ نہیں لکھا ہوگا۔ کیونکہ کوئی شخص بھی ہر کسی کے متعلق کہاں تک لکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سرمد کے علم وفضل اور کمالات پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ اگر مولانا آزاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے سرمد کو اردو داں طبقے سے روشناس کرایا تو اس کے لیے مولانا آزاد کی تعریف کی جانی چاہیے نہ کہ ان پر رد و قدح۔

جہاں تک مولانا آزاد کے مضمون سے متعلق

صاحب کی خود اپنی رائے کا تعلق ہے، ہمیں کچھ عرض کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص ہر مسئلے کے بارے میں اپنی رائے رکھنے کا مجاز ہے اور ظاہر ہے کہ یہ رائے ہر شخص اپنے اپنے ذوق، رجحان اور مزاج یا پھر علم و آگہی کے مطابق رکھتا ہے۔

تکیہ ہر کس بقدر ہمت اوست

اندازِ گفتگو

اے میرے عزیز ہم وطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اس طرح پر رکھو جس سے تہذیب اور متانت ظاہر ہو مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے الفاظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا یا شاید مجھے دھوکا ہوا یا میں غلط سمجھا۔ گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا، یا اس پر پھر خیال کروں گا۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینا تھا۔ کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔"

علی سید /؟

سوشل سروس کی اہمیت

محمد اسحاق ♡

سال ۱۹۸۳ء کی بات ہے کہ آندھرا پردیش میں پہلی مرتبہ تلگو دیشم پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے چیف منسٹر این ٹی راما راؤ نے کچھ ہی دنوں میں اعلان کیا کہ ریاست کی ایسی بیواؤں کو جن کی عمر پچاس برس سے زائد ہو اور بے سہارا رہ گئی ہوں انھیں حکومت کی جانب سے پچاس روپیہ ماہانہ تاحیات وظیفہ منظور کیا جائے گا۔ یہ ایک غیر اہم خبر اخبار "سیاست" کے کسی کونے میں شایع ہوئی تھی۔ ایک غریب بیوہ اپنے مکان آتی جاتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ دیکھو تمہاری قسمت چمک گئی۔ چیف منسٹر نے اعلان کیا ہے کہ بیواؤں کو ماہانہ پچاس روپیے تاحیات وظیفہ ملے گا۔ بس اتنا کام کرو کہ نامپلی اسٹیشن روڈ پر کلکٹر آفس ہے۔ وہاں پر فارم ملے گا۔ یہ تلگو میں ہوگا اس فارم کی خانہ پُری کر کے کسی گزیٹیڈ افسر کی تصدیق اور اپنے فوٹو کے ساتھ ایک مہینے کے اندر اندر اسی آفس میں داخل کر دو۔ پھر کیا ہے مزہ ہی مزہ ہے۔ میری اس ساری تقریر کا اس بوڑھی بیوہ پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا اور نہ اس نے کسی مسرت کا اظہار کیا۔ بلکہ حسرت سے ایک آہ سرد بھری اور یوں کہنے لگی:

س: صاحب یہ فارم کہاں سے لانا ہوگا

ج: بس یہیں تو کلکٹریٹ آفس ہے۔ وہاں چلی جاؤ۔ فارم مل جائے گا۔

س: آنے جانے کے لیے کم از کم رکشا کے لیے دو تین روپیے ہوں گے۔ وہ کہاں سے لاؤں۔

ج: چلو میں دے دوں گا۔ تم لوگوں کو تو بہانہ چاہیے

س: اچھا تو وہاں افسر سے ہمیں کون بات کرنے دے گا۔ پہلے تو اندر ہی جانے نہ دے گا۔

ج: دیکھو دفتر میں یوں ہی کام نہیں بنتا وہاں کے اٹنڈر کو آٹھ آنے روپیہ دے دینا۔

س: یہ فارم کون بھرے گا۔ کون افسر ہمارے لیے تصدیق کرے گا۔ وہ بڑا افسر کہاں رہتا ہے۔

ج: بس بس تم لوگ تو اپنے سے کچھ حرکت ہی کرنا نہیں چاہتے۔۔۔۔

س: ہاں ہماری قسمت ہی کچھ ایسی ہے۔ سرکار کیا دیتی ہے۔ کس کو دیتی ہے اور کتنا دیتی ہے۔ ہم لوگ بھی سنتے ہیں لیکن کون خدا کا بندہ ایسا ہے جو ہماری فریاد سنتا ہے۔ کون ہماری مدد کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ بڑھیا چلی گئی۔ اس کو وظیفے کی اطلاع دے

♡ ہیڈ ماسٹر ایمبسی اسکول آف انڈیا- الجبیل، سعودی عربیہ

پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اس پر بڑا احسان کر دیا جب اس کی حسرت آگیں باتیں سنا تو شرم آ گئی کہ ہم لوگ [illegible] پر بیٹھ کر بہت سی باتیں کرتے ہیں اور ایسا ہونا چاہیے' وہ ہونا چاہیے۔ جہاں ہم آپ سنیں گے۔ سب کی بات یہاں پر آ کر ٹوٹ جاتی ہے۔ دل میں خیال آیا کہ بس یہی دو ٹکے کا کام کر کے بتلا دو تو معلوم ہوگا کہ عوام اور حکومت کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہے۔ اپنے محلے میں اور کبھی چھ سات بیواؤں کا پتہ چلا۔ کلکٹر آفس سے [illegible] فارم اور ضروری نقلیں لے کر [illegible] میں [illegible] گئے کوئی دو ماہ گزر گئے۔ ایک دن دیکھا وہ ایک چھوٹا سا پیکٹ مٹھائی کا لے کر حاضر ہوئی۔ اسے تین ماہ کا وظیفہ ڈیڑھ سو روپے ذریعہ منی آرڈر اسی روز مل چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ اور بھی تین بیواؤں کو بھی وظیفہ منظور ہو گیا۔

ریاست کچھ میں ہزاروں ہوں گی ایسی بیوائیں ہوں گی جنہیں آج تک یہ پتہ نہ ہوگا کہ حکومت نے ایسا قدم بھی کیا تھا۔ سیکڑوں پڑھے لکھے لوگوں نے سرسری طور پر اس خبر کو دیکھا ہوگا لیکن کبھی انہیں خیال نہیں آیا کہ کم سے کم ایک بیوہ کے لیے کچھ مدد کر دیں۔ اسی بات کا تذکرہ ایک میٹنگ کے سامنے آیا جو ایک مذہبی جماعت کے سرگرم کارکن تھے اور جن کے پاس سوشل سروس کا ایک مستقل شعبہ بھی ہے۔ کہنے لگے دراصل یہ کام ہمارے ہی کرنے کا تھا افسوس کہ وقت گزر گیا

اسی زمانے میں راقم گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ سامنے وقت ہی وقت تھا۔ [illegible] مشورے ہونے لگے کہ بندہ کو کیا کرنا چاہیے۔ ہر ایک نے اپنی سمجھ کے مطابق رائے دی۔ [illegible] گھومنے سے [illegible]۔ [illegible] نے ایک ایسا مشورہ دیا جنہوں نے ساری زندگی بھر کوئی کام بھول کر بھی نہ کیا تھا "کچھ سوشل سروس کیجیے۔" میں نے عرض کیا "آپ ہی بتائیے کہ کون سا کام اچھا رہے گا" کہنے لگے "بنگلے کی مرمت میں ساتھ دیں"

حیدرآباد دکن میں ایک سلم ایریا (SLUM AREA) تھا جس کو آصف نگر "گندی بستی" کہتے جو شہروں میں ایسے محلوں کے لیے مخصوص ہے جو شہر کی عالی شان خوبصورت عمارتوں کے پیچھے غریبوں کی جھونپڑیوں کے جھنڈ ہوتے ہیں جن کی گندگی کا اندازہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] وقت دیکھے۔ [illegible] میں کوئی دو سو فرد بستے تھے۔ اس پراجیکٹ کی شروعات کا کچھ اندازہ نہ تھا [illegible] سوشل سروس میں کوئی بڑا بجٹ [illegible] دو برس کی مدت میں [illegible] میں سیکڑوں چکر لگانے کے بعد ملے۔ [illegible] کافی ہے۔ کوئی ساٹھ ہزار کی رقم چندے کے ذریعے جمع کی گئی۔ یہ کام تو اور بھی مشکل ہے۔ [illegible] مگر چندہ کس کے [illegible]۔ [illegible] دو سال کی مدت میں ۲۹ پختہ مکانات بن گئے۔ اب اس کا نام "[illegible]" [illegible] ہے۔

ایک مرتبہ [illegible] حساب کرتے ہوئے [illegible] کام کی [illegible] تبدیلی ہندوستان جیسے ملک [illegible] سوشل سروس کے ذریعے غریب لوگوں کی خدمت کے کئی مواقع ہیں۔ اپنی طبیعت

ذوق، وجدان کے مطابق زندگی میں کسی نہ کسی کام کو لے لو اس لیے کہ مخلوق کی خدمت اعلیٰ ترین عبادت ہے گو تم جرمنی یا انگلستان چلے جاؤ اور وہاں کچھ سوشل سروس کرنا بھی چاہو تو وہاں کوئی موقع نہیں ملے گا۔ وہاں پر فلاحی حکومتیں ہیں اور آپ کی مہربانیوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہندوستان میں آبادی کی کثرت، غربت اور جہالت کی وجہ ملک کے ہر شہر اور ہر بستی میں ایسے کئی مواقع ہیں جہاں پر آپ اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔

کوئی پندرہ برس سے امریکہ میں چند ماہرین اس بات کی ریسرچ میں لگے ہوئے ہیں کہ

"وہ کیا راز ہے کہ سوشل سروس میں مشغول لوگوں کی صحت نسبتاً بہتر ہوتی ہے، ان کی عمریں طویل ہوتی ہیں اور شرح اموات بھی کم ہے۔"

مشی گن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے ۱۴ برس تک ۲۷۰۰ افراد پر اپنی ریسرچ جاری رکھی اور بتلایا کہ ایسے لوگ جو کسی سوشل سروس کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے ان میں شرح اموات دوسروں کے مقابلے میں ڈھائی گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ ہان سیلی (Hans Selye) جو اس ریسرچ کا ہراول ہے لکھتا ہے کہ دوسروں کے کام آنے سے لوگوں کی مشکور نظریں اور احسان مندی کے سچے الفاظ دماغ کے ان خلیوں کو تازگی بخشتے ہیں جن کا تعلق راحت و مسرت سے وابستہ ہے جو زندگی اور صحت کے لیے معاون ہیں۔ اسی طرح ماہرین امراض قلب کا کہنا ہے کہ

"دل جلا" (Angry heart) بہت زیادہ امراض قلب میں گرفتار رہتا ہے دل کی شریانوں پر اس کا اثر پڑتا ہے ان میں حرکت قلب بند ہو جانے کے زیادہ امکانات پائے گئے۔

(ریڈرز ڈائجسٹ۔ دسمبر ۱۹۹۰ء)

عیسائی مشنریز میں خلق خدا کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا ایک سلسلہ ہے۔ نوبل انعام یافتہ مدر ٹریسا کی مثال سامنے ہے۔ ہزاروں بے سہارا بچوں، غریب و لاچار لوگوں، یتیموں اور بے سہارا عورتوں کے لیے یہ رحمت کا فرشتہ بنی ہوئی ہے۔ کروڑوں کی رقم ساری دنیا کے دولت مند اور درد مند 'مدد' کے نام پر بھیجتے رہتے ہیں جن کی کوئی رسید نہیں دی جاتی۔ ساری دنیا کے لوگوں نے کوئی پچاس ساٹھ برس سے اس کے کام کو پرکھا ہے، دیکھا ہے اور سمجھا ہے کہ یہ خالص سونا ہے۔

ایک اور نادر مثال پاکستان کے عبدالستار ایدھی کی انگریزی اخبارات کے ذریعے پڑھنے میں آئی ساری دنیا میں اس ایک شخص کے کام کی دھوم ہے سوچو تو حیرت ہوتی ہے کہ اس ایک شخص نے کیا کیا کام کر دکھایا ہے۔ ۲۲ سال کی عمر میں تقسیم ہند کے وقت یہ گجراتی مسلمان پاکستان آیا۔ اب اس کی عمر ۶۲ سال ہے۔ "ایدھی ویلفیر سینٹر" میں اس وقت ایک ہوائی جہاز، آٹھ ہیلی کاپٹرس، چار سو امبولنس کاریں جو دن رات غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کے لیے سارے ملک میں دوڑتے رہتے ہیں۔ اس سینٹر میں کوئی ۳۰ ہزار مریضوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ ۱۳ دواخانوں میں پانچ ہزار سے زیادہ مریض شریک ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے تین ہزار ڈاکٹر، نرسیں اور دوسرے لوگ مشغول ہیں۔ ایدھی نے اب تک ۱۴ ہزار لاوارث نعشوں کو دفن کرنے کا انتظام کیا ہے۔ آدھی رات کو کوئی اس کا دروازہ کھٹکھٹائے وہ اسی وقت

ان کی مدد کے لیے چل پڑتا ہے۔ اکثر تو وہ خود دفن کا کام بھی اپنے ہاتھوں سے کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ

میں پاکستان میں "سوشل ویلفیر انڈسٹری"
قائم کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک "اسٹوڈینٹس ویلفیر فنڈ" بھی قائم کر چکا ہے تاکہ غریب طلبا کی تعلیم کا انتظام نہایت معقول پیمانے پر ہو۔ اور طلبا میں ہمدردی کا جذبہ اور سوشل سروس کی اہمیت آشکار ہو۔" ایدھی انٹرنیشنل سینٹر نیویارک" اور اس کی شاخ لندن کے ذریعے ہزاروں لوگ فیلفاً روپیہ اس سینٹر پر بھیجتے رہتے ہیں۔ جس کی مقدار سالانہ پانچ کروڑ سے زیادہ ہے۔ ایدھی دو روپے کی رسید بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیتا ہے

اوپر کی دو مثالوں سے آپ کو ضرور اس بات کا اندازہ ہوا ہوگا کہ انھوں نے کام شروع کرنے سے پہلے نہ تو پیسے کی پرواہ کی ورنہ ہمدردوں کو آواز دی کام شروع کر دیا۔ لوگ آتے گئے قافلہ بنتا گیا اور رواں دواں ہوتا گیا۔ آخر ان میں خاص بات کیا ہے۔ یہی بس اخلاص ایثار اور خلق خدا کی خدمت کا شدید جذبہ۔

یہی کچھ ایسی نادر صفات ہیں جن کے ناقابل یقین اور ہوش ربا کرشمے دیکھنے میں آتے ہیں۔

سوشل سروس کے لیے چھوٹا بڑا کام سب برابر ہے۔ اپنے اطراف دیکھیں تو ایسے کئی ایک کام ہیں جو آپ کو آواز دے رہے ہیں۔ آدمی کسی اچھے کام کے شروع کرنے کے لیے بہت سوچتا ہے۔ کرنے یا نہ کرنے کی سوچ میں ساری زندگی ہی ختم کر دیتا ہے اور یہ تذبذب سے لے ڈوبتا ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ

کسی اچھے کام کے شروع کرنے کے لیے
سب سے اہم پہلا قدم ہوتا ہے۔ یہ قدم
اٹھ گیا تو پھر منزل خود سامنے آتی ہے
لیکن یہ پہلا قدم اٹھانے والے بہت کم
دنیا میں ملتے ہیں۔"

"مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانۂ گزشتہ اور حال پر نظر کر کر ایک ایسا طریقۂ تعلیم معین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی اور دنیوی دونوں قسم کے تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔"

سرسید رح

میڈم کیوری — دنیائے سائنس کی ایک نامور خاتون

عرفان احمد ♡

ایک مضمون نگار نے میڈم کیوری کے بارے میں لکھا ہے کہ

"اگر انسانی شرافت کو مجسم دیکھنا چاہتے ہو تو میڈم کیوری کی ذات میں دیکھ سکتے ہو۔"

ان کی عقل ہمیشہ عالی خیالات کی جولانگاہ رہی اور ان کا دل بلند احساسات کا مرکز۔ ان کی زندگی فداکاری، ایثار اور خودداری کا نمونہ تھی۔

میڈم کیوری پولینڈ میں ۷ نومبر ۱۸۶۷ء کو اس گھرانے میں پیدا ہوئیں جو ہمیشہ سے علم و دانش کا مرکز و محور رہا۔ اس کے والدین بہت غریب تھے۔ میڈم کیوری کو جس کا بچپن کا نام میری سکلودوسکا (Marie Sklodowska) تھا اپنی چھوٹی بہن کے تعلیمی مصارف برداشت کرنے کے لیے ایک پولش دیہاتی امیر کے یہاں اس کے بچوں کی آیاگیری کرنی پڑی۔ وہ چھ سال تک اس ملازمت پر رہیں۔ اس طرح ان کی چھوٹی بہن اپنی اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کے قابل ہوگئی۔ میڈم کیوری نے سائنس کی ابتدائی ٹریننگ اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ یہ زمانہ پولینڈ میں سیاسی اعتبار سے انتہائی خلفشار کا زمانہ تھا۔ چونکہ میڈم کیوری کا تعلق طلبا کی ایک سرگرم سیاسی جماعت سے تھا اس لیے حکومت کی نظر عتاب سے وہ بچ نہ سکیں۔ کسی طرح وہ جان بچا کر پولینڈ سے فرانس کے دارالحکومت پیرس پہنچ گئیں جہاں انھیں خوش قسمتی سے یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا جہاں سے انھوں نے طبیعیات اور ریاضی میں ماسٹر ڈگری (Master degree) حاصل کرلی۔ طبیعیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری انھوں نے اسکول آف فزکس (School of Physics) سے حاصل کی۔

۱۸۹۵ء کے موسم گرما کے آغاز میں اُن کی شادی مشہور عالم طبیعیات پیری کیوری (Pierre Curie) سے ہوئی جو کم عمری ہی میں اچھی خاصی شہرت کے مالک بن چکے تھے۔ یہ فرانسیسی تھے اور سائنس کی اعلیٰ ڈگری انھوں نے ساربون (Sorbonne) یونیورسٹی سے حاصل کی تھی جہاں وہ بعد میں فزکس کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ پروفیسر کیوری جن کی شہرت عالم سائنس میں تابکاری (Radioactivity) کے میدان میں اپنی بیوی میڈم کیوری

♡ شعبۂ طبیعیات، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ، یو۔پی۔

کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ہوئی ایک زبردست تجرباتی ماہر طبیعیات Experimental Physicist تھے انھوں نے Piezo Electricity اور دوسرے بہت سارے شعبوں میں بہت سے تجربات کیے۔

شادی کے فوراً بعد دونوں میاں بیوی نے سائیکل پر بیں اور فرانس کے دیہی علاقوں کی سیر کی۔ اس سال کے موسم گرما کا بقیہ زمانہ انھوں نے سیر سپاٹے میں گزارا۔ ۱۸۹۷ء میں ان کے ہاں ایک خوبصورت بچی کا جنم ہوا جس کا نام آئرین کیوری (Irene Curie) رکھا گیا۔ آگے چل کر یہ بچی ایک مشہور عالم سائنس دان بنی اور دنیائے سائنس میں جولیو کیوری (Joliot Curie) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے شوہر فریڈرک جولیو (Frederic Joliot) جو فرانسیسی تھے اور عمر میں ان سے سات سال چھوٹے تھے، بیسویں صدی کے مشہور ماہر نیوکلیر طبیعیات (Nuclear Physicist) تھے۔

جولائی ۱۸۹۸ء میں مادام کیوری اور ان کے شوہر پروفیسر کیوری بڑی محنت اور کاوش سے بسمتھ (Bismuth) عناصر سے ایک نئی دھات الگ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس نئی دھات کا نام انھوں نے مادام کیوری کے وطن پولینڈ کے نام پر پولونیم (Polonium) رکھا۔ یہ ایک انتہائی تاب کاری دھات (Strong Radioactive element) ہے۔ ان کی اس دریافت نے دونوں کی شہرت پورے عالم میں پھیلا دی۔ دسمبر ۱۸۹۸ء میں دونوں میاں بیوی نے پروفیسر ہنری بکریل (Henry Becquerel) کی دریافت شدہ اہم ترین تاب کاری دھات ریڈیم (Radium) کو الگ کرنے میں کامیابی حاصل کرلی

یہ یورینیم سے بیس لاکھ گنا زیادہ تاب کار (Radio-active) دھات ہے۔ بلا شبہ یہ ایک دھماکہ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ٹن سے صرف دو ملی گرام ریڈیم حاصل کرنے کے لیے Pitch blende سے دشوار، صبر آزما، طویل کیمیائی پیچیدہ Physical Chemical Process سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ مادام کیوری نے اپنے شوہر کے ساتھ ریڈیم کی دریافت انتہائی غربت اور افلاس کے عالم میں کی۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کا کام جاری رکھا۔

اب دونوں [illegible] کی وجہ سے سائنس میں دونوں میاں بیوی کی شہرت انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ ۱۹۰۳ء میں رائل سوسائٹی لندن Royal Society London نے دونوں کو ڈیوی میڈل Medal ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی کو دنیائے سائنس کا سب سے بڑا اعزاز نوبل انعام دیا گیا۔ یہ انعام انھیں فزکس میں [illegible] ریڈیم کی دریافت کے لیے ۱۹۰۳ء میں دیا گیا۔ ان دونوں کے ساتھ اس انعام میں پروفیسر ہنری بکریل Henry Becquerel بھی شریک تھے۔ ۱۹۰۵ء میں پروفیسر کیوری کو اکادمی آف سائنسز Academy of Sciences کا پروفیسر چن لیا گیا۔ بدقسمتی سے ۱۹۰۶ء میں پروفیسر کیوری کا ایک گھوڑا گاڑی (Carriage) کے حادثے میں انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر محض سینتالیس سال تھی۔ اس طرح مادام

کیوری انتالیس سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ اگرچہ دونوں کی ازدواجی زندگی بہت مختصر عرصہ محض گیارہ سال کے لیے تھی لیکن یہ ہر لحاظ سے ایک مثالی ازدواجی زندگی تھی۔

شوہر کی وفات کے بعد میڈم کیوری کو پروفیسر کیوری کی جگہ پروفیسر منتخب کیا گیا۔ انھوں نے شوہر کے غم کا علاج ڈھونڈھ نکالا۔ وہ پوری طرح ریسرچ میں غرق ہوگئیں۔ اب اُن کی شہرت ایک ماہر طبعیات کے ساتھ ساتھ ایک ماہر کیمیاداں کی حیثیت سے بھی ہونے لگی۔ پھر وہ بھی دن آیا جب ۱۹۱۱ء میں انھیں کیمسٹری کا بلا شرکت غیرے نوبل انعام عطا کیا گیا۔ اس طرح میڈم کیوری دنیا کی وہ واحد سائنس داں ہیں جنھیں دو مختلف مضامین میں نوبل انعام ملے۔ گورنمنٹ نے پیرس میں میڈم کیوری کے نام پر ریڈیم انسٹی ٹیوٹ Radium Institute کھولا جہاں کام کرتے ہوئے میڈم کیوری کی صاحبزادی پروفیسر جولیو کیوری اور ان کے شوہر پروفیسر جولیو نے ۱۹۳۴ء میں Induced Radioactivity کی دریافت کی۔ دنیا کی بڑی بڑی علمی انجمنوں اور یونیورسٹیوں نے میڈم کیوری کو جو علمی خطابات عطا کیے ان کو اگر ہم لکھنا چاہیں تو بڑے بڑے پانچ صفحوں سے کم میں نہ آئیں گے۔

آج سائنس کا ادنیٰ طالب علم بھی تاب کاری کی اکائی کیوری Curie کیوری پوائنٹ Curie Point کیوری درجۂ حرارت Curie's Temperature اور کیوری کا اصول Curie's Law سے خوب واقف ہے۔ اس یگانۂ روزگار خاتون کی وفات ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔

بلاشبہ میڈم کیوری دنیائے سائنس کے آسمان پر ایک ستارہ بن کر چمکیں مگر نہ تو ان کی شہرت نے ان کو مغرور کیا نہ طلب ثروت اور حب جاہ نے انھیں علم اور انسانیت کی خدمت سے باز رکھا۔ مندرجہ ذیل واقعہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وہ اخلاق و ایثار کے بلند مقام پر فائز تھیں۔

• ایک روز ایک امریکن لیڈی ان سے ملنے آئی بات چیت کے دوران اس نے ان سے پوچھا کہ دنیا کی کوئی ایک چیز لینے کا اگر آپ کو اختیار دے دیا جائے تو آپ کیا چیز مانگیں گی۔ میڈم کیوری کا جواب تھا:

"ایک گرام ریڈیم، اپنی علمی تحقیقات میں کام میں لانے کے لیے۔"

امریکن لیڈی کو بڑی حیرت ہوئی کہ ایک ایسی خاتون جس نے ساری دنیا کو ریڈیم جیسی نعمت عطا کی ہے اس کو نکالنے میں شدید تکالیف برداشت کیں اور سب کو اس کے استعمال کی ترکیب بتا کر اس کی عام اجازت دے دی مگر خود ایک ذرا سی مقدار کی بھی مالک نہیں۔ یہاں تک کہ اتنی بھی نہیں کہ اپنے علمی کاموں میں صرف کر سکے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ریڈیم ایک انتہائی بیش قیمت دھات ہے۔ ۱۹۰۰ء میں ایک گرام ریڈیم کی قیمت ایک لاکھ پچاس ہزار امریکن ڈالر تھی۔ بہر حال اس امریکن لیڈی نے امریکہ پہنچتے ہی خواتین کی ایک انجمن بنائی اور چندہ جمع کر کے ایک گرام ریڈیم خرید کر میڈم کیوری کی نذر کی۔ ۲۰ رمئی ۱۹۲۱ء کو امریکہ کے صدر ہارڈنگ ایک گرام ریڈیم میڈم کیوری کو دیتے وقت ان سے یوں مخاطب ہوئے:

"ہم ریڈیم کو پہچاننے اور اس کے مالک ہونے میں آپ کے قرض دار ہیں۔ اس لیے یہ ریڈیم آپ کی خدمت میں پیش

کہتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ جب تک
یہ آپ کے ہاتھ میں ہے ضرور دنیا کے
لیے معلومات میں وسعت کا ایک مفید
ذریعہ اور انسانوں کے دکھ درد کی کمی
کا باعث ہو گی"۔

میڈم کیوری نے یہ ریڈیم لیتے ہی پیرس
کی انجمن "ریڈیم" کو ہدیہ کر دیا۔ ایک سال بعد وہ
پھر امریکہ گئیں۔ اس دفعہ بھی خواتین نے ایک گرام
ریڈیم خرید کر ان کو ہدیہ دیا۔ انھوں نے اس دفعہ
یہ ریڈیم پولینڈ کی راجدھانی وارسا کی انجمن "ریڈیم"
کو دے دی اور خود خالی ہاتھ رہ گئیں۔

یہ ہے میڈم کیوری کے حالات زندگی
کی مختصر داستان۔ وہ اپنے علم و عقل، اخلاق و
ایثار کے لحاظ سے بہت ممتاز تھیں۔ ان کی زندگی
نیکی اور کمال سخاوت کا ایک طلائی دور تھا۔ وہ
ان تمام چیزوں سے کوسوں دور تھیں جو انسانی دماغ
پر بدنما داغ ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں۔

"سب سے خوش نصیب وہ انسان
ہے جو نئے حقائق کا انکشاف کرتا
ہے اور دوسرے درجے پر وہ جو پرانے
تعصبات ترک کرتا ہے"۔

دنیا میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے
پر، اگرچہ وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو، متفق ہو جاویں۔ پس ضرور ہے کہ
آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی
رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ
رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو بھی
لوں اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کروں اور جب
ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں
کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور ان غلطیوں کو اس طرح
پر بتاتا ہے جیسے ایک دل سوز دوست بتاتا ہے۔ کبھی کبھی
طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لیے نہایت دلچسپ ظرافت بھی
کر بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے اور باوجود
مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے"۔

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جلد ۱۰ شمارہ ۸ (اگست ۹۱)

جسم کی چیر پھاڑ

کیپٹن محمد گلستان ♡

جسم کی چیر پھاڑ کے ذریعے مرض کے علاج کے عمل کو سرجری کہا جاتا ہے۔ انسان زمانہ قدیم ہی سے آپریشن کرتا آیا ہے تاہم قدیم دور کے اکثر آپریشن ناکام رہتے تھے۔ غالباً انسان نے اس وقت آپریشن کرنا شروع کیا جب وہ غاروں میں رہتا تھا۔ بعض قدیم غاروں سے ہڈیوں کے ایسے ڈھانچے ملے ہیں جن کی کھوپڑیوں میں سوراخ ہیں۔ یہ سوراخ مریض کے سر میں سے جن بھوت نکالنے کے لیے کیا جاتا تھا۔

غاروں کے باسی ہڈیوں کی جراحت میں بہت ماہر تھے۔ مصر، بابل، نینوا اور سندھ کی قدیم تہذیبوں میں آپریشن کا رواج تھا۔ جن میں یونان کے ذہین اطباء نے اس علم میں بیش بہا اضافے کیے۔ ان دنوں مریض کو شراب یا بھنگ پلا کر بیہوش کیا جاتا تھا۔ یہ بیہوشی مکمل نہیں ہوتی تھی اس لیے یہ آپریشن بہت تکلیف دہ ہوتے تھے۔ مریضوں کو رسیوں سے باندھ دیتے تھے اور سرجن قصاب کی طرح چھرے لے کر مریض پر پل پڑتا تھا۔ آپریشن نے رومیوں کے عروج کے زمانے میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کی۔ لڑائی دنگل و غارت گری رومیوں کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ بہت سے زخموں کا علاج آپریشن کے ذریعے کرنا ضروری ہوتا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک سرجن گالن کا نام بہت مشہور رہا۔ اسے چودھویں صدی تک سرجری کا باوا آدم سمجھا جاتا رہا لیکن رفتہ رفتہ اس کی غلطیاں سامنے آتی گئیں اور اس کا نام دھندلا گیا۔ بغداد اور قرطبہ کے مسلمان سرجنوں نے آپریشن کے طریقے کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اسے بہتر بھی بنایا ورنہ یہ قدیم علم وقت کی گرد میں چھپ جاتا۔ گزشتہ صدی تک آپریشن کا عمل مقبول نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجوہ یہ تھیں۔

۱۔ قدیم سرجن انسانی جسم کی ساخت اور اس کے اعضاء کی ترتیب سے ناواقف تھے۔ مثلاً انھیں یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ فلاں رگ کہاں سے گزرتی ہے اور بعض اوقات دوران آپریشن کوئی بڑی رگ کٹ جانے سے مریض کی موت واقع ہو جاتی تھی۔

۲۔ انسان جراثیم کی ان دیکھی مخلوق سے ابھی متعارف نہیں ہوا تھا۔ جراثیم زخم کو خراب کر کے مریض کی موت کا باعث بن جاتے۔ جراثیم سے بے بہرہ ہونے کے باعث اس خرابی کا مناسب سدباب نہ کیا جا سکتا تھا۔

۳۔ زخموں کو سینے کے لیے مناسب دھاگے موجود نہیں تھے۔ عام دھاگے تو زخم کو مزید خراب کر سکتے

♡ ۱۲۲-ایم شاہراہ قائداعظم، کراچی، پاکستان

ب۔ ان دھاگوں کو نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ ظاہر ہے
پیٹ کے اندرونی زخم سے دھاگے نکلنے ممکن
نہیں ہوتے۔

گزشتہ چند صدیوں کے دوران علم الاعضا میں
زبردست ترقی ہوئی۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں لوئی
پاسچر نے جراثیم دریافت کیے اور ایسے دھاگے بھی
دریافت ہو گئے جو جسم کے اندر جذب ہو سکتے تھے اور
انہیں باہر نکالنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ
اس صدی کے دوران آپریشن کی تکنیکوں میں زبردست
ترقی ہوئی ہے حتیٰ کہ تبدیلیٔ قلب جیسے بظاہر ناممکن
آپریشن بھی کامیابی سے کر لیے گئے ہیں۔

آپریشن کیسے کیا جاتا ہے

آپریشن جدید طب کے اہم ترین طریقہ ہائے علاج
میں سے ایک ہے۔ اس کے ذریعے بے شمار بیماریوں
کا علاج ممکن ہو گیا ہے جو پہلے لاعلاج تھیں۔ آپریشن کو
یہ امتیاز جدید اصولوں کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ آپریشن
کے بعض اہم اصول اور اس کے روشن اور تاریک
پہلو درج ذیل ہیں۔

مریض کو تیار کرنا

آپریشن سے پہلے اس کی تیاری شروع کر دی
جاتی ہے۔ آپریشن سے بارہ گھنٹے پہلے ہی مریض کا کھانا
بند کر دیا جاتا ہے۔ وہ صبح ناشتہ بھی نہیں کر سکتا۔ آپریشن
تھیٹر جانے سے آدھ گھنٹہ پہلے اسے پیتھیڈین اور ایٹروپین
کے انجکشن دیے جاتے ہیں۔ پیتھیڈین ایک خواب آور
دوا ہے۔ اس کے انجکشن کے بعد مریض اپنے آپ میں
کھو جاتا ہے اور وہ متوقع خطرے کے متعلق قطعی فکر
نہیں کرتا۔ ایٹروپین کی وجہ سے معدے، آنتوں اور
منہ میں بلغمی رطوبتوں کا اخراج کم ہو جاتا ہے اور یہ سرجن
کو پریشان نہیں کر سکتیں۔ دوا کے ذریعے مریض کی آنتیں
خالی کر دی جاتی ہیں اور نالی کے ذریعے اس کا پیشاب بھی
خارج کر دیا جاتا ہے۔

آپریشن سے پہلے مریض کے جسم کے اس حصے کو
صاف کر دیا جاتا ہے جہاں شگاف دیا جانا ہے۔ اس
حصے پر اگر بال ہوں تو انہیں صاف کر دیا جاتا ہے اور
صابن سے اچھی طرح دھو دیا جاتا ہے۔ مریض کو آپریشن
تھیٹر پہنچا کر اس کے جسم کے تمام حصے ڈھانپ دیے
جاتے ہیں۔ صرف وہ حصہ کھلا رہنے دیا جاتا ہے جس کا
آپریشن ہونا ہوتا ہے۔ اسے آیوڈین کی مدد سے بھی
صاف کر دیا جاتا ہے تاکہ اس پر موجود جراثیم ہلاک ہو جائیں
اور آپریشن کے دوران جسم کے اندر داخل نہ ہو سکیں۔ بعض
اوقات ضرورت ہو تو مریض کو خون کی بوتل لگا دی جاتی ہے
ورنہ بڑے آپریشن کی صورت میں خون کی بوتل تیار رکھی
جاتی ہے۔ آپریشن تھیٹر میں لے جانے سے پہلے ہی
مریض کے خون کا گروپ معلوم کر لیا جاتا ہے اور اس
گروپ کے خون کا بندوبست بھی کر لیا جاتا ہے تاکہ کسی بھی
صورت میں کوئی مشکل درپیش نہ آئے۔ اگر مریض کے
خون میں ہیموگلوبن بہت کم ہو تو آپریشن سے پہلے اسے
بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آپریٹر

آپریشن کرنے والے سرجن اور اس کی مدد کرنے
والے لوگوں کو بھی آپریشن کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے
یہ لوگ اپنے ہاتھ صابن سے اچھی طرح دھوتے ہیں۔
آپریشن تھیٹر میں موجود جراثیم سے پاک گاؤن پہن لیتے ہیں۔
پاؤں میں ایسے سلیپر یا بوٹ پہنتے ہیں جو جراثیم
سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ہاتھوں میں صاف دستانے چڑھاتے

ہیں۔ سر پر صاف ٹوپی پہن لیتے ہیں اور ناک اور منہ پر ماسک (نقاب) باندھ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے جسم پر موجود جراثیم مریض اور آپریشن تھیٹر میں موجود چیزوں تک نہیں پہنچ سکتے آپریشن دیکھنے والوں (طلبا، یا تماشائیوں) کو ایک علیحدہ گیلری میں بٹھایا جاتا ہے۔ کوئی شخص جو مناسب لباس میں نہ ہو اور اس نے ہاتھ وغیرہ صاف نہ کیے ہوں وہ آپریشن تھیٹر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ان اصولوں نے آپریشن کو بہت محفوظ بنا دیا ہے۔

آپریشن

صاف نشتر کے ذریعے پہلے جلد اور پھر گہرائی میں موجود اعضا کو کاٹا جاتا ہے۔ گھاؤ کی لمبائی کم از کم رکھی جاتی ہے۔ سرجن کا ایک مددگار صاف کپڑوں کے ذریعے خون صاف کرتا رہتا ہے۔ سرجن مختلف آلات کے ذریعے جلد اور کٹے ہوئے پٹھوں کو ایک طرف ہٹا دیتا ہے۔ تاکہ وہ مطلوبہ جگہ کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ اس جگہ پر تیز روشنی پڑ رہی ہوتی ہے۔ ابتدائی گھاؤ کے بعد نشتر استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ قینچی سے کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ گہرائی میں خون کی بڑی رگیں زیادہ ہوتی ہیں اور ان کے کٹنے سے خون بہت زیادہ ضائع ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی بڑی رگ کٹ بھی جائے تو اسے کلیمپ کے ذریعے بند کیا جا سکتا ہے۔ پیٹ کے آپریشن میں سرجن ہاتھ اندر ڈال کر تمام اعضا کو ٹٹول سکتا ہے اور اگر ان میں کوئی خرابی ہو تو متاثرہ حصے کو کاٹا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات مرض کی اصل تشخیص آپریشن کے دوران ہوتی ہے۔ پیٹ کھولتے وقت صاف کپڑے کے چند پیڈ اس میں ٹھونس دیے جاتے ہیں تاکہ زخموں سے نکلنے والا خون پیٹ میں جمع نہ ہو سکے۔ بلکہ پیڈوں میں جذب ہوتا رہے اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد سرجن زخموں کو سیتا ہے۔ زخم کی تہوں میں سیے جاتے ہیں۔ اندرونی زخموں میں ایسا دھاگہ استعمال کیا جاتا ہے جو کچھ عرصے بعد جذب ہو جاتا ہے اور جسم کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ جلد کے زخم ایسے دھاگے سے سیے جاتے ہیں جسے بعد میں نکالا جا سکتا ہے۔ آپریشن کے دوران ایک ڈاکٹر مریض پر کڑی نظر رکھتا ہے۔ اس کے خون کا دباؤ اگر بہت گر جائے یا اس کے خون کا بہاؤ یا دل کی دھڑکن بے قاعدہ ہو جائے یا اس کی سانس اکھڑ جائے تو وہ مناسب اقدامات کرتا ہے۔

آپریشن کے بعد

آپریشن کے بعد مریض کو احتیاط سے اسٹریچر پر ڈال کر ایک خصوصی وارڈ میں لے جایا جاتا ہے۔ بڑے آپریشنوں کی صورت میں اسے کم از کم دو دن تک کچھ کھانے پینے نہیں دیا جاتا۔ اسے گلوکوز وغیرہ دیا جاتا ہے۔ مریض کے اس حصے کو مکمل آرام میں رکھا جاتا ہے جس کا آپریشن کیا گیا ہو۔ حرکت کی صورت میں اس کے ٹانکے اکھڑ سکتے ہیں یا اس کے مندمل ہونے میں دیر ہو سکتی ہے۔ اس کے جسم کو فراہم کی جانے والی غذا اور اس کے جسم سے خارج ہونے والے فضلات کا مکمل ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اسے ایسی دوائیں دی جاتی ہیں جو جراثیم کے حملے سے اسے محفوظ رکھ سکیں۔ اس طرح زخم کے خراب ہونے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اسے حیاتین ج (وٹامن سی) بھی دیا جاتا ہے جو اس کے جسم کی قوت مزاحمت بڑھاتا ہے اور زخم مندمل ہونے میں مدد دیتا ہے۔

آپریشن کے تاریک پہلو

آپریشن قابلِ رشک طریقہ علاج نہیں کیونکہ اس سے کئی خطرات اور پیچیدگیاں بھی وابستہ ہیں۔ دوران آپریشن مریض کی کوئی بڑی رگ کٹ سکتی ہے اور خون بند ہونے

تک اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مریض صدمے کے باعث آپریشن کی میز پر ہی ہلاک ہو سکتا ہے۔ آپریشن کے بعد جراثیم اس زخم کو خراب کر سکتے ہیں اور یہ صورت حال بہت خطرناک ہوتی ہے۔ تاہم آج کل اس مسئلے پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا ہے۔ کوئی اندرونی ٹانکہ نکل جانے کی وجہ سے مریض کا خون اندر ہی اندر ضائع ہوتا رہتا ہے اور بعض اوقات ہسپتال کے عملے کے خبردار ہونے تک مریض چل بستا ہے۔ اگر آپریشن کینسر کا ہو تو بعض اوقات سرجن کینسر کے خلیات جسم میں ادھر ادھر بکھیر دیتا ہے اس طرح کینسر کئی جگہوں پر نشوونما پانے لگتا ہے۔ موت عموماً ایسے مریض کا مقدر بن جاتی ہے۔ اسی طرح کسی ایسے متاثرہ عضو کو کاٹتے وقت، جو جراثیم سے بھرپور ہو، جراثیم ادھر ادھر بکھر سکتے ہیں۔ جب زخم مندمل ہوتا ہے تو اس کی جگہ داغ بن جاتا ہے۔ یہ داغ اندرونی زخم پر بھی بنتا ہے اور اندرونی زخم کی جگہ بھی۔ اس داغ میں اتنی قوت نہیں ہوتی جتنی کہ جسم کی صحت مند بافتوں میں۔ اس طرح جسم کا یہ حصہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ اگر آنت یا کسی دوسرے نالی کی شکل کے عضو کا آپریشن کیا جائے تو زخم مندمل ہوتے وقت یہ سکڑ جاتے ہیں۔ ان سے متعلقہ افعال میں پہلے سا توازن نہیں رہتا۔ پیٹ کے آپریشن کی صورت میں بعض اوقات اندرونی اعضا آپس میں جڑ جاتے ہیں۔ اس سے ان کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ بعض اوقات آپریشن کے زخم کا داغ رسولی کی شکل اختیار کر سکتا ہے جسے نکالنے کے لیے ایک اور آپریشن کرنا پڑتا ہے۔ سرجن کی ناتجربہ کاری یا غفلت مریض کو بہت نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس ضمن میں ایسی مثالیں خالی از دلچسپی نہ ہوں گی جن میں سرجن قینچی یا کوئی دوسرا آلہ مریض کے پیٹ میں بھول گیا یا اس نے مریض کی متاثرہ آنکھ نکالنے کے بجائے واحد صحت مند آنکھ نکال دی۔

آپریشن کے ممنوعات

بعض مریضوں کا آپریشن نہیں کیا جا سکتا۔ چند مثالیں یہ ہیں:-

۱۔ ایسے مریض جو ہیموفیلیا کا شکار ہوں۔ ہیموفیلیا ایک ایسا مرض ہے جس میں مریض کا خون منجمد ہونے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے۔ اس صورت میں نہایت معمولی زخم سے بھی اتنا زیادہ خون بہہ سکتا ہے کہ مریض کی موت واقع ہو جائے جبکہ آپریشن کے دوران بے شمار چھوٹی بڑی رگیں کٹتی ہیں۔

۲۔ ایسے مریض جو خون کی [illegible] کا شکار ہوں۔

۳۔ ایسے مریض جو بہت کمزور ہوں اور آپریشن کا صدمہ نہ برداشت کر سکتے ہوں۔

۴۔ دل کے بعض امراض میں دل کے علاوہ کسی دوسرے عضو کا آپریشن کرنے سے عموماً احتراز کیا جاتا ہے۔

۵۔ ذیابیطس میں عموماً آپریشن نہیں کیا جاتا۔

جب مریض کسی شدید [illegible] بیماری میں مبتلا ہو یا اسے تیز بخار ہو تو اس کا آپریشن نہیں کیا جاتا۔

دار العلوم دیوبند: تعلیمی اور سیاسی جائزہ

علی احمد (۱) اور محمد طیب (۲)

دار العلوم دیوبند کا قیام ۱۸۶۶ء کے دل ہلا دینے والے غدر کے بعد ہوا۔ اس غدر کے بعد مسلمانوں کی سیکڑوں سال کی حکومت ختم ہو گئی۔ انگریزوں کی حکومت پورے ملک میں مکمل طور سے قائم ہو گئی۔ انگریز مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے۔ مسلمان انگریزوں کے ظلم و تشدد کا شکار ہو گیا۔ ان کی تعلیمی، مذہبی، سیاسی، تمدنی اور سماجی حیثیت کو ختم کرنے کے منظم منصوبے بنائے گئے۔ پورے ملک میں، خصوصاً مسلمانوں کے لیے افراتفری کا ماحول تھا۔ مسلمانوں کی زندگی اپنے ہی ملک میں تنگ ہو گئی۔

انگریزوں کے تسلط سے پہلے ہندوستانیوں میں خاص طور سے مسلمانوں میں، مذہب کا بہت احترام تھا۔ ہندوستان کی سبھی قومیں آپس میں باہمی رواداری اور میل محبت سے رہتی تھیں۔ لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان میں عقائد اور طریقہ عبادت پر کوئی سخت اختلافات اور جھگڑے نہیں ہوتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کی رسی میں بندھے ہوئے تھے۔ سیاسی پیچیدگیاں نہیں تھیں۔ جتنے بھی حکمراں ہندوستان میں رہے چاہے وہ کسی مذہب کے ماننے والے تھے، انھوں نے ہمیشہ عوام کو، خاص طور سے مذہب اور عقاید کے بارے میں پوری آزادی دی۔ اس کا اندازہ کسی حد تک شہنشاہ بابر کی مندرجہ ذیل وصیت سے لگایا جا سکتا ہے جو سلاطین مغلیہ کو کی گئی تھی۔ وہ ایسی وصیت ہے جو ان کی حکومت کی سنگ بنیاد اور آپسی تعلقات کی اساس کہی جا سکتی ہے۔

"اے پسر سلطنت، ہندوستان مختلف مذاہب سے پُر ہے۔ الحمد للہ اس نے اس کی بادشاہت تمہیں عطا کی ہے تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات مذہبی کو لوح دل سے دھو ڈالو اور عدل و انصاف میں ہر مذہب اور ہر ملت کے طریق کا لحاظ رکھو جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اس ملک کی رعایا فراہیم خسروانہ اور الطاف شاہانہ سے مرہون ہوتی ہے۔ جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر کام کرتے ہیں اسی طرح مختلف مذاہب و رعایا کو ملا کر رکھو اور ... میں اتحاد عمل پیدا کرو تاکہ جسم سلطنت

---

(۱) لیکچرر شعبہ تعلیم، اے ایم یو علی گڑھ

(۲) ریسرچ اسکالر، شعبہ سیا

مختلف امراض سے محفوظ رہے۔ سرگزشت تیمور کو مرکز اتحاد و اتفاق کا مالک تھا ہر وقت نظر کے سامنے رکھو تاکہ نظم و نسق کے معاملات میں پورا تجربہ ہو۔[1]

مسلمانوں کی حکومت کے ان اساسی اصولوں اور قوانین کو دیکھ کر انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ ان اصولوں پر کاربند رہنے سے ہندوستانی اقوام متحد رہیں گی اور ان حالات میں ان پر حکومت کرنا مشکل ہوگا۔ اس لیے انگریزوں نے ایسے منصوبے تیار کیے جس سے ہندوستانیوں میں عام طور سے مسلمانوں میں، مذہبی قدروں، علماء کا احترام، باہمی اخوت اور احساس دینیت کا جذبہ ختم ہو جائے اس لیے انھوں نے تعلیمی اور سیاسی میدان میں چالیں چلنا شروع کیں۔

تعلیم چونکہ ترقی اور سماجی تبدیلی لانے کا ایک اہم اور طاقتور ذریعہ ہے اس لئے انگریز والوں نے ایسی پالیسی اپنائی جس سے لوگ جاہل اور لامذہب ہو جائیں اسی طرح اور لادینیت کی وجہ سے مسلمان اپنا سر کبھی نہ اٹھا سکیں گے۔ حالانکہ اس زمانے میں مسلمانوں کے پاس تعلیم کا مناسب انتظام موجود تھا۔ مسلمانوں میں صنعت و حرفت، احساس دینیت جیسی اعلیٰ قدریں موجود تھیں۔ سر تھامس رو نے اس زمانے کے مسلمانوں کی تعلیم و صنعت اور ان کے اخلاق و کردار کا نقشہ حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:

"ہندوستانیوں کا طریقہ کاشتکاری بے مثل، صنعت و دستکاری کے معاملے میں ان کی استعداد اعلیٰ۔ ہر قریہ میں ایسے مدارس جن میں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہو۔ ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد، اس کی عزت و عصمت و عفت کا پورا پورا لحاظ۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے تم انھیں نہ مہذب اور نہ متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستانیوں کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ہندوستان اور انگلستان کے تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"[2]

اس بات کا احساس اور ذکر تو دنیا کی ساری قوموں کو ہے کہ مسلمان ایک باصلاحیت قوم ہے۔ ہر زمانے میں وہ عملی تمدن اور ذہنی صلاحیت کے حامل رہے ہیں۔ بنگال کے سول سروس کے ایک افسر نے اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

"عام تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور ہندو مسلمانوں کے سامنے طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہلیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔"[3]

مسلمانوں کی تعلیمی صلاحیت کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر آرنلڈ، جو کہ تعلیم کے افسر اعلیٰ تھے، لکھا ہے:

"بحیثیت معلم کے میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمانوں کے اسکولوں میں فارسی پڑھنے کے لیے بے شمار ہندو لڑکے ان پر اعتماد کرکے پڑھنے

آتے ہیں۔" سے

چونکہ انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اس لیے وہ ہندوستانیوں کی تعلیم و ترقی کو اپنا کام نہیں سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے انگریزوں کی حکومت بڑھنے اور مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں علم و فضل کے بجائے جہالت پھیلتی رہی۔ ایک انگریز اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

"انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیے۔ ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع مسدود کیے بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے ہمیں اس کی تلافی کے لیے کچھ کام کرنا چاہیے۔"

جہاں تک سیاسی معاملات کا تعلق ہے، انگریز ہندوستانیوں کی سیاسی قوت کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے۔ سیاسی میدان میں انگریزوں نے "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی اپنائی۔ انھیں یہ یقین تھا کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک پر حکومت اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک اس ملک کی بڑی جماعتوں میں اختلافات اور تقسیم نہ ہو۔ اگر اس ملک کی مختلف جماعتوں میں تقسیم ذاتوں، فرقوں اور قوموں کی بنیاد پر ہو گی تو کوئی بغاوت ہماری قوت کو متزلزل نہیں کر سکے گی۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انگریز مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی، انتظامی اور ذہنی صلاحیتوں سے بخوبی واقف اور قائل تھے لیکن چونکہ مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی صلاحیتوں کو بڑھنے کا موقع فراہم کرنے کے بجائے انھیں ختم کرنے میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔ ان کی حالت دن بہ دن بگڑتی چلی گئی۔ انگریزوں نے اپنی حکومت مستحکم کرنے کے لیے مسلمانوں پر مصیبتوں اور پریشانیوں کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے۔ ان کے ظلم و زیادتی کی ایک لمبی داستان ہے جو یہاں موضوعِ بحث نہیں ہے۔

ظلم و تشدد اور دشمنی کے ان حالات میں شاید دوسری قوم دوبارہ ابھرنے کی ہمت بھی نہ کرتی لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک چنگاری علم کی، احساس وطنیت کی اور ملک کی آزادی کی بچی ہوئی تھی جو شعلہ بن کر سامنے آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں مسلمانوں میں ایسے لوگ کھڑے ہو گئے جو اس مظلوم قوم کو ظلم سے نکالنے کے لیے کمربستہ ہو گئے جس کے نتیجے میں انھیں ہر قسم کی مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔

ان حالات میں مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، سیاسی اور تمدنی ترقی کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے کہ انگریزوں کے نشانے انھیں پر تھے۔ ان حالات پر قابو پانے کے لیے علما اور دانش وروں نے مشورے کیے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس وقت ہماری پوری توجہ دینی علوم کے حصول، بقا اور اشاعت پر مرکوز ہونی چاہیے کیونکہ اسلامی علوم کے حصول اور عمل سے ہی سارے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مدد سے ہی انگریزی حکومت کی لائی ہوئی دہریت اور عیسائیت کے طوفان سے مسلمان محفوظ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اسی سوچ اور فکر کے نتیجے میں دیوبند میں ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء کو ایک مدرسہ قائم کیا گیا جو آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔ یہ مدرسہ صرف اسلامی درس گاہ ہی نہیں تھا بلکہ تربیت گاہ بھی تھا، جہاں زندگی کے ہر گوشے کے لیے افرا

تیار کیے جاتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام بنیادی طور پر اسلامی علوم کے تحفظ اور اشاعت کے لیے کیا گیا تھا لیکن تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت مسلمانوں کی سیاسی، تمدنی، معاشی اور سماجی زندگی کے لیے کچھ کم نہ تھی۔ اس لیے کہ اسلامی علوم سے زندگی کا کوئی گوشہ چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ اس مقالے میں تعلیم اور سیاست ہی زیر بحث ہے کیونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اگر کوئی قوم تعلیمی اور سیاسی طور پر قوی نہیں ہے تو اس قوم کا زندہ رہنا اور باوقار زندگی گزارنا دشوار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو تحریکیں مسلمانوں کو کامیاب ترین زندگی تک پہنچانے کے لیے چلائی گئیں ان تحریکوں کے مقاصد میں یہ دونوں پہلو بہت نمایاں تھے۔ دارالعلوم دیوبند جسے دیوبند تحریک بھی کہتے ہیں، میں بھی دو پہلوؤں پر زیادہ زور دیا گیا جس کا اجمالی بیان یہاں کیا گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے کچھ اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

الف) آزادی ضمیر کے ساتھ یہ موقع ہو کہ حق کا اعلا ہو۔ کوئی شہری جبر، بے جا دباؤ، مرتبہ سلطانہ مراعات اس میں حائل نہ ہو سکیں۔

ب) اس کا تعلق عام مسلمانوں سے زیادہ سے زیادہ ہو تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو۔

ج) ایسے باحوصلہ افراد کو تیار کرنا جو ۱۸۵۷ء کی تلافی کر سکیں۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے دارالعلوم قائم کیا گیا تھا۔ ان مقاصد میں مذہبی علوم کی اعلیٰ تعلیم اور اس کی اشاعت سب سے مقدم ہے۔ تاکہ بڑے بڑے علما تیار ہوں جو ملک اور بیرون ملک میں اسلام کی تعلیم اور [illegible] سیاست کے میدان میں آگے [illegible] ملک کی آزادی کی [illegible] ۱۹۰۵ء میں مولانا محمود حسن صاحب نے [illegible] تحریک [illegible] نامی ایک انجمن قائم کی۔ مولانا محمود حسن صاحب دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے۔ [illegible] تحریک کا نام یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کا سب سے پہلے قدم اٹھایا تھا۔

[illegible] دارالعلوم پر مشتمل [illegible] کا دائرہ وسیع ہو [illegible] ۱۹۰۹ء میں [illegible] جمعیۃ الانصار [illegible] ۱۹۱۱ء میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے تیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔ اس تحریک میں دھیرے دھیرے مسلمانوں کے مدرسے منسلک شامل ہونے لگے اور اشاعت کا کام انجام دیا اور انگریزوں کی منصوبہ بندی کو پاش پاش کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ دارالعلوم کی نہج پر ملک کے مختلف حصوں میں دینی مدارس قائم کیے گئے۔ ان مدارس کا تعلق کسی نہ کسی طریقے سے دارالعلوم سے ضرور ہوتا تھا۔ ان مدارس کی وجہ سے الحاد و دہریت کے سیلاب کی طغیانی مدھم پڑ گئی۔ عوام اور خواص تک علمائے کرام نے تحریروں، تقریروں اور مناظروں

کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں میں اسلامی نقوش نقش کیے۔

آج کل دارالعلوم دیوبند برصغیر ہند و پاک کے عربی جامعات اور اسلامی مطالعات کے اداروں میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے طالب علم ہی تعلیم حاصل نہیں کرتے ہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک سے بھی بڑی تعداد میں طلباء تعلیم کے لیے یہاں آتے ہیں۔ اس دارالعلوم نے مختلف علوم و فنون میں گراں قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔

جہاں تک دارالعلوم کے سیاسی کردار کا تعلق ہے، دارالعلوم نے انگریزوں کی غاصب حکومت کو نیست و نابود کرنے کے لیے حب الوطنی کے جذبے کو آگے چل کر اس تحریک نے سارے ہندوستانیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طرح یہ تحریک مسلمانوں کی تحریک نہ رہ کر سارے ہندوستانیوں کی تحریک بن گئی اور آخر میں اس نے "ہندوستان چھوڑو تحریک" QUIT INDIA MOVEMENT کی شکل اختیار کر لی جس کی جدوجہد کے نتیجے میں ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی اور سیاسی جائزہ لینا اس مختصر مقالے میں بہت دشوار ہے۔ پھر بھی اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دارالعلوم دیوبند جن مقاصد کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ ان میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اخبار خلافت بمبئی ۱۱ اگست ۱۹۲۶ء، ص ۱۹۰

۲۔ تعلیمی ہند، ص ۲۰

۳۔ سید طفیل احمد منگلوری مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ دہلی ۱۹۴۵ء، ص ۱۹۲

۴ ایضاً ص ۱۶۰

۵۔ ایضاً ص ۳۲،

۶۔ محمد میاں۔ علمائے حق۔ حصہ اول۔ دہلی، ص ۵۵-۵۴

۷۔ محمد میاں۔ اسیران مالٹا۔ دہلی ۱۹۰۶ ص ۱۲

بچے اور مرضِ اسہال

ابوسعد

اسہال بچوں کے لیے ایسا مہلک مرض ہے کہ جس کی سنگینی کا اندازہ عالمی اعداد و شمار کے مطابق اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ہر سال تقریباً دو کروڑ بچے اپنا سال پورا کرنے سے قبل ہی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں اموات کی بیشتر اسہال کے زیر اثر جسم میں پیدا ہونے والی پانی کی کمی اور دیگر ELECTROLYTES کی قلت کا مناسب نہ ہو پانا ہوتی ہے۔

اسہال کے محرکات Causative Factor یوں تو بہت زیادہ ہیں البتہ جراثیم اور طفیلیے Parasites بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ موسم گرما ان جراثیم اور طفیلیے کی نشو و نما اور افزائش کے لیے سازگار موسم ہے۔ اسی لیے گرمی، جراثیم کی کثرت اور ان کیڑے مکوڑوں کی افزائش میں مددگار ثابت ہوتی ہے جو مرض اسہال کے عوامل بنتے ہیں۔ نیز گرمی کی بنا پر فساد غذا جلد واقع ہوتا ہے خاص کر دودھ اور اس سے بنی ہوئی غذائیں جلد فساد کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تیسری دنیا کے ممالک میں صاف ستھرے اور غیر آلودہ پانی کی قلت بھی اس مرض کے پھیلاؤ میں بے حد اہم رول ادا کرتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی نصف آبادی پینے کے صاف ستھرے پانی سے محروم ہے۔ یونیسف UNICEF جو کہ بچوں کی صحت پر خاص توجہ مرکوز کئے ہوئے ہے اس نے اس سنگین مسئلہ کی جانب خصوصی طور پر توجہ مبذول کرائی ہے۔

اسہال کے یوں تو بہت سارے جراثیمی اور غیر جراثیمی اسباب ہیں مگر وہ عوامل جو عمومی زندگی میں ہماری کم علمی، کوتاہی اور غفلت کی بنا پر اسہال کا سبب بن جاتے ہیں کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ حالانکہ ان اسباب پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ ان عوامل میں درج ذیل عادات کا بڑا دخل ہے۔

بچوں کو چپ کرانے کے لیے کھلونوں کا استعمال بھی ایک اہم سبب ہے۔ ان کے اندر جراثیم بکثرت موجود رہتے ہیں۔ ان کھلونوں کو چوسنے اور چبانے کے ساتھ یہ جراثیم اندر پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح اسہال شروع ہو جاتا ہے۔

فیڈر کے ذریعہ بچوں کو دودھ پلانے سے

☐ متعلم ایم۔ڈی (معالجات) اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

غفلت برتنا اور رضاعت کے مصنوعی طریقوں کو خدمت میں لانے سے بھی اسہال میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے کہ اس طریقے سے بچوں کے اندر قوت مدافعت کم ہو جاتی ہے۔ مزید برآں مصنوعی طور پر تیار کردہ دودھ کی شیشی رات اور دن کے اکثر اوقات میں بچوں کی ہم آغوش رہتی ہے اور جب بھی بچہ روتا ہے، اسی نسخہ کیمیا کو استعمال کرا دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ ان حالات میں یہ شیشی جراثیمی تعدیہ میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور اسی وجہ سے تعفن اسہال پیدا کرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان آلات رضاعت کی حفاظت برف میں رکھ کر کی جائے اور بچے ہوئے دودھ کو ضائع کر دیا جائے۔

حالت اسہال میں ادویہ کا استعمال بسا اوقات انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ یہ بات مانی جاتی ہے کہ یہ ادویہ کبھی کبھی نفع بخش ہونے سے کہیں زیادہ مضرت رساں ہو جاتی ہیں بایں معنی کہ ان میں قابضات کا استعمال آنتوں میں انسداد پیدا کر دیتا ہے اور دواؤں کے مقابلے جراثیم کی قوت مدافعت بھی شفا میں تاخیر پیدا کر کے ایک بڑی کلفت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

ناقص تغذیہ بھی اسہال کا اہم سبب ہے۔ بچوں کو طویل وقفے تک گائے یا بھینس کے دودھ پر رکھنا اور کوئی دوسری غذا فراہم نہ کرنا بھی اسہال کا سبب بن جاتا ہے۔ نامناسب اور اندازے سے زائد غذا کے استعمال سے بچوں کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اسہال کے اندیشے اور خطرات

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بچوں میں شرح اموات کا چوتھائی حصہ اسہال کے سبب ہوتا ہے پانچ سال کی عمر سے کم میں ۵۰، ملین بچے افریقہ لاطینی امریکہ میں سالانہ اسہال عارضے سے متاثر ہوتے ہیں اور ۴ ملین بچے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ اس طرح دوسرے امراض مثلاً خسرہ اور کالی کھانسی وغیرہ امراض کی شرکت سے بچوں کی سالانہ شرح اموات ۱۵ ملین تک پہنچ جاتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر اسہال کے پہلو بہ پہلو سوڈیم اور پوٹاشیم کی کمی ہو جاتی ہے جو کہ بالآخر جسمانی قوت مدافعت کم کر دیتی ہے اور دماغ اور گردے کے افعال متاثر ہو جاتے ہیں۔ نیز بار بار اسہال کی بنا پر وزن گھٹنا شروع ہو جاتا ہے اور بچے Marasmus جیسے مرض کی اسٹیج تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مرض انتہائی خطرناک اور جان لیوا ہے۔

علاج وتدابیر:

۱۔ بچوں کی تغذیہ کی طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔ مصنوعی دودھ کی فراہمی کے بجائے ماں کے دودھ پر زور دیا جانا چاہیے اور اگر مصنوعی دودھ فراہم بھی کیا جائے تو پوری طرح آلات رضاعت کو جراثیمی تعدیہ سے محفوظ رکھنا چاہیے۔

۲۔ جسم میں پانی کی کمی اور دیگر ELECTROLYTES کا بدل فراہم کرتے رہنا چاہیے اور وقفے وقفے سے اسے بچوں کو دیتے رہنا بے حد مفید اور ضروری ہے۔

۳ طبیب سے مشورہ کرکے دواؤں کا استعمال

یہ تو بنیادی علاج ہے۔ دیگر تدابیر تو
مندرجہ ذیل امور پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے

ا۔ مصنوعی دودھ اور آلات رضاعت
کے استعمال کے متعلق طبی معلومات
قومی پیمانے پر نشر کرتے رہنا
چاہیے۔

ب بچوں کے لیے سب سے بہتر غذا
ماں کا دودھ ہے۔ اس کا احساس
ماؤں کو دلایا جائے۔

ج صاف ستھرے پانی کا انتظام

د۔ طبی عادات پر لوگوں کو اکسانا
چاہیے۔ ہمیشہ صابن سے ہاتھ دھونا

ہ سبزی وغیرہ کو پانی سے دھوکر
پکانا۔

و اسہال کے علاج کے بارے بڑی تعداد
میں لوگوں کو صحیح معلومات فراہم کرنا۔

"اے صاحبو! ہماری زندگی قریب اختتام ہے۔
چند سال ہماری تمہاری عمر میں اور باقی ہیں۔ یہ سفید
سفید داڑھیاں، یہ پلے پلے منہ زمین میں گڑ کر یا
مرگھٹ پر جل کر خاک ہو جائیں گے مگر یاد رکھو کہ یہ بچے
جن کو تم نوجوان چھوڑ جاؤ گے ان کا یہ حال ہوگا کہ روز
بروز مفلس اور ذلیل و خوار ہوں گے۔ جیل خانے ان
سے بھرا کریں گے۔ اے ہندوؤ اور مسلمانو! اگر
مرنے کے بعد روح قائم رہتی ہے تو مرنے کے بعد
یہ حالت دیکھ کر تمہاری پاک روحیں کھنڈروں اور
قبروں پر تڑپیں گی"

سر سید

لندن میں پروفیسر رالف رسل سے ملاقات

سیدہ جعفر (*)

جب میں مدرسے میں زیر تعلیم تھی تو بار بار یہ مقولہ سننے میں آتا تھا کہ حکومت برطانیہ کے طول و عرض میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا اور اسی زمانے سے مجھے انگلستان کی راجدھانی لندن کی سیاحت کا شوق تھا۔ میری تعلیم ماحبوب گرلز اسکول میں ہوئی تھی اور یہ حیدرآباد کی ان چند درس گاہوں میں سے ایک تھی جہاں متعدد انگریز خواتین بھی تدریس کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ اس زمانے میں شہر کے اکثر معززین کی لڑکیاں یہیں تعلیم پاتی تھیں جس کی وجہ سے اس مدرسہ کا معیار تعلیم بلند تھا۔ لڑکیوں کی علمی رہبری اور رہنمائی کرنے والی یہ یورپین اور انگریز استانیاں کسی مشفق و مہربان خواتین تھیں۔ وقت کی کتنی پابند اور کیسی فرض شناس۔ ان سب سے بچپن میں ہمیں یہ درس ملا کہ زندگی ضائع کرنے کے لیے نہیں ہے اس کے ایک ایک لمحے کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ ہر شے زندگی کی قیمت مانگتی ہے اور زندہ رہنا ہو تو اس کی قیمت ادا بھی کرنی پڑتی ہے۔ ان کی تعلیمات کا نقش دل پر ثبت ہو کر رہ گیا۔ مسز لینل میری کلاس ٹیچر تھیں۔ بڑی شفیق اور فرد نواز۔ مجھ پر ان کی بڑی عنایتیں رہیں۔

۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا اور میری چشم گنہ گار نے وہ سحر بھی دیکھی جس کے بارے میں کہا گیا ہے

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ایک ایک کر کے ہماری استانیاں ہندوستان سے رخصت ہونے لگیں اور عظیم تر ہندوستان کے ہنگاموں کے ایک جزو بن کے رہ گئیں اور پھر دھندلکوں کی ان خاموش وادیوں میں کھو گئیں، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ جب میں لندن کے ایرپورٹ ہیتھرو پر اور اس سرزمین پہ پہلا قدم رکھا تو میرا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہاں ہو مسز لینل! آپ نے مجھ میں اکتساب علم کی جو شمع روشن کی تھی میں نے اسے زمانے کی آندھیوں سے بچائے رکھا ہے اور اس کی لو مدھم نہیں ہونے دی ہے۔ آپ سب کی مقدس روحوں پر میرا سلام ہو۔

میں اردو مجلس لندن کی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے سمینار میں مجھے مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی اور مجھے حیدرآباد سے لندن بلوایا۔ میرے

---

* پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، سینٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد۔

مقالے کا عنوان قطب شاہی تہذیب و تاریخ سے متعلق تھا۔

لندن میں جہاں پارکوں، مشہور دکانوں، عجائب گھروں، کتب خانوں اور دانش گاہوں میں جانے کا موقع ملا وہیں اہل علم و ادب سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ انڈیا آفس، کیمبرج، آکسفورڈ اور لندن یونیورسٹی کے کتب خانوں میں گئی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ علوم کے بیش بہا سمندر ان کتب خانوں میں سما گئے ہیں۔ [illegible] صاحب، عبدالعلیم [illegible] پروفیسر [illegible] پروفیسر رالف رسل [illegible] سے نیاز [illegible] اور [illegible] کی [illegible]۔ [illegible] رالف رسل [illegible] اپنی [illegible] سال گرہ کا دن تھا اور انھوں نے زندگی کی [illegible] منزلیں طے کر لی تھیں۔ رالف رسل نے بھی بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ [illegible] سے [illegible] اردو کے [illegible] سے [illegible] کے [illegible] ہو سکوں۔ [illegible] کے مصنف [illegible] لندن میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے رالف رسل کی [illegible] نہیں۔ [illegible] کی [illegible] میں اردو کی [illegible] کی کامیاب کوشش کی ہے اور اس زبان سے اپنے عشق کا [illegible] کر دیا ہے۔ رالف رسل بڑی روانی اور اعتماد کے ساتھ صحیح اردو بولتے ہیں لیکن کہیں کہیں تلفظ پر انگریزی لب و لہجہ غالب آ جاتا ہے۔

اردو زبان کی خدمت کے سلسلے میں رالف رسل حامد حسن قادری کے بڑے مداح ہیں۔ حامد حسن قادری سے ان کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ رالف بڑے راست گو اور صداقت پسند انسان ہیں۔ انھوں نے کھلے الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ [illegible] شاعری کی [illegible] سے [illegible] سید [illegible] جعفری اور مخدوم محی الدین کو انھوں نے [illegible] سے [illegible] کہا کہ ان شعرا نے [illegible] میں [illegible] کی [illegible] کے [illegible] سے [illegible] شعرا کی [illegible] نظموں کو ان کو حقیقی [illegible] ان کی تخلیقی حیثیت [illegible] رالف رسل [illegible] انھوں نے کہا کہ [illegible] شعر نے [illegible] کو خوب [illegible] ملا کیا ہے [illegible] فراموش [illegible] ہے۔

رالف رسل کو [illegible] زندہ رہنے کی [illegible] سے [illegible] دور میں [illegible] اردو میں [illegible] مہینے [illegible] ان کی زبان اور [illegible] سے [illegible] اردو کا [illegible] ہندو پاک میں اردو [illegible] اور [illegible] کی طرف توجہ کی [illegible] سے [illegible] کلاسیکی سرمایے سے [illegible] ہو سکتی ہے۔

میں نے رالف رسل سے سوال کیا کہ اردو کے اہم مرکزوں سے دور رہ کر بھی آپ نے اس زبان سے کیسے دلچسپی لی تو انھوں نے جواب دیا کہ دوسری عالمی جنگ میں وہ فوج میں ملازم تھے۔ ایک دن ان کے متعلقہ عہدیدار نے ان سے کہا کہ رالف تمھیں ہندوستان جانا ہوگا اور یہ حکم [illegible] مرگ مفاجات سے بہرحال بہتر تھا۔ وہ اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے۔ یہاں انھوں [illegible]

تک یہ دور ان کی زندگی کا ایک یادگار عہد ثابت ہوا۔ رالف کا بیان ہے کہ اس زمانے میں انڈین آرمی میں انگریز افسروں کو اردو کی [illegible] ہندوستانیوں کو اردو سیکھنا پڑتی تھی بلکہ گورے [illegible] فوجی بھی اردو سیکھنے پر مجبور تھے۔ اس زمانے میں رالف کو اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے اردو کا رسم الخط سیکھا اور اس زبان میں گفتگو کرنے کی مشق کی۔ [illegible] فوجی زندگی میں [illegible] تک کو [illegible] سکھا۔ [illegible] اردو میں گفتگو کرتے [illegible] رالف رسل سیاسی مسائل کے علاوہ سے محبت بھی [illegible] بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوستان واپس آکر انھوں نے اردو زبان اور ادب سے دلچسپی برقرار رکھی اور سیاسی سرگرمیوں کا بھی فائدہ [illegible] کر دیں۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ [illegible] اخبار میں یہ اشتہار نظر آیا کہ حکومت برطانیہ کی ایک اسکیم کے تحت ان امیدواروں کی درخواستیں مطلوب ہیں جو غیر ملکی زبانوں پر عبور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان امیدواروں کو اسکالرشپ دیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ ان غیر ملکی زبانوں میں اردو بھی شامل تھی۔ اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ [illegible] جائیں۔ لندن یونیورسٹی میں رالف رسل کے استاد اے ایچ ہارڈی (A.H. Hardy) تھے وہ ہندوستان کے بڑے مداح تھے۔ رالف رسل کہتے ہیں کہ میں نے پروفیسر ہارڈی سے زیادہ اچھی اردو بولنے والا انگریز آج تک نہیں دیکھا۔ انھیں اردو کے روزمرہ اور محاوروں پر عبور حاصل تھا اور صحیح زبان سیکھنے کے لیے وہ زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں سے آگہی ضروری تصور کرتے تھے۔ جب رالف رسل نے بی۔ اے آنرس میں داخلہ لیا اس وقت گراہم بیلی کو رخصت ہوئے ایک یا ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ رالف کے ایک اور استاد اے ایچ ہارڈی تھے جو پہلے کلکتہ کے ایک انگریزی اسکول میں پرنسپل تھے اور پھر لندن چلے آئے تھے۔ ان کی اردو تعلیم و تدریس کے سلسلے میں کیپٹن جیکب (Captain Jacob) نے بھی اہم حصہ لیا تھا۔ اردو کے ساتھ ذیلی مضمون کی حیثیت سے رالف رسل نے سنسکرت پڑھی۔ رالف رسل ۱۹۴۹ء میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے اور وظیفہ پر سبکدوش ہونے تک اردو کی تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے۔

میں نے رالف سے سوال کیا کہ آپ کی اردو تعلیم کا آغاز "رومن اردو" سے ہوا ہے کیا آپ اردو کے فارسی رسم الخط کو بہتر سمجھتے ہیں یا رومن رسم الخط اس کے لیے مناسب ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں ابتدا ہی سے رومن رسم الخط کے خلاف ہوں کیونکہ ہر زبان کا ایک رسم الخط ہوتا ہے جو اس کا جزو لاینفک بن جاتا ہے اور اس میں اس کے مزاج کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ جب ہندوستان میں ساہتیہ اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تو بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لیے بھی دیوناگری رسم الخط رائج کرنے کی ضرورت ہے لیکن عملاً ایسا نہیں ہو سکا۔ ابتدائی منزلوں میں میں اپنے اردو سیکھنے والوں کے لیے رومن رسم الخط سے مدد لیتا ہوں تاکہ تعلیم میں سہولت ہو اور پھر وہ رفتہ رفتہ فارسی رسم الخط کو اپنا لیتے ہیں۔ یہ میرا اپنا طریقہ کار ہے لیکن اردو کے لیے رومن رسم الخط مناسب نہیں بلکہ غیر مناسب ہے۔

رالف رسل نے آکسفورڈ میں ان طالب علموں کو اردو سکھائی جو اس زبان سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ لندن کے کوئی سات اسکولوں میں اردو پڑھانے کا باقاعدہ انتظام ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی مدرسوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ انھوں نے

[redacted]

اس خیال کا اظہار کیا کہ برطانیہ میں ایسے اساتذہ کی کمی ہے جو یہاں کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس زبان کی تدریس کے فرائض انجام دے سکیں ہندوستان، پاکستان اور ویسٹ انڈیز وغیرہ کے جو خاندان لندن آکر مقیم ہوگئے ہیں اُن کے بچے لندن میں پیدا ہوئے ہیں انھوں نے ہوش سنبھالا ہے ان بچوں کو اردو سکھانے کا مسئلہ درپیش ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ لندن کے تہذیبی اور سماجی حالات اور یہاں کے ماحول کی مناسبت سے انھیں اردو پڑھائی جائے۔

نصابی کتابوں کے بارے میں میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے رالف نے کہا کہ بچوں کے لیے اردو کی ایسی ریڈرس تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی ریڈروں سے مختلف ہوں۔ کیونکہ وہاں کی ضروریات کے تحت انھیں مرتب کیا گیا ہے اور یہ ریڈرس لندن کے نوعمر طالب علموں کے لیے مناسب نہیں۔ اس سلسلہ میں رالف رسل کی مساعی قابل ستائش ہیں۔

میرے اس سوال پر کہ لندن میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے آپ کے ذہن میں کیا تجویزیں ہیں انھوں نے جواب دیا کہ سب سے پہلے اردو کے قابل قدر شعری ادب کو انگریزی زبان میں منتقل کرلیا جائے۔ رالف رسل نے خورشید الاسلام کے ساتھ غالب کے کلام کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔

سب سے آخر میں میں نے رالف رسل سے یہ سوال کیا کہ لندن میں کون سے ادارے اردو کے لیے اچھا کام کر رہے ہیں، اس کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ اردو مرکز کے پاس خاطر خواہ وسائل تھے اور انھوں نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا تھا الطاف گوہر نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اردو پڑھنے کا انتظام جدید بنیادوں پر کیا جائے۔ رالف رسل نے اردو مجلس لندن کی ستائش کی اور کہا کہ اس کے اراکین اچھا کام کر رہے ہیں۔ رالف رسل نے اردو مجلس کی سرگرمیوں کو بھی سراہا اور اس کے بارے میں اچھی رائے ظاہر کی۔

(بشکریہ سیاست حیدرآباد)

"کاش اگر ہندوستان کے لوگ عقل رکھتے ہوتے اور جوش جہالت اُن پر غالب نہ ہوتا تو بجائے اس نفاق کے ان کے دلوں میں ایک عام ہمدردی اور محبت ہوتی اور جو خراب نتیجہ اب ان کو اس نفاق کا ملتا ہے بجائے اس کے ان کو اتفاق کا نتیجہ ملتا جس کے سبب سے ان کی آبرو و جان مال سب محفوظ و مصئون ہوتا۔"

سر سید احمد

ایکو سسٹم کا بگڑتا توازن

طارق اشرف

ایکو سسٹم (Eco System) کائنات کے تمام جاندار اور غیر جاندار اشیاء کے باہمی ربط کا نام ہے۔ غیر جاندار اشیاء، توانائی، حرارت، گیس وغیرہ کی ایک خاص مقدار خود زمین پر انسان اور پیڑ پودوں کی بقا کے لیے لازمی ہے۔ زمین پر ذی روح کا وجود ان اجزاء کے درمیان ایک خاص توازن میں مضمر ہے جسے سائنس کی زبان میں ہم Ecological balance کہتے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں بے مہار ٹکنولوجیکل ترقی بالخصوص صنعت کاری نے اس توازن سے ایک سنگین مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ بھوپال گیس المیہ، چرنوبل نیوکلیئر حادثہ اور کویت کے کنووں سے نکلنے والی گیس جس کی چادر اب ہمالہ تک پھیل چکی ہے۔ دور حاضر میں ماحولیاتی توازن میں خلل کی بڑی زندہ مثالیں ہیں۔ اوزون پرت (Ozone Layer) میں رفتہ رفتہ ہو رہے سوراخ اور گرین ہاوز اثر Green house effect نے تو مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ صنعتی ممالک میں ہو رہی تیزابی بارش اور بین الاقوامی پیمانے پر موسم میں رونما ہونے والی عجیب و غریب تبدیلی نے پوری سائنسی دنیا میں بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

فضا کے سب سے اوپری حصے پر اوزون (Ozone) گیس کی ایک پرت جو سورج سے نکلنے والی مضر کرنوں کو جذب کر لیتی ہیں، ہماری فصلوں اور جانوروں کو اس کے خطرناک اثرات سے محفوظ رکھتی ہے۔ دور حاضر کی سائنسی ایجادات کے نتیجے میں اوزون پرت Ozone Layer متعدد مقامات پر کافی پتلی ہو گئی ہے۔ اس میں پہلا چھید قطب جنوبی (South Pole) کے علاقے میں دیکھا گیا لیکن تازہ ترین تحقیقات کے مطابق کثیر انسانی آبادی والے علاقے میں بھی اس طرح کے مزید چھید کا امکان ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کینسر، امراض جلد اور دیگر خطرناک امراض کے پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

صنعتی انقلاب اور آٹوموبائل کے بے پناہ اضافے نے فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں حیرت انگیز اضافہ کر دیا ہے۔ یہ گیس آفتاب سے زمین پر آنے والی گرمی کو واپس فضا میں جانے سے روکتی ہے۔ نتیجتاً فضا کا درجۂ حرارت دھیرے

♡ نواب کالونی، مولانا چک، بھاگل پور۔ بہار

[redacted]

دھیرے بڑھنے لگا ہے۔ گزشتہ برس امریکا اور حالیہ دنوں میں انگلینڈ میں سخت گرمی اور اوسط درجہ حرارت میں ہوئے اضافے کا بین ثبوت ہے۔ بہار کا شہر گیا اور یوپی کا دہرہ دون بھی گرین ہاؤس (Green House) کے اثرات سے متاثر نظر آتا ہے۔ تقریباً ۱۰ - ۱۵ سال قبل دہرہ دون میں بجلی کا پنکھا لگانے کی بات لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی لیکن اب شہر دہلی اور لکھنؤ جیسے گرم شہروں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ گرین ہاؤس اثر (Green House Effect) کا سب سے خطرناک پہلو گلیشیر (Glacier) یعنی برف کا پگھلنا ہے سائنس دانوں کے مطابق انٹارکٹکا اور آرکٹک سمندر میں موجود برف کی مقدار میں کمی ہوتی نظر آتی ہے مزید برف کے پگھلنے سے سطح سمندر کے کافی بلند ہونے کا اندیشہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس سے نہ صرف ان سمندری علاقوں میں بسنے والے مالدیپ جیسے چھوٹے ممالک مکمل غرق آب ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہیں بلکہ تحقیقات کے مطابق دنیا کے چند مشہور شہر مثلاً بمبئی، فلوریڈا اور وینس بھی سمندر کی نذر ہو جائیں گے۔ گرین ہاؤس اثر (Green House Effect) کے کئی وجوہات، جیسا کہ میں نے کہا، کاربن ڈائی آکسائڈ، میتھین، نائٹروجن آکسائیڈ، کلورو فلورو کاربن اور اسی اقسام کی چند دوسری گیسیں ہیں۔ ان گیسوں کی زیادتی کے دو خاص وجوہ ہیں

پہلا وسیع پیمانے پر صنعتی ترقی اور

دوسرا جنگلوں کا کٹنا

کہا جا سکتا ہے۔

تیزی سے بڑھتی ہوئی صنعت کی وجہ سے کوئلہ، پٹرولیم وغیرہ کا استعمال کافی بڑھ گیا ہے۔ آج ہم ہر سال تقریباً چار ارب ٹن ایندھن جلاتے ہیں اور اس میں ہر سال چار فیصد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ نتیجتاً فضا میں زہر آلود گیس کی مقدار کافی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دوسری وجہ زمین پر تیزی سے نباتات کا کٹنا ہے۔ تازہ ترین تحقیق کے مطابق ہر سال دنیا میں تقریباً چھ کروڑ ہیکٹر زمین سے جنگلوں کا صفایا کیا جاتا ہے جس میں صرف بھارت کا حصہ ۱۰ لاکھ ہیکٹر ہے۔ کویت کے کنوؤں سے نکلتی ہوئی میتھین گیس بھی ماحولیات پر منفی اثرات ڈال رہی ہے۔ ایسا گمان کیا جاتا ہے کہ جس رفتار سے جنگل کٹ رہے ہیں تو اس صدی کے آخر تک زمین کے صرف ۵ فیصد حصے پر جنگل رہ جائیں گے۔ درخت پودے کاربن ڈائی آکسائیڈ فوٹو سینتھیسس (Photo Synthesis) کے ذریعے جذب کر کے O_2 آکسیجن چھوڑتے ہیں [illegible] کاربن ڈائی آکسائڈ [illegible] آکسیجن کا [illegible] جنگلوں کے کٹنے سے [illegible] بگڑتا نظر آتا ہے [illegible]

علاوہ ازیں ایک اہم مسئلہ تیزابی بارش (Acid Rain) کا ہے۔ [illegible] ترقی یافتہ ممالک تک محدود ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ ترقی پذیر ممالک کے سامنے بھی بھیانک شکل میں آ کھڑا ہو۔ تیزابی بارش جیسے بارش [illegible] کہہ سکتے ہیں یا عام لفظوں میں بارش کے پانی میں تیزاب کی زیادتی کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی ہوا میں موجود آلودگی کے اثرات سے پیدا ہوتا ہے۔ فیکٹریوں، سواریوں سے نکلنے والے کروڑوں ٹن، نائٹروجن آکسائیڈ اور سلفر ڈائی آکسائیڈ بھاپ میں مل کر سلفیورک تیزاب (Sulphuric Acid) اور

نائٹرک تیزاب (Nitric acid) میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو بارش کے ساتھ زمین پر گرتے ہیں اور فصلوں، مچھلیوں اور دوسری چیزوں کو زبردست نقصان پہنچاتے ہیں۔ تاج محل بھی اس کے مضر اثرات سے نہ بچ سکا اور stone cancer کا شکار ہوا۔ کیونکہ پتھر میں موجود چونا اور تیزاب کے reaction سے پتھر کی پائیداری ختم ہو جاتی ہے۔

ان تمام مسائل سے نمٹنے کی کوشش بین الاقوامی پیمانے پر جاری ہے۔ سائنس دانوں نے ایندھن کے استعمال میں کمی کرنے پر خصوصی توجہ دی ہے اور لوگوں کا دھیان مبذول کرایا ہے۔ کوشش اس بات کی کرنی ہے کہ ایندھن کا کوئی متبادل ذریعہ پیدا ہو۔ آفتابی توانائی Solar energy کا استعمال اس سلسلہ کا ایک کامیاب قدم ہے۔ دوسری طرف کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں کمی کے لیے اسے رقیق میں تبدیل کر کے فضا کے بجائے سمندر میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بھی خاطر خواہ کامیابی دکھائی نہیں دیتی جس کی وجہ ہمارا بڑھتا معیار زندگی اور اس مسئلے سے عدم واقفیت ہے۔

ان حالات میں ایک عام شہری ایندھن بالخصوص کوئلہ اور پیٹرول کے کم سے کم استعمال اور بڑے پیمانے پر پودے لگا کر ہی ایکو سسٹم - Eco system میں توازن برقرار رکھنے میں معاون ہو سکتا ہے۔

> "جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تو تکرار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گزر جاتی ہے مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔"
>
> سر سید

ایک فراموش شدہ تحریک ـــــ فرائضی

مختصر تعارف

محمد اسلم صدیقی *

فرائضی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ تھے جو بنگال کے ضلع فریدپور کے پسماندہ گاؤں بندر کھولا کے ایک غریب خاندان میں ۱۷۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں حج کے لیے گئے اور وہاں بیس سال مقیم رہے۔ وہاں قیام کے زمانے میں مکہ معظمہ کے شیخ طاہر السنبل مکی نام کے بزرگ اور عالم دین سے وہ مانوس ہوئے اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ شیخ موصوف شافعی مسلک کے امام تھے۔ حاجی شریعت اللہ نے وہاں علم دین حاصل کیا اور زبان عربی میں بڑی مہارت حاصل کی۔ وہاں وہ امام محمد بن عبدالوہاب کی دینی اور اصلاحی تحریک سے متعارف ہوئے اور اس کا کافی اثر قبول کیا۔ بیس سال بعد ۱۸۰۲ء میں وطن آنے کے بعد انھوں نے اپنے گاؤں اور قرب وجوار میں دینی اور اصلاحی تحریک شروع کی۔ چونکہ وہ بہت سادہ مزاج اور صاف ذہن کے عالم دین تھے اس لیے ان کی سیدھی سادی باتوں اور تبلیغ میں بڑی تاثیر اور جوش تھا۔ اس وجہ سے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی کوششوں اور اصلاحی تحریک سے مسلمانوں کے عام طبقہ میں صحیح دینی شعور اور رجحان پیدا ہوا اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بہت سی بداعتقادیاں اور معاشرہ میں غیر دینی رسوم سے توبہ و بیزاری پیدا ہونے لگی۔ عام مسلمان [illegible] دخیل عقائد اور [illegible] کی رسموں سے متنفر اور [illegible] ہو گئے۔ ان کی یہ تحریک دور دور تک پھیلی [illegible] ڈھاکہ اور اس سے ملحقہ [illegible] اور وہاں کے مسلمانوں میں دینی [illegible] دلچسپی اور [illegible] دینی ترغیب [illegible] تحریک خالص توحید و سنت کے [illegible] پر مشتمل تھی۔ دین کے نام پر جو ملاوٹ اور بدعات مسلمانوں میں رائج تھے، تحریک ان کے خلاف بڑے زور [illegible] چنانچہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے ان کی تعلیمات اور اصلاحات کو دل سے قبول کیا اور وہ خود بھی اس کے داعی اور مبلغ بن گئے۔ بقول ایک انگریز مصنف جیمس ٹیلر:

> "ڈھاکہ شہر کی ایک تہائی مسلم آبادی فرائضی تحریک سے وابستہ ہو گئی تھی۔"

توحید خالص اور دینی شعائر کے ساتھ حاجی شریعت اللہ مساوات، باہمی اتحاد اور بھائی چارہ پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ وہ اپنے متبعین سے مروجہ پیری مریدی کے

---

* غازی پور لاج - سرسید نگر - علی گڑھ

برخلاف برابری اور اخلاص و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ کوئی شخص ان کا مروجہ پیروں کی طرح احترام اور اظہار عقیدت کرے۔ ان کے اس مساویانہ اور مخلصانہ طرز عمل کی وجہ سے ان میں اور ان کے متبعین کے درمیان بہت مضبوط رشتۂ اتحاد قائم ہو گیا تھا۔ وہ لوگوں کے بُرے اعمال سے تائب ہونے کے لیے بھی تو بہ پر زور دیتے تھے۔ مسلم معاشرہ میں نوزائیدہ بچے کی نال، نچلے طبقے کی غیر مسلم عورتوں کے ہاتھ سے کاٹے جانے کا عام رواج تھا۔ حاجی صاحب نے اپنے معتقدین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ یہ کام مسلم خاتون کے ہاتھ سے کرایا جائے اور غیر مسلم عورتوں سے یہ کام ہرگز نہ کرایا جائے۔ چنانچہ ان کی یہ سعی کامیاب ہوئی۔

فرائضی تحریک کا اثر بیشتر مسلمانوں کے غریب اور پسماندہ طبقے میں روز بروز وسیع ہوتا گیا۔ یہ لوگ عموماً کمزور کاشتکار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لارڈ کارنوالس کے جدید نظام کی بدولت ستمری آراضی (۱۷۹۳ء) کے نتیجے میں عموماً مسلمان چھوٹے زمین دار اور بیشتر چھوٹے مسلم کاشتکار بے حد متاثر تھے۔ کیونکہ اس جدید بندوبست کے ذریعہ شرح لگان آراضی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ کر دی گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ دوسری زیادتی یہ کی گئی کہ اس کی وصولیابی میں آفات ارضی و سماوی یا فصل کی کمی یا کوئی بھی معذوری و مجبوری، ناقابل سماعت تھی اور مقررہ لگان کی عدم وصولیابی کی صورت میں فی الفور آراضی نیلام پر چڑھا دی جاتی تھی جس کو غیر مسلم سرمایہ دار بنیے کوڑیوں کے مول خرید لیتے تھے اور اصل مالک آراضی اسی وقت بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ چھوٹے درجے کے مسلم زمین دار اور غریب کاشتکار، ان غیر مسلم زمین داروں کی رعیت بن گئے اور ان کی نت نئے

جبر و زیادتی کے شکار ہونے لگے اور یہی ان انگریز حاکموں کی عام پالیسی بھی کہ مسلمانوں کو جو مسلم دورِ حکومت (سراج الدولہ کی پلاسی میں ۱۷۵۷ء میں شکست سے پہلے) میں بااثر، خوشحال، باوقار اور صاحب حیثیت و جائداد تھے ان کو دھیرے دھیرے بے اثر اور ختم کر کے معاشی طور پر تباہ و برباد کر دیا جائے۔ سراج الدولہ کی شکست کے بعد مسلمانوں کے پاس جو جاگیریں تھیں وہ انگریزوں نے ضبط کر لی تھیں۔ انگریزوں کی مسلم زمین داروں کے خلاف تمام کارروائیوں میں یہ نئے غیر مسلم زمین دار ہر طرح معاون و مددگار تھے۔ اور اس کا پورا صلہ پا رہے تھے۔ غرضیکہ ان عوامل کے نتیجہ میں مسلمانوں کا جو خوشحال اور آسودہ طبقہ تھا وہ بھی خستہ حال ہو گیا اور چھوٹے زمیندار اور غریب کاشتکار تھے وہ اس جدید بندوبست آراضی سے بہت ہی تباہی کا شکار ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمرانوں کے جور و ستم کی المناک داستان تاریخ کا ایک عبرت ناک حصہ ہے۔ ان نئے غیر مسلم زمین داروں کے علاوہ، نیل کی کاشت اور کارخانوں کے انگریز مالکان اور ان کے غیر مسلم گماشتے اور ایجنٹ بھی بڑی حیثیت اثر کے مالک تھے۔ یہ سب کے سب مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اُن کی تباہی کے کوشاں تھے۔ حاجی شریعت اللہ کی تحریک (فرائضی) ان تمام پریشان حال اور پسماندوں کی پناہ گاہ تھی۔ حاجی شریعت اللہ کی مساوات اور بھائی چارے کی تبلیغ و تحریک سے ان پسماندوں کا کسی نہ کسی درجے میں معاشی بوجھ ہلکا ہوتا تھا کیونکہ جو کچھ بھی خوش حال اور آسودہ تھے وہ اُن کی ہر طرح مدد کرتے تھے اور ان کے دکھ درد میں عملی حصہ لیتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ان کی تحریک اور اس کے اثرات و بھائی چارہ کے عمل کو غیر مسلم زمین داروں اور نیل کے انگریز کاشتکاروں اور

مالکوں نے خطرے کی نظر سے دیکھا اور محسوس کرنا شروع کر دیا اور اس تحریک کے فروغ و مقبولیت میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے اور اس کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش اور سازشوں کا جال بچھایا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے جبر و دباؤ اور ناجائز بیگار کی خدمت کے خلاف ان مسلمانوں نے سخت رویہ اختیار کر لیا تھا اور ان کی من مانی حکمرانی کے وہ خلاف ہو گئے تھے کیونکہ وہ اس معاملہ میں اپنے کو برسرِ حق اور اُن کو غلط کار سمجھتے تھے اور یہی بالکل درست اور صحیح بھی تھا کیونکہ وہاں حق و ناحق کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اس لیے ان کوششوں اور خیالات کو مٹانے اور کچلنے کے لیے ان دونوں طبقوں (غیر مسلم زمین داروں اور نیل کے انگریز کاشتکار و مالکان) نے سازش کر کے ایک پلان تیار کیا اور حکومت تو اُن کی ہمنوا اور سرپرست و پشت پناہ تھی اور افسران بھی انگریز ہی تھے ان کے یہاں حاجی شریعت اللہ اور ان کے معتقدین کاشتکاروں اور رعیت کے خلاف شکایات .. بیانی غلط اور ان کے خلاف بے بنیاد اور جھوٹا الزام فساد اور لوٹ مار کا عائد کیا گیا۔ اس الزام کی نہ تو تحقیقات کی گئی اور نہ اس کے خلاف کوئی ثبوت و دلیل شنوائی قبول کی گئی اور بالکل یکطرفہ حاجی شریعت اللہ کے دو ممتاز معتقدین کو دو سال کی قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا دے دی گئی اور کچھ لوگوں کو سو سو روپیہ جرمانہ کی سزا پر چھوڑا گیا۔ حاجی شریعت اللہ صاحب ان دنوں اپنے وطن سے باہر ضلع ڈھاکہ میں مقیم تھے۔ اس کے باوجود وہاں کے انگریز مجسٹریٹ نے ان کو بھی ملزم گردان کر گرفتار کر لیا۔ چونکہ ان کو دوسرے ضلع میں گرفتار کیا گیا اور جو الزام ان پر عائد کیا تھا وہ سراسر بے بنیاد تھا۔ اس لیے وہ جیل سے تو رہا کر دیے گئے اس کے باوجود دو سال پر امن رہنے کی شرط کے ساتھ دو سو روپیے کی ضمانت اور مچلکہ لیا گیا۔ یہ بھی قانون اور انصاف کا ایک عجوبہ تھا کہ جن وجوہ سے جیل سے رہائی ہوئی تھی اس کو ضمانت و مچلکہ کے لیے نظر انداز کر دیا گیا لیکن جور و ستم کا یہ نتیجہ نکلا کہ گرفتاری و رہائی اور ضمانت و مچلکہ کے واقعہ سے ان کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگ جوق در جوق ان کے حلقہ ماثر اور تحریک سے وابستہ ہونے لگے۔

حاجی شریعت اللہ اس بے جا دار و گیر اور جور و ستم کے باوجود اپنے مقررہ طریق کار پر پورے عزم و استقامت کے ساتھ عمل پیرا اور گامزن رہے اور لوگوں کو بھی صبر و تحمل کے ساتھ تمام اعمال پر کاربند ہونے کی برابر پرزور تلقین کرتے رہے۔ ان کی تمام تر کوشش صرف دینی، تبلیغی اور اصلاحی کاموں تک محدود تھی۔ وہ سیاسی کشمکش سے دور رہنا چاہتے تھے اور خوب اچھی طرح یہ جانتے تھے کہ فریق مخالف کا اصلی نشانہ مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور ان کی یہ مخلصانہ تحریک ہے اور وہ اس کے خلاف سازشیں اور رکاوٹیں پیدا کر کے اصل مقصد سے دور کر دینا چاہتے ہیں اور اس کی وجہ سے تحریک اور اس کے مقاصد کو نقصان پہنچے گا اور اس کے بہت خراب نتائج نکلیں گے حاجی شریعت اللہ عام مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی پریشانی اور بربادی اور روز بروز کے جور و تعدی کے واقعات سے بے حد متاثر تھے اور ان لوگوں کی تکلیفوں کو دور کرنے میں ہر قسم کی عملی مدد خود کرتے اور اپنے معتقدین کو بھی اس پر آمادہ کرتے اور عام مسلمانوں کو صبر و تحمل کے ساتھ حوصلہ مند بناتے تھے۔ ان کی اس مخلصانہ کوشش کے برخلاف مخالفوں کی سازش اور کوشش برابر جاری تھی کہ یہ تحریک کسی طرح بڑھنے نہ پائے اور ختم ہو جائے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مغربی

علاقے میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی اور سکھوں سے ان کی محاذ آرائی جاری تھی لیکن عمل و طریق کے لحاظ سے ان دونوں کے میدان کار میں بڑا فاصلہ تھا اور ان دونوں بزرگوں کے طریق کار میں بھی بڑا فرق تھا۔ اس کی واضح وجہ یہ بھی تھی کہ مشرقی بنگال کے مسلمان علم و دین اور اقتصادی لحاظ سے مغربی صوبوں کے مقابلے میں بہت پسماندہ تھے۔ اسی لیے حاجی شریعت اللہ کی تحریک (فرائضی) اصلاحی اور تبلیغی نوعیت کی تھی۔ برخلاف اس کے سید احمد شہید کی تحریک، تبلیغی ہونے کے ساتھ مجاہدانہ زیادہ تھی۔ اس دور کے لٹریچر میں ایسا کوئی سراغ نہیں ملتا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ حاجی شریعت اللہ سید احمد شہید کی تحریک اور کوششوں سے واقف تھے۔ نہیں بلکہ راقم الحروف کی نظر سے ایسا کوئی نوشتہ یا تذکرہ نہیں گزرا ہے۔

حاجی شریعت اللہ کے بعد ان کے لڑکے محسن عرف دودھو میاں سیاسی دماغ اور فکر کے انسان تھے۔ وہ اپنے والد کے برخلاف کسی فاضل شخصیت کے مالک بھی نہ تھے۔ وہ ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنی جوانی کے زمانے میں حج کے لیے گئے اور وہاں سے واپس آنے کے بعد لوگوں کے اصرار اور خواہش پر اپنے مرحوم والد کی تحریک کی باگ ڈور ہاتھ میں لی اور منظم طور پر کام شروع کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے اس تحریک کو بڑی وسعت دی اور پورا مشرقی بنگال ان کے حلقۂ کار میں شامل ہو گیا۔ انھوں نے ہر علاقے میں اپنا نمائندہ یا خلیفہ مقرر کیا تاکہ ہر مقام اور علاقے میں کام میں نظم و یکسانیت رہے اور معقول نگرانی بھی ہو سکے۔ اس طرح تمام متاثرین تحریک معتقدین کو ضابطے کا پابند بنائے رکھنا آسان ہو۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے لوگوں سے عطیات بھی قبول کیے تاکہ جماعتی کاموں اور حاجت مندوں کی ضرورت پوری کی جا سکے۔ ان تمام کاموں کے براہ راست نگران اور سربراہ بذات خود دودھو میاں تھے۔ اس طرح ان کو ایک پیر یا سربراہ جماعت کا مقام حاصل تھا۔ عام طور پر ان کے معتقدین اور تحریک سے متاثر لوگ ان کو "استاد" سے مخاطب کرتے تھے۔ ان کے مقرر کردہ نمائندے یا خلیفہ پورے صوبۂ مشرقی بنگال میں انتہائی وفاداری اور ضبط و نظم سے اس تحریک کو فروغ دینے میں بیش از بیش خدمات انجام دینا باعث سعادت تصور کرتے تھے۔ اس سے تحریک کو بہت فروغ اور استحکام ہوا۔

یہ خلفاء اپنے علاقے کی تمام اہم اور ضروری خبروں اور حالات سے اپنے سربراہ دودھو میاں کو برابر مطلع کرتے تھے اور ان کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان تمام کوششوں اور احتیاطی کاموں پر پوری طرح قابو نہ رکھ سکے اور تشدد اور سختی کے بعض واقعات بھی رونما ہو گئے۔ ایسی ایک صورت یہ پیش آئی کہ جب ایک غیر مسلم زمین دار نے اپنے ناجائز حقوق کو زبردستی اپنی ایک مسلم رعیت سے منوایا اور اس کے ساتھ اس نے سرمایہ فراہم کر کے حکومت کے کارندوں کے ذریعے اس کی ملکیت اور سامان کو تباہ اور برباد کرنے کا منصوبہ بنایا تو تحریک سے متاثر مسلم کاشتکاروں نے اس بے جا مطالبہ اور تشدد کے خلاف لوگوں کو جمع کر کے اس کی مدافعت کی تو اس کے نتیجے میں شدید ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے علاوہ تحریک کے متاثرین اور غیر متاثرین کے درمیان بھی اختلاف رونما ہونے لگے جس سے مقامی غیر مسلم زمین داروں نے فائدہ اٹھایا۔ حاجی شریعت اللہ کے زمانۂ حیات میں ایسے واقعات زیادہ اثر انداز نہ ہونے پاتے تھے کیوں کہ ان کی دینی شخصیت اور کردار ان سب پر حاوی تھا۔ لیکن دودھو میاں نے غیر دانستہ لوگوں کو زبردستی اپنی تحریک میں شامل کرنے پر زیادہ

زور دینے لگے اور جبر و زیادتی تک نوبت پہنچ گئی بلکہ تشدد
کے واقعات بھی ہونے لگے جس کی وجہ سے زمین داروں
اور نیل کے انگریز کاشتکاروں اور مالکوں نے ان
کی پشت پناہی شروع کر دی اور مخالف لوگ ان کے
آلۂ کار بن گئے۔ تحریک سے وابستہ کاشتکار جب زمین داروں
کی حکم عدولی کرتے تو وہ دو ڈاڑھیوں کو پکڑ کر ان کی داڑھی
ایک دوسرے کی داڑھی سے باندھ دیتے اور پسی ہوئی
سرخ مرچ ان کی ناک میں بھر دیتے تھے۔ ان کا یہ ظلم و تشدد
کے باوجود تحریک برابر زور پکڑتی رہی اور نئے نئے لوگ
شامل ہوتا رہا۔ اس تحریک [illegible]
[illegible] زمین [illegible] نیل کے
انگریز کاشتکاروں اور مالکوں کے [illegible] سے
واقعیوں کی [illegible] ہوئی۔ [illegible]
دودھو میاں نے [illegible]
[illegible] آسودہ شخص کی [illegible]
[illegible] بھائیوں کی [illegible]
دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ اس میں کوئی کوتاہی
کریں گے تو سزا کے مستحق ہوں گے۔

ایک مرتبہ ہندو زمین داروں نے درگا پوجا کے
موقع پر درگا دیوی کی عبادت اور آرائش کے لیے اپنی مسلم
رعیت سے بھی روپیہ طلب کیا۔ اس نے مدد بھیجے اس
کاشتکاروں میں سخت ہیجان اور بے چینی پیدا ہوئی اور یہ مطالبہ
مطالبہ انھیں کسی طرح بھی قابل قبول نہ تھا۔ انھوں نے
سختی کے ساتھ اس مطالبے کو پورا کرنے سے انکار کر دیا
کہ اصولاً ایک مسلمان جو خدائے واحد کا پرستار ہوتا ہے
وہ کسی مورتی کے لیے کچھ بھی دینا مذہب کے خلاف سمجھتا
ہے۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ یہ زمین خدا کی ملکیت
ہے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس پر مالکانہ تصرف کا
دعویٰ کرے اور اس قسم کا کوئی ٹیکس طلب کرے

رفتہ رفتہ حالات خراب ہوتے گئے اور محاذ آرائی کی صورت
پیدا ہو گئی [illegible] دودھو میاں کے خلاف [illegible] زمین داروں
اور نیل کے انگریز کاشتکاروں اور مالکوں نے سازش
کر کے جھوٹے اور غلط [illegible] چلوائے جس کے نتیجے میں
فساد پھوٹ پڑا اور جب ایک مسلمان ڈپٹی مجسٹریٹ نے حق و
انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا [illegible] دوسری جگہ تبادلہ
کرا دیا گیا اور [illegible] انگریز مجسٹریٹ مقرر کیا گیا جس کی
سرپرستی میں [illegible] کے ذریعے دودھو
میاں کے خلاف [illegible] کی [illegible] عدالت
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
پولیس [illegible] دودھو میاں کو
[illegible]
اور [illegible]
قانون کا [illegible]
نامنظور ہو گئی لیکن کچھ دنوں بعد پھر دوبارہ ان کو مجسٹریٹ
نے مختلف [illegible] کے تحت گرفتار کر لیا اور
ان پر لوٹ مار اور تشدد کا غلط الزام عاید کیا گیا اور
کافی عرصے تک مقدمے کی کارروائی کے بعد انصاف کی
عدالت نے ان کو مجرم قرار دے کر جیل [illegible]
میں محبوس کر دیا۔ مکان اور تمام ملکیت پہلے ہی ضبط ہو
چکی تھی اور پھر بار بار طویل عرصے تک مقدمہ میں
ماخوذ ہونے اور سزا پانے کے باعث ان کا خاندان
معاشی تنگی و بدحالی کا شکار ہو گیا اور تحریک کو بھی

بوجوہ شدید نقصان پہنچا۔
الغرض حاجی شریعت اللہ اور اُن کے مخلص اور پرجوش حامیوں کی سعی وجہد، جوش وولولہ اور تحریک کے لیے ہر قسم کے ایثار وقربانی کی گراں قدر متاع، ان کے بعد سرسبز وشاداب نہ رہ سکی۔ اگرچہ ان کے لڑکے دودھو میاں کے دور میں تحریک کو کافی فروغ ووسعت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی نئے میدانوں میں ان کی کارگزاری اور کوششوں کا پھیلاؤ ہوا، مگر ان باپ بیٹوں کے علاوہ اس تحریک میں کوئی اور موثر شخصیت ایسی نمایاں نہ تھی جو ان کوششوں کے ثمرات کو آگے بڑھاتی اور اس کو زندہ اور تادیر برقرار رکھتی۔

ہاں یہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک معقول طبقے میں ان کی کوششوں سے دینی شعائر اور سماجی اصلاحات بہت کامیاب رہیں اور اُن کے معتقدین اس پر پوری طرح کاربند رہے اور مدتوں اس کے اثرات اور نقوش معاشرے میں باقی رہے۔
اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہوگا کہ یہ تحریک اور اس کے کارکنان اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

"سب سے بڑا عیب ہم میں
خودغرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب
قومی ذلت اور تباہ ہونے کا ہے
ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے
کہ رفاہِ عام کا جوش دل میں پیدا
کریں اور یقین جانیں کہ خودغرضی سے
تمام قوم کی اور اس کے ساتھ
اپنی بھی بربادی ہوگی۔"

سید احمد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۰ شمارہ ۸ (اگست ۱۹۹۱)

اترپردیش کے بیس اسکولوں میں جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۹۱ء کے نتیجے پر

ایک سو پانچ ہونہار ترین بچوں کو شیروانی انعامات

احمد رشید شیروانی ♡

اترپردیش کے ہم رسے کئی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور ہیڈ مسٹریس صاحبان نے جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۹۱ء کے رزلٹ مسعدی کے ساتھ بھیجے ان میں سے کئی سکولوں کے ہونہار ترین طلباء و طالبات کے لیے الحاج بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیئرمین کورٹ سیوا ٹرسٹ وچیف ایڈمنسٹریٹو سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے دو دو ماہ کے ساتھ انعامات بھیجے گئے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

پیپل جونیئر ہائی اسکول

ضلع غازی آباد ۔ یوپی

۱۔ حامد علی سلمہٗ ۲۔ نوشاد علی سلمہٗ۔ ۳۔ کماری تبسم ناز سلمہا۔ ۴۔ کماری رقیعہ بیگم سلمہا ۵۔ کماری فوزیہ کرمانی سلمہا۔

ایک آنند جونیئر ہائی اسکول لکھنؤ۔

۱۔ کماری زرینہ بانو سلمہا ۲ کماری چندا بے بی سلمہا ۳۔ کماری پیتو رانی سلمہا۔ ۴۔ کماری حفصہ تسلیم سلمہا ۵۔ کماری زینب خان سلمہا

رحمانیہ گرلز جونیئر ہائی اسکول

بدایوں

۱۔ کماری مہ جبیں سلمہا ۲۔ کماری نجمہ بی سلمہا۔ ۳۔ کماری زیبا حسن سلمہا۔ ۴۔ کماری ستارہ خان سلمہا ۵۔ کماری ندیم اختر سلمہا۔

ماڈرن جونیئر ہائی اسکول کیرانہ

۱۔ جاوید علی خاں سلمہٗ ۲۔ احتشام الدین قمر سلمہٗ ۳۔ فراد علی سلمہٗ ۴۔ کفیل احمد خان سلمہٗ ۵۔ شمس الحسن سلمہٗ ۶۔ علی نور سلمہٗ۔

الاصلاح اسلامیہ جونیئر ہائی اسکول کمال پور۔ ضلع بلند شہر۔

۱۔ کماری شمیم خاتون سلمہا ۲۔ کماری شاہ جہاں سلمہا ۳۔ کماری امینہ بیگم سلمہا ۴۔ کمار

♡ کناٹ پلیس، نئی دہلی۔

مصباح الجنت سلمہا۔

امامیہ جونیئر ہائی اسکول۔

رسڑا۔ ضلع بلیا

۱۔ محمد افتخار سلمہٗ ۲۔ شمس الدین جعفری سلمہٗ۔
۳ تسارکانت سنگھ سلمہٗ ۴۔ افروز عالم سلمہٗ
۵ محب اللہ سلمہٗ ۶۔ رمضان علی سلمہٗ ۷۔ سوربھ
کمار گروال سلمہٗ ۸۔ جے پرکاش سنگھ سلمہٗ
۹۔ کماری جیندر بالا سنگھ سلمہا۔

شمسی گرلز جونیئر ہائی اسکول

[illegible]

۔کماری [illegible] سلمہا۔ ۲ کماری [illegible]
سلمہا۔ ۳ کماری [illegible] پروین سلمہا ۴۔کماری
فریدہ یوسف سلمہا۔

انجمن رفاہ عام جونیئر ہائی اسکول

کانپور نگر۔

۱۔ امتیاز احمد سلمہٗ ۲۔ محمد رشید سلمہٗ ۳۔ سرور
علی سلمہٗ۔

اسلامیہ عربیہ جونیئر ہائی اسکول

دھام پور۔ ضلع بجنور

۱۔ محمد سلیم خاں سلمہٗ ۲۔ نعیم احمد سلمہٗ ۳۔ شجاع الحسن
سلمہٗ ۴۔ کماری مجیبہ پروین سلمہا —
۵۔ محمد ناظم سلمہٗ۔

جعفری بیگم میموریل جونیئر ہائی اسکول

سنگرام پور۔ ضلع بدایوں

۱۔ نذر احمد سلمہٗ ۲۔ حبن خاں سلمہٗ ۳۔ محمد
جابر سلمہٗ ۴۔ تنویر احمد سلمہٗ ۵۔ ارشاد
خاں سلمہٗ ۶۔ گھنشیام سنگھ سلمہٗ ۷۔ محمد
عمران خاں سلمہٗ ۸۔ شمیم احمد خاں سلمہٗ
۹۔ عشرت خاں سلمہٗ ۱۰۔ ارشد علی سلمہٗ

۱۱۔ راجیش کمار سلمہٗ۔

علی خان اردو میڈیم جونیئر ہائی اسکول

ہاپوڑ۔ ضلع غازی آباد

۱۔ محمد کوکب عبداللہ سلمہٗ ۲۔ جاوید خالد
سلمہٗ ۳۔ حفیظ الرحمٰن خاں سلمہٗ ۴۔ افضل
شاداب سلمہٗ ۵۔ شبیر محمد سلمہٗ۔

اسلامیہ جونیئر ہائی اسکول

گنگوہ۔ غازی پور

۱۔ کماری شاداب عنبرین سلمہا ۲۔ عبد
انصاری سلمہٗ ۳۔ کماری خورشیدہ خاتون
۴۔ [illegible] سلمہٗ ۵۔ [illegible] محمد سلمہٗ

ظفر میموریل مسلم جونیئر ہائی اسکول

سیتاپور

۱۔ کماری [illegible] سلمہا۔ ۲۔ کماری [illegible]
بانو سلمہا ۳۔ کماری شاہین عرفہ سلمہا ۴۔ کماری
قریش بانو سلمہا ۵۔ کماری نور افشاں سلمہا

مسلم رحمانیہ جونیئر ہائی اسکول

راجہ کا تاج پور۔ ضلع بجنور

۱۔ محمد ذاکر سلمہٗ ۲۔ کماری واجدہ تبسم سلمہا
۳۔ کماری شبانہ خاتون سلمہا ۴۔ کماری مہ
جہاں سلمہا۔ ۵۔ فرقان احمد سلمہٗ۔

نیشنل جونیئر ہائی اسکول

دھیڑو۔ مظفر نگر۔

۱۔ خالد حسن سلمہٗ ۲۔ شبیر حسن سلمہٗ ۳۔ محمد
اکرم سلمہٗ ۴۔ محمد ارشاد سلمہٗ ۵۔ منا خاں
سلمہٗ ۶۔ کماری شاذیہ حسن سلمہا۔

مدرسہ جامعہ عربیہ نور العلوم جونیئر
ہائی اسکول۔ زیدپور۔ ضلع بارہ بنکی

۱۔ عظمت علی سلمہٗ۔ ۲۔ کماری ترنم فاطمہ سلمہا

۳۔ محمد افروز سلمہٗ ۴۔ کماری تبسم زرینہ سلمہا۔
۵۔ عبدالرحمٰن سلمہٗ

مظہر العلوم جونیر ہائی اسکول
اکبر پور۔ ضلع بلند شہر:

۱۔ کماری گل افشاں سلمہا ۲۔ کماری مہ جبیں سلمہا
۳۔ کماری شاذیہ خانم سلمہا۔ ۴۔ کماری [illegible] سلمہا۔

مسلم گرلز جونیر ہائی اسکول
محل پورہ، مرادآباد

۱۔ کماری روبی فراست سلمہا ۲۔ کماری نسیم اختر سلمہا
۳۔ کماری آمنہ خاں سلمہا۔

جواہر لال جونیر ہائی اسکول
اسلام نگر۔ رام پور

۱۔ نصیر احمد سلمہٗ ۲۔ [illegible] سلمہٗ ۳۔ [illegible] سلمہٗ ۴۔ وسیم احمد سلمہٗ ۵ محمد آصف

[illegible]
[illegible] جونیر ہائی اسکول۔
مبارک پور۔ ضلع فیض آباد

کماری درخشاں [illegible] سلمہا
۲ کماری [illegible] خاتون سلمہا
۳۔ کماری [illegible] سلمہا
۴ کماری درخشاں انجم سلمہا۔

ان کے علاوہ قریب بیس اور اسکولوں سے نتائج آگئے ہیں جن کے ہونہاروں کے لیے انعامات روانہ کیے جارہے ہیں۔ اتر پردیش کے ہمارے باقی جونیر ہائی اسکولوں کے ہیڈ صاحبان اور صاحبات بھی اب مزید تاخیر نہ کریں۔ بڑے کرم فور نتیجہ ارسال فرمائیں۔

قومی تہذیب

"اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا و ترقی دینا قومی تہذیب کے لیے ایک بہت بڑا جزو ہے۔"

سر سید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جلد ۱۰، شمارہ ۸، (اگست ۹۱ء)

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے تعلیمی وظیفے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دہلی نے اپنی ٹیلنٹ سرچ اسکیم کے تحت قرض وظیفہ حاصل کرنے کے خواہش مند ایسے افراد سے درخواستیں وصول کرنے کا کام شروع کردیا ہے جو اس سال کم سے کم دسواں درجہ پاس کر چکے ہیں اور تعلیم کا سلسلہ سال ۹۳-۱۹۹۲ [illegible] جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ قرض وظیفہ کے [illegible] مسلم طلبا اور طالبات درخواست [illegible] دسواں درجہ کم سے کم ۸۰ فیصد، بارھواں پاس [illegible] امتحان ۷۵ فیصد [illegible] ۵۰ روپے اور ۵۰۰/ روپے ماہانہ دیا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے وظیفوں کی اسکیم اپنے صدر جناب حکیم عبد الحمید صاحب کے ایما پر ۱۹۸۶ء میں شروع کی تھی اور تب سے اب تک ۱۵۰ مسلم طلبا جن میں لڑکے لڑکیاں دونوں شامل ہیں اس اسکیم سے مستفید ہو چکے ہیں۔ ان ۱۵۰ طلبا میں سے ۵۵ کو امدادی وظیفہ، ۲۸ کو قرض وظیفہ اور ۶۷ کو یکمشت امدادی رقم دی جا چکی ہے۔ یہ طلبا مختلف ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں آسام، اتر پردیش، اڑیسہ، آندھرا پردیش، بہار، پنجاب، تامل ناڈو، جموں و کشمیر، دہلی، راجستھان، کرناٹک، کیرالا، گجرات، گوا، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور ہریانہ شامل ہیں۔

جو مسلم طلبا [illegible] میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ ——— سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، ہمدرد نگر، نئی دہلی ۶۲ ——— [illegible] درخواست فارم اور شرائط کا پرچہ مفت منگا [illegible] ۱۱ [illegible] ان کے بعد ان کی جانچ کی جائے گی اور ان طلبا کو جن کے نمبر اپنی اپنی ریاستوں میں سب سے زیادہ ہوں گے۔ سوسائٹی اپنے خرچ پر نومبر ۱۹۹۱ء میں کسی وقت دہلی بلانے کا اہتمام کرے گی۔ [illegible] دہلی میں قیام کے دوران ان کا انگریزی میں تحریری امتحان، معلومات عامہ (جنرل نالج) کا امتحان اور انٹرویو لیا جائے گا۔ [illegible] کے بعد ہی وظیفوں کا فیصلہ ہوگا۔ جو طلبا اس میں کامیاب ہوں گے، انہیں منظور شدہ رقم کی ترسیل انشاء اللہ جنوری ۹۲ء سے شروع ہو جائے گی۔ جن طلبا کی تعلیمی پیش رفت پہلے سال میں اطمینان بخش ہوگی، ان کے وظیفہ کی میعاد میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ وظیفہ یاب طالب علموں کی کارگزاری کا ہر سال احتساب ہوگا

سکریٹری
ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی
نئی دہلی 62

بانی
سر سید احمد خاں

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۰

شمارہ

ستمبر ۱۹۹۱ء

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

انچارج سرکولیشن
شفیق احمد

تزئین
سرفراز

نائب مدیر

شباب الدین

مقالات وغیرہ بھیجنے کا پتہ
پروفیسر کبیر احمد جائسی
اڈیٹر تہذیب الاخلاق ایڈیٹر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ انڈیا
(202002)

زر سالانہ :	انڈیا	Rs 45.00
	بیرونی ممالک [illegible]	
	[illegible]	

ترسیل زر کا پتہ :
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH

مندرجات

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو۔

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پبلشر: اسرار احمد ۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ ۔ پریس - اے - ایم - یو پریس - علی گڑھ

اداریہ

ماضی قریب کی بات ہے "قوت بازو" کی ترکیب کا اکثر بڑے وثوق سے استعمال ہوتا اور اس بات پر نازاں رہتے کہ انھوں نے اپنی "قوت بازو" سے زندگی کے کئی محاذ سر کرتے ہوئے کیا کیا حاصل کیا۔ ایسے لوگ جب نانا دادا بن جاتے تو اپنے نواسوں، پوتوں اور پوتیوں کو اپنی "قوت بازو" کے قصے سناتے اور یہ بتاتے کہ جب انھوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کے گھر کی مالی حالت کیسی تھی اور کس تنگی ترشی سے ان کے خاندان کی گذر بسر ہوتی تھی لیکن اپنی "قوت بازو" کی بدولت انھوں نے آج وہ کچھ حاصل کر لیا ہے جو دنیا میں اب بھی بہت سے لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ جب "قوت بازو" کی یہ ترکیب اس زمانے میں استعمال کی جاتی تو ان کی محنت مسلسل، جد وجہد، ایمان داری، صداقت اور شرافت پر مبنی زندگی سے عبارت ہوتی تھی ایک واضح تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی تھی اور کمسنوں کے دلوں میں یہ خیال موجزن ہوتا کہ بڑے ہو کر وہ بھی اپنی قوت بازو سے اس دنیا میں بہت کچھ حاصل کر لیں گے۔

وقت اور زمانہ بدل گیا۔ الفاظ کے مفاہیم و معانی کچھ کے کچھ ہو گئے۔ کل تک جو لفظ ترکیب شرف و سعادت کے مترادف سمجھی جاتی تھی آج بے وقعت و ناپسندیدہ بن کر رہ گئی اور اس کی تہہ میں ایسے معانی و مفاہیم بیٹھ گئے جنھوں نے اس لفظ کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ "قوت بازو" کی ترکیب آج بھی استعمال ہوتی ہے مگر Muscles Power کے معنوں میں۔ قدروں کے بدل جانے کی وجہ سے اب نانا، دادا اپنے کمسنوں کے ذہنوں کو اس طرح مسموم کرتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے "قوت بازو" سے ناجائز زمینوں پر قبضہ کیا۔ اپنے حریف کا جینا دوبھر کر دیا۔ کس طرح "قوت بازو" کا مظاہرہ کر کے الکشن کی ہاری بازی جیتی۔ کس طرح سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسی قوت کی بدولت خوب کو ناخوب اور ناخوب کو خوب بنا کے رکھتے اور آج بھی اسی کا درس دے رہے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ہر طبقہ میں "قوت بازو" کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ چاہے

مذہبی معاملات ہوں یا سیاسی معاملات، عدالتوں کا احاطہ ہو یا کارخانوں کا، تعلیم گاہوں کی چہار دیواری ہو یا اسپتالوں کی ہر جگہ "قوت بازو" کے غلبے کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ جس کے پاس موجودہ عہد کی "قوت بازو" ہے وہ زندگی کے ہر میدان میں کامیاب و کامران ہے۔ زمانے کی ساری مسرتیں اس کے قدموں پر نچھاور ہوتی ہیں۔ اس کے دن عید اور راتیں شب برات ہیں۔ وہ جدھر بھی نظر اٹھاتا ہے اس کو سارا معاشرہ اپنا مطیع و دست نگر دکھائی دیتا ہے۔ جو لوگ اس نئی قوت بازو سے محروم ہیں وہ زندگی کے ہر میدان میں پیچھے ہو گئے ہیں۔ بات یہیں تک رہتی تو چنداں قابل افسوس نہ تھی۔ قابل افسوس بات تو یہ ہے کہ اس نئی قوت بازو سے محروم لوگ آج خود اپنی ہی نظروں سے گر گئے ہیں۔

اس نئی قوت بازو کے مظاہرے اب علمی اور ادبی دنیا میں بھی ہونے لگے ہیں۔ آپ کسی بھی سیمینار میں شرکت کریں، ہماری بات کی تصدیق پر آپ مجبور ہو جائیں گے۔ جو چیز سیمینار کہلاتی ہے وہاں کی دنیا میں وہی لوگ کامیاب و کامران کہلاتے ہیں اور انہی لوگوں کا بول بالا ہوتا ہے جو جارحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے ہر مقالہ نگار پر سوالات کی بوچھار کر دیں، اس طرح چیخ چیخ کر بولیں کہ کسی دوسرے کی آواز سنائی نہ دے اور اگر کوئی شخص ان سے زیادہ اونچی آواز میں بولنا شروع کرنا چاہے تو [illegible] دست و گریباں ہو کر اس کی اور اپنی دونوں کی صورتیں بگاڑ لیں۔

تعلیم گاہوں کے الکشن ہوں یا کسی قسم کے اختلافی معاملات پر کوئی جلسہ ہر جگہ اس نئی "قوت بازو" کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے جو کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ مہذب بے تہذیب، عالم جاہل مطلق، شبنم صفت شعلۂ جوالہ، منکسر المزاج نظر آنے والے بد خود غلط بن کر پورے معاشرے میں وہ انتشار پیدا کر دیتے ہیں جس کو ختم کرنے کے لیے ایک لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔

انگریزی میں ایک لفظ NUISANCE VALUE کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں اسی قدر (VALUE) کا بول بالا ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ اس قدر کا حامل ہے اپنے میدان عمل کا اتنا ہی بڑا "علامہ" قرار دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ علم و ادب کیا تعلیم و تعلم کیا زندگی کی دائمی اور معروف قدریں، ہر چیز رو بہ زوال ہے۔ جب ہم کو کچھ کہنے میں ناکامی ہوتی ہے تو ہم قدروں کے زوال کا ماتم کرتے ہیں، اگر مقرر ہیں تو ایک آدھ تقریر جھاڑ دیتے ہیں، مصنف ہیں تو ایک مضمون لکھ دیتے ہیں مگر موقع ملتے ہی ہم بھی نئی "قوت بازو" کے مظاہرے سے چوکتے نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نئی قوت بازو کا مظاہرہ ہم کو کہاں لے جائے گا اور ہم کس "جہنم" کا ایندھن بننے والے ہیں؟

کبیر احمد جائسی

محبت

سر سید احمد خاں

فرض کرو کہ کوئی شخص کسی سے محبت رکھتا ہے۔ ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ

"تم اس سے کیوں محبت رکھتے ہو؟"

وہ اس کا جواب دیتا ہے کہ

"میرا بڑا محسن ہے۔ اس نے بڑے مشکل مشکل وقتوں میں مجھ پر احسان کیے ہیں۔ تنگی کے وقت روپیہ سے مدد کی ہے۔ بیماری کی حالت میں میری تیمار داری کی ہے۔ دوا دارو، علاج معالجہ میں بڑی کوشش کی ہے۔"

یا وہ اس کا یوں جواب دیتا ہے کہ

"ہم اور وہ مدت تک ساتھ رہے ہیں۔ دن رات آپس میں اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ساتھ رہا۔ روز روز کی ملاقات، بات چیت، ہنسی مذاق، دل لگی، مزاج کی باہمی موافقت کے سبب آپس میں دوستی و محبت ہو گئی ہے۔"

یا وہ کہتا ہے کہ

"جس فن کا مجھ کو شوق ہے اس فن کا اس کو بدرجہ غایت کمال ہے۔ اس فن کے کمال کے سبب جس کا مجھ کو شوق ہے اس شخص سے دلی محبت اور جانی دوستی ہو گئی ہے۔"

یا اس کا سبب وہ یہ بتاتا ہے کہ

"وہ شخص نہایت خوب صورت ہے۔ اس کے حسن و جمال نے میرے دل میں اس کی محبت بٹھا دی۔ اس کا عشق پیدا کر دیا ہے۔"

پھر ہم اس سے دوسرا سوال کرتے ہیں اور کسی بزرگ کا بزرگان دین میں سے نام لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ

"تم اس بزرگ سے بھی محبت رکھتے ہو؟"

وہ جواب دیتا ہے کہ

"ہاں کیوں نہیں؟"

تب ہم اس سے کہتے ہیں کہ

"وہ بزرگ تو تمہارے کئی سو برس پہلے گزر گئے ہیں۔ انہوں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کبھی مشکل کے وقت تمہارے کام نہیں آئے۔ کبھی تنگی کے وقت میں تم کو کچھ نہیں دیا۔ کبھی تمہاری تیمار داری نہیں کی۔ کبھی تمہاری دوا دارو اور علاج معالجہ میں کوشش نہیں کی۔ کبھی وہ اور تم ساتھ نہیں رہے۔ نہ کبھی ساتھ اٹھے بیٹھے۔ نہ کبھی

آپس میں ملاقات بات چیت ہوئی، نہ کبھی ہنسی مذاق ہوا، نہ کبھی باہم مزاجی موافقت ہوئی۔ جس فن کا تم کو شوق ہے، وہ اس کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ نہ تم نے ان کو دیکھا کہ اُن کے حسن و جمال سے تم کو فریفتہ کر لیا ہو۔ پھر تم کیوں اس سے محبت رکھتے ہو؟"

اس سوال کا وہ نہایت ناراض ہو کر اور لال منہ کر کے غصہ بھری آواز سے جواب دیتا ہے کہ:

"میاں! وہ بزرگان دین تھے۔ خدا کے ہاں ان کا بڑا درجہ ہے۔ وہ دین داری میں یگانۂ وقت تھے۔ ایمان کامل ان کو نصیب تھا۔ دین میں سب کے سردار تھے۔ ہم اس لیے ان سے [illegible] رکھتے ہیں۔"

اب میں بتاتا ہوں کہ یہی پچھلی محبت "محبت من حیث الدین" ہے جس کو میں حُبِ ایمانی کہتا ہوں اور یہی محبت غیر مذہب سے رکھنی شرعاً ممنوع اور حرام بلکہ کفر ہے اور پہلی محبت جس کو میں حُبِ انسانی کہتا ہوں شرعاً ممنوع نہیں۔ دونوں قسم کی محبت میں بالبداہت تفرقہ و تمیز موجود ہے کہ ایک قسم کی محبت اُن ظاہری اسباب کے باعث تھی جو بمقتضائے فطرت انسانی ایک کو دوسرے کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں اور دوسری قسم کی محبت باوجود معدوم ہونے ان تمام اسباب ظاہری کے من حیث الدین تھی۔ اب کون شخص ہے جو ان دونوں قسم کی محبت میں تمیز نہیں کر سکتا؟

پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے یہ اُن کی غلطی ہے۔ جو چیز کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے وہ برحق اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیے مگر وہ تمام محبت اور دوستی حب انسانی کے درجے میں ہو۔ حب ایمانی کے۔ کیونکہ حب ایمانی بلا اتحاد مذہب، بلکہ بلا اتحاد مذہب ہونی غیر ممکن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہدایت ہم کو ہمارے مذہب اسلام نے کی ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

"تعلیم دراصل کسی سماج کی اس کی بقا کی بوجھی سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں بھی یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی پیدا کر سکیں۔

— ذاکر حسین خاں

فنونِ شریفہ

سید حامد ▽

بعض پیشوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ شریفانہ پیشے ہیں یعنی خدمت اور ایثار پر مبنی ہیں۔ ان کا مقصد بیماروں، مجبوروں، جہالت اور برائیوں کو دور کرنا ہے۔ مثلاً طب سے بیماروں، کمزوروں، مجبوروں کی مدد کی جاتی ہے۔ زندگی، عزت اور کردار کو سدھارنا مقصود رہتا ہے۔ مقدمے کو [illegible] اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے۔ ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دولت سمیٹی جائے [illegible] ہوس و حرص کے اشارے پر چلا جائے۔ شریفانہ پیشوں میں سب سے اہم اور نافع تعلیم اور طب ہیں۔ اس لیے کہ تعلیم انسان کو انسان بناتی ہے اور طب اس کے دکھ درد کو دور کرتی ہے۔

آزادی کے وقت جب ہر قوموں کی ترقی اور خوش حالی کا انحصار صحت اور تعلیم سے ہی ممکن ہے مگر کسی پیشے کو شریفانہ پیشہ نہیں کہہ سکتے کہ شرافت جس کی [illegible] کی نذر ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں کو دیکھیے، ان میں بہت سے انسانوں کی بیماری اور بے بسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مرض کو سنگین بتانے یا [illegible] میں ان میں سے بعض کو تامل نہیں ہوتا۔ چاہے مریض دہشت اور فکر سے ادھ موا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ [illegible] کو سرکاری ملازموں کے ایک بڑے طبقے کی طرح بالائی

آمدنی کی [illegible] بعض [illegible] دو قانون کی خلاف ورزی کرتے [illegible] آمدنی میں [illegible] حیرت [illegible] ڈاکٹر [illegible] زندگی [illegible] ہیں [illegible] مریض کا [illegible] کرتے ہیں [illegible] ہیں [illegible] ہوتا [illegible] ملک [illegible] مریضوں کا [illegible] ہی [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کا [illegible] ہے۔ کوئی ڈاکٹر [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] خدمت [illegible] نہیں [illegible] میرے خدمت [illegible] نہیں [illegible] کی [illegible] دستیاب [illegible] نہیں [illegible]۔

ڈاکٹر کہتے ہیں ہم نے ڈاکٹری کے بہت زر کثیر صرف [illegible] ہمارے بھی بیوی بچے ہیں۔ [illegible] تو [illegible] تک تو [illegible] بات صحیح ہے کہ ڈاکٹر بھی [illegible] ہیں۔ ان کی بھی ضروریات ہیں۔ ڈاکٹری کا پیشہ [illegible] کسب معاش کا ذریعہ ہے لیکن صرف کسب معاش کا نہیں خدمت خلق اور درماں [illegible] کا ذریعہ بھی ہے۔ کسب معاش اور ہوس زر کو دل و دماغ

▽ سابق وائس چانسلر، اے ایم یو، علی گڑھ ——— ہمدرد نگر، نئی دہلی۔

پر اس قدر غالب کیوں کر لیا جائے کہ خدمتِ خلق کے جذبے
کے لیے جگہ تنگ ہو جائے۔ یہاں سوال اضافی اہمیت کا
ہے۔ جہاں تک فرد کا تعلق ہے ان کی تعلیم پر ان سے کہیں
زیادہ خرچ قوم نے کیا ہے۔ اگر یہ پیشہ صرف تجارت ہے
تو پھر اس کی شرافت اور عالی ظرفی اور ایثار پیشگی کے آئے دن
تذکرے کیوں ہوتے ہیں اور بقراط دی سوگند قسم کھانے کی کھوکھلی
رسم ادا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے ورنہ بس اندازہ
ہے بعض پیشہ وروں کے ذریعے یہ تجارت کرنی جا رہی ہے
اس کی قبا پر انسان کے خون کے دھبے بھی نظر آتے ہیں۔
ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جو [illegible] کی بے حسی کا فائدہ
اٹھائے وہ انسانیت کا دعویٰ کس منہ سے کر سکتا ہے

تعلیم کا جو حال ہمارے ملک میں ہے اسے کون
نہیں جانتا۔ طب کی طرح تعلیم نے بھی ہوس کے آگے ہتھیار
ڈال دیے ہیں۔ اس نے بھی بہت سے ناجائز
تجارت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسکولوں میں بہت سے
استاد ایسے ہیں جو اسکول میں بڑی بے دلی سے پڑھاتے
ہیں تاکہ اسکول کے بعد ٹیوشن پر فرمائیں اور ٹیوشن
کی مجموعی آمدنی تنخواہ سے کہیں آگے نکل جائے۔ ایسے ٹیچر
بھی ہیں جو طالب علموں سے تحائف کی فرمائش کرتے ہیں۔
دیہات کے اسکولوں میں ایسے استادوں کی تعداد کم
نہیں ہے جو شہروں میں رہتے ہیں اور اسکولوں میں کبھی
کبھی جھانک آتے ہیں۔ ان کے ساتھ [illegible] استادوں
کو جو امتحانوں میں نقلیں کراتے ہیں، پرچے بتاتے ہیں
یا نمبر بڑھاتے ہیں اور اس کو [illegible] سے روپے
کا روبار کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی حالت اس سے بھی ابتر
ہے۔ وہاں تقلید کو تحقیق کا درجہ مل جاتا ہے۔ [illegible] کے
مقالے خریدے جا سکتے ہیں۔ [illegible] بلکہ ایسے
مقالوں اور ڈگریوں کے بل پر چلتے ہیں جن کی اہمیت و
افادیت گنتی میں اضافہ کی ہوتی ہے۔ یہ مقالے گنے جاتے
ہیں تولے نہیں جاتے۔ گنیے تو زرخیزیِ تحقیق کے شواہد،
تولیے تو پرِ کاہ۔ یہ مقالے بالعموم اہم اور مفید موضوعات
سے کترا کر نکل جاتے ہیں، جانی بوجھی راہوں پر چلتے ہیں۔
ریسرچ اسکالر قدم قدم کی قبا بنتے ہیں تب یہ خود ہو پاتے
ہیں۔ کامیابی کے لیے اچھے صدرِ شعبہ اور نگراں دونوں
کی نگہِ التفات درکار ہوتی ہے۔ اسکالر کی اپنی صلاحیت
جیسی کچھ بھی ہو وہ اکثر [illegible] کی سواری کے آگے جھاڑو کا
کرتی چلتی ہے۔ جہاں تک نظر دوڑائیے داد و ستد کے
سلسلے ہیں۔ دور دور تک کا منظر دکھائی دیتا ہے
جس کے سہرے اساتذہ کا [illegible] بیشتر انتخاب
جانب داریوں اور دوست نوازیوں اور اقربا پروریوں کی
[illegible] کا آئینہ [illegible] کا
[illegible]
[illegible] کی خیرت کو پارہ پارہ
کر دیتے ہیں [illegible]
[illegible] خیرت
[illegible] باقی کیا رہا؟

[illegible] کا دفاع کیوں کر ممکن ہے جو دیکھنے
سوچنے، سمجھنے اور کھوجنے اور گرد و پیش پر گرفت حاصل
کرنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ جو رٹنے اور یاد
کرنے کی عادت ڈال دیتا ہے۔ "آنکھوں کے دریچے بند
کر دو اور حافظے کے دروازے کھول دو۔" [illegible]
عقل کے لیے غارت گر اور شخصیت کے لیے سم قاتل ہے۔
ہماری تعلیم یک طرف اپنے نقص اور دوسری طرف صدقِ
[illegible] سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ یہی وجہ ہے کہ
مفلسی کو کھلی ہوئی بیماری ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں
تک سائنس اور ٹکنالوجی کا تعلق ہے [illegible]
کی افرادی طاقت دنیا بھر میں تیسرے نمبر پر ہے۔ لیکن
تعداد معیار کا نعم البدل نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے

[اس] بات سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان
[نے] بڑے بڑے سائنس داں، ڈاکٹر اور انجینئر پیدا کیے ہیں
[...] کا خاصہ نااہل اور سطحی باب سائنس دانوں اور
[...] کے مقابلے میں کیا ہے۔ اس بات کو بھی دیکھا و
[...] والے مانتے ہیں کہ یہاں ڈاکٹر فریدی جیسے طبیب
[...] رہے ہیں جو مریضوں کی ایک معقول تعداد کو روزانہ
[...] کے دیکھتے تھے؛ لیکن ایسے ڈاکٹر اب مشکل سے
[...] مل پائیں گے۔ کیا حشر ہوگا اس ملک کا جہاں
[...] جب جرأت دیانت کے معیار ہوتے ہیں مگر
[...] گرہ گیر کے اسیر ہو گئے ہوں۔ مطلب یہ ہے

کسی تحریک کی عمومیت یا صداقت زائل نہیں ہوتی۔ سائنس
اور ٹکنالوجی میں ہمارے درخشاں کارنامے اور بہت سے
تابندہ ستارے اور طب میں ہمارے امتیازات
اس بات کی تردید نہیں کرتے کہ فنونِ تعلیم و طبِ جدید
کو بڑی حد تک ہم نے تجارت سے خود ہم اور رفعت سے
معزول کر دیا ہے۔ ان کو ان کی موجودہ حالت میں شریفانہ
پیشے کہنے کے لیے عبارت کو پیشہ متانت اور صداقت سے
منہ موڑنا ہوگا۔ دوسرے معنی ہمارا اکثریت کی طرف ہے
ورنہ دونوں فنون طب اور تعلیم کے ایسے برتنے والے آج
کل بھی موجود ہیں جن پر صحیح شریعت بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

"ہم چاہتے ہیں کہ ایک ایسا مدرسہ قائم کیا
جائے جس سے ہر قسم کے مطالب و مقاصد
پورے ہوں کیوں کہ تمام لوگوں کے مقاصد ایک سے
نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شخص مولوی بننا
چاہتا ہے تو مولوی بننے کا بھی اس میں موقع
موجود ہو۔ اگر کوئی شخص بڑا ریاضی داں بننا چاہے
تو وہ بھی یہ مقصد اس میں حاصل کر سکے۔ اور اگر
کوئی شخص علوم و زبانِ انگریزی میں تحصیل کمال
کرنا چاہے اور عہدہ پانے علمیت و عزت کو
حاصل کرنا چاہے وہ بھی کر سکے۔ جب ایسا مدرسہ
اور سلسلہ قائم ہو جاوے گا تب مسلمانوں کی
تربیت اور دینی و دنیوی ترقی کی توقع ہوتی
ہے۔"

سرسید

سراج الاستخراج ملا فرید ابراہیم شاہجہانی

شبیر احمد خاں غوری ▽

سراج الاستخراج اسلامی علم الہیئت کا پہلا متن متین ہے جو برصغیر میں لکھا گیا اور جو حوادث کے تھپیڑے کھا کر بھی زندہ رہا اور ہم تک پہنچ سکا ہے۔[1]

سراج الاستخراج سے پہلے بھی اس ملک میں علم الہیئت کے موضوع پر متعدد تصانیف وجود میں آئی تھیں مگر وہ نجومی جداول (Astronomical Tables) تھیں جن کا اصطلاحی نام "زیج" ہے جیسے:

"زیج ناصری" جسے محمد بن عمر نے مرتب کر کے بادشاہ التمش کے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کے نام معنون کیا تھا[2] اور اسی وجہ سے اس کے نام پر یہ "زیج ناصری" کہلاتی ہے اور

"زیج جامع محمود شاہی" جسے شہر بیدر (دکن) کے کسی فاضل نے (جس کا نام متن کتاب میں کہیں نہیں ہے) مرتب کر کے مالوہ کے تاجدار محمود شاہ خلجی کے نام معنون کیا تھا اور اسی وجہ سے کاتب نے اس کا نام "زیج جامع محمود شاہی" لکھا ہے۔[3]

یا پھر ہندوستان سے باہر جو علم الہیئت کے متون لکھے گئے تھے، ان کی شروح و حواشی تھیں جیسے علامہ ابوالحسن علی قوشجی نے روم (ترکیا) میں علم الہیئت پر رسالہ لکھ کر سلطان محمد فاتح کو اس موقع پر پیش کیا جب سلطان نے لشکر ترکمان (حسن ازون حسن) پر فتح پائی تھی اور اسی لئے علامہ قوشجی نے اس کا نام "رسالہ فتحیہ" رکھا تھا۔ ہمارے ملک میں

سب سے پہلے مولانا مصلح الدین لاری نے اس رسالہ کی شرح لکھ کر بادشاہ ہمایوں کے نام معنون کی تھی اور اسی وجہ سے یہ "ہمایوں نامہ" کہلاتی ہے۔ اس رسالہ کی دوسری شرح مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی نے لکھی تھی۔[4]

اسی طرح قاضی زادہ رومی نے سمرقند میں محمود الجغمینی کے "الملخص فی الہیئۃ" کی ۸۱۶ھ میں شرح لکھ کر بادشاہ سمرقند الغ بیگ کے نام معنون کی تھی۔ یہاں مولانا وجیہ الدین گجراتی نے اس پر حاشیہ لکھا۔

اسی طرح علامہ قطب الدین شیرازی نے "التحفۃ الشاہیہ" کے نام سے جو ہیئت کی کتاب لکھی تھی، مولانا وجیہ الدین نے اس کی بھی شرح لکھی تھی۔[5]

غرض "سراج الاستخراج" برصغیر میں علم الہیئت کا پہلا متن متین ہے جس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے

▽ سابق رجسٹرار یوپی عربی و فارسی بورڈ امتحانات، الہ آباد۔ سر سید نگر علی گڑھ۔

مصنف

"سراج الاستوزان" کے مصنف ملا فرید منجم شاہجہانی تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا نام ملا ابراہیم تھا۔ ان کا تعلق علما کے ایک ایسے طبقے سے تھا جس کے افراد اپنے اپنے وقت کے صاحبان فضل وکمال میں محسوب ہوتے تھے مگر ملا فرید علم و فضل کے میدان میں اپنے آبائے کرام سے بھی آگے بڑھ گئے[۸] انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی جو [illegible] تک ان سے [illegible] آخر میں ابو الفتح اللہ شیرازی کی خدمت [illegible] ان کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے[۹]

[illegible] انھوں نے خواجہ جمال الدین [illegible] [illegible] جلال الدین [illegible] تھے۔ پھر مولانا جمال الدین شیروانی مولانا [illegible] کی [illegible] ان سے [illegible] اور پھر [illegible] میں ہندوستان میں تشریف [illegible] گئے [illegible] وقت ان کے شیخ [illegible] انھوں نے [illegible] ولایت کی [illegible] معقولات [illegible] کے درس میں داخل [illegible][۱۵] [illegible] معقولات [illegible] علوم حکمیہ [illegible] کے بارے میں ابو الفضل نے لکھا ہے [illegible] کی کتابیں بغرض نقال دنیا سے نابود ہو جاتیں [illegible] فتح اللہ ان علوم کی کتابوں کی [illegible] ان علوم کو دوبارہ زندہ کر سکے ہیں[۱۶] [illegible] ہمراہ سفر کشمیر پر گئے تھے۔ وہیں وفات پائی [illegible] کو نے انتہائی صدمہ ہوا[۱۷] فیضی نے ان کی وفات پر [illegible]

تھا۔ شاہ [illegible] کی بالغ نظری کے باوجود سب کچھ حقیقت [illegible] ہے۔

فلسفہ و حکمت کے ساتھ ساتھ انھیں ریاضی و ہیئت میں بھی [illegible] حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے [illegible] Calendar [illegible] مذہب "دین [illegible] [illegible] ان کی [illegible] [illegible] شیخ اللہ [illegible][۱۸] [illegible]

[illegible] شیخ اللہ [illegible] میں رد [illegible] کار شاہ [illegible] زمانے سے [illegible] [illegible] ان علوم حکمیہ [illegible] علوم کی [illegible] شیخ [illegible] جیسا کہ [illegible] ریاضی [illegible] علوم کے اسرار و رموز [illegible] گئے اور ان سے استفادہ [illegible] کے [illegible] حسابات کرنے لگے[۱۳]

یہ گیارہویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں کی بات ہے۔ اس وقت صاحبان علم و ہنر کی تربیت و سرپرستی میں والی گجرات عبدالرحیم خان خاناں امرائے وقت سے گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اُس نے بھی اس نابغۂ روزگار کی قدر شناسی میں کسی اہمال سے کام نہیں لیا اور اپنے صوبے کے منصب صدارت پر ان کا تقرر فرمایا[۲۴] ملا فرید نے اپنے غیر معمولی فضل و کمال کے استقرار کے لیے علم ہیئت میں ایک متن متین مرتب کیا جو یہی پیش نظر رسالہ سراج الاستخراج ہے جس کا سن تصنیف سنہ ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء ہے۔[۲۵]

اس کے بعد وہ شاہ جہاں کی تخت نشینی ۱۰۳۷ھ تک خان خاناں ہی کی سرکار سے وابستہ رہے مگر جب شاہ جہاں تخت نشین ہوا اور اس کی تربیت فرمانہ سے علم و فضل کی از سر نو گرم بازاری ہوئی[۲۶] تو وزیر آصف خان نے بادشاہ کے تخلید مآثر کے لیے ایک زیچ مرتب کرانے کا ارادہ کیا اور اس کڑی کمان کو زہ کرنے کے لیے اس کی جوہر شناس نگاہ نے ہمارے رئیس التذکرہ ملا فرید ہی کا انتخاب کیا اور پھر اُنھوں نے وزیر آصف خان کی سرپرستی میں اپنے بھائی ملا طیب اور دوسرے ہندو مسلمان ہیئت دانوں کی مدد سے "کارنامہ صاحبقرانی زیچ شاہجہانی" کے نام سے ۱۰۳۸ھ میں یہ زیچ مرتب کرکے بادشاہ کے حضور میں پیش کی[۲۷] پھر بادشاہ نے مصنف کی مزید عزت افزائی اس طرح کی کہ یہ رسالہ خواص و عوام کے لیے اسے فارسی سے سنسکرت میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا[۲۸]

مصنف [illegible] اس کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہ رہے۔ تصانیف میں سراج الاستخراج اور زیچ شاہجہانی کے علاوہ ہیئت سے اور رسائل ہیں۔ نجوم و ہیئت کے علاوہ انھیں علم جفر، علم الاعداد، نیرنجات و طلسمات وغیرہ میں بھی دستگاہ حاصل تھی[۲۹]

وجہ تصنیف

مصنف نے تقویم کے استخراج کی اہمیت کے بعد اس کی تیاری کی مشکلات کا بیان کیا ہے[۳۰] جن میں بنیادی وجہ یہ ہے کہ "زیچ جدید" (زیچ الغ بیگ) جس سے تقویمیں مستخرج کی جاتی تھیں بغایت مختصر تھی۔ مرتبین زیچ (الغ بیگ اور اس کے معاون علامہ قوشجی) نے ہر بات کا قاعدہ صرف اشارتاً لکھا تھا جبکہ متعلقہ [illegible] کی وضاحت کے لیے ضروری تھا اور ان مختلف قواعد کو ایک جگہ جمع کرنا کہ تقویم ساز کے لیے ایک مکمل ہدایت نامے کا کام دے سکیں مبتدی کے لیے انتہائی مشکل تھا[۳۱]۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مرتبین زیچ نے بہت سے قواعد کی کماحقہ وضاحت نہیں کی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ اتنے واضح اور مشہور تھے کہ ان کی توضیح غیر ضروری تھی[۳۲] اور مصنف سراج الاستخراج ملا فرید کے زمانے میں علمی معیار اتنا بلند نہیں رہا تھا اور یہ معلوم و مشہور مباحث بھی محتاج توضیح ہو گئے تھے۔

ان امور کے پیش نظر مصنف کتاب ملا فرید کو یہ خواہش دامن گیر ہوئی کہ انتہائی واضح اور مفصل عبارت میں ایک ایسی کتاب تصنیف کریں جو تقویم کے [illegible] وغیرہ کے استخراج میں کام آ سکے۔ اس کے ساتھ تقویم ساز کو اعمال تقویم سازی میں جس وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے اُس کے لیے مثالیں بھی دی جائیں، نیز تاریخ کی غلطی اور نقص کی جانچ کے لیے جس چیز کی ضرورت ہوتی اور جس کے بغیر غلطی کا احتمال رہتا ہے اس کی بھی تفصیل ہو[۳۳]

[illegible] اس اہم امر کی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ ناکام

ملہم غیب نے اس بندہ (ملا فرید) کے دل میں القا کیا کہ یہ زیج
کتاب کو عظیم المرتبت ممدوح شاہ جہاں بادشاہ کے
نام نامی کے ساتھ وابستہ کرے تا کہ اس کے یمن و برکت
کے طفیل میں توفیق غیبی بھی ممد و معاون ہو جائے اور
گوہر مقصود ہاتھ لگ جائے۔ لہذا جوں ہی ممدوح کے
عظیم الشان نام کا خیال ہوا ویسے ہی عجیب و غریب علمی و
فنی نکات کا انکشاف ہونے لگا جو اس کتاب میں
اپنے اپنے مقام پر بیان ہوں گے

آخر میں وہ دانشمند نکتہ سنج سے درخواست کرتے
ہیں کہ ان کی اس تصنیف کے اندر جو اغلاط و تسامحات
ہوئے ہوں، اگر قابل اصلاح ہوں تو ان کی اصلاح
فرمائیں اور جو اس قابل نہ ہوں ان سے اغماض و چشم پوشی
فرمائیں گے

محتویات کتاب کا تجزیہ

کتاب میں ایک مقدمہ، نو باب اور ایک خاتمہ
ہے۔

مقدمہ میں ان امور کا بیان ہے جن سے واقفیت
اس علم (ہیئت یا تقویم سازی) کے شروع کرنے سے
پہلے ضروری ہے۔ یہ مقدمہ چار قسموں پر مشتمل ہے۔

قسم اول: زیج رصد تقویم کی تعریف نیز یہ بات
کہ راصد کسے کہتے ہیں۔

قسم دوم: منجموں کی مصطلحات کی تعریف و توضیح

قسم سوم: تعدیل ما بین السطرین

قسم چہارم: زمانے کے اجزاء یعنی سال، مہینہ، روز،
ساعت (گھڑی) اور ان کے اجزاء مختلف اقوام
کے نزدیک ان کی ابتدا اور انتہاء سال اور مہینے
کے پہلے دن کی دریافت اور مشہور اور متداول
تواریخ۔

باب اول: اوساط کواکب (مختلف اجرام فلکی کی
وسطی حرکات) اور ان کا بیان (یعنی ان کی دریافت
کے بعد اُن کے صحیح یا غلط ہونے کی جانچ)

باب دوم: مختلف سیاروں کی تقویم کا استخراج۔
اس باب میں تین فصلیں ہیں۔

فصل اول: آفتاب کی تقویم کا استخراج اور
متعلقہ امور

فصل دوم: ماہتاب کی تقویم اور اس کے حرکت
کی دریافت

فصل سوم: باقی پانچ سیاروں کی تقویموں کا
استخراج اور جو امور ان سے متعلق ہوں۔

باب سوم: نصف النہار، قوس، نہار وغیرہ کے
استخراج کا بیان۔

باب چہارم: رویت ہلال کے استخراج کا بیان نیز
دوسرے ستاروں [illegible] کا
بیان۔

باب پنجم: تقویم اصلی کا بیان جس پر منازل کی
عمل کرنا ضروری سمجھا ہے نیز دیگر متعلقہ امور

باب ششم: اتصالات کلی اور ان کے مزاجات کے
استخراج نیز متعلقہ امور کا بیان۔

باب ہفتم: آفتاب کے میل، غایت ارتفاع اور
فئ الزوال (سایۂ اصلی) کے استخراج کا بیان

باب ہشتم: تاریخ سال وغیرہ کے استخراج کا بیان۔

باب نہم: خسوف (چاند گرہن) اور کسوف (سورج
گرہن) کے استخراج کا بیان۔ یہ باب دو فصلوں
پر مشتمل ہے:

فصل اول: خسوف
کا بیان۔

فصل دوم: کسوف
کا بیان۔

خاتمہ میں اُن زاید امور کا بیان ہے جو تقویم (جنتری) میں بیان ہوتے ہیں۔

حرفِ آخر

پوری کتاب کے اندر بیان شدہ مباحث کا خلاصہ عہدِ اکبری میں علم الھیئت کی تعلیم و تعلم کا معیار سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے مگر صفحات کاغذ کی تنگ دامانی اہم المباحث مباحث کے ایاد و توضیح تک سے مانع ہوا کرتی ہے۔ اس فن اور اس کے شاہ کاروں کے تعارف کا تو کیا ذکر۔ ہاں بحیثیت مجموعی کتاب کسی دیدہ ور محقق کی یلغار تحقیق کی منتظر ہے۔

لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا

تعلیقات و مراجع

١ اس رسالہ کا ایک نسخہ سینٹرل اسٹیٹ لائبریری (سابق کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد میں ہے نمبر ا فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد جلد اول صفحہ ٨١٦، دوسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری کے ایک مجموعۂ مخطوطات میں ہے نمبر 2227/7 ملاحظہ ہو

Catalogue of Persian Manuscripts in India Office Library, vol. II, 1180

موخر الذکر کی ایک زیروکس کاپی مولانا آزاد لائبریری میں ہے (شعبۂ مخطوطات۔ یونیورسٹی علوم فارسی نمبر ٨٠) اس مقالہ کی ترتیب میں اسی زیروکس کاپی سے مدد لی گئی ہے۔

2. Storey Persian Literature vol. II, Part I p. 52

٣ "زیج جامع محمود شاہی کا غالبا واحد نسخہ بوڈلیان لائبریری آکسفورڈ میں ہے مگر یقینا ناقص الاول ہے اور غالبا ناقص الآخر بھی۔ جلد بندی انتہائی غیر ذمہ داری سے ہوئی ہے یا کاتب نے کتابت میں سیدھے اور الٹے کی احتیاط نہیں برتی۔ زیروکس کاپی میں کتاب کے نام پر سیاہی کا دبیز داغ ہے جس کی وجہ سے عسیر القراءۃ ہی نہیں مستحیل القراءۃ بن گیا ہے۔ میرے داماد محمد خالق قریشی بوڈلیان لائبریری کے لائبریرین سے ملے اور موخر الذکر نے اپنے اسٹاف کی مدد سے اس دھبے کے نیچے کی عبارت پڑھنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ کتاب کا نام ترقیمہ میں "زیج جامع محمود شاہی" لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

1, Catalogue Of Persian Manuscripts Bodleian Library ...

2, History of Indian Astronomy (Indian National Science Academy N.D. pp 31-33 " Literature in India by S.A.K. Ghori

٤ طاشکبری زادہ: الشقایق النعمانیہ (بر حاشیہ تاریخ ابن خلکان 'وفیات الاعیان' الجزء الاول صفحہ ١٤٩،

٥ مولانا آزاد لائبریری میں اس شرح کے دو نسخے ہیں۔ ایک فرنگی محل کلیکشن میں نمبر علوم فارسیہ ۱۱/۳ اور دوسرا سبحان اللہ کلیکشن میں ٥٢٠/١٩ فلکیات فارسی یہ "ہمایوں نامہ گلبدن بیگم" سے قطعا جدا گانہ چیز ہے۔ ثانی الذکر ہمایوں کی سوانح حیات ہے جسے اکبر کے ایما سے اس کی پھوپھی گلبدن بیگم نے تصنیف کیا تھا جب کہ مصلح الدین لاری کا ہمایوں نامہ علامہ ابو الحسن علی قوشجی کے رسالہ فتحیہ" در رسالہ در ہیئت فارسی یا رسالہ قوشجیہ" کی شرح ہے۔

۶ غلام علی آزاد بلگرامی: مآثر الکرام (مفید عام پریس آگرہ ۱۹۱۰ء، ۱۳۲۸ھ) صفحہ ۱۹۶-۱۹۰

۷ ایضاً

۸ ایضاً

۹ نہاوندی، عبدالباقی: مآثر رحیمی (کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۱ء) جلد سوم صفحہ ۹

۱۰ ایضاً

۱۱ ایضاً "آخرالامر از جملہ تلامذہ علامہ زمان، وحید دوران، ارسطوے ثانی و افلاطون یونانی شاہ فتح اللہ شیرازی گشت۔"

۱۲ آزاد بلگرامی: مآثر الکرام ۲۳۶

۱۳ ابوالفضل: اکبر نامہ جلد سوم حصہ اول صفحہ ۲۹۱

۱۴ مکران کا سلسلۂ تلمذ ملا عبدالسلام لاہوری کے ذریعے چلا۔ ملاحظہ ہو مآثر الکرام صفحہ ۲۳۶ "ملا عبدالسلام لاہوری۔۔۔۔ علم از میر فتح اللہ شیرازی فراگرفت"

۱۵ آزاد بلگرامی، مآثر الکرام صفحہ ۲۳۶ "تصانیف علماے متأخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان۔ میر ۔ در حلقہ درس انداخت"

۱۶ ابوالفضل۔ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۲۰۳ "آں بادشاہ معانی دار دکہ گوہر تا ساے دانش بر بیں سر در شوید اساس نورنہ بود بدان رفت [illegible]"

۱۷ ایضاً صفحہ ۵۵۰ "پادشاہ پاس شناس از گزشتن آن یادگار علما بسی اندوہ درگرفت و بار بار بر قدی زبان رفت۔۔۔ اندازہ سوگواری ما نہ نوا شناخت"

۱۸ ایضاً

اول امام دین عضد الدولہ که بود — از تحقیق و علامۂ زمان
حکمت ملی و عقل مستقیم — در قبہ باہم دفنست نہاں
در صحبت معانی اشیا کہ بیک آن — میرد وجود و توفیق گردن بران

۱۹ ابوالفضل: آئین اکبری (دہلی اسماعیلی ۱۲۷۲ھ) جلد دوم صفحہ ۲۲۱

۲۰ ایضاً جلد اول صفحہ ۳۰۔ "نسخۂ زیج جدید مرزائی بہ دیدہ وری میر فتح اللہ شیرازی راقم اقبالنامہ۔۔۔ از فارسی بہندی آوردند"

۲۱ بدایونی، عبدالقادر: منتخب التواریخ (کلکتہ ۱۸۶۹ء) جلد سوم صفحہ ۱۵۵
"میر فتح اللہ شیرازی۔۔۔ جمیع علوم عقلی از حکمت و ہیئت و ہندسہ و نجوم۔۔ نیکومی دانست و در ین فن آن قدر حالت داشت کہ اگر بادشاہ متوجہ می شد، رصد می توانست بست"

۲۲ نہاوندی، عبدالباقی: مآثر رحیمی۔ جلد سوم صفحہ ۹
"و آخرالامر از جملہ تلامذۂ علامہ زماں و وحید دوراں ارسطوے ثانی و افلاطون یونانی شاہ فتح اللہ شیرازی گشت و ترقی تمام درخدمت ایشاں او را دست داد و در اندک زمانے از دانشمندان متبحر این فنون گردید۔"

اہل ہندوستان بدانش وفضیلت او معترف گشتند"۔

۲۳ الیضاً۔ وکارش بجاے رسید کہ اکثر علماے متقدمین ریاضی و دانایان پیشین وجودش را درمی یافتند، بوجود او مفتخر گشتہ مباہات نمودند۔ ومتاخرین را خود درفضل ودانش او سخنے نیست "

۲۴ الیضاً " وعلی ای حال بتاریخ ہزار او وشش ہجری بلازمت این قدر دان دانش وران رسیدہ درسلک ملازمان در آمدہ۔ منصب ارجمند صدارت عالی الیشان کہ از اہتمام مہام کارخانہ سلطنت واعاظم عظائم کارگاہ خلافت است، بالیشان مرجوع است "

۲۵ ملا فرید منجم دہلوی۔ سراج الاستخراج (ریڈکس کاپی مخطوط انڈیا آفس لائبریری موجودہ شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری۔ یونیورسٹی کلیکشن فارسیہ علوم نمبر ۰۸)

"این رسالہ را سراج الاستخراج نام نہادم کہ از حروف منقوطش سال تاریخ ابتدا، آن تحصیل شد۔

ج + ب + خ + ج = ۱۰۰۶

۲۶ آزاد بلگرامی: مآثر الکرام صفحہ ۳۰۳ - ۳۰۵ "چون نوبت دارائی ہندوستان بہ صاحبقران شاہجہان انار اللہ برہانہ رسید۔ طائفہ علماء وشعراء را رواجے دیگر بدید آمد"

۲۷ محمد صالح کنبو: عمل صالح (مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء جلد اول صفحہ ۲۰۵

۲۸ الیضاً

۲۹ نہاوندی، عبدالباقی: ماثر رحیمی۔ جلد سوم صفحہ ۹

۳۰ ملا فرید منجم دہلوی: سراج الاستخراج، ورق ۱۔ ب "استخراج تقویم امر است مشکل واکثر فضلا را رغبتے است بآن"

۳۱ الیضاً " عبارت زیج جدید محمول زمان در رعایت اختصار وقاعدہ ہر یک در محلے کہ تقریب افتادہ، کرد مصنف بیان نفرمودہ مبتدی راجمع کردن آن خالی از اشکال نہ"

۳۲ الیضاً " ونیز بعضے قواعد از غایت شہرت بیان نفرمودہ"

۳۳ الیضاً۔ ورق ۱۔ ب "تا متشاعف براں محرر این اوراق ... فرید منجمی ... می خواست کہ آن قدر کہ برائے استخراج تقاویم ... بکار آید از مواہرہ زیج آوردہ بعبارتے مفصل .... وبرائے ہر عمل مثالے ومیزانے ... در حیز قلم آورد"

۳۴ الیضاً ورق ۲۔ الف۔ " توفیق رفیق نمی یافت ناگاہ ملہم غیبی .... بگوش ہوش این بندہ ندا داد کہ بنام نامی واسم سامی نتیجہ امراے عظام و وزراے کرام مہر سپہر بخت وبختیاری، ماہ آسمان عظمت وکامگاری .... التجا باید آورد تا توفیق موافقت نماید وعروس مقصود بوجہ احسن وبہبود چہرہ کشاید"

۳۵ الیضاً: ہرگاہ بآن اسم عظیم الشان توجہ آوردیم، قواعد عجیبہ وفوائد غریب بانواع حصول پیوست کہ ہر یک دل خود شگفتہ آید انشاء اللہ العزیز۔

۳۶ الیضاً

کینسر

محمد مسلم پرویز ▽

کینسر ہونے کی مکمل وجوہات سے ہم ابھی ناواقف ہیں۔ جب کہ کچھ وجوہات یقیناً ایسی ہیں کہ جو کینسر پیدا کرتی ہیں۔ تازہ ترین تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ کینسر سے متاثر ہونے یا نہ ہونے کی صلاحیت انسان میں پیدائشی ہوتی ہے جو لوگ کینسر سے متاثر ہونے کی صلاحیت اپنے جسم میں رکھتے ہیں وہ کسی بھی وجہ سے کینسر کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس دریافت نے کینسر کی تحقیقات کو جینی تکنیک کے ماہرین کے پاس پہنچا دیا ہے جو کوشش میں ہیں کہ اس خطرناک بیماری کا علاج جین کی سطح پر کیا جا سکے۔

کینسر اس دور کی مہلک ترین بیماریوں میں سے ایک ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر سال ۵ لاکھ افراد اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں متعدی [illegible] اور بیماریوں کی وجہ سے لوگ [illegible] ان مہلک وجوہات کی فہرست میں کینسر کا [illegible] صرف دہلی میں ہی ہر ماہ [illegible] کینسر [illegible] ہوتے ہیں۔ دیگر ترقی پذیر ممالک میں بھی [illegible] ہے جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں کینسر کا زور اس سے بھی زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں مہلک بیماریوں کی فہرست میں کینسر کا نمبر دوسرا ہے اور وہاں ہر [illegible] ہونے والی ہر چار اموات میں سے ایک کینسر سے ہوتی ہے۔

خلیہ ہر جاندار چیز کی بنیاد ہوتی ہے۔ چاہے وہ ایک چھوٹا سا پودا ہو یا [illegible] کہ دونوں ہی ہماری نظروں کے سامنے دیکھنے میں بڑے ہوتے ہیں۔ یہ پودا اور جاندار [illegible] سے بنے ہوتے ہیں جسے [illegible] کو [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] کا نام [illegible] کافی بڑے ہوتا [illegible] ان کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو [illegible] اینٹ کی ہوتی ہے۔ ہر جاندار کی زندگی ایک [illegible] سے شروع ہوتی ہے یہ ایک [illegible] زندگی کی بنیاد ہوتا ہے جسامت کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی جسامت کا

▽ ریڈر ذاکر حسین کالج، نئی دہلی۔

اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ سوئی کی نوک پر ۴۰ ہزار سیل نہایت آرام سے رکھے جا سکتے ہیں۔ جب نئی زندگی کی شروعات ہوتی ہے تو یہ ایک سیل تقسیم ہو کر دو، دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ سیل بنتا ہے۔ یہ تقسیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے چاہے یہ ماں کے پیٹ کے اندر ہو، انڈے میں ہو یا کسی پودے کے بیج میں۔ جب تقسیم ہو ہو کر سیلوں کے اس مجموعے کی جسامت بڑی ہو جاتی ہے تو یہ آنکھ سے نظر آنے لگتا ہے۔ تقسیم کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک خاص مرحلے پر یہ نیا جاندار دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے یعنی اس کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ پیدائش کے بعد بھی مختلف قسم کے سیلوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اسی وجہ سے جسم میں نشوونما ہوتی ہے۔ سیلوں کی تقسیم کا سلسلہ اس وقت تک شدومد سے جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ جاندار بلوغت کو نہیں پہنچتا۔ اس کے بعد اس کی جسمانی ساخت کو قرار آ جاتا ہے۔ ظاہری بڑھوتری رک جاتی ہے لیکن اس کے جسم کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کے لیے سیل تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ جو سیل ختم ہو جاتے ہیں ان کی جگہ نئے سیل لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سمجھ سکتے ہیں سیلوں کی تقسیم کا یہ سلسلہ نہایت منظم طریقے سے ہوتا ہے۔ جسم کے ہر حصے میں سیلوں کی تقسیم اور اس حصے کی نشوونما ایک خاص وقت پر رک جاتی ہے۔ لیکن کسی وجہ سے تقسیم کا یہ سلسلہ بے قابو ہو جاتا ہے اور اسی [illegible] جسم کے پاس [illegible] ہو تو اس حالت کو ہم کینسر کہیں گے۔ یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی جاندار کے جسم میں بے قابو اور غیر منظم قسم کی تقسیم ہونے لگے تو اسے کینسر کہتے ہیں اس کے نتیجے میں کسی بھی حصے کا حجم یا جسامت ایک دم بڑھنے لگتی ہے۔ تاہم کچھ کینسر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی بے ترتیب بڑھوار بظاہر نظر نہیں آتی۔

اگرچہ عام طور سے لفظ کینسر کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ جیسے یہ کسی ایک بیماری کا نام ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ کینسر بہت ساری بیماریوں کے ایک گروپ کا نام ہے۔ یعنی کینسر بہت سے اقسام کے ہو سکتے ہیں جن کی ظاہری علامات اور وجوہات الگ الگ ہوتی ہیں۔ اگرچہ طبی ماہرین کی نظر کینسر پر کافی عرصے سے تھی لیکن اس پر تحقیقات کی ابتدا ۱۹۱۱ء سے ہوئی۔ ایک امریکی ڈاکٹر جس کا نام راؤس تھا اس نتیجے پر پہنچا کہ کینسر ایک جاندار کے جسم سے دوسرے جاندار کے جسم میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے تجربات چوزوں پر کیے اور یہ ثابت کر دیا کہ اگر ایک چوزے کو جس کو ایک قسم کا کینسر ہو تو اس کو دوسرے چوزے میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کینسر والے حصے کو الگ کر کے اس کو پیس کر عرق حاصل کر لیا جائے اور اس عرق کو انجکشن کی مدد سے دوسرے صحت مند چوزے میں داخل کر دیا جائے تو وہ بھی کینسر کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس تجربے کی بنیاد پر سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے کہ کینسر کسی جاندار سیل کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی وجہ کوئی ایسا ایجنٹ ہے جو جاندار نہیں ہے اور بے حد چھوٹا ہے۔ اسی قسم کے تجربات دیگر تجربہ گاہوں میں بھی کیے گئے۔ ۱۹۶۶ء میں راؤس کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۸۶ سال تھی اور وہ ابھی تحقیقات میں مشغول تھے۔ [illegible] یہ بات ثابت ہو گئی کہ تمام کینسر وائرس [illegible] کی وجہ سے پھیلتے ہیں۔ وائرس [illegible] ہوتی ہے [illegible] پوری طرح جاندار کہا جا سکتا ہے اور نہ بے جان۔ بظاہر یہ بے جان نظر آتے ہیں۔ جسامت میں سیل سے بھی کہیں زیادہ چھوٹے ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی کسی جاندار کے جسم کے اندر پہنچتے ہیں ان میں جان آ جاتی ہے۔ یہ تقسیم ہونے لگتے ہیں اور اپنے جیسے بے شمار وائرس بنا لیتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ہم کو نزلہ، چیچک، پولیو جیسی خطرناک بیماریاں ہوتی

ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کچھ اقسام کے کینسر بھی وائرس کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۷۰ء تک یہ خیال پختہ ہو چکا تھا تاہم کچھ سائنس دان ایسے بھی تھے جو اس سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کینسر کی وجہ جاندار کے جسم میں ہی موجود ہوتی ہے۔ کینسر پیدا کرنے والی کچھ مخصوص جین ان کے جسم میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے کینسر ہوتا ہے۔ کینسر پیدا کرنے والی ایسی جین کو "اونکوجین" کا نام دیا گیا۔ اون کو یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں رسولی یا "پھوڑا"۔

جین کیا ہے؟

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے ہر جاندار کی بنیادی اکائی سیل ہے جو جاندار جتنا بڑا ہوتا ہے اس میں اتنے ہی زیادہ سیل ہوتے ہیں۔ ہر سیل بذات خود ایک کارخانے کی مانند ہوتا ہے وہاں طرح طرح کے کام ہوتے رہتے ہیں۔ ان مختلف کاموں کو کرنے کے لیے سیل میں الگ الگ قسم کے ننھے منھے عضلات ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک عضلے کا نام "نیوکلیس" ہے۔ یہ نیوکلس ایک گٹھلی کی شکل کا ہوتا ہے اور اس کی حیثیت کارخانے کی منیجر کی سی ہوتی ہے۔ کیونکہ سیل کے تمام کام نیوکلس کے ذریعے ہی کنٹرول کیے جاتے ہیں۔ اس نیوکلس کے اندر دھاگے کی سی شکل کے کچھ اجسام ہوتے ہیں جن کو کروموزوم کہا جاتا ہے۔ ہر جاندار کے جسم میں کروموزوم کی تعداد اور شکل ایک ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ کروموزوم جوڑوں کی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کے جسم میں ۲۳ جوڑے یعنی ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں۔ ہر کروموزوم کے اندر ایک کیمیاوی مادہ ہوتا ہے جس کو ڈی۔این۔اے کہتے ہیں۔ یہ ایک لمبے نام کا مخفف ہے جو کہ اس کی کیمیائی صفت کو بیان کرتا ہے۔ ڈی۔این۔اے کی شکل ایک چکردار زینے کی سی ہوتی ہے اور اسی مادے کو جین کہا جاتا ہے۔ اس مادے میں جاندار کے نشو و نما اور عادات و اطوار کی تفصیل ہوتی ہے یعنی ایک بچے کے جسم میں جو جینی مادہ ہوگا اس میں مکمل تفصیل ہوگی کہ وہ کس طرح بڑا ہوگا اس کا قد و قامت کیا ہوگا، رنگ کیسی ہوگی، ذہانت کیسی ہوگی، شکل و صورت کیسی ہوگی، برتاؤ کیسا ہوگا۔ الغرض تمام تفصیل موجود ہوتی ہے اور اسی تفصیل کے مطابق اس کا جسم اور ذہن پروان چڑھتا ہے۔ اسی جینی مادے کے بے شمار حصے یا ٹکڑے ہوتے ہیں جن کی تعمیر ان کے کام کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ ہر ایک حصہ کسی ایک کام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جاندار کی رنگت کو کنٹرول کرنے والا ایک حصہ ہوگا، اس کی شکل کو کنٹرول کرنے والا دوسرا حصہ ہوگا۔ جینی مادے کے ایسے ہی حصے کو جین کہتے ہیں یعنی ہر سیل میں بے شمار جین ہوتے ہیں اور ہر جین کا اپنا کام الگ ہے۔ ہمارے جسم کے ہر سیل میں تقریباً ایک لاکھ جین ہوتی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی جین خراب ہو جائے تو وہی کام متاثر ہوگا جو کہ اس جین کے ذمے تھا۔

تازہ تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ کینسر کا تعلق بھی جین سے ہے۔ کینسر پیدا کرنے والی جین اور ان کو رکھنے والے کروموزوم کافی متحرک ہوتے ہیں۔ اس حرکت کی وجہ سے ان میں [illegible]۔ ان کی ساخت میں تبدیلی کیمیائی مادوں کی وجہ سے بھی آسکتی ہے۔ نیوکلیائی شعاعوں کی وجہ سے بھی آسکتی ہے۔ درجۂ حرارت کی انتہائی تبدیلی کی وجہ سے بھی آسکتی ہے۔ یا پھر کسی اور ماحولیاتی تبدیلی کے باعث ان کی بناوٹ اور ترکیب متاثر ہو سکتی ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ جن لوگوں میں کینسر کے پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا

ہے ان کے کروموزوم کچھ مخصوص جگہوں پر زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر کسی ایسے ماحول میں رہیں وہاں ان کے جسم میں اس قسم کے مادے جانے کا خطرہ ہو کہ جو کینسر پیدا کرتے ہیں تو یقیناً یہ لوگ کینسر کا شکار ہوں گے کیونکہ کینسر پیدا کرنے والے یہ مادے کروموزوموں کو ان مخصوص نازک مقامات سے الگ کر دیں گے اور اس تبدیلی کی وجہ سے ان میں کینسر کی شروعات ہو جائے گی۔ کینسر پیدا کرنے والے مادوں میں سرفہرست وہ کیمیائی مادے ہیں جو کہ آج کل کثافت اور آلودگی کی وجہ سے ہمارے ماحول میں موجود ہیں۔ وہ ہوا میں بھی ہیں اور پانی میں بھی۔ لہٰذا سانس لینے کے دوران یا متاثرہ پانی کے استعمال کرنے کی وجہ سے یہ مادے ہمارے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں صنعتی سرگرمیاں زیادہ ہیں وہاں کثافت بھی زیادہ ہے اور کینسر کا بھی زور ہے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں ترقی یافتہ ممالک میں کینسر زیادہ پایا جاتا ہے۔ گاؤں میں رہنے والوں کے مقابلے شہر والوں میں بھی کینسر زیادہ عام ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شہر کی کثیف ہوا میں سبھی لوگ سانس لیتے ہیں لیکن کینسر کچھ کو ہوتا ہے اور کچھ لوگ محفوظ رہتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ یعنی کچھ لوگ پیدائشی طور پر کینسر کے تئیں حساس ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے کروموزوم میں یا جین میں اس قسم کی خاصیت ہوتی ہے کہ وہ کسی مخصوص کیمیائی مادے کی موجودگی میں اپنی کارکردگی بدل دیتے ہیں اور کینسر بنانے والے سیل پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے جسم میں ایسی ہی ایک جین ہوتی ہے جن کو "پی۔ ۵۳" کا نام دیا گیا ہے۔ جن لوگوں میں یہ جین پائی گئی ہے وہ سبھی کسی نہ کسی وقت کینسر کا شکار ہوئے ہیں بشرطیکہ حالات کینسر پیدا کرنے کے لیے سازگار ہوں۔

ان دریافتوں کی مدد سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ کینسر کی ایک اہم وجہ جاندار کی جینز یا جینی مادے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ چونکہ جینی مادہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا ہے۔ اس لیے کینسر کی کم از کم کچھ اقسام نسلی طور پر منتقل ہوتی ہیں البتہ اُن کا ظاہر ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ جینز جس شخص میں پہنچی ہیں وہ نقصان دہ ماحول سے کتنا نزدیک یا دور ہے۔ اگر حالات سازگار ہوں تو یہ جینز کینسر پیدا کر دیں گی ورنہ خاموش رہیں گی۔ اب سائنسدانوں کی کوشش ہے کہ ان جینی مادوں کو پہچاننے کے لیے آسان قسم کے ٹیسٹ تیار کر لیے جائیں جن کی مدد سے کسی بھی انسان کے خون یا پیشاب کو ٹیسٹ کر کے یہ بتایا جا سکے کہ اسے کینسر کا خدشہ ہے یا نہیں۔ جس رفتار اور عزم کے ساتھ یہ کام ہو رہا ہے اس سے لگتا ہے کہ جلد ہی یہ ممکن ہو گا کہ کسی بھی شخص کا محض خون ٹیسٹ کر کے اسے یہ بتایا جا سکے گا کہ آیا وہ کینسر کا شکار ہو گا یا نہیں۔ اور اگر اس میں کینسر پیدا کرنے والی جینز پائی گئیں تو پہلے سے بتایا جا سکے گا کہ وہ کیا احتیاط کرے تاکہ کینسر سے محفوظ رہے۔

> انسان کو چاہیے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راستبازی نیکی و نیک دلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں رسوا کرنا ہے۔ سرسیدؒ

چوری اور ڈکیتی

محمد مختار اصلاحی علیگ ▽

کسی کی چیز بغیر اس کی اجازت کے لے لینا چوری اور علانیہ اور زبردستی چھین لینے کا نام ڈکیتی ہے۔ چوری و ڈکیتی کی عادت بھی نہایت بری عادتوں میں سے ہے۔ شروع ہی سے اگر بچوں کی تعلیم و تربیت پر دھیان نہ دیا جائے اور انھیں خراب سوسائٹی و برے ماحول سے نہ بچایا جائے تو یہ عادت چھوٹی موٹی چوریوں سے آگے بڑھ کر بینکوں کی تجوریوں اور سونے و جواہرات کے خزانوں کی چوریوں و ڈکیتیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک بار جب چوری و ڈکیتی کی عادت پڑ جاتی ہے تو پھر چور و ڈاکو کی نظر صرف ریتیوں اور سامانوں ہی پر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے و پرائے کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔ باہر سے جب وہ کچھ نہیں پاتا تو پھر گھر ہی میں ہاتھ صاف کرنے لگتا ہے۔ چوری و ڈکیتی کے ساتھ اور بھی کئی برائیاں جیسے بے مروتی، بے شرمی، جھوٹ، فریب، دغابازی، ظلم اور قتل وغیرہ شامل ہو جاتی ہیں۔ ہر ایک سوسائٹی و مذہب میں چوری اور ڈکیتی کو نہایت برا کہا گیا ہے اور قانوناً اس جرم کی سخت سزائیں بھی ہیں۔ اسلام نے خاص طور سے ان دونوں کو بدترین گناہ قرار دیا ہے اور ان کی سزا بھی بڑی سخت اور عبرت انگیز رکھی ہے۔ کیونکہ صاف ستھرے معاشرے میں اس برائی سے بڑی بدنظمی اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ گھر کے گھر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ ایک بیوہ اپنی اکلوتی بچی کی شادی کے لیے بہ مشکل کاٹ کپٹ کر ہر طرح کا سامان اکٹھا کرتی ہے لیکن شادی سے صرف چند دن پہلے اچانک چور رات میں آکر اس کی ساری کمائی صاف کر دیتا ہے۔ سوچیے کہ اس غریب بیوہ اور اکلوتی جوان بچی کا کیا حال ہوا ہوگا اور اس حادثہ کے بعد ان پر کیا گزری ہوگی۔ تو اسی طرح سامان سے بھرے ایک ٹرک میں چند ڈاکو داخل ہوتے ہیں۔ دو بہادر جب اپنے قیمتی سامان کی حفاظت کے لیے روک تھام کرتے ہیں تو ڈاکو ان دونوں کو گولی کا نشانہ بنا کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ صرف ان دونوں ہی کا نہیں ان کی نہ جانے کتنی حسرتوں اور تمناؤں کا بھی۔

قصبہ خیرآباد یو۔پی کے قریب ایک تیل ٹینکر نے موٹر سائیکل سوار کو ٹکر ماردی جس کی وجہ سے سائیکل سوار کرن پرشاد کی موت واقع ہوگئی جب کہ سائیکل کے

▽ اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ، بمبئی

کیریر پر گود میں ڈیڑھ ماہ کا بچہ لیے ہوئے ان کی بیوی شدید زخمی ہوگئیں اور بچہ کو بھی ہلکی سی چوٹ آئی۔ اس حادثے کا انتہائی شرمناک اور قابل مذمت پہلو یہ ہے کہ ٹینکر سائیکل کو ٹکر مارنے کے بعد آگے بڑھ کر رُک گیا اور اس پر سے دو آدمی نیچے اُترے جنھوں نے کرن پرشاد کی لاش کو بے دردی سے گھسیٹ کر سڑک کے کنارے ڈالنے کے بجائے ایک برساتی سے ڈھک دیا اور اُن کے ہاتھ کی قیمتی گھڑی اور جیب کی سب رقم نکال کر ٹینکر پر بیٹھ کر چمپت ہوگئے اور ان کی زخمی مجبور بیوہ اس غمناک اور دل دوز منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔ چوری و ڈکیتی سے متعلق اس طرح کی بے شمار درد انگیز و جاں گداز خبریں آئے دن اخباروں میں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ مگر اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید سب کے دل بھی اس طرح کی خبریں سننے اور چوٹ سہنے کے کچھ زیادہ ہی عادی ہوگئے ہیں۔

اس زمانے میں جب کہ چوری ڈکیتی ایک مستقل فن بن گیا ہے اور اس کی باقاعدہ ٹریننگ کے لیے ہر جگہ کالج بھی موجود ہیں جو رضاکارانہ طور پر اس خدمت کے لیے مستعد و آمادہ رہتے ہیں اور وہاں جاسوسی کتابیں، جاسوسی رسالے، پھر ٹی۔ وی کے مخصوص پروگرام وغیرہ بھی ان چوروں، گرہ کٹوں اور ڈاکوؤں کی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے بآسانی میسر ہیں۔ ایسے ناموافق حالات میں چوری و ڈکیتی کو روکنے کے لیے ایک ہی طرح کی کوشش سے کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کئی محاذ بنا کر ہر محاذ سے بھرپور کوشش کرنی ہوگی۔ سب سے پہلے تو گھر کا ماحول درست ہونا ضروری ہے۔ ماں باپ اگر خود احتیاط نہیں برتتے اور ادھر اُدھر ہاتھ مار لیتے ہیں تو پھر بچوں کا بھی اس بری عادت سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں بچوں کو اس بُرائی سے بچانے کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو ماں باپ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر ہمیشہ کے لیے اس سے توبہ کرلیں یا انھیں بہت جلد کسی صاف ستھرے ماحول میں بھیج دیں۔ بچوں کو ایسے اسکول و مدرسے میں داخل کریں جہاں تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہو۔ اسکول جانے والے بچوں کے سلسلے میں ماں کی ذمہ داری خاص طور سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بچے اسکول و مدرسے سے جب اپنے گھر آئے تو ماں کو چاہیے کہ کبھی کبھی اس کی کتاب کاپی اور بستہ وغیرہ کا بھی جائزہ لے کر یہ اطمینان کر لے کہ بچہ کی اپنی کاپی کتاب کے علاوہ کسی دوسرے ساتھی کی کوئی کتاب وغیرہ تو نہیں ہے۔ بعض بچے ایسا کرتے ہیں کہ اپنے کسی ساتھی کی کوئی چیز پسند آئی تو چپکے سے اپنے بستے میں رکھ لیتے ہیں اور اگر ماں باپ نے وقت پر گرفت نہ کی تو یہ عادت بگڑ کر مزید چوری کے بڑے دروازے کھول دیتی ہے۔ بعض بچے باہر سے کچھ لا کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ میرے دوست نے تحفہ میں دیا ہے اس وقت بھی یہ معلوم کرنا ماں باپ کا فرض ہے کہ واقعی یہ تحفہ ہے یا کہیں سے چھینی ہوئی چیز۔ جب یہ معلوم ہوتا کہ چوری کی چیز ہے تو مار پیٹ کے بجائے زیادہ تر سمجھانا اور کبھی دھمکانا مفید ہوتا ہے۔ کبھی بچوں کی جیب بھی ان کی لاعلمی میں دیکھ لینا چاہیے کیونکہ ٹافی و چاکلیٹ کے لیے بچے بسا اوقات گھر ہی میں ہاتھ مار دیتے ہیں اس طرح ماں اگر بچوں کے عادات و اطوار کی نگرانی میں ہمیشہ مستعد و سرگرم رہے تو پھر بچے چوری کے علاوہ بہت سی بُری عادتوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بہت دن ہوئے ایک دوست نے یہ عبرت انگیز

واقعہ سنایا تھا کہ کسی جوان کو چوری و قتل کے جرم کی سزا میں پھانسی کے وقت جب اس کی آخری خواہش دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ میری ماں کو میرے پاس لایا جائے ماں جب اس کے پاس آئی تو اس نے ماں سے کہا کہ زبان باہر نکالو جیسے ہی ماں نے زبان باہر نکالی تو اس نے اس کی زبان اپنے دانتوں سے کاٹ لی اور کہا کہ جب بھی میں برا مال لاتا، خوش خوش اپنے گھر میں رکھ لیتی اور کبھی بھی اپنی اس زبان سے مجھے سرزنش نہیں کی ورنہ آج مجھے یہ برا دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اب میں اپنے اس طرز عمل سے تمام دنیا کی ماؤں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اس بات کی خواہش مند ہیں کہ ان کی پیاری اولاد کے گلے میں کبھی پھانسی کا پھندا نہ ڈالا جائے تو ابتدا ہی سے ان کی تعلیم و تربیت میں احتیاط برتیں۔

تعلیمی اداروں میں اگر اساتذہ و نگراں حضرات طلبا پر کڑی نظر رکھیں تو بھی اس لعنت کو کسی حد تک روکا جاسکتا ہے۔

حکومت وقت سخت اور عبرت انگیز سزاؤں سے بھی اس بری عادت پر قابو پا سکتی ہے۔ مادی کومرن کے لیے کڑی سزاؤں کے نفاذ کی ضرورت نہیں۔ جہاں ایسی سخت سزائیں نافذ ہیں وہاں چوری و ڈکیتی کے واقعات و حادثات بہت ہی کم ہوا کرتے ہیں لیکن جہاں نرمی برتی جاتی ہے وہاں نہ صرف چوری بلکہ ہر طرح کے جرائم کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ سعودی عرب کے شاہ فیصل مرحوم کے دور حکومت میں امریکہ کی ایک خاتون صحافی نے مرحوم سے شکایت کی تھی کہ اس تہذیب و تمدن کے زمانے میں بھی آپ کے یہاں زانی کو سنگسار کرنا، قاتل کو قتل کرنا اور چور کا ہاتھ کاٹنا جیسی سخت سزائیں رائج ہیں جو نہایت وحشیانہ اور ظالمانہ ہیں۔

شاہ فیصل نے خاتون سے دریافت کیا کہ آپ کے یہاں زنا، قتل اور چوری ڈکیتی کے اعداد و شمار کیا ہیں اور اس کے نتیجے میں جانی و مالی نقصانات کا کیا اندازہ ہے؟ امریکی خاتون نے جواب دیا کہ اس وقت تو میرے پاس صحیح اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن زنا کا اندازہ تو اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہزاروں بچے ناجائز تعلقات کی پیداوار ہوتے ہیں قتل کی وارداتوں اور چوریوں و ڈکیتیوں کی کثرت کی وجہ سے ہر سال ہزاروں جانیں اور کروڑوں کی املاک تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

شاہ فیصل نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے یہاں زنا اور قتل کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں اور چوری ڈکیتی کے سلسلے میں سال بھر میں چند ہاتھ کٹتے ہیں وہ بھی کٹے ہوں گے۔ عورتیں اپنے جسم پر قیمتی زیورات پہنے رہتی ہیں جس کو دیکھ کر سب کو چوری اور ڈکیتی کے تصور سے بھی لوگ ڈرتے اور کانپتے ہیں۔ بڑے بڑے دوکاندار اپنی دوکانوں کو بند کیے بغیر کھلی چھوڑ کر نماز کے لیے مسجد چلے جاتے ہیں لیکن کسی کی مجال نہیں کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ چھوٹے بچے اور نوجوان عورتیں آزادی کے ساتھ رات میں بھی گھوم پھر سکتے ہیں۔ کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ اب آپ ہی انصاف کے ساتھ بتائیں کہ سال بھر میں بطور سزا دو چار کا قتل، چند ہاتھوں کا کٹنا اور عوام کا بے خوف و پرسکون رہنا یہ ظلم و بربریت ہے یا ہزاروں جانوں کی ہلاکت اور کروڑوں کی تباہی و بربادی؟ شاہ فیصل مرحوم کے اس سوال پر امریکی خاتون کچھ دیر عجیب سکتے کے عالم میں رہیں پھر نرم و دھیمی آواز میں فرمایا کہ بلاشبہ اس جائزہ کی روشنی میں اسلامی سزاؤں کا یہ قانون قابل قدر اور لائق عمل ہے۔

یہاں یہ بات بھی خاص طور سے ذہن میں رکھیے
اسلام میں ہر چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ اس کے
ے کچھ ضروری شرطیں ہیں۔ عدالت فیصلے کے وقت
ام حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیتی ہے اور
کو سامنے رکھ کر ہی ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ بڑی احتیاط
ساتھ کرتی ہے۔ اسی احتیاط ہی کا تقاضا تھا کہ حضرت
رضی اللہ عنہ نے سخت قحط کے زمانے میں ہاتھ کاٹنے
سزا کو وقتی طور پر روک دیا تھا اور اسی احتیاط
تحت فقہا نے بیوی، بچے، گھریلو ملازم، نابالغ،
یک دار اور مجنوں وغیرہ کو اس سزا سے بری
قرار دیا ہے۔ پھر اسلام میں چوری و ڈکیتی جیسی
بُری عادتوں کے لیے صرف ہاتھ کاٹنے ہی پر اکتفا نہیں
کیا جاتا بلکہ اس کے تمام اسباب و محرکات کو سامنے
رکھ کر اس سے بچنے کے لیے پوری احتیاط و تدابیر
بھی اختیار کی جاتی ہیں۔

• سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ کی پوری
توجہ، صاف ستھرا ماحول، اساتذہ کی مخلصانہ تعلیم و
تربیت اور حکومت کی طرف سے بھرپور نگرانی، سخت
سزائیں اگر اپنی اپنی جگہ ان سب کا صحیح بندوبست ہو تو اس
بُرائی کو پھیلنے سے بڑی حد تک روکا جا سکتا ہے۔

"میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید
سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے تحقیق
کرکے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ
اور عمدہ اور سچا یقین کیا ہے اور
اسی سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے
سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ
وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ اور کرتا کچھ
ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ
شخص ہے جو شریعت کے حکم سے
واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم
سے یا لوگوں کے طعن طعن کے ڈر سے
اس کے کرنے میں تامل کرے۔۔ جس
چیز میں ہم کو خدا سے شرم نہیں اس
میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے"

سرسید رح

حلیم صاحب

[ایک یادگار شخصیت]

ریاض الدین [illegible] ▽

تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے شمارہ ماہ مئی میں جلیل قدوائی کا ایک مقالہ حلیم صاحب کی یاد میں نظر سے گزرا۔ ان کی رحلت کی اچانک خبر نے دھکا سا لگایا۔ وقت کی بھولی بسری یادیں تازہ ہوگئیں۔ جلیل قدوائی کی قوالی کی تصویر آنکھوں میں گھومنے لگی اور ان کے شعروں کی گنگناہٹ سے کان لذت آشنا ہونے لگے۔ جلیل صاحب نے کراچی کے اے بی اے حلیم کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہم قارئین تہذیب الاخلاق کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے [illegible] سے ملانے جارہے ہیں۔

ہم طلبا اکثر انھیں ابا حلیم کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ [illegible] اے بی اے کے حروف پر ایک فاصلانہ تصرف بھی تھا اور ان کی شفقت اور ان سے طلبا کی عقیدت کا آئینہ بھی۔ حلیم صاحب صرف نام کے حلیم نہیں تھے۔ ان کے کردار میں حلم کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی آواز میں ایسی نرمی اور کچھ ایسا ترنم تھا کہ ہم لوگوں کو ان کی نقل اتارنے میں مزا آتا تھا۔ ہم طلبا سے جب وہ باتیں کرتے تھے تو بالکل ہماری سطح پر اتر آتے تھے۔ ہمارے گھریلو حالات پر بھی نظر رکھتے تھے اور اپنے گھریلو معاملات بھی بڑی دلچسپی سے سنا جاتے تھے۔ ایک دن جب وہ اپنے وطن سے ہوکر پٹنہ سے واپس آئے تو ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ دوران گفتگو فرمایا:

"ریاض صاحب! اب کی جب میں گھر گیا تو لوگ کہنے لگے۔ حلیم صاحب آج کل آپ کی صحت بہت اچھی ہے۔ دراصل [illegible] کی وجہ سے میرا [illegible] بھاری نظر آرہا تھا۔"

ہر روز شام کو وہ ایک طویل پیدل قدمی کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ طلبا کا ایک بڑا قافلہ ان کے ہم سفر ہوتا۔ کیونکہ راہ سفر میں وہ ہر شخص کی داستان دل کان لگا کر سنتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا اس کا مداوا کرتے تھے۔

دراصل ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کی وائس چانسلری میں حلیم صاحب ایک نعمت غیر مترقبہ تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں کسی طالب علم کی ضرورت کی پرکھ یہ تھی کہ وہ کتنا دوڑ سکتا ہے۔ حلیم صاحب گتھی کو فوراً سلجھا دیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے جب یونیورسٹی کی طرف سے ریویو آف اکنامکس پر ایک ریسرچ اسکالر کی مانگ شائع

▽ نور اللہ روڈ، الہ آباد۔

ہوئی تو احقر نے بھی درخواست لگادی اور وائس چانسلر کے دفتر کا چکر لگانے لگا۔ میں علیم صاحب کی خدمت میں اس وقت سے حاضر ہوتا رہا تھا جب ۱۹۳۳ء میں ٹیچرس ٹریننگ کالج میں طالب علم تھا اور ان کے تلمذ کا ذائقہ دان تھا مگر اس بار وہ میری مدد نہیں کر پائے تھے کیونکہ معاملہ براہ راست ڈاکٹر ضیاءالدین سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر بھی وائس چانسلر سے میری ملاقاتوں کی رپورٹ وہ دلچسپی سے سن لیا کرتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ دوڑنے کے بعد ایک دن ڈاکٹر صاحب نے بڑی سنجیدہ روئی سے فرمایا کہ

بھائی وہ وظیفہ تو فائق کے بھتیجے کو مل گیا ہے۔ مجبوری ہے"

میں سلام کر کے چلا آیا اور یہ قصہ علیم صاحب کو سنایا۔ موصوف نے بہت مزا لیا اور ہنس کر فرمایا:

"مبارک ہو جائیے اگلی کارروائی کیجیے۔ کیونکہ "فائق کا بھتیجہ" تو میں ہی تھا۔

اس وقت پی۔ وی۔ سی کے لیے ایک بہت بڑا پھونس کا بنگلہ سرسید کی آخری یادگاروں میں تھا۔ اب وہاں اسٹاف کلب تعمیر ہوگیا ہے۔ اس سے ملا ہوا اسی طرح کا ایک دوسرا بنگلہ تھا جس میں ڈاکٹر لودی کریم حیدر صدر شعبۂ معاشیات رہتے تھے۔ سامنے ہی ایک وسیع کمرے میں ان کا اسٹڈی روم تھا۔ اس میں ایک اونچی کرسی پر بیٹھ کر انھیں اپنی شخصیت کو ابھارنا پڑتا تھا۔ اس کرسی پر وہ جتنے واقعی تھے اس سے کچھ زیادہ ہی قد آور معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بالکل سیدھے بال ماتھے سے اٹھا کر سر کی پشت تک پہنچا دیے جاتے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے آثار کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگتے تھے مگر ان کی زبان مٹھاس اور طرز ادا کی مانوس لچک میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ دفتری کاموں کا بوجھ ان پر اتنا زیادہ تھا کہ ... مشاغل میں حائل ہوتا۔ شعبۂ تاریخ کے دوسرے پروفیسر حبیب صاحب تھے وہ بھی اکثر کلاس نہیں لیتے تھے مگر جب لیتے تھے اور نظریں نیچی کر کے لیکچر شروع کرتے تھے تو یہ سدھ نہیں رہتی تھی کہ انھوں کتنے پریڈ لیے۔ دراصل وہ جادوگر تھے۔ دو دو تین تین پریڈ مسلسل کلاس چلتا مگر کیا مجال کہ کوئی لڑکا چلا جائے۔ بلکہ بعض ایسے باذوق طلبا بھی بیٹھ جاتے تھے جو تاریخ کے طالب علم نہیں تھے غرض کہ میں نے بطور ریسرچ اسکالر اپنا کام شروع کر دیا۔ عثمانیہ ہوسٹل میں مجھے ایک کمرہ الاٹ ہوگیا۔ اگرچہ میں نووارد تھا مگر پہلے ہی سے میرا شمار سینئر طلبا میں ہونے لگا اور نئے طلبہ کی اذیتوں سے محفوظ رہا۔ ڈاکٹر ضیاءالدین میرے گائڈ تھے یہ بھی میرے لیے ایک وقار کی بات تھی مگر انھوں نے کبھی میرا کام دیکھا نہیں البتہ ان کے ساتھ گھومنے کا مزا کافی تھا۔ دہلی جاتے تو کہتے کہ میرے ساتھ چلو وہیں کام دیکھ لوں گا۔ ان کے ساتھ دن بھر اسمبلی کے سیشن میں رہتا۔ رات کو گھومنے اور دوستوں سے ملاقاتیں کرتا۔ مگر غنیمت یہ ہوئی کہ اس وقت ڈاکٹر کول عارضی صدر شعبہ تھے۔ وہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے آئے تھے اور وہاں میرے استاد تھے۔ اس لیے وہ خود میرا کام دیکھ لیا کرتے تھے۔ میری تحریریں رسالوں میں شائع ہونے لگیں اور جلد ہی میں آل انڈیا اکنامک کانفرنس کا رکن ہوگیا اور آگرہ کی آل انڈیا اکنامک کانفرنس میں میں نے ریلوے اکنامکس پر ایک مقالہ پڑھا جو کہ ان کے

جرنل میں شائع ہوا۔

مگر میرے گائڈ ڈاکٹر ضیاء الدین جتنا میرے کاموں سے بے خبر تھے، اتنا ہی حلیم صاحب باخبر تھے اور شاید ضرورت سے زیادہ متاثر بھی تھے مگر "روشنی طبع تو بر من بلا شدی" ایک دن فرمایا کہ ریاض صاحب میں آپ کو ایک زحمت دینا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ بطیب خاطر منظور کر لیں۔ انکار کی گنجائش ہی کہاں تھی میں نے کہا ضرور فرمائیے۔ کہنے لگے کہ ایک طالب علم میرے ایک بہت عزیز دوست کا بیٹا ہے اور بجنور کے تین باوقار خاندانوں کا واحد چشم و چراغ ہے۔ اس کے لیے مجھے ایک صالح ساتھی کی تلاش ہے۔ میری نظر آپ پر پڑ رہی ہے آپ اسے ایک چھوٹے بھائی کی طرح اپنے کمرے میں رکھ لیں تو مجھ کو اور لڑکے کے خاندان والوں کو اطمینان ہو جائے گا۔ میں نے ہنکاری تو بھر لی مگر گھبرایا ہوا تھا۔ کہاں میں اور کہاں ایک رئیس ابن رئیس۔ یہ تھے میاں عبدالغفور خاں شیروانی جنھیں پیار سے لوگ آبادمیاں کہتے تھے۔ غرض کہ ایک دن ایک حسن دار فٹن میرے کمرے کے نیچے آکر رکی۔ اس میں سے ایک نوجوان۔ سرخ و سفید رنگ۔ گٹھیلا بدن۔ چہرے پر شادابی اور مسکراہٹ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے خیر مقدم کیا اور اپنے بیک روم (back room) میں انھیں جگہ دی۔ ان کے پاس بڑا مختصر سامان تھا اور نوابی کر و فر کا کوئی نشان نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ ان کا ایک خاندانی ملازم سلطان وقتاً فوقتاً حاضری دے جاتا تھا۔ آبادمیاں ایسے سادہ مزاج اور بے تکلف آدمی تھے کہ ان کے متعلق میرے تخیل کا قلعہ ایک دم مسمار ہو گیا۔ وہ بڑی تیزی سے محبت کی منزلیں طے کرنے لگے۔ پہلے ایک نووارد تھے پھر ایک دوست ہوئے۔ پھر قریبی عزیزوں میں داخل ہوئے۔ پھر بھائی بن گئے۔ ایسے بھائی کہ عمر بھر یہ رشتہ قائم رہا۔

اس درمیان میں یہ تھیسس (ریسرچ ورک) بھی تیار ہو گیا اور پی ایچ ڈی کے لیے میرے ممتحن مقرر کرنے کا مسئلہ تھا۔ شومیٔ قسمت کہ ڈاکٹر کول جنیوا چلے گئے اور ڈاکٹر حیدر پھر کرسی صدارت پر واپس آگئے۔ وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے شدید مخالفوں میں تھے۔ اس لیے انھوں نے مجھے بلا کر صاف کہہ دیا کہ جب تک یونیورسٹی کی طرف سے ریلوے اکنامکس کا کوئی ماہر استاد مقرر نہیں کیا جاتا میں تمہارا تھیسس منظور نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر حیدر کے واپس آنے سے قبل ہی میں شعبۂ معاشیات میں عارضی لکچرر مقرر ہو گیا تھا مگر ڈاکٹر حیدر کو یہ بھی گوارا نہیں تھا۔ انھوں نے پوسٹ کے لیے اشتہار جاری کر دیا اور statistics کی شرط لگا دی۔ اتفاق ایسا کہ جتنی درخواستیں آئیں میں ہی تنہا امیدوار تھا جس نے statistics میں آنرز کیا تھا۔ اب سر شاہ سلیمان وائس چانسلر ہو گئے تھے۔ میں ان سے ملنے گیا اور خاصا پُرامید تھا مگر ڈاکٹر حیدر نے پھر اڑنگا لگا دیا۔ انھوں نے کہا مجھے ایسا استاد چاہیے جو ایم اے کو statistics پڑھا سکے۔ آپ انگلستان جا رہے ہیں وہاں سے کوئی امیدوار لے کر آئیے۔ نعیم صاحب نے اس گتھی کو سلجھانے کی ہزار کوشش کی مگر راہ استوار نہیں ہوئی۔

میں نے علی گڑھ چھوڑ دیا اور وزارت صنعت و حرفت اور وزارت براڈکاسٹنگ کی ملازمتوں کا مزا چکھتے چکھاتے معاملا اسلامیہ کالج الہ آباد میں جا کر ٹک گیا۔ کچھ عرصے کے بعد حلیم صاحب نے مجھے پھر یاد فرمایا اور حکم دیا کہ کالج سے لمبی چھٹی لے کر

چلے آؤ۔ مسلم معاشیاتی منصوبہ بندی کا کمیشن قائم ہو گیا ہے اور تم کو اس میں کام کرنا ہے۔ تعمیل حکم میں میں علی گڑھ پہنچ گیا اور وہاں سے دہلی بھیج دیا گیا۔ اس سے قبل بمبئی کی کانفرنس میں شریک ہوا تھا۔ جہاں کام کا خاکہ مرتب ہوا۔ بھوپال کے ایک مسلم چیف انجینیر (جن کا نام بھول گیا ہوں) صدر بنائے گئے۔ حلیم صاحب سکریٹری ہوئے اور عربک کالج دہلی کے پروفیسر معاشیات لطیف قریشی نائب سکریٹری اور دہلی کے دفتر کے نگراں مقرر ہوئے۔ میں اور حلیم خاں (جو بعد میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل مقرر کیے گیے) ریسرچ اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ دہلی میں فیض روڈ پر ایک دفتر کرائے پر لیا گیا۔ میں نے بڑی محنت سے کام کا تفصیلی خاکہ تیار کیا۔ مگر لطیف قریشی شاید مجھ سے اس وجہ سے ناراض تھے کہ میں زیادہ کام گھر ہی پر کرتا تھا۔ کیونکہ میں کام شروع کرنے کے بعد تسلسل کو قائم رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لطیف صاحب نے میرے خاکے کو مسترد کر دیا اس لیے میں واپس الہ آباد چلا آیا تھوڑے دنوں کے بعد پھر حلیم صاحب کا خط آیا کہ میں پٹنہ جا رہا ہوں۔ تم مجھ سے الہ آباد ریلوے اسٹیشن پر ملو۔" حسب ہدایت میں اسٹیشن پہنچ گیا۔

اسٹیشن کی مختصر ملاقات میں انھوں نے فرمایا کہ میں نے تمہارا خاکہ صدر کے پاس بھیج دیا تھا۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ خاکہ نہایت مکمل ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی گنجایش نہیں ہے۔ فوراً کام اسی خاکے کے مطابق شروع ہو جانا چاہیے۔ اس لیے اب تم پھر چھٹی لے کر آجاؤ اور کام کو مکمل کر دو۔"

میں نے عرض کیا کہ مگر میں لطیف صاحب کے ساتھ تو کام نہیں کر سکتا۔"

انھوں نے جواب دیا کہ اب تم لطیف صاحب کی نگرانی میں نہیں رہو گے۔ کیونکہ میں نے دفتر علی گڑھ منتقل کر دیا ہے۔

علی گڑھ میں غلام باری صاحب بر [illegible] کی نئی کوٹھی بنی تھی وہ کرائے پر لے لی گئی اور کام شروع ہو گیا۔ ابھی رپورٹ تیار ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ آزادی اور تقسیم ملک کا ڈنکا بج گیا اور ہمارا کام عملاً رک گیا۔ اسی درمیان میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کی ایک کتاب نکل آئی جس کا نام تھا – [illegible] انھوں نے اعداد و شمار سے ثابت کیا تھا کہ مجوزہ پاکستان معاشی اور اقتصادی لحاظ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ میرے پاس اعداد و شمار تو اکٹھا تھے ہی میں نے جھٹ ان کے جواب میں ایک کتاب لکھ ڈالی اور مصدقہ سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں بتایا کہ انھوں نے غلط نتائج اخذ کیے ہیں اور کہیں کہیں تو عمداً اعداد کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ پاکستان بن چکا تھا اس لیے یہاں کے مزاج کے مطابق میں ڈر رہا تھا کہ اخبارات میری کتاب کے پرخچے اڑا دیں گے۔ مگر جملہ تنقیدات کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے اعداد و شمار قابل اعتماد نہیں ہیں تو کیسے یقین کیا جائے کہ ریاض الدین کے اکٹھا کیے ہوئے اعداد صحیح ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد کتابستان الہ آباد کے مالکان پاکستان چلے گئے اور میری کتاب جو انھوں نے شائع کی تھی وہ بھی لے گئے۔

علی گڑھ کی ایک ٹریڈیشن یہ تھی (شاید اب بھی ہو) کہ طلبا، نامور اساتذہ کے دربار میں بلا اس امتیاز کے حاضر ہوتے تھے کہ وہ اُن کے استاد ہیں یا نہیں۔ حلیم صاحب کے یہاں حاضری ان کے رتبۂ علمی کے علاوہ تعلیمی تعلق سے بھی تھی۔ مگر دوسرے بین الاقوامی شہرت کے اساتذہ مثلاً پروفیسر حبیب، ڈاکٹر بابر مرزا، خواجہ غلام السیدین،

پروفیسر ہادی حسن، رشید احمد صدیقی، مولانا سلیمان اشرف وغیرہ ایسی شخصیتیں تھیں کہ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہونا ایسا تھا کہ

حذر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

مگر عید کے دن جب اپنے محبوب اساتذہ کے یہاں سوئیاں کھاتے کھاتے ہم لوگ عاجز ہو جاتے تھے تو حکیم صاحب کے یہاں امرتیوں کی ضیافت سے تازہ دم ہو جاتے۔

افسوس کہ اس صدی میں اساتذہ کرام کی یہ روش پرورش ایک قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئی ہے معلوم نہیں کہ تاریخ کب تک ان کا ماتم کرتی رہے گی۔

"ایک سچے مسلمان کے قول اور عمل میں مطابقت ہونی چاہیے جو کچھ کہے اسے کر دکھائے اور کرنے کی نیت یا ہمت نہ ہو تو زبان سے بھی نہ نکالے کہنا کچھ اور کرنا کچھ۔ یہ انسان کی ان بدترین صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں۔ کیونکہ ایک ایسا شخص اس اخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اسلام پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو۔"

——— سرسید

"تمام دنیا کی مہذب قومیں اخلاق کے بڑے بڑے اصولوں میں متفق ہوتی ہیں، گو کہ عقائد میں وہ کیسی ہی مختلف ہوں۔"

سرسید

خلانوردوں کا عذابِ تنہائی

یہ تاریخ کی سب سے لمبی خلائی پرواز تھی تینوں خلانورد سیلیوٹ، کے خلائی اسٹیشن میں مسلسل ۲۳۷ دن اور ۲۳۷ راتیں گزارنے کے بعد اپنی پیاری زمین پر واپس آرہے تھے۔ ۲/ اکتوبر کو جب وہ وسطی ایشیا کے ایک میدانی علاقے میں اُترے تو اُن کے چہروں سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ زمین کے باسی معلوم نہیں ہوتے کسی اور ہی دنیا کی عجیب و غریب مخلوق دکھائی دیتے تھے۔ خلاؤں میں آٹھ ماہ تک ہلکے پھلکے تیرتے رہنے کے بعد جب کشش ثقل کے دباؤ میں آئے تو وہ اپنے ہاتھ بھی نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ دیکھنے والوں کو وہ بالکل گم سم، و رہونق سے نظر آرہے تھے۔

ایک اخبار نویس نے ان سے پوچھا "زمین پر واپس آکر آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا

"بھائی! پہلے ہمیں یہ تو محسوس کر لینے دو کہ ہم کہاں ہیں۔"

مجرمین کو ان کے جرم کی نسبت سے سزا دی جاتی ہے۔ قاتل کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور سنگین جرائم کے مرتکب حضرات کو قید بامشقت یا قیدِ تنہائی کی سزا دی جاتی ہے۔ یعنی قیدِ تنہائی سزائے موت سے ذرا ہی کم ہے لیکن روئے زمین کے جیل خانوں کی کوٹھریوں میں کٹنے والی تنہائی کے عذاب سے اس تنہائی کے عذاب شدید ہیں جو خلائیات کے مہم جو مسافروں کو ہیبت ناک خلا میں بسر کرنا ہوتی ہے۔ قیدِ تنہائی کا مجرم بہر صورت زمین پر ہی رہتا، اٹھتا بیٹھتا، سوتا جاگتا، کھاتا پیتا ہے، بے چارے خلانورد تو زمین سے لاکھوں میل کے فاصلے پر آسمان کی پہنائیوں میں خلائی مشینوں کی تنگ کوٹھری میں اوندھے سیدھے، اوپر نیچے لٹکتے رہتے ہیں۔ نہ دن اُن کے اپنے ہوتے ہیں نہ راتیں ان کی مرضی ہیں۔ عزیزوں، رشتہ داروں، احباب، بیوی بچوں کی یادیں دوچند سہ چند ہوجاتی ہیں بعض کی خوشگوار ناخوشگوار کرتب ادھر دیکھو تو تاریکی ہی تاریکی، ادھر دیکھو تو نیلاہٹ ہی نیلاہٹ، بے چینی، اضطراب، خوف و دہشت۔ یہ ساری چیزیں مل کر نفسیات کا ایک نیا موضوع بن گئی ہیں۔

روسی خلانورد لیبدیف ۱۹۸۲ء میں سیلیوٹ۔ میں سات ماہ تک خلا میں رہا تھا۔ ابھی اس نے اپنا آدھا مشن پورا کیا تھا کہ ۱۱۲ ویں دن اس نے اپنی ڈائری میں لکھا:

"میں گویا ہر وقت اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ خود کلامی میری گفتگو بن کر رہ گئی ہے۔ خلائی مشین کے اندر تیرتے پھرنا ہی میرا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ نہیں معلوم کہ ہوتا کب

ہوں جاگتا کب ہوں۔ دماغ کی عجیب
کیفیت ہو کر رہ گئی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ
زندگی میں کبھی وہ دن بھی آئے گا جب میں
دوبارہ زمین پر جاؤں گا اور اپنے پیاروں
سے ملوں گا۔"

ہم زمین پر رہنے والے تو یوں سوچتے ہیں کہ ان خلا بازوں کے بڑے مزے ہیں۔ زمین کے مدار سے اس کے دائرۂ کشش سے باہر نکلتے وقت جب یہ بے وزن ہوتے ہیں تو ان کو لطف آتا ہوگا۔ وہاں آزادانہ گھوم پھر رہے ہوں گے۔ قہقہے لگاتے ہوں گے۔ تیز رفتار مصنوعی سیاروں کو دوڑانے پھرنے میں بڑی خوشی کی مسرت حاصل ہوتی ہوگی۔ کبھی کبھی خلائی تشتیوں سے باہر نکل کر خلائی میدان میں چہل قدمی کرنے میں ان کی خوشی کی بہت کیا سے کیا ہو جاتی ہوگی اور وہ [illegible] میں آکر کبھی کبھی قہقہے بھی لگاتے ہوں گے لیکن ان کے دل کا کیا حال ہوتا ہے۔ ان کے جذبات [illegible] سے کیا ہو جاتے ہیں اس کو سوائے ان لوگوں کے اور کوئی نہیں جان سکتا جو خود بھی خلا میں جا چکے ہیں۔ چونکہ روسی خلا بازوں نے خلاؤں میں زیادہ سے زیادہ لمبے سفر کئے ہیں اس لیے روس میں باقاعدہ طور پر خلائی طب اور خلائی نفسیات وجود میں آ چکی ہیں۔ اب چونکہ امریکہ میں بھی کئی کئی [illegible] کی مدت کی خلائی پروازوں کے پروگرام بن رہے ہیں۔ مثلاً مریخ پر جانے کا منصوبہ [illegible] امریکی خلا بازوں کی نفسیات پر بھی خصوصی توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ چونکہ امریکی خلا باز روسی خلا بازوں کی خود نوشت ڈائریاں ان کے طبی و نفسیاتی احوال پڑھتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی اپنی نفسیات میں قدرے [illegible] پیچیدگی کا پہلو شامل ہو جاتا ہے۔ قدرتی طور پر ان میں گھبراہٹ پہلے ہی ہوتی ہے لیکن جب وہ دوسروں کے تجربات پڑھتے ہیں تو گھبراہٹ بڑھ جاتی ہے۔ ناسا کے ایک ذمہ دار افسر نے کہا ہے کہ

" خلائی نفسیات میں اس قدر پیچیدگیاں
ہونے کا امکان ہے کہ آئندہ پانچ سال
میں خلائی مشن پر خلا بازوں کے ہمراہ ایک
معالج ماہر نفسیات بھی بھیجا جائے گا"

امریکہ والے روسی خلا بازوں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ ان کے انسانی رد عمل خلائی تجربوں مثلاً سیلیوٹ کا بغور جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے نتیجہ نکالا کہ سیلیوٹ کے کیبن میں پنکھوں کی آواز بہت تیز اور کرخت ہے دوسرے آلات سے بھی بہت آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ خلا بازوں کو جو کھانا دیا جاتا ہے وہ خوش ذائقہ تو رہا ایک طرف [illegible] والا ہوتا ہے۔ غسل کا طریقہ [illegible] ہے کہ گیلے رومال کو تولیے جسم پر پھیرتے رہتے ہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ بے وزنی کی کیفیت ہر وقت دل و دماغ پر طاری رہتی ہے۔ جہاں کشش ثقل نہ ہوگی وہاں معدے کی گیس اور دوسرے انسانی [illegible] دماغ کی طرف آئیں گے اور [illegible] ہو جائے گا ورم [illegible] جب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوں گے تو اگر خوف زدہ نہیں ہوتے ہوں گے تو خوف ان کے عکس میں ضرور پیدا کرتا ہوگا۔ ان کی باہمی گفتگو میں [illegible] ہوگا سب سے زیادہ یہ کہ تھوڑی جگہ [illegible] کبھی [illegible] فرار نہیں۔ آدمی کبھی نہ کبھی اپنے محبوب سے بھی اکتاہٹ اور بے زاری محسوس کرتا ہے جو کچھ دیر کچھ دور رہنے سے ختم ہو جاتی ہے۔ خلائی مشن میں یہ ممکن نہیں کہ ساتھی خلا باز کی کوئی بات ناپسند آئی ہے تو اس سے کچھ دیر کے لیے کنارہ کر لیا جائے۔ روئے زمین پر کبھی

کبھی زندگی بوجھ بن جاتی ہے جسے اتارنے کے لیے آدمی دوستوں کے ہمراہ فلم دیکھتا ہے یا سیر و تفریح کے لیے باہر نکل جاتا ہے یہاں یہ بھی ممکن نہیں کہ زندگی بوجھ بنتی ہوگی تو اس بوجھ کو ہلکا کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں بلکہ بوجھ زیادہ محسوس ہونے لگتا ہوگا۔ جلوت کے علاوہ خلوت بھی اچھی چیز ہے سیلیوٹ کی واحد خلوت گاہ ایک گیلری ہے جو خلائی جہاز کی دم پر بنی ہوئی ہے۔ جی گھبرائے تو گیلری میں چلے جائیے کھڑکی کھولیے اور باہر کا نظارہ دیکھیے۔ باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کوئی حسین سے حسین چیز نظر بھی آئے گی تو وہ آپ کی محبوب زمین ہے جو اُلٹا آپ کی سوئی ہوئی یادوں کو جگائے گی اور خوابیدہ تمناؤں کو زندہ کرے گی اور یوں خلاباز کی نفسیات کا ایک نیا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔

اس بے رنگ زندگی میں رونق اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دوسرے خلائی جہازوں کے مسافر تھوڑی بہت دیر کے لیے مہمان بنتے ہیں یا قریب سے گزر کر دل میں اک ہنگامہ سا بپا کرتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں چھ ماہ تک خلا میں رہنے والے ایک روسی خلانورد ویری روومین نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

"مشہور امریکی افسانہ نویس او۔ ہنری نے اپنی ایک کہانی میں لکھا ہے کہ اگر آپ قتل کے آرٹ کی ترویج چاہتے ہیں تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ دو آدمیوں کو اٹھارہ بارہ فٹ کے ایک کمرے میں دو ماہ کے لیے اکیلا بند کر دیں ان میں سے ایک دن دونوں قتل ہو جائیں گے۔ ہنری کی یہ بات یاد کرتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ لیکن خلائی جہاز میں مہینوں قیدِ تنہائی کا عذاب کاٹ کر اب سوچتا ہوں کہ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دوسرے آدمی کو قتل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ آدمی اپنی محبوبہ کے ساتھ بھی دیر تک تنہائی میں رہنے کی مشقت نہیں جھیل سکتا۔"

پھر اصلی بات یہ ہے کہ خلائی سفر بجائے خود ایک مشکل، کٹھن اور خطرناک منزل ہے۔ "سیلیوٹ میں فنی خرابیوں کی وجہ سے اب تک ۴ خلانوردوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ کوئی نیا خلانورد جب خلائی جہاز میں سوار ہوتا ہوگا تو ایک بار خوف سے اس کا جسم کانپ اُٹھتا ہوگا۔ منصوبہ ساز بھی یہ بات خوب جانتے ہیں اور منصوبہ باز بھی۔ جب روسی خلانورد خلاؤں میں محوِ سفر ہوتے ہیں تو ماسکو مشن کنٹرول کے ایک مخصوص کمرے میں ماہرین بیٹھے خلانوردوں کی حرکات و سکنات اور رویوں کا مشاہدہ کرتے وقت نفسیاتی تجزیے بھی کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی خلائی پروگرام میں خلانوردوں کی ذہنی صحت اور نفسیات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب خلانورد مشن کنٹرول سے مواصلاتی رابطہ قائم کر کے گفتگو کرتے ہیں تو اس وقت ماہرینِ نفسیات بھی موجود ہوتے ہیں اور ان کی آوازوں کی نرمی یا سختی تندی یا ترشی اور لب و لہجہ نوٹ کرتے رہتے ہیں۔ ٹیلی وژن پر ان کی جو صورتیں آتی ہیں ان کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے نیز یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس دن کس وقت ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر بیٹھے یا کھڑے ہوئے تھے اس سے ماہرینِ نفسیات یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے جب اُن کا باہمی رویہ یوں ہے تو ہماری غیر موجودگی میں اور خاموشی اور خلوت میں اُن کا باہمی سلوک کیا ہوتا ہوگا۔

ماہرین نفسیات خاص طور پر خلائی سفر کے عین وسط میں زیادہ محنت کرتے اور زیادہ توجہ دیتے ہیں اس لیے کہ سفر کے عین وسط میں خلانوردوں کا جوش و خروش اور ولولہ بجھ چکا ہوتا ہے۔ ساٹھ دن کا خلائی سفر ہو تو تیس دن کے بعد خلانوردوں کی نفسیات دیکھنے والی ہوتی ہے۔ اس موقع پر ماہرین نفسیات ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مشن کنٹرول میں خلانوردوں کے بیوی بچوں، دوستوں اور عزیزوں کو بلوا لیا جاتا ہے۔ وڈیو کے ذریعے دو طرفہ گفتگو ہوتی ہے۔ نئی نئی خبریں سنائی جاتی ہیں۔ مبارک ہو تمہارے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ مبارک ہو تمہاری بیوی صحت یاب ہو گئی ہیں۔ بیٹا امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے سائنس دانوں [illegible] اور فن کاروں کو ان سے گفتگو کا موقع فراہم کیا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے ولولے [illegible] سرگرم ہو سکیں۔

پھر ان کے ذہنی اور احساساتی دباؤ کو کم کرنے [illegible] تازہ پھل، سبزیاں، خطوط، اخبارات [illegible] سیلانی جہازوں کے ذریعے [illegible] بھیجے جاتے ہیں۔ [illegible] نے وی سی آر اور [illegible] ارسال کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں خلانورد [illegible] نے پیغام بھیجا کہ [illegible] آئندہ خلائی سیلانی جہاز کے ذریعے [illegible] بھیجے گئے تو ان کے [illegible] ہیں۔

اپنی پیاری زمین کی یاد [illegible] تو خلانوردوں کی [illegible] ہوتا ہے۔ چنانچہ خلائی جہاز میں زمین کی آوازوں کے ٹیپ پہلے سے رکھ دیے جاتے ہیں۔ بارش کی آواز، بادلوں کی گھن گرج کی آواز، سمندر، دریا کے طوفان کی آواز، پرندوں کے چہچہانے کی آواز، گایوں، بھینسوں کی آوازیں۔ اداس لمحوں میں ٹیپ ریکارڈ کی یہی آوازیں جینے کی تمنا پیدا کر دیتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک خلائی سفر میں ایک کتاب رکھ دی گئی تھی جس میں پہاڑوں، درختوں، دریاؤں اور دوسرے قدرتی مناظر کی رنگین تصویریں تھیں۔ خلانورد نے اپنی ڈائری میں لکھا:

"بھلا ہو اس شخص کا جسے کتاب رکھنے کا خیال آیا، اس نے دل شاد کر دیا۔"

کبھی کبھی روسی خلانورد تو اس وضع [illegible] کی حد [illegible] کر لیتے ہیں [illegible] خلانوردوں کی مثال ذہن میں رکھیے جس نے ۱۹۹۰ء [illegible] ریکارڈ [illegible] خلا میں رہا [illegible] زمین پر [illegible] اپنے [illegible] ذہنی [illegible] خلانوردوں [illegible] اس نے اپنے دوسرے سفر میں خصوصی ورزشی [illegible] کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ چنانچہ [illegible] زمین پر آیا تو [illegible] بلیوٹ کے [illegible] کمرے میں [illegible] دھو پڑا [illegible] اسے کاندھوں پر اٹھا کر [illegible] کی نقید میں دوسرے خلانوردوں [illegible] ولاہکوف کو بھی [illegible] ورزشوں سے نفرت ہونے لگی۔ انھوں نے [illegible] ۲۳ دنوں کا سفر روس سے [illegible] میں کیا۔ اگر وہ ورزش کرتے رہتے تو ان کی یہ حالت نہ ہوئی ہوتی۔ سب زمینی مشینیں کنٹرولوں سے ان کا رابطہ رہتا [illegible] ٹیلی وژن پر وہی کچھ کرنے جن کی انھیں تربیت و ہدایت دی گئی تھی۔ [illegible] ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رابطہ ٹوٹتا وہ [illegible] اداس [illegible] ڈمیوں کی طرح ایک طرف ڈھیر ہو کر پڑے رہتے۔

تنہائی کے عذاب ناک احساس نے روسی خلا نوردوں کی نفسیات میں ہلچل مچا رکھی ہے، جو روس کے خلائی منصوبہ سازوں اور تدبیر کاروں کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ امریکہ کے خلائی ادارے "ناسا" کے متعدد عہدہ دار اب روسی خلائیات سے سبق لے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے طور پر ایسی تدابیر اختیار کی ہیں جن پر عمل کرنے سے امریکی خلا نوردوں کو ویسے احساس تنہائی اور اس سے پیدا شدہ تکلیفوں سے نہیں گزرنا پڑے گا، جن سے روسی خلا بازوں کو گزرنا پڑا ہے۔

[ماخوذ]

دشمن

"دشمن جو عیب صحیح یا غلط تم میں نکالتا ہے تو اس وجہ سے نقصان نہیں کہ وہ تم میں ہو۔ ہے تو تم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو خدا کا شکر کرتے ہیں کہ وہ عیب تم میں نہیں سچ ہے کہ:

دشمن از دوست ناصح تر است منتج
نکوئی نگوید و بین جز بدی نبیند۔

[دوست سے زیادہ نصیحت کرنے والا دشمن ہے کہ یہ صرف نیکیاں بیان کرتا ہے اور وہ برائی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتا] ۔

مہ ستارہ

شفاء الملک عبد اللطیف فلسفی

برکت اللہ ▽

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک دور وہ تھا جب [illegible] میں [illegible] مسعود [illegible] کے [illegible] پر [illegible] روزگار [illegible] گوشے [illegible] تھے۔

اسی دور کی [illegible] شخصیتوں [illegible] حکیم عبد اللطیف فلسفی کا نام نامی [illegible] کان کے افق پر نمودار [illegible] [illegible]

آپ [illegible] ہندوستان میں [illegible] [illegible] [illegible]

آپ کی پیدائش [illegible] محمد [illegible] محرم الحرام ۱۳۱۸ھ ۲۹ اپریل ۱۹۰۰ء کو [illegible] ہوئی۔ پیدائش کے دو ہی سال بعد والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کے چچا اور بڑے بھائی نے [illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب کا [illegible] علی گڑھ سے [illegible]

▽ ایم۔ ڈی شعبۂ معالجات، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ

شغف تھا۔ اس کی فروغ و ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ۱۹۴۹ء میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے تو نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ دواخانہ طبیہ کالج کی طرف خاص توجہ فرمائی اور ایک شعبہ ریسرچ و تحقیقات سے متعلق بھی قایم کیا۔ نیز بہت سی جڑی بوٹیوں کے پودے لگوائے جس سے دوا کی شناخت و ماہیت اور اس کی اصلیت سے بخوبی واقف ہوا جا سکے۔ آپ ڈین فیکلٹی آف میڈیسن کے عہدے پر فائز رہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے وائس پریسیڈنٹ کے فرائض کو بھی نبھا دیا۔ آپ کو علاج و معالجہ و طبی خدمات کی بنا پر گورنمنٹ آف انڈیا نے "شفاء الملک" کا خطاب عطا کیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۱ء میں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گئے۔ ۶۵-۱۹۶۵ء میں جامعہ دہلی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اسی دوران آپ کو قلب کا عارضہ لاحق ہوا جس کی وجہ سے ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے آبائی وطن لکھنؤ منتقل ہو گئے وہاں پہنچ کر لکھنؤ کے جھوائی ٹولہ میں مطب شروع کیا اور تک و دو تجربات بھی قلمبند کیے۔ آخری ایام میں عارضہ قلب کا دوبارہ و سہ بارہ حملہ ہوا۔ ڈاکٹر فریدی مرحوم کے مشورے پر لکھنؤ کے میڈیکل کالج اسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ بالآخر ۱۴ نومبر ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب کو دو بجے جان جانِ آفریں کو سپرد کر دی۔ اس طرح طب کا یہ روشن ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

مرحوم نے تصنیفات و تحقیقات کے میدان میں علم طب، مذہب و فلسفہ کے مختلف گوشوں پر خامہ فرسائی کی۔ آپ کی تصنیفات طب کے میدان میں بہت اہم ہیں جن میں مندرجہ ذیل کتب قابل ذکر ہیں:

۱۔ تحقیق المقال فی تعریف الاعتدال۔
۲۔ التحقیق المطلوب فی الماء المشروب
۳۔ ہماری سائنٹفک طب یونانی
۴۔ تاریخ طب۔
۵ مختصر تاریخ قدیم تشریح و منافع الاعضاء و علم الجراحت۔
۶۔ ہماری طب میں ہندوؤں کا ساجھا۔
۷۔ طب اور سائنس۔
۸۔ نبض۔
۹۔ ترجمہ و شرح ادویہ قلبیہ

مذہبی اور دینی کتابوں میں

۱۔ مذہب اور لامذہبیت
۲ فلسفۂ نبوت اور
۳۔ راضیہ مرضیہ

قابل ذکر ہیں۔

مریضوں کے دیکھنے اور علاج و معالجے میں آپ کا طریقۂ مطب نرالا تھا۔ اگر اس کو نہ بیان کیا جائے تو ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ نامکمل رہے گا۔ آپ کے نسخوں میں قدیم روایات کے ساتھ جدت و ذہانت کا اثر خوب پایا جاتا تھا۔ اکثر طویل و دشوار طلب نسخوں سے گریز فرماتے۔ دورانِ مطب سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظریف و غیر سنجیدہ بھی نظر آتے تھے جس کی جھلک آپ کے مطب میں نمایاں ہوتی۔ بقول پروفیسر حکیم نعیم طبیب صاحب:

"میں نے ایسے لوگ کم دیکھے ہیں جو اپنی زندگی میں سنجیدہ بھی اتنے ہی پائے جا سکیں جتنا کہ وہ ظریف اور غیر سنجیدہ بھی نظر آتے رہے ہوں۔ دور کی کوڑی لانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انھیں عام روش پر اور لگے بندھے راستوں پر چلنا کبھی

پسند نہ تھا چنانچہ ان کے مطب میں اجتہاد
کی شان نمایاں رہتی تھی"
مقدمہ مطب لطیف ص ۵
آپ علاج و معالجہ میں بے جا انا کا مظاہرہ نہیں کرتے
تھے۔ بلکہ بسا اوقات مریض کی مالی امداد بھی فرماتے
تھے۔ خصوصاً وہ مریض جو اپنی غربت و افلاس کی بنا
پر دوا نہیں خرید سکتا۔ بجا طور پر ان کا یہ عمل آج کے
اطبا و حکما کے لیے قابل تقلید و قابل رشک ہے۔

بقول حکیم محمد مختار اصلاحی:
"ماہر اطبا معالج کے تمام اوصاف
آپ میں موجود تھے ان کا مطب
مقصود و مرجع خلائق تھا"
اطبا اور ان کی مسیحائی
آپ کی وفات سے مطب کا ایک زریں باب ختم ہو گیا۔
ہندوستان میں ایسے بزرگ دیکھے گئے
افسوس کہ وہ بہت سے صحت نہیں رہے

مراجع

۱۔ مطب لطیف ۔ سید کمال الدین حسین ہمدانی الجدلی
۲۔ شفاء الملک حکیم عبداللطیف کے نقوش و تاثرات محمد اسلم
۳۔ اطبا اور ان کی مسیحائی۔ از محمد مختار اصلاحی ص ۱۶۰
۴۔ تاریخ خاندان عزیزی ۔ سید ظل الرحمن ۔

زندگی عبادت ہے حرکت سے آرزو سے
جستجو سے۔ جہاں ان تینوں میں سے کسی کا سراغ نہ
ملے تو جان لو کہ وہاں موت کی قلمرو شروع ہو گئی جس
انسان کے دل میں آرزو نہیں، جس کو جستجو نہیں،
جو آگے بڑھنے کے لیے بے چین نہیں، وہ انسان نہیں
مٹی کا ڈھیر ہے۔

سید حامد

گاہے گاہے باز خواں

محمد اسلم صدیقی *

مسلمانوں کے دورِ اقبال میں، مختلف علوم و فنون سے ان کو جس قدر شوق و ذوق اور دلچسپی رہی اس کا مختصر ذکر اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان علوم و فنون کے حصول کے لیے انھوں نے کس قدر کاوشیں اور سعی و جہد کی اور اس کو ترقی دے کر ایک نیا رنگ و روپ دیا اور کتنے نئے گوشے معلومات کے پیدا کر کے ان کو بامِ عروج تک پہنچایا سچ تو یہ ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کے صاحب ذوق اور علم کے شیدائی بیٹے مامون الرشید کی سعی اور سرپرستی نے فضلائے اسلام کے لیے بہت آسانیاں فراہم کیں اور ان کے شوق علمی کی تکمیل کے لیے سروسامان مہیا کیا اور ان کی قدر افزائی کی۔ علم کے اس شیدائی (مامون) کی قدر افزائی کا ایک واقعہ ابن اصیبعہ نے طبقات الاطبا، میں حنین بن اسحاق کے بیان میں لکھا ہے کہ:

> "مامون الرشید حنین بن اسحق کو معاوضے کے طور پر اس کی ہر کتاب کے عربی ترجمہ کرنے پر اس کتاب کے برابر وزن کر کے سونا دیا کرتا تھا۔"

مامون کا یہ سلوک اور انعام و اکرام دوسرے اہل علم کے لیے بھی عام تھا۔ علم کی سرپرستی اور قدر دانی کا شیوہ کم و بیش دوسرے اہل ذوق خلفا، اور امراء میں بھی پایا جاتا تھا۔ قرطبہ میں الحکم ثانی کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں تھیں جن میں چوالیس جلدیں تو صرف فہرست کتب پر مشتمل تھیں۔ اس کے برعکس الحکم ثانی کے چار صدیوں بعد جب چارلس عاقل شہنشاہ فرانس نے شاہی کتب خانے کی بنیاد ڈالی تو بہ مشکل صرف نو سو کتابوں سے زیادہ جمع نہیں کر سکا اور ان میں مذہبی کتابوں کی ایک الماری بھی نہ تھی۔ ابن السبندی جو ۴۳۰ء میں قاہرہ میں مقیم تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ

> "اس شہر کے ایک کتب خانے میں دو کرۂ سماوی اور چھ ہزار کتابیں، صرف فن ریاضی اور ہیئت کی تھیں۔"

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک کتب خانے میں صرف فن ریاضی اور ہیئت کی اس قدر کتابیں تھیں تو دیگر علوم فنون کی کتابوں کی تعداد کس قدر ہوگی۔ بلاشبہ لاکھوں ہوں گی۔ بغداد کے کتب خانوں کا بھی یہی حال تھا کہ وہاں تو روم و یونان کے علمی ذخائر اونٹوں پر لد لد کر

---

* غازی پور لاج، سرسید نگر، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲ یو۔پی۔

مبصر اور ناقد فن تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو الکندی کے مطالعہ میں نہیں آئی ہو یا جس پر الکندی نے خود کچھ یاد داشتیں نہ تحریر کی ہوں۔ یہ یاد داشتیں بڑی علمی اور معلومات پر مشتمل تھیں

عام مسلمانوں کو حصول علم کا کس قدر شوق تھا اس کے متعلق ایک دو واقعات ملاحظہ ہوں

سند بن علی نامی ایک شخص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس کو المجسطی پڑھنے کا بے حد شوق تھا مگر اس شوق کی تکمیل کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے کسی طرح یہ کتاب حاصل کی اور پھر ایک گوشۂ تنہائی میں یہ تہیہ کر کے اس طرح بیٹھا کہ کھانے پینے کا ہوش نہ رہا۔ بغیر کسی کی مدد اور رہنمائی کے محض اپنی ذاتی کاوش سے اس پر پورا عبور حاصل کر لیا اور جب اس نے اپنے دور کے فنون ریاضی کے مشہور و مستند استاد عباس بن سعید الجوہری کو دکھایا تو اس کو یقین نہیں آیا کہ یہ ایک نوجوان طالب علم کا کارنامہ ہو سکتا ہے لیکن جب اس نے سند بن علی کا امتحان لیا تو اس کی ذہانت اور محنت کا قائل ہو گیا۔ بنو موسیٰ (موسیٰ بن شاکر کے لڑکوں کا لقب) میں سے چھوٹا بھائی حسن جس نے پوری اقلیدس کبھی نہیں پڑھی تھی مگر ہندسہ کے مسائل تربیع دائرہ، تثلیث زاویہ اور تضعیف مکعب کے حل میں اس قدر منہمک رہتا تھا کہ دنیا کا ہوش نہ رہتا تھا۔ اس کی کتاب "مساحۃ الاشکال البسیطۃ والکرویۃ" اس فن میں مشہور رہی ہے۔ یہ مثالیں ذاتی شوق و کاوش اور جستجوئے علم کی ہیں جن میں انھوں نے اپنی تمام تر توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کر دیں اور اپنے مطلوبہ مقصود کو حاصل کر کے ہی چھوڑا۔ اسی کو "خود آموزی" کہتے ہیں اور جوش و ولولہ اور تعمق فکر بھی اور عبقریت تو نمایاں ہی ہے۔ صاحب علم و فضیلت کی قدر و منزلت کا ایک واقعہ بھی بطور مثال پیش ہے۔ ثابت بن قرہ صابی فرقے سے تعلق رکھتا تھا مگر معتضد باللہ خلیفہ اس کے علم و فضل کا اس درجہ قدردان اور اس کا احترام کرتا تھا کہ ایک دن باغ میں اس کے ساتھ بے تکلفی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے چہل قدمی کر رہا تھا کہ اچانک اس نے ثابت کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ثابت خوفزدہ ہو گئے کہ معلوم نہیں کیا خطا ہوئی ہے۔ خلیفہ معتضد نے کہا:

"خوف نہ کرو، میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ کے اوپر تھا میں نے یہ بات پسند نہ کی کہ اہل علم کا ہاتھ نیچے ہو اور میرا اوپر ہو"

یہ تھی علم کی توقیر و عظمت جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

چند مصنفین اور ان کی علمی تصانیف کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان فضلا اور حکما کی خدمات اور ان کی کاوشہائے پیہم کی روداد و احوال اور ان کی قابل قدر تصانیف وغیرہ کے متعلق بہت سے اہل علم حضرات نے مستقل معلومات افزا کتابیں لکھی ہیں جن کے مطالعے سے ان فضلا اور حکما کی بلند مرتبت شخصیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ چند مصنفین اور ان کی گراں قدر تصانیف کے نام پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ جمال الدین ابن القفطی کی تاریخ الحکماء
۲۔ ابن ندیم کی الفہرست
۳۔ ابن ابی اصیبعہ کی عیون الانباء فی طبقات الاطباء
۴۔ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون
۵۔ ابن جلجل کی طبقات الاطباء والحکماء
۶۔ ابن خلکان کی وفیات الاعیان
۷۔ بیہقی کی تتمہ صوان الحکمۃ

اور آخری دور میں ہندوستان میں

۸۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی مآثر الکرام

قافلوں کی صورت میں پہنچتے تھے۔ ابن ندیم کی کتاب الفہرست ابن اصیبعہ کی طبقات الاطبا، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور اس طرح اور کئی کتابوں میں جو کئی جلدوں میں مختلف علوم وفنون کے تعارف و تفصیل میں ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ سب عربوں کے علمی ذوق وشوق کو ظاہر کرتی ہیں۔ بقول فاضل موسیو سدی یو:

"مسلمانوں نے ایشیا اور یورپ میں
اس وقت علم و سائنس کی روشنی پھیلائی
جب یورپ میں جہالت کا گھٹا ٹوپ
اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ امویوں نے دمشق
میں اور انھیں کی ایک شاخ نے اندلس
پہنچ کر وہاں اور عباسیوں نے بغداد میں
اور فاطمیوں نے قاہرہ میں علوم وفنون
کو ترقی و سرپرستی اور فروغ دیا۔"

ان کوششوں اور سرپرستی کی ایک ہلکی سی جھلک موجودہ صدی میں، حیدرآباد دکن کے آخری فرمانروا سلطان العلوم میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے قائم کردہ دارالترجمہ میں نظر آتی ہے، جہاں سے بے شمار نایاب و نادر اور متون کتابوں کی اشاعت و فروغ کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور جو آج بھی کم و بیش جاری ہے۔ مسلمانوں کو علوم و فنون سے کس درجہ دلچسپی اور شوق تھا۔ اس کے متعلق ایک دوسرے فاضل گبن فرماتے ہیں کہ:

بغداد کے سلطان کے ایک وزیر نے وہاں
مدرسے کے واسطے دو لاکھ دینار وقف
کیے اور پچاس ہزار دینار سالانہ دیگر
اخراجات کے لیے اس مدرسے پر درجے
کے چھ ہزار طلبا مختلف اوقات میں
بہرہ مند ہوئے۔

ابن جبیر ۱۱۸۴ء میں بغداد پہنچا تو اس وقت شہر کے صرف مشرقی حصے میں تیس بڑے بڑے دارالعلوموں کی شاندار عمارتیں اور ایوانات دیکھ کر محو حیرت ہو گیا تھا۔ ابن جبیر نے اپنے سفرنامے میں بغداد کے احوال میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اسپین میں خلیفہ الحکم المستنصر الدین اللہ کا زمانہ آیا تو اس نے اندلس کو تمام دنیا کے علوم وفنون سے معمور کر دیا۔ الحکم ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس نے بلاد مشرقیہ میں ہر مقام پر اپنے گماشتے مقرر کیے تاکہ جس قدر نایاب کتابیں جہاں سے مل سکیں اس کے کتب خانے کے واسطے فراہم کریں۔ اس نے کوشش کی کہ جو نادر تصنیف ممالک مشرقیہ میں لکھی جائیں، وہ بغداد سے پہلے اندلس میں اس کے پاس پہنچ جایا کریں۔ چنانچہ جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ علامہ ابوالفرج اصفہانی "کتاب الاغانی" تصنیف کر رہے ہیں تو الحکم کے گماشتوں نے کتاب کے مکمل ہونے سے پہلے، ایک ہزار اشرفیاں مصنف کو پیش کیں کہ کتاب مذکور کا پہلا نسخہ جو تیار ہو وہ الحکم کے شاہی کتب خانے کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ اس زمانے میں اندلس کا خراج پانچ کروڑ سے زیادہ تھا۔ باوجود اس کے الحکم کے علمی ذوق کے لیے وہ کافی نہ تھا۔ بقول علامہ مقریزی صاحب 'نفح الطیب' وہ تمام ممالک اور اطراف سے کتابیں حاصل کرتا تھا۔ یہاں تک کہ شاہی خزانہ ان مصارف کو برداشت نہ کر سکا۔ معلوم ہے کہ اس کا سالانہ خراج پانچ کروڑ تھا اور اس قدر کثیر رقم بھی کم پڑتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے شوق علمی کے آگے ہارون اور مامون کے کارنامے ماند پڑ گئے۔ الحکم نے جو کتب خانہ جمع کیا تھا اس کی وسعت و کثرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف عربی دیوانوں کی تعداد اس قدر تھی کہ اس کی فہرست اسی صفحات پر مشتمل تھی۔ کل کتابوں کی تعداد بقول علامہ مقریزی چار لاکھ تھی اور یہ تمام تر منتخب اور نادرۂ روزگار کتابیں تھیں۔ رطب و یابس کا انبار نہ تھا۔ الحکم خود بڑا صاحب علم و فضل اور نہایت

۹۔ مولانا نواب صدیق حسن خاں قنوجی کی ابجد العلوم

۱۰۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی کی نزہۃ الخواطر (آٹھ جلدیں)۔ اس کتاب میں ہزاروں ہندوستانی علما و فضلا اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے اعیان و مشاہیر کی تاریخ اور سوانحی حالات ہیں۔ یہ بے حد معلومات افزا اور مفید کتاب ہے۔

۱۱۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی کی کتاب "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" بے حد قابل قدر اور مختصر ہونے کے باوجود اپنے فن سے متعلق شاہکار ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے جس کا نام "الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند" جس کو المجمع العلمی دمشق نے شائع کیا تھا۔ یہ ہندوستان کی علمی تاریخ ہے اور گویا ایک مکمل ڈائرکٹری کی حیثیت رکھتی ہے۔

الغرض! ان کتابوں میں کوئی تو اشخاص کی علمیت الاختصاصات پر کوئی علوم و فنون کی تاریخ و تعارف اور کوئی فن کے متعلق اور کوئی فضلائے اسلام کی تصانیف کے تعارف و بیان میں بے مثل خزینہ ہیں ان فضلا و حکما کی کاوشوں اور تحقیق و جستجو نے جو یادگاریں اور نقوش چھوڑے ہیں، اس بحر زخار میں سے چند قطرے بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ ان سب کی علمی خدمات کا احاطہ اور بیان اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ بہر صورت ان کی خدمات سے آج بھی دنیا فیض یاب ہو رہی ہے اور ان کو نظر انداز کرنا کسی دانش ور کے لیے خارج از امکان ہے۔

"ہر ضلع میں جس قدر مسلمان آباد ہیں اگر ہر ایک شخص تھوڑا تھوڑا روپیہ بھی دو دو ٹکے ایک بلکہ آٹھ آنے تک دے تو ہر ضلع میں اس قدر روپیہ جمع ہو جاتا ہے کہ ان تمام مطالب کے لیے ایک نہایت عمدہ مستقل مدرسہ قائم ہو سکتا ہے صرف لوگوں کا ارادہ کرنا اور اس کام کے انجام کرنے پر دل سے کوشش کرنا شرط ہے۔"

سرسید

ماحولیاتی آلودگی اور اسلام

واجد حسین ▽

اس سے قبل کہ ہم ماحولیاتی آلودگی کا جائزہ اسلام کے نقطۂ نظر سے لیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ماحولیاتی آلودگی کے معنیٰ و مفاہیم اچھی طرح سمجھ لیں۔

ماحولیاتی آلودگی: معنیٰ و مفہوم

ماحولیاتی آلودگی دو الفاظ کا مرکب ہے ماحولیاتی اور آلودگی۔ لفظ ماحولیاتی فارسی زبان کا ہے جو ماحول سے بنایا گیا ہے۔ ماحول کے معنیٰ گرد و پیش کے ہیں۔ لفظ آلودگی بھی فارسی زبان کا ہے جس کے معنی پراگندگی، پلید اور نجس کے ہیں۔ لہٰذا ماحولیاتی آلودگی کا مطلب ہے گرد و پیش کا پراگندہ ہونا، نجس ہونا اور پلید ہونا۔

ماحولیاتی آلودگی اور پاکیزگی:

انسان کے گرد و پیش خواہ پانی ہو یا فضا یا دیگر سامان زیست ان کو پراگندہ اور نجس نہیں کرنا چاہیے یعنی پاکیزگی اختیار کرنا چاہیے۔ اگر انسان اپنے گرد و پیش کو پراگندہ کرتا ہے تو اس کا یہ عمل مخلوقات کی زندگی کے لیے خطرے کی علامت بن جاتا ہے۔ کیونکہ مخلوقات کی زندگی کے لیے صاف پانی اور پاک فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آسمان کو پراگندہ کر دیا جائے تو مخلوقات کی زندگی اس کرۂ ارض میں کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ لہٰذا اللہ نے اس بارے میں حکم دیا:

"اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے پسند ہیں۔"

(سورۃ التوبہ: ۱۰۹)

اسی طرح اللہ کے رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دین کی بنیاد صفائی پر ہے۔"

دین اسلام دنیا کو پاکیزگی اور صفائی کی تعلیم دیتا ہے چنانچہ پاکیزگی چاہے ظاہری ہو یا باطنی۔ اعضاء کے متعلق ہو یا گرد و پیش کے، ہر صورت میں انسان کو پاکیزگی اور صفائی مدنظر رکھنی چاہیے۔ پراگندگی انسانی زندگی کے لیے بے حد مضرت رساں ہے۔ جس طرح اعضاء کی گندگی جسم کو بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے، اسی طرح خود غرضانہ خیالات روح کو پلید کر دیتے ہیں۔ اور ماحولیاتی آلودگی مخلوقات کی زندگی کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ اسی لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ روحانی جسمانی اور ماحولیاتی آلودگی سے بچنے اور پاکیزگی اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

▽ شعبۂ قانون لائبریری، اے۔ ایم یو۔ علی گڑھ۔ یو۔ پی

"اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے پسند ہیں۔"

(سورہ التوبہ - ۱۰۸)

دنیا اور مخلوقات:

یہ دنیا تمام مخلوقات کے لیے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

"اور زمین کو اس نے مخلوق کے لیے مہیا کیا۔"

(سورہ الرحمٰن - ۱۰)

"زمین کی ساری چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں۔" (سورہ البقرہ ۲۹)

"وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون، کھجور، انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔"

(سورۃ النحل : ۱۱)

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے ترو تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو۔"

(سورہ النحل : ۱۴)

مخلوقات اللہ کی پیدا کردہ ان چیزوں کو اسی وقت استعمال کر سکتی ہے کہ ان میں زندگی باقی رہے اور زندگی کے لیے لازم ہے کہ ان کو مناسب فضا، پانی اور حرارت ملے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے لیے قدرتی ماحول کو اس تناسب اور توازن سے پیدا کیا جس میں اگر پراگندگی پیدا نہ کی جائے تو زندگی قائم رہ سکے۔

قدرتی ماحول اور زندگی:

اللہ تعالیٰ نے قدرتی ماحول کو اس تناسب و توازن کے ساتھ پیدا کیا جس میں مقررہ مدت تک کے لیے تمام مخلوق زندہ رہ سکیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اس قدرتی ماحول کے بارے میں فرماتا ہے:

"تم اپنے رب برتر کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا۔"

سورۃ الاعلیٰ ۲،۱

یعنی قدرتی ماحول میں زندگی قائم رکھنے کے لیے جو گیس پیدا کیں وہ تناسب و توازن کے ساتھ پانی کو حیات بخش بنایا۔ نباتات اور سورج کی روشنی میں تناسب و توازن قائم کیا تاکہ حیات بخش بارش زمین کو زندگی بخشے اور چرند پرند اس سے فیض یاب ہو سکیں۔ مختصر یہ کہ قدرتی ماحول کو درست رکھنے کے لیے ہر چیز کو درست اور درست بنایا اور اس میں تناسب اور توازن قائم کیا۔ قدرتی ماحول میں گیسوں کا توازن اور تناسب اس طرح رکھا۔

نائٹروجن گیس ۷۸٪ مقدار میں پیدا کی۔
آکسیجن گیس ۲۰٫۹٪ مقدار میں پیدا کی۔
کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس ۰٫۰۴٪ مقدار میں پیدا کی۔
دیگر گیسیں ۰٫۹۶٪ مقدار میں پیدا کیں۔

ان گیسوں کے علاوہ زندگی قائم رکھنے کے لیے پانی اور حرارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی تناسب اور توازن کے ساتھ پیدا کیا۔

دعوتِ فکر:

اللہ تعالیٰ نے قدرتی ماحول کے بارے میں انسانوں کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے فرمایا:

"تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطگی
نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تمہیں خلل
نظر آتا ہے۔ بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری
نگاہیں تھک کر نامراد پلٹ آئیں گی۔"
(سورہ الملک ۳-۴)

یعنی اللہ نے تمام آلودگیوں سے پاک ماحول پیدا کیا تاکہ ہر جاندار زندگی کو صحت مندی کے ساتھ گزار سکے۔ ہمارا یہ اولین فرض ہونا چاہیے کہ ہم اپنے ماحول کو آلودہ نہ ہونے دیں ورنہ ساری مخلوقات کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

میزان میں خلل نہ ڈالو:

انسان بہت سے اعمال ایسے کرتا ہے جس کی وجہ سے قدرتی ماحول میں آلودگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے زندگی کو خطرہ پیدا ہو جاتا ہے جیسے مختلف ممالک کے مابین جنگ کی صورت میں بے تحاشہ بارود استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے فضا اور پانی میں آلودگی پیدا ہو جاتی ہے۔ امریکہ اور عراق کی جنگ کے دوران تیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا اور لاکھوں بیرل تیل سمندر میں چھوڑ دیا گیا جس کی وجہ سے آبی آلودگی پیدا ہو گئی۔ ایٹمی تجربات کرکے فضا اور پانی میں آلودگی پیدا کی جا رہی ہے بھاری انڈسٹریز فضا میں زہریلی گیسیں چھوڑ کر فضا میں آلودگی پیدا کر رہی ہیں اور پانی میں کچرہ اور کیمیکل چھوڑ کر اس کو آلودہ بنا رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام افعال ایسے ہیں جو قدرتی ماحول میں خلل ڈال کر اس میں بے ربطگی پیدا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اس کرۂ ارض پر زندگی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے افعال جن کی وجہ سے قدرتی ماحول میں خلل پیدا ہو اہل دنیا کو کرنے سے منع فرمایا ہے:

"آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم
کیا۔" (سورہ الرحمٰن: ۷)

لہٰذا

"اس کا تقاضا ہے کہ تم میزان میں خلل
نہ ڈالو۔" (سورہ الرحمٰن: ۹)

اگر قدرتی ماحول کے میزان میں خلل ڈالا گیا تو اس کے نتائج بہت خطرناک ثابت ہوں گے۔ ضروری ہے کہ اقوام متحدہ ایسے ہتھیاروں پر پابندی عاید کرے جس کی وجہ سے فضا اور پانی میں آلودگی پیدا ہوتی ہے۔ نیوکلیائی تجربات پر پابندی عاید کی جائے۔ جنگ کی حالت میں بارود کا استعمال ختم کیا جائے۔ کیمیکل ہتھیاروں پر پابندی لگائی جائے۔ انڈسٹریز اور سیورز کے پانی کے لیے مناسب اقدام کیے جائیں تب ہی ماحول کو آلودگی سے بچایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان اور ماحولیاتی آلودگی

ہندوستان کے اندر این۔ آئی۔ ای۔ آر۔ ٹی بنگلور نے آبی آلودگی کا سروے کرنے کے بعد اپنی رپورٹ میں انکشاف کیا ہے:

"ہندوستان کا ۷۰٪ پانی آلودگی سے
ناقص ہو چکا ہے۔ اس پانی کے استعمال
سے مزدور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے
ہیں۔ اس کی وجہ سے ہر سال ۳،۷ لاکھ
مزدوری کے دن (WORKING DAYS)
ضایع ہو جاتے ہیں۔ ۶۰ کروڑ
روپیہ سالانہ کا نقصان ہو جاتا ہے۔"

ENVIRONMENT & LAW
BY
LEELA KRISHNA

لوک سبھا میں نائب وزیر صحت نے آبی آلودگی کے مضر اثرات بتاتے ہوئے کہا:

"ہندوستان میں آبی آلودگی سے ۱۵ لاکھ بچے مرجاتے ہیں"

(روزنامہ جاگرن ۲۳ اگست ۲۰۰۰ء)

و کے ساتھ ساتھ

"۲½ کروڑ لوگ فلورائڈ پانی پینے سے کبڑے ہوگئے ہیں"

روزنامہ جاگرن ۲۶ اگست ۲۰۰۰ء

ماحولیاتی آلودگی کو روکنے کے لیے ۱۹۸۶ء میں [illegible]ن منٹ نے ایکٹ وضع کیا ہے۔ فضا میں آلودگی کی [illegible] بھوپال گیس المیہ ہمارے سامنے موجود ہے جس [illegible] ہوکر ہزاروں افراد لقمہ اجل ہوگئے اور اتنے ہی [illegible] اپاہج ہوگئے۔ اگر دنیا میں فضا میں آلودگی کو [illegible] روکا گیا تو یہ ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ [illegible] انسانوں کو قدرتی ماحول کے میزان کو نہیں بگاڑنا چاہئے۔ اس کے علاوہ لوگ پیڑوں کو کاٹ کر جنگلات کو ختم کرکے سورج کی حرارت اور نباتات کا تناسب و توازن بگاڑ رہے ہیں۔ اس کا توازن بگڑنے کی وجہ سے موسموں پر [illegible] پڑ رہا ہے۔ طوفان آرہے ہیں، سوکھا پڑ رہا ہے۔ زمین کی زرخیزی برباد ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان تمام مصیبتوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کو ماحولیاتی آلودگی سے بچایا جائے۔ یہ تب [illegible] ممکن ہو سکتا ہے [illegible] جب دنیا اس زریں [illegible] اصول پر عمل کرے:

"میزان میں خلل نہ ڈالو۔"

سورہ رحمٰن ۹

اسلام کی جانب پیش قدمی

آج دنیا کو ماحولیاتی آلودگی سے بچانے کا عمل ہو رہا ہے جس کا حکم قرآن حکیم میں ۱۴۰۰ سال قبل اہل دنیا کو دیا گیا:

"میزان میں خلل نہ ڈالو"

سورہ رحمٰن ۹

آج دنیا اسی زریں اصول کی جانب آ رہی ہے۔ ۵ جون ۱۹۹۱ء سے اقوام متحدہ ہر سال عالمی ماحولیات

WORLD ENVIRONMENT DAY

مناتی ہے۔ دنیا کے سبھی ممالک اب اپنے ملک کو ماحولیاتی آلودگی سے محفوظ رکھنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کر رہے ہیں۔ یو۔ این۔ ڈی۔ پی نے عوام کو بیدار کرنے کے لیے ایک خوبصورت نعرہ دیا ہے جس پر یہ صادق [illegible] ہے

DON'T [illegible] OUR [illegible]

[illegible]

ماحولیاتی آلودگی سے دنیا کو محفوظ رکھنے کے لیے عالمی تنظیم بھی ترقی پذیر ممالک کو مالی مدد دے رہا ہے لہذا لوگوں کو چاہیے کہ عقل سے کام لے کر اس دنیا کو ماحولیاتی آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ درحقیقت وہی لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ دنیا میں ماحولیاتی آلودگی پیدا کرتے ہیں جیسا کہ قدرت نے اس [illegible] بارے میں فرمایا ہے۔ [illegible] قدرت کا طریقہ [illegible] ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی [illegible] ڈال دیتا ہے۔

سورہ یونس [illegible]

[illegible] اسی لئے ہی لوگ ماحولیاتی آلودگی پیدا کرتے ہیں جو عقل کا استعمال نہیں کرتے۔ لہذا امریکہ اور

"زمانہ حال میں جس قدر مسلے [illegible] کے موجود ہیں ان میں وہی نقص ہے جس کے سبب ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں اسباب تعمیر مہیا نہیں ہوتے اور عموماً تعلیم کا رواج باوجود بے انتہا کوشش اور سعی کے نہیں ہوتا ہے۔"

[illegible]

کے حلیفوں نے ناعقلی کا ثبوت دے کر گلف میں ماحولیاتی آلودگی پیدا کر کے دنیا کو مصیبت میں ڈال دیا۔ درحقیقت ماحولیاتی آلودگی اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئی بلکہ ناعقلوں نے پیدا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی فرد کو مصیبت میں ڈال کر اس پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ احکامِ الٰہی سے انحراف کر کے خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

> "اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا اور خود ہی لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔"
>
> سورۂ یونس: ۴۴

"میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے کہ جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے۔ یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوب صورت شخص کو دیکھا، مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۱۰، ش ۹ (ستمبر ۹۱)

ضلع بدایوں کے پانچ مسلم جونیئر ہائی اسکولوں میں پچھلے ایک سال کے دوران

مسلمان کتنے پیچھے گئے

احمد رشید شیروانی ▽

اب تک یہ بات تو تقریباً ہر ایک کو معلوم ہو گئی ہے کہ ہندوستان میں مسلمان تعلیم میں دوسروں سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ [illegible] مسلمان تعلیم میں آگے بڑھ رہے ہیں، یا مزید پیچھے ہو رہے ہیں۔ اگر آگے بڑھ بھی رہے ہیں تو کس رفتار سے؟ کیا غیر مسلموں کے آگے بڑھنے کی رفتار اور مسلمانوں کے آگے بڑھنے کی رفتار یکساں ہے؟ [illegible] ہمارے لوگ اکثر پوچھتے ہیں اور پوچھنے کی بات بھی ہے مگر اس سے [illegible] یہ سوال ہر [illegible] مسلمانوں کو [illegible] کہ ہر شہر، قصبے یا گاؤں یا اس کے علاقے میں مسلم بچے تعلیم میں کس رفتار سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ [illegible] خود دلّی کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کی بات [illegible] پوچھیں تو کیا لیڈروں میں کبھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے نہیں۔ بلکہ میں بھی کبھی [illegible] جب ہوں تو کچھ حضرات آکر مجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت اب کیسی ہے؟ میں تنگ آکر یہ کہہ دیتا ہوں کہ اگر واقعی آپ کو دلچسپی ہے تو آپ جس جگہ بھی رہتے ہیں شہر، قصبے یا گاؤں، محلے وغیرہ میں خود جا کر [illegible] وہاں مسلمانوں کی تعلیمی حالت معلوم کیجیے، اور اگر آپ کو دلچسپی نہیں ہے تو پھر مجھ سے کبھی یہ مت پوچھئے۔ مسلمان تعلیم میں آگے بڑھ رہے ہیں یا پیچھے ہو رہے ہیں [illegible] کھوج لگا لیجیے۔

بدایوں میں کیا ہوا؟

میرے ایک دوست نے بدایوں کے قریب پانچ مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کی ۱۹۹۰ء کے رزلٹ کے بارے میں تحقیق کی۔ [illegible] رزلٹ سے [illegible] شہر و قصبے کے پانچ مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کے سنہ ۱۹۸۹ اور ۱۹۹۰ کے امتحانات میں مسلم لڑکیوں اور مسلم لڑکوں کے نتائج چارٹ میں [illegible] مندرجہ ذیل ہیں۔ ۱۹۸۹ میں ان سب اسکولوں سے [illegible] امتحان میں شریک ہوئے تھے اور ماشاء اللہ سب کے سب ہی سو فیصد پاس ہو گئے تھے اور [illegible] فیصد فرسٹ [illegible]

▽ ۱۲- اے کیننگ پلیس، نئی دہلی۔

تھے ۔ پھر کیا ہوا؟ ۱۹۹۱ء میں انہی سب اسکولوں سے ملا کر ایک سو تین مسلم طلبا و طالبات امتحان میں شریک ہوئے اور ایک سو ایک یعنی اٹھانوے فیصد پاس ہوئے اور چھپن عدد یعنی قریب چون فیصد فرسٹ ڈویژن لائے ۔ تو پھر کیا پتہ چلا؟ شریک ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ایک سو ایک سے بڑھ کر ایک سو تین ہو گئی ۔ دو عدد یا دو فیصد کا اضافہ ہوا آپ فرمائیں گے ماشاءاللہ ۔ جی ہاں بالکل ۔ بلکہ ساتھ میں الحمدللہ ۔ جزاک اللہ اور چشم بد دور بھی ۔

لیکن سب لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی آبادی ماشاءاللہ ہر سال قریب تین فیصد بڑھ جاتی ہے ۔ اس لیے اگر مسلمان کسی جگہ کسی سطح پر تعلیم میں ایک سال میں تین فیصد آگے آئیں تو یہ کہا جائے گا کہ صرف آبادی کے تناسب سے اضافہ ہوا ۔ درحقیقت مسلمان نہ آگے بڑھے ہیں نہ پیچھے گئے ہیں بلکہ وہیں کے وہیں ہیں جہاں پچھلے سال تھے ۔ اگر مسلمان ایک سال میں صرف دو فیصد آگے آئیں تو پھر مجبوراً ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ آبادی میں اضافے کے لحاظ سے مسلمان جہاں تھے وہاں سے ایک فیصد پیچھے اور چلے گئے اور پھر امتحان میں پاس ہونے والے مسلمانوں کی تعداد وہی ایک سو ایک رہی چونکہ آبادی بہرحال تین فیصد بڑھ گئی ہوگی ، اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ امتحان پاس ہونے کے معاملے میں مسلمان گزشتہ سال کی بہ نسبت کم از کم تین فیصد پیچھے اور چلے گئے

جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان

۱۹۹۰ء شریک و پاس	۱۹۹۰ء فرسٹ ڈویژن تعداد	فیصد	اسکول کا نام و مقام	۱۹۹۱ء شریک امتحان	پاس تعداد	فیصد	فرسٹ ڈویژن تعداد	فیصد
			مسلم لڑکیاں					
١١	٩	بیاسی	رحمانیہ بدایوں	٢٣	٢٣	سو	١٦	ستر
١٤	٨	ستاون	سید منور علی بدایوں	١٩	١٩	پچانوے	٧	سینتیس
٩	٢	بائیس	جعفری بیگم میموریل سنگرام پور	٢	٢	سو	-	صفر
-	-	-	مومن انصار سبھوان			سو	-	صفر
٣٣	١٩	اٹھاون	چار میں مسلم لڑکیاں	٤٥	٤٤	اٹھانوے	٢٣	اکیاون
			مسلم لڑکے					
-	-	-	سید منور علی بدایوں	١	١	سو	١	صفر
٣٥	٢٩	اسی	آزاد ککرالہ ککرالہ	٢٢	٢٢	سو	١٩	چھیاسی
٣٣	٣	[illegible]	جعفری میموریل سنگرام پور	١٩	١٨	چورانوے	٩	سینتالیس
١٠	-	صفر	مومن انصار سبھوان	١٦	١٦	سو	٥	اکتیس
٦٩	٣٢	سینتالیس	چار میں مسلم لڑکے	٥٨	٥٠	اٹھانوے	٣٣	ستاون
٠١	٥١	باون	پانچ میں مسلم لڑکے و لڑکیاں	١٠٣	١٠١	اٹھانوے	٥٦	چون

اب جو لوگ محض تفریحاً پوچھتے ہیں کہ "بتلایئے مسلمان آگے بڑھے یا پیچھے گئے؟" ان کے لیے تو یہی جواب کافی ہے کہ پیچھے گئے۔ لیکن جن لوگوں کو مسلمانوں کی تعلیم کے فروغ میں کچھ حقیقی دلچسپی ہے (یعنی یہ محض اتفاق سے جن کو ہو) وہ چاہیں تو کچھ اور گہرائی سے دیکھ سکتے ہیں۔ بہت زیادہ "گہرائی" میں جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ موٹے طور پر چارٹ ہی میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ بورڈ امتحان میں شریک مسلم لڑکیوں کی تعداد تینتیس سے بڑھ کر پینتالیس ہو گئی۔ بارہ عدد کا اضافہ چھتیس فیصد ہے اور ایک سال میں یہ اضافہ بہت کافی ہے۔ مگر شریک ہونے والے مسلم لڑکوں کی تعداد اسی سال کے دوران اڑسٹھ سے گھٹ کر اٹھاون رہ گئی۔ دس عدد کی یہ کمی پندرہ فیصد ہے۔

کچھ غم خوارِ ملت

جب بھی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذکر ہو کچھ لوگ فوراً بڑی سرد آہ بھر کر بہت ہی دردمندانہ انداز میں فرمانے لگتے ہیں کہ

"مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی بدحالی راہ میں حائل ہے۔"

لیکن جہاں مسلم لڑکیاں ایک سال میں چھتیس فیصد آگے بڑھیں وہاں اسی عرصہ میں مسلم لڑکے اسی سال کے دوران پندرہ فیصد پیچھے ہٹ گئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہاں مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی بدحالی مسلم لڑکیوں کی راہ میں کیوں حائل نہیں ہوئی۔ صرف مسلم لڑکوں کی راہ میں کیوں حائل ہوئی۔

کچھ اور "غم خوارِ ملت" قسم کے لوگ یہ رونا رونے لگتے ہیں کہ

"آہ ہندوستان میں مسلمان کا وجود ہی خطرے میں ہے۔ مسلمان بیچارہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ وہ اگلی سانس تک زندہ رہے گا یا کوئی اسے مار ڈالے گا۔ تو پھر وہ بیچارہ تعلیم میں آگے کیسے آئے؟"

میں پوچھوں گا کہ یہ خطرہ بدایوں کی مسلم لڑکیاں بالکل محسوس نہیں کرتیں۔ صرف مسلم لڑکوں کو یہ خطرہ ہر وقت ڈراتا رہتا ہے؟

بے شک جیسے کہیے وہ (خواہ کتنے ہی بڑے) مسلم ہمدرد اور ہمدردِ ملت قوم دوستی کے جذبے سے سرشار و معمور ہونے ہوں، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے جواز (بلکہ میں تو کہوں گا بہانے) تلاش کرکے بیان کرتا رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی بدحالی یقیناً مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کی جان کو ہر وقت خطرہ لاحق ہونا حقیقت ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تعصب و تفریق کا برتاؤ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اور ان سب باتوں کا ذکر ٹھیک ہے بلکہ عین کارِ ثواب۔ لیکن ان میں سے کسی بات کو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے جواز یا بہانے کے طور پر استعمال کرنا نہ صرف گمراہ کن ہے بلکہ بدترین قسم کی مسلم دشمنی ہے۔ کیونکہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جہاں مسلمان ذرا سی کوشش کرتے ہیں، تھوڑی سی بھی کاوش و جد و جہد کی جاتی ہے وہاں مسلمانوں کے بچے ماشاء اللہ تیزی سے آگے بڑھتے ہیں۔ بیشک جہاں مسلمان غفلت و لاپرواہی برتتے ہیں وہیں ان کے بچے تعلیم میں آگے آنے کی بجائے پیچھے جاتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے حقیقت یہی ہے۔

هر جگہ الگ الگ۔

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم لڑکیوں کی ٹوٹل تعداد میں اضافہ ہوا ہے تو ہر جگہ اضافہ ہوا ہوگا۔ بدایوں شہر کے دو اسکولوں

میں ملا کر مسلم لڑکیوں کی تعداد (ایک میں گیارہ اور دوسرے میں چودہ یعنی کل پچیس سے بڑھ کر (ایک میں تیئیس اور دوسرے میں انیس یعنی کل) بیالیس ہو گئی۔ ڈیڑھ گنی سے بھی زیادہ مگر سنگرام پور کے اسکول میں مسلم لڑکیوں کی تعداد آٹھ سے گھٹ کر صرف دو رہ گئی یعنی چوتھائی۔

اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ مسلم لڑکوں کی تعداد ہر جگہ ضرور بالضرور گھٹ گئی ہو۔ گڑہ میں بتیس سے گھٹ کر بائیس رہ گئی اور سنگرام پور میں تیئیس سے گھٹ کر انیس رہ گئی۔ مگر سبھن میں دس سے بڑھ کر سولہ ہو گئی۔ گویا یہیں مسلمان آگے بڑھتے ہیں جبکہ پیچھے جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم عمومی وجوہات گنوانے لگیں ہمیں خصوصی طور پر جہاں مسلم بچے کسی سطح پر کسی سال تعلیم میں پیچھے جائیں وہاں اس کی وجوہات معلوم کرنی چاہیے اور پھر اس تشویش ناک رجحان (یعنی کسی سطح پر مسلم بچوں کی تعداد گھٹنے کے خطرناک رجحان) کو روکنے اور پلٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ کام ظاہر ہے خصوصاً ان اسکولوں کے عہدے داران وغیرہ کو کرنا ہوگا جن کے اسکول میں مسلم بچے تعلیم میں پیچھے گئے ہیں۔

" ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا۔ مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ نیک آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ ذلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجے سے اوپر ہیں انہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے "

سرسید

ترقی پذیر ممالک کی خواتین اور سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم

عبدالرؤف نوشہروی*

جنگ عظیم دوم کے بعد تیسری دنیا کے ممالک میں سیاسی اور معاشرتی بیداری کی ایک رو چلی جس کے باعث عورتوں کو سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی میدانوں میں قدم آگے بڑھانے کا موقع ملا اور ایک وقت ایسا آیا کہ پاکستان، بھارت، فلپائن اور سری لنکا میں عورتیں سربراہ مملکت اور وزارت عظمیٰ کے عہدے تک پہنچیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب مہنگائی بڑھنی شروع ہوئی نتیجہ میں ترقی یافتہ ممالک کی طرح تیسری دنیا کے ممالک میں بھی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بھی گھر سے باہر نکل کر ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ ان ممالک میں مزدور طبقہ میں عورت کا روزمرہ مزدوری کے حساب سے کام پر جانے، کھیتوں پر کام کرنے، یا دیگر کاموں میں مرد کا ہاتھ بٹانے کا رواج تو عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ اس طرح عورت کا معیار زندگی بھی بہتر ہوا، ان کی تعلیم بھی زنگ آلود ہونے سے بچ گئی۔ ساتھ ساتھ بحیثیت تربیت یافتہ فرد کی قوت ملکی ترقی میں وہ ممد و معاون ثابت ہوئیں۔

موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے لہٰذا قومی سطح پر ایک باعزت زندگی گزارنے کے لیے اور اگر ہو سکے تو ترقی یافتہ دنیا کی (اگر سبقت نہیں تو) برابری کرنے کے لیے ترقی پذیر ممالک کو سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں مہارت حاصل کرنے کی خاطر اپنی کوششوں کو کئی گنا بڑھانا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے صنف نازک کی شرکت کے بغیر جو آبادی کا نصف حصہ ہیں حقیقی کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی۔ تعلیم نسواں کے سلسلے میں ترقی پذیر ممالک میں دو قسم کے رویے عام ہیں۔

۱۔ مخالف رویہ

بعض لوگوں کے نزدیک عورت کے فرائض گھر بار کی دیکھ بھال اور بچوں کی نگہداشت تک محدود رہنے چاہئیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی ان کا میدان نہیں کیونکہ عورتیں جسمانی لحاظ سے نیز طبعاً اس قسم کے کام کے لیے موزوں نہیں۔ نیز ان ممالک کا قدامت پسند معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ بہو بیٹیاں نوکری کر کے روزی کمائیں اور خاندان ان کا دست نگر ہو۔ بچوں اور میاں کی طرف بے توجہی البتہ ایک اور اعتراض ہے۔

۲۔ نیم روشن خیال طبقہ:

انہیں علیحدگی پسند بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں حصول تعلیم لڑکیوں کے لیے بھی ضروری ہے لیکن انہیں خصوصی روایتی زنانہ پیشوں کی تعلیم و تربیت

* ۶۶۸ بفرزون، کراچی، پاکستان

دی جائے۔ انھیں دوران ملازمت مردوں سے کسی قدر الگ رکھا جائے۔ اسلامی دنیا میں یہ سوچ عام ہے البتہ اس سلسلے میں مختلف ملکوں میں پابندیاں کہیں کم ہیں، کہیں زیادہ۔

۳۔ مغرب زدہ آزاد طبقہ :

ان کے خیال میں مرد و زن اپنی کارکردگی میں برابر ہیں۔ اس لیے لڑکیوں پر تعلیم کے حصول میں کسی قسم کی پابندی فضول اور بے جا ہے۔ یہ مغرب کی کورانہ تقلید کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مغرب میں اس نظام پر تنقید ہوتی رہتی ہے۔ وہاں بھی یہ اصول پوری طرح کارفرما نہیں۔ مثلاً اخبار کے ایڈیٹر یا ٹرام ڈرائیور کی ایک ہی پوسٹ کے لیے یا اس طرح عورت اور مرد کی تنخواہ میں فرق ہے۔

ترقی پذیر ملکوں میں یہ گروپ بھی مختصر ہے لیکن معاشی دباؤ کے تحت ان کی تعداد بڑھ رہی ہے اس لیے آپ کو ان ممالک میں انجینئرنگ اور زراعت جیسے مردانہ شعبوں میں نیز بطور پائلٹ بھی عورتیں مل جائیں گی۔

۴۔ چوتھا گروپ کسی قدر انتہا پسند ہے :

ان کے خیال میں کام کے تمام شعبے عورتوں کے لیے کھلے ہونے چاہیں۔ خواہ وہ تعلیم کا شعبہ ہو، ڈاکٹری ہو یا سائنس یا ٹکنالوجی وغیرہ مگر ان عورتوں کو ان ملازمتوں کے ساتھ ساتھ سماج کی طرف سے تفویض کردہ سوشل فرائض اور پابندیوں کو بھی قبول کرنا ہوگا ظاہر ہے اس طرح ان کی بچوں کی نگہداشت بطور والدہ اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ تعلق پر برا اثر پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے۔ دوسرے اس طرز عمل سے معاشرے میں نمایاں تبدیلیاں آجائیں یا لانی پڑیں گی۔

لہذا جہاں تک عورتوں کا سائنس کے مطالعے اور ٹکنالوجی سیکھنے کا تعلق ہے چاروں رویوں کو ستم ہے اور کوئی ایک بھی پوری طرح قابل عمل نہیں۔ کیوں کہ اس طرح نہ تو ترقی پذیر ممالک کے موجودہ مسائل حل ہوں گے اور نہ اُن کے خوش آئند مستقبل کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد فراہم کرسکیں گے عورتوں کے سائنس اور ٹکنالوجی میں حصہ لینے کے بارے میں ایک قابل عمل پروگرام چند دیگر لازمی امور پر غور و فکر کا بھی متقاضی ہے مثلاً

۱۔ تعلیم

جملہ طلبا سائنسی مطالعے کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ ہر معاشرے میں صرف کچھ ایسے لوگ ہوں گے جن کا سائنس کی طرف طبعی میلان ہوگا۔ اسی طرح لڑکیوں میں بھی انتخاب کرنا ہوگا اور صرف ان طالبات کو سائنس میں داخلہ لینا چاہیے جو سائنس کے لیے ذہنی صلاحیت اور طبعی میلان رکھتی ہوں۔ عورتوں میں عموماً صبر اور برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے یہ امکان زیادہ ہے کہ تحقیق کے صبر آزما میلان میں وہ زیادہ کامیاب نظر آئیں (بشرطیکہ دیگر تفکرات سے انھیں بھی آزاد رکھا جائے)

تیسری دنیا کے لوگوں میں البتہ یہ میلان ہے کہ وہ اپنے تمام ہونہار طلبا کو خواہ وہ پسند کریں یا نہ کریں ڈاکٹر یا انجینئر بنایا جائے۔ یہ کوشش کہ سب کو ڈاکٹر بنایا جائے لڑکیوں کی صورت میں بھی ترک کر دینی چاہیے۔ اب اگلا سوال لڑکے لڑکیوں کے مخلوط تعلیم حاصل کرنے کا ہے تیسری دنیا میں لڑکیوں پر تعلیمی پابندیوں نیز معاشرے میں موجودہ شکوک و شبہات کے مدنظر بہتر یہ ہے کہ ہائی اسکول اور کالج کی سطح پر طلبا اور طالبات کے لیے الگ الگ درس گاہیں قایم کی جائیں۔ عیسائی معاشرے کو شاید مخلوط تعلیم پر زیادہ اعتراض نہ ہو اگرچہ اس طرح انھیں بھی بعض مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ البتہ پوسٹ گریجویٹ سطح پر یعنی یونیورسٹی میں جہاں اعلی درجے

کی لیبارٹری اور دیگر سہولتیں درکار ہوتی ہیں مخلوط تعلیم کی
اجازت دی جا سکتی ہے کیونکہ اس عمر کی جوان لڑکے اور
لڑکیاں اگرچہ ان کی عمر زیادہ پختہ نہیں ہوگی تاہم اکثر و
بیشتر اپنی ذمہ داریاں اور نفع نقصان کو سمجھتے ہیں۔ اس
کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح لڑکیاں نسبتاً زیادہ تعداد
میں تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں گی۔ کیونکہ داخلے کے لیے
[illegible] ان کی امتحانی کارکردگی لڑکوں کی نسبت بہتر ہوتی ہے
پاکستان میں لڑکیوں کے جداگانہ میڈیکل کالج بھی ہیں
[illegible] مگر وہاں بھی باوجود مستند خواتین و اساتذہ کی موجودگی
کے پروفیسروں کو پسند کیا جاتا ہے۔

عورتوں کے ملازمتی شعبے (CAREER)

ترقی پذیر ممالک میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے عورتیں
کھیتی باڑی، تجارت، صنعت وغیرہ میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی
ہیں۔ یہ عورتیں روزانہ مزدوری پر بھی کام کرتی ہیں۔ [illegible]
[illegible] مردوں کے شانہ بشانہ [illegible] صنعت میں تحقیق کے [illegible]
[illegible] علمی [illegible] پر کام کرنے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے
[illegible] ایسی صورت میں بھی ان کے [illegible]
[illegible]
البتہ بطور ریڈنگ نرس، لیڈی ڈاکٹروں سے
[illegible] اپنی افادیت ثابت کر چکی ہیں

۵۔ خاندانی ذمہ داریاں

[illegible] قواعد ملازمت عورتوں کو زچگی کی چھٹیاں دیتی
ہیں لیکن بچوں کی نگہداشت اور امورِ خانہ داری پھر بھی ان کی
بھرپور توجہ کی محتاج ہوتی ہیں۔ لہٰذا انھیں اپنی سماجی میل
ملاپ اور ملازمت کی ذمہ داریوں کو اپنی خاندانی ذمہ داریوں
کے ساتھ ساتھ نبھانا پڑتا ہے۔ مشترکہ خاندان کی صورت
میں کبھی جہاں اگرچہ دادی اماں کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹاتی رہتی ہیں
بعض گھروں میں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے آیا بھی ہوتی ہے
جس کے ناز نخرے بھی ظاہر ہے کہ اٹھانے پڑتے ہیں۔

۳۔ مرد و زن کا باہمی رابطہ

مرد و زن کا آزادانہ میل جول خواہ وہ اسکول
یا کالج [illegible] کام کرنے [illegible] یا کارخانے میں
کسی بھی صورت میں پسندیدہ نہیں۔ [illegible] ترقی پذیر ملکوں
میں مذہب اور معاشرے [illegible]
[illegible]
کو بطور پیشہ اختیار کرنا [illegible]
(اگرچہ [illegible] Civil Service [illegible] اعلیٰ [illegible]
میں ان کو جانا ہے لیکن [illegible]
کی [illegible] ہے)

۴۔ [illegible]

ترقی پذیر ممالک [illegible]
ہوتی ہے۔ فیصلے کا حق [illegible] کے پاس ہوتا ہے
لڑکی کی شادی کے معاملے میں بھی [illegible]
کا تعین [illegible]
[illegible] خود کفیل [illegible] پھر بھی [illegible]
[illegible] کی ضرورت محسوس
ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] چاہیے [illegible]
[illegible] کی حمیت میں داخل ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں لوگ مختلف مذاہب کے
پیروکار ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں بالعموم مسلمانوں کی اکثریت
ہے۔ اسلام میں مرد و زن ہر دو پر حصولِ علم فرض ہے
اس لیے ابتدا میں کوئی ایسی پابندی نہیں تھی کہ کوئی ایک
شعبہ خاصتاً مردانہ اور دوسرا زنانہ ہو۔ امہات مومنین
میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تاجر تھیں اور حضرت عائشہ
صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حدیث پر ایک سند۔ بعد کے
دور میں بغداد، قرطبہ اور غرناطہ ادب، شاعری، ریاضی

منطق، حکمت وادویہ سازی میں کئی عورتوں کے نام بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اصفہان اور قاہرہ بھی اپنے نسوانی حلقۂ علما پر بجا طور پر فخر کر سکتا تھا

عرب ممالک اور ایران قرونِ وسطیٰ کی دنیا کا ایک اہم حصہ ہیں یہ خطہ گزشتہ کئی سالوں سے تیل کی دولت سے مالا مال ایک معاشی انقلاب سے دوچار ہے جس کی روشنی میں عورتوں کی آزادی اور حقوق کی، جو اسلام نے انھیں دیے ہیں، بحالی قابلِ ذکر ہے۔ ان ممالک کا معاشی ماحول اور تعلیمی کمی عورت کو سیاست اور دیگر میدانوں میں حصہ لینے میں مانع ہے لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ مغربی ممالک میں تقریباً ۱۰۰ برس قانونی اور قانونی مساوات کے باوجود سیاست کا میدان بالعموم مردوں کے لیے مخصوص نظر آتا ہے (یہاں تک کہ امریکہ میں بھی عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی)

ان ممالک میں مردوں کے عورتوں پر جبر اور زیادتی کے جو واقعات گاہے بگاہے سننے میں آتے ہیں تو ان کی وجہ سوسائٹی کی عمومی خرابی ہے جس سے یورپ اور امریکہ بھی اپنا دامن بے داغ نہیں رکھ سکے ہیں۔

اس عمومی بحث کے بعد آیئے اب اس خطے کے چند چیدہ ممالک میں عورتوں کے سائنس اور ٹکنالوجی کو بطور پیشہ اختیار کرنے پر روشنی ڈالیں۔ آج پاکستان میں سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کی معتدبہ تعداد موجود ہے جن میں عورتیں بھی اچھی تعداد میں شامل ہیں۔ لہٰذا لیڈی ڈاکٹروں کی کمی نہیں (خصوصاً شہروں میں) بلکہ پاکستان میں لیڈی ڈاکٹروں کی فیصد تعداد امریکہ سے زیادہ ہے۔ البتہ اکثر سند یافتہ لیڈی ڈاکٹروں کی (دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح) خواہش شادی کر کے گھر بسانے کی ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو گھروں کی ہو جاتی ہیں۔ تاہم اکثریت پریکٹس یا ملازمت ترک نہیں کرتیں۔ ان کے علاوہ یونیورسٹی کے شعبہ جات اور تحقیقی اداروں میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں کو جگہ مل جاتی ہے۔ بلکہ ایک آدھ تو وائس چانسلر کے عہدے تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ بعض سند یافتہ عورتیں بیرون ممالک میں چلی جاتی ہیں۔ کیونکہ وہاں انھیں کام کی بہتر سہولتیں مل جاتی ہیں۔ بعض اور صورتوں میں انھیں اپنے مردوں کے ساتھ جو بیرون ملک ملازم ہوتے ہیں، جانا پڑتا ہے مگر یہ میلان صرف پاکستان تک محدود نہیں۔

پاکستان میں انھیں مقابلے کے امتحانوں میں (سول سروس یا فارن سروس) میں بیٹھنے کی اجازت ہے۔ سیاست کے میدان میں بھی عورتیں چالیس کی دہائی سے حصہ لیتی آئی ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کی سابق وزیراعظم اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وزارتی اور سفارتی عہدوں پر بھی کئی عورتیں فائز رہ چکی ہیں۔

ترکی:

ایران اور پاکستان کے مقابلے میں یہاں زیادہ تعداد میں عورتیں سرکاری دفتروں اور صنعتی کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ البتہ ترک عورتیں سیاست میں دلچسپی نہیں لیتیں۔ مثلاً ترکی گرینڈ اسمبلی ۱۹۳۵ء میں ۵ ۳ عورتیں ممبر تھیں۔ جب کہ ۱۹۶۸ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۸ رہ گئی۔ ۱۹۶۵ء میں یہاں ۶۰۰۰۰ خواتین مختلف پیشوں سے منسلک تھیں۔ ۱۸,۶۴۵ ڈاکٹری کے پیشے سے اور ۳۶,۶۰۸ تدریسی پیشے سے، ۲۲۰۵ ماہرین طبعیات و کیمیا سے اور ۱۵۰۴ قانون کے پیشے سے متعلق تھیں۔

ایران:

۱۹۷۰ء میں دو عورتیں سینٹ کی ممبر تھیں۔ ۴ مجلس کی اور ایک وزیر۔ یہاں اجتماعی، معاشی، تہذیبی میدان اور محکمۂ تعلیم میں خواتین اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اچھی خاصی تعداد دفتروں میں بطور کلرک

اور آفس سکریٹری، تعلیمی اداروں، نیز بطور ڈاکٹر، انجینئر، میئر [illegible] جج وغیرہ بھی کام کرتی ہیں۔ یہاں کے خاندانوں میں حرکت یعنی رحلت مکانی کے رجحان کے مدنظر مشترک خاندانوں کا تناسب کچھ گھٹ رہا ہے موجودہ انقلابی ایرانی حکومت کے البتہ اپنے رجحانات ہیں جس سے معاشرے میں دوررس تبدیلیاں متوقع ہیں۔

مصر:

یہاں ۱۹۶۲ء کے چارٹر کی رو سے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملے۔ لہٰذا عورتوں سے کہا گیا کہ وہ آگے بڑھیں اور ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔

دوسرے عرب ممالک کی طرح اردن، کویت اور سعودی عرب وغیرہ میں تعلیم میں توسیع کے ساتھ ساتھ عورتوں نے بھی ملکی ترقی کے کاموں میں اب حصہ لینا شروع کر دیا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ موثر ہوتا جائے گا۔

بھارت:

بھارت تیسری دنیا کا ایک اہم ملک ہے۔ یہاں کا تعلیمی ریکارڈ نسبتاً بہتر ہے۔ آزادی کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء سے جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، ہندو سوسائٹی میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔ عورتوں کو حقوق دلانے کے لیے زنانہ تحریکیں انیسویں صدی کی ابتدائی نصف صدی سے شروع ہو چکی تھیں۔ ودیا ساگر نے عورتوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی تحریک شروع کی۔ ۱۸۴۹ء میں ایک زنانہ ادارے نے کلکتہ میں کام شروع کیا۔ مخالفت کی بنا پر ابتدا میں ترقی کی رفتار سست رہی۔ بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کے بعض روشن خیال لیڈروں نے عورتوں کو کچھ نمائندگی بھی دی۔ اس طرح زنانہ تحریکیوں کو قوت ملی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں ایک زنانہ آل انڈیا کانگریس بلائی گئی اور اس طرح کئی زنانہ اصلاحات عمل میں آگئیں۔

ہندوؤں میں بھی مشترکہ خاندان کا رواج ہے اگرچہ نئی نسل اس ماحول میں دم گھٹنے کی شکایت کرتی ہے۔ چونکہ ہندوستان میں کئی سوشیو کلچرل معاشی تہذیبی اختلافات ہیں۔ اس لیے صحیح تقابلی اعداد میسر نہ ہو سکے تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۳ء کالجوں میں عورتوں کی تعداد سات گنا بڑھ گئی۔ اس لیے لیڈی ڈاکٹروں اور دیگر سائنس کارکنوں کی تعداد میں بھی۔ اگر زیادہ نہیں تو اسی نسبت سے اضافہ ہوا ہے۔ یہ ڈر ہے کہ یہاں عورتوں میں تعلیم کے حصول کا مقصد مرد سے برابری کرنا نہیں ہے لہٰذا بہت کم عورتیں پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان پر اب بھی روایتی مذہبی گرفت مضبوط ہے اس لیے حالات بدلنے میں کچھ وقت لگے گا۔

لاطینی امریکہ:

یہ ایک وسیع علاقہ ہے۔ یہاں کے مختلف ممالک کا پس منظر جداگانہ ہے۔ اس لیے حالات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس علاقے میں تعلیم نسواں کا چرچا ابتداءً اگرچہ بہت کم تھا تاہم رفتار حال ہی میں کچھ تیز ہوئی ہے۔ یہاں عورتوں میں زنانہ روحانی برتری (حضرت مریم کی تقلید میں) کا ایک احساس پایا جاتا ہے جو ان کے ملازمت اختیار کرنے میں مانع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطے میں عورتیں معاشی لحاظ سے بالکل سرگرم عمل نہیں۔ ان کے ماہرین معاشیات کی بھی یہی رائے ہے کہ عورتوں کو ملازمت نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ ان ملکوں میں وسیع پیمانے پر بیروزگاری ہے آدمیوں کو تو روزگار ملتا نہیں۔ لہٰذا اس مقابلے میں عورتوں کی شمولیت خوش آئند نہیں ہوگی۔ تاہم ہنرمند عورتوں کو لاطینی امریکہ میں ملازمت ڈھونڈنے میں کوئی

دشواری نہیں ہوتی۔ ان ممالک میں مشترک خاندانی نظام کے باعث برسرروزگار عورت امریکہ کے مقابلے میں زیادہ آرام سے ہے۔ لاطینی امریکہ میں اندازاً ۱۳٪ خواتین برسرروزگار ہیں۔ ان میں سے ۴۰٪ کا تعلق Dress Maker ملبوسات ساز، پرچون فروش، کلرک اور اسکولوں میں استانیاں ہیں جب کہ باقی عورتیں زراعت کے پیشے سے منسلک ہیں۔ مثلاً چلی ۶۰ - ۱۹۷۰ء کے درمیانی سالوں میں ۵ء۸ فیصد عورتیں ڈاکٹر تھیں (دانتوں کے ڈاکٹر ۳۲٪ عورتیں ہوتی ہیں) یاد رہے اس سال امریکہ میں ڈاکٹروں کی تعداد اس سے کم تھی۔

بالعموم لاطینی امریکہ کی روایات انھیں اجازت نہیں دیتیں کہ عورت کسی پروفیشن کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچ سکے لہٰذا شاذ و نادر ہی فیصلہ کن اسامیوں تک ان کی رسائی ہوتی ہے۔

یونس آئزر کی علم الاجناس کی ایک ماہر خاتون رقمطراز ہے "کبھی میں سوچتی ہوں کیا اس سب کچھ کرنے کا فائدہ ہے۔ گھر کا کام یہ پیشہ ورانہ ذمہ داریاں اور ساتھ ساتھ یہ فکر اور پریشانی کہ اچھی ماں یا اچھی بیوی بنوں کا رجمع ہوتا جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ جلد یا دیر مجھے ملازمت ترک کرنی پڑے گی تاکہ اپنی صحت قائم رکھ سکوں اور ہوش و حواس بھی۔"

آخر میں ذرا پیرو کا حال سن لیجیے جہاں حالات کسی قدر بہتر ہیں۔ یہاں ۲ء۵٪ تعلیم سے منسلک ہیں۔ ۹ء۳٪ سب سے ۲٪ فارن سروس میں ہیں ۲۲٪ فلاح عامہ کے کاموں میں ۱ء۱٪ شعبۂ قانون میں اور ۶ء٪ ڈاکٹری میں جب کہ شعبۂ معاشیات ۵ء۵٪ ہیں۔ اس کے علاوہ آرٹ میں ۱۵ء۰ انجینئرنگ میں ۴ء۰ کیمسٹری میں ۴ء۰ ہیں۔

"ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی، بُرائی بھلائی جاننے کی، عجائب قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو۔ اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امورِ معاد پر غور کرے۔"

سرسید ؒ

سرسید احمد خان

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۱۰

جلد ۱۰

اکتوبر ۱۹۹۱ء

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

نائب مدیر

شباب الدین

انچارج سرکولیشن
شفیق احمد

تزئین
سرفراز

مسودہ بھیجنے کا پتہ :
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ انڈیا
(202002)

زر سالانہ : انڈیا Rs.45.00
بیرونی ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک US $ 20.00
بحری ڈاک $ 8.00

PHONE 24922

ترسیل زر کا پتہ :
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ &
NISHANT,
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGARH.

مندرجات

ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پریس: اے۔ ایم۔ یو پریس علی گڑھ

اِداریہ

علیگ برادری کو یوم سرسید مبارک ہو۔ آج کا دن نہ تو صرف سرسید احمد خاں کے مزار پر قرآن خوانی اور گل پوشی کا دن ہے نہ ہی صرف سرسید کے ذکر کرنے، ہالوں کو برقی قمقموں سے سجانے اور ان کے نام پر کسی کی محفل سجانے کا دن ہے۔ سچ پوچھیے تو علیگ برادری کے لیے یہ دن تجدید عہد کا دن ہوتا ہے۔ جہالت کی تاریکی مٹانے علم کا نور پھیلانے، توہمات کا پردہ فاش کرنے اور مستحکم حقائق سے آنکھیں چار کرنے کے عہد کا دن۔ ان تھک محنت، بے لوث خدمت، بے باکانہ عمل اختیار کرنے کے عہد کا دن اور سب سے بڑھ کر سرسید کی معروضی فکر کی اہمیت و معنویت کو اجاگر کرنے کے عہد کا دن۔ اگر اس دن تجدید عہد نہ کیا جائے، اپنے گذشتہ کاموں کا ناقدانہ جائزہ نہ لیا جائے، آئندہ کے لیے وقت و ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے لائحہ عمل نہ مرتب کیا جائے تو پھر سرسید منانا، سرسید ڈے، ذکر کرنا، علمی مذاکرات کی مجلسیں منعقد کرنا یہ سب ایک رسمی بات ہو کر رہ جائے گی۔

سرسید کی حقیقی اور دائمی اہمیت و معنویت کا عرفان حاصل کرنے کے لیے ہم کو ۱۸۵۷ء کے بعد کے مسلم معاشرے کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اگر ہم بیسویں صدی کے آخری دہے کے ماحول کو سامنے رکھ کر سرسید کی اہمیت و معنویت تلاش کریں گے تو یہ نہ تو سرسید کے ساتھ انصاف ہوگا اور نہ ہی علمی دیانت داری کا تقاضہ ان کے ساتھ سرانجام ہوگا۔

سرسید اور ان کی تحریک کی اہمیت و معنویت کو سمجھنے کے لیے ہم کو اس نکتے کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ جب ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد نصرانیت کا جو سیل رواں آیا ہوا تھا اور اس وقت کا ہندوستانی معاشرہ پادری فنڈر اور ان کے متبعین کے لوگوں کی ہرزہ سرائیوں سے گونج رہا تھا، اُس وقت سرسید اور ان کے رفقا نے اس سیل رواں کو روکنے کی کس طرح کوشش کی اور کس کس انداز سے اپنے مذہب کا دفاع کرتے رہے۔ اگر ہم اس بنیادی نکتے کو فراموش کردیں گے تو ہمارا سرسید اور ان کی تحریک کا مطالعہ خطرناک اور مایوس کن ہوگا۔

نصرانیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے جو حضرات آگے آئے اُن کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جس نے مناظروں کے ذریعے پادری فنڈر کے افکار و

خیالات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اس گروہ کے دو ممتاز افراد مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں تھے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے مناظروں سے نہیں بلکہ علمی انداز سے اس سیل بلا کو روکنے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں میں بقول مولانا سید سلیمان ندوی، سرسید، مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی ایک مخصوص مکتب فکر کے بزرگ تھے اس لیے قدرتی طور پر ان کی نگاہیں سرسید کی "غلطیوں" پر زیادہ رہیں اور ان کی اصل خدمات پر کم۔

اگر تعصب کو بالائے طاق رکھ کر غور و فکر کے ساتھ سرسید کی تمام تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو اُن کی زیریں لہروں میں مذہب اسلام کے دفاع کا جذبہ ہی کارفرما ملے گا۔ خطبات احمدیہ، تفسیر قرآن، تبئین الکلام اور ان کے مذہبی مضامین سے قطع نظر ان کے اصلاحی اور تعلیمی مضامین کی زیریں لہر بھی مذہب ہی کا دفاع ہے۔ وہ اصلی و حقیقی مذہب کے دفاع میں توہم پرستی اور جہالت کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ جب حقوق نسواں کی بات کرتے ہیں اور قوم کی توجہ اس کی طرف دلاتے ہیں تب بھی ان کا مقصد اصل و حقیقی مذہب کا دفاع ہی ہوتا ہے۔ ان کا کوئی بھی مضمون خواہ کسی عنوان سے لکھا گیا ہو اگر اس کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اس مضمون کے ذریعے کسی نہ کسی پہلو سے اپنے مذہب کا دفاع کیا ہے۔

جو لوگ سرسید اور ان کی تحریک کے مخالف ہیں ان سے تو ہم کو نہ گلہ ہے نہ شکوہ۔ ہم کو گلہ اور شکوہ تو اس گروہ کے افراد سے ہے جو سرسید کی تحریک کے مداح ہیں، سرسید کے گن گاتے ہیں ان کو انیسویں صدی کے مسلمانوں کا نجات دہندہ اور مسیحا سمجھتے ہیں وہ بھی اب سرسید کی تحریروں کے نہ عارف رہ گئے ہیں اور نہ رمز آشنا۔ وہ تبرک کے طور پر سرسید کا نام لیتے ہیں لیکن سرسید کی ہیئت و معنویت سے مطلقاً بے خبر ہیں۔ اس گروہ کی اسی بے خبری کا نتیجہ ہے کہ آج بھی سرسید کے "فرد جرم" میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان پر الزام تراشیاں ہو رہی ہیں، ان کو منکر حدیث ثابت کیا جا رہا ہے مگر سرسید کے نام لیوا سر بہ در گُھو بیٹھے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سرسید کی اُن کی اصل تحریروں کے ذریعے بازیافت کی جائے اور اُن کے اس پیغام کو عام کیا جائے جس کے لیے وہ زندگی بھر اپنوں کی گالیاں کھاتے رہے اور مرنے کے بعد بھی مورد الزام ہیں۔ مگر کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق؟

کبیر احمد جائسی

باہمی اتحاد اور تعلیم

سرسید احمد خانؒ

جناب پریسیڈنٹ صاحب و دیگر بزرگان و طالب علمان

اس وقت میں آپ [illegible] کی خدمت میں [illegible] ہوں کہ اس حال میں جو ایک تعلیم گاہ ہے جس میں [illegible] موجود ہیں اور کچھ بہت سے لائق لوگ تشریف رکھتے ہیں [illegible] کے بارے میں کچھ [illegible] نسبت اتحاد قائم کرنے [illegible] میں جو غلطیاں ہوں گی ان کی اصلاح ہو گی

اے صاحبو! ہمارے ملک ہندوستان میں [illegible] دو قوموں [illegible] ہندو اور مسلمان [illegible] اور ناموری ایسی ہی جو بھلا دی جائے۔ ہندوؤں [illegible] علوم ریاضیات [illegible] ان کی یادگار [illegible] فخر ہے مسلمان جو کہ اس ملک میں [illegible] بھی اپنے بزرگوں کی عمدہ تصنیفات [illegible] فخر کرسکتے ہیں۔ انھوں نے علم کی اشاعت میں ترقی دی گو وہ علم یونان سے حاصل ہوئے مگر انھوں نے اس کو ایسے درجے تک ترقی پر پہنچایا کہ یونان اور انگلستان دونوں کو ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ یہ باتیں یقیناً بہت سے لڑکے اور جوان یاد کرکے فخر کرتے ہوں گے مگر اے دوستو! بزرگوں کو یاد کرکے فخر کرنا اور خود کچھ نہ ہونا حمیت کے خلاف ہے بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی سے ان بزرگوں کے نام کو بھی بٹہ لگانا ہے۔ نہایت افسوس ہے ان دونوں قوموں پر [illegible] ہمارے [illegible] بزرگوں کو بھی بد نام کریں۔ اس زمانے میں علم کا بہت چرچا ہو رہا ہے لیکن ہم کو تعلیم کے معاملے میں اول غور کرنا چاہیے کہ وہ چیز ہے جس کو ہم سیکھیں [illegible] جس کا سیکھنا [illegible] مفید ہوگا [illegible] زبان [illegible] جو اس قابل بھی ہے [illegible] پسند کرتا ہوں مگر [illegible] زمانوں میں سوال یہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔" ہم بغیر خیال ضرورت کے محض یا فضول خواہش سے [illegible] دونوں زبانوں کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیں و یقین کرنا چاہیے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی ہم کو ضرورت ہے اس کو ہم نہ دیکھیں گے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان مقدس [illegible] زبانوں کو بھی نہ سیکھیں [illegible] بات ہے کہ ہم کو ضرورت کس چیز کی ہے اور کس زبان ہم کو علوم کے اعلیٰ مطالب کی طرف پہنچا سکتی ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ انگلش لینگویج۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں کی کتابیں علوم و فنون سے بھری ہوئی تھیں مگر اب دیکھنا چاہیے کہ علوم و فنون نے کہاں تک ترقی کی ہے میں سمجھتا ہوں کہ جن علوم کے بیج ہمارے بزرگوں نے بوئے تھے وہ اب برومند اور تناور درخت ہو گئے ہیں اور ان میں ایسے پھل پھول لگے ہیں اور ایسی خوشنما شاخیں نکلی ہیں اور ایسے لذیذ میوے لگے ہیں

وہ درخت معدوم ہوتے ہیں علوم جدیدہ جو بالکل نئے ہوں اور جن کا وجود مطلقاً ہمارے بزرگوں کے زمانے میں نہ پایا جاتا ہو۔ بہت ہی تھوڑے ہیں۔ اور زیادہ وہی ہیں جو اگلے بزرگوں کے پاس تھے مگر حقیقت میں اُس وقت وہ بیج تھے اور اب وہ پھل دار درخت ہو گئے ہیں پس اب ہمارا ان بیجوں پر فخر کرنا اور ان پھل دار درختوں کے پھلوں سے فائدہ نہ اٹھانا اور ان کے مزے ذائقہ سے محروم رہنا کیا کچھ فائدہ دینے والا ہے۔ یا کچھ عزت بخشنے والا۔ اگر ہم ہی علوم میں ترقی کرتے جائیں تو ان بیجوں کا جو ہمارے باپ دادا نے بوئے تھے ہم کو فائدہ حاصل ہوگا۔ نہیں تو ہم پرانے کہنہ لگے ہوئے بیجوں کو جن میں بسبب کہنگی کے نمو کی طاقت بھی نہیں رہی ہے ہاتھ میں لیے بیٹھے رہ جائیں گے۔ ہم کو اب بڑی بڑی شاخیں اور میوہ دار ٹہنیاں لینی چاہئیں جو میووں کے گچھے ہیں اور ان سے منفعت حاصل کرنا چاہیے۔

پس اب یہ بات قابل دیکھنے کے ہے کہ وہ علوم کن کن زبانوں میں ہیں؟ اور ان میں سے ہم کو کس زبان کو اختیار کرنا چاہیے؟ تمام یورپ میں فرنچ زبان سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ شیریں اور سب سے زیادہ وسیع ہے۔ علوم جدیدہ بھی فرنچ زبان میں بہت ہیں۔ اور قریب زمانہ آنے والا ہے کہ جرمن زبان بھی اس سے زیادہ علوم کی مخزن ہو جائے گی مگر وہ دونوں زبانیں ہمارے احاطے سے باہر ہیں۔ علوم انگلش لینگویج میں بھی ہیں اور ہم جو کچھ ترقی کر سکتے ہیں اسی زبان میں کر سکتے ہیں۔ ہم انگلش گورنمنٹ کے زیر سایہ بستے ہیں جس میں ہم کو ہر طرح کا امن و امان حاصل ہے۔ ہم کو اپنی گورنمنٹ کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہم کو امن و امان کے سوا تعلیم میں بھی ایسی مدد دی ہے کہ کوئی سلطنت کوئی بادشاہت ایسی ہم کو نظر نہیں آتی جس نے اپنی رعایا کی تعلیم میں ایسی مدد کی ہو اور عمدہ سامان تعلیم مہیا کر دیا ہو۔ گورداسپور کوئی بڑا مقام نہیں ہے مگر دیکھیے کہ گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم گاہ موجود ہے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم شکرگزاری کے ساتھ تعلیم کا فائدہ نہ اٹھائیں۔

مگر اے دوستو! میری رائے اور میرا خیال یہ ہے کہ کوئی گورنمنٹ ہر ایک قوم کی تعلیم کا ذمہ اپنے اوپر نہیں لے سکتی ہے بلکہ میں مضبوطی سے اس رائے پر قائم ہوں کہ ممکن نہیں کہ گورنمنٹ یعنی تمام رعایا کی تعلیم کر سکے۔ اس سے بھی سخت میری رائے یہ ہے کہ کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اس کی خواہش کا پورا ہونا غیر ممکن ہے مجھ کو بڑا افسوس یہی ہے کہ ہماری قوم کو ہر جگہ یہی خواہش ہے کہ گورنمنٹ اسکول قائم کرے مگر یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ گورنمنٹ کی آمدنی بہ لحاظ اس کے اور مصارف کے کسی قوم کی تعلیم کے واسطے کافی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستانیوں کی ترقی اس وقت ہوگی جب وہ اپنے باہمی چندہ اپنے انتظام اپنی قوت سے بلا مداخلت گورنمنٹ اور اس کے افسروں کے اپنی خودسری اور اپنی مرضی کے موافق اپنے بچوں کی تعلیم کریں۔

اے دوستو! ذرا اس بات کا خیال کرو کہ گورنمنٹ جو ایسی وسیع مملکت ہندوستان میں حکومت کرتی ہے جس میں مختلف قومیں مختلف مذاہب کے بستے ہیں وہ کسی ایک قوم کی طرفداری۔ مذہبی کی کوشش نہیں کر سکتی۔ اس کو لازم ہے کہ اس کے قواعد تعلیم ایسے ہوں جو یکساں سب سے متعلق ہو سکتے ہوں اور جیسا کہ میں بیان کر چکا کہ قوم کی ضرورتیں مختلف ہیں پس گورنمنٹ اپنی عام پالیسی کے قاعدے سے کسی خاص فرقے کی خاص ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی اور ہرگز نہیں کر سکتی۔ ایک بات خیال کرنے کی ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی بہت ہی تعریف کی جاتی ہے کچھ ہی عمدگی اس میں ہو مگر سب سے زیادہ عمدگی جو اس میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلیم مذہبی سے بالکل علیحدہ ہے۔ اگر گورنمنٹ کسی مذہبی تعلیم میں دخل دے گو وہ نیک نیتی اور نیک دلی سے ہی کیوں نہ ہو ہم کو شبہ میں ڈالے گا اور بہت برا خیال ہمارے دل میں پیدا ہوگا۔ اس سبب سے بچوں کی تعلیم مذہبی گورنمنٹ کی معدلت اس کی پالیسی اور اس کے نظام حکومت کے بالکل خلاف ہے اگر گورنمنٹ کے اسکول ہماری دنیوی تعلیم کے واسطے کافی ہوں تب بھی ایک ضروری جزو مذہبی تعلیم کا رہ جاتا ہے۔ پس ہمارے ہم وطن اور ہم قوم لوگوں کو گورنمنٹ پر بوجھ تعلیم کا نہ ڈالنا چاہیے اور تعلیم کو

اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ تم کو مدد دے اس سے زیادہ گورنمنٹ سے مانگنا بے غرضی ہے۔ یہاں تک مجھے معلوم ہے گورنمنٹ ہر اسکول میں مدد دینے کو تیار ہے۔ تم یہ کہتے ہو کہ فلاں قسم کی تعلیم ہم کو چاہیے اور فلاں قسم کے مدرسے اور کالج ہماری تعلیم کے لیے ضروری ہیں۔ کیوں نہیں تعلیم کو تم لوگ اپنے ہاتھ میں لیتے اور جس طرح کی تعلیم کی ضرورت سمجھتے ہو اسی طرح کی تعلیم دیتے۔ پنجاب یونیورسٹی میں ابھی ایک مسلمان نے ایک نیا کالج قائم کیا ہے۔ اس نیاس لیڈر نے اس کالج کے لیے اپنے پاس سے لاکھ روپے دیے ہیں جو یہاں کے حساب سے بیس لاکھ ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ہمارے ملک کے ہر ضلع اور قصبہ کے لوگ [illegible] ہیں۔ یہاں کی مردم شماری [illegible] ہو [illegible] سے یہاں کے لوگ لاہور کالج سے زیادہ عمدہ کالج [illegible] میں قائم کر سکتے ہیں لیکن ہمت اور ارادے کی کمی ہے۔

تعلیم کے متعلق میں اس وقت بحث کرنا نہیں چاہتا کہ کون کون علوم اور فنون عمدہ ہیں اور کون کون تعلیم میں شامل ہونے چاہییں۔ یہ بہت بڑا وسیع میدان ہے اور بہت لوگوں نے اس پر بڑے بڑے بحث کی ہے۔ اس وقت میں اس تعلیم کا ذکر کروں گا جس کو میں ادنیٰ درجے کی تعلیم کہتا ہوں اور جس کی عموماً ملک کے لوگوں کو ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان عمدہ طور پر جاننا، عمدہ گفتگو کرنا، انگریزی اخبارات کا بخوبی پڑھنا، قانون انگریزی کو خوب سمجھنا، اپنے خیالات کو انگریزی تحریر میں اچھی طرح ظاہر کر سکنا۔ اسی تعلیم کی البتہ ضرورت ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم سے تربیت جدا نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارے ملک کے لڑکے اس قدر تعلیم پا جاویں اور ایسی تحریر کر سکیں جس سے وہ لارڈ میکالے کا خطاب پا سکیں اور تربیت ان میں نہ ہو تو وہ کسی کام کی نہیں۔ لارڈ میکالے میرے خیال میں وہ شخص ہے جس نے ہندوستان میں بھلائی کے درخت کا یعنی کہ علم کے درخت کا بیج بویا۔ کوئی گورنر جنرل اور کوئی وائسرائے ہندوستان میں ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان کو بھلائی پہنچائی ہو گو یقیناً اس نے جو کچھ کیا اپنی گورنمنٹ کی خیرخواہی اور بھلائی کے لیے کیا مگر اسی کے ساتھ اصلی خیرخواہی اور بھلائی کی اصلی جان اس نے ہمارے ملک میں بھی ڈال دی۔

اے دوستو! تربیت اور تعلیم دو چیزیں ہیں۔ صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے۔ بولنے میں یہ ایک مثل ہے کہ تعلیم و تربیت، مگر تربیت [illegible] تعلیم پر مقدم ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ [illegible] لڑکوں کی تعلیم کا گورنمنٹ کے مکتبوں پر محدود کرنے میں تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ تربیت بھی پا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ تعلیم [illegible] اصلی مقصد ملک کی ترقی ہے۔ جب تک تعلیم یافتہ [illegible] کا اخلاق ایسا نہ بنے جس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے [illegible] کاش وہ پہلے [illegible] اچھا ہوتا۔ میں تمام ہندوستان میں جہاں تک خیال کر سکتا ہوں اور بڑے بڑے شہروں میں پھرا ہوں اور وہاں کے حالات سے واقف ہوا ہوں نہایت افسوس سے کہتا ہوں کہ کسی کو اولاد کی تربیت کا خیال نہیں ہے۔

اے میرے دوستو! سمجھو کہ اگر لڑکے کسی گورنمنٹ سکول میں پانچ گھنٹے تعلیم پاتے ہیں [illegible] باقی حصہ زندگی کا تمام [illegible] درحقیقت [illegible] یا سڑکوں پر [illegible] بازاری لونڈوں کے ساتھ کھیلنا، ان کی صحبت میں بداخلاقی کی باتیں سیکھنا اور فحش اور بداخلاقی کے الفاظ جو وہ لونڈے بولتے ہیں دیکھتے ہیں اور سننا۔ اسی قسم کے حالات کی [illegible] میں ان کی زندگی کا باقی حصہ بسر ہوتا ہے [illegible] فرشتہ سیرت ہونے کے شیطان سے بدتر [illegible] ہو جاتے ہیں۔ جب کہ لڑکوں کا چہارم حصہ ماسٹر کے پاس اور اس سے زیادہ حصہ خراب حالت میں گزرتا ہے تو کیا اس سے ان کی تربیت اخلاق کی توقع ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اور ہمارے بچے تربیت یافتہ اور مہذب ہوں اور دوسری قوموں میں عزت پاویں تو ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ تربیت کی فکر کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سب کچھ میرے ہی خیال کے موافق کریں۔ تم مجھ کو جانے دو۔ میرے خیال کی پیروی نہ کرو۔ تم

خود سوچ کر کوئی تدبیر نکالو۔ دیکھو یہ یورپین بچہ (ایک کم عمر لڑکا جو اُس وقت موجود تھا، اس کی طرف اشارہ کیا) جو اس وقت موجود ہے کیا تم کوئی ایسا بچہ اپنی قوم میں نکال سکتے ہو؟ گو یہ بچہ اب تک سوسائٹی میں نہیں ملا۔ مگر یہ اپنی ماں کی تربیت سے کیسا نیک عادتوں کا نمونہ ہو رہا ہے۔ اگلے زمانے میں ہماری اولاد بھی اپنے باپ اور اس کے دوستوں کی صحبت سے فائدہ اُٹھاتی تھی، ان کے اخلاق حسنہ سیکھتی تھی۔ واقعی وہ بہت اچھا طریقہ تھا۔ مگر وہ تیلیاں جس ڈورے سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا اب یہ دوسرا ڈورا اُن کے باندھنے کو ہونا چاہیے۔ اب جو لیڈیاں موجود ہیں آپ مجھ کو معاف کیجیے گا۔ وہ اس لائق نہیں کہ بچے ان سے تربیت پا سکیں۔ پس مناسب ہے کہ اولاد کی تربیت کی فکر کی جائے۔ گورنمنٹ پر بوجھ نہ ڈالیے، اس سے صرف مدد لیجیے جو اس کا فرض ہے اور جس کے ادا کرنے پر وہ آمادہ ہے۔

اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب و ہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنویں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت کا شریک ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے بغیر ملے کوئی رہتا۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے تعلق رکھتی ہے، اُن دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں قومیں تباہ اور بگڑ جائیں گی۔

پرانی تاریخوں میں پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہلاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو ان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔

اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین پر تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔ اتفاق کی خوبیاں مجھ کو زیادہ بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص اتفاق نہیں رکھتا وہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ بُرا کرتا ہے۔ جو لوگ باہم برخلاف ایک دوسرے کے دشمن ہیں وہ بھی جب دل میں سوچتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بُری بات ہے جو چیز نہایت عمدہ اور خوب ہے وہ اتفاق ہی ہے۔ اتفاق کر کے جو کچھ کیا جائے گا وہی عمدہ ہوگا۔ پس اس امر پر خیال کر کے باہم اتفاق کرنا چاہیے اور اس اتفاق کے ذریعے سے قومی تعلیم اور تربیت حاصل کرنا چاہیے۔ میں کچھ اور زیادہ بیان کرتا مگر آپ مجھے معاف رکھیں کہ میں آج ہی ابھی آیا ہوں اور سفر کی تکان سے خستہ ہو رہا ہوں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۰ - شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۱۹۹۱ء)

سرسید کا حقیقی پیغام

اور

علی گڑھ میں ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت

آل احمد سرور ▽

استاذ محترم پروفیسر آل احمد سرور صاحب کا درج ذیل مقالہ اب سے تقریباً پچاس سال قبل علی گڑھ کے ایک رسالہ "بیداری" میں شائع ہوا تھا۔ ہم یوم سرسید کے موقع پر اس مقالہ کو دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس مقالے کے بعض نکات سے اتفاق نہ کیا جائے لیکن یہ مقالہ بہرحال ہم کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ہمارے خیال میں موجودہ عہد کے علی گڑھ میں بھی ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔ جب تک ذہنی انقلاب کا عمل شروع نہ ہوگا، ہم علی گڑھ تحریک کی اس غرض و غایت سے دور ہوتے رہیں گے اور ہمارا تعلق اپنے ماضی سے کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جائے گا۔

— ایڈیٹر

سرسید کی تحریک کا مقصد کیا تھا؟ کیا وہ محض مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی کا خوگر بنانا چاہتے تھے؟ کیا وہ ہندو اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے تھے؟ کیا وہ اسلام سے بالکل بیگانہ اور مغرب سے مرعوب تھے؟ کیا وہ مغربیت کو تمام سے ایک سطحی مغربیت کو رائج کرنا چاہتے تھے؟ کیا ان کا مقصد انگریزی کے ذریعے سے برائے نام تعلیم دینا تھا؟ کیا علی گڑھ کو وہ صرف کلرکوں، ڈپٹی کلکٹروں، خان بہادروں اور ٹھیکیداروں کی تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے؟ کیا وہ انگریز افسروں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی سیاست کو بیچنے کے لیے میدان میں آئے تھے۔ سرسید واقعی کیا چاہتے تھے اور وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس سوال کا صحیح جواب بہت مشکل نہیں ہے۔ بشرطیکہ لوگ توجہ سے سنیں اور انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔

درحقیقت سرسید ایک نہیں بلکہ دو تھے۔ یا یوں کہیے کہ ایک ہی شخصیت کے دو پہلو تھے۔ ایک سرسید تو وہ تھے جنھوں نے "آثار الصنادید" لکھی، آئین اکبری کی تصحیح کی، سائنٹفک سوسائٹی کی اس غرض سے بنیاد ڈالی کہ اردو ادب کو علوم مشرقیہ کے خزانوں سے

▽ سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، اے ایم یو، علی گڑھ

حالا سال گیا ہوتا ہے۔ گزٹ اس وجہ سے نکالا کہ اخبار کے ذریعے سے حاکموں تک محکوموں کے دل کی بات پہنچائی جائے۔ غدر میں انہوں نے فرض منصبی کو محسوس کر کے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں، مگر صلے میں لاکھوں کا علاقہ لینے کے بجائے "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر ان کی بدگمانی دور کی۔ آگرہ کے دربار میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی الگ الگ نشستوں پر احتجاج کیا، اپنے صوبے کے گورنر سے معمولی سا سلام اس وجہ سے گوارا نہ کیا کہ اس نے آنحضرتؐ کے اوپر بڑے نازیبا حملے کیے تھے۔ انگلستان جاکر "خدا کی شان" دیکھنے اور موم کی پتلیوں پر پگھلنے کے بجائے "خطبات احمدیہ" کی تصنیف میں وقت گزارا۔ جب دیکھا کہ برادران وطن اردو کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں تو خود سینہ سپر ہو گئے اور تقریر و تحریر دونوں کے ذریعے سے اردو کی حمایت میں جان لڑا دی۔ ایک ورناکیولر یونیورسٹی کی اسکیم مرتب کی اور اردو کی ترقی کا ڈول ڈالا۔ دوسرے سرسید وہ تھے جنھوں نے پنجاب میں عربی زبان کے ذریعے تعلیم کی مخالفت کی، انتخاب کو برا کہا اور نامزدگی کو سراہا، مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے باز رکھا اور انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی سیاست کی باگ دے دی۔ جنھوں نے مشرقیت کو چھوڑ کر مغربیت اختیار کی، جنھوں نے ہائی ایجوکیشن کو مسلمانوں کے لیے امرت سمجھا، جنھوں نے علی گڑھ کی خاطر بہت سے اداروں کو ویران کرنا چاہا، جنھوں نے سائنس کی روشنی میں مذہب کو دیکھا، ان میں کون سے سرسید اصلی ہیں، کون سے اس قابل ہیں کہ ان کی تقلید کی جائے؟ کون سے ابدی ہیں اور کون سے وقتی، کہاں اصول کار ہیں اور کہاں طریق کار۔ سرسید کا مذہب کیا ہے اور ان کی سیاست کیا؟ کہاں وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور کہاں وہ مصلحت وقت کے شکار ہیں۔ اس کی پہچان ایسی مشکل تو نہیں ہے۔

سرسید سے پہلے مسلمانوں کی سیاست علما کے ہاتھ میں تھی یا بادشاہوں کے۔ بادشاہوں کا اس وقت زیادہ اثر نہ تھا۔ علما کو اپنی خانقاہ۔ اگر مسلمانوں کی سیاست کی زمام ان ہاتھوں میں رہتی تو ہندوستان بہ آسانی انگریزوں کے ہاتھ میں نہ چلا جاتا۔ انگریزوں کے خلاف وقت علما میں سے کچھ لوگ برسرپیکار رہے لیکن اس مخالفت کا نتیجہ کوئی نکلا نہیں۔ غدر میں اس کی سزا خوب بھگتنی پڑی۔ اس مقاومت مجہول passive Resistance کے بجائے سرسید نے ایک عملی پروگرام وضع کیا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سرسید انگریزوں کے آلۂ کار تھے یا ان کا کام مسلمانوں کو غلامی پر راضی کرنے کا تھا۔ سرسید وقت کی نبض کو پہچانتے تھے وہ دیکھتے تھے کہ مغرب ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے وہ اس سے واقف تھے کہ مغرب نے سائنس کی مدد سے علمی سرمایہ میں اضافہ کیا ہے، وہ مغرب کے تہذیبی کارناموں سے آنکھیں بند کرنے کے بجائے ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے وہ مہذب دنیا میں اپنے لیے جگہ بنانا چاہتے تھے اس کے لیے ان کے سامنے دو راستے تھے یا تو وہ دنیا کو چھوڑ کر دینی خدمت میں مصروف ہو جاتے۔ درس نظامیہ کی گردان کرتے اور بقول اقبال "الہیات کے لات و منات" سے مسلمانوں کو آشنا کرتے رہتے، دوسری صورت یہ تھی کہ مغرب سے جو طوفان آیا تھا اس کے راستے سے کترا جانے کے بجائے اس کا زور آزماتے۔ دین کو صرف اپنی جنت پکی کرنے کے بجائے دنیا کو سدھارنے اور سنوارنے کے لیے استعمال کرتے، اپنے حلقے میں ایک سوز، ایک آرزو، ایک ولولہ پیدا کرتے، محکوم مسلمانوں

تو اس کی مکمل پر راضی رکھنے کے بجائے اس میں ماضی
کا جذبہ پیدا کرنے۔ سرسید کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ
انھوں نے اس دوسری صورت کو اختیار کیا۔ انھوں
نے جب قدیم نظام تعلیم کے خلاف آواز بلند کی تھی تو وہ
محض انگریز پرستی کی وجہ سے نہیں۔ قدیم طلب اور قدیم
استاد مذہبی جذبہ ضرور رکھتے تھے مگر ہندوستان
نے اس مذہبی جذبے پر رسم و رواج کی کچھ تہیں ضرور
چڑھا دی تھیں۔ اس نظام میں بہت سی خوبیاں تھیں
یہ محنت کا زیادہ قائل تھا۔ اس میں اسلامی کردار بھی
بن گیا۔ یہ ذہنی بیداری، وسعت قلب، عملی نقطہ نظر اور
روح میں شخصیت پیدا کرنے سے قاصر رہا تھا۔ وہ جس
مقصد کے لیے تھا اس میں تو کامیاب تھا مگر بدلتے ہوئے زمانے میں
خود کو بدل نہ سکا تھا۔ اس میں غور و فکر کی سلامت
تھی، تحریک بار دار کی لچک نہ تھی۔ یہ محض نظام تعلیم نہ رہا
تھا مذہب بن گیا تھا۔

سرسید مغرب سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ کہہ سکتے ہیں وہ
مغرب سے مرعوب تھے۔ انھیں مغرب کی مادی ترقی
میں زندگی اور سائنس کی تعمیر میں بہتر نشان
نظر آتی تھی لیکن یہ غلط ہے کہ انھیں مغرب کی روح بھی
اور اپنی تہذیب عزیز معلوم نہ تھی۔ انھیں اپنا مذہب عزیز تھا
اس پر حملہ ہوتا تو وہ برداشت نہ کرتے۔ ولیم میور نے جو رسالہ
لکھا اس کی ہمارے علما کو کیا خبر تھی۔ وہ مغرب کی آواز
سے ہی اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ سرسید نے اسلام
کو اس کے حقیقی خد و خال میں پیش کرنے کی کوشش کی۔
یہ خد و خال تمام تر حقیقی نہ تھے مگر ان کی کوشش کے خلوص
میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ سرسید کا سب سے بڑا
کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد
ڈالی۔ قدیم علم کلام فلسفے کو یونانیت سے بڑا دشمن سمجھتا
تھا۔ انیسویں صدی میں سائنس کی ترقی سے مذہب کو
جو خطرے پیدا ہو سکتے تھے ان سے وہ بالکل بے خبر تھا
اگر سرسید نہ ہوتے تو شبلی بھی نہ ہوتے۔ شبلی کو شبلی
سرسید نے بنایا۔ انھوں نے الکلام لکھی اور سرسید کا نام
نہ لیا مگر ان کے خیالات پر سرسید کا اثر بہت
واضح ہے۔

مذہب سے نمٹنے کے بعد سرسید نے دنیا
کی ترقی سے اپنے آپ کو منسلک کیا۔ اس کے لیے جو نیا نعرہ
بلند ہو رہا تھا اس کا ساتھ دینا ضروری تھا اور مسلمانوں کو
ایک ایسا ادارہ دیا جس میں وہ اپنے مخصوص مذہبی ماحول
و تہذیب میں رہنے کے ساتھ ساتھ اپنی دنیوی ضروریات
کو پورا بھی کر سکیں اور پورا بھی کر سکیں۔ یہ ادارہ ایک
خاص فلسفے کی ضرورت تھی اور ایک سعی تعلیمی نظریے پر
قائم تھا جس کی رو سے خوش حالی رفتہ رفتہ اوپر سے نیچے
تک سرایت کر سکتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ
اس ادارے کا احساس سرسید کو دوسروں سے
زیادہ تھا۔

نئی مذہبی اور تعلیمی قدروں کے ساتھ ساتھ سرسید
نے نئی ادبی قدریں بھی پیش کیں۔ وہ جدید اردو ادب کے
بہت بڑے معمار ہیں اور ان کے بعد علی گڑھ تحریک
ایک سرکاری اور سیاسی گروہ کے ہاتھ سے ایک عظیم الشان
سیاسی ادارہ بن گئی۔ علی گڑھ محض انگریزی پڑھنے اور
سرکاری نوکری دینے کا ذریعہ تھا۔ یہ ایک خواب تھا
جس کی عظمتوں کی خود سرسید تاب نہ لا سکے۔ یہ قوم کو ایک مرکز، ایک
محور، ایک ہموار خیال دینا چاہتا تھا۔ جہاں قدیم و جدید مل
کر ایک نیا راستہ بنا سکتے تھے۔ جہاں قوم قوم بن سکتی تھی لیکن
حکمران تاک میں تھے کہ اس کی مرکزیت اور افادیت کو
محدود کر دیں۔ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے اور
علی گڑھ ناکام رہا۔ سرسید نے انگریزوں سے فائدہ
اٹھایا تھا۔ سرسید کے جانشینوں سے انگریزوں نے

فائدہ اُٹھایا۔ اصلی سرسید ٹرسٹی بل والے سرسید نہیں "تہذیب الاخلاق" والے سرسید ہیں۔

سرسید کے بعد سے اب تک جو لوگ علی گڑھ کی قیادت کرتے رہے ہیں وہ دو ایک کے سوا، سرسید کی سی شخصیت کے مالک نہ تھے۔ انھوں نے چاہا کہ سرسید کی طرح مسلمانوں کی سیاست کو اپنے ہاتھ میں رکھیں مگر اس اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے جس ذہنی عظمت، جس دوربینی جس ژرف نگاہی کی ضرورت تھی وہ نہ پیدا کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں تعلیم پھیلنے کے ساتھ علی گڑھ کی مرکزیت کمزور ہوتی گئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ مقرر اب تک یہ دہرائے جاتے ہیں کہ جو آج علی گڑھ کہتا ہے، کل سارے ہندوستان کی زبان پر ہوگا۔ ذہنی اعتبار سے علی گڑھ مغرب تو مغرب خود ہندوستان کا بھی ساتھ نہیں دے سکا ہے۔ جو لوگ علی گڑھ سے واقعی خلوص اور محبت رکھتے ہیں اور علی گڑھ کو علمی دنیا میں سب سے آگے دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ زندگی کی رفتار کچھ ایسی تیز ہو گئی ہے کہ اس دور میں آہستہ آہستہ چلنے والے اور پرانے طریقوں سے سوچنے والے نیک نیت مگر تنگ نظر لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہماری ساری یونیورسٹیاں اس تنگ نظری کا شکار ہیں۔ ان میں اقتدار خالص علمی اغراض کے لیے نہیں بلکہ ذاتی شہرت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ ان میں ایک غلط اور خطرناک قسم کی جمہوریت رائج ہے۔ ان میں لوگوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔ ان کے گرد ایک چار دیواری سی کھنچی ہوئی ہے جو انھیں باہر کے فتنوں سے محفوظ رکھتی ہے اور اندر کے فتنوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہے۔ ان میں علم، علم یا زندگی کی خاطر نہیں مقابلے کے امتحانوں کی خاطر سکھایا جا رہا ہے۔ ان کی ساکھ، علمی کارناموں سے نہیں "محفوظ سرمایے" سے متعین کی جاتی ہے۔ ان میں کوئی قدر آخری قدر نہیں ہے بلکہ اس کا دوسری اقدار سے بڑی آسانی سے مبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حالت صرف علی گڑھ کے سر ہی نہیں جا سکتی مگر اس کا الزام ارباب علی گڑھ کے سر پر رکھنا غلط ہوگا۔ یہ اس نظام تعلیم کی پیدا کی ہوئی ہے جو فرسودہ محدود اور تجارتی ہو کر رہ گیا ہے۔ جو بویا گیا ہے وہی آج کاٹا جا رہا ہے۔

آپ کہیں گے کہ جب سارے ہندوستان کی حالت ہے تو علی گڑھ پر تنقید کیوں کی جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ علی گڑھ کو ہم دوسرے اداروں سے زیادہ اور باوقار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ سارے ہندوستان کی ذہنی قیادت کرے۔ علی گڑھ وہ خواب ہے جو ایک بڑے اچھے اور سچے مسلمان نے دیکھا تھا۔ مسلمانوں کا اس سے تعلق اور عقیدت اور اسے بہتر بنانے کی خواہش بڑی مبارک خواہش ہے۔ اس لیے اسے بہتر بنانے کے ذرائع پر ہمہ وقت غور کیا جاتا ہے اور کرنا چاہیے۔

۱۔ آج علی گڑھ میں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ گزشتہ بیس سال کے علمی کاموں کا خلوص اور دیانت سے جائزہ لیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس عرصے میں اس ادارے نے بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی سرمایے میں کیا اضافہ کیا ہے۔

۲۔ اگر یہ ہو جائے تو شاید یہ احساس بھی بیدار ہو کہ اس عرصے میں بہت سے نیک کام کرنے کے باوجود ہمارے ذہن میں اپنی منزل مقصود کا کوئی خاص تصور نہیں رہا ہے ہم مشین کو دستور کے موافق چلاتے رہے ہیں۔ مشین کی ضرورت کیوں پیش آئی اس پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا

علی گڑھ کو حکومت کے مقاصد کے لیے چلانا ہے یا قوم و ملک کے لیے اس کا بھی فیصلہ اب ہو جانا چاہیے۔ کم از کم بنارس والوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے اور ہم بھی اسے دیر تک ملتوی نہیں کر سکتے۔

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ اس ادارے میں انگریزی کی موجودہ حیثیت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، وہ ایک بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور علی گڑھ کی عمومیت اور افادیت کے راستے میں حائل ہیں۔ ہندوستان میں ہر جگہ انگریزی کے بجائے دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جا رہا ہے۔ ہر جگہ اب اسے میں انگریزی اب لازمی نہیں اختیاری ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو علی سے علی علمی منزلوں کا ساتھ دے سکتی ہے مگر ہمارے یہاں اب بھی کچھ لوگ اس فکر میں رہتے ہیں کہ انگریزوں کا سا لب و لہجہ کیسے حاصل ہو اور بالکل ویسی انگریزی لکھنے کی مشق کیسے کی جائے۔ ہم کو یہ مان لینا چاہیے کہ انگریزی کو اب وہ اہمیت دینا جو اب تک دی جاتی رہی ہے، ناعاقبت اندیشی ہے۔

۴ طلب کو شروع ہی سے مقابلے کے امتحانوں کے لیے تیار کرنے کے بجائے ان میں قوم کی ضروریات کا احساس، قوم کا درد، قوم کی پستی کو دور کرنے کا ولولہ پیدا کرنا چاہیے۔ جو لوگ مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہوتے ہیں وہ چاہے کتنے ہی قابل ہوں لیکن وہ قوم سے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ کسی بھائی کو کلکٹر یا تحصیلدار بنا سکیں لیکن حقیقی قومی خدمت کی امید ان سے بالکل فضول ہے۔ اب تک علی گڑھ اپنے بہترین ادیبوں کو باہر بھیج کر اور انھیں سرکاری نوکریاں دلوا کر اپنا نقصان کرتا رہا ہے۔ اس زمانے میں یونیورسٹیوں کو مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کی مشین بنانا ہے۔ وقت کی راگنی ہے۔

۵. علی گڑھ نے اب تک جن لوگوں کو اعزازی ڈگریاں دی ہیں ان میں بیشتر صاحب ملک اور سرکار ہیں ... سیمان سر اقبال اور سر راس مسعود کو ڈگریاں دے کر اپنے نقطہ نظر کا ثبوت دیا تھا۔ مسلمانوں کے کئی ایسے محسن ہیں جن کو اعزازی ڈگریاں دے کر ہم ان کی عزت افزائی کر سکتے ہیں۔ کئی سال سے مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی کو ڈگری دینے کا مسئلہ درپیش ہے۔ افسوس ہے کہ یونیورسٹی اب تک اس فیصلے کو طے نہیں کر سکی نیز ڈاکٹر رضی الدین کو اعزازی ڈگری دے کر عثمانیہ یونیورسٹی نے جس قدر دانی کا ثبوت دیا ہے اس میں پہل تو علی گڑھ سے ہونی تھی۔ ... علی گڑھ یہ فخر کر سکے کہ بعض ... کا اس طرح ... سب سے پہلے اس نے کیا ہے ... تقسیم اسناد کے موقع پر جو ... کے بیانات ہوں تو زیادہ مناسب ہوگا ... باتیں بعض اوقات معمولی ہوتی ہیں مگر ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی چیز کی قدر کرتے ہیں کسی کی نہیں، دیری اور بیرونی ... سرکاری افسروں اور بیرون ملک کی پذیرائی بھی غالباً ضروری ہے لیکن کاش کبھی کبھی وہ توجہ وہ انہماک وہ استغراق وہ جوش جوان لوگوں پر صرف کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر رضی الدین وغیرہ کے لیے بھی دیکھنے میں آتا۔ اس وقت ہم خود اپنی نگاہوں میں کتنے بلند ہو جاتے۔ میں نے جب اخبار میں پڑھا کہ رشن چند کاٹی سٹیک نکلنے گئے تو یہ حسرت ہوئی کہ کاش وہ علی گڑھ بھی آتے۔ جب ٹیگور کی موت کا علم ہوا تو

ساتھ ساتھ یہ خلش بھی پیدا ہوئی کہ وہ کبھی علی گڑھ نہ آسکے۔ ہم علی گڑھ کو ادبی اور علمی شخصیتوں سے بچ کر کیسے رہ سکتے ہیں ان سے ملنا ان سے کچھ سیکھنا ان کی سننا اور اپنی کہنا بھی تو ہمارے لیے ضروری ہے۔

۲۔ طلبا کی اپنی یونین ہے۔ اس کا ماضی بہت شاندار رہا ہے مگر حال میں اس کی جو حالت ہو گئی ہے، اسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اب یونین میں تقریر کرنے کے لیے خاص طور پر کوئی نہیں آتا جو لوگ یونیورسٹی کے مہمان ہوتے ہیں جیسے کے طور پر یونین میں بھی تقریر کر جاتے ہیں۔ یونین کے عہدے دار پہلے طلبا کی ذہنی قیادت کرتے تھے۔ اب ان سے ڈرتے ہیں۔ پہلے لوگ تقریریں سننے یا معلومات حاصل کرنے یہاں آتے تھے، اب ہنگامہ آرائی کرنے آتے ہیں۔ پہلے انھیں حکم ماننے میں لطف آتا تھا، اب اسے توڑتے ہیں۔ پہلے کچھ مقرر ہوتے تھے کچھ سننے والے اب سب مقرر ہیں، سننے والا کوئی نہیں ہے۔ جب تک طلبا یونین کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں گے۔ ذہنی میدان قابل اطمینان نہ ہوگا۔ یہ اصلاح کوئی دوسرا نہیں کر سکتا صرف طلبا ہی کر سکتے ہیں۔

یونیورسٹی میں سب سے اہم اس کی علمی فضا ہے۔ اسی فضا سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ یہ فضا آسانی سے نہیں بنتی۔ بنتے بنتے بنتی ہے۔ مگر بگڑ بڑی جلد جاتی ہے ذرا سا کھوٹ، ذرا سی مطلب پرستی، ذرا سی جماعت بندی، برسوں کے کام کو غارت کر دیتی ہے۔ ضرورت ہے کہ علی گڑھ میں سب سے زیادہ عزت اپنے ادیبوں، اپنے عالموں، اپنے فن کاروں کی ہو۔ عزت قوانین کے ذریعے سے نہیں کرائی جا سکتی۔ طلبا اور اساتذہ اسی فرض کو محسوس کریں تو خود بخود اس کا ظہور ہو جائے۔ علی گڑھ کیا، سارا ہندوستان جاہے تو ہندوستان کو انگریزوں کا سا ادب وہم نہیں آسکتا اور اگر آجائے وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھیں، ان کے ادب و ہنر کی نقل فضول ہے اس میں فخر نہیں ذلت محسوس کرنی چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ علی گڑھ میں ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔ وہ ذہنی انقلاب جو بقول سید سلیمان ندوی علی گڑھ کا قبلہ مغرب کی طرف سے پھیر کر مشرق کی طرف کردے۔ یہ انقلاب اسی وقت رونما ہو سکتا ہے جب علی گڑھ والے بدمذاقی، تجارتی ذہنیت اور جاہ پرستی کو گوارہ نہ کریں جب وہ یونیورسٹی کے ذریعے سے اپنا مقصد حاصل کریں اور وہ اسے کچھ بھی دے سکیں۔ یونیورسٹی کے خزانے کو صرف فیس اور یونیورسٹی کے عہدے داروں کو درسگاہ ہی نہیں جب وہ وقت کی رفتار کو پہچانیں، جب وہ آسانی سے ہر خود غرض آدمی کا شکار نہ بن جائیں، جب جیسے طالب علم کے لیے صرف سچا طالب علم ہونا ہی ضروری ہو جب استاد سے علاوہ ڈگریوں کے لینے پینے سے محبت اور اس کی عزت کا بھی مطالبہ کیا جاسکے۔ جب کوئی یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ اس نے علی گڑھ کی خاطر ڈپٹی کلکٹری چھوڑی یا نائب تحصیلداری پر لات ماری۔ جب ہماری درسگاہ کی عنان ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو تعلیم کے مسائل کو سمجھتے ہوں، نوجوانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوں، صرف ان سے ڈرتے نہ ہوں۔ جو بدلتے ہوئے حالات کا نہ صرف احساس رکھتے ہوں بلکہ خود

"ہر سانس ایک خزانہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا کوئی سانس بے کار جائے اور قیامت کے دن اپنے خزانے کو خالی دیکھ کر تمہیں شرمندگی اٹھانی پڑے۔"

ابن جوزیؒ

بھی ان کو موزوں سانچے میں ڈھالنے کی ہمت رکھتے ہوں
اور علم وفن کے خدمت گزار رہے ہوں۔ ملک وملت کو
زیادہ عزیز رکھتے ہوں اپنا کم۔ جو پیچ معنی ہیں عوام ہوں۔
اس کام میں خود محسوس کرتے ہوں، جب یہ ذہن
ہو چکے گا، اس وقت ہم سرسید کی جانشینی کو
ادا کر سکیں گے اور اسی وقت ان کی روح کو بھی خوشی حاصل ہوگی
کاش یہ انقلاب ہمارے آپ کے زمانے

میں ہماری آپ کی کوششوں سے رونما ہو سکے
ورنہ ہم سب ... ... کا ... ... سے
... ...

... ...
... ...

"ہنر، فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں
سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک
حاصل کرنا چاہیے۔ ایک متعصب انسان
ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو
نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل
ہوتی ہیں، محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے
اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت
محض بے کار ہو جاتی ہے اور تربیت و شائستگی
تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا
جاتا۔"

سرسید احمد خاں

سرسید کی کرسی

مولوی مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ کی ان آخری شخصیتوں میں سے تھے، جنھوں نے سرسید کی بزم کو اپنے پورے شباب پر دیکھا تھا۔ وہ خود اس محفل کی آخری شمع تھے۔ ان کو ہم علی گڑھ کا آخری Grand old man کہہ سکتے ہیں۔

وہ ۱۹۰۵ء میں لاہور سے علی گڑھ واپس آئے اور مسلم یونیورسٹی پریس سے وابستہ ہو گئے جہاں سے ان گنت کتابیں ان کے اہتمام میں شایع ہوئیں وہ خود بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے اور مختصر سوانحی مضامین لکھنے میں ان کا جواب نہ تھا ان کو علی گڑھ تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا سمجھا جاتا تھا۔

ان کا درج ذیل معلوماتی مضمون قارئین تہذیب الاخلاق کی دلچسپی کے لیے شایع کیا جا رہا ہے۔ ہم م۔ ندیم (مینگ) اور فرخ جلالی صاحبان کے شکر گزار ہیں جن کے توسط سے یہ مضمون ہم کو حاصل ہوا ہے۔

ادارہ

سرسید مرحوم نے جو عمارتیں بنائیں اُن میں سب سے پہلے انسٹی ٹیوٹ ہال ۱۸۶۶ء میں تعمیر کیا جہاں اب مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کا دواخانہ ہے۔ اس کے چاروں گوشوں کے کمرے (جو بجائے خود ہال ہیں) اُن میں سے جنوب مشرقی گوشہ کے کمرے میں اخبار کا دفتر تھا جو انھوں نے ۱۸۶۶ء میں جاری کیا تھا۔

یہ کرسی اس اخبار کے دفتر کی تھی۔ اس لحاظ سے اس کی عمر سو سال کی آسانی سے فرض کی جا سکتی ہے۔ سرسید مرحوم اس اخبار کے خود ایڈیٹر تھے اور جب وہ اخبار کے دفتر میں آتے تو اسی کرسی پر بیٹھتے، سرسید کے بعد نواب محسن الملک مرحوم اور نواب وقار الملک مرحوم اس کے ایڈیٹر رہے، لہٰذا وہ بھی اسی پر بیٹھتے رہے۔

سرسید کے اہل قلم مقامی اور آفاقی ساتھی بھی اخبار کے دفتر میں ضرور آتے اور اسی کرسی پر بیٹھتے۔ مثلاً نواب اسمٰعیل خاں (رئیس دتاولی) مرحوم، حاجی موسیٰ خاں مرحوم۔ مولوی حاجی حبیب الرحمٰن خاں شروانی (بعد کے نواب صدر یار جنگ) مرحوم، حالی، شبلی، ہز ہائی نس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحومین، لالہ لاجپت رائے، راجہ جے کشن داس سی آئی ای۔ مولوی ذکاء اللہ، مولوی

بشیر الدین (البشیر)، مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی، لٹریری اسسٹنٹ سر سید مرحوم، پروفیسر آرنلڈ (بعدہ مسٹر طامس آرنلڈ لائبریرین انڈیا آفس لائبریری لندن) آنریبل مسٹر جسٹس سید محمود، آنریبل مسٹر جسٹس شاہ دین مرحوم۔

سر سید کی وفات کے قریب زمانے میں جب اخبار اور اس کے ساتھ دفتر بھی، چند روز کے لئے بند ہوا تو اخبار کے انگریزی کے مترجم [illegible] نواب محسن الملک کی اجازت سے یہ کرسی اپنے گھر لے گئے مگر جب آخر سہ ماہی ۱۹۰۵ء میں اخبار کو جاری میں نے کیا تو ازراہ شفقت بزرگانہ لارسن(?) نے یہ کرسی ذاتی طور پر مجھے عطا فرمائی۔ اگرچہ اخبار اس سے بہت پہلے جاری ہو چکا تھا اور مولوی سید وحید الدین پانی پتی اس کے اڈیٹر تھے مگر ان کو نہیں دی۔

نواب وقار الملک کے بعد جو کالج کے آنریری سکریٹری ہوئے، نواب حاجی محمد اسحاق خاں اور نواب سید محمد علی، وہ اگرچہ اخبار کے دفتر سے [illegible] کے دفتر میں گئے اور اسی کرسی پر بیٹھے۔

ملک ہو جانے کے بعد علی گڑھ کے [illegible] جلسے اسی ہال میں ہوتے تھے اور سر سید [illegible] جلسے اور مقررین کے ساتھ شدید اختلاف رائے کے باوجود ہال میں جلسہ کی اجازت انہیں بے تکلف دیتے تھے چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی مرحوم تقریر کے لیے علی گڑھ آئے تو اسی ہال میں تقریر کرنے والے تھے مگر یہاں پہنچ کر انہیں روسی زبان میں الہام ممانعت کا ہوا — بہرحال سر سید نے اجازت دے دی تھی۔ اخبار کے دفتر میں آ کر وہ اسی کرسی پر بیٹھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کانگریس کی حمایت اور اشاعت میں اسی ہال میں بولے اور صورت یہ ہے کہ سر سید کانگریس کے جیسے شدید مخالف تھے۔ وہ سب [illegible] ثابت [illegible] دفتر میں آ کر [illegible] کرسی پر بیٹھے۔

[illegible] یونیورسٹی [illegible]

[illegible] دفتر [illegible] مولوی [illegible]

[illegible] مولوی [illegible]

[illegible] کرسی [illegible]

[illegible] بیٹھے۔

[illegible] کرسی [illegible]

[illegible]

"[illegible] خلق [illegible]"

[illegible] کرسی پر

[illegible] آدمی [illegible]

گرچہ از نیکان نیم خود را بہ نیکان بستہ ام

در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

میری [illegible] میں [illegible] کرسی کی بیٹھک [illegible] بار اور پیٹھ دو بار [illegible] گئی ہے۔ اول

تین بار بازار میں، دو میدان میں دو بار میری بچیوں،
(مدینہ خاتون و مکہ خاتون) نے اور اب چھٹی بار
اسی سال بازار میں ۔ بیٹھ یہ وہی ہے جو دوسری بار
میری بچیوں سلمہا اللہ تعالیٰ نے بنی۔
ملاحظہ باشد ــــ

قسمت سے تو ناچار ہیں اے ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہیں وہ طاق انھیں کیا نہیں آتا

عبدہ الجانی محمد مقتدیٰ خاں شروانی
چھتاری کمپاؤنڈ علی گڑھ
یکشنبہ ۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء

سرسید مرحوم اور ان کے رفقاء کے حسن عمل اور جانباز کوشش سے تعلیم و تربیت کے جو سامان ایم اے او کالج میں ہوئے اور ان کے نتائج جو ملک نے دیکھے وہ تاریخ ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد کرے گی۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

حقیقت یہ ہے کہ سرسید سے زیادہ وسیع الخیال اور غیر متعصب شخص ملنا محال ہے، انھوں نے صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور کی ناراضگی کی پرواہ نہ کی اور جو سیرت رسول اکرمؐ میور نے تصنیف کی تھی اس کا رد لکھنا شروع کیا

مولانا محمد علی جوہر

سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دی جائیں، یقیناً درست اور صحیح تھا بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں غیر موثر بن جائیں گے

پنڈت جواہر لال نہرو ---

تقابلی مطالعہ مذاہب کے فروغ میں سرسید کی کوشش

تبیین الکلام کا خصوصی مطالعہ

محمد سعود عالم قاسمی ▽

مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے مطالعہ کی
... ہے۔ خصوصاً دو مذہب جن کا تذکرہ
قرآن کریم میں صراحت سے ہے۔ ان سے واقفیت حاصل کرنے
کا رجحان ابتدا سے مسلمانوں میں بہت ہے۔ جہاں
تک سامی مذاہب کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر وہ ...
دین کے ... اور کہیں ... شروع ہے
... اور دین ... کی ... مشترک ہیں
اور اسی کی وجہ سے کہ مسلمانوں کے ... ان
مذاہب کا ... اور ... دونوں ... جیسا کہ
ارشاد ربانی ہے۔

"آمن الرسول بما أنزل إليه
من ربه والمؤمنون كل آمن بالله
وملائكته وكتبه ورسله لا نفرق
بين أحد من رسله (البقرہ ۵-۲)

(رسول اس کتاب پر جو ان کے پروردگار
کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ہے ایمان
رکھتے ہیں اور مومن بھی، سب خدا پر اور
اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں
پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں
(اور کہتے ہیں کہ) ہم اس کے پیغمبروں سے
کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے)

قرآن کریم نے جہاں سابقہ مذاہب میں تحریف
کے رد میں ذرات ... ترمیم ... پر ... تنبیہ کی ہے
وہیں ان کے قدر مشترک کی ... زور دیا ہے ...
مشترک ... کی دعوت ... چنانچہ اہل کتاب
یعنی یہود و نصاریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے۔

قل يا أهل الكتاب تعالوا إلى
كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد
إلا الله ولا نشرك به شيئا ولا
يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون
الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا
بأنا مسلمون (آل عمران - ۶۴)

(کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے
اور تمہارے درمیان یکساں ہے اس کی

▽ ناظم دینیات سنی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

طرف آؤ، یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت
نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک
نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے
سوا اپنا کارساز نہ سمجھے، اگر یہ لوگ نہ مانیں
تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار
ہیں۔

چونکہ مسیحیت کے ساتھ اسلام کی یہ رعایت تھی
کوششیں اور تعلقات مستحکم موجود ہے۔ اس لیے
مسلمانوں سے روحانی اور سیاسی معاملات میں وہ زیادہ
قریب تھی جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے:

لتجدن أشد الناس عداوة للذين آمنوا
اليهود والذين أشركوا ولتجدن
أقربهم مودة للذين آمنوا الذين
قالوا إنا نصارى ذلك بأن منهم
قسيسين ورهبانا وأنهم لا
يستكبرون (سورة المائدة ۸۲)

تم اہل ایمان کی دشمنی میں سب سے
زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور
ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں قریب
تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا کہ
ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس وجہ سے ہے کہ
ان میں عبادت گزار اور عالم اور تارک دنیا
فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس
نہیں ہے۔

اس لیے مسلمانوں نے تاریخی طور پر مسیحیت کے سلسلے
میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ حق و باطل کی تمیز و تفریق
کی کوشش کے ساتھ ہمدردی اور افہام و تفہیم پر مبنی رہا
ہے۔ سلطنت مغلیہ کے دور آخر میں جب کہ برطانوی حکومت
ہندوستان کو اپنی نوآبادی میں تبدیل کرنے کے لیے جد وجہد
کر رہی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ملک کے بیشتر
علاقوں پر اپنا سیاسی و معاشی کنٹرول حاصل کر چکی
تھی اس وقت عیسائی مبلغین نے ناگزیر سمجھا کہ ہندو
ستان کے ہندوؤں اور بالخصوص مسلمانوں میں عیسائیت
کی تبلیغ کی جائے تاکہ مسلمانوں کی دینی وابستگی کمزور
پڑے اور برطانوی حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی
جائیں۔ گویا یہ کوشش تھی کہ ہندوستان
کو سیاسی و معاشی، سماجی اور مذہبی ہر اعتبار سے
مفتوح بنایا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگریز پوری
دنیا کو اپنی سیاسی باجگزار اور سارے انسانوں کو عیسائی بنا
دینے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ بڑے پیمانے
پر عیسائی مبلغین اور پادریوں کی ٹیم ہندوستان
بھیجی گئی۔ یہ پادری اور مبلغین ملک کے مختلف
علاقوں میں جاتے عیسائیت کی تبلیغ کرتے۔ اسلام
کے سلسلے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے اور مسلمانوں
کو مناظرے اور مباحثے کی دعوت دیتے۔ ان مبلغین
کے پیچھے برطانوی حکومت کی دولت اور طاقت کارفرما
تھی اس لیے ان کا مقابلہ کرنا بہت ضروری تھا۔
علماء نے عیسائیت کے اس چیلنج کو قبول کیا۔ اور جگہ جگہ
عیسائی مبلغین سے مناظرے ہونے لگے۔ مسلمانوں کی
طرف سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا قاسم بانی
دار العلوم دیوبند، ڈاکٹر وزیر وغیرہ پیش پیش رہے۔ ان
حضرات نے ایک طرف تو عیسائی مبلغین کے الزامات
اور شبہات کا جواب دے کر ان کا علمی رد اور استشہاد
مقابلہ کیا اور دوسری طرف عیسائیت کی کمزوری اور
اس میں تحریف و تبدیلی کو نشانہ بنایا اور اس کے مقابلے
میں اسلام کی حقانیت کو پیش کرنے کے لیے کتابیں
لکھیں۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق
اور مولانا قاسم رح کی کتاب انتصار الاسلام انھیں چیلنج کے

جواب میں لکھی گئیں۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پادری فنڈر سمیت تمام مبلغوں کو میدان درشکست خوردگی کا سامنا کرنا پڑا اور اسلام کے [illegible] کرنے کی ہر کوشش ناکامی پر منتج ہوئی [illegible]۔ [illegible] استعمار کے [illegible] رو یہ اختیار کیا تھا اس [illegible] اسلام کے [illegible] عیسائیت [illegible] کا [illegible] وہ پہلو نظروں سے اوجھل ہو گیا جو قدر مشترک [illegible] قرآن کریم [illegible] کا قدرتی نتیجہ تھا

[illegible]

"[illegible] Commentary on the Holy Bible"

یعنی جیسا کہ نام سے [illegible] توریت و انجیل کا مطالعہ [illegible] منافرت و مغایرت پیدا کرنے کے [illegible] تین جلدوں میں لکھی گئی۔ پہلی جلد [illegible] میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد علی گڑھ سے [illegible] میں شائع ہوئی۔ تیسری جلد بھی علی گڑھ سے [illegible] شائع ہوئی۔ پہلی دونوں جلدیں اردو اور انگریزی [illegible] جبکہ تیسری جلد صرف اردو میں ہے [illegible] مشتمل بر کتب و رسائل مذہبی [illegible] گیا۔ اس میں رسالہ احکام طعام اہل کتاب بھی شامل ہے۔ پہلی جلد میں دس مقدمے اور دو ضمیمے شامل ہیں۔ دوسری جلد توریت کی کتاب پیدائش کی تفسیر پر مشتمل ہے اور

تیسری جلد [illegible] (متی) کی تفسیر پر مشتمل ہے۔
[illegible] کتاب میں [illegible] [illegible] Believe [illegible] Objections [illegible]

[illegible]

[illegible] تھی جب [illegible] متعصب [illegible] کوشش کرنے قرآن کو [illegible] اسلام کی [illegible] جائیگہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے قریب آنے کی سنجیدہ کوشش کرتے، [illegible] تعصب و عناد کے باوجود [illegible] حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا نبی [illegible]

اور انجیل کو ہی انجیل خدا کی کتاب تسلیم کرتے اور حضرت مریم کو خدا کی پاکیزہ بندی شمار کرتے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ یکطرفہ کوشش اس صورت حال میں مقبول نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرے یہ کہ انگریزوں کا مذہب عیسائیت تھا اور عیسائی مبلغین مذہب سے زیادہ انگریزوں کی اقتدار سیاست کی خدمت انجام دے رہے تھے یعنی وہ مذہب کو سامراجیت کا آلۂ کار بنائے ہوئے تھے اور ظاہر ہے کہ انگریز بر بنائے ہر قیمت پر اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان حالات میں اس طرح کی کوشش اپنی جگہ کتنی ہی مخلصانہ سہی مداہنت اور خود سپردگی کے الزام سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔

تیسرے یہ کہ سرسیدؒ نے اس کوشش میں جا بجا قرآنی آیات اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی من پسند تاویلیں کیں، اور اسلاف کی تعبیرات میں نقص اور خامیاں نکالیں اور توریت و انجیل کی ایسی توجیہ و تشریح کی کہ وہ صرف انگریزوں کے لیے قابل قبول ہو سکتی تھی۔ مسلمان کسی قیمت پر اسے قبول نہیں کر سکتے تھے بلکہ عیسائی مبلغین نے بھی اسے قبول نہیں کیا اور عیسائیوں سے باقاعدہ اس کی تردید ہوئی۔ مثلاً کتب مقدسہ میں تحریف کے سلسلے میں سرسید نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تحریف سے اگر جان بوجھ کر تحریف کرنا مراد نہ ہو تو وہ فعل گناہ نہیں رہتا۔ پس ضرور ہے کہ جس تحریف کا قرآن مجید میں ذکر ہے وہ تحریف جان بوجھ کر ہو۔ سرسیدؒ کے نزدیک اپنی طرف سے کچھ لکھ کر خدا کا کلام کہہ دینا تحریف نہیں کیونکہ تحریف کے لیے کلام اللہ میں تغیر و تبدل ضروری ہے۔ اس طرح سرسیدؒ نے کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کے قائل علما کی بھی تردید کی اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ان حضرات سے لغزش ہوئی اور صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں سے کتب مقدسہ میں تحریف سے مراد عبارتوں کا تغیر و تبدل نہیں بلکہ زبانی لوگوں کو غلط بدل کر سنانا یا کلام الٰہی کو اخفا کرنا یا احکام الٰہی کو بدلنا یا کلام الٰہی کے غلط معنی اور غلط تاویلیں بیان کرنا مراد ہے۔ وغیرہ

• اسی طرح سرسیدؒ نے ایک عجیب و غریب بات یہ بیان کی کہ

"ہم مسلمانوں کے مذہب میں یہ بات
ہے کہ زبور کے آنے سے توریت اور
انجیل کے آنے سے، زبور اور قرآن کے
آنے سے انجیل اس طرح منسوخ ہوگئی
کہ ان میں کچھ نقص تھا۔ یہ ان کی سمجھ
محض غلط ہے۔ نہ ہم مسلمانوں کے
مذہب میں یہ بات ہے۔ نہ ہمارا یہ
اعتقاد ہے اور اگر کوئی جاہل مسلمان
اس کے برخلاف کہے تو اپنے مذہب
اور اپنے مذہب کے احکام سے واقف
نہیں۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ سرسیدؒ نے اپنے ذاتی خیال کو اسلام کی طرف منسوب کیا اور اس خیال کی تائید میں قرآن و حدیث یا سلف سے کوئی دلیل نہیں دی۔ بلکہ اس کے برعکس ان لوگوں کو جاہل ٹھہرایا جو قرآن کے آنے کے بعد کتب سماویہ کی تنسیخ کے قائل نہیں۔ حالانکہ قرآن کی آیت

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً
(الاحقاف ۱۲)

خود سابقہ کتابوں کی تنسیخ پر دلالت کرتی ہے۔

سرسیدؒ توریت کے باہم متناقض بیانات (باب ۱، درس ۲۶، اور باب ۲، درس ۷) کے سلسلے میں

بہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

"یہ تضاد نہیں بلکہ تعدد آدم کی دلیل ہے
یعنی پہلے آدم اور ہمارے باپ آدم میں
کا ذکر باب دوم میں ہے۔ دونوں الگ
الگ شخصیتیں ہیں اور ان دونوں کے درمیان
معلوم نہیں کتنے آدم اور کتنی پشتیں اور
گذر گئیں۔" وغیرہ ذالک

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سرسید نے توریت و انجیل کے الہامی ہونے اور ان کے متنوں کو غیر محرف ہونے کو حق بجانب ثابت کرنے اور قرآن و حدیث سے اس کے لیے دلائل فراہم کرنے کی ہی کوشش کی اور کتب سماویہ کے سلسلے میں پائی جانے والی [illegible] غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی جد و جہد کی بلکہ حسب ضرورت جہاں [illegible] مصنفین پر [illegible] تنقید بھی کی اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی [illegible] وہ عیسائی علما کے اس دعوے کی تردید کرتے ہیں کہ مقدس تحریروں میں کوئی تحریف نہیں ہوئی [illegible] ان کا کہنا یہ ہے کہ عیسائی علما کے [illegible] کے دلائل ناکافی ہیں۔ سرسید نے اس کی تائید میں خود عیسائی مصنفین میں سے Man ford، Reckord، Horne اور D. Oyly Chaston کے حوالے سے پیش کیے ہیں۔

سرسید عیسائی علما کے اس خیال کی بھی تردید کرتے ہیں کہ انجیل ہی انسانوں کی ہدایت کے لیے کافی ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک ہی کتاب انسان کی ہر حالت کی تربیت کے لیے کافی ہوتی تو عہد نامہ عتیق کے بعد عہد نامہ جدید کی ضرورت کیوں کر پیش آئی۔ یہ بات وہ یہودی علما کے خلاف کہتے ہیں جو توریت کو ہدایت انسانی کا آخری صحیفہ قرار دیتے ہیں۔ [illegible] انگریزی مترجمین کے غلط ترجمے کی گرفت بھی کرتے ہیں اور [illegible] الفاظ کی توضیح و تشریح کرتے ہیں۔

بہ صورت توریت و انجیل کو قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے بلکہ صحیح تر الفاظ میں توریت و انجیل کے مطابق قرآن و سنت کی تعبیر و تاویل کرنے کی اس کوشش کو مسلمانوں نے [illegible] نہیں کیا اور سرسید کی تفسیر قرآن کی طرح یہ کوشش بھی مسلمانوں کی نظر میں غیر مقبول بن کر رہ گئی اور انگریزوں نے خود [illegible] عیسائیت کے خلاف ہونے یا مناظرانہ رویہ [illegible] نہیں ہو [illegible] بعد میں سامنے آئی [illegible] توریت و انجیل کے تضادات [illegible] مصنف [illegible] پر سنجیدہ تجزیاتی و تحقیقی [illegible] مناظرانہ [illegible] کی کتاب [illegible] کی کتاب [illegible] اسلام [illegible] عیسائیت [illegible] کی کتاب "توحید تثلیث اور راہ نجات" وغیرہ [illegible] سکتا ہے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسائیت کی حد تک سرسید کی اس کوشش کو وسعت نہیں ملی۔ البتہ ہندو مذہب کے سلسلے میں اس طرح کی کوششیں بڑے پیمانے پر ہوئیں ہندو مذہب کو اس کی مقدس کتابوں، شخصیات اور مفکرین کے بیانات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی اور قرآن و حدیث کے میزان پر تولنے کی

[illegible] ہوئی۔ ہندومت میں [illegible]
بھی تلاش کی گئی اور اس کے مشرکانہ مظاہر پر
ضربیں بھی لگائی گئیں اور یہ کوششیں آج تک بدستور
جاری ہیں مگر اس کوشش میں علی گڑھ تحریک کا
کوئی اہم عنصر شامل نہیں ہے بلکہ زیادہ تر دوسرے
مکاتیب فکر کے علما اور اسکالر اکیڈمی اور جامعوں نے
اس موضوع پر کام کیا ہے۔ یہاں تک کہ مسلم یونیورسٹی
میں مطالعۂ مذہب کے شعبے بھی اس سلسلے
میں کوئی پیش رفت نہ کر سکے مگر مذہبی کشمکش
اور نظریاتی کثافت کے موجودہ ماحول میں ہمارے
لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم مطالعۂ مذاہب سنجیدہ
کوشش کریں اور سرسید کی گذشتہ کوششوں
سے موجودہ حالات میں تحریک حاصل
کریں۔

[یہ مقالہ سرسید اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار "علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر" مارچ ۱۹۹۱ء میں پڑھا گیا]

سید احمد خاں اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں چلے گئے، دیکھو ہماری قومی عمارت کے ستون ہل رہے ہیں، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت طاقت گویائی کہاں سے لاؤں۔

——— علامہ شبلی نعمانیؒ

نوائے تلخ

○ نسیم انصاری

علی گڑھ کی درس گاہ کو قایم ہوے سو برس سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس عرصے میں اس نے ترقی کی اتنی منزلیں طے کی ہیں کہ اب اس کا شمار دنیا کی مشہور دانش گاہوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کے بہت سے پڑھنے اور پڑھانے والوں نے اپنے اپنے میدان علم و فکر میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ کم از کم بعض مضامین مثلاً ہندوستانی کی ہندوستانی تاریخ، جغرافیہ، اردو اور فارسی اور ریاضی میں تو اس یونیورسٹی کا شمار ہندوستان کی صف اول کی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔

ہمیں اپنی اس ترقی پر بجا فخر ہے لیکن اپنی کمزوریوں پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہماری ایک کمزوری یہ رہی ہے کہ یونیورسٹی میں وہ فضا نہیں بن پائی ہے جس میں علم و فن کی ترقی کو باقی سب باتوں پر اہمیت دی جائے۔ کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی ملازمت حاصل کرنے کا ایک کارخانہ سمجھا جاتا ہے اور یہاں زیادہ تر طالب علم اس لیے ڈگریاں حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں کہ انھیں ملازمت ملنے میں آسانیاں ہوں۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے بشرطیکہ طالب علموں کی ایک بڑی تعداد علم حاصل کرنے کے لیے بھی یہاں آئے

اسی طرح یہاں کے بیشتر اساتذہ اس لیے علی گڑھ میں پڑھانا چاہتے ہیں کہ اس سے بہتر ذریعہ معاش انھیں میسر نہیں آسکتا۔ بہت کم ایسے ہیں جو سوچ کر پڑھانے آئے ہوں کہ علم حاصل کرنے کا غالباً سب سے اچھا راستہ یہی ہے کہ معلمی کا پیشہ اختیار کیا جائے۔ ضرور کچھ اساتذہ ایسے ہیں لیکن تعداد میں بہت کم۔

ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے میدانوں میں بھی علی گڑھ میں کوئی مدرسۂ فکر نہیں بنا جن کے بننے کے سب سامان یہاں موجود ہیں۔ مثلاً علوم اسلامیہ میں کوئی ایسا کام نہیں ہوا جس کا چرچا دنیا کے علمی حلقوں میں ہوتا۔ فلسفہ اور پولیٹیکل سائنس کا بھی یہی حال ہے۔ ان تینوں علوم کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا کہ ان کی ترقی کے لیے کتابوں کے علاوہ بہت زیادہ سازوسامان کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء میں ہمایوں کبیر صاحب وزیر تعلیم نے علی گڑھ میں یہ بات کہی تھی کہ ابھی تک یہ یونیورسٹی صرف نام کی مسلم یونیورسٹی رہی ہے۔ اسلامیات پر بڑے بڑے کام تو یورپ کی یونیورسٹیوں میں ہوے ہیں، علی گڑھ والوں نے تو اب تک اس طرف کوئی توجہ

○ پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف سرجری۔ جے این میڈیکل کالج۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

نہیں کی۔

ہماری طبیہ کالج کی لائبریری میں جو ذخیرہ طب کی کتابوں کا ہے وہ دنیا کی بہت کم یونیورسٹیوں میں ہوگا۔ ان کی طرف بھی بہت کم لوگ دیکھتے ہیں۔ ستھویں صدی میں طب میں نئے نئے دروازے انہی لوگوں نے کھولے جنھیں ان کتابوں کے ترجموں پر عبور رہتا جو آج ہمارے کتب خانوں کی زینت ہیں نہ معلوم ان میں کیسے کیسے جواہر پارے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہمارے اساتذہ اس کام پر کمر باندھ لیں تو ہمارا طبیہ کالج ایک ایسا مستند ادارہ بن سکتا ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کے لیے محققین دنیا کی بڑی بڑی دانش گاہوں سے کھنچ کر علی گڑھ آئیں گے۔

یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہے، دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ علی گڑھ میں کوئی نظریاتی معرکہ نہیں ہوا، سیاسی معرکے ضرور ہوئے لیکن کوئی علمی یا نظریاتی معرکہ کبھی نہیں ہوا۔ پچھلی نصف صدی سے زیادہ یہاں جماعت اسلامی اور کمیونزم کے ماننے والوں کی کافی تعداد رہی ہے لیکن تصور ریاست پر کوئی بحث ایسی نہیں ہوئی جس میں دونوں طرف کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔

میں مدد ملے گی بلکہ ہندوستان کے سامنے کے مسائل کے حل کرنے میں بھی کوئی مدد مل سکے۔

سرسید نے تعلیمی اداروں میں بحث و مزاج کو بڑی اہمیت دی تھی۔ بدقسمتی سے ہماری یونیورسٹی میں اب اسے نظرانداز کیا جانے لگا ہے۔ سیاسی حلقے تو دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر یونیورسٹی کی نچلی سطح کی سیاست سے ہے یعنی کہ کس کے زیرِ اثر آدمی کا تقرر کس جگہ پر ہوتا ہے یا الیکشن میں کس امیدوار کی کامیابی سے کس گروپ کا اقتدار یونیورسٹی میں بڑھے گا لیکن اس سیاست کا کوئی تعلق ملکی سیاست سے نہیں ہے۔ اہل علم کی عزت وہی کرتے ہیں جن کے مزاج میں رواداری ہو ورنہ پیر پرستی شروع ہوجاتی ہے یعنی جو زیادہ شاطر ہیں وہ پیر بننے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کامیاب بھی ہوجاتے ہیں اور کم حیثیت لوگ ان کے گرد حلقہ بنا کر ان کی بات پر آمنّا و صدقنا کہتے ہیں۔ اس طرز فکر سے سوائے گروہ بندی کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور یہ گروپ یونیورسٹی کے بدن میں ناسور کی طرح پیوست ہوجاتے ہیں۔

حد تو یہ ہے کہ آج کل جب مشرقی یورپ کے ملکوں میں زبردست تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور ساری دنیا کے علمی حلقوں میں اس کے چرچے ہیں علی گڑھ کے دانشور بالکل خاموش ہیں۔ مارکس کے تصور تاریخ اور لینن کے ریاست کے متعلق نظریات

> "آج جس چیز کی وجہ سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے، جس نے ہماری طاقت کو بالکل گھٹا دیا ہے جس کی وجہ سے گورنمنٹ کی نگاہ میں اس گروہ کی عظمت نہیں رہی، جس کی وجہ سے مخالفین کو ہم پر شماتت کا موقع ملا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اختلاف و اتفاق کو اصلی حدود پر نہیں رہنے دیتے۔"
>
> علامہ شبلی

علمی حلقوں میں معاصرانہ چشمک کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن اس کے حدود بھی مقرر ہیں۔ جب بات حد سے گزر جاتی ہے تو بغض اور حسد شروع ہوجاتا ہے۔ اس زہر کا تریاق رواداری یا لبرل انداز فکر ہے۔ انقلاب فرانس کے زمانے میں کسی نے اپنے مخالف

تو ایسی باتیں ہیں جن پر گفتگو سے نہ صرف علمی گتھیاں سلجھنے

سے کہا تھا کہ:

میں آپ کی ہر بات سے اختلاف کرتا
ہوں اور پوری کوشش کروں گا کہ آپ
کو غلط ثابت کر دوں لیکن میں آپ کے اس
حق کی حفاظت اپنی جان دے کر کروں گا
کہ آپ مجھ سے برملا اختلاف کر سکیں۔

جن کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان سے بچنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ ہم شاہراہِ ترقی پر گامزن ہیں اور ہمیں اپنا دامن ہر اس چیز سے بچانا چاہیے جس سے ہماری رفتار میں فرق آئے۔ ہماری شاندار لائبریری، ہمارے فاضل اساتذہ، ہماری تجربہ گاہیں ہمارا انجینئرنگ کالج، ہمارا میڈیکل کالج، ہمارے کھیل کے میدان، ہمارے شہسوار سب قابل فخر ہیں، لیکن اگر ہماری درسگاہ میں علمی فضا نہیں ہے۔ اگر ہم میں علمی رواداری اور بردباری کی کمی ہے تو یہ عالیشان عمارتیں، یہ سازوسامان، ایسے قابل اساتذہ اور ایسے لائق طلباء سب مل کر ڈگریاں بانٹنے والی فیکٹری تو چلا سکتے ہیں لیکن ان سے دانش گاہ نہیں بن سکتی۔

مایوسی کے اندھیرے میں مسلمانوں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کو روشنی میں لے جائے اور ان کی شکستہ دنیا کی تعمیرِ نو کرے۔ یہ شخص سرسید احمد خاں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس عظیم رہنما کی عظمت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔

——— ایچ۔اے۔آر۔گب

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۰ شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۱۹۹۱)

نمبر ۱

علی گڑھ کالج اور انگریز مخالف تحریکات

پس منظر اور ابتدائی واقعات

○ سید حامد حسین

جدوجہد آزادی کا ذکر کرتے ہوئے بسا اوقات مورخین علی گڑھ اینگلو اورینٹل محمڈن کالج کا اس طرح حوالہ دیتے ہیں گویا اس ادارے نے انگریزوں کے پٹھو تیار کرنے کا کردار ادا کیا ہے اور غیر ملکی حکمرانوں کے سیاسی مفادات کو تقویت پہنچائی ہے۔ لیکن حقیقت حال اس سے بہت کچھ مختلف ہے اور اس صدی کی ابتدا میں اس کالج میں جو شورشیں اور ہنگامے ابھرے ان کے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس ادارے میں انگریز مخالف تحریکات مختلف شکلوں میں سامنے آرہی تھیں۔ ان سب سے زیادہ نمایاں تحریکات وہ تھیں جن کا نشانہ کالج کا یورپین اسٹاف تھا۔

ایم۔ اے۔ او کالج کی تشکیل کے وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ کالج میں کچھ یورپین اسٹاف بھی ہو اور اس اسٹاف کو کچھ خصوصی اختیارات بھی حاصل ہوں۔ سرسید نے یہ بھی ضروری سمجھا تھا کہ کالج کا پرنسپل بھی یورپین ہی ہو۔ کالج کے اندرونی معاملات میں یورپین پرنسپل کو جو خصوصی اختیارات دیے گئے تھے اس کے حق میں شیخ محمد اکرام نے دو خاص وجوہ بتائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ

> کالج کے ڈسپلن اور اس کی کارکردگی کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے پرنسپل کو اساتذہ کے انتخاب اور کالج یا ہوسٹل کے قواعد میں دخل ہونا چاہیے۔

اور دوسرے یہ کہ:

> سرسید یورپین اسٹاف کو قوم اور گورنمنٹ کے درمیان خوش گوار تعلقات پیدا کرنے کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے [1]

کالج میں یورپین اسٹاف کو شامل کرنے کے بارے میں سرسید کی ایک اور مصلحت کی جانب محمد امین زبیری نے اشارہ کیا ہے:

> 'ان کا خیال ہے کہ انگریزوں کا ایک طبقہ مسلمانوں کے مدرسوں سے بدظن تھا اور یورپین اسٹاف کی شمولیت سے اس بدظنی کا ازالہ کرنا مقصود تھا۔ [2]

سرسید کی اس پالیسی سے علی گڑھ کے

○ ای-۴/۱۸۴ - پروفیسرز کالونی - بھوپال - ایم پی

طلبا کو بعض فائدے بھی حاصل ہوئے تھے۔ محمد امین زبیری لکھتے ہیں کہ:

> اس طرح علی گڑھ کے طلبا کی وفاداری مسلّم ہو گئی اور اس کے نتیجے میں سرکاری ملازمتوں میں ان طلبا کو ترجیح ملنے لگی۔

لیکن یہ فوائد یک طرفہ نہ تھے۔ انگریز حکومت نے علی گڑھ کے طلبا کو بعض ترجیحات دے کر خود بھی بعض سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہے۔ ایم۔ اے۔ او کالج کو جہاں مسلمانوں نے اپنی ملی حیثیت مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا، وہیں انگریزوں نے اس کالج کے ذریعے مسلمانوں کو ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف ابھرنے والی تحریکات کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہا۔ چنانچہ کالج کے دوسرے پرنسپل تھیوڈور بیک نے جس خوش اسلوبی سے اپنی کالج سے متعلقہ ذمہ داریاں نباہیں، اتنی ہی تندہی سے انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ طفیل احمد منگلوری نے اپنی تصنیف 'مسلمانوں کا روشن مستقبل' میں مسٹر بیک کی سیاسی کوششوں کی جو تفصیل دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

> ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے پہلے اجلاس کے بعد مسٹر بیک نے مختلف طریقوں سے یہ کوشش کی کہ وہ مسلمانوں کو کانگریسی نعرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر کے برطانوی حکومت کی مدد کریں چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے لیے سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" کے قیام میں مدد دی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک کیے گئے تھے اور اس کا ایک خاص مقصد ہندوستان میں امن و امان اور برٹش گورنمنٹ کے استحکام کی کوشش کرنا اور کانگریس کے خیالات کو لوگوں کے دلوں سے دور کرنا تھا۔ لیکن بعد میں انھوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ کر کے ۱۸۹۳ء میں ایک اور جماعت "محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفینس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" کے نام سے قائم کی جس کے خاص مقاصد مسلمانوں کی رائیں انگریزوں اور گورنمنٹ ہند کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا، عام سیاسی شورش کو مسلمانوں میں پھیلنے سے روکنا... اور لوگوں میں وفاداری کے جذبات پیدا کرنا تھا۔

مسٹر بیک نے ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور انھیں انگریز حکومت کا دست نگر بنانے کی کوشش کی۔ طفیل احمد منگلوری نے یہ بتایا ہے کہ

> '۱۸۹۰ء میں مسٹر بیک نے مسٹر بریڈلا کے مسودہ قانون جمہوری حکومت کے خلاف مسلمانوں سے ہزارہا دستخط کرا کے عرضداشت بھجوائی تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ یہاں مختلف قومیں بستی ہیں اس لیے انتخابی کونسلیں اس ملک کے حسب حال نہیں۔ اس عرضداشت پر دستخط کرانے کے لیے مسٹر بیک نے طلبا کی کئی ٹولیاں باہر بھیجی تھیں اور ایک ٹولی کے ساتھ خود دلی گئے تھے جہاں جامع مسجد کے دروازے پر بیٹھ کر لوگوں کو یہ باور کرا کے دستخط حاصل کیے تھے کہ عرضداشت گئوکشی نہ بند کیے جانے کے بارے میں ہے۔ اس

کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے دستخطوں سے ایک اور عرضداشت بھیجی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ سول سروس کا امتحان ہندوستان میں جاری نہ کیا جائے اور بعد میں انھوں نے مقابلے کے سارے امتحانات کی مسلمانوں سے مخالفت کرائی۔ کالج میں انھوں نے کھیلوں پر زور دیا اور ایک ایسا ماحول تیار کیا جس میں لکھنے پڑھنے والوں کا مضحکہ اڑایا جاتا۔

چنانچہ بقول طفیل احمد منگلوری (جو خود اس دور کے علی گڑھ کالج کے طالب علم ہیں):

"کالج میں مسٹر بیک کا عمل دخل ہونے پر یہ ضرور ہوا کہ رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ طلبا کا زیادہ خلا ملا ہو گیا، مگر مساویانہ کی جگہ غلامانہ ذہنیت پیدا ہو گئی۔" [illegible]

کالج کے انتظامی معاملات میں بھی رفتہ رفتہ مسٹر بیک نے زیادہ اختیارات حاصل کر لیے۔ بورڈنگ ہاؤس بلکہ باورچی خانے کا انتظام بھی پوری طرح یورپین اسٹاف کے ہاتھ میں آ گیا اور محمد امین زبیری کے الفاظ میں:

"ہندوستانی کھانے کی عمدگی و خرابی ایک انگریز ممبر کی رائے پر منحصر ہو گئی۔ نیز ذائقہ کی نسبت اسی کا فیصلہ حتمی ہو گیا۔" [illegible]

ظاہر ہے اس کے نتیجے میں بعض اوقات طلبا کے ساتھ کشمکش کی صورت حال بھی پیدا ہوئی۔ مسٹر بیک کے زمانۂ پرنسپلی میں ہی ۱۸۹۷ء میں ایم۔ اے۔ او کالج میں پہلی اسٹرائک ہوئی جس کے نتیجے میں دو طلبا عزیز مرزا اور مظہر الحق کو خارج کیا گیا۔ [illegible]

بیک کے بعد تھیوڈور ماریسن کالج کے پرنسپل ہوئے اور انھوں نے کالج کے معاملات میں وہ

اقتدار حاصل کیا جو اُن کے پیشرو حاصل نہ کر سکے تھے۔ جب اگست ۱۹۰۰ء میں اردو ہندی کے قضیے پر نواب محسن الملک نے سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ پیش کیا تو اس وقت ماریسن لفٹننٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل سے جا کر ملے اور لفٹننٹ گورنر نے انھیں کسی طرح حکومت اور سکریٹری کے درمیان واسطہ بنایا اس کے نتیجے میں ماریسن کا در[جہ] سکریٹری سے بالاتر ہو گیا۔ [illegible] اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے جو تعلیمی کمیشن مقرر کیا۔ اس سلسلے میں ماریسن کو بھی امپیریل کونسل میں عارضی ممبر نامزد کیا گیا [illegible] اس سے ان کا وقار اور اقتدار اور بڑھ گیا اور ماریسن نے کالج کے معاملات میں آمرانہ اند[از] سے اپنی رائے کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چنا[نچہ] مختلف معاملات میں انھوں نے سکریٹری، ٹرسٹیوں اور طلبا پر شدید دباؤ ڈالنا چاہا جس کے نتیجے میں ایک مخالفت اور کشمکش کا ماحول پیدا ہو گیا اور کالج کے باشعور طلبا کے لیے ان شورشوں سے خود کو دور رکھ[نا] دشوار ہو گیا۔

۱۹۰۳ء میں ایک اور اہم واقعہ پیش آیا جب مولانا محمد علی آکسفرڈ سے بی۔ اے کی ڈگری لے کر آ[ئے] اور انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج کے اسٹاف میں ش[امل] ہونے کی کوشش کی۔ نواب محسن الملک ان کی قابلی[ت] کے معترف تھے اور کالج میں زمانۂ طالب علمی کے دو[ران] ان کے بارے میں خود ماریسن کی بڑی اچھی رائے تھی [لیکن] کالج میں تقرر کے معاملے پر ماریسن نے سخت مخا[لفت] کی جس کی وجہ سے محمد علی کی درخواست مسترد کر د[ی] گئی۔ [illegible] اس کے نتیجے میں محمد علی نے کالج کے معاملا[ت] میں یورپین اسٹاف کے اقتدار کے خلاف باقاعدہ مہم کا آغاز کیا۔ انھیں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن [کے] ایک طبقے کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انھیں

نواب وقار الملک جیسے بعض بااثر ٹرسٹیوں کی بھی تائید مل گئی تھی۔ چنانچہ اپنی تحریر و شرافت و باوجاہت شخصیت کے اثر سے انھوں نے کالج کے طلبا کی ایک اچھی تعداد کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ کالج کے باہر اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع کرکے انھوں نے اپنی شکایات کو ساری قوم کے سامنے بھی عام کرنا شروع کر دیا۔ ان ساری کارروائیوں کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ کالج کے انگریز پرنسپل اور انگریز اسٹاف میں کالج کے طلبا کے لیے ایک واضح طور پر مخالفانہ رویّہ پیدا ہو گیا۔ دوسری جانب طلبا میں انگریز مخالف جذبات نے زیادہ تقویت حاصل کر لی۔

۱۹۰۳ء میں کالج کے طلبا، ٹرسٹیوں اور یورپین اسٹاف کے درمیان تعلقات مزید بگڑنے لگے۔ اسی زمانے میں کالج کے بعض طلبا کو ایک انگریز مشنری خاتون نے انجیل پڑھانا شروع کیا۔ اس پر لوگوں کو اعتراض ہوا۔ چنانچہ نواب محسن الملک نے طلبا کو اس تعلیم کے لیے ممانعت کر دی۔ اس پر ماریسن نے نہ صرف نواب محسن الملک کو تحریری طور پر اپنی ناراضگی سے مطلع کیا بلکہ یہ بھی لکھا کہ

> اگر اس معاملے میں کچھ شورش یا مداخلت
> ہوئی تو میں کالج کے طلبا کو اپنی بی بی
> سے نہیں ملنے دوں گا، نہ اُن کو اپنے
> بنگلہ میں آنے دوں گا۔[شه]

اسی سال ایک اور معاملے نے شدید مخالفت کا ماحول پیدا کیا۔ اس کا تعلق کالج میں عربی تعلیم پر زور دینے سے تھا۔ کالج کے ایک پروفیسر ہارڈ ور براؤن نے یہ تجویز رکھی کہ کالج میں عربی علوم کی تکمیل اور تحقیقات کے لیے ایک دار العلوم کھولا جائے جس میں ہندوستانی اور مصری پروفیسر مقرر کیے جائیں۔[عه] اس اسکیم کو ماریسن کی تائید حاصل تھی۔ اسے یونین کلب میں مباحثے کے لیے بھی پیش کیا گیا اور طلبا نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں۔[عه] نواب محسن الملک نے بھی مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم کے حصول کے مقصد کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس اسکیم کی شدید مخالفت کی اور یہ اسکیم بروئے کار نہ آ سکی۔[عه] اس کے بعد ایک اور موقع پر ماریسن کی تائید سے یونین کلب میں بحث کے لیے یہ مضمون پیش ہوا:

> "خلافت موجودہ اسلام میں کوئی چیز
> نہیں اور مسلمانانِ ہند سلطنت برطانیہ
> کی رعایا ہو کر کسی دیگر سلطنت کے فرمانروا
> کو خلیفہ نہیں مان سکتے۔"

اس پر بھی گرما گرم بحث ہوئی اور تجویز مسترد ہو گئی۔ محمد امین زبیری لکھتے ہیں کہ ان واقعات سے بھی طلبا کی جانب ماریسن کے برتاؤ میں فرق آ گیا۔[عه]

وسط ۱۹۰۴ء میں ماریسن نے کالج کی پرنسپلی سے سبکدوشی کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ کالج کے معاملات پر جس طرح حاوی ہو چکے تھے اس کے نتیجے میں انھوں نے یہ چاہا کہ وہ کالج کے ایک سینیئر پروفیسر جے۔ آر۔ کارنا کو اپنا جانشین مقرر کر جائیں۔ اس تجویز نے ماریسن اور کالج کے بعض ٹرسٹیوں کے درمیان ایک سنگین تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ نواب محسن الملک نے ماریسن کی سفارش کو کسی قدر تردد و تامل کے بعد ایک حد تک منظور کر لیا لیکن نواب وقار الملک نے اس کا اختلاف کیا اور ۲۲ر اگست ۱۹۰۴ء کو انھوں نے ٹرسٹیوں کو ایک مفصل خط لکھا جس میں انھوں نے کالج کے قیام کے بارے میں سرسیّد کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ صورتِ حال کے سنگین نتائج کی جانب نشان دہی کی گئی ہے[عه] ادھر ماریسن نے نواب محسن الملک کو یہ باور کرایا کہ اگر اُن کی تجویز پر عمل نہیں کیا گیا تو کالج کا سارا یورپین عملہ کالج چھوڑ کر چلا جائے گا۔[عه] ماریسن اس طرح اپنا جانشین نامزد کرنے کی جو نظیر ڈال رہے تھے وہ نہایت تشویش ناک

تھی۔ چنانچہ مولانا حالی نے بھی اس خطرے کو محسوس کیا۔ انھوں نے نواب وقار الملک کو لکھا کہ

"علاوہ اور خرابیوں کے جو مسٹر کارنا کے
پرنسپل ہونے سے پیدا ہوں گی اور نہایت
مضر نتیجے پیدا ہوں گے ایک یہ ہے کہ آئندہ
ٹرسٹیوں کو یہ اختیار باقی نہ رہے گا کہ
وہ کسی نئے پرنسپل کو اپنی رائے یا اختیار
سے مقرر کریں۔ کیونکہ اگر اس وقت مسٹر
مارسین کی تجویز کامیاب ہو گئی تو پھر ہمیشہ کو
ہر پرنسپل کا یہ واجبی حق ہو جائے گا کہ اپنے
جانشین کو خود تجویز کرے۔" [۳۸]

ٹرسٹیوں کے درمیان خط و کتابت سے نکل کر یہ مسئلہ بہت جلد اخبارات تک پہنچ گیا لیکن اس کا سب سے زیادہ نمایاں اثر یورپین اسٹاف اور کالج کے طلبا کے درمیان تعلقات پر پڑا۔ یورپین اسٹاف سے طلبا کو شکایت کا آغاز تقریباً ۱۹۰۰ء سے ہو چکا تھا جب کہ بورڈنگ ہاؤس میں مقیم طلبا نے کھانے کے بارے میں شکایتیں کیں جو کہ سختی کے ساتھ رد کر دی گئیں۔ پھر طلبا نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ تھوڑا سا ٹیکس ادا کرنے پر ایسے لوگوں کو کالج میں مٹھائی وغیرہ فروخت کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو نہایت ردّی چیزیں بیچتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک طالب علم کے والد کو جب کہ وہ اسکول سے گزر رہے تھے ایک یورپین پروفیسر نے ٹھوکروں سے مارا تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ پروفیسر طلبا کی موجودگی میں ٹرسٹیوں اور دوسرے باحیثیت مسلمانوں کے لیے حقارت آمیز کلمات استعمال کرتے تھے۔ طلبا نے اس بات کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا کہ ایک پروفیسر کی اس شکایت پر کہ حکیم محمود اور مولوی زین العابدین کے ملازم ان کے گھوڑوں کو تنگ کرتے ہیں، انھیں سزائیں دی گئیں اور ان پر جرمانہ کیا گیا۔

یہاں تک کہ ایک انگریز پروفیسر نے اپنے کلاس میں یہ کہا تھا کہ:

"بیک کالج کو چاہتے تھے، مارلیسن
دکھاوا کرتے تھے کہ وہ اسے چاہتے ہیں
لیکن میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔"

اس قسم کے واقعات سے طلبا میں اشتعال پیدا ہونا بالکل فطری تھا۔ چنانچہ جب مسٹر مارلیسن نے پرنسپل کے لیے مسٹر کارنا کا نام تجویز کیا تو طلبا نے بھی اس کی مخالفت کی۔ مسٹر مارلیسن کے زمانہ پرنسپلی کے آخری دور میں طالب علموں کی جانب سے نہ صرف مسٹر مارلیسن کے ہی رویے میں سخت تبدیلی آ گئی تھی بلکہ دوسرے یورپین اساتذہ بھی طلبا کے ساتھ نہایت حقارت آمیز سلوک کر رہے تھے۔ اس قسم کے برتاؤ کی وجہ جن اساتذہ سے طلبا بالخصوص شاکی تھے ان میں مسٹر بیلاکن اور کارنا تھے۔ کارنا کے کیا خیالات تھے اور ان کی بد دماغی کس درجے پہنچ چکی تھی اس کی بعض مثالیں نواب وقار الملک نے ٹرسٹیوں کے نام اپنے خط ۲۲ اگست ۱۹۰۴ء میں تحریر کی ہیں۔ [۳۹]

"ایک عرصہ میں ان کی یہ رائے رہی
کہ علی گڑھ کو صرف ہائی اسکول تک رکھنا
مناسب ہے اور ایک موقع پر انھوں نے
فرمایا کہ انگلش تعلیم کی بہ نسبت مسلمانوں
کو کمل ہندی کی تعلیم زیادہ فائدہ بخش ہو گی
..... بورڈنگ ہاؤس کے ملازموں
سے انھوں نے فرمایا کہ تمہاری عشا اور صبح
کے وقت اذان سے مجھ کو بہت تکلیف
ہوتی ہے۔ اگر تم اس کو بند نہ کرو گے
تو میں تمہارے نماز کے چبوترے کو اکھاڑ
کر پھینک دوں گا..... بارہ وفات

کی تعلیم و ملی سیاسی ہوتی تھی انھوں نے
بند کی اور جب نواب محسن الملک کی ہدایت
سے طلبا نے ان کے بنگلے پر جاکر ان سے تعطیل
کی درخواست کی تاکہ ان کو مجلس میلاد شریف
منعقد کرنے کے واسطے وقت ملے تو اُن کے
ساتھ وہ نہایت درشتی سے پیش آئے۔"

اس سیاسی مخالفانہ فضا کے باوجود جب مارچ ۱۹۰۵ء میں مسٹر ماریسن سبکدوش ہوے تو کا لج ان کے قائم مقام ہوے اور ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو مسٹر ڈبلو۔ اے جے آرچبولڈ کے کام سنبھالنے تک کالج کے پرنسپل رہے۔[۳۱] آرچبولڈ بھی آتے ہی دوسرے یورپین اسٹاف کے رنگ میں رنگ گئے اور انھوں نے طلبا پر ڈسپلن کے نام پر اور زیادہ سختیاں کرنا شروع کر دیں۔

تین ماہ بعد ہی جنوری ۱۹۰۶ء میں سید مصطفیٰ حسین رضوی کے اخراج کا واقعہ پیش آیا۔ مصطفیٰ حسین کالج کے ایک سینیر طالب علم تھے اور انھوں نے طلبا کی جانب سے پرنسپل کو بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات کے بارے میں چند شکایتوں پر مشتمل ایک یادداشت پیش کی تھی۔ ان شکایتوں کا اثر مسٹر گارڈنر براؤن پیوڈسٹ پر پڑتا تھا۔ پرنسپل نے اس شکایت کو ڈسپلن کے خلاف قرار دیا اور انھوں نے شکایت کی تحقیقات کیے بغیر مصطفیٰ حسین کو بورڈنگ ہاؤس اور کالج چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ طلبا میں اس کی وجہ سے غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی لیکن اس سے زیادہ ہنگامہ خیز صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب نواب محسن الملک کی دعوت پر مصطفیٰ حسین نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے میٹنگ میں شرکت کی۔ مسٹر آرچبولڈ مصطفیٰ حسین کی موجودگی کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے برافروختہ ہو کر کہا کہ:

"مجھے یا مصطفیٰ حسین دونوں میں سے
کسی ایک کو میٹنگ سے چلا جانا چاہیے"

اور مصطفیٰ حسین کو چلا جانا پڑا۔ بقول محمد امین زبیری:

"اب یہ معاملہ قومی توہین کا سوال بن
گیا۔ علی برادرس نے سوالات کی
بوچھار کر دی اور غضب آلود خطوط
تحریر کیے۔"[۳۲]

مولانا محمد علی اور شوکت علی کا یہ اصرار تھا کہ نواب محسن الملک نے آرچبولڈ کو اس عمل پر کھلے بندوں معافی مانگنے پر مجبور کریں۔ نواب محسن الملک نے مصالحانہ رویہ اختیار کرنا چاہا تو اسے ان کی کمزوری تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ محمد علی نے یہاں تک کہا کہ:

"اگر پرنسپل آرچبولڈ یعنی مہادبنگ)
ہے تو سکریٹری آرچ ویک (یعنی
مہادتو) ہے۔"[۳۳]

ان خطوط اور اخبارات میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے مراسلات نے طالب علموں کے ذہنوں میں جہاں سکریٹری اور ٹرسٹیوں کے لیے عزت و احترام کے جذبے پر ناگوار اثر ڈالا وہیں یورپین اسٹاف اور طلبا کے درمیان کشیدگی بڑھتی رہی جس نے رفتہ رفتہ ایک سنگین صورت حال کی شکل اختیار کر لی۔ کیونکہ کالج کے طلبا کو مصطفیٰ حسین رضوی کے ساتھ برتاؤ نے یہ احساس دلادیا تھا کہ ان کی شکایات پر کوئی معقول توجہ دیا جانا ممکن نہیں۔ خان بہادر مولوی بشیرالدین خان نے اس پس منظر کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"مسٹر ماریسن صاحب نہ صرف کالج کے
اندرونی انتظامات میں دخیل تھے بلکہ وہ
گورنمنٹ کے سیاسی معاملات میں محمڈن
کالج کو آلہ بنائے ہوئے تھے۔ جو ڈیپوٹیشن

ایلین بھیجا گیا تھا اس میں سکریٹری اور ممبران سے بغیر دریافت کیے انھوں نے کالج فنڈ سے ایک ہزار روپیہ نکلوالیا۔ جب بعض لوکل ٹرسٹیوں نے اس کارروائی کی مخالفت کی تو نواب محسن الملک کو ایک خط بھیجا کہ ان ٹرسٹیوں کے نام لکھو جو اس تجویز کے مخالف ہیں تاکہ میں وائسرائے کے سامنے یہ نام پیش کر دوں۔ غرض کہ مسٹر ماریسن کی اس قسم کی بہت سی بے ضابطگیاں تھیں جو واقعتہً لوکل ٹرسٹیوں کو ناگوار گزرتی تھیں اور اس کی شکایت نواب محسن الملک سے سخت الفاظ میں کرتے تھے۔ ... مسٹر ماریسن کا اثر نہ صرف لوکل گورنمنٹ میں تھا بلکہ گورنمنٹ انڈیا میں بہت بڑھا ہوا تھا اور جماعت ٹرسٹیان میں گورنمنٹ کا خوف اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر گورنمنٹ ناراض ہوئی تو کالج کی امداد بند ہو جائے گی اور بغیر گورنمنٹ کی امداد کے کالج نہیں چل سکتا اور سرکاری ملازمتیں جو مسٹر ماریسن کی وجہ سے مسلمانوں کو ملتی ہیں، آئندہ یہ ملازمتیں مسلمانوں کو نہ ملیں گی اور اس طرح مسلمانوں کی قوم کو سخت نقصان پہنچے گا۔ دوسری طرف کالج کے طلب

ہیں اس قدر سیاسی بیداری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ مسٹر ماریسن کی اس قسم کی کاروائیوں سے سخت ناراض رہتے تھے۔ اس ناراضگی کا اثر یہ ہوا کہ طالب علموں میں روز بروز ایسی جماعت ترقی کر رہی تھی جو نہ صرف پرنسپل کے خلاف تھی بلکہ انگریزی قوم کے خلاف ان میں جذبات بھڑک رہے تھے۔ تیسری طرف بعض جوشیلے ٹرسٹی ان واقعات کو غم و غصے کے ساتھ دیکھتے تھے۔ غرض کہ مسٹر ماریسن نے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ مسٹر آرچ بولڈ پرنسپل ہو کر آئے۔ پرنسپل اور ان کے یورپین اسٹاف کا برتاؤ طالب علموں کے خلاف ہونا شروع ہوا۔ طالب علم ناراض ہوتے تھے اور اپنی شکایت نواب محسن الملک کے پاس لے کر آتے تھے۔ نواب محسن الملک طالب علموں سے حکمت آمیز گفتگو کر کے اُن کی تسلی و تشفی کرتے تھے۔ مسٹر آرچ بولڈ کو طالب علموں کا نواب صاحب کے یہاں جانا سخت ناگوار تھا۔" [2]

(جاری ہے)

حوالہ جات

[1] شیخ محمد اکرام۔ موجِ کوثر۔ تاج کمپنی لاہور۔ ۱۹۴۰ء
[2] محمد امین زبیری تذکرۂ محسن ص ۲۰۰

۳ محمد امین زبیری تذکرۂ محسن ص ۲۰۰

۴ طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۳۲۴

۵ محمد امین زبیری: تذکرۂ محسن ص ۲۰۳

۶ ایضاً اس اشتراک کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے انعام الٰہی: مولوی عزیز مرزا۔
علی گڑھ میگزین (علی گڑھ نمبر) [illegible] ۱۹۵۴-۵۵ء ص ۲۷

۷ محمد امین زبیری: تذکرۂ محسن ص ۱۰۲ و ۲۰۳

۸ ایضاً ص ۱۰۹

۹ شیخ محمد اکرام: "موج کوثر" ص ۴۷

۱۰ حبیب اللہ خاں: حیات آفتاب ص ۵۳

۱۱ محمد امین زبیری: تذکرۂ محسن ص ۱۰۹

۱۲ ایضاً ص ۲۰۴

۱۳ ایضاً ص ۱۱۰ و ۱۱۱

۱۴ ایضاً ص ۲۴۲

۱۵ محمد اکرام خاں ندوی: وقار حیات ص ۴۳۶ و ۴۳۷

۱۶ مکتوب نواب محسن الملک بنام نواب وقار الملک "مکاتیب نواب محسن الملک و نواب وقار الملک"
مرتبہ محمد امین زبیری ص ۴۴ و ۴۵

۱۷ مکتوب مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۰۴ء۔ مکتوبات حالی حصہ اول۔ مرتبہ خواجہ سجاد حسین صفحہ ۳۔

۱۸ Report of the Committee of Enquiry at Aligarh M.A.O College ...

۱۹ محمد اکرام اللہ ندوی: وقار حیات ص ۴۳۷

۲۰ S.K. Bhatnagar, The History of the M.A.O College, Aligarh p.200

۲۱ محمد امین زبیری: تذکرۂ محسن ص ۲۱۸

۲۲ S.K. Bhatnagar. The History of the M.A.O. College, Aligarh
بحوالہ سر رضا علی، اعمال نامہ pp 188—189

۲۳ اخبار البشیر اٹاوہ۔ دسمبر ۱۹۳۳ء۔ بحوالہ محمد امین زبیری: تذکرۂ محسن۔
صفحات ۲۳۴ تا ۲۳۶

"ہم تم کو کچھ چیزوں کے ساتھ آزمائیں گے، ڈر اور بھوک سے مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصانات سے اور خوشخبری دو صبر کرنے والوں کو۔" (سورہ بقرہ ۱۵۵)

سر سید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہ

ابو سفیان اصلاحی ○

مصر کے محمد عبدہ (۱۸۴۹ء - ۱۹۰۵ء) اور ہندوستان کے سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) کی زندگیوں کے نشیب و فراز اور حالات و کوائف کا جائزہ لیا جائے تو دونوں شخصیتوں میں بڑی ہم آہنگی اور مماثلت نظر آتی ہے۔ کافی حد تک دونوں کی جدوجہد اور اصلاحات کے طریقے یکساں نظر آتے ہیں۔ دونوں کا ملت اسلامیہ سے غیر معمولی ربط تھا۔ ملت اسلامیہ کی غفلتوں اور انحطاط و زوال کا دونوں پر بڑا گہرا اثر رہا۔ دونوں امت مسلمہ سے سیادت و قیادت کا کام لینا چاہتے تھے، دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں انھیں بلند و بالا دیکھنے کے خواستگار تھے۔ محمد عبدہ نے اس کے لیے اس بات پر زور دیا کہ ہم اپنے تمام مسائل کا حل قرآن کریم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں تلاش کریں اور سر سید نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا کہ ملت اسلامیہ کی ترقی اور کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ ایک طرف وہ مذہب اسلام کے تمام تقاضوں کو پورا کرے اور دوسری طرف نئے علوم کے حاصل کرنے میں پیش پیش رہے۔ علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کو حاصل کر کے ہی ملت اسلامیہ عظمت و رفعت کے مقام پر فائز ہو سکتی ہے۔ دونوں شخصیتوں کے انداز فکر میں اختلاف تو ہے لیکن مقصد ایک ہے اور وہ ہے ملت اسلامیہ کی بقا، دوام اور ترقی۔

دونوں کا عہد

سب سے پہلے دونوں شخصیتوں کے عہد کا قدرے جائزہ لے لیا جائے کہ اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کیا تھے۔ محمد عبدہ ۱۸۴۹ء میں مصر میں پیدا ہوئے تو انگریزوں کا دور دورہ تھا۔ اس سے پہلے ۱۷۹۸ء میں فرانسیسی مصر کا ایک بار خون چوس کر جا چکے تھے۔ دوبارہ انگریز ۱۸۸۲ء سے ۱۹۵۲ء تک مختلف انداز سے مصر کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس دوران انگریزوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ مصر کے مسلمانوں کو ان کے مذہب اور تہذیب تمدن اور معاشرت سے ناآشنا کر دیا جائے۔ ان کے درس و تدریس کے سلسلوں کو ختم کیا جائے، اسکولوں میں نئے نصاب کا نفاذ ہو۔ انھیں ان کی تاریخ سے لاتعلق کر دیا جائے اور مصری طلبا کو نئے عادات و اطوار کا عادی بنایا جائے۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنے استحکام کے لیے یہ سب کام کیے۔ اسکولوں کے نصاب

○ لکچرر شعبۂ عربی، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

تبدیلی ہو رہی ہے۔ جب مصر کے شہروں اور پبلک اسکولوں کی بنیاد ڈالی گئی۔ ان اسکولوں سے تاریخ ملت اسلامیہ کو کالعدم قرار دیا گیا اور ذریعہ تعلیم عربی کے بجائے انگریزی کر دیا گیا جس کی وجہ سے مصری معاشرہ بڑی تیزی سے مغربیت سے قریب ہونے لگا۔ ایک طرف یہ سیلاب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ دوسری طرف جامعۂ ازہر ہلاکت کے دہانے سے قریب ہو رہا تھا۔ ازہری شیوخ نے جامعہ ازہر کو رجعت گاہ تصور کر رکھا تھا۔ انھیں صرف اپنی ذہنی اور تقلیدی پسندی کا خیال تھا۔ قوم کے نونہالوں اور ملت کے مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مغربیت کے سیلاب کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی سے غلط عقائد رسومات اور بدعات خرافات قوم کے اندر پھیل رہے تھے۔ انہی سنگین حالات میں محمد عبدہٗ نے اپنی تعلیمی اور معاشرتی اصلاحات کی تحریک کا آغاز کیا۔

سرسید احمد خاں نے جب ۱۸۱۷ء میں آنکھ کھولی تو مغلیہ حکومت کا آفتاب لب بام آچکا تھا۔ اس کی شان و شوکت اور قدر و منزلت کی داستان دم توڑ رہی تھی۔ سرسید کے خاندان کا مغلیہ حکومت سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ سرسید کے گھرانے میں بہت پہلے سے مغل فرماں رواؤں کے عہدے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں جب حکومت برطانیہ کا ہندوستان پر پوری طرح قبضہ ہو گیا اور مسلمانوں کو بے پناہ ذلتوں اور رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا تو سرسید پر اس کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ سرسید نے دلی کی تباہی اور مسلمانوں کی سیاسی موت کا مشاہدہ بڑے قریب سے کیا تھا۔ سرسید نے یہ آواز اپنے کانوں سے سنی تھی جب مغل شہزادے چھتوں پر چڑھ کر چلاتے کہ ہم بھوکے ہیں۔ انھیں مغلوں سے اب کوئی امید وابستہ نہ تھی۔ اس لیے وہ ایک ایسی راہ کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے کہ جس سے مسلمانوں کے وقار کو بحال کیا جائے۔ انھیں پستی و انحطاط سے نکالا جائے۔ ان ہی حالات میں سرسید نے آنکھیں کھولیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے سرسید کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب ہندوستان سے مسلمانوں کا وجود ختم ہو جائے گا چنانچہ ان حالات میں سرسید نے قوم کی اصلاح اور ترقی کا بیڑا اٹھایا۔

محمد عبدہٗ اور سرسید کے حالات میں کس قدر یکسانیت ہے، دونوں ہی انگریزوں کے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کو سرزمین ہستی سے نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں دونوں کی اصلاحی تحریک کے چلانے کی کیا حکمت عملی رہی، اس میں بھی دونوں کافی حد تک متفق نظر آتے ہیں۔

حصول تعلیم پر زور

ان حالات میں دانش مندی کا تقاضا یہ تھا کہ انگریزوں سے براہ راست ٹکر نہ لی جائے۔ بلکہ سب سے پہلا کام یہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو علم کی دنیا میں آگے بڑھایا جائے چنانچہ دونوں نے اپنے اپنے بس کے مطابق اپنے اپنے ملک میں حصول تعلیم پر زور دینا شروع کر دیا۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ سرسید نے علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ عصری علوم کے حصول پر کافی زور دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کر کے ہی دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کا ہندوستانی مسلمان مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سرسید کے ذہن میں پہلے اردو میڈیم کی یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال تھا لیکن حالات کے مدنظر یہ ارادہ ترک کر کے انگریزی میڈیم پر زور دیا۔ سرسید کے برخلاف محمد عبدہٗ کا خیال یہ تھا کہ ہم علوم دینیہ حاصل کر کے ہی ذلتوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مصری اسکولوں میں انگریزوں نے انگریزی

ذریعہ تعلیم بنایا تو اس پر عبدہ نے کئی مقالات لکھے جن میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر تنقید کی کہ عربی زبان ہی ہمارے وقار اور تشخص کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ عبدہ نے افغانی کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا کہ ہم براہ راست انگریزوں سے برسر پیکار ہو کر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ سر سید بھی انگریزوں کے وفادار رہ کر ہی اپنی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرتے گئے۔

تعلیمی ادارے

حصول تعلیم کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے دونوں شخصیتوں کو تعلیمی ادارے کی اشد ضرورت تھی عبدہ کو اس سلسلے میں آسانی یہ ہوئی کہ مصر میں قدیم ترین یونیورسٹی جامعہ ازہر پہلے سے موجود تھی اور جامعہ ازہر کا پورے ملک و ملت میں ایک بلند و بالا مقام تھا لیکن جامعہ ازہر کے حالات اس وقت بہت ناگفتہ بہ تھے۔ تعلیم و نصاب کا کوئی مقررہ نظام نہ تھا۔ کلاس اور امتحان کا کوئی تصور نہ تھا۔ طلبا پر ایسی کوئی سختی نہ تھی کہ وہ کلاس میں ہیں یا نہیں۔ دوران تدریس طلبا نے پر بھی ان پر کوئی قدغن نہ تھی۔ شیوخ اپنے میں مگن رہتے۔ انھیں وقت کی پابندی اور طلبا کی حاضری و غیر حاضری کا کوئی خیال نہ ہوتا۔ سالہا سال سے وہ طلبا کے سامنے مختلف شرحوں کی قرات کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان تمام چیزوں کی اصلاحات کے لیے عبدہ نے بے شمار مقالات لکھے اور حکومت سے اصلاحات کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ عبدہ نے نصاب میں بڑی تبدیلیاں کیں۔ بہت سی نئی چیزیں مرحلہ وار داخل کیں درجہ بندی کا اہتمام کیا۔ چنانچہ شیوخ محمد عبدہ کے دشمن بن گئے اور انھیں دائرہ اسلام سے خارج کیا عبدہ نے جامعہ ازہر کے ہاسٹلوں میں بھی خوش گوار تبدیلیاں کیں اور طلبہ کے [illegible]

سر سید کو اپنے شہر کے لیے مراد آباد اور غازی پور رہتے ہوئے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالنی پڑی۔ چنانچہ سرزمین علی گڑھ پر سر سید نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی۔ کالج کی تعمیر کے لیے انھوں نے پورے ہندوستان سے روپیے جمع کیے۔ ۱۸۶۹ء میں جب انھوں نے انگلستان کا سفر کیا تو انھوں نے بغور وہاں کی ترقی یافتہ زندگی کا مطالعہ کیا تھا اور کیمبرج یونیورسٹی میں جو کچھ سیکھا تھا اسے نوٹ کر لیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بھی اسی طرز کی ایک یونیورسٹی قائم کریں اور اعلی تعلیم کا اہتمام کریں تاکہ ہندوستان کے مسلمان آج کے ترقی یافتہ اور سائنسی دور میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ چنانچہ ملک کے گوشے گوشے سے مسلم طلبا یہاں پڑھنے کے لیے آئے اور رفتہ رفتہ یہی مدرسۃ العلوم اور کالج ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ آج دنیا اس مدرسۃ العلوم کو مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانتی ہے اور اس کا شمار دنیا کی چند اہم جامعات میں ہوتا ہے اگر آج یہ یونیورسٹی نہ ہوتی تو مسلمانوں کا کیا حال ہوتا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ علم کا یہ دریا یونہی انشاء اللہ تا قیامت جاری و ساری رہے گا۔ یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ دونوں نے اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ادارے کا سہارا لیا۔ اب ایک نے ادارہ قائم کیا اور دوسرے نے قائم شدہ ادارے کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔

رسائل کا اجراء

تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ایک تحریک اور ایک مصلح کے لیے کسی آرگن کی شدید ضرورت ہوتی ہے یہ آرگن ایک طرف تو اپنا حلقہ وسیع کرتا ہے اور دوسرے عائد کردہ الزامات کی تردید کرتا ہے۔ سر سید نے ۱۸۷۰ء

میں تہذیب [illegible] کیا۔ اس میں وہ مختلف تعلیمی اور معاشرتی مسائل پر اظہار خیال کرتے۔ ان کی تحریک اور ادارہ پر کوئی اعتراض کیا جاتا تو اس کی وضاحت کرتے کہ یہ اعتراض کس حد تک درست اور کس حد تک غلط ہے۔ وہ اس رسالے میں اپنے تمام کاموں کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کرتے۔ عبدہ نے خود تو کوئی رسالہ نہیں جاری کیا بلکہ مصر کے سرکاری رسالہ الوقائع المصریہ کے ۱۸۸۰ء میں ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ ایڈیٹری کے دوران متعدد معاشرتی، تعلیمی اور دینی مقالات تحریر کیے ان تمام مقالات کا مقصد صرف اصلاح تھا۔ انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ قوم کے اندر سے خرافات و فسادات کو ختم ہونا چاہیے۔ انھوں نے اصلاح زبان اور اسلوب پر بھی کافی زور دیا کہ مقالات ایسی زبان میں لکھے جائیں جو آسان اور عام فہم ہو۔ سرسید نے بھی زبان و اسلوب کی اصلاحات کے سلسلے میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے الوقائع المصریہ کے علاوہ بھی عبدہ نے بہت سے مجلات میں مقالات تحریر کیے۔ رشید رضا کے "المنار" میں بھی عبدہ کے بہت سے مضامین اور درس قرآن پابندی سے شائع ہوتے۔ یہاں بھی دیکھیے کہ دونوں نے آرگن کو اپنی تحریک کے لیے ضروری تصور کیا۔

مستشرقین کے اعتراضات کے جواب

مستشرقین کو اسلام سے ذاتی عناد ہے۔ وہ طرح طرح سے اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کر دینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ اسلام پر بے شمار الزامات عائد کر کے اس میں نقص بتلاتے ہیں۔ قرآن کریم کو ایک عام انسانی کتاب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ ایک نبی اور رسول کے بجائے نجانے کیا کیا قرار دیتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہر زمانے میں بہت سے ایسے اسلام پسند محقق تھے جنھوں نے اسلام کی حقانیت کو ثابت کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے الزامات غیر مدلل ہیں اور تعصب پر مبنی ہیں انھی اسلام پسند مصنفین کے سلسلے کی ایک کڑی سرسید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہ بھی ہیں۔ دونوں ہستیوں نے ہمیشہ اسلام کی بالادستی قائم کرنی چاہی اور مذہب اسلام کو دلائل کی روشنی میں الہامی مذہب قرار دیا۔

سرسید ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے تو انھوں نے وہاں سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کا جواب لکھنا چاہا جس میں انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر بہت رکیک حملے کیے تھے۔ اس کتاب کا جواب وہ ہندوستان ہی میں بیٹھ کر دینا چاہتے تھے لیکن جواب کے لیے جن کتابوں اور مواد کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں دستیاب نہیں تھا کیونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں مسلمانوں کا بہت سا علمی مواد بھی ضایع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے سرسید اپنے ذاتی اسباب کو بیچ کر اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ چنانچہ انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں بیٹھ کر انھوں نے اس کتاب کا جواب لکھا اور وہیں اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر شایع بھی کرا دیا۔ اس کتاب کو علمی دنیا 'خطبات احمدیہ' کے نام سے جانتی ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف میور کے بلکہ بہت سے دوسرے عیسائی مصنفین کے بے جا الزامات کے بھی جواب دیے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سرسید اسلام اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے سچے فرماں بردار اور معتقد تھے۔

سرسید کی طرح عبدہ بھی زندگی بھر اسلام کی سچائی کا اعلان کرتے رہے کہ اسلام ہی تنہا مذہب ہے جو سچے حقائق پر مبنی ہے۔ اسلام تعصبات و توہمات کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ دین ہادیٔ برحق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ اسلام کے نظریۂ "قضا و قدر" کا عیسائی مصنف رینان نے بڑا مذاق اڑایا اور بتایا کہ یہ

قدامت پسندی اور رجعت پسندی کی ایک بین مثال
ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نظریے سے اسلام مسلمانوں
کے اندر سے جدوجہد کی اسپرٹ کو ختم کرنا چاہتا ہے،
اس عقیدے ہی کی وجہ سے مسلمان آج دنیا میں ذلیل و
رسوا ہیں۔ لیکن عبدہ نے بتایا کہ اس نے قضا و قدر
کے متعلق یہ تمام باتیں عداوت و تعصبات کی بنیاد پر کہی
ہیں۔ چنانچہ عبدہ نے اس الزام کا نہایت مدلل اور
مسکت جواب دیا اور بتایا کہ یہ عقیدہ مسلمانوں کے اندر
سے بزدلی و دنائت اور پست ہمتی کو ختم کرتا ہے۔
یہ عقیدہ امت مسلمہ کی تطہیر کرتا ہے۔ محمد عبدہ نے
"النصرانیہ والاسلام و اھلیہا" کے عنوان سے کئی مقالات
تحریر کیے اور بتایا کہ عیسائی مذہب صرف نرمی اور مصلحت
پر مبنی ہے۔ عیسائیت میں حکومت اور قصاص کا کوئی
تصور نہیں وہ رہبانیت کا داعی ہے۔ اسلام اس
کے برعکس ہے۔ وہ رہبانیت کے بجائے جدوجہد کی
دعوت دیتا ہے۔ وہ دین و دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر
چلتا ہے۔ وہ دنیا کی تمام چیزوں کو اسلامی نقطۂ نظر
سے دیکھتا ہے۔ وہ گوشہ نشینی کا شدید دشمن ہے
وہ شریعت اسلامی سے ٹکرانے والے تمام نظام کو باطل
قرار دیتا ہے۔ عبدہ نے فرانسیسی فلسفی رینان کو بھی
مسکت جواب دیا جس کا کہنا تھا کہ اسلام حصول علم کا
مخالف ہے۔ عبدہ نے جتایا کہ اسلام کا پہلا زینہ تعلیم و
تعلم سے شروع ہوتا ہے۔ اب یہ بات کھل کر منظر عام پر
آگئی کہ دونوں اسلام کے تئیں کتنے سچے جذبات کے حامل
تھے۔ سر سید اور عبدہ کے اور بھی بہت سے ایسے کام
ہیں جو مستشرقین کی تردید میں کیے گئے۔

قرآن کریم کی تفسیر

سر سید اور عبدہ کے زمانے میں بہت سی تفاسیر
مختلف زبانوں میں موجود تھیں، یہ دونوں ایسی تفسیر لکھنا
چاہتے تھے جو ایک حد تک [illegible]۔ پہلی تفاسیر
سے ہٹ کر ان عقلی تحقیقات کی تفسیر ایک نئے اسلوب
اور جدید طرز تحقیق کی حامل ہو۔ رشید رضا نے اپنے
استاد شیخ محمد عبدہ کے مشورے سے جب ۱۸۹۸ء
میں رسالہ "المنار" نکالا تو آپ سے فرمائش کی
کہ آپ قرآن کریم کی تفسیر لکھیں۔ چنانچہ کافی غور و خوض کے
بعد عبدہ تیار ہوئے۔ عبدہ نے جامعہ ازہر میں طلب
اور اساتذہ کے درمیان درس قرآن کا سلسلہ شروع
کیا۔ رشید رضا درس کے دوران نوٹ کر لیا کرتے تھے
بعد میں اسے ترتیب دے کر محمد عبدہ کو دکھاتے اور
اسے رسالہ میں شائع کرتے۔ یہ سلسلہ سورہ نساء
کی آیت ۱۲۵ تک چلا۔ اس کے علاوہ بھی پارہ عم اور
تبارک الذی کی تفسیر انھوں نے لکھی۔

اس تفسیر میں عبدہ نے اس بات پر زور دیا ہے
کہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ یہی کتاب ہمیں تاریکیوں
اور ظلمتوں سے نجات دے سکتی ہے۔ یہی کتاب
ہمیں رحمتوں اور سعادتوں سے ہم کنار کر سکتی ہے۔
اگر ہم نے اس کتاب کو چھوڑ دیا تو شقاوتوں اور محرومیوں
سے دوچار ہوں گے۔ عبدہ نے اس تفسیر میں "العروۃ
الوثقیٰ" کی پوری طرح روح پھونکنے کی کوشش کی ہے
یہ تفسیر "المنار" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ سورۂ نساء
آیت ۱۲۵ کے بعد یہ سلسلہ رشید رضا نے جاری رکھا
اور اس طرح یہ تفسیر سورۂ یوسف کی آیت ۵۲ تک پہنچ
سکی۔

سر سید احمد خاں متقدمین سے ہٹ کر ایک
نئے انداز کی قرآن کی تفسیر لکھنا چاہتے تھے۔ انھیں کامل
یقین تھا کہ قرآن ہر لحاظ سے کامل اور اسلام بہتر مذہب
ہے۔ انھیں پختہ یقین تھا کہ قرآن کریم دنیا کے تمام چیلنجز
کا مقابلہ کر سکتا ہے اور تا قیامت اس کتاب الٰہی کی

اعادیت و احیثیت متوارد رہے گی قرآن ہر صرف تے احساسات کا محدود ومعاون ہو سکتا ہے۔ سر سید نے تمام پچھلی تفاسیر کے متعلق بتایا کہ وہ خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں نئے حالات اور جدید مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے نہیں لکھی گئیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر قرآن کی صحیح تاویل کر دی جائے تو جدید تمام مسائل اور پیش آمدہ شبہات کا حل قرآن کریم میں مل سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک نئے انداز کی تفسیر لکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ ابتدا میں ان کے قرآنی مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہوتے رہے اور جب تہذیب الاخلاق بند ہو گیا تو باقاعدہ ابتدا سے تفسیر قرآن کا آغاز کیا۔ تفسیر القرآن سر سید کی آخری تصنیف ہے اور دو خمس کی تفسیر لکھنی باقی تھی کہ ۱۸۹۸ء میں اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ سر سید کی تفسیر القرآن نے علمائے کرام کے درمیان ایک طوفان برپا کر دیا۔ سر سید کے بہت سے خیالات جمہور امت اور تمام مفسرین کے خیالات کے برخلاف تھے۔ ابھی تک تو ان کے بہت سے خیالات سے اختلاف تھا ہی اور انھیں دائرہ اسلام سے خارج کر ہی دیا گیا تھا لیکن اب علمائے کرام کو ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دینے پر کوئی تامل بھی باقی نہیں رہا۔ اس سلسلے کے ان کے کچھ خیالات ملاحظہ کریں۔

سر سید نے شیطان اور ابلیس کے سلسلے میں بتایا کہ:

> "یہ لفظ جس طرح قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے کوئی خارجی وجود مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے انسان کی طبیعت کے خصائص اور گندے خیالات مقصود ہیں۔

معراج اور شق القمر کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ:

> دونوں عالم خواب میں واقع ہوئے۔ حضرت ابراہیم کا آگ میں ڈالا جانا کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا اور جنات کا وجود بھی قرآن کریم سے ثابت نہیں ہے

اس طرح کے اور بھی بہت سے خیالات سر سید کے یہاں مل جائیں گے۔ سر سید اور عبدہ کی تفسیر میں کوئی فکری مناسبت نہیں ہے۔ مناسبت صرف یہ ہے کہ دونوں کو اپنے اپنے ملک میں ایک ایسی نئی تفسیر کی ضرورت کا احساس ہوا ہو۔ تفسیر و تاویل کے نقطۂ نظر سے دوسری تمام تفاسیر سے منفرد ہو۔ عبدہ نے تفسیر قرآن کو ہدایت کا ذریعہ بنایا اور سر سید نئے دور کے تمام تقاضوں کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنا چاہتے تھے۔ اتفاق دیکھیے کہ دونوں میں سے کوئی بھی قرآن کی پوری تفسیر نہ لکھ سکا۔

علی گڑھ تحریک اور "المنار" تحریک

سر سید احمد خاں نے اپنی زندگی میں کئی کام بیک وقت کیے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے یہ کام کیا کہ مسلمانوں کے اندر سے احساس کمتری کو ختم کرنے کی تدبیر کی اور انھیں مختلف جہتوں سے اٹھایا۔ اس کے لیے انھوں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی کیونکہ یہی ایک ایسی چیز ہے جو انھیں تمام تباہیوں سے بچا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف اور تحقیق و تجزیے کا آغاز کیا اور بہت سے تشنہ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی۔ تہذیب الاخلاق میں بہت سے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے بہت سے مسائل پر اظہار خیال کیا اور ان کا حل پیش کیا تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے۔ کالج اور خود پر عائد کردہ الزامات کے جوابات دیئے۔ مسلمانوں کے اندر انگریزی اور سائنس کا رواج پیدا کرنے کے لیے بہت زور دیا۔ سر سید کے انہی تمام خیالات اور نظریات سے جہاں

[illegible] سرسید کے
خیالات کی تبلیغ کے لیے ہر طرف سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس گروہ کو علی گڑھ تحریک کا نام دیا گیا۔ اس تحریک میں بہت سی نمایاں شخصیتیں شامل ہو گئیں اور اس تحریک کی ہی وجہ سے بہت سے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک کو جلا دینے والوں کے چند نمایاں نام اس طرح ہیں:

نواب محسن الملک ۔ نواب وقار الملک
ڈاکٹر سید علی بلگرامی   الطاف حسین حالی
نواب عماد الملک   مولوی ذکاء اللہ
اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ

اور اداروں میں

دار المصنفین (اعظم گڑھ) ندوۃ المصنفین (دہلی) دائرہ حمیدیہ (مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر) مجلس تحقیقات و نشریات اسلام (لکھنؤ) ہیں

اس کے علاوہ بہت سے ادارے تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں قائم ہوئے۔ اس وقت بہت سے ادارے ہیں جو علی گڑھ تحریک کی کوششوں سے منظر عام پر آئے۔

سرسید اور محمد عبدہ نے ملت اسلامیہ کو غفلتوں سے ہم کنار کرنے کے لیے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ ایک طرف عبدہ نے حصول تعلیم کی تحریک برپا کی اور تعلیم کو عام بنانے کے لیے جامعہ ازہر پر خصوصی توجہ مبذول کی۔ دوسری طرف سعادو خرافات کے قلع قمع کے لیے قدم اٹھایا۔ تصنیف و تالیف اور تحقیق و تنقید کا آغاز کیا۔ الوقائع المصریہ، العروۃ الوثقیٰ،

[illegible] معاشرتی مسائل پر اظہار خیال کیا۔ منتسبین اسلام کی زبان پر لگے [illegible] کھلوانے کے لیے خدمات جلیلہ انجام دیں۔ محمد عبدہ کی اس اصلاحی تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مصر اور مصر کے باہر ایک پوری نسل پر عبدہ کے خیالات اور تعلیمات کے اثرات مرتب ہوئے۔ بیشتر تعلیم یافتہ حضرات عبدہ کے خیالات کو پھیلانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عبدہ کے خیالات کی اشاعت سب سے زیادہ المنار میں ہوئی اس لیے عبدہ کی اصلاحی تحریک کو المنار تحریک کا نام دینا مناسب ہو گا۔ ازہر کے بہت سے فارغین نے عبدہ کے خیالات کو بڑھ کر قبول کیا۔ اس سلسلے میں کچھ اہم نام یہ ہیں۔

شیخ ابو خطوہ، شیخ عبد الکریم سلمان، محمد مصطفیٰ المراغی اور شیخ عبد العزیز شاویش

اس کے علاوہ بہت سے ادبی گروہ نے عبدہ کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مثلاً

حفنی ناصف، احمد فتحی زغلول پاشا، مصطفیٰ لطفی منفلوطی، محمد حافظ بک ابراہیم، قاسم امین، لطفی السید اور سعد زغلول وغیرہ

مصر کے بہت سے نوجوان ادبا بھی عبدہ کے خیالات سے مستفیض ہوئے مثلاً عباس محمود العقاد، ڈاکٹر منصور فہمی، مصطفیٰ عبد الرزاق، طہٰ حسین، علی عبد الرازق وغیرہ

عبدہ کی تحریک کے اثرات مصر سے باہر بھی دیکھنے میں آئے۔ ہندوستان میں ندوۃ العلماء، علی گڑھ اور دوسرے اداروں کا تعلق رسا

> "احسان فراموش پاس بٹھانے کے لائق نہیں۔ تیرے افعال تیرے اقوال سے بہتر ہونے چاہیں۔"
>
> حضرت علیؓ

المنار سے مستفیض اور متاثر ہو کے بہت سے لوگوں کے مضامین بھی رسالہ المنار میں شائع ہوئے۔ عالم اسلام میں بہت سی ایسی تحریکیں بھی وجود میں آ گئیں جنہوں نے پان اسلامزم اور المنار کے نہج پر کام کرنا شروع کیا بہرکیف سرسید اور عبدہ کے خیالات اور اصلاحی جدوجہد ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ اتفاق دیکھیے کہ باقاعدہ نہ تو سرسید نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی اور نہ ہی محمد عبدہ نے المنار کا کوئی تنظیمی خاکہ بنا کر اس کی بنا ڈالی۔ دونوں کے خیالات میں خود اتنی اسپرٹ تھی کہ تحریک کی شکل اختیار کر گئے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا

- جو خدا سے ڈرتا ہے اسے کسی کا خوف نہیں ہوتا۔
- جس کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ بد باطن کبھی چین سے نہیں رہتا۔
- اس قلیل زندگی میں ساری آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ نہ موت کا وقت ٹل سکتا ہے۔ پس خدا سے ڈر اور حلال کی روزی کما۔
- جس دن تو گناہ نہ کرے اسی دن تیری عید ہے۔
- سخاوت ایمان داری کا پیش خیمہ ہے۔
- اخلاق حسنہ زندگی کو خوشگوار کر دیتے ہیں۔
- نیکی اور اخلاق حسنہ زیور ہیں۔
- سخاوت خوبی ہے، طمع ذلالت ہے، وعدہ غلامی ہے، اس کا ایفا آزادی ہے اور صبر جوہر ہے۔
- خوش حالی میں سخاوت سے دولت ضائع نہیں ہوتی بدبختی میں کنجوسی سے جمع نہیں ہوتی۔
- جس میں سخاوت و حیا نہیں وہ زندہ نہیں مردہ ہے۔

سرسید کی سیاسی حکمت عملی

توقیر عالم فلاحی *

ایک طرف سلاح دین صنعتی انقلاب اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ پسماندہ قوموں کو دعوت فکر دے رہی تھی تو دوسری طرف بغاوتِ ہند کے بعد ہندوستانیوں کی زبوں حالی بالخصوص مسلم قوم کی ہمہ جہت بربادی کا دلخراش منظر تھا۔ انیسویں صدی میں مشرق و مغرب کی دو قومیتوں کے متضاد حالات و کوائف نے سرسید کی زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا گویا کہ ایک قوم کی مرفع الحالی اور دوسری قوم کی شکستہ حالی نے ہندوستانی معاشرے کے افق پر اصلاح کی علامت بن کر ابھرنے والے سرسید کو متحرک و فعال بنایا اور قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد پر لاکھڑا کرنے کا محتاط سبق سکھایا۔

سرسید کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی زمین معرکۂ سائنس و مذہب کے لیے زرخیز ہو چکی تھی۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان ذہنی طور پر اس میدان کارزار میں آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس دور کشمکش میں سرسید نے جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں انھیں ایک دیانتدار مبصر نظر انداز نہیں کرسکتا۔ سرسید کے ایک قریبی شناسا جنگ آزادی کے مرد مجاہد اور متحدہ قومیت کے نقیب مولانا آزاد گویا ہیں:

"دراصل یہ جنگ فکر انسانی کی تاریخ کا ایک عالمگیر خاصہ تھی۔ ہندوؤں میں یہ جنگ جلد شروع ہوئی اور جلد ختم ہوگئی مگر مسلمانوں میں اس نے بہت وقت لیا۔ بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوا ہے — وقت کے تقاضے فتح مند ہوئے اور قدامت پرستی کو اپنی ہار مان لینی پڑی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بلا خوف ڈر کہا جاسکتا ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا مرد میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشے میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اسی علی گڑھ میں لڑی گئی اور یہی علی گڑھ اس کی فتحمندی کا یادگاری منارہ ہے۔" [1]

اس میں صداقت نظر آتی ہے کہ سرسید و پہلے شخص ہے جنھوں نے حالات کے تقاضوں کو سم اور عہد جدید دور میں جدید طریقے سے فروغ اسلام کے

---

* ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، اے ایم یو علی گڑھ

جدوجہد کا آغاز کیا۔ سرسید کا یہ عظیم کارنامہ اگرچہ دینی اور ملی خدمات سے متعلق ہے لیکن مغربی یلغار کے خلاف سرسید کی شبانہ روز کی سرگرمیوں سے ہی معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک طرف ہندوستان کے مسلمانوں کا سیاسی اور معاشی دیوالیہ پن اور دوسری طرف عیسائی مشنریوں کی مذموم سرگرمیاں" انھیں دونوں حالات نے سید احمد کی مساعی سرگرمیوں کا نقشہ استوار تیار کیا۔ سرسید کے مطابق وقت کی اہم ضرورت اور حالات کا اشد ترین تقاضا تھا کہ یکسو ہو کر اعلیٰ تعلیم کے حصول پر توجہات مرکوز کر دی جائیں۔ تعلیم و تربیت کی طرف اس التفات و توجہ کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ سیاسی تنظیموں میں شمولیت سے راہ گریزاں اختیار کی جائے۔ قوم کے اس بہی خواہ نے اپنے اس موقف کا بارہا اظہار کیا اور قوم کے ہمہ گیر مرض کا واحد نسخۂ شفا تعلیم و تربیت کے حصول کو قرار دیا۔ چنانچہ اپنے مستحسن جذبات کو عملی شکل دینے کی خاطر ۱۸۸۶ء میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کی بنا ڈالی اور اس کے پہلے اجلاس میں قوم کے نام یہ پیغام جاری کیا۔

"جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی اس سے میں اتفاق نہیں کرتا۔ بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعۂ قومی ترقی سمجھتا ہوں ہماری قوم کو اس وقت بجز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جاوے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔"[۳۳]

سرسید کو یقین تھا کہ ان حالات میں جب کہ قوم کی پسماندگی انتہا کو پہنچ چکی تھی کسی سیاسی تنظیم سے دلچسپی اور کسی قسم کے سیاسی ایجی ٹیشن کا سہارا قوم کی ہلاکت کا سامان بنے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پورے ہندوستان کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص تعلیم کے زیور سے آراستگی کا سبق دیا۔ سفر لندن کی صعوبتیں، سائنٹفک سوسائٹی کی تشکیل برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بحالی گزٹ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کا اجرا نیز مدرسۃ العلوم کا وجود یہ تمام کے تمام سرسید کی تعلیمی تحریک کے ثمر بار مظاہر ہیں جن سے سرسید کی پختگی عزم اور فکری استقلال کا پتہ چلتا ہے سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے وقت سرسید نے کہا تھا:

"اپنے ہم وطنوں کے حال پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ رستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی روشنی نہیں ہے وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اس سبب سے وہ کچھ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔ وہ نہیں جانتے کہ دنیا میں جو چھوٹی چھوٹی قومیں تھیں انھوں نے کیوں کر ترقی پائی اور کس طرح وہ بڑے شاندار اور سایہ دار درخت کے مانند ہو گئیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جو بڑی بڑی قومیں ایک بڑے میوہ دار درخت کے مانند پھول رہی تھیں وہ کیوں کر مرجھا کر سوکھ گئیں"[۳۲]

جدید تعلیم سے لگاؤ، معاشرے کے مروجہ رسم و روایات سے بیزاری اور حالات زمانہ کے لحاظ سے امور و مسائل پر اسلامی تعلیمات کا انطباق، یہی تین موضوعات سرسید کی قومی فلاح کے اہم مشتملات ہیں۔

سرسید کی آرزو تھی:

"میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں

سے اوپر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد میں ایسی پھیلے کہ سورج چاند اور ستارے سب اس کے آگے ماند ہو جائیں۔ “

سرسید کی یہ دیرینہ آرزو اسی وقت جامۂ عمل پہن سکتی تھی جبکہ مسلمان دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے اپنے اندر اہلیت و استعداد پیدا کر لیں۔ سرسید کے اس خیال کی تائید ایک مستشرق کے ان جملوں سے ہوتی ہے۔

It is our conviction that the welfare of the muslim community in India. Both the mundane and Spiritual lies in its standing on its own facts undergoe, recognizing and accepting responsibility in India and recognizing and Accepting responsibility for its own destiny in that situation, able to trust others and itself and freely honestly and creatively participating in the life of the new nation."

[" یہ ہمارا اعتقاد ہے کہ ہندوستان میں مسلم قوم کی مادی اور روحانی دونوں طرح کی فلاح و بہبود کا راز یہ ہے کہ وہ قدرتی اصلاح کے تحت اپنی حقیقت پر ثابت قدم رہیں۔ وہ ہندوستان میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور قبول کریں۔ مزید برآں اس صورت حال اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے ذمہ داریوں کا احساس پیدا کریں اور اسے انجام دیں۔ وہ دوسروں پر اعتماد کرنے اور خود اپنے اوپر اعتماد کرنے کے لائق بن جائیں۔ نیز آزادانہ، ایماندارانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ نئی قوم کی نئی زندگی کے لیے اس میں اپنے آپ کو شریک کر لیں۔"]

سرسید نے تعلیم و تربیت کو قومی فلاح و بہبود کا قیمتی اثاثہ قرار دیا۔ تعلیم کی اہمیت پر اتنا زور دیا اور عوام و خواص کی توجہ اس قدر مبذول کرائی کہ تعلیم سے متعلق سرسید کے خطبات و مقالات کو پڑھ کر بادی النظر میں ایک شخص کو احساس ہونے لگتا ہے کہ سرسید نے سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دے دیا۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ قوم کے ان ناگفتہ بہ حالات میں سرسید نے تعلیم کو مرکزی حیثیت دی اور سیاست سے دور رکھنے میں زبان و قلم کا زور صرف کر دیا۔

بلاشبہ سرسید جدید علوم کی اثر آفرینی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جوں جوں انکشاف کی رو تیز ہوتی گئی اور کار گہہ حیات میں انقلابات رونما ہوتے گئے۔ نیز تعلیم کے فیوض و برکات ہر شعبۂ زندگی پر آشکارا ہوتی گئیں۔ جدید تعلیم سے متعلق سرسید کے افکار کی اشاعت اور توسیع ہوتی گئی۔

مغرب کی خوشحالی اور مسلمانان ہند کی زبوں حالی کے ان متضاد حالات اور تیز تر رعنائیوں کے ساتھ ایک زوال پسند معاشرے کے تعلق کے سیاق و سباق میں سرسید کی بے لوث جدوجہد انقلاب کی غماز نظر آتی ہے۔ سرسید کی ذات سے متعلق پنڈت نہرو کا یہ تجزیہ بڑا ہی معنی خیز ہے۔

"سرسید نے اپنی پوری قوت جدید تعلیم کی طرف مرکوز کر دی اور اپنی قوم کو ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ وہ اپنی قوم کو کسی دوسری طرف متوجہ ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک مشکل کام تھا اور مسلمانوں کی ہچکچاہٹ دور کرنا اور مشکل تھا۔۔۔۔ سرسید کی سرگرمیاں بظاہر اعتدال پسند نظر آتی ہیں لیکن دراصل ان کے قدم انقلابی سمت میں آگے بڑھ رہے تھے۔" [illegible]

پروفیسر نظامی کا خیال ہے:

"سرسید کی بصیرت کا فیصلہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنی ساری توجہ علوم کے حصول کی طرف مرکوز کر سکیں۔ شاید پنڈت جواہر لعل نہرو وہ واحد شخص تھے جن کی تاریخی ژرف نگاہی نے سرسید کے اس فیصلے کی اہمیت کو سمجھا اور لکھا کہ سیاست سے علیحدہ ہو کر مغربی تعلیم کو حاصل کرنے کی تلقین سرسید کے فکر کی صحیح انقلابی سمت میں نشان دہی کرتی ہے۔" [illegible]

سرسید نے مادی، فکری آزادی اور قومی فلاح و بہبود کے جذبے سے سرشار ہو کر مغرب سے خوشہ چینی کرنا اور اپنے ملی کشکول کو پر کرنا وقت کا تقاضا اور بالخصوص مسلمانان ہند کے قعر مذلت سے نکلنے اور ترقی کی سبیل پر گامزن ہونے کا ایک کارگر ہتھیار قرار دیا۔ فلاح قوم سرسید کی سرگرمیوں کا محور تھا اس محور پر قائم رہتے ہوئے دوسری قوموں کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے دیار غیر کے علم و حکمت کو حاصل کرنا سرسید کی سیاسی حکمت عملی کا پتہ دیتا ہے۔

شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے بغیر مغربی تعلیم کا استقبال اور اس ضمن میں تعلیمی اداروں کا قیام، مسلمانوں میں تقلید بے جا اور رجعت پسندی کا خاتمہ اور مذہبی و معاشرتی اصلاح اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان نفرت کی حائل دیوار کو مسمار کرنے کی جدوجہد، یہ تمام موضوعات تحریک سرسید کے تین نکاتی پروگراموں پر مشتمل تھے۔

مغربی تعلیم کا فروغ اور تقلید جامد سے جنگ ان دونوں پروگراموں کے عملی نفاذ میں بلاشبہ سرسید نے شب و روز ایک کر دیا۔ چونکہ ان کی یہ کوشش بڑی حد تک بالواسطہ یا بلاواسطہ دین و شریعت کے حدود میں دخیل ہو جاتی ہے۔ اس لیے سرسید کے تعلیمی مشن کی سرگرمیوں اور اصلاح معاشرت کی کارکردگیوں کو دینی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا گیا۔ وہ حضرات جو قدیم طریقۂ تعلیم سے وابستہ تھے یا رسوم و روایات کی بے جا بندشوں میں گرفتار تھے انھوں نے سرسید پر لعن و طعن میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ملحد و کافر کہنا بھی فرض منصبی سمجھا لیکن انصاف اور دیانت داری کے ساتھ سرسید کی ان کوششوں کا مطالعہ یہ گنجائش نہیں چھوڑتا کہ کسی بھی زاویے سے سرسید کو

ہے دیکھا اور گمراہ کیا جائے۔

سرسید کے تین نکاتی پروگرام کا دوسرا نکتہ ہندوؤں اور انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین واقع ہونے والی نفرت کی خلیج کو پاٹنے سے متعلق ہے۔ دراصل مسلمانانِ ہند اور انگریزوں کے حالات و کوائف سے آگہی نیز مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی استحکام سے ہمکنار کرنے کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی عظیم تباہی کے بعد مسلمان سرسید کی توجہ کا خاص محور بنے۔ یہ سچ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی سرسید ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی اور فلاح و بہبود پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے تھے لیکن مسلمان زیادہ محتاج تھے کہ ان کی ترقی کی ہمہ جہت کوششیں کی جائیں اور کم از کم اس کا اعتراف تو ہر خاص و عام کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ہندوستان میں ایک مسلم مصلح کا کردار ادا کر رہے تھے۔ اتحاد و اتفاق اور قومی یکجہتی سے متعلق ان کی تمام تر کوششوں پر مستقبل کے ہندی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی چھاپ نظر آتی ہے اور یہ دراصل ان کی سیاسی حکمت عملی ہے کہ ہندوستان میں رہنے والی دو قومیتوں کے باہمی عناد و چپقلش اور بغض و تنفر کو ختم کر کے مسلم قوم کو ترقی یافتہ اقوام کے بالمقابل کھڑا کر دینا چاہتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے چونکہ سرسید کو بری طرح متاثر کیا۔ وقت کا تقاضا بھی تھا اور سیاسی مصلحت بھی کہ بالخصوص مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ہر ممکن مداوا کیا جائے۔ اس محور پر سرسید کے شب و روز جب گھومتے ہیں تو ان کے سلسلے میں فکری عدم استحکام اور دو قومی نظریے کی بات کہی جاتی ہے حالانکہ قوم کے سلسلے میں سرسید کے یہاں غموض و ابہام نہیں ہے۔ پروفیسر مشیر الحق کے بقول:

"Thus as we have seen the concept of [illegible] of the [illegible] of a community and of a nation was very clear to Syed Ahmad. As a Muslim he considered it his duty to help the Muslims; as an Indian, he made it a point to work for the good of the whole country. There was no ambiguity in his concept of nation." ۵

[اس طرح چونکہ ہم واقف ہو چکے ہیں کہ سرسید کے نزدیک قوم کا تصور گروہ یا جماعت اور قوم (ملک) کے مفہوم کے لحاظ سے بہت واضح تھا۔ ایک مسلم ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں اور ایک ہندوستانی کی حیثیت سے پورے ملک کی خیر و فلاح کے لیے کام کرنے کا ایک نقطہ قرار دیا۔ قوم کے تصور میں سرسید کے یہاں کوئی ابہام نہیں ہے]

سرسید کی سیاسی سرگرمیوں میں جو موضوعات بہت نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں ان میں انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت بھی ہے۔ سرسید کی سیاسی زندگی کا یہ باب احباب کے علاوہ مخالفین کے اعتراضات و اختلافات کا نشانہ بنا ہے۔ "انڈین نیشنل کانگریس"

کی مخالفت کے تجزیے پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف اس قسم کی سیاسی تحریکوں میں ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی شمولیت کو سرسید ترقی کے لیے سدِ راہ قرار دیتے تو دوسری طرف انھیں جارحانہ اور معاندانہ تعبیر کرتے۔ اس صورت میں مسلمان انگریزوں کے الطاف و عنایات کے مستحق نہیں بن سکتے تھے اور ۱۸۵۷ء کے قلق انگیز انجام و عواقب کی روشنی میں سیاسی سماجی اور معاشرتی حالات مخدوش و پُرخطر نظر آتے تھے۔

کانگریس کی مخالفت کی وجہ بتاتے ہوئے تارا چند کہتے ہیں کہ:

"انڈین نیشنل کانگریس کے منعقدہ اجلاع نے سرسید کے دل و دماغ کو مشتعل کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس اگر انگریزی حکومت سے اپنے مطالبات منوانے میں کامیاب بھی ہو گئی تو ہندوستانی قوم کا مستقبل خوش آئند نہ ہوگا۔ درحقیقت سرسید کی کانگریس سے مخالفت اور مسلم قوم کو اس سے الگ رکھنے کی کوشش بڑی معنی خیز تھی۔" ۹

سرسید کا یہ خیال تھا کہ طاقت اصل بنیادی چیز ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کا اصل مسئلہ ہندوستان کی غربت و افلاس اور کثرتِ آبادی کا نہیں تھا بلکہ مسئلہ تھا حکمرانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا اور یہ ہمدردی انھیں خود بہ حاصل کی جا سکتی تھی جن پر کانگریس سے متعلق سیاسی امور میں سرسید کے قدم اٹھ رہے تھے۔ سرسید کی کانگریس سے مخالفت یا دوسری تحریکوں سے دوری کے پیشِ نظر یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ سرسید کا یہ ایک مستقل فکر یا نظریہ تھا۔ ایک طرف وہ حکمران قوم کی شان و شوکت دیکھ رہے تھے تو دوسری طرف ماضی قریب میں مسلمانوں پر کیے گئے دل دوز مظالم تھے اور پھر مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال تھی۔ وہ یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم کا فطری نتیجہ سیاسی تحریک ہوگا لیکن یہ بعد کی چیز تھی۔ سب سے پہلی ضرورت تعلیم کی تھی، معاشی خوش حالی اور حکمران قوم میں اپنا وقار بلند کرنا تھا۔ اگر حالات کے نشیب و فراز اور سرسید کے فکر و خیال پر نظر رکھی جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرسید ہندوستانی قوم بالخصوص مسلم معاشرے کے مسائل کو دوررس نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کا قیام اور محمڈن ایسوسی ایشن کا بائیکاٹ۔ ان تمام چیزوں کو سرسید کی زندگی کے باضابطہ اصول اور مسلک کی حیثیت سے دیکھنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ یہ چیزیں حالات سے نبرد آزمائی کے لیے وقتی وسائل کے طور پر اختیار کی گئی تھیں۔ سرسید کے سوانح نگار جی۔ ایف۔ آئی گراہم کا یہ تبصرہ درست ہے کہ سید احمد سیاسی طور پر نظریۂ عملیت کے قائل تھے۔ ۱۸۷۰ء میں ان کی توانائیاں مسلم قوم کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وقف تھیں لیکن ۱۸۸۰ء میں دفعتاً انھیں ہندوستانی قومی سیاست اور انڈین نیشنل کانگریس سے سابقہ پیش آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ سرسید کے سیاسی افکار و نظریات نے کوئی منظم اور متفقہ فلسفہ کی تشکیل نہیں کی۔ یہ تمام افکار و خیالات فوری سیاسی وقوعے اور مسلم قوم کے مفادات کی بقا و تحفظ کی ضد میں اُبھرے۔ ۱۰

جواہر لال نہرو کے خیال میں سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت اس لیے نہیں کی کہ وہ اسے نمایاں طور پر ہندوؤں کی تحریک سمجھتے تھے بلکہ مخالفت کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اس تحریک کو سیاسی لحاظ سے بہت جارحانہ تصور کرتے تھے۔

نہرو جی کے اس خیال کی صداقت کہ سیاسی علیحدگی

کی پالیسی وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کے لیے بھی پسند کرتے تھے۔ جس وقت انعقاد ہوا تب سر سید نے ۱۸۸۸ء میں یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ اس کے لیے مسلمانوں کے علاوہ بڑے بڑے ہندو راجاؤں اور تعلقہ داروں کو بھی طلب کیا کہ وہ کانگریس کی مخالفت کریں۔

سید امیر علی کے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے قیام کے چند برس بعد جب وہ جالندھر گئے تو انھوں نے ہندوستانیوں کے ایک خصوصی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میرا ارادہ ہے کہ جو کچھ ہندوستانیوں کے لیے زیادہ ضروری اور زیادہ ترغیب اور کارآمد ہے اور جس پر ہندوستانیوں کو زیادہ غور کرنا اور دل سے متوجہ ہونا درکار ہے اور جو درحقیقت ملک کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ اسی کے متعلق کچھ بیان کروں۔ جس چیز پر میں نے اس قدر زور دیا ہے وہ چیز تعلیم ہے اور اسی کے ساتھ تربیت ہے۔"

سر سید بلاشبہ انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت میں پیش پیش تھے لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ تقریباً سر سید کا ہر سیاسی نظریہ حالات کا نتیجہ تھا اسے بہرحال سر سید کی زندگی کے اصول یا فلسفیانہ نظریے کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ سر سید کے سامنے ایک مشن تھا اسی مشن کی سبیل پر وہ گامزن تھے۔

چنانچہ ۱۸۷۷ء میں جب آنریبل سید امیر علی نے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن بنائی اور سر سید کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی تو انھوں نے قطعی انکار کر دیا اور امیر علی کو لکھا کہ اس وقت مسلمانوں کو صرف تعلیم کی ضرورت ہے کسی سیاسی آرگنائزیشن کی نہیں۔ امیر علی کے بار بار اصرار کرنے پر سر سید نے اپنے ایک دوست

مولوی [illegible] میں انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد سے اتفاق نہیں کرتا ہوں۔ میری رائے میں مسلمانوں کے لیے کسی بھی سیاسی تحریک میں حصہ لینا صحیح نہیں ہے۔ جب آپ سمجھ لیں گے کہ سیاسی تحریک کیا ہے اور کون حضرات اس کو چلا سکتے ہیں اور ان کے کیا مقاصد ہیں تو مجھے امید ہے کہ آپ میرے خیال سے اتفاق کریں گے۔"

انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت میں سید امیر علی کے قائم کیے ہوئے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی نوازش کرنا، پیٹریاٹک سوسائٹی کا قیام اور اپنے لیکچرز و خطبات میں موجودہ حکومت کی وفاداری کی تلقین۔ یہ تمام نکات حالات کی پیداوار تھے۔ ایک طرف سر سید کی منشا تھی کہ ان تمام تحریکوں اور تنظیموں سے دور رہ کر مسلمان تعلیمی لحاظ سے اپنے آپ کو بلند کر لیں اور دوسری طرف حکومت برطانیہ کی طاقت اس ملک میں مستحکم ہو۔ انگریزی حکومت اور وفاداری کے تعلق سے ایک لیکچر میں غلط فہمی کا ازالہ یوں کرتے ہیں:

"یہ خیال کہ گورنمنٹ ان لوگوں سے بدگمان ہوگی جو کانگریس کی مخالفت کر رہے ہیں نہایت احمقانہ ہے اور کسی نے اس وجہ سے کانگریس کی مخالفت کی ہے تو وہ انسان، مجھے یہ کہنے میں دریغ نہیں ہے، بہت گرا ہوا اور ذلیل ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ برطانیہ گورنمنٹ ترقی کرے اس خیال کے تابع ہے کہ اس کے استحکام سے ملک میں امن و امان قائم ہوگا اور جو مدد ہم اپنی گورنمنٹ کو دیتے ہیں وہ

[illegible] ہمدردی کے
بجائے میں مشورہ کرتی ہوں کہ
اگر آکلینڈ کالون، مسٹر ہیوم، وزیر ہند
اور ہماری ماژنگ قوم کانگریس سے
ہمدردی کرنے لگیں تب بھی میں اسی طرح
کانگریس کی مخالفت میں رہوں گا۔ ۔ ۔ یہ
میرا یقین ہے کہ اگر کانگریس کے ریزولیوشن
عمل میں لائے جائیں تو برطانیہ گورنمنٹ کے
لیے ملک میں امن قائم رکھنا اور دسول دار
پر قابو حاصل کرنا ناممکن ہوگا۔" [13]

سرسید نے حکومت برطانیہ کی مدح وستائش
میں چاہے جتنی بھی مبالغہ آرائی کی ہو اور اس کے جیسے کچھ بھی
مثبت یا منفی اثرات مسلمانوں یا حکومت برطانیہ پر پڑے
ہوں لیکن اس بات سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ حکومت
وقت کی وفاداری اور برطانیہ نوازی ہی سرسید کا مسلک حیات
ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو سرسید کی نوک قلم سے "بغاوت ہند
کے اسباب" جیسی شاہکار تصنیف منظر عام پر نہ آتی۔
انھوں نے اس کے اندر جرأت وبہادری کے ساتھ مسلمانوں
سے متعلق انگریزوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے
اور مسلمانوں کے وفادارانہ مزاج کو بے نقاب کیا ہے نیز بغاوت
کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے برعکس خود حکومت
برطانیہ کے سر رکھی ہے۔ بغاوت ہند کے اسباب دراصل
غلط فہمیوں اور نفرتوں کے بھڑکتے ہوئے حالات میں
ایک عظیم خدمت تھی جو مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے
معاندانہ سلوک کو ختم کرنے اور اعتماد بحال کرنے میں
بڑا محرک بنی نیز بغاوت کی تباہیوں اور بربادیوں کی بنا پر
مسلمانوں کے دل ودماغ پر جو خوف وہراس کے بادل
چھائے ہوئے تھے اس رسالے کی تصنیف سے چھٹ
گئے۔ [illegible] فرماتے ہیں:

"۱۸۵۷ء وہ منحوس سال تھا جس میں
شمالی ہند کے مسلمانوں کو قیامت خیز حادثات
سے سابقہ پیش آیا۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانوں کی حالت
۔ ۔ ۔ ایسے سخت وصعب زمانے میں بلکہ
ایسے ہولناک اور پُر آشوب وقت میں
سارے ہندوستان میں سرسید ہی ایسا
بہادر، دلیر، نڈر اور بیباک شخص تھا جس
نے جان پر کھیل کر بڑی آزادی اور بے خوفی
کے ساتھ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب
اور مسلمانوں کی اس سے بریت کے متعلق
مضمون لکھا۔ سرسید نے اس عجیب دلیرانہ
مضمون کی پانچ سو کاپیاں چھپوائیں اور
پارلیامنٹ انگلستان، ممبروں اور
معززین کو بھیج دیں تاکہ وہ دیکھیں کہ مسلمانوں
پر اس معاملہ پر ناحق ظلم ہوا ہے —
علاوہ ازیں ایک کاپی گورنمنٹ آف
انڈیا کو بھی روانہ کر دی۔" [14]

کانگریس کی مخالفت کے اسباب کی حقیقت جاننے
کے لیے بارہ دری لکھنؤ ۱۸۸۷ء کی تقریر [15]، میرٹھ ۱۸۸۸ء
کی تقریر [16] اور پانیر میں دیے گئے وضاحتی مراسلے کے
مباحث کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ
سرسید اسے سارے ملک کے لیے نقصان دہ سمجھتے
تھے۔ کیونکہ اس کے مطالبات سے خدشہ تھا کہ برطانوی
حکومت مسلمانوں سے متنفر ہو جائے اور پھر ۱۸۵۷ء کی
تاریخ دہرا دی جائے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا
کہ تدریجی جمہوری عمل رُک جاتا اور غم وغصہ اور نفرت و
کدورت کے مسموم جذبات پھر سر نہ اٹھانے دیتے۔
سرسید کی آزادیٔ فکر اور جرأت وبے باکی بالخصوص
مسلم قوم کی فلاح کا رشتہ لوکل سیلف گورنمنٹ کی تشکیل

ترمیم سے بچا جا سکتا ہے۔ سر سید بے جا قناعت کی مذمت سے مخالفت کرتے ہیں اور قوم کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ کسی عزت و وقار کی بازیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قوم حکمراں قوم کے ساتھ درجات و مراتب حاصل نہ کر لے حتیٰ کہ حکومت میں شریک و سہیم ہو جائیں۔ سر سید قوم کی غیرت کو ابھارنے کے ساتھ ہی ساتھ اس حکومت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں جو اپنی رعایا کو اس قسم کے شرف و اعزاز سے محروم رکھتی ہے۔

مستقل جد و جہد کے نتیجے میں انڈین کونسل ایکٹ سنہ ۱۸۶۱ء کے مطابق ہندوستانیوں کو لیجس لیٹو کونسل (Legislative Council) کے ممبر بنائے جانے کی بات یقیناً ایک حوصلہ افزا پیغام تھا اور ایک خوش آئند علامت تھی، ہندوستانیوں کو حکومت میں شریک کرنے کی۔ سر سید کی نظر چونکہ سو سال بعد کے ہندوستان پر تھی۔ یہ حوصلہ افزا علامات و آثار قوم کے بہتر مستقبل کی شہادت دے رہے تھے اور اُن سے سر سید کی سیاسی دوربینی کو تقویت بھی مل رہی تھی۔ انھیں بے جا قناعت سے نفرت تھی اس لیے قانون ساز اسمبلی میں چند ہندوستانیوں کی شرکت بھی انھیں مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ سر سید قوم سے گویا ہوتے ہیں:

"چند ہندوستانیوں کا لیجس لیٹو کونسل میں داخل ہونا ہندوستانیوں کی ترقی کا شروع ہے۔ تم میری اس پیشین گوئی کو یاد رکھو کہ وہ دن کچھ دور نہیں ہے کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کا کونسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا۔ وہ دن آئے گا کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔" [۲۰]

بیس سال بعد سر سید سنہ ۱۸۸۳ء میں خود ہی وائسرائے کی کونسل کے رکن منتخب ہونے ... [illegible] کے پیش کردہ لوکل سیلف گورنمنٹ بل کے مسودے کی تائید کی اور کہا:

"میں اس عمدہ تجویز کی بڑے فخر سے مگر ناچیز تائید کرتا ہوں۔ کیونکہ میں اس بات کے خیال کرنے سے خوش ہوتا ہوں کہ اس قدر عرصے تک زندہ رہا کہ میں نے اس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سیلف ہیلپ اور سیلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنھوں نے انگلستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشن پیدا کی ہیں اور اس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔" [۱۹]

بعض نقادوں کا یہ خیال کہ سر سید ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشن میں بھی مسٹر بیک کی منشا پوری کرتے نظر آتے ہیں۔ مسٹر بیک کے لیے یقیناً سر سید نرم گوشہ رکھتے تھے لیکن دونوں کے درمیان مقصدیت کے نمایاں اختلافات کے باوجود یہ خیال من و عن صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ لوکل سیلف گورنمنٹ کے اصول سے جزوی اتفاق میں بھی بیک کے خصوصی تعلق کا دخل ہے۔ ہندوستان کے حالات سر سید کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ مختلف افکار و خیالات کے مبلغین اور مذاہب و نظریات کے علم برداروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان حالات میں لوکل سیلف گورنمنٹ کی بعینہٖ تائید اور ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشن کی کھلی حمایت سے خصوصاً مسلمانوں کا مستقبل مخدوش ہوتا نظر آتا تھا اس کے لیے اگر یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ سر سید نے مسٹر بیک کے زیر اثر ہو کر نہیں بلکہ درخشاں مستقبل کے خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے قومی فلاح کے جذبے سے معمور ہو کر لوکل سیلف گورنمنٹ کی مخالفت کی۔ لوکل سیلف

گورنمنٹ کے تعلق سے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:[۵]

"ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کے ذریعے لوکل سیلف گورنمنٹ کا اصول شاید سب سے بڑا فائدہ مند سبق ہے جو انگلستان کی نیابتی ہندوستان کو سکھا دے گی لیکن انگلستان سے ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں ان مخصوص اور پالیٹیکل معاملات کو یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے انگلستان اور ہندوستان میں امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ حالت کئی صدیوں کی خود مختار حکومت اور ایک قوم کی دوسری قوم پر اور ایک مذہب کے دوسرے مذہب پر غلبہ حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔"[۶]

بغاوت ہند کے بعد مسلمانوں کی طرف خصوصی توجہ اور اس ضمن میں سیاسی تحریکات سے کنارہ کشی، اعلیٰ تعلیم کے حصول کی تلقین، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، حکومت برطانیہ کی وفاداری اور لوکل سیلف گورنمنٹ میں ترمیم خاص موضوعات کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ سرسید ان تمام موضوعات و مباحث میں روشن خیال سیاستداں کی حیثیت سے سرگرم عمل نظر آتے ہیں اور وہ خیالات و خطرات جو سرسید نے اپنی تحریروں اور خطبات میں ظاہر کیے تھے آج سو سال بعد ان کی صداقت آشکارا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض تحریروں اور خطبات کی روشنی میں سرسید کی سیاسی سرگرمیاں بعض پہلوؤں سے تنقید کا نشانہ تو بن سکتی ہیں لیکن یہ حقیقت بھی مستحضر رہنی چاہیے کہ سرسید کے سامنے فلاح قوم ہی واحد مقصد تھا اور بقیہ تمام چیزیں ذرائع کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بغاوت کے بعد مسلمان زیادہ ضرورت مند تھے کہ ان کے زخموں پر مرہم رکھا جائے۔ ذرائع و وسائل کے انھیں خطوط پر نزاکت حالات سے نبرد آزمائی ممکن تھی اور انھیں خطوط پر چل کر عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے راہیں ہموار کی جا سکتی تھیں۔

حوالہ جات

۱ کانووکیشن ایڈریس۔ ۲۰ فروری ۱۸۸۳ء بحوالہ خلیق احمد نظامی۔ ارمغان علی گڑھ ص ۱۶

۲ اجلاس اول محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ منعقدہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ بحوالہ مجموعۂ لکچرز ص ۲۵۰

۳ روئداد سائنٹفک سوسائٹی نمبر ص ۲۶

۴ سرسید احمد خاں۔ تقریر بجواب ایڈریس مسلمان طلبائے پنجاب۔ دسمبر ۱۸۸۴ء لاہور

۵ Cantwell Smith Islam in modern History P.200. Princeton University Press 1957

۶ پنڈت جواہر لال نہرو۔ خود نوشت سوانح عمری۔ بحوالہ سرسید بازیافت ص ۲۸۱

Prof Mushirul Haque. Muslim Politics in Modern India, P. 32 (1857 to 1947)

Dr Tara Chand. History of the freedom movement in India P 367 Vol II Faridabad

G.F.I Graham: The life and work of Sir Syed Ahmad Khan. P. 867. Oxford University Press. 1974 London.

Rajmohan Gandhi: Eight Lives. P38. N. Delhi.

سرسید احمد خاں۔ تقریر جالندھر۔ بحوالہ خطبات سرسید

ڈاکٹر شان محمد کا مضمون "سرسید کا سیاسی نقطۂ نظر" از سرسید بازیافت ص ۱۵۴

مکتوب مرقومہ ۱۸۸۸ء پانیر بحوالہ سرسید بازیافت ص ۱۵۹ — ۱۵۸

تقریر بتاریخ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء بمقام بارہ دری بحوالہ عتیق احمد صدیقی۔ سرسید احمد خاں۔ ایک سیاسی مطالعہ۔ ص ۲۴۰ - ۲۵۲

تقریر بتاریخ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء۔ بمقام بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ۔

تقریر بتاریخ ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء بمقام میرٹھ۔ مجموعہ لیکچرز بحوالہ عتیق احمد صدیقی۔ سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ ص ۲۵۶ — ۲۵۷

پانیر ۸ فروری ۱۸۸۸ء

ڈاکٹر شان محمد۔ مضمون "سرسید کا سیاسی نقطۂ نظر بحوالہ سرسید۔ بازیافت ص ۱۴۲

ایضاً ص ۱۴۲ - ۱۴۳

منشی سراج الدین (مرتب) مجموعۂ لیکچرز ص ۲۷۴، ۲۷۶

سرسید احمد خاں کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی
سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو اس نے
جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں خواہ ہمیشہ اس
سمت میں نہ ہوں جو سرسید پسند کرتے۔

—— خالد اسحاق بخاری

کتب سیر میں

خطبات احمدیہ کی اہمیت و انفرادیت

شجاع الدین ○

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح اور آپؐ کے حالات زندگی پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یقیناً یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آپؐ پر جس قدر لکھا گیا ہے وہ دنیا کی اور کسی شخصیت کے حصے میں نہیں آیا۔ مسلمانوں نے آپؐ کی سیرت کی تدوین میں جس قدر کدو کاوش کی وہ اتنی تعجب خیز نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے ایمان و یقین اور عقیدت و محبت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس ضمن میں جتنی کوشش کریں، کم ہی ہیں۔ آپؐ کی خصوصیت تو یہ ہے کہ غیر مسلموں اور مستشرقین نے بھی آپ کی سیرت پر اپنا تمام تر زور قلم صرف کر دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ پروفیسر مارگولیتھ جیسا متعصب مصنف بھی اپنی کتاب "محمدؐ" کے مقدمے میں اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوا۔

> "پیغمبر محمدؐ کے سوانح نگاروں کا ایک طویل
> سلسلہ ہے، اس کا ختم ہونا ناممکن ہے
> لیکن اس میں شریک ہونا قابل فخر ہے۔"

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور دنیا کے دوسرے رہبران مذاہب کے سوانح اور حالات زندگی میں ایک بین فرق یہ ہے کہ آپؐ کے حالات زندگی از مہد تا لحد بڑی تفصیل سے اور ایک ایک جزئیات کے ساتھ موجود ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ "حیات محمدؐ" کے گوشے گوشے سے ہم واقف ہیں۔ آپؐ کی مقدس حیات کا کوئی واقعہ اور حادثہ تاریخ عالم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آپؐ نے اپنی تمام زندگی ایک بشر کی حیثیت سے گزاری ہے جس میں رنج و راحت، خوشی و غم، سفر و حضر اور فتح و شکست سب کچھ جاری و ساری رہا ہے۔ آپؐ کے اصحاب نے آپؐ کی ایک ایک حرکات و سکنات کو بجنسہٖ محفوظ رکھا ہے، یہاں تک کہ راویوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ فلاں بات کہتے وقت آپؐ کے چہرۂ مبارک کے تاثرات کیا تھے۔ آپؐ اس وقت کیسا لباس زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور آپؐ نے دست مبارک سے کس طرح اشارہ کیا تھا وغیرہ۔ اسی لیے جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب "اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن" مطبوعہ ۱۸۷۰ء کو ان الفاظ سے شروع کیا:

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام مقننوں
> اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس
> کے وقائع عمری محمدؐ کے وقائع عمری سے
> زیادہ مفصل اور سچے ہوں۔"

اس کے برخلاف دوسرے مذاہب کے بزرگوں اور ہادیان دین کے ہمیں چند جستہ جستہ واقعات ہی ملتے

○ استاد، اے۔ ایم۔ یو سٹی ہائی اسکول، اے۔ ایم یو علی گڑھ

ہیں اور اکثر واقعات اور ان کی طرف اشارے بھی غیر مصدقہ اور دھندلے ہیں۔ اسی لیے ریورنڈ باسورتھ اسمتھ نے لکھا ہے:

"دوسرے بانیانِ مذاہب کے چند حالات کو ہم کوئی دوسرا نام نہ ہونے کے سبب ہی تاریخی کہتے ہیں۔"

موصوف نے دوسرے مذاہب کے بزرگوں سے موازنہ کرنے کے بعد لکھا ہے:

"ہم مسیح کی ماں، مسیح کی خانگی زندگی، ان کے ابتدائی احباب، ان کے ساتھ ان کے تعلقات، ان کے روحانی مشن کے تدریجی طلوع یا یک بیک ظہور کی نسبت کیا جانتے ہیں؟ ان کی نسبت کتنے ہی سوالات ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے۔ یہاں دھندلاپن اور راز نہیں ہے۔ ہم تاریخ رکھتے ہیں۔ ہم محمد ﷺ کے متعلق اس قدر جانتے ہیں جتنا لوتھر اور ملٹن کے متعلق جانتے ہیں۔ میتھالوجی، فرضی افسانے اور مافوق الفطرت واقعات ابتدائی عرب مصنفین میں نہیں یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخی واقعات سے الگ کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی شخص نہ یہاں خود کو دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو۔ یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔"

یوں تو تمام مذاہب اور بزرگوں کی تعلیمات میں اخلاقی شہ پارے، مفید نصیحتوں اور عمدہ تعلیمات کی کمی نہیں لیکن ان مذاہب کے شارحوں اور بانیوں کی سیرت کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہی نہ ہو سکے گا کہ خود انھوں نے ان پر کس حد تک عمل کیا لیکن سیرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ باب سب سے زیادہ عظیم اور واضح ہے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا، پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ اس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخِ عالم قاصر ہے اور اس کی شہادت اپنوں ہی نے نہیں، غیروں اور دشمنوں نے بھی دی ہے۔ متعصب سے متعصب مورخ اس کا انکار نہ کر سکا بلکہ اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور رہا۔

مسٹر چیمبر نے اپنی انسائیکلوپیڈیا میں آپ کے اخلاقِ حسنہ اور فضائلِ حمیدہ کی شہادت دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"مذہبِ اسلام کا وہ حصہ جس سے اس کے بانی کی طبیعت صاف صاف معلوم ہوتی ہے، نہایت کامل اور بدرجۂ غایت موثر ہے۔ اس سے ہماری مراد اس کی اخلاقی نصیحتیں ہیں۔ یہ نصیحتیں کسی ایک یا چند سورتوں میں مجتمع نہیں ہیں، بلکہ اسلام کی عظیم الشان عمارت میں سلسلۃ الذہب کی مانند ملی جلی ہیں۔"

ولیم میور جس نے "لائف آف محمد" کے عنوان سے سیرت پر بہت ہی مخالفانہ و متعصبانہ کتاب لکھی اور جس کے اعتراضات کا رد کرنے کے لیے ہی سرسید نے "خطباتِ احمدیہ" کی تالیف کی، وہ بھی آپ کے اخلاق، صبر و ضبط، تحمل و بردباری اور ہر حال میں ثابت قدم رہنے کی صفات کو سراہے بغیر نہ رہ سکا اور یہ لکھنے پر مجبور ہوا۔

" آپ کے بارے تحقیقات کریں کہ سرمو
کچھ لغزش نہ ہوئی تھی۔ آپ عالم تنہائی و
مصیبت میں ایسے عالی پایہ اور کامل انسان
نظر آتے تھے کہ کتب مقدسہ سماویہ میں
آپ کا کوئی عدیل و مثیل دکھائی نہیں
دیتا —"

آپ کی سیرت مبارکہ کے یہی وہ روشن پہلو ہیں جنھوں نے ہر سیرت نگار کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اسی لیے غیر مسلم مصنفین و مستشرقین نے اپنے تمام تر تعصب اور مخالفت کے باوجود آپؐ کے سیرت نگاروں میں شامل ہونا باعث فخر سمجھا، چاہے انھوں نے اپنا مقصد اور مطمح نظر بڑی حد تک نکتہ چینی و خردہ گیری ہی رکھا ہو۔

عیسائیوں نے کبھی بھی اسلام کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ میدان کارزار میں شکست و ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد انھوں نے علمی و ادبی میدانوں میں اسلام اور نبی آخر الزماں کے خلاف لایعنی اعتراضات کرنے اور سیاق و سباق سے علیحدہ کرکے اسلام کی بعض معتبر اور بیشتر نامعتبر کتابوں کی کچھ عبارتوں کا انتخاب کرکے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو ہدفِ تنقید بنانا شروع کیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کی استعماری طاقتوں کے عروج اور عالم اسلام کے زوال کے ساتھ اس عمل میں بڑی تیزی آگئی۔ زوال خوردہ اور دین سے بیگانہ مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا اسے موثر ہتھیار سمجھا گیا۔ اسی لیے مستشرقین نے اپنا تمام تر زور اس محاذ پر صرف کر دیا۔ اس وقت کے یو۔پی کے گورنر ولیم میور کی مذکورہ بالا تصنیف بھی اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے آپؐ کے حالات زندگی پر ایک ضخیم کتاب 'حیات محمدؐ' [illegible] کے نام سے چار جلدوں میں لکھی۔ اس کتاب نے تمام یورپ میں بڑی شہرت پائی اور یہ سمجھا گیا کہ ولیم میور نے علمی سطح پر اسلام کے استیصال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اسی لیے یہ کتاب نہ صرف اسلام سے یورپ کی بدگمانی و غلط فہمی کا باعث بن رہی تھی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کو بھی اسلام سے برگشتہ کر رہی تھی۔

سرسید پہلے ہی سیرت پر ایک ایسی کتاب لکھنا چاہتے تھے جو اسلام کے بارے میں عیسائیوں کے شکوک و شبہات دور کر سکے اور یورپین مصنفین کی پھیلائی ہوئی غلط بیانیوں اور گمراہیوں کا خاتمہ کر سکے۔ ولیم میور کی اس کتاب کے بعد انھوں نے سب کام چھوڑ کر سیرت پر کتاب لکھنے کا تہیہ کر لیا۔ ان کے سفر انگلستان کی مختلف اغراض میں سے ایک خاص غرض ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنا اور اس کے دلائل و ادعا کا رد کرنا بھی تھی۔

سرسید ولیم میور کی کتاب کی اشاعت کے بعد بڑے بے چین تھے اور اس کا جواب لکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ حالانکہ ان کے دوست احباب اور مخلصین انھیں اس ارادے سے باز رکھنا چاہتے تھے کیونکہ ولیم میور اس وقت یو۔پی کا لفٹننٹ گورنر تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس جواب سے سرسید کو نقصان پہنچ جاتا — لیکن ان کا مذہبی جوش اور حق پژوہی ان کو بے چین کیے ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے انگلستان سے محسن الملک کو لکھا تھا۔

" ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں حضرت

سا مال میں ہو سے' اس زمیں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور ان کی نا انصافیاں و تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔

مارا ہمیں تحفۂ شہنشاہی بس است"

ایک اور خط میں محسن الملک کو یہی لکھتے ہیں:

"مواعظ احمدیہ کے لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، ہلنا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔"

ب اور میں لکھتے ہیں:

"میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی صلعم (یعنی خطبات احمدیہ) میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگی ہے۔"

انگلینڈ میں انھوں نے انڈیا آفس لائبریری اور برٹش زیم کی لائبریری میں اہم کتابوں کا انتخاب کر کے ان سے ر پور استفادہ کیا۔ مصر، فرانس اور جرمنی سے سیرت موضوع پر نادر و نایاب اور قیمتی کتب منگائیں اور ب و روز کی محنت سے بارہ خطبے تیار کیے۔ انھیں ب لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع ا۔ ان خطبات میں سر سید نے ولیم میور کے اسلام ر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر کیے گئے اعتراضات کا بھرپور رد کیا اور دلائل کے ساتھ ان کو باطل قرار دیا۔ ان بارہ خطبوں کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

پہلے خطبے میں سر سید نے عرب کا مفصل تاریخی جغرافیہ پیش کیا ہے اور اسلام کے ان دیار و آثار کو توریت و انجیل اور عیسائی محققوں کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے جن کا ولیم میور نے انکار کیا تھا۔

دوسرے خطبے میں انھوں نے ماقبل اسلام عربوں کی حالت، ان کے رسم و رواج، خیالات و عقائد اور معاشی و معاشرتی حالات کا نقشہ پیش کیا ہے تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اسلام نے ان کی زندگی میں کیسا انقلاب برپا کیا۔

تیسرے خطبے میں ان ادیان مختلفہ کا بیان ہے جو اسلام سے قبل عرب اور اس کے قرب و جوار میں رائج تھے۔ اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ اسلام عرب کے دیگر الہامی مذاہب سے کس قدر مماثلت رکھتا ہے اور اس نے ان مذاہب میں کس قدر اصلاحات کی ہیں۔

اکثر عیسائی مصنفین یہ دعویٰ اور اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام درحقیقت سابق متفرق مذاہب کے اصول و عقائد کی احسن ترتیب جدید ہے۔ خود اسلام کبھی نیا مذہب ہونے کا مدعی نہیں ہے، وہ تو اپنے آپ کو دین فطرت قرار دیتا ہے اور تمام الہامی مذاہب کی ترقی یافتہ شکل ہونے کا دعوے دار ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ اور اعتراض بالکل بے معنی ہے۔ سر سید نے اس خطبے میں یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوتھے خطبے میں یہ بتایا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کو اسلام سے کیا کیا فوائد حاصل ہوئے اور خود یہودیت و عیسائیت نے اسلام سے کیا سیکھا۔ سر سید نے ایڈورڈ گبن، جان ڈیون پورٹ، ٹامس کارلائل اور

ولیم میور کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ عیسائیت نے اسلام سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ سرسید نے اسلام کے فوائد کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

پانچویں خطبے میں کتب احادیث، سیر، تفاسیر اور فقہ کی تصانیف کا منشا اور غرض بیان کی گئی ہے۔

چھٹے خطبے میں اسلام میں روایات اور احادیث موضوع، درجات و مقام سے بحث کی گئی ہے نیز اختلاف روایت کے اسباب اور احادیث موضوع کی وجوہات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ساتویں خطبے میں قرآن مجید، اس کے نزول، سورتوں اور آیتوں کی ترتیب، مختلف قراتوں، ناسخ و منسوخ وغیرہ کی بحثیں ہیں اور ان غلط بیانیوں کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے جو انھیں سمجھنے میں خود عیسائی مورخوں نے کی ہیں۔

آٹھویں خطبے میں خانہ کعبہ کے حالات اور اس کی تاریخی و جغرافیائی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور عیسائی محققوں و جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد حجاز میں آئی اور مکہ اور اس کے قرب و جوار کے آثار انھیں سے متعلق ہیں۔

اس بحث کے چھیڑنے کی وجہ ولیم میور کا یہ دعویٰ تھا کہ آل اسمٰعیل کا حجاز اور خانہ کعبہ سے کوئی تعلق نہیں۔

نویں خطبے میں آنحضرتؐ کے حسب و نسب کی تحقیق ہے اور بدلائل آپؐ کو آل اسمٰعیل ثابت کیا گیا ہے، اس کی ضرورت یہی پیش آئی کہ ولیم میور آپؐ کے بنی اسمٰعیل ہونے کا ہی منکر ہے۔

دسویں خطبے میں ان بشارتوں اور پیشین گوئیوں کا بیان ہے جو توریت و انجیل میں آپؐ کے رسول کی حیثیت سے مبعوث ہونے کے بارے میں ملتی ہیں اور جنھیں خود یہودی و عیسائی علما بیان کرتے رہے ہیں۔

گیارہویں خطبے میں معراج اور شق صدر کی حقیقت کو محققانہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں سرسید جمہور علمائے اسلام سے مختلف نظر آتے ہیں۔

بارہویں اور آخری خطبے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لے کر بارہ برس کی عمر شریف تک کے حالات معتبر اور صحیح روایات سے اخذ کر کے بیان کیے گئے ہیں اور اس سلسلے کے بے شمار رطب و یابس سے پرہیز کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ خصوصاً ولیم میور کے ان اعتراضات کا بخوبی جواب دیا گیا ہے جو اس نے آپؐ کی اس عمر تک کے حالات پر کیے ہیں۔

غرض یہ کہ بقول ڈاکٹر نورالحسن نقوی:

> "خطبات احمدیہ سرسید کا نہایت وقیع اور قابل قدر کارنامہ ہے، ہر اعتراض کا مدلل جواب ہے اور متانت کے ساتھ۔" [illegible]

مختلف علما نے خطبات احمدیہ کی انفرادی و امتیازی شان اور اس کی اہمیت و افادیت پر اظہار خیال کیا ہے جس سے اس کے بعض مبہم گوشے بھی واضح ہو گئے ہیں۔ یہاں سب کا احاطہ تو ممکن نہیں، چند آرا درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں

> "سرسید کی تمام تصانیف میں خطبات احمدیہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس کی تصنیف کی تحریک کا سرچشمہ ان کی عقیدت رسول اور بے پناہ جذبۂ محبت ہے۔ اس کتاب سے سرسید کی کوئی ذاتی یا سیاسی

غرض وابستہ نہیں کی جاسکتی۔" [57]

بقول حامد حسن قادری

"سرسید کی مذہبی خدمات ماضی و مستقبل میں بہترین خدمت یہ تصنیف ہے۔" [58]

انگلستان کے ایک اخبار "انکوائرر" میں مورخہ ۱۱ رمئی ۱۸۷۲ء کی اشاعت میں یعنی سرسید کی واپسیٔ انگلستان کے بھی تقریباً دو سال بعد ایک آزاد خیال انگریز کا سیر حاصل تبصرہ شایع ہوا تھا جس میں اس نے ان خطبات کو بہت سراہا ہے اور سرسید کے پیش کردہ دلائل کو قابلِ قبول قرار دیا ہے۔

سرسید کو اس کتاب کی اشاعت کے لیے زبردست مالی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ انھوں نے اس کی اشاعت کے لیے نہ صرف اپنا تمام اثاثہ داؤ پر لگا دیا بلکہ اپنے بے تکلف دوستوں سے مانگنے اور سود پر روپیہ قرض لینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ تاکہ اپنے آقا و مولیٰ پر ہونے والے اعتراضات کا دفاع کر سکیں اور ان کے نام نامی کی سربلندی کے لیے ہر طرح کی سعی اور جدوجہد کر سکیں۔ بقول مولانا حالی

"سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے۔" [59]

اس خیال کی تائید اُن کے ایک خط بنام محسن الملک سے بھی ہوتی ہے۔

"اگر میری کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا، خدا قبول کرے۔" [60]

یوں تو مسلم علما ہمیشہ سے ہی عیسائیوں کے اعتراضات کے دندان شکن جواب دیتے رہے ہیں لیکن سرسید کی اس سعی کو کئی حیثیتوں سے امتیاز اور انفرادیت حاصل ہے۔ مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" میں بعض ترجیحات کی نشان دہی کی ہے۔

سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے خود عیسائی ملک میں بیٹھ کر اور ان ہی کی زبان میں جواب لکھا۔

پروفیسر آرنلڈ کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں

"ایسی مثالیں تو بہت ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے ملک میں اور اپنی زبان میں عیسائیوں کی کتابوں کے رد اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھیں لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ جاکر، یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شایع کی ہو۔" [61]

ریورنڈ ہیوپر سرسید کے اس کارنامے سے بہت ہی متاثر ہیں۔ اسی تاثر کے زیرِ اثر ان کا خیال ہے

"ہمارے نزدیک سرسید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا جو کام کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے نہیں ہوا۔

..... میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سرسید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔" [62]

اس تاثراتی رائے سے تو پوری طرح اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ اس انداز خاص میں بھی سرسید کو اولیت کا شرف ضرور حاصل ہے۔

سرسید نے اس کتاب میں ردو جواب کی کتابوں کا مروجہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ انھوں نے نہ تو جواب

برائے جواب نکالا بلکہ انھیں اور دوسرے مصنفوں کی طرح جوابی الزام اور اعتراض وارد کیے بلکہ ہر مقام پر ٹھوس علمی انداز میں اور دلائل و براہین کے ساتھ اپنے دعووں کو ثابت کیا نیز خود عیسائی مورخوں و محققوں کے حوالوں سے اپنے جوابات کو وقیع بنایا۔ اسی لیے سرسید کے ایک سوانح نگار کرنل گریہم کہتے ہیں:

> "اس کتاب سے مصنف کا غیر معمولی
> تحقق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی
> اور اصلی عیسائیت کے سچے اصولوں کا التزام
> ظاہر ہوتا ہے۔" [13]

کرنل گریہم ہی ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

> "بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب
> میں بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے
> خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں
> گے۔" [14]

انتہائی غم و غصے کے باوجود سرسید نے پوری کتاب میں متانت اور سنجیدگی کا التزام رکھا ہے اور یہ اس کتاب کا ایک بہت بڑا امتیاز اور اس کی ایک انفرادیت ہے۔ ورنہ ایسے مواقع پر اکثر جذبات غالب آجاتے ہیں۔

غرض یہ کہ 'خطبات احمدیہ' سرسید کا ہی ایک وقیع اور قابل قدر کارنامہ نہیں ہے بلکہ کتب سیر میں بھی ایک انفرادیت کی حامل ہے اور ایک منفرد علمی و مذہبی کارنامہ ہے۔ بلکہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> "خطبات کی تالیف میں خدمت
> علم کا مقصد کم ہے، ضمیر اور عقیدت
> کی اطاعت زیادہ ہے۔ ایسی
> صمیمیت اور خلوص کے سبب
> ہم اس کتاب کو ان کی سب
> تصانیف میں بلند ترین درجہ
> دینے پر مجبور ہیں۔" [15]

حواشی وحوالہ جات

[1] پروفیسر موصوف نے ۱۹۰۵ء میں "ہیروز آف دی نیشنز" کے سلسلہ کی کتاب "محمد" تصنیف کی تھی۔ انھوں نے ہر واقعہ کے متعلق سند بہم پہنچا کر اور اسے توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ یہ کتاب سیرت کے موضوع پر چند انتہائی زہریلی کتابوں میں سر فہرست ہے۔ مقدمے میں پروفیسر موصوف کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

The biographers of the Prophet Mohammad from a long series. It is impossible to aid but in which it would be honourable to find a place

[2] ریورنڈ باسورتھ اسمتھ ٹرینٹی کالج آف آکسفورڈ کے فیلو تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۴ء میں محمد اینڈ محمڈنزم

[illegible] ... میں بھی شائع ہو سکے۔ ص ۱۳-۱۵

۳ "خطوط سرسید" مرتبہ سرراس مسعود۔ ص ۹۴۔

۴ ایضاً ص ۵۹

۵ ایضاً ص ۵۴

۶ سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ ص ۹۶

۷ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء ص ۴۱

۸ داستان تاریخ اردو

۹ حیات جاوید ص ۴۱۹

۱۰ خطوط سرسید مرتبہ سرراس مسعود ص ۵۵

۱۱ بحوالہ حیات جاوید ص ۴۲۰

۱۲ ایضاً ص ۴۱۹

۱۳ ایضاً ص ۴۲۱

۱۴ ایضاً ص ۴۲۱

۱۵ سرسید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقاء ص ۴۲

> ۱۸۵۷ء کے غدر میں مرحوم سرسیدؒ نے جس قومی خیرخواہی کے راگ کو چھیڑا، دمِ واپسیں تک اس کی آواز منقطع نہیں ہوئی اور ایک سے ایک بڑھ کر نغمۂ دلکش اس میں نکلتا چلا آیا۔
>
> ——— نواب محسن الملک

ہماری ایجنسیاں

۱. میسرز بک امپوریم
سبزی باغ۔ پٹنہ، بہار

۲ میسرز محمد الیاس
نیوز پیپر ایجنٹ۔ ۹۱ کالوٹولہ اسٹریٹ
کلکتہ۔ بنگال۔

۳. میسرز مکتبہ معارف الاسلام
ریاض الدین امیر محمد۔ جمعیت کالونی۔ انصار محلہ
روم نمبر ۶۸۔ اے فورتھ نظام پورہ
بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲۔ تھانے

۴. آزاد کتاب گھر
ساکچی بازار۔ جمشید پور۔ ۸۳۱۰۰۱

۵. میسرز طالب حسین
ایف ڈی ہائر سکنڈری اسکول۔
کانٹھ دروازہ۔ مراد آباد۔ ۲۴۴۰۰۱

۶. میسرز صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ
دانش پورہ۔ کامٹی ۴۴۱۰۰۱

۷. میسرز احمد حسین۔
جمال بک ڈپو
باری روڈ۔ گیا ۸۲۳۰۰۱۔ بہار

۸. میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔
پرنسس بلڈنگ
ای۔آر۔روڈ۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

۹. میسرز مکتبہ عمر
بک سیلرز اینڈ نیوز پیپرس، مدینہ مسجد کمپلکس
میناکشی سرکل۔ بیجاپور۔ ۵۸۶۱۰۱

۱۰۔ میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ بغیہ، فیروز آباد ۲۸۳۲۰۳

۱۱ میسرز جنتا بک ڈپو
مین روڈ
رانچی ۸۳۴۰۰۱

۱۲۔ میسرز شانی بک ڈپو
پرانا قلعہ
سیوان۔ بہار

۱۳۔ میسرز ایجوکیشنل بک ہاؤس
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۴۔ میسرز انوار بک ڈپو
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۵۔ میسرز کتاب سینٹر
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۱۶۔ میسرز فردوسی کتاب گھر
بک سیلرز اینڈ پبلشرز
بھوسپا چوک
دھرواد

۱۷۔ میسرز عبدالقیوم
اردو لائبریری
تحصیل گیٹ
گھنٹہ گھر۔ بدایوں۔ یو۔پی۔

۱۸۔ میسرز اسلامک بک سینٹر
جامعہ کمپلکس
ایم۔آر۔روڈ
بنگلور۔

۱۹- میسرز کتب محل
تکیہ
اعظم گڑھ ۔ یو۔پی

۲۰- میسرز محمد شفیع
معرفت خورشید بک اسٹال
پارنواده، رانچی روڈ
نواده ۔ ۸۰۵۱۱۰

۲۱- میسرز کریسینٹ بکس
اردو بازار
دربھنگہ ۔ بہار

۲۲- میسرز مکتبہ اسلامی
بنے میاں کی درگاہ کے سامنے
شاہ گنج
اورنگ آباد ۔ مہاراشٹر

۲۳- میسرز ایم۔ راشد ندیم
محلہ محل سرائے
دھام پور ۔ بجنور

۲۴ میسرز روشن درسی کتب خانہ
معرفت اے۔ ڈبلو خاں
چارگیمان / کیو، ے ای
وہیکل فیکٹری
جبل پور ۔ مدھیہ پردیش

۲۵ میسرز شاہد متین
وحید بلڈرز
گولڈن ۔ کے۔ این۔ آئی
سیدہ پور
دھرواڑ ۔ ۵۸۰۰۰۸

۲۶ [illegible] بک سیلرز اینڈ پبلشرز
نیو مارکیٹ
تاتر پور چوک
بھاگل پور ۔ سٹی بہار ۔

۲۷ میسرز آزاد بک اسٹور
مین روڈ، مدھوبنی
مدھوبنی ۔ بہار

۲۸ میسرز انور بک ایجنسی
ہاؤس نمبر ۱۔ ۱۱۔ ۱۱۷
مستان پورہ
نانڈیڑ ۴۳۱۶۰۲ مہاراشٹر

۲۹- میسرز سب رنگ بک
انجمن پلازہ
مین روڈ
رانچی ۔ بہار ۔

۳۰- میسرز قاسمی بک سینٹر
چھوٹی مسجد
اسٹیشن روڈ
سمستی پور ۔ بہار

۳۱ میسرز محمد شکیل صدیقی
معرفت ایم ایم صدیقی صاحب
[illegible] بانک
پوسٹ بیاپور
نزد دیناپور کینٹ
پٹنہ ۔ بہار

بانی سرسید

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ١١

جلد ١٠

نومبر ١٩٩١ء

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

نائب مدیر

شباب الدین

انچارج سرکولیشن
شفیق احمد

تزئین
سرفراز

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ :
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اپنڈ ٹرسٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، انڈیا
(202002)

زر سالانہ : انڈیا Rs.45.00
* بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک
* US $ 8.00 عام ڈاک

PHONE. 24827

...سیل زر کا پتہ :
...ادارہ تہذیب الاخلاق اپنڈ ٹرسٹ
...گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ ...
PREMANT(?),
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGAR...

مندرجات

ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو۔

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — پرنٹر پبلشر: اسرار احمد — مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — پریس: اے. ایم. یو. پریس — علی گڑھ

اداریہ

ہمارے دور کی دنیا میں زور، زبردستی، جبر، ظلم، تشدد اور من مانی کرنے کی جو لہر آئی ہوئی ہے اس سے شاید ہی کوئی ملک محفوظ ہو۔ جس طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھیے، آگ لگی ہوئی ہے اور وہاں کی حکومت، تمام گنی، سیانے اور دانش ور بے بس تماشائی کی طرح آگ کے بھڑکنے اور اس کو بڑھتے دیکھ رہے ہیں مگر اس کو فرو کرنے سے عاجز اور قاصر ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حکومتیں ہوں یا عقلاء و دانش ور سب نے ہی حالات سے "خاموش معاہدہ" کر رکھا ہے اور تباہی و بربادی کے تانڈو ناچ کو تقاضائے وقت قرار دیتے ہوئے اس کی سنگینی پر اصطلاحات کے دبیز پردے ڈالنے کا "فریضہ" انجام دینے میں مصروف ہیں۔

ہندوستان بھی اسی دنیا کا ایک جزو ہے۔ جو کچھ پوری دنیا میں ہو رہا ہے کسی نہ کسی شکل میں ہندوستان میں بھی وہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہاں بھی زور، زبردستی، جبر، ظلم، تشدد اور من مانی کرنے کی عادت عام ہوتی جا رہی ہے اور اس عادت کو معاشرے کے ہر طبقے کی طرف سے دل کھول کر بڑھاوا مل رہا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آج کشمیر، پنجاب، آسام اور اتر پردیش سمیت ملک کے بہت سے علاقے ایسے آتش فشاں بنے ہوئے ہیں جن سے مسلسل لاوا ابل رہا ہے۔ لوگ ہلاک ہو رہے، املاک تباہ ہو رہی ہیں، امن و قانون کا وجود معرض خطر میں پڑ گیا ہے مگر ملک کا ضمیر ہے کہ جاگتا ہی نہیں ہے، احساس ہے کہ جھرجھری ہی نہیں لیتا، جو کچھ جس انداز اور جس شکل میں ہو رہا ہے اس کے ہم سب اس طرح خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں جیسے ہم گوشت پوست کے زندہ، جیتے جاگتے انسان نہیں پتھر کے مجسمے ہیں۔

اس وقت تشدد کی لہر نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے جس کو "اغوا کی سیاست" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کسی کو زور زبردستی سے اٹھا لے جانا انسانی تاریخ میں کوئی نیا عمل تو نہیں ہے مگر پچھلے زمانے میں اس کا ایک "مخصوص استعمال" اور "مخصوص موقع و محل" تھا۔ بالعموم جیالے عشاق اس عمل کے مرتکب ہوتے تھے اور اس طرح کے واقعات عام نہیں محدود سے چند تھے۔ پچھلے زمانے میں اغوا کی جو وارداتیں ہوتی تھیں ان کو اگرچہ سماج میں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا تاہم ان کا ایک "خاص مقصد" ہوتا تھا اور حصول مقصد کے بعد مغوی [illegible] زندگی کے دھارے میں اس طرح جذب و پیوست ہو جاتے تھے کہ ان میں اور دیگر افراد میں کوئی فرق نہ دکھائی دیتا تھا۔

ہمارے دور میں اغوا کا عمل عشق و عاشقی سے متعلق نہیں رہا۔ اب سیاست یا لین دین کیلئے زور زبردستی سے اپنی بات منوانے کا ایک ذریعہ بن گیا ہے۔ کہیں الکشن ہے تو اپنے مخالف یا مخالفین کو اغوا کر لیا جاتا ہے کہیں کسی مسئلے پر رائے شماری ہے اور خدشہ اس بات کا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے زک کھا سکتی ہے تو زک کھلانے کا امکان رکھنے والی جماعت، دوسری جماعت کے افراد کو اغوا کرنے سے باز نہیں رہتی۔ اگر کہیں مقدمہ لڑا جا رہا ہے تو فریق کے گواہ کو بلا تکلف اغوا کر کے اس کو بھی موجودہ اخلاقیات کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں تو ہیں ہی اب ایک نئی بات یہ ہو گئی ہے کہ حکومت وقت سے اپنی بات منوانے کے لیے ان افراد کا بھی اغوا کیا جانے لگا ہے جو نہ تو حکومت کے کار پرداز ہیں اور نہ ہی اس کے چلانے والے۔ چونکہ ہر شہری کے جان و مال کی ذمہ داری حکومت وقت پر فرض عین ہے اس لیے حکومت کو نیچا دکھانے یا اس سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے عام شہریوں کو بھی اغوا کیا جانے لگا ہے اور ان کو عذاب مسلسل میں ڈال کر حکومت سے مطالبہ کیا جانے لگا ہے کہ اغوا کرنے والوں کے مطالبات کو مان لیا جائے۔

ابھی تک اغوا کی سیاست کے شکار فرد ہمارے ہم وطن تھے ان میں سے جو خوش قسمت تھے ان کی جان بچ گئی اور جن کی قسمت کا ستارہ گردش میں آگیا وہ فنا کے گھاٹ اتر گئے، ان کی موت پر ان کے اہل خانہ بھلے ہی رو پیٹ لیے مگر ہمارے معاشرے میں ان کی موت پر کسی قسم کے رد عمل کا کوئی اظہار نہیں کیا گیا۔ اب اغوا کی سیاست نے ایک اور رخ اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ سے اب ہمارے ملک میں دوسرے ملکوں کے شہری حتی کہ سفارت کار بھی محفوظ نہیں ہیں۔ رومانیہ کے سفارت کار کے اغوا کا معاملہ اس ضمن میں آتا ہے جس کی تلاش تو جاری ہے مگر جن کا نام و نشان عنقا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ اغوا کی سیاست ہم کو کہاں لے جائے گی؟ اس کی کوئی حد اور انتہا ہے بھی یا نہیں؟ کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟ لیکن ان باتوں کو سوچے کون؟ اس عمل میں تو ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ اپنی اپنی باری آنے پر ہم سب اس عمل کے مرتکب ہوتے ہیں جس کی اُس وقت تک ہم مذمت کرتے ہیں جب تک ہم کو اس کا موقع نہیں ملتا۔ جہاں موقع ہاتھ آیا ہماری فکر بھی بدل جاتی ہے اور زبان بھی اور کل تک جو "ناخوب" تھا وہی آج "خوب" بن جاتا ہے اور ہم اُسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تکلف برطرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب اغوا کار ہیں، ہمارے نام بدلے ہوئے ہیں، ہمارے اغوا کرنے کے طریقے بدلے ہوئے ہیں جن کو ہم نے دلکش اصطلاحوں کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ اپنی ہاتھوں سے اغوا کی سیاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکنے کی انتھک اور مسلسل کوشش کی جائے۔ یہ عمل ہم کو کسی اور کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی بقا کے لیے کرنا ہوگا۔ اگر ہم اب بھی نہ چوکے اور اپنی جدوجہد مسلسل سے اغوا کی سیاست کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیابی حاصل نہ کی تو ہم کو اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ہم کو بھی اغوا کی سیاست کا وہ سانپ ڈسے بغیر چھوڑے گا نہیں جس کے کاٹے کا کوئی علاج ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

اسلام کی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ حالت

سر سید احمد خاں

اکثر بزرگوں کو اسلام کی گزشتہ اور موجودہ حالت اور ترقی آئندہ کی سبیل کی تفتیش رہتی ہے۔ اسلام کا لفظ اور اس کی گزشتہ اور موجودہ اور ترقی آئندہ کی سبیل کی تفتیش سن کر تعجب ہوتا ہے۔ اسلام ایک لازوال نور ہے جو ہمیشہ سے روشن ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اسلام خود خدا کا نور ہے جو مثل اس کی ذات کے ازلی و ابدی ہے۔ یہی نور اسلام آدمؑ کے سینے میں تھا۔ اسی نور اسلام نے نوحؑ، شعیبؑ اور یعقوبؑ و ابراہیمؑ، موسیٰؑ و یحییٰؑ و عیسیٰؑ تمام انبیاء علیہ السلام کے دلوں کو منور کیا تھا۔ یہی نور اسلام ہے جو فاران کے پہاڑ پر چمکا اور اسماعیل کے دل میں اترا اور اس کنکریلی زمین نے اپنا گھر بنایا اور ابراہیمؑ نے کہا جب کہ وہ اور اسماعیلؑ اس گھر کی دیواروں کو اٹھاتے تھے

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم
السمیع العلیم "

خدا نے اُس کو قبول کیا۔ پس وہ مقبول ہے اور ہمیشہ مقبول رہے گا۔ اسی نور نے آخر کار سینۂ مبارک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور کیا۔ وہ نور نہ کسی خاص قوم کے مخصوص تھا نہ کسی خاص ملک کے لیے وہ تمام دنیا کے لیے روشنی تھا اور روشنی ہے اور روشنی رہے گا۔ ہر ایک مسلمان کے سینے میں وہی نور ہے۔ اس میں نہ کبھی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا۔ اختلاف فرقے سے جو مذہب اسلام میں دکھائی دیتے ہیں اُس نور میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ تھوڑی دیر کے لیے اسلام کے تمام مختلف فرقوں کا تصور کرو اور تمام مختلف باتوں یا مسئلوں کو حذف کرتے جاؤ۔ حذف کرتے کرتے بہت کچھ رہ جائے گا جس پر سب فرقے متحد ہوں گے۔ پس وہی نور اسلام ہے جو باوصف اختلافات کے سب میں بلاشبہ نقصان کے منور ہے۔

مختلف فرقوں کے باہمی مباحثے اور ایک کو دوسرے کی تکفیر اس پاک نور میں کچھ نقصان نہیں ڈالتی۔ بلکہ اس کو اور زیادہ منور کرتی ہے۔ ایک مسلمان فلاسفر یا نیچرل کہو کہ ایک بدبخت نیچری یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کو اگر دلائل عقلی اور مسائل علمی سے تطبیق دے کر استحکام نہ دیا جاوے تو اُن کے دلوں میں جو علمی تحقیقاتوں پر وثوق رکھتے ہیں زیادہ موثر ہوگا۔ ایک مقدس عابد و زاہد خدا پرست سیدھا سادھا مولوی اُس کی تکفیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدائی باتوں تک انسان کی ناقص عقل نہیں پہنچتی۔ مذہبی باتوں کو بغیر عقل کی مداخلت کے ماننا چاہیے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو پہلے شخص کی باتوں سے تسکین ہوتی ہے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے مقدس بزرگوں کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر باوجود اس اختلاف کے نور اسلام کو برابر ترقی ہوتی رہتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں کے دو مختلف رستے ہیں، مگر درحقیقت یہ ایک غلطی

ہے۔ یہ دونوں اُسی ایک نور کے حامی ہیں اور اُن دونوں
کی کوشش ایک ہی مقصد اور ایک ہی منزل کو پہنچتی ہے
ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے
سامنے پکڑا آتا اور حضرت ابوذر کا کہنا

"لا واللہ صاحب المال کافر"

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمانا

لولا رجعت من هذا لاجدنك ثم قول
ابی ذر افعل ما شئت انی سمعت من
حبیبی محمد رسول اللہ صاحب المال
کافر وانا علیہ مادمت حیا ناخرجہ
عمر رضی اللہ عنہ عن بلد حبیب صلعم
فہذہ کلہا فی الظاہر متناقضۃ لکن
من کلیہا یعنی نور الاسلام اعلی من
ضیاء الشمس فی نصف النہار۔

پس اے بھائیو! تم اسلام کی گزشتہ اور موجودہ حالت کیا پوچھتے ہو اور اس کی آئندہ ترقی کی سبیل کیا سوچتے ہو وہ خدا کا نور ہے وہ جیسا تھا ویسا ہی تھا اور ویسا ہی رہے گا وہ پورا ہے اور پورا ہو گا) واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

ہاں اگر تمہاری مراد اسلام سے اہل اسلام ہے تو بلاشبہ اُن کی گزشتہ اور موجودہ اور آئندہ حالت نہایت دل خراش ہے۔ اسلام جنی کی یا جینی کی کوئی مورت نہیں ہے جو سب کو دکھائی دے۔ اسلام کی حالت مسلمانوں کی حالت سے دکھائی دیتی ہے۔ اگر ان کی حالت اچھی ہے تو اسلام کی حالت بھی اچھی ہے۔ اگر ان کی حالت بُری ہے تو اسلام کی حالت بھی بُری ہے انسان کی اچھی اور بُری حالت کا ہونا دو امر سے متعلق ہے:

ایک اخلاقی۔
دوسرے تمدنی یعنی دنیاوی۔

اخلاقی حالت کے بھی دو حصے ہیں:
ایک وہ ہے جس پر نجات عقبیٰ منحصر ہے۔
دوسرا وہ ہے جو دنیا میں لوگوں پر نیک اثر ڈالنے والا اور نیکی کا نمونہ بن کر لوگوں کو نیکی کی راہ بتانے والا ہے اور عقبیٰ میں اعلیٰ درجات پر پہنچانے والا۔

میں یقین کرتا ہوں کہ پہلا حصہ تمام مسلمانوں کو جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر یقین کرتے ہیں حاصل ہے۔ اس باب میں تمام اہل اسلام جو سابق میں گزرے اور جو اب موجود ہیں اور جو آئندہ ہوں گے سب برابر ہیں۔ دوسرے حصے میں البتہ تفاوت درجات ہیں۔ اگلے زمانے میں نہایت بزرگ اور مقدس یا خدا ولی اللہ گزرے ہیں جن کے انفاس کی برکت سے لوگوں نے بہت کچھ ہدایت پائی ہے۔ ان کی برکت سے ہزاروں انسانوں کے دلوں میں نور خدا کی روشنی پیدا ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے تئیں مجسم نیکی بنا کر اسلام کو اور اس کی خوبیوں کو مجسم کر دکھلایا ہے۔ وہ ہمارے سرتاج تھے۔ ان سے ہمیشہ ہم کو اور ہماری قوم کو افتخار کا باعث ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہمارا ایسے بزرگوں سے ہمارا زمانہ خالی ہے یا شاید ہماری آنکھیں اس قابل نہیں ہیں کہ ہم ایسے بزرگوں کو دیکھیں۔ اسباب میں میں آئندہ کے لیے پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ ہماری قوم میں ایسے مقدس و بزرگ لوگ پیدا ہوں گے یا نہیں مگر میں خدا کی رحمت سے نا امید بھی نہیں ہوں۔ اے دوستو! جب کہ ہم کو یقین حاصل ہے کہ ہم نجات پاویں گے پھر ہم کو اور کیا چاہیے۔ فرض کرو کہ ہم کو اعلیٰ درجات عقبیٰ کے نہ ملیں گے لیکن ایک ذرا سا ہی کونہ ہی بہشت کا مل جاوے گا تو وہ کیا کچھ کم ہوگا۔ مجھ سے تو اقرار نامہ لکھوا لو کہ مجھے تو بہشت میں پھونس کی ایک جھونپڑا کافی ہوگی۔

عقبیٰ سے تو ہم کو بالکل طمانیت اور دلی تسلی

ہے۔ جو کچھ فکر ہم کو ہے وہ تمدنی حالت کا ہے۔ اگر ہماری دنیاوی حالت ذلیل ہوگی تو اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے۔ ہم کو اپنی دنیاوی حالت کے درست کرنے میں کوشش کرنی چاہیے نہ دنیا کے لیے بلکہ دین کے لیے، نہ اپنے لیے بلکہ خدا کے لیے۔

ہمارے بزرگوں نے اس دنیا میں کیا علم میں اور کیا عمل میں کیا دولت میں اور کیا حکومت میں۔ کیا شان میں اور کیا شوکت میں۔ کیا رزم میں اور کیا بزم میں کیسا کچھ اعلیٰ درجہ حاصل کیا تھا جس کے سبب تمام قوموں میں معزز تھے اور اسلام کی شان اُن سے دکھائی دیتی تھی۔ اب ایک ہم ہیں کہ اپنے اسلاف کو بٹہ لگاتے ہیں۔ نہ ہمارے پاس دولت ہے نہ حکومت، نہ علم ہے نہ فضیلت، نہ زر ہے نہ زور ہے۔ سب سے ذلیل اور تمام قوموں سے بدتر ہیں۔ ہر ایک ہم کو ٹھکراتا چلتا ہے۔ ہمارا سر ہر ایک کے پاؤں کے تلے اور ہر ایک کا پاؤں ہمارے سر پر ہے۔ اے دوستو، تم یقین جان لو کہ جو شخص خدا کی خوشنودی چاہتا ہے، جو شخص ثواب آخرت کا طالب ہے، جو شخص بہشت میں اپنے لیے ایک موتی کا محل بنانا چاہتا ہے۔ جو شخص قوم کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ اپنی قوم کو اس ذلیل حالت سے نکالنے میں کوشش کرے۔ تم مسجدیں بناتے ہو بغیر اس کوشش کے اس میں نماز پڑھنے والے بھی قایم رہیں۔ تم خانقاہیں بناتے ہو اور ان میں عبادت کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں کی سلامتی کی فکر نہیں کرتے۔ تم خدا کا گھر اینٹ مٹی سے بنانے پر رغبت رکھتے ہو اور زندہ خانہ خدا کی زندگی کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ ہوشیار ہو، خبردار ہو جان لو، کوئی عبادت، کوئی خیرات، کوئی خیر جاری قومی ہمدردی سے بہتر نہیں ہے۔

قوم کی موجودہ حالت تو تمہارے سامنے ہے اس کی آئندہ حالت تمہارے ہاتھ ہے۔ اگر تم فیاضی کروگے قوم کے ساتھ ہمدردی کروگے۔ اس کی آئندہ حالت درست ہو جاوے گی۔ اگر بے پرواہی کروگے نفسا نفسی میں پڑوگے قوم کی حالت روز بروز ذلیل و خوار ابتر ہوتی جاوے گی۔ مگر اے دوستو! میری بات کو سن لو میں سچ کہتا ہوں۔ سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ میں نہایت دل سوزی سے تم کو سخت لفظوں میں کہتا ہوں کہ اگر تم قوم کی بھلائی میں کوشش نہ کروگے تو تمہاری آئندہ نسلیں اپنے اسلاف کو کوسیں گی اور خود تمہاری روحیں اپنی اولاد کو ذلت کی حالت میں دیکھ کر قبروں میں تڑپیں گی پھر وہ عذاب اُن کو دوزخ کے عذاب سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوگا۔ برائے خدا سمجھو اپنی جان پر اپنی اولاد کی جان پر اپنی ارواح پر رحم کرو اور قوم کی بھلائی پر متوجہ ہو۔

قوم کی بھلائی اور ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ زمانے کے مناسب اُن کی ترقی کے اسباب جمع کیے جاویں۔ اس زمانے میں قومی ترقی صرف زمانے کی حاجتوں کے موافق تعلیم پر منحصر ہے۔ ہم کو دینیات کی تعلیم اپنے عقائد اور اپنا مذہب درست رکھنے کے لیے کافی ہے۔ وہ کہتی ہے تم میری بات نہ سنو اس کی سنو، جس کی بات سننی سب پر فرض ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی سے کیا فرمایا جس نے کہا

" یا نبی اللہ دلنی علی عمل اذا عملتہ دخلت الجنۃ۔"

قال تعبد اللہ ولا تشرک شیئاً
تقیم الصلوٰۃ المکتوبۃ و تودی
الزکوٰۃ المفروضۃ و تصوم رمضان
قال والذی نفسی بیدہ لا ازید
علیٰ ھذا شیئاً ولا انقص فلما ولی

قال النبی صلعم من سرہ ان
ینظر الی رجل من اهل الجنة
فلینظر الی هذا۔

دینیات کی تعلیم تو تمام ہوئی، اب آگے اس پر
اہو جتنی بڑھاؤ اور جس قدر چاہو حاشیے لگاؤ۔ دنیا
کے لیے جو تعلیم درکار ہے وہ بلاشبہ ہیچ در ہیچ ہے
یں کہے دیتا ہوں کہ جو تم چاہو سو کرو مگر جب تک تم اعلیٰ
اعلیٰ تعلیم کا سامان مہیا نہ کر لوگے اور اپنی اولاد کی
کے لیے ایک عالی شان گھر نہ بناؤ گے جس میں بھیج کر
اپنے بچوں کی تعلیم ان کی صحت کی حفاظت اور اُن کے اخلاق
ادات کی درستی اُن کے چال چلن کی نگہبانی سے بے فکر
اؤ، اس وقت تک یہ مطلب حاصل نہ ہوگا۔ بھائیو! میں
ن ہی خیالات سے توکلاً علی اللہ علی گڑھ میں ایک ایسا
الی شان گھر تمہارے بچوں کے لیے بنانے کی بنیاد ڈالی
۔ بہت کچھ اس میں ہو چکا ہے اور بہت کچھ ہونا باقی ہے
گر قوم کی امداد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی قوم کے
بزرگوں کا جنہوں نے اس میں مدد کی اور اپنی غیر قوم
کے دلی بھائیوں کا جنہوں نے فیاضی کی اور مسلمانوں کو خیرات
دی اور حق انسانی ادا کیا دل سے شکر گزار ہوں لیکن اگر وہاں
پوری مراد تک نہ پہنچے تو کیا کرایا سب اکارت ہے۔ اے بھائیو!
اگر تم کو خدا نے پلاؤ کی رکابی دی ہے تو ایک چھوٹی ٹھیکری اپنی قوم
کے لئے بھی ڈال دو۔ اگر خدا نے تم کو سوکھی روٹی دی ہے تو
ایک ٹکڑا اس کا اپنی قوم کے بھوکے بچوں کو بھی دو۔ سب
لوگ مل کر مدد کرو اور اس قومی گھر کو پورا کرو اور ڈرو
اس دن سے جب خدا تم سے کہے گا کہ میں بھوکا تھا تم نے
مجھ کو کھانا نہ دیا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھ کو پانی نہ دیا۔
میں حاجت مند تھا تم نے میری حاجت روائی نہیں کی۔ خدا ان
سب باتوں سے پاک ہے مگر وہ اس پیرایہ میں تم کو سکھاتا ہے
کہ قوم کی خبر لو، قوم کی مدد کرو، قوم کی حاجت روائی کرو۔
تم ان باتوں کو بہ فرض سمجھتے ہو اور اگر نہیں سمجھتے تو اب سمجھ لو
آگے تم کو اختیار ہے۔ چاہو کرو چاہو نہ کرو۔ وما توفیقی الا
باللہ العلی العظیم وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و
آلہ وصحابہ اجمعین۔ برحمتک یا ارحم
الراحمین۔"

"دشمن سے سامنا ہونے کی دعا ہرگز نہ کرو۔
مگر جب دشمن کے سامنے آجاؤ پھر
ثابت قدم رہو۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

تنگی

سید حامد ▽

آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ تنگی کا شکوہ کرتے رہتے ہیں، اشیائے صرف اور اُن کی قیمتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں روپے کی قیمت برابر گر رہی ہے۔ ایسی صورت میں گزر ہو تو کیسے؟ تنخواہیں اور آمدنیاں بڑھتی ہیں تو قیمتیں دوڑ کر ان سے آگے نکل جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک بڑا طبقہ بلکہ اکثریت اپنی ان ضرورتوں کو بھی پورا نہیں کر پاتی جن پر جسم و جان کے تعلق کا انحصار ہے۔ ہر وہ نظام جس میں سارے باشندوں کے لیے روٹی کپڑے اور مکان کی موثر ضمانت نہ ہو، نامنصفانہ ہے؛ اُس سے استحصال کی بو آتی ہے۔

دوسرے سرے پر جو طبقہ ہے وہ مالا مال ہے نہال ہے۔ اس کے پاس دولت اور اسبابِ اظہارِ دولت کی کوئی کمی نہیں۔ مالی اعتبار سے اس طبقے کے نیچے وہ لوگ ہیں جو اچھے خاصے خوش حال ہیں مگر دولتمند نہیں۔ خدا کسی کو اتنا خوش حال نہ بنائے کہ اسے خواہشیں اور ضرورتیں پوری کرنے میں تنگی کا احساس نہ ہو۔ کیونکہ جہاں یہ احساس گیا، انسانیت گئی، شرافت گئی، قناعت گئی۔ تنگ دستی بُری شے ہے کہ بسا اوقات انسان کو یہ محتاج و معذور کر دیتی ہے اور یہ کتنی بُری بات ہے کہ انسان ٹکڑے ٹکڑے کو ترسے۔ اس طرح انسانیت کا وقار مٹی میں مل جاتا ہے لیکن تنگی اچھی چیز ہے کہ یہ انسان کو بے حسی اور فرعونیت اور کاہلی اور تن آسانی سے روکتی ہے وہ انسان بدنصیب اور بد قسمت ہے جس کو تھوڑی بہت کفر نہ کسنی پڑتی ہو، ایک حد تک پیٹ نہ کاٹنا پڑے۔

آپ اعتراض کریں گے کہ تنگی اضافی امر ہے۔ غریب کے لیے جو حالت فارغ البالی کی ہے مگر کے لیے وہی تنگی بن سکتی ہے۔ یہ بات اعتراض کی حد تک صحیح ہے۔ یوں سمجھیے کہ معیار یہ ہے کہ زندگی کی اہم بنیادی ضرورت کو بخیر و خوبی پورا کرنے کے بعد جب نگاہ آسائشوں کی طرف جائے تو وسائل کی طرف سے رکاوٹ محسوس ہو۔ نظام تو وہ بھی غیر منصفانہ ہے جس میں تنگدستی اور خوشحالی کھوے سے کھوا چھیلتی نظر آئیں لیکن وہ نظام جس میں ایک طبقے کے لیے گوناگوں آسائشوں اور تازہ ترین اشیائے صرف کا حصول آسان ہو، اخلاق کو تباہ اور انسانی ہمدردی کو مسمار کر دیتا ہے۔

تنگی محسوس ہوتی ہے تو خدا کا خوف بھی دل میں آتا ہے؛ محروموں سے ہمدردی بھی پیدا ہوتی ہے، نفس پر جو چربی چڑھ جاتی ہے وہ بھی کچھ نہ کچھ چھٹتی ہے۔ راقم کو ڈر لگتا ہے کہ اشتراکیت کے انہدام کے بعد سرمایہ داری نظام انسانوں اور انسانی قدروں پر کیا کیا ظلم نہ ڈھائے۔

▽ سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہمدرد نگر، دہلی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۰، شمارہ ۱۱ (نومبر ۱۹۹۱ء)

تاجکستان میں ہند شناسی

کمال الدین عینی ◊ | مترجم | کبیر احمد جائسی ◊

۱۹۱۲ء میں ایک ترک ادیب عالم جان ادریسی کا مرزا عبدالقادر بیدل پر ایک مقالہ عربی رسم الخط میں اوفا سے شائع ہونے والے ایک مجلہ "شورٰی" کے دوسرے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں صدر الدین عینی کے اس خط کا ترجمہ شامل ہے جو انھوں نے ۱۹۱۱ء میں بخارا سے عالم جان ادریسی کو استانبول بھیجا تھا جہاں موخر الذکر مقیم تھے۔ صدر الدین عینی نے اپنے خط میں ان سوالوں کے تحقیقی جوابات لکھے تھے جو ہندوستان کے اس عظیم شاعر کے سوانح اور ادبی ورثے کے سلسلے میں کیے گئے تھے۔ عینی نے اپنے جواب میں میر غلام علی آزاد بلگرامی کی تصنیف "خزانۂ عامرہ" (سترہویں صدی) اور سراج الدین علی خاں (آرزو) کی "مجمع النفائس" میں مرقوم بیدل سے متعلق اہم اور قابل قدر معلومات فراہم کی تھیں۔ علاوہ بریں صدر الدین عینی نے بیدل کے اس کلیات سے بھی اشعار نقل کیے تھے جو ۱۸۸۲ء میں بمبئی سے لیتھو میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بیدل کی صحیح تاریخ پیدائش کی بھی تعیین کی تھی۔ عالم جان ادریسی اور صدر الدین عینی کی مراسلت و مکاتبت معمولی اہمیت کی حامل نہ تھی۔ ایک طرف یہ مراسلت و مکاتبت بیدل کی علمی میراث کی تحقیق کے اعتبار سے بخارا اور بیرون بخارا کے دانش وروں میں عینی کی عظمت کا سکہ بٹھاتے ہیں تو دوسری طرف عالم جان ادریسی کی تحریر سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ ۱۹۱۰ء ہی سے عینی ہندوستان کے عظیم شاعر بیدل کی شاعری کے سنجیدہ مطالعے میں مصروف تھے۔ وہ ۱۹۱۱ء کے بعد بھی تن دہی سے بیدل کے بارے میں غور و فکر کرتے رہے اور ان کی زندگی کے بعض پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی بھی کی۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے انقلاب کے بعد عینی نے بیدلیات کا مطالعہ ایک منظم انداز سے شروع کیا جس کے نتیجے میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۴ء تک ان کا ایک سلسلۂ مقالات "شرق سرخ" نامی مجلہ میں برابر شائع ہوتا رہا جس میں بیدل کی حیات اور کلام کے مختلف پہلوؤں کو اپنے مطالعے کا ہدف بنایا گیا تھا۔

وہ سائنسی، تہذیبی اور لسانی روایتیں جنھوں نے ہندوستان اور تاجکستان کے عوام کو صدیوں تک ایک دوسرے سے قریب رکھا ابھی تک فراموش نہیں کی گئی ہیں اور آج بھی یہی روایتیں سوویت یونین اور جمہوریۂ ہندوستان

◊ ممبر تاجیک اکیڈمی آف سائنسز، ۳۳ لینن ایونیو، دوشنبہ، تاجکستان۔

◊ ڈائرکٹر ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

کی دوستی و باہمی تعاون کو استحکام بخش رہی ہیں۔ اس امر سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تاجیکی محقق اور دانش ور ہندوستان کی تاریخ و تمدن کا مطالعہ کس ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔ روسی اور ہندوستانی عالموں کے اس طرح کے باہمی تعاون کی ایک قابلِ قدر اور دلکش مثال "وسطِ ایشیا کی تمدنی تاریخ" کی اشاعت کا منصوبہ ہے جو چھ ضخیم جلدوں میں شائع کی جائے گی۔ اس بنیادی کام کا بیڑا بین الاقوامی عالموں کی ایک جماعت نے اٹھایا ہے۔ ان عالموں کی تحریر کردہ جلدوں کو انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار دی اسٹڈی آف دی کلچرس آف سنٹرل ایشیا" کے زیر اہتمام شائع کیا جائے گا۔

مذکورہ ایسوسی ایشن کے صدر، تاجیک سوویت سوشلسٹ ریپبلک اکیڈمی آف سائنسز کے صدر اور بین الاقوامی جواہر لعل نہرو انعام یافتہ عاصموف (محمد عاصمی) کا خیال ہے کہ اس تاریخ کو مرتب کرنا بجائے خود اس خطۂ ارضی کی تہذیبوں کو پیش رفت کی راہوں پر گامزن کرنے کی ان کی خلاقی ترقیوں کی نشان دہی اور اس امر کی طرف توجہ دلانے کی مترادف ہے کہ مختلف اقوام کے درمیان دوستی و اخوت کے کتنے امکانات موجود ہیں۔

تاجیکستان میں ہند شناسی کے باقاعدہ اور منظم مطالعے کا آغاز ۱۹۵۸ء سے ہوتا ہے جب وہاں کی اکیڈمی آف سائنسز میں "شعبۂ مطالعات شرقی و میراثِ تحریری" (Department of Oriental Studies and written heritage) کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک اس شعبہ کی پیش رفت کی سمت یہ رہی ہے کہ ہندوستان میں تحریر کیے جانے والے ان فارسی مخطوطات کا تعارف کرایا جائے جو تاجیک اکیڈمی آف سائنسز میں محفوظ ہیں۔ ان مخطوطات پر تفصیلی مقالات لکھے جائیں اور ان کا نام مخطوطات کی مطبوعہ فہرست میں شامل کر کے ان کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جائیں اور گیارہویں سے بیسویں صدی تک ہندوستان میں معرضِ وجود میں آنے والے فارسی کلاسیکی ادب کا نہ صرف مطالعہ کیا جائے بلکہ اس کو شائع بھی کر دیا جائے۔ اس شعبے میں انیسویں صدی کے اردو ادب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کی ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو اور ہندی کا تاریخی پس منظر میں تقابلی لسانی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

اس صدی کے پانچویں دہے کے نصف آخر سے لے کر آج تک تاجیکی دانش ور اور محققین ان ہندوستانی فارسی مخطوطات کو متعارف کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں جو فردوسی پبلک لائبریری اور تاجیکستان کی دوسری لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ ان مخطوطات میں وہ رسالے بھی شامل ہیں جن کا موضوع فلسفہ، سائنس، طب، تاریخی توقیعات، دستاویزیں اور افسانوی ادب ہے۔ تاجیک اکیڈمی آف سائنسز میں محفوظ مخطوطات کی ایک فہرست تاجیکی محققوں نے دس ضخیم جلدوں میں مرتب کی ہے ان میں سے پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور بقیہ پانچ جلدوں کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس فہرست مخطوطات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گیارہویں صدی سے بیسویں صدی تک کے ہندوستان کے منفرد اور نایاب فارسی مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جن شاعروں اور ادیبوں کے آثار کے بارے میں اس فہرست مخطوطات میں قابلِ قدر مواد ملتا ہے ان میں مسعود سعد سلمان، عثمان مختاری غزنوی، ابوالفرج رونی، بدر چاچی، امیر خسرو دہلوی، حسن دہلوی اور ضیاء الدین نخشبی کے نام شامل ہیں۔ عثمان مختاری غزنوی کے منظوم "شہر یار نامہ" کا ایک نادر مخطوطہ جو بارہویں صدی عیسوی کے وسط کا کتابت کردہ ہے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ شہر یار نامہ کے صرف دو مخطوطے پوری دنیا میں دستیاب

یہ ان میں سے ایک برٹش میوزیم لندن میں ہے مگر یہ مخطوطہ ناقص ہے۔ دوسرا وہی نادر مخطوطہ ہے جو تاجیک اکیڈمی آف سائنسز دوشنبہ کے ذخیرۂ عبدالغنی میرزائیف میں محفوظ ہے۔ مذکورہ ذخیرہ میں اس مخطوطے کے علاوہ اور بھی بہت سے قابل ذکر مخطوطات محفوظ ہیں۔ مثلاً محمد قاسم فرشتہ کی دستور الاطباء جو قدیم ہندوستانی طرز ادویہ (فارماکوپیا) پر مبنی ہے، ضیاء الدین نخشبی کی 'لذت النساء' جو سنسکرت کوک شاستر کی فارسی تشریح و توضیح ہے۔ علاوہ بریں درویش محمد کی تصنیف طب اورنگ زیب جس میں طبی نسخے ہندی اور فارسی میں ملتے ہیں۔

اسی ذخیرۂ عبدالغنی میرزائیف میں ہندوستان کی ایسی نایاب تاریخی دستاویزیں اور مخطوطے محفوظ ہیں جن میں سولہویں اور سترہویں صدی کے سیاسی و سماجی واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں 'بدایع الانشاء' بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں عبدالسلام کی خود نوشت 'انشاآت' بھی خاص طور سے قابل ذکر ہے جس میں ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے اور کشمیر پر اس کے سیاسی اثرات کا مفصل ذکر ہے۔ علاوہ بریں پنڈت لچھمی رام کے منشآت کا ایک مجموعہ بھی جو انیسویں صدی کا ہے اس ذخیرے میں محفوظ ہے۔ مذکورہ بالا ذخیرے میں تیس جلدوں سے بھی زیادہ خسرو کی تصانیف کے مخطوطے ہیں۔ خسرو کے آثار کا اتنا بڑا ذخیرہ پورے سوویت یونین میں کہیں اور نہیں ہے۔ ان مخطوطوں میں غرۃ الکمال کا وہ مخطوطہ بھی شامل ہے جس کی کتابت چودھویں صدی کی ابتدا میں یعنی شاعر کے زمانۂ حیات میں ہوئی تھی۔ ہندوستان کے جن دوسرے فارسی ادیبوں اور شاعروں کے آثار اس ذخیرے میں محفوظ ہیں ان میں شیخ ابوالفضل، طالب (آملی)، ظہوری، انیسی شاملو، غزالی، قدسی، عرفی، فنی کشمیری، منیر لاہوری، سعد الدین ہمدانی، صائب، نظیری، فانی کشمیری، ناصر علی (سرہندی)، غنیمت (کنجاہی) اور طغرئی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان مخطوطات میں کلیات عرفی کا وہ بیش قیمت مخطوطہ شامل ہے جس کی کتابت اس کے انتقال کے کچھ ہی عرصے بعد ہوئی تھی۔ غنی کشمیری کے دیوان کا وہ مخطوطہ بھی قابل ذکر ہے جس کی کتابت شاعر کے زمانۂ حیات میں ہوئی تھی۔ اس بات کا علم بہت ہی کم لوگوں کو ہے کہ اس ذخیرہ میں ابوالفضل علامی کی 'عیار دانش' کا بھی ایک مخطوطہ محفوظ ہے جس کی کتابت اس کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔ ابوالفضل کے جو مخطوطات یہاں محفوظ ہیں ان میں یہ قدیم ترین مخطوطہ ہے۔

عبدالغنی میرزائیف کے ذخیرے میں انیسویں اور بیسویں صدی کی دہلی، بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ اور ہندوستان کے دوسرے اور شہروں کی لیتھو میں شائع شدہ فارسی، عربی، ہندی اور اردو کی وہ کتابیں بھی محفوظ ہیں جو ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی تالیف کردہ ہیں۔ اس ذخیرے میں اس کی اپنی ایک کیمیکل اور فوٹو تجربہ گاہ (لیبوریٹری) بھی ہے اور ایک جلد خانہ بھی جس میں جلد سازی کے علاوہ کتابوں کی حفاظت کے لیے بڑبیر ([illegible]) بھی لگایا جاتا ہے۔ یہاں کے کارکن مختلف کیمیکل کے ذریعے مخطوطات کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ ان کی مائکروفلم بنا کر ان کو محفوظ کر لینے کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔

ہندوستان کی فارسی میراث سے تاجیکی محققوں اور دانش وروں کی دلچسپی تیس برس سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ صدر الدین عینی کا مونوگراف "میرزا عبدالقادر بیدل اور ان کے آثار" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا جس میں بیدل کے بہت سے اشعار بھی نمونے کے طور پر جمع کیے گئے تھے۔ بعد ازاں انہی کی [illegible]

خالدہ عینی نے اپنا رسالہ "بیدل اور ان کی مثنوی عرفان" کے عنوان سے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ ۱۹۶۴ء میں عبدالغنی بیدل کے مجموعی آثار [illegible] کی گیارہویں جلد منظر عام پر آئی (اس جلد کو خالدہ عینی نے مرتب کیا تھا اور اس پر مقدمہ بھی لکھا تھا) جس میں عینی کی وہ تمام تحریریں شامل ہیں جن کو انھوں نے بیدلیات کے موضوع پر وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پھر ۱۹۸۳ء میں خالدہ عینی کی مرتب کردہ بیدل کی کتاب "چہار عنصر" کا انتقادی متن منظر عام پر آیا۔ اس تنقیدی متن کی ترتیب میں خالدہ عینی کے پچیس سال صرف ہوئے تھے۔ ۱۹۸۴ء میں تاجکستان سے بیدل کے دو انتخابات کی اشاعت عمل میں آئی۔ ایک کے مرتب اے۔ ہادی زادہ تھے اور اس کے حواشی کی تحریر میں ہادی زادہ کی شریک خالدہ عینی بھی تھیں اور دوسرا غزلیات بیدل کا انتخاب تھا جو خالدہ عینی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ تاجکستان میں آثار بیدل کی اشاعت تین زبانوں یعنی تاجکی (روسی رسم الخط میں لکھی ہوئی فارسی)، فارسی اور روسی میں ہوئی ہے۔ آثار بیدل کی اشاعت اور ان کا مطالعہ تاجکستان میں روز افزوں ہے۔

ایک تاجیک محقق اور دانش ور معروف باقیف نے اپنی عمر کے کئی قیمتی سال امیر خسرو دہلوی کی حیات اور آثار کے مطالعے پر صرف کیے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کا مونوگراف "خسرو دہلوی اور ان کی مثنوی دول رانی و خضر خاں" شائع ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں خسرو دہلوی کا ایک انتخاب کلام شائع ہوا (اس انتخاب کے بھی مرتب باقیف تھے) بعد ازاں ۱۹۶۵ء میں حسن دہلوی کے کلام کا ایک انتخاب معروف باقیف اور سلامت شائی وا نے شائع کیا۔ آج کل ہندوستان کے ادب اور انگریزی ادب کا مطالعہ بڑی توجہ سے کیا جا رہا ہے اور اس مطالعے میں جو ادیب اور دانش ور مشغول ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

عبداللہ جان غفاروف ، شریف النسا پولاتووا ، اے۔ علی مردانوف — اے جان خیدو، زلیا امراروف۔ ایس اکراموف۔ ایم کناوف سلامت شائی وا اور ایم۔ شہیدی وغیرہ۔

عبداللہ جان غفاروف کا رسالہ "مرزا غالب حیات و آثار" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں شریف النسا پولاتووا کا مونوگراف "غالب کے اردو خطوط" منظر عام پر آیا۔ بعد ازاں ۱۹۶۷ء میں عبداللہ جان غفاروف نے غالب کے منظوم و منثور آثار کا ایک انتخاب شائع کیا۔ اس انتخاب میں غالب کی بہترین غزلیں، قصیدے، رباعیاں اور قطعوں کے ساتھ ساتھ پنج آہنگ، مہر نیمروز اور درفش کاویانی کے منتخب اقتباسات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ سوویت یونین میں غالب کی فارسی تصانیف سے متعلق اس مونوگراف کی پہلی اشاعت کلیات و دیوان غالب کے ان مخطوطوں پر مبنی ہے جو ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں جب سوویت یونین میں غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی اس وقت سے کافی تاجیکی ادیب اور محقق غالب کی حیات اور آثار کے مطالعے میں مصروف ہیں۔

۱۹۷۵ء میں ہندوستانی اور تاجیکی عوام کے ایک بہت بڑے جلسے نے امیر خسرو کی سات سو سالہ برسی منائی اس موقع پر تاجیکی ادیبوں کے جو رشحات قلم منظر عام پر آئے ان میں سے چند یہ ہیں، "امیر خسرو دہلوی" یہ کتاب فارسی میں شائع کی گئی ہے جو محمد عاصمی (عاصموف) اور اے۔ میرزائیف کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ علاوہ بریں محمد عاصمی نے امیر خسرو کے آثار کا ایک انتخاب بھی چار جلدوں میں شائع کیا۔

"امیر خسرو دہلوی۔ حیات اور آثار" کے عنوان سے ایم۔ بقیف کا مونوگراف شائع ہوا جس کے مرتب زیڈ۔ امراری تھے۔ انہی بابقیف نے مثنوی دول رانی خضر خاں کا تنقیدی متن شائع کیا۔ مزید برآں اے۔ افصح زادہ نے "خسرو کے سال و حکم" شائع کیے۔ مؤخر الذکر دونوں کتابیں فارسی میں شائع ہوئی ہیں (یعنی ان کا رسم الخط بھی فارسی ہے)۔

ایک دوسرے ہندوستانی شاعر اور مفکر محمد اقبال کی صد سالہ برسی تاجیکستان کے دانش وروں نے ۱۹۷۷ء میں منائی۔ اس برسی کے موقع پر بہت سے مونوگراف اور کتابیں شائع کی گئیں۔ مثلاً عبداللہ جان غفاروف نے "محمد اقبال" کے عنوان سے تاجیکی زبان میں ایک مونوگراف لکھا اور اس کے علاوہ انھوں نے اقبال کے منتخب کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا جو مذکورہ برسی کے موقع پر شائع ہوا۔ ایک پاکستانی دانش ور سید عبدالواحد کی انگریزی کتاب "Iqbal - Activity and world out-look" کا روسی زبان میں ترجمہ شائع کیا گیا۔ اس کتاب کے مترجم ایم۔ زیڈ۔ شہیدی تھے اور اس کو محمد عاصمی نے مرتب کر کے ایک مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔

۷۷-۱۹۷۶ء میں کراچی سے عبدالغنی و: انیف کی مرتب کردہ دو فارسی کتابیں تذکرۃ الشعرا اور خاطرات مطربی شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کی اشاعت سے اس منصوبے کی تکمیل ہوئی جو تاجیکستان میں برسوں سے پندرھویں تا سترھویں صدی کے درمیان ماوراء النہر اور کشمیر میں معرض وجود میں آنے والے ادب کے مطالعے کے لیے مختص تھا۔

برسوں تک تاجیک محقق اور دانش ور عہد وسطیٰ اور عصر جدید کے ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کے آثار و حیات کا مطالعہ کر کے ان پر کتابیں شائع کرتے رہے ہیں۔ جن ادیبوں اور شاعروں پر خاص طور سے توجہ کی گئی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ ضیاء الدین نخشبی، غنی کشمیری، نعمت خاں عالی، حسین قلی خاں عظیم آبادی اور الطاف حسین حالی۔ ۱۹۷۸ء میں عبداللہ جان غفاروف کی مرتب کردہ کتاب "اشعار افوت" شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں انھوں نے ان تمام اشعار کو یکجا کر دیا ہے جن کے مطالعے سے ہندوستان اور ماوراء النہر کے شاعروں کے مابین باہمی ادبی لین دین کا علم ہوتا ہے۔ اسی سال انہی عبداللہ جان غفاروف نے غنی کشمیری کا بھی ایک انتخاب کلام شائع کیا۔ ۱۹۸۰ء میں علی مردانوف کا مونوگراف "ضیاء الدین نخشبی اور ان کا طوطی نامہ" منظر عام پر آیا۔ اسی سال زیڈ۔ امراروف اور ایل۔ شیر علی نے صائب کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا۔ ۱۹۸۱ء میں ایس۔ اکراموف نے نعمت خاں عالی کے اشعار کا مجموعہ "چمن اندیشہ" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔

(۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۵ء) میں حسین قلی خاں عظیم آبادی کے مرتب کردہ تذکرہ کی اشاعت تاجیکی "مطالعۂ ہندشناسی" کا ایک اہم اقدام ہے۔ حسین قلی خاں عظیم آبادی کا یہ تذکرہ جو "نشتر عشق" کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوستان میں ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس تذکرے میں دسویں صدی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک کے ایک ہزار چار سو سے بھی زائد فارسی شعرا کے حالات اور ان کے نمونۂ کلام درج ہیں۔ ایک تاجیک محقق اے۔ جان فیدا نے اس تذکرہ کا متن پانچ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا۔ اسی سال ایچ۔ رہبروف کا مونوگراف "موہن راکیش اور ان کے افسانے" بھی منظر عام پر آیا۔ ۱۹۸۲ء میں ایل۔ سلامت شائی وا نے اپنا مونوگراف "حسن دہلوی کی فلسفیانہ غزلیات" کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ مونوگراف حسن دہلوی کی حیات اور آثار کے مطالعے کے لیے وقف ہے۔ وہ عہد وسطیٰ کے ایک ہندوستانی مفکر شاعر تھے جن کی ادبی میراث دو بڑی تہذیبوں یعنی ہندی اور تاجیکی (ایرانی) کو باہم

جذب و پیوست کر لی ہے ۔

اب بارھویں صدی عیسوی کے فارسی شاعر مختاری غزنوی کے منظوم "شہریار نامہ" کے مخطوطہ کا عکسی ایڈیشن Facsimile edition پریس جانے کے لیے تیار ہے جس کو کمال الدین عینی نے مرتب کیا ہے ۔

ہند شناسی کے تاجیک ماہرین صرف سائنسی تحقیقات ہی میں سرگرم عمل نہیں رہے بلکہ انھوں نے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر علمی سائنسی کتابیں اور مقالے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان ماہر ہند شناس ادیبوں اور عالموں کی حیات اور آثار پر محققانہ کتابیں لکھنے کے علاوہ ہندوستان کے اصلی و حقیقی مسائل پر کتابیں لکھی ہیں ۔ علاوہ بریں ان افراد نے ہندوستان کے فارسی اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی ادبی کاوشوں کو بھی روسی اور تاجیکی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی اس طرح کے موضوعات پر تقریریں نشر ہوتی ہیں اور اخبارات و رسائل میں بھی ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں جن سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں نے سائنس اور تہذیب و تمدن میں کیا پیش رفت کی ہے ۔

ہندوستانی فارسی شاعروں کے بھی سارے کے جو مجموعۂ کلام فارسی اور تاجیکی (روسی) رسم الخط میں برابر شائع کیے جاتے ہیں وہ تاجیکوں میں بہت مقبول ہیں۔ اس طرح کی کتابوں کی اشاعت سے تاجیکستان کے عوام قدیم ہندوستانی شاعروں کے نام اور کلام سے آشنا ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں لی۔ پولاتووا نے غالب کی فارسی رباعیوں کو فارسی اور تاجیکی دونوں رسم الخطوں میں شائع کیا۔ ۱۹۸۳ء میں سروجنی نائیڈو پر ایم تہابودا کی تحریر کردہ کتاب منظر عام پر آئی ۔ ۱۹۸۴ء میں لے ۔ مختاروف کی کتاب "ہندوستانی میوزیموں میں محفوظ تاجیکی فرامین" شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنے اس سہ ماہی سفر کا حال بیان کیا ہے جو انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھی اے۔ مختاروف نے دہلی، علی گڑھ، پٹنہ، حیدرآباد اور رامپور کے کتابخانوں میں محفوظ اس تمام مواد کو بھی دیکھا جس سے ہندوستان اور تاجیکستان کے قدیم ادیبوں اور شاعروں کے باہمی ادبی روابط پر روشنی پڑتی ہے ۔

گزشتہ تیس برسوں میں تاجیکستان کے دانشوروں اور محققوں نے سو سے زیادہ مونوگراف اور تنقیدی متون شائع کیے اور سیکڑوں کی تعداد میں ایسے مقالات لکھے اور شائع کیے گئے ہیں جن سے ہندوستان کی سائنسی تہذیبی اور لسانی میراث پر روشنی پڑتی ہے ۔

ہندوستانی اور تاجیکی عالموں اور دانشوروں کا علمی اشتراک بھی روز افزوں ہے ۔ ۱۹۸۵ء میں جب کہ مشرق کے عظیم دانشور اور سائنس داں الخوارزمی کی ایک ہزار دو سوویں برسی منائی گئی ۔ اس زمانے میں ڈاکٹر رضیہ جعفری اور دائی۔ ایس مانٹ سیف کے اشتراک سے اک "اہم مونوگراف" شائع کیا گیا جو "صورۃ الارض" پر مبنی ہے اور اس کا مقدمہ کمال الدین عینی کا تحریر کردہ ہے ۔ یہ کتاب کشمیر یونیورسٹی کے سینٹر فار دی اسٹڈی آف سنٹرل ایشیا اور انسٹی ٹیوٹ آف دی اکیڈمی آف سائنسز آف تاجیک سوویت سوشلسٹ ری پبلک دوشنبہ کے اشتراک سے شائع ہوئی تھی۔

تاجیکی ہند شناسوں نے مستقبل کے لیے بھی کچھ علمی منصوبے تیار کیے ہیں۔ ۱۹۸۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۹۰ء میں ختم ہونے والے زمانے میں تاجیکی محققین اور دانشور ہندوستان کے فارسی ادب کی ایک تاریخ مرتب کریں گے ۔ یہ تاریخ ادب متعدد جلدوں میں ہوگی اور اس میں گیارہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے ہندوستانی فارسی ادب کا مطالعہ اس طرح کیا جائے

کا کر اس کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقی کے سارے مراحل واضح و روشن ہو سکیں گے۔ یہ تاریخ ادبیات اس سعی و کاوش کا ایک زندہ ثبوت ہوگی جو تاجیکی دانشور اور محققین گزشتہ تیس برسوں سے زیادہ عرصے سے ہند شناسی کی نسبت سے انجام دے رہے ہیں۔ اس قابل قدر تاریخ ادبیات کی تکمیل کے لیے تاجیکی محققین ہندوستانی محققین کی قابل قدر خدمات حاصل کر سکیں گے۔ ایک منصوبہ یہ بھی ہے کہ تاجیکستان کے عوام کے ایک بڑے طبقے کے لیے ہندوستان کے عظیم رزمیہ مہابھارت کا فارسی ایڈیشن شائع کیا جائے۔ نیز رابندر ناتھ ٹیگور، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، امرتا پریتم اور دوسرے ہندوستانی ادیبوں کے منتخب آثار کے تاجیکی زبان میں ترجمے شائع کیے جائیں گے۔

عصر حاضر میں تاجیکستانی ریپبلک میں ہند شناس سائنسی ماہرین اور استادوں کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول رکھی گئی ہے اور اس سلسلے میں تاجیک اکیڈمی آف سائنسز اور نیشنل ایجوکیشن منسٹری ہر ممکن اعانت کرتی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ہند شناسی کے لیے لینن یونیورسٹی کے اورینٹل اسٹڈیز کے شعبہ میں ایک نئی کرسی (CHAIR) قایم کی گئی۔ اس کے تحت ماہرین ہندشناس مثلاً ش۔ پولاتووا، ایچ۔ رجبوف، ایم۔ عثمانوف، نوروف اور دوسرے حضرات ہندوستان کی تاریخ، تاریخ تمدن، ادب، لسانیات اور عصر حاضر کے سماجی و سیاسی ترقی پر لکچر دیتے ہیں۔ اورینٹل اسٹڈیز کے شعبے سے منسلک طالب علم اپنا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس شعبے کے اساتذہ جدید ہندوستان کے بارے میں اپنا مطالعہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جنگ عظیم دوم کے

بعد کے ہندوستان کا ہند شناسی اور عصر حاضر میں تاجیکستان اور ہندوستان کے سائنسی اور تہذیبی روابط، اردو زبان کے افعال وغیرہ اس سلسلے میں شائع ہوئے ہیں۔

تاجیکی علما اور دانشور "آل انڈیا" اور "انٹرنیشنل سائنٹفک" جلسوں میں برابر شرکت کرتے رہتے ہیں اور ہند شناسی کے موضوع و مسائل پر تحریراً اور تقریراً اظہار خیال کرتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں دہلی میں جو تاجیکی اور فارسی کی بین الاقوامی کانگریس ہوئی تھی اس میں بابا جان غفوروف، اے۔ ایم میرزائیف، کمال الدین عینی اور اے۔ مختاروف اور پروفیسر عثمانوف نے شرکت کی تھی اور اپنے مقالات اس کانگریس میں پیش کیے۔

اکثر ہندوستانی ادیب بھی تاجیکستان آتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا جنھوں نے عبدالغنی میرزایف کے ذخیرۂ مخطوطات میں ۱۹۸۳ء میں کچھ کام کیا تھا۔ انھوں نے " [illegible] Tajik [illegible] " کے نام سے ایک رسالہ انگریزی میں شائع کیا۔

مشہور تاجیکی ماہر شرقیات بابا جان غفوروف (۱۹۰۹ء – ۱۹۷۷ء) کے الفاظ میں:

"تمام وسط ایشیائی قوموں کی طرح تاجیکی قوم کی تاریخ بھی ہندوستان، افغانستان، ایران اور عرب کے عوام کی تاریخ سے مربوط ہے۔"

تاجیکی علما اور محققین اس تاریخی رابطے کو دل و جان زیادہ عزیز رکھتے ہیں جو ہندوستان اور وسط ایشیا عوام کے درمیان رہا ہے اور یہی رابطہ آج ان کو اور سماجی پیش رفت کے حصول میں مربوط کیے ہو

حواشی

لہ فہرست مخطوطات فارسی موزہ برطانیہ ج ۲ ص ۵۴۲ ۵۴۳ میں مخطوطے کی وضاحت ہے۔ اس میں ۲۰ اوراق ہیں اور ہر صفحہ پر ۲۹ سطریں، نستعلیق میں ہے اور بظاہر سترہویں صدی کی کتابت ہے۔ یہ مصور نسخہ ہے۔ اس میں ۱۲ تصویریں، آخری دو ورق میں شاہنامے کے اشعار ہیں جو داستان اسفندیار سے تعلق رکھتے ہیں۔ شہریار نامے کے اس نسخے کا ذکر پروفیسر صفا نے اپنی کتاب حماسہ سرائی در ایران میں ۱۹۵۵ء میں اور پھر اپنی تاریخ ادبیات ج ۲ میں ۱۹۵۸ء میں کیا تھا، حماسہ سرائی میں ایک اور نسخے کا ذکر اس طرح ہے کہ روسی ایران شناس پروفیسر چایکین نے ایران میں شہریار نامے کا ایک نسخہ خریدا اور اسے روس منتقل کیا۔ اسی نسخے سے پروفیسر نفیسی کے توسط سے ڈاکٹر صفا نے ۵۴ شعر نقل کیے (حماسہ سرائی ص ۳۱۳ - ۳۱۵) معلوم نہیں کہ یہی نسخہ ڈاکٹر مرزائیف کے ذخیرے میں ہے یا کوئی اور نسخہ۔ اگر یہ کوئی اور نسخہ ہے تو اس مثنوی کے تین نسخے مکشوف ہو گئے تھے شہریار نامہ دیوان مختاری تصحیح جلال ہمایوں میں شامل ہے۔ (مترجم)

ٹہ طب ہندی پر ہے۔ اس کے نسخے عام ہیں۔ ہندوستان کی مختلف لائبریریوں کے علاوہ پاکستان میں اس کے ۱۴ نسخے بتائے گئے ہیں۔ فہرست مشترک پاکستان ج: ص ۵۶۲ - ۵۶۳۔ اس کو "افتیالات قاسمی" کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ (مترجم)

تہ حکیم درویش محمد امن آبادی یا امین آبادی تھے۔ امن آباد یا امین آباد گوجرانوالہ پنجاب (پاکستان) میں ہے کہتے ہیں کہ حکیم درویش کو ایک گاؤں انعام میں ملا تھا، درویش نامی گاؤں ہنوز موجود ہے۔ ان کو شاہجہاں اور اورنگ زیب دونوں کے دربار میں رسائی تھی لیکن طبی کتاب اورنگ زیب ہی کے نام پر ہے۔ اس کے نسخے عام ہیں۔ ۱۴ نسخوں کا ذکر فہرست مشترک ج ۱، ص ۶۲۲ - ۶۲۳ پر ہے۔ (مترجم)

عہ بدایع الانشا نام کے کئی رسالے ہیں لیکن سب سے مشہور یوسفی ہروی کی کتاب ہے جو ہمایوں کے زمانے ۹۴۰ھ میں لکھی گئی اس کے نسخے عام ہیں اس کو "انشای یوسفی" بھی کہتے ہیں۔ یوسفی سکندر لودی ابراہیم لودی بابر اور ہمایوں کے عہد کے بزرگ ہیں۔ ان کی تصانیف میں ریاض الادویہ کئی بار طبع ہو چکی ہے، وہ شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا ایک نسخہ گورنمنٹ اورینٹل لائبریری مدراس میں محفوظ ہے۔ ان کا ایک قصیدہ در لغات ہندی ہے جس میں مختلف چیزوں اور دواؤں کے نام ہندی میں درج کیے ہیں۔ (مترجم)

ھہ ... رسم الخط میں یہ لفظ واضح طور پر نہیں پڑھا جا سکا لیکن پنڈت لچھی رام دہلوی (وفات ۱۸۰۱ء) مفید الاطفال کے مصنف ہیں، انھیں کی طرف اشارہ ہے (موزہ پاکستان فہرست ۱۴۴)

(مترجم)

لہ افسوس ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے وسط میں ان کا انتقال ہو گیا۔
(مترجم)

کہ انگریزی مقالے میں اس کا نام
Apparsmo a aiccta
لکھا ہے۔ معلوم نہیں فارسی کا کیا متبادل ہے۔ (مترجم)

شہ انگریزی مقالے میں اس کا نام
Poetry of Saiamaasaip
درج ہے۔ اصل نام قطعیت کے ساتھ نہیں معلوم۔
(مترجم)

سرسید کے کردار کا ایک نمایاں پہلو تھا، ان کی
بے خوفی۔ ان کی صاف گوئی بعض اوقات تشویشناک
ہو جاتی تھی، ان کا مخاطب خواہ وائسرائے ہو یا کوئی
مغضوب الغضب ملا۔ عیسائی مشنری یا اخباری نمائندہ
وہ وہی کہتے تھے جو واقعی ان کے دل میں ہوتا تھا عوامی
مخالفت، گالیاں، جان لینے کی دھمکیاں کوئی چیز بھی ان کو
اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکتی تھی

——— ایچ۔ جی۔ النس

بُخل اور کنجوسی

محمد مختار اصلاحی علیگ ▽

اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو سینت سینت کر رکھنا اور انھیں ضرورت کے موقع پر بھی خرچ نہ کرنا "بخل و کنجوسی" ہے۔ یہ ایسی بُری لت ہے جو انسان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ حضرت ابو علی جرجانیؒ نے لفظ بخل کی بڑی اچھی اور دلچسپ تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"بخل میں تین حروف ہیں۔ بَ سے مراد بلا۔ "خَ" سے مراد خسران یعنی گھاٹا، "لَ" سے مراد لومۃ لائم یعنی لوگوں کی ملامت ہے۔"

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ بخیل ہمیشہ بلا و مصیبت کے ساتھ گھاٹے میں رہتا ہے اور اس پر مزید ستم یہ کہ لوگوں کی ملامت کا ہدف بھی بنتا ہے۔

مال و دولت اور خدا کی دی ہوئی دوسری نعمتیں اسی لیے ہیں کہ انسان خود اس سے فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عمر بھر صرف روپے پیسے جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا حاصل ہوتا ہے۔ بھائی، بہن، عزیز و اقارب، دوست احباب اور محتاج و فقیر کوئی کتنا بھی ضرورت مند اور پریشان حال ہو مگر ایک بخیل و کنجوس اپنا پیسہ کبھی ان پر خرچ کرنے کا روادار نہیں ہوتا۔ بعض کی بخالت و خساست تو اس درجے پر پہنچ جاتی ہے کہ بے حساب دولت رکھنے کے باوجود اپنے کپڑے لتے، اوڑھنے بچھونے اور کھانے پینے میں بھی اتنی کنجوسی کرتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ محتاج و مفلس کوئی اور دوسرا نہیں۔ بہت سے بخیلوں کو میں نے قریب سے دیکھا ہے لیکن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ بہت زیادہ روپیہ پیسہ رکھتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی اس طرح اجیرن کیوں بنائے ہوئے ہیں؟

اپنے بچپن میں ایک بابا کو دیکھا تھا کہ وہ معمولی سی لنگوٹی باندھے دن بھر گھومتے اور لوگوں سے سوال کرتے حالانکہ سبھی جانتے تھے کہ ان کے پاس روپیہ و اشرفی بہت ہے۔ آخر وقت میں تو انھوں نے ایک درخت کے نیچے گھورے کے پاس اپنا ڈیرا ڈال لیا تھا اس لیے بچے عام طور سے انھیں "گھورے بابا" کہنے لگے تھے۔ لیکن جب گھورے بابا کا انتقال ہوا تو اُن کے قریبی لوگوں نے اسی گھورے سے جہاں اُن کا قیام تھا کافی اشرفیاں اور روپیے برآمد کیے

بمبئی کے مطب میں ایک صاحب میلی کچیلی ترکی ٹوپی پہنے، بے ڈھنگے قسم کا لباس پہنے اکثر دوا خانے میں تشریف لاتے اور اپنی کسی نہ کسی تکلیف کا ذکر ضرور کرتے۔ کبھی کھانسی، کبھی داد، کبھی بواسیر، کبھی بلڈ پریشر اور کبھی ذیابیطس وغیرہ کا رونا رویا کرتے، لیکن دوائیں کبھی نہ لیتے۔ بہت سے حکیموں اور ڈاکٹروں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان میں سے اگر کوئی بطور نمونہ دوائیں دے دیتا تو لے لیتے۔ خرید کر کسی سے بھی دوا نہ لیتے۔ معلوم ہوا کہ وہ کئی بڑی بڑی بلڈنگوں کے مالک اور کروڑوں کی ملکیت رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کیا کہ سنا ہے کہ آپ کوئی نئی بلڈنگ بنوا رہے ہیں۔ آپ کی قوم کے پاس اسکول و ہسپتال کی بہت کمی ہے۔ یہ بلڈنگ اسی اہم اور نیک مقصد کے لیے وقف کر دیتے تو قوم کی ضرورت پوری ہوتی اور آپ کی زندگی امر ہو جاتی۔ میری بات تو خاموشی کے ساتھ سن لی لیکن اس کے بعد پھر میں نے کبھی ان کی شکل نہیں دیکھی۔ البتہ ان کے مرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ ان کے کئی دامادوں نے اڑا پٹا کر ان کی زیادہ تر بلڈنگیں بیچ ڈالیں۔

بمبئی کے لوگوں سے ایک صاحب کی جہالت کا ذکر اکثر سنا کرتے۔ میرے یہاں بھی وہ کبھی کبھی سلسلۂ علاج تشریف لایا کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ پھل کی دکان پر ان کو دیکھا کہ جتنے گلے سڑے پھل تھے اسی کو نہایت کم قیمت پر وہ خرید رہے تھے۔ حالانکہ وہ ایک بڑے سرمایے کے مالک تھے اور ان کی کوئی اولاد بھی نہ تھی۔ اسی خساست کی وجہ سے ان کی صحت بھی ہمیشہ خراب رہا کرتی۔ جب وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے تو ان کے وارثوں نے ان کی اچھی خاصی جائداد کے حصے بخرے کر کے ان کا نام و نشان بھی مٹا دیا۔

کچھ ایسے لوگوں سے بھی واقف ہوں جو بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک تھے لیکن اپنی تنگ دلی و کنجوسی کی وجہ سے کسی کو بھی اپنی خداداد صلاحیت سے فائدہ نہ پہنچا سکے۔

ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن کو کسی مرض کا کوئی چٹکلا یا مجرب نسخہ کہیں سے ہاتھ آگیا تو وہ ان کی زندگی کا سرمایہ و سہارا بن گیا۔ کیا مجال کہ کسی کو ذرا بھی اس کی بھنک مل جائے۔ گناہ کی طرح زندگی بھر وہ اس کو چھپائے رہے۔ کچھ ان میں ایسے بھی تھے جو اپنے بچوں سے بھی پوشیدہ رکھ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قرآن میں کئی جگہ بخل و کنجوسی کی سخت مذمت آئی ہے۔ کیوں کہ یہ بہت سی برائیوں کی جڑ ہے۔ بدعہدی، بے مروتی، بے رحمی، بدسلوکی، لالچ، تنگ نظری اور پست ہمتی جیسی بری عادتیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ بخیل دل سے آخرت پر کبھی یقین نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے بینک میں جمع کرنے کے بجائے دولت اپنی تجوریوں میں بند کر کے محفوظ رکھتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انبیاء کی دعوت اور بھلائی کے کاموں میں بھی یہی بخیل و خسیس سب سے بڑی رکاوٹ بنتے رہے۔ تاکہ ان کی جمع کی ہوئی دولت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ انھیں خرابیوں کے پیش نظر اسلام نے جھوٹ کے بعد سب سے زیادہ نجاست و خساست ہی پر ضرب لگائی ہے۔ ہر صاحب مال و دولت پر زکوٰۃ و خیرات کے ذریعے بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا، محتاجوں کی ضرورت پوری کرنا، یتیموں کی خبرگیری اور قرض داروں کے قرض کی ادائیگی میں مدد کرنا جس طرح ضروری قرار دیا گیا اسی طرح ہر صاحب عقل و فہم کو بھی تاکید کی گئی کہ جن لوگوں میں عقل و فہم کی کمی ہو وہ ان کی صحیح رہنمائی کریں۔ علوم و فنون میں حصہ پانے والوں سے بھی کہا گیا کہ وہ اپنے علم و فن سے دوسروں کو بھی فیض پہنچاتے رہیں۔ ایسے ہی جو توانا و طاقت ور ہیں ان پر

گئی یہ بات لازم قرار دی گئی کہ وہ ضعیفوں وکمزوروں کو سہارا دیا کریں نہ کہ قوت وطاقت کے بل پر ان کو دبائے رکھیں۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والوں اور دوسروں کی مدد کرنے والوں کی تعریفیں کی گئیں اور ان کو اس کا بہترین بدلہ دینے کی خوش خبری دی گئی۔ اسلامی نظام میں انھیں سخت قوانین اور اسی کے ساتھ بہترین اجر وثواب کی بشارت کے طفیل بخل وکنجوسی کو نہایت بری نظر سے دیکھا جانے لگا اور پورا معاشرہ بڑی حد تک اس لعنت سے پاک وصاف ہو گیا۔

تدارک:

بخالت وخساست اگر کسی کے دل میں رچ بس جائے تو بڑی مشکل ہی سے وہ نکل پاتی ہے لیکن بزرگوں اور اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے سے اصلاح ممکن ہے بچپن ہی میں اگر نگاہ رکھی جائے اور جن بچوں میں کنجوسی نظر آئے ان پر بھرپور محنت کرنے سے اس بری عادت سے نجات مل سکتی ہے۔ کچھ لوگ بخالت وخساست سے چھٹکارا پاکر فضول خرچی پر اتر آتے ہیں اور اسی طرح کچھ فضول خرچی چھوڑ کر بخل وکنجوسی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں بری عادتوں کے چھڑانے کے وقت اعتدال وکفایت شعاری کی اہمیت وافادیت کو خاص طور سے ذہن نشین کرایا جائے تاکہ ایک بری عادت کو چھوڑ کر دوسری بری عادت اختیار نہ کی جائے۔

"یا رسول اللہ! ہم آپ(کی رسالت) پر ایمان لائے ہیں۔ ہم آپ کی صداقت کا اعلان کرتے ہیں۔ جہاں جی چاہے تشریف لے چلیے اور ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔ بخدا اگر آپ ہمیں سمندروں کو عبور کرنے کے لیے فرمائیں اور آپ سمندر میں کود جائیں تو ہم بھی آپ کے ہمراہ سمندر میں کود جائیں گے۔"

سعد بن عبادہؓ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۰ - شمارہ ۱۱ (نومبر ۱۹۹۱ء)

بائیو سفیر

BIO SPHERE II

جدید لیبارٹری جو اپنی دنیا آپ ہے

محمد زکریا ورک ٭

امریکہ کی ریاست ایری زونا (ARIZONA) کے صحرا میں ایک جدید لیبارٹری پر کام قریب مکمل ہو چکا ہے جو اپنی ذات میں اس زمانے کی کشتی نوح ہے۔ اس لیبارٹری پر گزشتہ چار سال سے کام ہو رہا ہے۔ اس کے اندر دنیا کے ہر قسم کے پودے، پھول، سبزیاں، درخت، جانور، پرندے موجود ہیں۔ اب صرف ایک چیز پر کام کرنا باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ اس کے اندر آئندہ دو سال کے لیے رہنے والے آٹھ افراد کے لیے مناسب آب و ہوا کا مہیا کرنا۔

لیبارٹری پر اب تک قریب ساٹھ ملین امریکی ڈالر خرچ ہو چکا ہے۔ اس تجربے کا در حقیقت مقصد یہ ہے کہ یہ پتہ لگایا جائے کہ ایک لمبے عرصے کے لیے زندگی اور زندہ رہنے والی چیزوں کو ایسا ماحول مہیا کرنا کہ زندگی اگر کسی نامعلوم آفت یا ہلاکت کے نازل ہونے سے بچ سکے تو پھلتی پھولتی رہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس سال موسم بہار کے شروع ہوتے ہی اس لیبارٹری کا آخری دروازہ بند کر دیا جائے گا اور اس کے بعد یہ ایک خود کفیل سسٹم (Self Supporting System) بن جائے گا اسی طرح جس طرح زمین کا کرہ خود کفیل سسٹم ہے۔

لیبارٹری کے اندر رہنے والے آٹھ افراد کو جو زندہ رہنے کے لیے ہوا میسر ہوگی وہ اُن درختوں اور پودوں سے پیدا ہوگی جو اس کے اندر نشو و نما پائیں گے۔ ہوا کو صاف کرنے کے لیے اڑھائی ایکڑ پر پھیلے ہوئے لیبارٹری کے soil کو استعمال کیا جائے گا۔ سائنس دان اور دوسرے ماہرین یہ امید رکھتے ہیں کہ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو ہم یہ جاننے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ زندگی کا [illegible] زمین کے کرہ کے اندر کیسے کامیاب طریقے سے رواں دواں ہے اور یہ کہ آیا ہم ایسی ہی زندگی دوسرے کرّوں پر پھیلانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

بائیو سفیر II کی عمارت کو باہر سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مستقبل کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ عمارت ۸۵ فٹ اونچی اور ۵۲۹ فٹ لمبی ہے۔ عمارت کے اندر ایک مخفی کنٹرول سینٹر ہے جہاں تیس سے زیادہ کمپیوٹر دن رات کام میں مصروف ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعہ عمارت کے اندر ہونے والی تبدیلیاں جیسے درجہ حرارت رطوبت روشنی کی مقدار پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔

٭ کنگسٹن۔ کینیڈا۔

عمارت کے اندر پودے اس قدر تعداد میں ہیں کہ ہر طرف سبز ہی سبز نظر آتا ہے۔ اکثر پودے دنیا کے مختلف ممالک اور علاقوں سے لاکر یہاں لگائے گئے ہیں۔ عمارت کے اندر ایک جگہ زرعی فارمز (Farming Zone) اور تقسیم کے بغیر نصف ایکڑ پر مشتمل ایک سرسبز باغ بھی پھیلا ہوا ہے جہاں ۱۰۰ سے زیادہ مختلف اقسام کے پھل، بوٹے سبزیاں جیسے چاول اور سویابین اُگ رہے ہیں۔

بائیوسفیئر ۲ کو زمین کے کرہ کا مکمل طور پر مشابہ بنانے کے لیے اس کے اندر ایک ۲۵ فٹ گہرا سمندر بھی موجود ہے۔ جس میں ایک ہزار سے زیادہ قسم کے سمندری پودے اور ۲۸۰۰ سے زیادہ قسم کے سمندری جانور موجود ہیں۔ اس سمندر کی دیکھ بھال ایک امریکی خاتون کرتی ہیں جو سمندر اور اس کے اندر کی کائنات کی اسپشلسٹ ہیں۔ سمندر کے حصے میں ایک مصنوعی بیچ (Beach) بھی بنائی گئی ہے اور پھر ایک ویو مشین (Wave Machine) بھی موجود ہے جس کے ذریعے مصنوعی لہریں پیدا کی جاتی ہیں۔ سمندر کے ایک حصے میں ایک آٹھ لاکھ گیلن کا ٹینک بھی ہے جس میں دنیا کی مختلف قسم کی مچھلیاں رکھی گئی ہیں جیسے Parrot Fish — اور Star Fish

بائیوسفیئر ۲ کے تجربے سے یہ پتہ لگایا جائے گا کہ ہم سب کرۂ زمین پر رہتے ہیں اس پر ہمارے کارخانوں سے نکلنے والے دھویں، زہریلی گیسوں اور دریاؤں جھیلوں میں جو ہم کیمیاوی مادے پھینکتے ہیں تو اس کا اثر ہمیں فوراً نظر نہیں آتا مگر بائیوسفیئر کے اندر جب ایک درخت کو کاٹا جائے گا تو کمپیوٹر کی اسکرین پر ایک دھبہ نمودار ہو جائے گا۔

بائیوسفیئر درحقیقت زمین کا ایک حقیقی ماڈل ہے۔ اس تجربے سے ہونے والے نتائج کو دنیا بھر کے ممالک تک پہنچایا جائے گا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ زمین اور اس کے اندر آنے والی انسانی تغیرات سے آگاہ ہو سکیں اور آئندہ نسلوں کے لیے زمین کا کرہ ہم چھوڑ کر جائیں گے وہ کس صورت میں زندہ رہ سکے گا۔

* حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس مومن بندے کے لیے جنت کے سوا اور کیا صلہ ہو سکتا ہے کہ جس کے محبوب کو لے لوں اور وہ ثواب آخرت کی خواہش پر صبر کرے۔"
(بخاری۔ مسلم)

علی گڑھ کالج اور انگریز مخالف تحریکات

(۱۹۰۷ء کی اسٹرائک) نمبر (۲)

سید حامد حسین ▽

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں سے ایم۔ اے۔ او کالج کے یورپین پرنسپل اور اسٹاف اور کالج کے طلبا کے درمیان کشیدگی برابر بڑھ رہی تھی۔ ڈسپلن کے نام پر یورپین اسٹاف طلباء پر طرح طرح کی پابندیاں ٹھونسنے کا رجحان رکھتا تھا اور اس کے ذریعے ایک جانب وہ اُن طلبا کے ذہنوں پر انگریز قوم کی فوقیت اور بالادستی کی دہشت پیدا کرنا چاہتا تھا تو دوسری جانب وہ یہ بھی بالواسطہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ اُن نوجوانوں کو ہندوستان کے مختلف حصّوں میں سر اُٹھاتی انگریز مخالف تحریکات سے ہمدردی رکھنے سے باز رکھے۔ لیکن اس سختی نے طلبا کے اندر ہر بار احساس خودداری پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ بیدار کیا اور وہ انگریز اسٹاف کی زیادتیوں کو اس خاموشی کے ساتھ برداشت نہ کر سکے جتنا یہ اسٹاف توقع کرتا تھا۔ چنانچہ طلبا اور یورپین اسٹاف کے درمیان روز بروز معاملات پیچیدہ ہوتے گئے اور بالآخر اس نے ایک سنگین صورت حال اختیار کر لی جو کہ ۱۹۰۷ء کی اسٹرائک کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس اسٹرائک کا آغاز ایک معمولی واقعے سے ہوا

۹ر فروری ۱۹۰۷ء کو کالج کے چند طلبا نمائش دیکھنے گئے، جہاں ایک طالب علم راجہ غلام حسین اور ایک کانسٹبل میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ کالج کے دوسرے طلبا بھی راجہ غلام حسین کی حمایت میں اکٹھا ہو گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولس نے پرنسپل کو مطلع کیا کہ وہ راجہ غلام حسین کو سزا دیں ورنہ حسب ضابطہ کارروائی کی جائے گی۔ یکم فروری کو پرنسپل نے راجہ غلام حسین کو بلا کر یہ فیصلہ سنایا کہ انھیں تین ماہ کے لیے کالج سے خارج کر دیا گیا ہے۔[1]

غلام حسین کالج کے ذہین اور معقول طالب علموں میں سے تھے۔ دو سال قبل یونین کلب میں اپنی تقاریر کی بنا پر کیمبرج اسپیکنگ پرائز بھی حاصل کر چکے تھے[2] اور کچھ عرصے پہلے ایک مباحثے میں ایک انگریز پروفیسر کو نیچا دکھا چکے تھے۔ غلام حسین کے اخراج کی اطلاع سے طلبا میں غم و غصہ پیدا ہوا اور اس سزا میں وہ اسی انگریز پروفیسر کا ہاتھ سمجھنے لگے جسے مباحثے میں خفت اُٹھانی پڑی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ طلبا نمائش والے واقعے میں غلام حسین کو بے قصور سمجھتے تھے[3] طلبا نے اس سزا کے خلاف پرنسپل

▽ ای ۲/۱۰۲ - پروفیسرز کالونی، بھوپال، ایم۔ پی

کی توجہ دلائی لیکن پرنسپل نے ۱۲ فروری کو غلام حسین پر بیس روپیہ جرمانے، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس سے معافی مانگنے، ہر سہ پہر پرنسپل کو اپنی حاضری دینے اور بورڈنگ ہاؤس سے باہر نہ جانے کی مزید سزائیں نافذ کر دیں۔ ۱۵ فروری کو پرنسپل نے غلام حسین کو کالج کے حدود سے باہر دیکھا اور اس خلاف ورزی کی پاداش میں غلام حسین کو فوراً کالج اور بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر چلے جانے کو کہا۔ طلبا پہلے ہی سے مشتعل تھے اور انھوں نے ہر طالب علم سے ایک ایک پیسہ وصول کر کے جرمانے کی کل رقم پیسوں کی شکل میں رومال میں باندھ کر پرنسپل کی میز پر رکھ دی۔ طلبا کو یہ بھی خبر ملی تھی کہ میر ولایت حسین نے پرنسپل کو بورڈنگ ہاؤس سے نکالنے کے لیے خاص خاص طلبا کی فہرست بھی دی ہے چنانچہ ۱۵ فروری کی شام کو طلبا یونین کے سامنے جمع ہو گئے جب کالج کے اسٹاف نے انھیں منتشر ہونے کا حکم دیا تو انھوں نے اسے نہیں مانا بلکہ اسٹاف کے خلاف نعرے لگائے اور ان کے خلاف سخت کلامی کی۔ تقریباً آدھی رات تک یہ ہنگامہ چلتا رہا۔ طلبا نے یہ طے کیا کہ جب تک غلام حسین کا معاملہ اور اُن کی دوسری شکایتوں کا حل نہیں نکلے گا وہ کلاسوں میں نہیں جائیں گے۔ چنانچہ کالج کو ۲ مارچ تک کے لیے بند کر دیا گیا

اسی دوران کالج کے بعض ٹرسٹیوں کو صورت حال سے مطلع کیا گیا اور اُن کے آنے پر اُن سے طلبا کی گفتگو ہوئی اور ۱۹ فروری کو طلبا کو اس بات پر تیار کر لیا گیا کہ وہ غلام حسین کی سزا کو تسلیم کریں گے اور پرنسپل سے بلا شرط معافی مانگ لیں گے۔ نواب محسن الملک کی تحریری یقین دہانی پر کہ کسی اور طالب علم کو سزا نہیں دی جائے گی طلبا نے تحریری معافی بھی پیش کر دی تھی لیکن ۲۰ فروری کو پرنسپل نے عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خاں شیروانی، قاضی عبدالعزیز، گورکھ ناتھ، محمد حسین انبالوی اور سید محمود چھ طلبا کو ۵ فروری کے گستاخانہ رویے پر کالج سے خارج کر دیا۔ باقی طلبا سے کہا گیا کہ وہ معافی مانگ کر کالج اور بورڈنگ ہاؤس میں رہ سکتے ہیں مگر طلبا نے کالج اور بورڈنگ ہاؤس پر قبضہ کر لیا اور کہا کہ کالج اُن کا ہے اور وہ کالج کے باہر نہیں جائیں گے۔ چنانچہ کالج ۲ اپریل تک کے لیے بند کر دیا گیا اور سب طلبا اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

۲۳ فروری کو تحقیقات کے لیے آٹھ ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے ۱۴ مارچ سے سماعت شروع کی جو کہ ۲۱ مارچ تک چلی۔ ۲۵ مارچ کو رپورٹ پر دستخط ہوئے۔ اس رپورٹ میں جو کہ ۲۶ مئی ۱۹۰۷ء کو ٹرسٹیوں کے اجلاس میں پیش ہوئی، طلبا کی نافرمانی کے جو وجوہ بیان کیے گئے ان میں سے خاص خاص یہ تھے کہ انگریز اسٹاف کے برتاؤ میں تبدیلی آ گئی تھی۔ طلبا میں مصطفیٰ حسین کے واقعے سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ ان کی شکایتوں کی شنوائی نہیں ہوتی۔ زبان کے اختلافات کی وجہ سے طلبا اور اسٹاف میں غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں چنانچہ اس کی سفارش کی گئی کہ اساتذہ کی جانب سے بے تکلفانہ میل جول اور طلبا کی جانب سے استادوں کی فرماں برداری کا اظہار کیا جانا چاہیے۔ رپورٹ میں غلام حسین کی سزا اور پرنسپل کے رویے کو حق بجانب بتایا گیا اور طلبا کے طرزِ عمل کو ناقابلِ حمایت قرار دیا گیا۔ لیکن یورپین اسٹاف کے ایک ممبر (جو غالباً گارڈنر براؤن تھے) کی درشتی کی مذمت کی گئی تھی۔ نواب وقار الملک اور مرزا عابد علی بیگ نے اپنے اختلافی نوٹ شامل کیے تھے۔ مرزا عابد علی بیگ نے کالج اسٹاف کی بالادستی کی شکایت کی تھی جب کہ نواب وقار الملک نے مسٹر گارڈنر براؤن کو سزا دینے اور ڈائننگ ہال کے انتظام کو یورپین اسٹاف کے بجائے ہندوستانی ممبروں

کے سپرد کرنے کی تجویز کی تھی۔[۱۰]

تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے یوروپین اسٹاف نے جو بیانات دیے تھے ان میں طلبا کے بدلے ہوئے سیاسی خیالات پر خاص طور پر زور دیا گیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ یونین میں کانگریسی اخبارات منگوائے جاتے تھے اور طلبا پر اُن کا اثر ہو رہا تھا۔ چنانچہ کالج کے طلبا بھی ملک میں پھیل رہی بدامنی کا شکار ہو رہے تھے۔ ایک یوروپین پروفیسر نے یہ بتایا کہ طلبا کو کانگریس نے پیسے دینے کی بھی پیش کش کی تھی۔[۱۱] کالج کے پرنسپل اور یوروپین اسٹاف نے اس شورش کو سیاسی رنگ دینے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور جتایا گیا ہے کہ اس تاثر کو پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے بنگلوں پر مسلح پولس والوں کو بھی تعینات کروا لیا تھا۔[۱۲]

طلبا بھی اس پروپیگنڈے کے نتائج سے غافل نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے عبدالرحمن بجنوری کی سرکردگی میں اپنا ایک نظام قایم کر لیا تھا[۱۳] اور وہ اپنے احتجاج اور اپنی شکایات کو پیش کرنے میں نہ صرف نہایت محتاط ہو گئے بلکہ انھوں نے یہ بھی مناسب سمجھا کہ اپنے طریقِ عمل پر بیرونی سیاسی اثرات کی موجودگی کی ہر طریقے سے پُرزور تردید کریں۔ لہٰذا انھوں نے "ہز آنر ویسٹرن لفٹننٹ گورنر" کو تار دے کر اس امر کی نسبت اطمینان دلایا کہ یہ حالت صرف کالج کے اندر محدود ہے۔ کوئی سیاسی حیثیت نہیں رکھتی اور تمام طلبا سر سید کی پالیسی پر ثابت قدم ہیں۔ اسی طرح انھوں نے بعض انگریزی اخبارات میں بھی ایک خط چھپوایا جس کا اردو ترجمہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۷ء کے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں شائع ہوا۔

اس خط میں انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ:

ہم نے حکام اور کالج کے قاعدوں کے خلاف بغاوت نہیں کی جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ ذیل کی پوسٹ ہی نے مداخلت کی تھی۔ افسوسناک واقعات کا ایک سلسلہ موجودہ مشکلات کا باعث ہوا ہے جس کے لیے ہم سے زیادہ کوئی بھی دل سے متاسف نہ ہوگا۔ کاش یہ مشکل نہ پیش آتی لیکن اب جبکہ پیش آگئی، ہم کو صاف طور پر یہ کہنا چاہیے کہ ہماری ناراضی کی اصل وجہ ہمارے بعض معلموں کا غیر ہمدردانہ اور معاندانہ برتاؤ ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے طرزِ عمل سے بہت سے لایق لوگ عجیب عجیب خیالات اور منصوبوں کو منسوب کریں گے جن کا ہمارے دلوں میں کبھی گزر بھی نہیں ہوا...... بدقسمتی سے اکثر ہندوستانی کالجوں کی ہوا میں بھی اثر بھرا ہوا ہے اور...... کچھ عرصے سے کالجوں میں گڑبڑ متواتر ہوتی رہی ہے۔ اور تقریباً ہر گڑبڑ کی تحریک کا بالآخر پتہ لگا کہ باہر سے ہوئی تھی یعنی پولیٹیکل فیلنگ کے مجنونانہ جوش کے بدولت جو اس ملک کے اکسٹریمسٹ خیالات میں اس وقت جاری و ساری تھے۔ لہٰذا یہ کچھ غیر قدرتی بات نہیں کہ ایسے خیالات والوں سے اخبارات علی گڑھ کی موجودہ پریشانی کو بھی بے چینی کی عام اسپرٹ کا ایک ظہور قرار دیں اور مسلمانوں کی اٹھتی ہوئی پود میں پولیٹیکل بیداری کی علامت تصور کریں۔ اس قسم کے بیانات کی ہم نہایت شد و مد سے تردید کرتے ہیں......

یہ الزامات ہیں جو کہ وفاداری کے جذبات جو ہم برٹش حکومت کے ساتھ رکھتے ہیں اور امن کی برکات جو ہمیں حاصل ہیں ان سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ گڑبڑ کی تمام تر وجہ محض کالج کے معاملات کے ایک سلسلہ کا نتیجہ تھی جن کو پولیٹیکل خیالات کے کسی شعبے سے کوئی تعلق نہیں ہے ...... [14]

اسٹرائک کو جس طرح سیاسی رنگ دیا جا رہا تھا غالباً اسی کی وجہ سے کالج کے پیٹرن سرجان ہیویٹ صاحب کو کالج آ پہنچے اور انہوں نے اس بات کی تحقیقات کرنے کا مشورہ دیا کہ:

"آیا زیر سطح بھی کچھ ایسے اسباب ہیں جو طالب علموں کو ایک ایسے طرز عمل کو اختیار کرنے کے باعث ہوئے جو کہ ایسے تعلقات کے منافی ہیں جیسے کہ استادوں اور شاگردوں کے درمیان ہونے چاہییں۔" [15]

چنانچہ اس دوران جاری تحقیقات میں اس پہلو پر دھیان رکھا گیا لیکن جب تحقیقات کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی تو اس میں یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ کالج کے طلبا میں انتہا پسند سیاسی خیالات کی جانب کوئی عام رجحان نہیں ہے۔ [16]

تحقیقات کے ختم ہوتے ہی نواب محسن الملک نے کالج کے آنریری سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا جس سے ایک عام بے چینی پیدا ہو گئی اور محسن الملک سے ہر جانب سے استعفیٰ واپس لینے کا اصرار کیا جانے لگا بالآخر انہوں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔ طلبا نے بھی نواب محسن الملک کو ایک خط لکھ کر کالج کی فضا کو پھر سے بہتر بنانے کا یقین دلایا جس کے جواب میں نواب محسن الملک نے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا:

"کہا یہ تحریر طالب علموں کی ہے یا جعلی ہے۔ اگر طالب علموں کی لکھی ہے تو ہزار ہزار لاکھ لاکھ خدا کا شکر کرتا ہوں کہ آخر ان کی فطری اور اصلی سعادت مندی نے اپنا اثر کیا اور کچھ غلطی کر کے پھر سنبھل گئے اللہ ایسی غلطیوں کو معاف کرتا ہے۔ ہم بھی معاف کرتے ہیں۔" [17]

چنانچہ ۳۰ مارچ کو اولڈ بوائز ڈنر ہوا جس میں پرانے اور موجودہ طلبا اور پرنسپل نے تقریریں کیں۔ پرنسپل آرچ بولڈ نے اپنی اور اسٹاف کی طرف سے طلبا کے ساتھ صلح و صفائی کا اظہار کیا۔ طلبا کی جانب سے عبدالرحمٰن بجنوری نے پرنسپل کا شکریہ ادا کیا اور ظاہر کیا کہ:

"ہم اب تمام شکایتیں بھول گئے اور بدستور اطاعت و فرماں برداری کے لیے تیار ہیں۔" [19]

اس طرح اسٹرائک کا ہنگامہ ختم ہوا لیکن جو حقائق حال میں سامنے آئے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ علی گڑھ کے طلبا اس وقت کی وطنی تحریکات کے اثرات سے اچھوتے نہ تھے۔ ڈاکٹر سید محمود جو اسٹرائک کے لیڈروں کی "تثلیث" میں عبدالرحمٰن بجنوری اور تصدق احمد خاں شیروانی کے ساتھ شامل تھے۔ [20] یہ بیان کرتے ہیں کہ طلبا کا ایک چھوٹا سا گروپ جس میں مندرجہ بالا تین طلبا کے علاوہ نثار احمد شیروانی، فدا حسین شیروانی اور غلام حسین بھی شامل تھے، کانگریس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے ایک خفیہ سوسائٹی بنائی تھی جس میں ہندوستان سے انگریزوں کو نکال بھگانے کے طریقوں کے بارے میں مضامین پڑھے جاتے اور تقریریں کی جاتی تھیں۔ [21] ڈاکٹر سید محمود نے اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے کہ:

"ایک بار ہم لوگوں نے مل کر سر سید کے مزار پر عہد و پیمان کیا کہ جب تک

انگریزوں کو ملک سے نکال نہ دیں گے
دم نہ لیں گے اور ملک کو غلامی سے
آزادی دلانا ہماری زندگی کا مقصد ہو گا۔"

دسمبر ۱۹۰۵ء میں جب بنارس میں گوپال کرشن گوکھلے کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو اس میں شرکت کے لیے عبدالرحمٰن بجنوری اور سید محمود گئے تھے اور اس کے بعد سے طلبا نے بجنوری کی عرفیت "ایجی ٹیٹر" (Agitator) اور سید محمود کی "قوم" رکھ دی تھی۔ ۷-۱۹۰۶ء میں طلبا نے "انقلابی گھنٹی" شروع کی تھی جس کی دبی ہوئی آواز زیر طلبا کمروں سے نکل آتے تھے اور منصوبوں پر غور و خوض کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس زمانے میں طلبا نے اپنے کمروں کو ترکی کے سلطان جرمن شہنشاہ، گوکھلے اور دوسرے لیڈروں کی تصاویر سے سجا رکھا تھا جو انگریزوں کے مخالف تھے[illegible]

اسٹرائک شروع ہونے سے چند روز قبل ہی ۵ فروری ۱۹۰۷ء کو گوکھلے علی گڑھ آئے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید محمود بتاتے ہیں طلبا نے گوکھلے کا ریلوے اسٹیشن پر شاندار استقبال کیا تھا۔ جس سے متاثر ہو کر گوکھلے نے کہا تھا کہ

"میں اب خوشی سے مر سکتا ہوں۔ ان
مسلمان لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس
ہوتا ہے کہ میرے ملک کی آزادی یقینی
ہے۔"[illegible]

گوکھلے کو نواب محسن الملک نے کالج میں مدعو کیا تھا جہاں انھوں نے "تعلیم" کے موضوع پر تقریر کی اور اس کے بعد انھوں نے اسٹاف اور آنریری سکریٹری کے ساتھ لنچ اور ڈنر لیا۔[illegible]

عبدالرحمٰن بجنوری، سید محمود وغیرہ کے اس گروہ میں بعد میں سید حسین، حسن شہید سہروردی، اور سیف الدین کچلو بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ گروہ ایک قومی نظریے کا حامی تھا اور مسلم سیاست کو ہندوستانی قومیت کی اس وسیع تر جد و جہد میں ضم کرنا چاہتا تھا جس کی نمائندگی انڈین نیشنل کانگریس کر رہی تھی۔ چنانچہ یہ گروہ ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ، سید امیر علی جیسے ان مسلمان لیڈروں سے اختلاف رکھتا تھا جو کانگریس سے مقابلہ کرنے کے لیے برطانوی حکومت سے تعاون پر زور دیتے تھے اور جو ۱۹۱۲ء تک آل انڈیا مسلم لیگ پر چھائے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس علی گڑھ میں ہوا تو سید محمود اور اُن کے رفقا نے اجلاس کی کارروائیوں میں بڑی دلچسپی لی لیکن انھوں نے اجلاس میں انگریزوں کی جانب غلامانہ رویہ اختیار کرنے پر نکتہ چینی کی۔[illegible]

قومی تحریکات کی پُرزور لہریں ہر طرف پھیل چکی تھیں اور ایم۔ اے۔ او کالج کے طلبا کا اُن سے محفوظ رہنا محال تھا۔ خود کالج کے باہر کالج کے قدیم طالب علم حسرت موہانی اپنے ماہنامے "اردوئے معلّٰی" کے ذریعے جولائی ۱۹۰۳ء سے انگریز حکومت کے خلاف تحریکات کو اردو داں طبقے تک پہنچانے کا کام کر رہے تھے اور حکومت اور کالج کے ارباب اختیار اس سے ناواقف نہ تھے۔ لہٰذا علی گڑھ کے طلبا کو "اردوئے معلّٰی" خریدنے اور حسرت کی دوکان پر جانے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ جب اس کا بھی خاطر خواہ اثر نہ ہوا تو "اردوئے معلّٰی" کے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں "مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" کے عنوان سے چھپنے والے ایک مضمون کو قابل اعتراض بتلا کر انھیں ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا کر انھیں دو سال کی قید بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔[illegible]

اس ماحول میں جہاں علی گڑھ کے طلبا میں انگریز مخالف رجحانات پیدا ہونا فطری بات تھی، وہیں اپنے سیاسی خیالات کے اظہار میں احتیاط برتنا مصلحت کا تقاضا تھا۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جب کہ کالج کے یوروپین اسٹاف کو طلبا کے قومی رجحانات کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ اسے اپنی جان و مال کا خطرہ ظاہر کر کے برطانوی حکومت کو انتقامی کارروائی کرنے کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔ بہرحال یہ بات واضح تھی کہ علی گڑھ کالج کا طالب علم اب انگریز اسٹاف یا انگریز حکومت کی زیادتیاں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور بیسویں صدی کے پہلے دہے کے اختتام تک علی گڑھ کے طالب علم نے اپنی قومی شخصیت کے بے باکانہ اور پر زور اظہار کے لیے پوری خود اعتمادی حاصل کر لی تھی۔

❖ ❖ ❖

حوالہ جات

1 Report of the Committee of Enquiry at Aligarh. p. 6

2 Bhatnagar: History of the M.A.O. College. P. 209

۳ تذکرۂ محسن۔ ص ۲۳۶۔

4 Report of the Com. of enquiry P. 9.

۵ میر ولایت حسین: آپ بیتی۔ ص ۱۵۲ تا ۱۵۶

6 Report of the Committee of enquiry. P. 10

7 Bhatnagar: History of the M.A.O. College. P. 209

۸ میر ولایت حسین: آپ بیتی۔ ص ۱۵۶

9 Bhatnagar: History of the M.A.O. College p. 204 and Report of the Committee of enquiry pp 1 & 19

۱۰ تذکرۂ محسن: ص ۲۴۳ تا ۲۴۶

11 Report of Committee of enquiry. p 13.

۱۲ تذکرۂ محسن: ص ۲۳۸

۱۳ ایضاً ص ۲۳۸

۱۴ ایضاً ص ۲۳ و ۲۳۹

۱۵ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۲۷ مارچ ۱۹۰۷ صفحات ۵ و ۶

۱۶ تذکرۂ محسن: ص ۲۴۰ و ۲۴۱

17. Report of committee of enquiry p 13

١٨ مکاتیب مرتبہ محمد امین زبیری ص ٩٧

١٩ تذکرۂ محسن : ص ٢٤٣

٢٠ اولڈ بوائے (علی گڑھ) جلد ٢ ، نمبر ١٢۔ اگست ١٩١٢ء - ص ٣٩

21. Bhatnagar, History of the M.A.O College. p 206

٢٢ مکتوب ڈاکٹر سید محمود بنام جناب محمد قاسم صدیقی مورخہ ٤ مئی ١٩٦٩ء مشمولہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کا قومی شعور" غبار خاطر (اورنگ آباد) جنوری ١٩٧٥ء ص ١٤

23. Bhatnagar; History of M.A.O College. p. 201

٢٤ ایضاً ص ٣٩ - ٢٣٨ -

٢٥ تذکرۂ محسن ص ١٨٦۔

٢٦ اس پیراگراف میں درج نتائج مندرجہ ذیل تالیف میں شامل ڈاکٹر سید محمود کے سوانحی تعارف پر مبنی ہیں۔

U.N. Datta & B.E Cleghorn (eds); A Nationalist Muslim and Indian Politics. pp. xii - xiii

٢٧ احمر لاری: حسرت موہانی - حیات اور کارنامے ص ٨٦ و ٨٧

(ختم)

"ایمان بہت بڑی دولت ہے۔ زندگی بخش۔
اس سے قوموں کی زندگی پھلتی پھولتی ہے اور
روح پیدا ہو جاتی ہے جیسے ہی کوئی قوم ایمان
کی دولت سے مالا مال ہوتی ہے وہ عظمت کی
حامل بن جاتی ہے۔"

(کارلائل)

آب حیات

ریاض الدین احمد ▽

یہ پانی ہی دراصل آب حیات ہے۔ موجودات عالم میں پانی سے زیادہ حیرت ناک شاید ہی کوئی دوسری چیز ہو۔ یہ پانی ہی ہے جس نے ہماری زمین کو جنم دیا ہے ہماری زندگی اور ارضی بناو سنگار کی تمام رعنائیاں پانی ہی کا کرشمہ ہیں۔ پانی کے بارے میں ہمارا علم جتنا ترقی کرتا جارہا ہے اتنے ہی زیادہ حیرت کے گوشے کھلتے جارہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پانی کے بارے میں ہم نے کم ہی سوچا ہے۔ پانی کی فراوانی خود اس کا پردہ بن گئی ہے۔

پانی کے اجزا سے ترکیبی کیا ہیں اس کی طرف ماہرین کی توجہ محدود رہی ہے۔ حالانکہ ہر وقت اور ہر جگہ پانی کی ضرورت ہے۔ پانی میں عجیب عجیب گن ہیں۔ وہی پانی جو کھٹے اور کسیلے پھلوں کو زمین سے اگاتا ہے۔ میٹھے پھلوں اور خوش ذائقہ میووں کو بھی جنم دیتا ہے۔ وہی پانی جو کھیتوں کو سرسبز و شاداب کرتا ہے، انھیں غرقاب بھی کر سکتا ہے پانی میں جتنی کرامات پوشیدہ ہیں ان سب کا پتہ لگانے سے اہل فکر ابھی تک قاصر ہیں۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ زمین کا ¾ حصہ پانی پر مشتمل ہے اور اس کے ¼ حصہ کو منجمد پانی برف نے ڈھانک رکھا ہے اس برف کا تقریباً نصف حصہ بھاپ بن کر بادل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پانی کے انھیں اجزات سے ہماری ہوائیں بوجھل رہتی ہیں۔ ہمارے جسم میں پانی کا حصہ ۷۰ فیصدی ہے۔ اس کے اجزا بیک وقت رقیق بھی ہیں۔ ٹھوس بھی اور گیس بردار بھی۔ زمین کے موسمیاتی نقشے سب کے سب پانی کے مرہون منت ہیں پانی نہ ہوتا تو یہ زمین کب کی ٹھنڈی ہو گئی ہوتی اور زندگی کے تمام آثار مٹ چکے ہوتے۔

پانی عجیب اوصاف کا حامل ہے۔ اس میں گرمی اور سردی قبول کرنے کی عجیب صلاحیت پائی جاتی ہے اگر اس کو گرم کیا جائے تو بہت زیادہ گرمی سمولیتا ہے اور اگر سرد کیا جائے تو بے حد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ پانی میں یہ تاثیر نہ ہوتی تو خلا کی ٹھنڈک پوری دنیا کو ڈھانپ لیتی۔ خلاء کے منجمد بستہ کے لیے پانی گرم کوٹ کا کام کرتا ہے۔ پانی کے ابخرات اس کوٹ میں روئی کی طرح تہہ جمالیتے ہیں۔ ریگستانی علاقوں میں جہاں عام طور پر خشکی رہتی ہے کوٹ کے سوراخ کھل جاتے ہیں۔ دن میں سورج کی گرمی پانی کو گرم کرکے فضا پر چھا جاتی ہے اور رات کو یہی پانی فضا کو سرد کر دیتا ہے۔

▽ ۸۲۲/۱ے/۲ نور اللہ روڈ - الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

پانی اگر عجیب و غریب اجزا کا مجموعہ نہ ہوتا تو زمین رفتہ رفتہ منجمد ہو جاتی۔ عجیب بات ہے کہ عام اشیاء ٹھنڈک پا کر سکڑ جاتی ہیں مگر پانی ٹھنڈا ہونے پر پھیل جاتا ہے۔ اگر ہمیں اس میں بھی پھیلنے کی صفت ہوتی تو زمین برف ہو جاتی۔ برف پانی سے زیادہ بھاری ہو کر اپنے بوجھ سے دب جاتی اور زمین پر ایک گیس کا مادہ پھیل جاتا جس میں پانی کا نام بھی نہ ہوتا۔

ایک دوسری غیر معمولی صفت پانی کی اس کی بھگو دینے والی مخفی گرمی اور ابخرات پیدا کرنے کی عظیم طاقت ہے اسی کی وجہ سے گرم موسم میں زندگی ممکن ہو گئی ہے۔ پانی کے ابخرات بن جانے کی وجہ سے گرمی تحلیل ہو جاتی ہے اور انسانوں اور جانوروں کا جسمانی ٹمپریچر فضائے محیط کے مقابلے میں کم ہو جاتا ہے۔

قدرت کے کارخانے میں پانی کا کردار بہت عجیب ہے کیونکہ اس کے بغیر زندگی کا کوئی تصور ناممکن ہے۔

ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ زندگی ازلی سمندر کے مادوں کے تحلیل ہونے سے وجود میں آئی ہے۔ تحلیلی مادوں کی کیمیاوی تبدیلیاں حیوانات اور نباتات کے ہر ایک خلیہ پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ یہ پانی کی وہ عجیب و غریب صلاحیت ہے جس کے بغیر زندگی وجود میں نہیں آ سکتی تھی۔

شاید بہت کم لوگوں کو پانی کا ایک عجیب وصف معلوم ہے کہ اس کی اولین سطح پر جھلی کی قسم کی ایک مضبوط چادر تنی ہوتی ہے جو سالمہ مادہ کی آپس کی کشش کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا کھنچاؤ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ چیزیں تیر نہیں سکتیں۔ اس پر آسانی سے ٹکی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک اسٹیل کی سوئی یا ریزر کا بلیڈ اس پر رکھ دیا جائے تو اس کے ڈوبنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

علاوہ ازیں بہت سے کیڑے مکوڑے اسی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ کیڑے نہ غوطہ لگا سکتے اور نہ تیر سکتے ہیں۔ وہ جھلی کے نیچے پانی کو چھو بھی نہیں سکتے الّا یہ کہ ان کی ٹانگ کی نوک تری محسوس کرے۔ مچھر کے لاروا، آبی بھونرے اور مختلف الاقسام گھونگے اس سطح پر اس طرح چپکتے ہیں جیسے وہ کسی سخت ترین جگہ پر ہوں۔

ماہرین سائنس کا مشاہدہ ہے کہ پانی جتنا خالص اور شفاف ہو گا، اسی کے لحاظ سے جھلی کی سطح مضبوط ہو گی۔ اس سطح کے کالم کو ۲½ سینٹی میٹر توڑنے کے لیے ۹۰۰ کیلوگرام کے برابر طاقت درکار ہو گی یہ اتنی طاقت کے برابر ہے جو بعض قسم کے اسٹیل میں ہوتی ہے مگر یہ آخری حد نہیں ہے کیونکہ ماہرین سائنس کا یہ بھی تجربہ ہے کہ بالکل خالص پانی کے اتنے ہی بڑے کالم کو توڑنے کے لیے ۹۵ ٹن طاقت کی ضرورت ہو گی۔ اگر کوئی ایسا تالاب ہو جس میں پانی نہایت شفاف اور خالص ہو تو یہ ممکن ہے کہ جھلی کی سطح پر انسان چل پھر سکے گا کیونکہ یہ سطح اتنی جامد ہو گی جیسے برف۔

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ "وہ مومن نہیں ہے جو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا ہو اور وہ یہ جانتا ہو۔"

حضرت ابن عباسؓ

توانائی کے غیر روایتی ذرائع

محمد اسلم پرویز ٭

کوئلہ اور پٹرولیم ہماری توانائی کی ضروریات کو صدیوں سے پورا کرتے آرہے ہیں۔ صنعتی میدان ہو یا گھریلو استعمال یا ذرائع نقل و حمل، سبھی میں توانائی کے ان بنیادی وسائل کا استعمال کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا ہے تاہم توانائی کے یہ وسائل جو کہ زمین کے سینے میں کسی راز کی طرح پوشیدہ ہیں، محدود ہیں۔ جلد یا بدیر ان کو ختم ہونا ہی ہے۔ علاوہ ازیں توانائی کی ضروریات انسانی آبادی اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھی ہیں۔ ان بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے توانائی کے ان وسائل کا استعمال بڑھ گیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہی ہیں کوئلہ اور پٹرولیم کے جلانے سے کافی دھواں پیدا ہوتا ہے لہٰذا ان کے زیادہ استعمال نے ایک طرف تو ان کے ذخائر کی عمر کم کر دی ہے تو دوسری طرف ماحول میں آلودگی بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان حقائق کے آشکارا ہونے کے بعد سے سائنس دانوں کی کوشش رہی ہے کہ توانائی کے لیے ذرائع دریافت کیے جائیں جو یا تو قابلِ تجدید ہوں یا پھر لامحدود ہوں اور کم آلودگی پیدا کرتے ہوں۔

نئے وسائل کی کھوج میں سائنس دانوں کی پر تجسس نگاہیں ہر اس شے یا عمل پر پڑیں جو کسی نہ کسی قسم کی توانائی کا مظہر تھا۔ اسی تلاش کے نتیجے میں آج ہمارے سامنے انواع و اقسام کے وسائل موجود ہیں جن سے کہ عملی اور تجارتی پیمانے پر توانائی حاصل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ ان وسائل میں سورج کی کرنوں میں چھپی قوت یعنی شمسی توانائی، ہوا کی قوت، زمین کے سینے میں چھپی حدت انسان اور جانوروں کے فضلے سے تیار کی گئی گیس (بائیو گیس)، ہائیڈروجن گیس بطور ایندھن، پودوں سے تیار کردہ الکحل جو کہ بطور ایندھن استعمال ہوتا ہے، سمندری مدوجزر کی قوت، لہروں کی توانائی اور سمندری حدت وہ وسائل ہیں جن کو یا تو استعمال کیا جا رہا ہے یا وہ قابلِ استعمال بنائے جا رہے ہیں۔

ہوا کی قوت:

توانائی پیدا کرنے کے لیے ہوا کا استعمال صدیوں سے کیا جاتا ہے۔ توانائی کے دیگر وسائل کے مقابلے یہ ذریعہ کم خرچ ہے اس کو فوراً قابلِ استعمال بنایا جا سکتا ہے — یہ قابلِ تجدید ہے اور آلودگی بھی پیدا نہیں کرتا۔ ہوا کی قوت سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے، زمین میں سے پانی نکالا جا سکتا ہے نیز چکی چلائی جا سکتی ہے۔ اس کام کے واسطے استعمال ہونے والی ہوائی پنکھڑیاں یا چرخ ایک بڑے پنکھے کی مانند ہوتی ہیں۔ عموماً ان کی تعداد تین یا کبھی کبھی چار بھی ہو سکتی ہے۔ اس چرخ کو ایک بڑے کھمبے کے

٭ ذاکر حسین کالج، دہلی۔

اہم ایسی جگہ اور ایسے رُخ پر لگایا جاتا ہے کہ ہوا کی مدد سے یہ چرخ گھومے۔ بہتر قسم کے چرخ میں رخ بدلنے کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ یعنی ہوا جس رُخ کی ہوتی ہے اسی طرف اِس چرخ کا رُخ کر دیا جاتا ہے۔ یہ کام خود کار نظام کے تحت بھی کرایا جاسکتا ہے۔ چرخ میں لگی پنکھڑیوں کے گھومنے سے بجلی پیدا کی جاتی ہے جو کہ آس پاس کے علاقے کی ضرورت پوری کرتی ہے۔ اگر اس سے پمپ جوڑ دیا جائے تو زمین میں سے پانی کھینچ لیا جاتا ہے جو کھیتوں میں سینچائی کے کام آتا ہے۔

ہمارے ملک میں ہوائی چرخ کا چلن پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا۔ حکومت نے ۱۵۰ مشینیں باہر سے منگوا کر مختلف جگہوں پر نصب کرائیں جن کی مدد سے زمین سے پانی نکالا جاتا تھا۔ بعدازاں بنگلور میں قائم ہونے والی نیشنل ایرونوٹیکل لیباریٹری نے ۱۹۵۴-۵۵ کے دوران ہوائی چرخ پر کافی تحقیقات کیں اور قریب ۷۰ مشینیں تیار کر کے ملک کے مختلف علاقوں میں نصب کیں۔ تاکہ عوام میں دلچسپی پیدا کی جا سکے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ مہم کامیاب نہ ہوئی۔ اُس وقت تک توانائی کے متبادل وسائل میں نہ تو لوگوں کو دلچسپی تھی اور نہ ہی حکومت کی بھرپور سرپرستی تھی۔ ۱۹۷۳-۷۴ء کے بعد یہ صورت حال یکلخت تبدیل ہوئی۔ تیل بحران کے بعد تمام عالم میں توانائی کے متبادل ذرائع پر ازسرِ نو توجہ دی گئی۔ ہوائی چرخ کی تیاری اور تنصیبات پر بھی بے تحاشہ پیسہ خرچ کیا گیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ڈنمارک جیسے چھوٹے سے ملک میں ۱۰،۰۰۰ ہوائی چرخ لگے ہوئے ہیں۔ امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا میں ۱۹۸۰ء کے دہے میں ۱۴،۰۰۰ ہوائی چرخ لگائے گئے جو کہ ۱۴۰۰ میگاواٹ بجلی تیار کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس دوران ہوائی چرخ پر از سرِ نو کام شروع ہوا۔ حکومت کے قائم کردہ غیر روایتی توانائی کے شعبے کی نگرانی میں کئی تجربے بطور نمونہ ہوائی چرخ لگائے گئے۔ گجرات، مہاراشٹر، تامل ناڈو اور اڑیسہ میں کئی مقام پر ہوائی چرخ کام کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال کرناٹک نے تالا کوڈیری کے مقام پر پہلی ہوائی چکی نصب کی۔ ۴۴ میٹر اونچے کھمبے پر دس دس میٹر لمبے تین پنکھوں پر مشتمل یہ چکی سلی موٹ نامی پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کی مدد سے ۱۱۰ کلو واٹ بجلی بنائی جاسکے گی۔

ہوائی چرخ سے حاصل شدہ بجلی آسانی سے کفایتی ہو جاتی ہے کیونکہ کوئلے سے چلنے والے بجلی گھر یا ڈیم بنا کر پانی کی مدد سے بجلی بنانے کے لیے جتنے بڑے پیمانے پر تعمیرات، مشنری اور پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اس کے مقابلے میں ہوائی چرخ کو بہت کم مقدار میں اور نہایت آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہوا کی مدد سے بجلی بنانے کے اس عمل کے دوران کسی قسم کی آلودگی نہیں پیدا ہوتی اور نہ ہی ماحول کو نقصان ہوتا ہے۔ کوئلے سے چلنے والے بجلی گھر کافی مقدار میں دھواں اور راکھ پیدا کرتے ہیں تو پانی سے بجلی بنانے کے لیے ڈیم بنائے جاتے ہیں جن کی تیاری کے لیے بڑے بڑے علاقوں سے جنگلات صاف کیے جاتے ہیں جس سے ماحول متاثر ہوتا ہے۔ تاہم ہوائی چرخ کے استعمال کی راہ میں کچھ رکاوٹیں بھی ہیں۔ اول یہ کہ ان کو صرف اُن علاقوں میں لگایا جاسکتا ہے جہاں ۲۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی اوسط رفتار سے ہوا چلتی ہو۔ اس زمرے میں ہمارے ملک کی صرف دو ریاستیں آتی ہیں۔ تامل ناڈو اور گجرات۔ دیگر ریاستوں میں ہوا کی اوسط رفتار کم ہے۔ اس لیے وہاں لگائے گئے چرخ کم بجلی پیدا کرتے ہیں۔ میدانی علاقوں کے علاوہ پہاڑی علاقوں میں بھی تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ اس لیے غیر روایتی توانائی کے شعبے نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں چھوٹی

آبادیوں کی توانائی کی ضروریات ہوائی چرخ کی مدد سے پوری کی جا سکتی ہیں۔ نیشنل ایروناٹیکل لیباریٹری کے ماہرین کی مدد سے گوا، آندھرا پردیش، کرناٹک اور اڑیسہ میں ایسی مناسب جگہیں تلاش کی جا رہی ہیں۔ ہوائی چرخ کے استعمال کی راہ میں دوسری رکاوٹ اس سے بنی بجلی کی قیمت ہے۔ اس وقت ہوائی چرخ سے بنی بجلی ۱۵۰ء۱ روپیہ فی یونٹ کے حساب سے دی جا سکتی ہے جو کہ دیگر ذرائع سے حاصل بجلی کی قیمت سے تین گنا زیادہ ہے۔ ان مشینوں کی قیمت کم کرنا تبھی ممکن ہوگا جب ہم ان کی تیاری اپنے ملک میں کرنے لگیں۔ اس وقت زیادہ تر مشینیں ڈنمارک سے منگائی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ان کی تیاری پر کام ہو رہا ہے اور کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ دیسی مشینوں کے بننے کے بعد ان سے تیار بجلی نسبتاً سستی ہوگی۔ علاوہ ازیں تیز ہواؤں والے علاقوں کی نشاندہی کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ ان علاقوں میں بہت سارے چرخ ایک ساتھ لگائے جائیں اس طرح بجلی کی پیداوار کافی بڑھ جائے گی اور نتیجتاً قیمت کم ہو جائے گی۔

زمینی حدت بطور ذریعۂ توانائی

گرم پانی کے قدرتی چشموں سے ہم سب واقف ہیں ان کو گندھک کے چشمے بھی کہا جاتا ہے۔ دہلی کے نزدیک سرہند (ہریانہ) میں ایسے چشمے پائے جاتے ہیں۔ جلدی امراض اور دیگر مریضوں کو یہاں غسل کرکے افاقہ بھی ہوتا ہے۔ یہ چشمے دراصل زمین میں چھپی بے پناہ حدت کا مظہر ہیں۔ ہماری زمین کا مرکز بے حد گرم اور پگھلا ہوا ہے۔ اس میں موجود دھاتیں رقیق حالت میں ہیں۔ آتش فشاں پہاڑ جب پھٹتے ہیں تو یہی پگھلا ہوا لاوا ان سے خارج ہوتا ہے۔ ان گرم چٹانوں کے پاس سے پانی کے جو چشمے گزرتے ہیں وہ گرم ہو جاتے ہیں۔ جب یہ زمین کی اوپری سطح سے گزر کر باہر آتے ہیں تو ان میں ابلتے ہوئے پانی کو دیکھ کر لوگ متحیر رہ جاتے ہیں۔ توانائی کی قلت کے اس دور میں سائنس دانوں کی توجہ قدرت کے ان ذخائر کی طرف بھی گئی ہے زمینی حدت سے توانائی حاصل کرنے کے طریقوں کی کھوج شروع ہوئی۔ ہمارے ملک میں تقریباً ۲۵۰ مقامات پر قدرتی گرم چشمے پائے جاتے ہیں، جن کا درجۂ حرارت ۴۵ ڈگری سیلسی گریڈ سے ۹۶ ڈگری تک پایا گیا ہے۔ ان سبھی چشموں سے تجارتی سطح پر توانائی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ لداخ کے علاقے میں واقع پگا وادی، گجرات میں کمبات اور ہماچل پردیش میں کلو کے مقام منی کرن پر زمینی حدت سے توانائی حاصل کرنا ممکن ہے چونکہ زمینی حدت سے حاصل توانائی سستی ہوگی۔ نیز اس کی تیاری کے دوران کسی قسم کی آلودگی پیدا بھی نہیں ہوگی۔ اس لیے موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق یہ ایک بہتر مناسب ذریعہ ہوگا۔ ان باتوں کے پیش نظر ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند نے گرم چشموں سے متعلق ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس کمیٹی نے تحقیقات کے بعد پورے ملک میں تین علاقوں کی نشان دہی کی ہے جہاں سے یہ توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ علاقے جنوب مغربی ہمالیہ، مغربی ہندوستان اور بہار میں ہزاری باغ نیز مغربی بنگال پر مشتمل ہیں۔ علاوہ ازیں اہم قدرتی چشموں کی پیداواری صلاحیت کا جائزہ بھی لیا گیا۔ کلو وادی میں واقع منی کرن چشموں کا درجۂ حرارت ۹۳ ڈگری سے ۹۶ ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔ یہاں سے ۴۵۰ کلوواٹ بجلی تیار کی جا سکتی ہے پگا وادی میں ہر چشمے سے ۴۰ کلوواٹ بجلی بنائی جا سکتی ہے۔ کمبات کے گرم چشمے بے پناہ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ گجرات کے اس علاقے میں ۳۲ چشمے ہیں جو کہ لگ بھگ ۳۰۰ کلومیٹر کے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر چشمے سے ۱۸۵۰ سے ۲۳۰۰ کلوواٹ بجلی

پھینکا جا سکتا ہے۔

زمینی حدت سے بجلی بنانے کا عمل بہت آسان ہے ایسے علاقوں میں زمین میں سوراخ کیے جاتے ہیں۔ ایک سوراخ سے پانی اندر ڈالا جاتا ہے۔ یہ پانی حدت کی وجہ سے بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بھاپ دباؤ کے ساتھ باہر نکلتی ہے جس کی مدد سے ٹربائن چلا کر بجلی بنائی جاتی ہے۔ اس گرم بھاپ سے مکانوں کو بھی گرم کیا جا سکتا ہے نیز دیگر صنعتی ضروریات کے لیے بھی حدت فراہم کی جا سکتی ہے۔

اقوام متحدہ کے ڈویلپمنٹ پروگرام کی صلاح پر نیکاوادی (لداخ) میں ۱۹۷۷ء میں ایسا ایک بجلی گھر قایم کیا گیا تھا۔ اس میں ۷ میگاواٹ بجلی تیار کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ بجلی آس پاس کے علاقوں کی ضرورت پوری کرتی ہے اس کے علاوہ بھاپ سے گرم کیے ہوئے مخصوص کمروں میں سبزیاں اگانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے تاکہ لداخ جیسے سرد علاقے میں بھی کاشتکاری کی جا سکے۔ اسی بھاپ کی مدد سے مرغی خانے گرم رکھے جاتے ہیں اور مچھلیاں بھی پالی جاتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی ادارے کے تخمینے کے مطابق ۳۰ میگاواٹ کی صلاحیت کا بجلی گھر لگ بھگ ۵ کروڑ روپے کی لاگت سے قایم کیا جا سکتا ہے جبکہ اسی صلاحیت کے کوئلے کے بجلی گھر پر ۲ کروڑ روپے کی لاگت آتی ہے۔ زمینی حدت سے تیار کی گئی بجلی نہ صرف یہ کہ ارزاں ہوگی بلکہ اس کی تیاری میں کسی قسم کی کثافت بھی پیدا نہیں ہوگی۔ اگرچہ دنیا کے ۸۰ ممالک میں قدرتی حدت کے ذخائر موجود ہیں لیکن ابھی تک صرف امریکہ، روس، اٹلی، جاپان، فرانس، نیوزی لینڈ اور ہنگری ہی ان سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ توانائی کی عالمی صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ قوی امید ہے کہ جلد ہی بقیہ ممالک بھی ان خزانوں سے فائدے اٹھائیں گے۔ ایک اندازے کے مطابق اس صدی کے آخر تک ۲۰۰۰۰ میگاواٹ بجلی زمینی حدت کی مدد سے تیار ہونے لگے گی۔

گورنر کے نام ایک خط کا اقتباس

"اپنے اور اپنے عوام کے درمیان کوئی حجاب نہ رکھو کیونکہ اس طرح عوام تمہاری ذاتی زندگی کے بارے میں بدگمانیاں کرنے لگیں گے اور تمہارے نیک افعال بھی بدگمانی کی وجہ سے انھیں بُرے نظر آنے لگیں گے۔"

حضرت عمرؓ

کائنات میں انسان کی اصل حیثیت

محمد بدیع الزماں ▽

روز ازل سے فلسفیوں کے نزدیک یہ ایک لاینحل عقدہ رہا ہے کہ اس کائنات میں انسان کی اصل حیثیت یا اُس کا صحیح مقام کیا ہے اور ہر فلسفی نے اپنے نقطۂ نظر سے کائنات کے وجود میں آنے اور اس میں انسان کے اجتماع کی الگ الگ توجیہ اور تاویل کی ہے۔ کسی نے انسانی وجود کو ایک حادثہ تک قرار دیا ہے جو زمانے کے گزرنے اور ارتقا کی منزلیں طے کر کے آج اس شکل میں سامنے آیا ہے جس شکل میں ہم اسے دیکھتے ہیں۔ نتیجتاً کائنات میں انسان کی اصل حیثیت کا گمراہ کن نظریہ ہر زمانے میں قائم کیا جاتا رہا۔ برعکس اس کے خدا نے ہر زمانے میں اپنے نبیوں رسولوں اور آسمانی کتابوں کے ذریعے انسانوں کو باور کرایا کہ یہ عظیم، وسیع و عریض کائنات کوئی اتفاقی وجود نہیں بلکہ ایک دانا اور حکیم خالق کی کارسازی ہے اور اس میں انسانوں کا اجتماع بھی اپنے اندر ایک مقصدیت رکھتا ہے جسے خدا نے خود اپنے "دونوں ہاتھوں" سے صرف پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس میں اپنی روح کا کچھ حصہ بھی پھونکا ہے۔

دنیا میں خیر و شر اور نیکی و بدی کا سارا انحصار صرف اس امر پر غور کرنے پر منحصر ہے کہ اس کائنات میں انسان کی اصل حیثیت کیا ہے۔ اگر انسان اس کائنات میں اپنے وجود کی اصل غرض و غایت، جو خدا نے بیان فرمائی ہے، اسے پیش نظر رکھتا ہے تو وہ اُن حدود میں رہتے ہوئے، جو خدا نے اس کے لیے مقرر کردی ہیں، دنیا کو باعث رحمت بنا سکتا ہے ورنہ یہ دُنیا اُس کے نزدیک ایک فعل عبث اور کھیل تماشے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اس نقطۂ نظر سے، جیسا کہ مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے عروج و زوال کے قرآنی قصوں میں مذکور ہے، خود اس کا وجود اُس کے لیے اور پورے معاشرے کے لیے فتنہ و فساد ہی قرار پاتا رہا ہے۔ روز ازل سے جن افراد یا قوموں نے کائنات میں انسان کی اصل حیثیت تعین کرنے میں بے راہ روی سے کام لیا ہے اُن پر دنیا میں بھی عذاب آتا رہا ہے اور آخرت میں بھی ایسے گمراہوں کے لیے خدا نے جہنم کی وعید بھی فرمائی ہے۔

جب ہم کائنات اور اس کائنات میں انسان کی اصل حیثیت کی باتیں کرتے ہیں تو خدا کا یہ ارشاد

▽ شاگرد ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ہارون نگر۔ فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف، پٹنہ۔

سامنے آتا ہے کہ:

"اُس (خدا) نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے اور اُسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے۔"

(سورۃ التغابن ۶۴ - آیت ۳)

اس آیت میں تین باتیں علی الترتیب بیان کی گئی ہیں جن کے درمیان ایک بہت گہرا منطقی ربط ہے۔ تخلیقِ کائنات کو برحق کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات بچوں کے کھیل کے طور پر نہیں بنادی گئی ہے۔ بلکہ ایک خالقِ حکیم کا نہایت سنجیدہ کام ہے۔ اس کی ہر چیز اپنے پیچھے ایک معقول مقصد رکھتی ہے اور یہ مقصدیت اس میں اتنی نمایاں ہے کہ ہر صاحبِ عقل انسان یہ جان سکتا ہے کہ اس چیز کے پیدا کرنے کا معقول اور مبنی بر حکمت مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ ایک اور موقع پر کائنات کے برحق پیدا کیے جانے اور وہ بھی ایک مقررہ وقت ہی کے لیے، اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

"کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدتِ مقررہ ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔"

(سورہ الروم ۳۰ — آیت ۸)

یہاں بھی یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ یہ کائنات ایک سنجیدہ نظام ہے جس کا ایک ایک ذرہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے جس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے اور جس کی ہر شے بامقصد ہے۔ خدا نے تمام کو

منکروں اور کافروں کو یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ آخر یہ بات انسان کی عقل میں کیسے نہیں سماتی کہ جس حکیم نے اس حکمت اور مقصدیت کے ساتھ یہ دنیا بنائی اور اس کے اندر انسان جیسی ایک مخلوق کو اعلیٰ درجے کی ذہنی و جسمانی طاقتیں دے کر، اختیارات سونپ کر، آزادیٔ انتخاب دے کر اور ساتھ ساتھ اخلاق کی حس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سروسامان حوالے کیا ہے۔ اس نے انسان کو بے مقصد نہیں پیدا کیا ہوگا۔ یا یہ کہ انسان دنیا میں تعمیر و تخریب اور نیکی و بدی اور ظلم و عدل اور راستی و ناراستی کے سارے ہنگامے برپا کرنے کے بعد بس یونہی مر کر مٹی میں مل جائے گا اور اس کے اچھے اور برے اعمال کی پوچھ نہ ہوگی۔

دوسری بات جو سورۃ الروم کی متذکرہ بالا آیت میں فرمائی گئی ہے وہ یہ کہ خدا نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔ جس سے مراد انسان کی پوری جسمانی ساخت اور وہ قوتیں اور صلاحیتیں بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں جو اس دنیا میں کام کرنے کے لیے انسان کو عطا کی گئی ہیں۔ اسی لیے خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر رکھا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ تمام موجودات پر حکمرانی کرے جو زمین اور اس کے گرد و پیش پائی جاتی ہیں۔ اس کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے اعلیٰ درجے کا ذہن دیا گیا اور اس کو اخلاقی حس کے ساتھ قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ بھی عطا کی گئیں۔ اسے یہاں تک آزادی دی گئی کہ چاہے تو اپنے خالق کو مانے اور اس کی بندگی کرے ورنہ اس کی بندگی سے انکار کر دے۔

ان حقائق بالا سے ایک منطقی نتیجہ خود بخود یہ سامنے آتا ہے کہ اس مقصد کی تکمیل تک پہنچانے کی خاطر اس انسان کو بھی ایک حکیمانہ اور بامقصد تخلیق کائنات میں ایک بااختیار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا تھا۔ پھر یہ بات ظاہر ہے کہ اس حقیقت کے سامنے جب وہ

ہے جس نے تمہیں ان اختیارات کے ساتھ اپنی کائنات میں اپنے نائب کی حیثیت سے مقرر کیا تھا۔

دنیا میں انسان کی حیثیت اور اس کو عطا کی گئی نعمتوں کے متعلق فرمایا گیا کہ:

"ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو۔"

(سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۱۰)

خدائے تعالیٰ نے کائنات کو اس لیے پیدا کیا جو کہ اسے انسان کو پیدا کرنا مقصود تھا اور انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ اس پر اخلاقی ذمہ داری کا بار ڈال کر اسے خلافت کے اختیارات سپرد کیے جانے تھے اور پھر یہ دیکھا جانا تھا کہ ان میں سے کون ان اختیارات کو اور اس اخلاقی ذمہ داری کے بوجھ کو کس طرح سنبھالتا ہے۔ اگر اس تخلیق کی تہہ میں یہ مقصد نہ ہوتا، اگر اختیارات کی تفویض کے باوجود کسی امتحان کا، کسی محاسبہ اور بازپرس کا اور کسی جزا و سزا کا کوئی سوال نہ ہوتا اور اگر انسان کو اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونے کے باوجود یونہی بے نتیجہ مر کر مٹی ہو جانا ہی ہوتا تو پھر یہ سارا کارِ تخلیق ایک مہمل کھیل قرار پاتا اور اس تمام ہنگامۂ وجود کی کوئی حیثیت ایک فعلِ عبث کے سوا نہ ہوتی۔

انسانوں کی اصل کے متعلق ایک موقع پر فرمایا گیا ہے کہ:

"لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

(سورۃ الحجرات ۴۹۔ آیت ۱۳)

یہ کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے اور ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پوری نوعِ انسانی وجود میں آئی ہے اور آج جتنی نسلیں دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود انسانوں کا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا علاوہ ازیں انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد خدا کے نزدیک اگر کوئی ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ خدا کے نزدیک اصل اہمیت دنیا کی عزت و ذلت کی نہیں نہیں بلکہ اس ذلت و عزت کی ہے جو خدا کے ہاں کسی کو نصیب ہو۔ اس لیے انسان کو اس کائنات میں اپنی حیثیت متعین کرنے کے ساتھ ساتھ فکر اس امر کی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے اندر وہ حقیقی اوصاف پیدا کرے جو اسے اللہ کی نگاہ میں عزت کے لائق بنا سکتے ہوں۔

جہاں تک انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت ہے اس سے زیادہ فضیلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب خدائے تعالیٰ نے سوکھے گارے کی مٹی سے پورا بشر بنا لیا تو اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دیا اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں جن کے مجموعے کا نام روح ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کالبدِ خاکی پر ڈالا گیا

چنانچہ اسی بنا کی وجہ سے انسان زمین کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار دیا گیا مگر صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ پالینا الوہیت کا کوئی جز پالینے کے ہم معنی نہیں۔

جیسا سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۳۰ میں فرمایا گیا ہے۔ اس کائنات میں انسان کی حیثیت خلیفۃ الارض کی ہے جہاں اسے خدا کی ملکیت میں اس کے تفویض کردہ اختیارات کو اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرنا ہے۔ یہاں اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہیں بلکہ خدا کے عطا کردہ ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام خدا کے منشاء کو پورا کرنا ہے۔ لہٰذا انسان اگر اس کائنات میں اپنے آپ کو مالک کائنات سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے کے لیے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کرکے اس کی منشا کی پیروی اور اسی کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب احکامِ الٰہی سے بغاوت کے مترادف ہوگا جس کی سزا جہنم ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کو اگر زندگی دی گئی تو پھر اس کے لیے موت یقینی سی چیز کیوں رکھی گئی۔ اس سوال کا جواب قرآن میں یہ ملتا ہے کہ:

"جس (خدا) نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا۔ تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔"

(سورۃ الملک ۶۷۔ آیت ۲)

اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے براہِ راست اس [illegible]

میں انسان کے اندر اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا مقصود ہے اور یہ ذہن نشین کرانا بھی کہ انسان کی زندگی بے مقصد نہیں ہے بلکہ اسے عمل کا موقع دے کر امتحان کی مہلت دی گئی ہے اور موت امتحان کے اسی وقت کو ختم کر دیتی ہے۔ اس امتحان کے مفہوم میں جو بات پوشیدہ ہے وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی۔ کیونکہ اگر جزا نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔

خدائے تعالیٰ نے اس امتحان کے لیے انسان کو ضروری ذرائع اور قوتیں عطا کی ہیں جن سے وہ علم حاصل کرتا ہے اور نتائج اخذ کرتا ہے۔ فرمایا گیا:-

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اُسے سننے اور دیکھنے اور سننے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا۔ خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔"

(سورۃ الدھر ۷۶۔ رکوع ۱)

یہ ہے دنیا میں انسان کی اور انسان کے لیے دنیا کی اصل حیثیت۔ انسان جس چیز کو عمر سمجھتا ہے حقیقت میں وہ اس کے لیے امتحان کا وقت ہے جو اسے دنیا میں دیا گیا ہے۔ دنیا میں جو قوتیں اور صلاحیتیں اس کو دی گئی ہیں جن چیزوں پر بھی اس کو تصرف کے مواقع دیے گئے ہیں جن حیثیتوں میں بھی وہ یہاں کام کر رہا ہے اور جو تعلقات بھی اس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں وہ سب اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، جس امتحان کا سلسلہ زندگی کی آخری سانس

[illegible]

اللہ تعالیٰ نے صرف علم و عقل کی قوتیں دے کر ہی انسان کو نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کائنات میں اسے اپنی حیثیت متعین کرنے کے لیے اس کی رہنمائی بھی کی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شکر یعنی ایمان کا راستہ کون سا ہے اور کفر کا راستہ کون سا۔ اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہو۔ ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دے دینے کے ساتھ اسے اخلاقی حس بھی دی گئی ہے جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور برائی میں امتیاز کرتا ہے علاوہ ازیں انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ضمیر (نفس لوامہ نام کی بھی ایک چیز رکھ دی ہے جو اسے ہر اس موقع پر ٹوکتا ہے جب وہ برائی کرنے والا ہو یا کر رہا ہو یا کر چکا ہو۔ آفاق و انفس کی بے شمار نشانیاں انسان کو یہ خبر دیتی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ انسان اگر اس کائنات میں اپنی اصل حیثیت سے واقف نہ ہو کر ان سب نشانیوں سے آنکھیں بند کر لے یا اپنی عقل سے کام لے کر اس پر غور نہ کرے یا جن حقائق کی یہ نشاندہی کر رہی ہیں ان کو تسلیم کرنے سے جی چرائے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

اس کائنات میں انسان کی حیثیت ایک بے بس کی ہے۔ کیونکہ ایک بالاتر حکومت اس پر اور ساری کائنات پر فرماں روائی کر رہی ہے جس کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے اور جس کی مدد کا وہ خود محتاج ہے۔ اس کائنات میں انسان کی اصل حیثیت کا اندازہ خدا کے اس ارشاد سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ: ۔

"میں نے جن اور انسانوں کو اس کے
سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا
ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔"

(سورۃ الذاریٰت ۵۱ ۔ آیت ۵۶)

اس نکتے سے ظاہر ہوا کہ ہر انسان اپنی ایک مستقل ذمہ داری رکھتا ہے اور اپنی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ جس ذمہ داری میں کوئی دوسرا شخص اس کا شریک نہیں ہے۔ ایک موقع پر اس طرح ذہن نشین کرایا گیا ہے: ۔

"جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس
کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید
ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی
پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے
کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہم عذاب دینے
والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و
باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغامبر
نہ بھیج دیں۔"

سورہ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۱۵

یہ آیت ہر انسان کو یہ صاف و صریح الفاظ میں متنبہ کرتی ہے کہ دنیا میں خواہ کتنے ہی آدمی، کتنی ہی قومیں اور کتنی ہی نسلیں اور پشتیں ایک کام یا ایک طریق عمل میں شریک ہوں۔ بہرحال خدا کی آخری عدالت میں اس مشترک عمل کا تجزیہ کر کے ایک ایک انسان کی ذاتی ذمہ داری الگ مشخص کر لی جائے گی اور اس کو جو کچھ بھی جزا یا سزا ملے گی، اس عمل کی ملے گی جس کا وہ خود اپنی انفرادی حیثیت میں ذمہ دار ثابت ہو گا اور جیسا کہ سورۃ الاعراف، کی آیت ۴۲ میں فرمایا گیا ہے کہ خدا نے ہر ایک کو اس کی استطاعت کے مطابق ہی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

ہر انسان کی نیک بختی اور بدبختی اور اس کے انجام کی بھلائی اور برائی کے اسباب بدرجہ خود اس کی اپنی ذات میں موجود ہیں۔ اپنے اوصاف، اپنی سیرت

کر کے اپنی آخرت تباہ اور قوت فیصلہ و انتخاب کے استعمال سے وہ خود ہی اپنے آپ کو سعادت کا مستحق بھی بناتا ہے اور شقاوت کا مستحق بھی اور یہی معنی ہیں خدا کے اس ارشاد کے کہ:

"ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے۔"

(سورہ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۱۳)

اسلام کے نقطۂ نظر سے اس کائنات میں انسان کی حیثیت اور اس کے اخلاق کے معاملے میں فیصلہ کن سوال یہی ہے کہ کارزارِ حیات میں انسان جو دوڑ دھوپ کر رہا ہے اُس میں آیا وہ دنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اُخروی نتائج پر۔ انسانوں رسولوں اور کتابوں کے ذریعے اس حقیقت سے آگاہ کیا جا چکا ہے کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اس دنیا کی چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم تک ان کا سلسلہ دراز ہوتا ہے اور یہیں پر انسان کی وسعت نظر اور دور بینی اور عاقبت اندیشی کا سوال آتا ہے کہ وہ خدا کا شکر گزار بندہ بن کر صرف ثواب دنیا کے ارادے سے کام کر رہا ہے یا ثواب آخرت کے نقطۂ نظر سے۔ اسی وسعت نظر، دور بینی اور عاقبت اندیشی کی طرف خدا نے انسان کا ذہن منتقل کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ:

"جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم اُن کی جزا ضرور عطا کریں گے۔"

(سورہ آل عمران ۳- آیت ۱۴۵)

انسان کی دنیاوی زندگی کی حقیقت ایک موقع پر اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ:

"وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

(سورہ الانعام ۶- آیت ۱۶۵)

روز حشر خدا مجرموں سے کہے گا کہ:

"اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے۔"

(سورہ السجدہ ۳۲- آیت ۱۳)

مگر خدا کے نزدیک حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرا کر ہی لوگوں کو ہدایت دینا پیش نظر ہوتا تو دنیا کی زندگی میں اتنے بڑے امتحان سے گزار کر اسے روز حشر پھر زندہ کر کے کھڑا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ مگر خدا کا منشا تو حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل اور حواس سے مخفی رکھ کر انسان کا امتحان لینا تھا تاکہ وہ براہ راست اس کو بے نقاب دیکھنے کے بجائے کائنات میں اور خود اپنے نفس میں اس کی علامات دیکھ کر اپنی عقل سے اس کو پہچانتا ہے یا نہیں اور خدا نے اپنے انبیا اور اپنی کتابوں کے ذریعے اس حقیقت شناسی میں جو انسان کی مدد کی ہے اس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں۔

اقبال نے "بانگ درا" کی نظم "انسان" کے درج ذیل اشعار میں انسانی زندگی کی اصلی حقیقت

کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے کہ انسان کو اس کائنات میں ان ہی گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کے لیے عقل و فہم سے فیض یاب کر کے لایا گیا ہے۔ تاکہ وہ اس حقیقت کائنات کی حقیقت معلوم کر سکے اور اس جزا کا مستحق ہو جو خدا نے عقل و فہم سے کام لے کر دنیاوی زندگی کی آزمائش میں پورا اترنے والوں کے لیے وعدہ کر رکھا ہے۔

اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

"ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا رزم گاہ ہے، عشرت کدہ نہیں۔ جو لڑنا نہیں جانتے، جو ہتھیار ڈال دیتے ہیں وہ زندہ رہنے کے لائق نہیں رہتے۔ زندگی ان پر حقارت سے نظر ڈالتی ہے۔ جینے کا اصول تو یہ ہے کہ انسان ہیر ٹامر سے مرعوب نہ ہو، آسائش اور عیش و عشرت اور مایوسی سے خود کو دور رکھے، جفاکشی کا خود کو عادی بنائے اور اسلحے سے لیس ہو کر اس میدان حرب میں کود پڑے جس کا نام زندگی ہے۔"

سید حامد

حضور اکرمؐ اور حقوقِ انسانی

محمد جنید خاں ▽

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف خطابات سے نوازا ہے۔ ان ہی میں سے ایک خطاب ہے رحمۃ العالمین۔ جیسا کہ قرآن کریم کی یہ آیت؛

"وَمَا اَرسلنٰک اِلّا رحمۃ للعالمین"

[ہم نے آپ کو سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے]۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کیا حضورؐ کی رحمت صرف عربوں کے لیے ہے جہاں پر آپؐ کی ولادت ہوئی؟ ایسا نہیں ہے۔ حضورؐ کا پیغام آفاقی ہے آپؐ کی رحمت آفاقی ہے۔ اس میں نہ کسی رنگ ونسل کو دخل ہے نہ کسی خاص خطہ یا فرقہ کو۔ نہ اس میں کسی امیر اور عزت دار کو خصوصیت حاصل ہے اور نہ ہی صاحب اقتدار اور صاحب قوت وطاقت کو۔ بلکہ حضورؐ نے اپنے افعال، اپنے اعمال اور اپنے اقوال سے انسانوں کو یہ درس دیا کہ انسانی حقوق کی پامالی کو نہ اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور نہ اس کے رسول۔

ہمیں حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں آپؐ نے انسانی حقوق کی بالادستی کو برقرار رکھا۔

تاریخ اور سیرت ہمارے بتاتی ہے کہ حضور اپنی ابتدائی زندگی میں جب وہ دائی حلیمہؓ کے یہاں تھے، حلیمہ کے اپنے بچے جو حضورؐ کے ہم عمر تھے اور دودھ شریک بھی آپؐ ان کے حصے کا دودھ نہیں پیتے۔ بچپن میں بھی حقوق انسانی کی حفاظت کا حق ادا کرتے ہیں۔

ایک اور واقعہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب بیت اللہ کی دوبارہ تعمیر کا مسئلہ پیش آیا تو عرب کے منظم قبائل کی تلواریں صرف اس لیے بے نیام ہو گئیں کہ ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ بیت اللہ میں حجر اسود کو نصب کرتے وقت اس کو سرفرازی وعزت حاصل ہو اور وہ اپنے ہاتھوں سے اس کو بیت اللہ میں نصب کرے۔ قریب تھا کہ اللہ کا پاکیزہ وبابرکت گھر انسانی خون سے لالہ زار ہو جائے لیکن مکہ کی ایک بزرگ شخصیت ابوامیہ نے اس جنگ کو اس طرح ٹالا کہ کل جو شخص سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہو وہ حجر اسود کو اس کے مقام پر لگائے۔ چنانچہ دوسرے روز سب سے پہلے جو شخصیت حرم پاک میں داخل ہوئی وہ حضورؐ تھے۔ سب لوگ پکار اٹھے کہ محمد آ گئے۔ امین آ گئے۔ تمام لوگ اس

بات پر متفق تھے کہ آپؐ حجرِ اسود کو اس کے مقام پر نصب فرمائیں لیکن آپ نے حقوقِ انسانی کا لحاظ فرماتے ہوئے اس فریضے کو اس طرح انجام دیا کہ ایک چادر میں حجرِ اسود رکھا۔ تمام قبائل کے سرداروں نے اس چادر کو اٹھایا اور آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کو اس کے مقام پر رکھ دیا۔ پیش کر سکتی ہے کوئی قوم حقوقِ انسانی کی ایسی زبردست مثال۔

آپ کی توجہ ایک اور واقعہ کی طرف دلاتا ہوں۔

ابوجہل حضورؐ کا چچا تھا لیکن بھتیجے کا بدترین دشمن بھی تھا۔ قریش کے سربرآوردہ شخصیات میں اس کا شمار تھا۔ ایک موقع پر ابوجہل نے کچھ رقم ایک شخص سے قرض لی لیکن ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ قرض خواہ اس ٹال مٹول سے پریشان ہو گیا۔ ایک روز وہ ابوجہل کو تلاش کرتا ہوا حرم میں آیا۔ دیکھا کہ چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ابوجہل ڈینگیں مار رہا ہے۔ کچھ دیگر لوگ جو اس شخص کے قریب ہی بیٹھے تھے معلوم کرنے لگے کہ آنے کا سبب کیا ہے۔ اس شخص نے سارا ماجرا ان لوگوں کے گوش گزار کر دیا۔ انھوں نے بطورِ مزاح اس کو مشورہ دیا کہ وہ سامنے بیت اللہ کے پاس جو شخص عبادت میں مصروف ہیں وہ محمدؐ ہیں۔ انسانوں کے ہمدرد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اُن سے جا کر کہو وہ ابوجہل سے تمہارا قرض دلوا دیں گے۔ اُن لوگوں کا منشا یہ تھا کہ حضور اُس شخص کی اگر مدد کرنے کے لیے ابوجہل کے پاس جاتے ہیں تو ابوجہل اُن کی خبر لے گا اور اگر نہیں جاتے ہیں تو ہمیں یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ یہ کیسے اللہ کے رسول ہیں جو حق و انصاف کی بات کہنے میں ہچکچاتے ہیں اور مجبوروں کی مدد نہیں کرتے۔ وہ شخص نووارد تھا۔ حضورِ اکرمؐ کے پاس پہنچا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ اِدھر یہ لوگ منتظر تھے کہ [illegible] حضورؐ کو کیا [illegible] انتظار ہے۔ اور اگر محمدؐ

حقوقِ انسانی کی حفاظت نہ کر سکے تو ہم اُن کی خبر لیں گے۔ حضورؐ اس قرض خواہ کو اپنے ساتھ لے کر ابوجہل کے پاس آئے اور فرمایا کہ تم اس کا قرض کیوں ادا نہیں کرتے۔ ابوجہل اور اس کے تمام ساتھی دم بخود تھے۔ ابوجہل فوراً گھر گیا اور اس شخص کو اس کی ساری رقم ادا کر دی۔ یہ شخص جو ابھی اسلام نہیں لایا تھا اپنا حق پا کر اس قدر مسرور ہوا کہ اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

آج دنیا میں ہر جگہ انسانی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ طاقتور قومیں کمزوروں پر ظلم و تشدد کا ہتھیار استعمال کر رہی ہیں اور کمزوروں کی فریاد سننے والا نہیں۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہیں۔ حضورؐ نے تو جانوروں سے بھی ایسا سلوک کرنے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ آج انسان انسان کے ساتھ کر رہا ہے۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حضورؐ کے ایک صحابی نے ایک پرندے کے بچوں کو پکڑ لیا تھا اور اپنے ساتھ گھر لا رہے تھے۔ پرندہ اس شخص کے اردگرد منڈلا کر شور مچا رہا تھا کہ کسی طرح اس کے بچوں کو رہائی مل جائے۔ آپؐ نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ان صحابی کو حکم دیا کہ وہ پرندے کے بچوں کو اس کے گھونسلے میں رکھ آئیں۔

حضورؐ نے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے قبل جو خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر دیا گیا تھا وہ

CHARTER OF HUMAN
RIGHTS AND PEACE

کا ایک نادر و یادگار نمونہ ہے۔ اگر آج ہم اس کو اپنا رہنما اور رہبر بنا لیں اور اس کے مطابق عمل کریں تو شاید دنیا میں کوئی جنگ نہ ہو، کسی غریب کا گھر نہ اجاڑا جائے، کسی بچے کو یتیمی کا منہ نہ دیکھنا پڑے، کسی عورت کو بیوگی

باقی صفحہ نمبر ۴۸ پر

قانون شیخ اور اکسیر اعظم ــــ ایک دلچسپ توارد

الوسعد ٭

سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا مجموعۂ علم ہے جو برق رفتار ترقیات زمانے کا ساتھ دے سکے۔ یعنی یہ کہ سائنسی موضوعات کی فطرت میں جمود و تعطل نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی سیلان ہو اگر وہاں "زندگی" نہیں ہے تو قدیم سرمایے میں اضافہ تو کجا اس کا تحفظ بھی ایک مشکل امر ہے۔

طب بھی ایک سائنٹفک موضوع ہے۔ اس کا غیر سائنٹفک دورِ تقلید سائنسی دور سے زیادہ مبارک اور وقیع نظر آتا ہے۔ جدید سائنسی آلات کی ایجاد سے قبل اطبا نے صرف مشاہدہ و تجربے کی بنیاد پر جتنا کچھ علمی سرمایہ ہم تک پہنچا دیا ہے، اعجاز مسیحائی سے کم نہیں ہے۔ طب یونانی جب تک عرب اطباء کی فکر و نظر کا محور رہا ہے، اس میں وسعت، گہرائی، مجتہدانہ صلاحیت کا اظہار اور نئی فکر و دانش کا سراغ ملتا ہے لیکن ہندوستانی اطبا کے تحقیقی و علمی "اکتشافات" کے تناظر میں صورت حال بڑی مایوس کن ہے۔ اطلاقی نقطۂ نظر سے تو پھر بھی اطبا کے ذاتی تجربات کسی حد تک قابل اطمینان ہو سکتے ہیں لیکن فنی حیثیت سے پورے سرمایے کا معاملہ اجتہاد سے خالی نظر آتا ہے۔

علمی بے بسی کا تو یہ عالم ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اب تک طب کی وقیع اور نہایت اہم کتب کے تراجم بھی اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکے ہیں۔ حالانکہ بنام تحقیق جو کچھ بھی انجام پاکر منظر عام پر آیا ہے اس کی حیثیت ترجمانی کا عمل سے زیادہ کی نہیں ہے یا پھر متقدمین اور عرب اطباء کے خیالات کا ایکسرے ہے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے بڑی شدت سے اس بات کو محسوس کیا تھا۔ ظاہر ہے دور جدید میں حکیم اجمل خاں کا شمار طب کے شہسواروں اور نکتہ دانوں میں ہوتا ہے۔ اجمل خاں کا تبحر علمی، تجربہ و مشاہدہ، بصیرت و بصارت اور جدید نظریات سے طب قدیم کو باہم مربوط کرنے کی فنکارانہ صلاحیت نے ہندوستانی اطبا میں ان کا نام طب کے افق پر روشن کر دیا ہے۔ انھوں نے آج کے سائنسی دور کی بدلتی ہوئی صالح اقدار و روایات اور علمی اکتشافات کو کھلے دل سے تسلیم کر لینے پر حکما کے ذہن کو آمادہ کیا اور اسی لیے انھوں نے اجمل خاں طبیہ کالج کا قیام علی گڑھ میں پسند فرمایا تھا۔ طبی موضوعات پر ریسرچ و تحقیق کے جتنے مواقع یہاں فراہم ہو سکتے ہیں شاید ہندوستان میں کہیں اور

٭ ایم ڈی - اسکالر - معالجات، اجمل خاں طبیہ کالج - اے ایم یو علی گڑھ

نہیں اسے جدید سائنسی معلومات سے مطابق و
انسان کے تمام تر احتمالات یہاں ہیں شاید کہیں اور
نہیں۔ یہ سوال تشنۂ جواب ہے کہ اطباء یونان کی توقعات
کہاں تک پھل پھول سکیں۔ اس میں اگر کچھ دخل ہماری
سہل پسندی کا ہے تو حکومت کی عدم سرپرستی کا دخل
کم نہیں ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا جو مقدمے سے طویل ہو گیا۔ دراصل
گفتگو چل رہی تھی کہ وہ اطباء جن کے کاموں کو بڑے اعتبار
کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بنظر غائر اگر ان کی نگارشات
کا مطالعہ کیا جائے تو بات اخذ و ترجمے سے آگے بڑھتی
ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ مثال کے طور پر حکیم محمد اعظم
خاں کی اکسیر اعظم، محیط اعظم اور قرابادین اعظم
قابل قدر تالیفات ہیں۔ لیکن اکسیر اعظم اور قانون شیخ
کا تقابلی مطالعہ کریں تو بیشتر جگہوں پر توارد کی دلچسپ
مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اپنی بات کے ثبوت کے لیے
اور طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک خیال پر اکتفا کروں
گا ورنہ مثالیں تو بہت مل سکتی ہیں۔

ضیق النفس کے سلسلے میں اکسیر اعظم کی فارسی
عبارت میں تخیل اور الفاظ کی ترتیب ملاحظہ کریں

"بالجملہ در ضیق النفس ہوا کہ داخل
میشود باستنشاق و خارج میگردد
بر نفس در دخول و خروج منفذ نمی
یابد مگر تنگ ولهذا تنفس اندک
اندک نماید و اسباب او یا
اورام است در منافذ کہ آن عضو
قصبہ و شعب آنہا و شرائین ست کہ
در نفس ظلفہ ریہ و اورام آن و شدید
ترین اورام کہ ضیق نفس آرند آنست
کہ صلب باشد و یا اخلاط کثیر غلیظ
یا لزج در آن مائیت کہ در ریہ
جمع گردد و یا انطباق کہ عارض شود
آنرا از ضاغط مجاور از ورم حار
در کبد یا معدہ و یا طحال و یا اخلاط
منصبہ در فضاء سینہ بسبب استسقاء
وغیر آن مثل آنکہ او انفجارات اورام
در جوف اسفل باشد و یا تعاطف
اعضاء حلق و صدر از یبس و یا از برد
کہ بریہ و یا حجاب رسد و یا بسبب
آفتی در عصب و این اولی است
باین کہ عسر نفس نامند نہ ضیق آن و یا
از ابخرہ دخانیہ و گاہے ضیق صدر
در اصل خلقت و گاہے بسبب
بحران امراض حار بود و این علامت
آنست کہ مواد بسوی فوق میل کردہ
گاہے عسر نفس و ضیق او بسبب سیلان
مواد از اورام باطنہ منتقل بسوی
نواحی راس باشد و منذر بود
یا اورام پس گوش اگر از سالم
تر و حواس و عقل بسلامت باشد و
یا بورم دماغ اگر امر صعب تر و
آفت در حواس و عقل باشد۔"

حوالہ: حکیم محمد اعظم خاں۔ اکسیر اعظم
ص ۱۲۶ — مطبع نظامی کانپور
سنہ ۱۲۸۹ھ

اس تحریر کے مطالعہ کے بعد قانون شیخ کی عربی
عبارت ملاحظہ ہو۔

فصل فی ضیق النفس۔ وهو ان

لانه لما يتصرف فيه النفس
منفذ ينفذ فيه حركة الا ضيقا لا يتسرب
فيه الا قليلا قليلا۔

واسبابه اما اورام في ممالك
المنافذ التي هي الحنجرة والقصبة
وشعبها والشرائين ومنه عسر
غلظة الرئة وجرمها واشد اورامها
تضييقا للنفس ما يكون صلبا او
اخلاطا كثيرة فيها غليظة ولزجة او
مائية تجتمع في الرئة او انصباب
يعرض لها من نافث مجاور مثل
ورم حار في كبد او معدة او طحال
او اخلاط منصبة في الفضاء لاستسقاء
او غير ذلك مما يكون من انفجار او دبيلة
في الجوف الاسفل تحول دون الانبساط
او تكاثف عن يبس او قبض او
عن برد يصيب الرئة والحجاب
او عن سبب في العصب والحجاب
وهو اولى بان يسمى عسر النفس او
عن ابخرة دخانية تضيق مداخل
النفس في المواضع الضيقة وقد يكون
بسبب ضيق الصدر خلقة لا لعلة
المبسط للنفس بالالات وقد يكون بسبب
الحركة وعلامته اذا ما سكنت الحاجة
عن الامتلاء والحاجة الى فرق وقد يكون
من النفس وضيقه بسبب سيلان
المولد عن الادرار بالمبالغة منقطعة اليه
نواحي الراس وذلك نذر باورام تحدث
الاذنين انه ما كان الامر اسلم او
في الدماغ انه كان اصعب ؟

حوالہ: شیخ بوعلی سینا۔
کتاب القانون فی الطب
جزء ثالث - ص ۲۱۶۔

مشتے از خروارے کے طور پر یہ ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ اس بات سے ماشاء و کلا میں منشا اعظم کی حیثیت گستاخی نہیں ہے۔ بات صرف یہ عرض کرنی ہے کہ حکیم اعظم خاں کو قدرت نے جس تخلیقی اور تحقیقی ذہن سے نوازا تھا اور جس طرح تجربہ ہم کو ان کے ذریعے مختلف امراض میں مفردی ادویہ کے تعارف میں ہوا ہے۔ اگر انہوں نے تقلید سے آگے اپنی خلاقانہ صلاحیت کو مہمیز کیا ہوتا تو طبی دنیا میں انتہائی قابل فخر اضافہ ہو سکتا تھا۔

بقیہ: حضور اکرمؐ اور حقوق انسانی۔

کی چادر نہ اوڑھنا پڑے، کسی ماں سے اس کا بیٹا چھینا جائے، کسی باپ کو اپنے جوان بیٹے کی لاش کو کاندھا نہ دینا پڑے۔

ہم عہد کریں کہ ہم حضورؐ کی سیرت اپنی زندگی گزاریں گے، اپنے اعمال اور افعال سے کسی بھی شخص کو اپنے اوپر ہنسی اڑانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اگر ہم سچے دل سے اس بات کا عہد کر لیں کہ ہمارا ہر فعل سیرت محمدی کے مطابق ہوگا تو شاید بہتر کہ ہم پر ظلم کرنے کی نوبت ہوگی اور ذلالت۔ کاش کہ ہم ایسا عہد کر سکیں اور اس پر کاربند بھی رہیں۔

ملا محمود جونپوری

محمد تقی علی عابدی ؎

ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں سائنس اور تکنیک کے باکمال افراد کی ایک طویل فہرست تیار کی جا سکتی ہے جس میں ملا محمود کو سر فہرست لکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس بات کے ثبوت ملتے ہیں کہ شاہجہاں نے ملا محمود کی صلاحیتوں کے مدنظر جونپور میں ایک رصدگاہ بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ تاکہ ملا محمود فلکیاتی تجربات اور مشاہدات کر سکیں لیکن حکومتی مسائل اور معاشی کمزوری کی وجہ سے وہ نہیں بن سکی۔

ملا محمود کی ولادت عہد جہانگیر میں ۱۶۰۶ء بمقام شیراز ہند جونپور میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ محمد، دادا شیخ شاہ محمد اور نانا شیخ شاہ محمد تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے شیخ فخر اور والدہ کی طرف سے مفتی حمزہ عثمانی سے ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے نانا شاہ محمد سے زبان، ادب اور شیخ محمد افضل سے علم معقولات کی تعلیم حاصل کی اور سترہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کر کے جونپور میں ہی درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ان کا شمار اس وقت کے انتہائی ذہین افراد میں ہوتا تھا۔ ملا محمود بچپن سے ہی علمی مجالس و محافل میں شریک رہے اور اپنی تقریر سے بڑے بڑے علما کو متحیر کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ

افسر ترکی نامی ایک ایرانی عالم شاہجہاں کے دربار میں آیا اور اس نے دربار سے وابستہ سبھی عالموں کو طبیعیاتی فلسفہ کی بحث میں شکست دے دی، جس سے شاہجہاں سخت رنجیدہ ہوا۔ کسی نے شاہجہاں کو ملا محمود جونپوری کی طرف متوجہ کیا تو شاہجہاں نے ملا محمود کو دہلی آنے کی دعوت دی لیکن ملا محمود نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاہ کی دعوت کو قبول کر لیا اور وہاں پہنچ کر بھرے دربار میں مادہ سے متعلق ایک طویل بحث میں اس ایرانی عالم کو شکست فاش دے کر اپنے علم سے بادشاہ کو کافی متاثر کیا۔

ملا محمود جونپوری علم معقولات کے علاوہ تفسیر، حدیث، ریاضی، علم ہیئت میں دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے تھے۔ مثلاً

ہر آن مے کہ ندارد خمار در لب تست
چرا دو چشم تو پیوستہ در خمار بود

ملا محمود جونپوری عہد شاہجہانی کے ایک جید عالم تھے۔ انھوں نے فارسی میں قضا و قدر، وحدت الوجود، اقسام الحیوان اور عربی میں الدوحۃ المیادۃ فی صورۃ والمادۃ، کلی وجزئی، ارتفاع النقیضین، فرائد جیسی کتب تصنیف کرنے کے ساتھ ساتھ طبیعاتی فلسفہ پر عربی زبان ہی میں شمس بازغہ جیسی مستند کتاب شاہجہاں کے عہد حکومت یعنی سترھویں صدی کے نصف اول میں تصنیف کی۔ اس میں جسم، مادہ، زمان، مکان، حرکت، گرمی، روشنی، آواز، چاند کے دھبے، آسمان کا نیلا دکھائی دینا جیسے مسائل پر بحث کی گئی ہے جس سے ان مسائل پر علما کے مختلف خیالات اور اختلافات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ملا محمود ان میں سے ہر ایک خیال پہلے اپنے سامنے پیش کرتے ہیں اور جنھیں غلط سمجھتے ہیں انھیں قدما کے مشاہدات اور منطق کی بنیاد پر رد کرتے ہیں اور خود اپنا نظریہ جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں اسے دلائل اور ثبوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس میں مشاہدات اور مروجہ نظریات کے واسطے سے جو منطقی تجزیے پیش کیے گئے ہیں وہ کافی اہم ہیں یہ کوشش اس لیے بھی کافی اہم ہے کہ اس میں کسی ماورائی عنصر مظاہر یا فوق الفطرت طاقت یا دیوتا کا سہارا نہیں لیا گیا ہے بلکہ مظاہر فطرت، اصلی طاقتوں، مختلف اشیا، کی خصوصیات اور ان کی ماہیت کی تشریح خالص سائنسی معلومات کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

شمس بازغہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی میں جب کہ ہندوستانی سماج شدید بحران کا سامنا کر رہا تھا اس وقت خواجہ میر درد نے کہا تھا ۔۔۔

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہ عیش و طرب
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھتے ہیں بدر منیر

ملا محمود شمس بازغہ کو آٹھ فنون سماع الطبیعی، سماء والعالم، کون والفساد، فعل والانفعال، آثار العلویہ، والمعادن، النفس، نبات اور حیوان کے تحت لکھنا چاہتے تھے لیکن ملا محمود جونپوری ان آٹھ فنون میں سے صرف تین فن سماع الطبیعی، سماء والعالم اور کون والفساد کو ہی تحریر کر سکے تھے کہ ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۱ء میں انتقال ہو گیا اور کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ اس کتاب پر میر زاہد، سندیلی، ملا حسن لکھنوی، مفتی ظہور اللہ لکھنوی، مفتی محمد یوسف لکھنوی، نظام الدین سہالوی، شیخ احمد پھلواری، ملا محمد عبد الحلیم اور مولانا محمد امین اللہ نے حاشیے لکھے۔

ملا محمود جونپوری نے شمس بازغہ میں شیخ الرئیس ابو علی سینا کی کتاب "الشفا" سے استفادہ کیا ہے لیکن بعض جگہوں پر جہاں الشفا سے اختلاف محسوس کیا ہے وہاں اسے رد بھی کیا ہے۔ ذاتی خیال ہے کہ اگر آج تقریباً ساڑھے تین سو سال گزر جانے کے بعد بھی شمس بازغہ پر تحقیق کی جائے تو اس سے دوربین کی ایجاد سے پہلے مغرب میں انکشاف ہونے سے قبل عہد وسطیٰ کی فلکیات کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر ملا محمود جونپوری کو ہندوستان کا ایک مایہ ناز سائنس داں بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

(یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے ۱۰ رمارچ ۱۹۸۹ء کو نشر ہوا۔ تقی علی عابدی)

دسویں کلاس کے بورڈ امتحان میں بہار کے پچیس ہائی اسکولوں میں پوزیشن لانے والے

ستر ہونہار بچوں کو شیروانی انعامات ۱۹۹۱ء

احمد رشید شیروانی ▽

بہار کے ۲۵ سے کچھ ہائی اسکولوں سے ۱۹۹۱ء کے دسویں کلاس کے بورڈ امتحان کے رزلٹ آگئے ہیں اور آرہے ہیں۔ اب تک ان اسکولوں کے جو نہار ترین طلبا و طالبات کو الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ و جیب اللہ شیروانی سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے دلی دعاؤں کے ساتھ انعامات بھیجے جاچکے ہیں۔ ان اداروں کے نام اور انعام جیتنے والے ہونہار بچوں کے نام ذیل میں درج ہیں۔

سینٹرل کریمیہ ہائی اسکول۔ جمشید پور (بوائز)

۱۔ عبد الرضا سلمہٗ۔ ۲۔ محمد اقبال سلمہٗ

۳۔ محمد کلیم سلمہٗ۔

سینٹرل کریمیہ ہائی اسکول۔ جمشید پور (گرلز)

۱۔ کماری نجم النساء سلمہا ۲۔ کماری کوثر پروین سلمہا۔ ۳۔ کماری کوثر تسنیم سلمہا۔

قاسمی ہائی اسکول۔ گیا

۱۔ نیر کمال صدیقی سلمہٗ۔ ۲۔ عاطف رحمٰن سلمہٗ۔

۳۔ محمد شاہنواز سلمہٗ۔

رسل ہائی اسکول۔ بہادر گنج ضلع کشن گنج

۱۔ محمد ممتاز عالم سلمہٗ۔ ۲۔ سرور اقبال سلمہٗ۔

۳۔ حسن راجہ ربانی سلمہٗ۔

گیا مسلم آر فنیج اردو ہائی اسکول۔ چرکی ضلع گیا

۱۔ محمد عرفان عالم سلمہٗ ۲۔ محمد افسر حسین سلمہٗ۔

۳۔ محمد طارق پرویز سلمہٗ۔

جگسلائی اردو ہائی اسکول۔ جمشید پور

۱۔ ایم۔ جہانگیر سلمہٗ ۲۔ اشرف علی سلمہٗ۔

۳۔ آفتاب عالم سلمہٗ۔

جے ایم خانقاہ ہائی اسکول۔ اسلامپور ضلع نالندہ

۱۔ محمد وحید عالم سلمہٗ۔ ۲۔ کماری سنیتا کماری سلمہا۔ ۳۔ مسعود واصفی سلمہٗ۔

آزاد نگر ہائی اسکول جھتر گاچھ۔ ضلع پورنیہ

۱۔ کماری تبسم آرا سلمہا۔

۲۔ کماری نوشابہ خاتون سلمہا

۳۔ کماری شاہین کوثر سلمہا۔

▽ کناٹ پیلس۔ نئی دہلی

ارشد میموریل اردو گرلز ہائی اسکول آرا ضلع بھوجپور

۱- کماری شبنم جہاں سلمہا۔ ۲- کماری یاسمین بانو سلمہا ۳- کماری شبنم رانق سلمہا۔

حنیفیہ ہائی اسکول۔ بائسی۔ ضلع پورنیہ۔

۱- محمد ضیا حسینی سلمہٗ۔ ۲- محبوب عالم سلمہٗ

۳- فیاض عالم تمنا سلمہٗ۔

اسلامیہ ہائی اسکول۔ پہاڑپور۔ ضلع سہرسہ

۱- محمد قیصر عالم سلمہٗ۔ ۲- محمد ساقی الزماں سلمہٗ۔ ۳- محمد شاہد حسین سلمہٗ۔

چترپور ہائی اسکول۔ ہزاری باغ

۱- جمیل الحسن سلمہٗ ۲- سجاد حسین سلمہٗ۔

۳- محمد شفیق اللہ سلمہٗ

نیشنل اکیڈمی ہائی اسکول۔ گنگی ہاٹ ضلع پورنیہ

۱- محمد مستقیم سلمہٗ۔ ۲- محمد انیس الرحمن سلمہٗ

۳- محمد مظاہر عالم سلمہٗ۔

عدالت حسینہ ہائی اسکول۔ بگاہی ضلع چمپارن

۱- کمال الدین سلمہٗ ۲- ناصر حسین سلمہٗ۔

۳- پرویز اختر سلمہٗ

داؤد میموریل گرلز ہائی اسکول سیوان

۱- کماری ریشاں پروین سلمہا۔ ۲- کماری فیروزہ خاتون سلمہا۔ ۳- کماری شمیم آرا سلمہا

موسیدا اردو گرلز ہائی اسکول پٹنہ

۱- کماری رخشاں طلعت سلمہا۔ ۲ کماری شاہین جہاں سلمہا ۳- کماری شمع پروین سلمہا۔

چاکسیہ ہائی اسکول۔ ضلع نالندہ

۱- محبوب عالم سلمہٗ ۲- نسیم آرا سلمہٗ

۳- مظاہر امام سلمہٗ۔

کبیر میموریل اردو ہائی اسکول مینگو۔ جمشید پور (بوائز)

۱- محمد جمیل اختر سلمہٗ ۲- محمد قطب الدین سلمہٗ ۳- محمد اقبال سلمہٗ۔

کبیر میموریل اردو ہائی اسکول مینگو۔ جمشید پور (گرلز)

۱- کماری رانی مہ ناز صدیقی سلمہا

۲- کماری کہکشاں بانو سلمہا

۳- کماری نور جہاں سلمہا۔

آزاد اکیڈمی ارریا:

۱- حامد رضا سلمہٗ

۲- محمد شمیم اختر سلمہٗ

۳- ریحان نجیب سلمہٗ۔

اسلامیہ ہائی اسکول اوہان پور۔ ضلع سارن

۱- نہال احمد سلمہٗ

۲ امیر الدین سلمہٗ

۳- اناما شرن سری واستو سلمہٗ

ملت اکیڈمی ہائی اسکول (بوائز) جھریا۔ ضلع دھنباد

۱- محمد جیلانی گدی سلمہٗ۔

۲- محمد رضوان سلمہٗ

۳- عظیم الدین سلمہٗ۔

ملت اکیڈمی ہائی اسکول (گرلز) جھریا۔ ضلع دھنباد۔

۱- کماری فرحت جہاں سلمہا۔

دیہات گرلز ہائی اسکول۔ بھامی
ضلع مظفرپور
۱۔ کماری سفیہ آرا اسلہا۔
۲۔ کماری فریدہ یاسمین اسلہا
پروجیکٹ گرلز ہائی اسکول
موتہا۔ ضلع کشن گنج
۱۔ کماری روبینہ نازلی اسلہا

پچھلے بائیس میں تین یا اس سے زیادہ فرسٹ ڈویژن کے ساتھ اسکول میں پہلی پوزیشن لانے والے مـ۱ کو ڈھائی سو روپیے، دوسری پوزیشن لانے والے مـ۲ کو ڈیڑھ سو روپیے اور تیسری پوزیشن لانے والے مـ۳ کو سو روپیے انعامات بھیجے گئے۔ جہاں تین سے کم فرسٹ ڈویژن تھیں وہاں مـ۱ کو ڈھائی سو روپیے اور مـ۲ کو ڈیڑھ سو روپیے بطور انعام بھیجے گئے۔

بہار کے ہمارے جن ہائی اسکولوں کے ہیڈ صاحبان یا صاحبائوں نے ابھی تک ۱۹۹۱ء کے رزلٹ نہیں بھیجے وہ اب براہ کرم فوراً بھیج دیں۔ اگر اسکول کا رزلٹ ناکامی بھی ہے تو کم از کم ایک پوسٹ کارڈ بھیج کر مطلع کریں۔ مہربانی ہوگی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"مومن مرد اور مومنہ عورتوں پر اُن کی
جانوں، مالوں اور اولاد میں برابر آزمائشیں
آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی
حالت میں ملیں گے کہ وہ گناہوں سے پاک و
صاف ہو چکے ہوں گے"۔
(ترمذی)

یونیورسٹی کے شب و روز

دو روزہ کل ہند سیمینار

داتا دیال مہرشی شیوبرت لال ورمن: حیات و خدمات

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام تقدس مآب [illegible] دیال ڈاکٹر ایشور چندر شرما اور عالی جناب موہن لال نیر کے اشتراک سے داتا دیال مہرشی شیوبرت لال ورمن کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کے لیے ۱۰، ۱۱ر اگست ۱۹۹۱ء کو دو روزہ کل ہند سیمینار منعقد ہوا۔

۱۰ر اگست کو صبح دس بجے کینیڈی ہال آڈیٹوریم میں افتتاحی جلسہ ہوا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد صدر شعبۂ اردو پروفیسر منظر عباس نقوی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا کہ مہرشی جی نے اپنی بیوی کی فرمائش پر ہندو خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے اردو میں کتابیں لکھنی شروع کی تھیں۔ اس سے اس عام خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ اردو ہندو خواتین کی زبان نہیں رہی ہے۔ انھوں نے مہرشی جی سے متعلق تحقیقی کام کی رفتار اور تفصیلات پیش کیں اور یہ بتایا کہ اب تک اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ کتنا کام کر چکے ہیں۔

سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے اپنے تمہیدی خطبہ میں کہا کہ پنڈت دیا شنکر نسیم اور پنڈت رتن ناتھ سرشار ایک کردار بھی ایسا پیش نہیں کر سکے تھے جسے ہندو کہا جا سکے۔ البتہ مہرشی شیوبرت لال ورمن کے نمایاں ہونے کے بعد [illegible] (ایڈیٹر)، بہجت (شاعر)، سلام (تذکرہ نویس) اور پریم چند (ناول و افسانہ نویس) جیسی بے مثال شخصیتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں اور زبان اردو صحیح معنوں میں ہندوؤں مسلمانوں کی مشترک زبان بن گئی۔ مہرشی جی کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ان سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کے دور عروج میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے کیسے عجیب و غریب کام کیے گئے تھے۔ اپنے خطبے میں انھوں نے مہمانوں کا مجملاً تعارف کرایا اور [illegible] انصاری صاحب کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے سیمینار کے شرکا کے لیے فائلوں کا تحفہ پیش کیا تھا۔

پروفیسر محمد حسن نے جو اپنی حق گوئی و بیباکی کے لیے معروف ہیں افتتاحی خطبے میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے شیوبرت لال ورمن کے وسیلے سے اردو کی نئی وسعتوں کا پتا لگایا۔ ورمن کے تصنیفی کارناموں کی تفصیل بیان کر کے انھوں نے فرمایا کہ اتنے عظیم الشان اور وسیع ذخیرے کو کھنگالنا اور اس پر حکم لگانا آسان نہیں اس کے لیے ایک انصار اللہ نہیں کئی اہل نظر چاہییں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ورمن کا سیدھا سادہ، دلنشیں اور غیر آرائشی اسلوب بار بار یاد دلاتا ہے کہ لکھنے والا بہت سادہ اور بے تکلف انداز میں کہتا جاتا ہے۔ [illegible] ۔ ورمن کا اسلوب [illegible]

سادگی اور انکسار کا انداز ہے اس سے سر سید احمد خاں یا ہیم چندر کی یاد آتی ہے۔

مالو دیال صاحب نے زبان اردو سے اپنے غیر معمولی شغف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے والد بھی پنجاب کے عمدہ شاعروں میں امتیاز رکھتے تھے۔ داتا دیال شیو برت لال ورمن کا تعارف کراتے ہوئے مالو دیال صاحب نے بتایا کہ ملکی اور غیر ملکی متعدد زبانوں کے عالم ہونے کے باوجود مہرشی جی نے تصنیف و تالیف کے لیے اپنے زمانہ کی سب سے زیادہ مقبول اور شیریں علمی زبان اردو کا انتخاب کیا تھا اور کہتے تھے کہ قدرت نے مجھے اردو داں طبقے میں رکھا ہے اور اسی کی علمی خدمات کا بار میں اپنے ذمے لیتا ہوں۔ مالو دیال صاحب نے فرمایا کہ میں دل کی گہرائیوں سے اس سمینار کے بانیوں خصوصاً ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا ممنون ہوں لیکن اس سمینار کا مقصد اس وقت تک ہرگز پورا نہیں ہو سکتا جب تک ہم کو جو مہرشی جی کے عقیدت مند اور نام لیوا ہیں اپنے آپ کو ان کی تصنیفی کارناموں سے ان اصل سمت اور رسم خط میں کما حقہ استفادہ کا اہل نہیں بنا لیتے۔

وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی نے صدارتی تقریر میں خوشی کا اظہار کیا کہ اس سمینار کے ذریعے اردو کے ایک ایسے کثیر التصانیف صاحب قلم کو پہلی مرتبہ متعارف کرایا جا رہا ہے جس نے ہندوستان میں قومی یکجہتی کا ماحول پیدا کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ مہرشی جی سے متعلق مطالعے کی ابتدا علی گڑھ میں ہو رہی ہے۔ یقین ہے کہ یہ سمینار باہر کے لوگوں کو بھی راستہ دکھلائے گا۔

جناب محمد احمد شیون نے ادارہ ندائے جمہور کی طرف سے جو صوری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ یادگاری مجلد چھپایا ہے، جناب وائس چانسلر نے اس کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر راجہ رام سنگھ (لی ہانگ چانگ) حکیم لندن نے مہرشی جی

کی کتاب روحانی رامائن کو دیوناگری خط میں منتقل کیا ہے۔ اس کتاب کا اجرا بھی وائس چانسلر صاحب کے ہاتھوں سے عمل میں آیا۔

آخر میں پروفیسر نعیم احمد نے تمام مہمانان گرامی کا شکریہ ادا کیا۔

سمینار کا دوسرا اجلاس شام کو چار بجے ہوا جس میں دس مقالات پڑھے گئے۔ رات میں بعد مغرب شام غزل کا پروگرام تھا۔ یونیورسٹی کے طالب علموں نے مختلف سازوں پر مہرشی جی کی غزلیں سنائیں۔ مہمان خصوصی اچاریہ شبد آنند نے بھی مہرشی جی کا کلام ترنم سے پیش کیا۔

اسی دن مولانا آزاد لائبریری میں پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد یحییٰ نے مہرشی جی کی تصانیف کی نمائش کا افتتاح فرمایا۔ نمائش کے لیے کتابوں کی فراہمی کا کام سمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے کیا تھا۔

۱۹ اگست کو تین اجلاس ہوئے۔ ان میں مزید چھبیس مقالات پڑھے گئے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے چھ سات مقالات پڑھے نہ جا سکے۔ جن حضرات نے مقالات پیش کیے ان میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر عبد الحق، ڈاکٹر محمد ایوب تابان، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، جناب رام لعل نابھوی، صاحبزادہ شوکت علی خاں، ڈائرکٹر عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک، جناب محمد انتظار اللہ، ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، جناب احمد مکرم اور ڈاکٹر راجہ رام سنگھ (لی ہانگ چانگ) کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اختتامی اجلاس بعد نماز عصر شروع ہوا جس میں پروفیسر نعیم احمد نے شعبہ کی کارکردگی کا بہت تفصیل سے تعارف کرایا اور دو تجاویز پیش کیں۔

۱۔ داتا دیال کے نام پر ایک چیئر قائم ہو۔ یہ اس یونیورسٹی اور اس شعبہ کا حق ہے کہ ان کے نام کی

پھر اس شعبہ میں کام کیا جائے۔
وقت کا تقاضہ ہے کہ ان کی تمام تصانیف نئے سرے سے شائع کی جائیں۔ یہ پروجیکٹ بھی اس شعبہ کو دیا جائے۔

ڈاکٹر نسیم احمد نے فرمایا کہ اس سیمینار کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے لیے سنسکرت، فارسی، ہندی، بنگالی اور تیلگو زبانوں کے عالموں نے بھی مضامین لکھے۔

صدر شعبہ پروفیسر منظر عباس نقوی نے یونیورسٹی کے عمائدین، شعبہ کے اراکین، مہمانوں اور شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

جلسہ کے صدر اور مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ظل الرحمان خاں نے فرمایا کہ اس سیمینار کا موضوع ایسا تھا جس کے بارے میں میں نے پہلے کچھ سنا نہیں تھا۔ سائنس میں بھی اگر ایسا مضمون ہوتا تو ہم لوگ ہچکچاتے۔ شعبۂ اردو نے خاص طور سے انصار اللہ صاحب نے بڑی محنت سے اس کام کو کیا اور ہم کو یہ موقع دیا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہم لکھنؤ اور الٰہ آباد، بنارس پر سبقت حاصل ہے۔ ایک تجویز ہے کہ مہر علی کی زندگی اور ان کی ادبی، علمی خدمات پر ایک ٹی۔ وی سیریل بننا چاہیے۔ یہ کام شاید ڈاکٹر اکرام صاحب کے مرکزی وزیر ہونے کی وجہ سے آسان ہوگا۔

آخر میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے سیمینار کے کنوینر کی حیثیت سے تمام حاضرین اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور یہ بتایا کہ ان کی کتاب "داستان دیال" جسے ساہتیہ اکیڈمی چھاپ رہی ہے، انشاء اللہ ستمبر میں ریلیز ہو جائے گی۔

> مرحوم سرسید احمد اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا، بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور ان کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔
>
> ——— مولانا ابوالکلام آزاد

Auction Notice

Electroencephlograph Machine, Cordis Dow Dialysis Monitor, the old spare parts of the vehicles, the tyres etc and of the vehicles, as mentioned hereunder shall be auctioned on 2nd December, 1991 at 10.00 A.M. on the basis of "As is where is".

Interested parties can see the Electroencephlograph Machine, Dialysis Monitor, old spare parts and vehicles in the premises of the Central Automobile Workshop AMU on any working day with the permission of Incharge, Central Automobile workshop, AMU between 8.00 A. M. to 1 00 P. M

The highest bidders, if the bid is accepted, shall have to deposit on the spot 25% of the bid amount The balance thereof shall have to be deposited within 48 hours with the cashier of the University

The decision of auction Committee shall be final. Right to accept/reject the bids or to postpone the auction with out assignment of any reason shall vest in the competent authority.

The material to be put on auction.

1 Electroencephlograph Machine

2 Cordis Dow Dialysis Monitor

3 Condemned spare parts of the different vehicles & tyres

4.

(i)	UPB-2586	Ambulance	J.N.M.C Hospital	—1962
(ii)	UPB-2896	Bus	Principal's Office J.N M C.	—1964
(iii)	UPB-2470	Bus	Women's College	—
(iv)	UPB-3328	Ambassadar Car	Guest House	—1967
(v)	UPB-8360	Jeep	Social Service Scheme	—1970
(vi)	DHB-5272	Jeep	Proctor's Office	—1973
(vii)	UPB-6557	Three wheeler	J N.M.C. Hospital	—1973
(viii)	UPB-106	Standard 20	Proctor's Office	—1979

(Mohd. Ismail Husain)
Purchase Officer

No. PA/213/988/PRO

D. 29-10-91

بانی سرسید

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۰ — شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۹۱ء

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

نائب مدیر

شباب الدین

انچارج سرکولیشن
شفیق احمد

ترتیب
سرفراز

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ :
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق بلڈنگ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، انڈیا
(202002)

زر سالانہ : انڈیا Rs.45.00
* بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک
* عام ڈاک US $ 8.00

PHONE. 24827

...بھیجنے کا پتہ :
...تہذیب الاخلاق بلڈنگ
...علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ
[illegible]
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY, ALIGA...

مندرجات

مالک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت اے ایم یو علی گڑھ ۔ پریس: اے ایم یو پریس ۔ علی گڑھ

اداریہ

آزادی کے بعد ہم نے جن چیزوں میں نمایاں ترقی کی ہے اُن میں سے ایک کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرنا بھی ہے۔ اب یہ فن اپنے معراج کمال پر پہنچ چکا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خالص دودھ، گھی، مسالے، غلّے اور دوسری چیزیں اگر کبھی بھولے سے استعمال کرلی جاتی ہیں تو ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ "ملاوٹی اشیا" کھاپی کر لوگ بیمار پڑتے تھے مگر اب "خالص" اشیا کھا کر لوگ بیمار پڑنے لگے ہیں۔ اس حقیقت سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اب ہمارے جسم ملاوٹی چیزوں کے اتنے عادی ہوچکے ہیں کہ خالص چیزیں ہضم نہیں کرپاتے۔ زندگی کی جہاں بہت سی تلخ حقیقتیں انسان گوارا کرتا ہے آج کے دور کے انسان نے یہ حقیقت بھی گوارا کرلی ہے کہ "خالص چیزیں" اس کی صحت کے لیے "مضر" ہیں۔

کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کا جب بازار گرم ہوا اور اس کو قبول عام بھی حاصل ہوگیا تو دوسری پیداوار کے "تاجر" کیوں خاموش بیٹھتے۔ وہ بھی عام دھارے "میں کیوں نہ بہتے"، اس لیے ہر پیداوار [illegible]) میں ملاوٹ کی جانے لگی، تاجروں کے جذبۂ مسابقت نے دواؤں کو بھی خالص نہ رہنے دیا اور ان میں بھی ملاوٹ ہونے لگی۔ شروع شروع میں جب ایک دواخانے نے موتی کی جگہ پر صدف ڈال کر اپنی مشہور و معروف دوا تیار کی تھی تو بڑا شور و غوغا ہوا تھا۔ اس شور و غوغا کو ختم کرنے اور اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے یہ سائنسی توجیہ پیش کی گئی تھی کہ دواؤں میں موتی کیلشیم کی وجہ سے ڈالا جاتا ہے صدف میں بھی اتنا کیلشیم موجود ہے جتنا کہ موتی میں ہوتا ہے اس لیے موتی کی جگہ صدف ڈالنے سے دوا کی تاثیر میں کوئی کمی نہیں آتی۔ پھر تو یہ کاروبار کچھ اس طرح چل نکلا کہ قافلۂ عمر رواں سے بھی آگے بڑھ گیا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی دوا ایسی ہو جس کو "اصلی" قرار دیا جاسکے۔ ہم دوا کے نام پر جانے کتنے زہروں کو اپنے جسم کے اندر داخل کر رہے ہیں اور سرعت کے ساتھ موت کی سرحد کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ جب تک یہ ملاوٹ حد اعتدال میں رہتی ہے اس کا کوئی خطرناک فوری اثر ظاہر نہیں ہوتا اور "تک بندی" "چل" جاتی ہے لیکن انسانی "اندازے" اکثر غلط بھی ہوسکتے ہیں۔ جیسے ہی ملاوٹ کا یہ تناسب "بگڑا" دوا زہر بن گئی اور جس نے بھی اس کا استعمال کیا وہ عدم آباد کو سدھارا۔

آزادی کے بعد سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ کبھی نقلی گلوکوز سے اجتماعی موت ہوتی ہے تو کبھی ملاوٹی بسکٹ

یا کوئی دوسری غذا کھا کر سیکڑوں اسکولی بچے اور بچیاں عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے جب کوئی زہریلی واردات ہوتی ہے تو چند دنوں کے لیے خوب شور مچایا جاتا ہے، بہر حال اس کا چرچا ہوتا ہے خطاکاروں کو سزا دینے کی باتیں کی جاتی ہیں۔ معاملہ زیادہ سنگین ہوا تو ایک تفتیشی کمیشن مقرر کر دیا جاتا ہے مگر ہم ہندوستانیوں کا المیہ یہ ہے کہ چند دنوں کے بعد ہم سب کچھ بھول کر گردش شام و سحر کے نظارے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

ابھی گزشتہ ماہ ایک ناٹک کے نام پر "زہریلی شراب" پینے سے جو اجتماعی موتیں ہوئی تھیں ان پر ہمارے نیتا لوگوں نے کیسے کیسے نعرے دیے تھے، کیا کیا وعدے کیے گئے تھے، ملاوٹ کا قلع قمع کر دینے کی بات کی گئی تھی۔ مجرموں کو سخت سزا دینے کا برملا اعلان کیا گیا تھا مگر چند دنوں کے بعد سب کے آنسو سوکھ گئے ہر زبان اپنی کہی ہوئی بات بھول گئی۔ ہر نیتا اپنی کرسی بچانے کی فکر میں جٹ گیا اور ہم آپ اپنے پیٹ کا ایندھن فراہم کرنے میں لگ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زہریلی شراب پی پی کر اب بھی لوگ مر رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو جب اس قسم کی خبر اخبار میں شائع نہ ہوتی ہو۔ مگر ہمارا انتظامیہ "گوریلا جنگ کے ماہر" ملاوٹی تاجروں سے نبرد آزما ہونے میں لاچار، بے بس اور مجبور ہو کر رہ گیا ہے۔ انتظامیہ کی ساری جرنیلی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور گوریلا جنگ کرنے کے ماہر اپنا کام کر جاتے ہیں۔

گزشتہ ماہ کی اجتماعی اموات کا ایک تاریک پہلو یہ بھی ہے کہ شراب پی کر مرنے والوں پر رونے والوں کی تعداد تو بہت تھی مگر اس عادت بد کو برا کہنے والوں کی تعداد صفر کے برابر تھی۔ اخبارات میں اس سانحے پر بہت سے مراسلات شائع ہوئے جن میں افلاطونی باتیں تو بہت تھیں مگر مسئلے کے حل کی طرف کوئی اشارہ کسی مراسلہ نگار نے نہیں کیا تھا صرف انڈین ایکسپریس کے ایک مراسلہ نگار نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ شراب پی کر مرنے والوں کی موت پر ہم جو معاوضہ دے رہے ہیں کیا وہ جائز ہے؟ کیا اس سے شراب پینے کی لت کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی؟ ہم یہ معاوضہ کس لیے دے رہے ہیں؟ اس لیے کہ لوگ شراب پئیں اور جب شراب پی کر مر جائیں تو ان کے گھر والوں کو ان کے مرنے کا معاوضہ مل جائے۔ مذکورہ مراسلہ کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سہی، خوشی اس بات کی ہے کہ ایک آواز تو اٹھی، ایک صدائے احتجاج تو بلند ہوئی، اس بات کا ثبوت تو ملا کہ ابھی ہمارا ضمیر زندہ ہے۔ ڈر تو اس دن سے لگتا ہے جب یہ ایک آواز بھی نہ اٹھے، اگر یہی لیل و نہار رہے تو یہ ایک آواز بھی، جو ضمیر کے زندہ ہونے کی علامت ہے، نہ سنائی دے گی اور ہر طرف نقارے ہی نقارے بجتے سنائی دیں گے، نقارے بجتے رہیں گے موت کا تانڈو ناچ ہوتا رہے گا اور ہم آپ "خوشی خوشی" مرتے رہیں گے۔

کبیر احمد عباسی

تعلیم اور اتفاق

سرسید احمد خاںؒ

ہمارے ملک ہندوستان میں جو کہ غالباً صدیوں سے ان دو قوموں سے جو ہندو اور مسلمان کے لفظ میں تقسیم کی گئی ہیں آباد ہیں۔ اُن کے بزرگوں کی عظمت اور فضیلت اور نام وری ایسی نہ تھی جو بھولی جاوے، ہندوؤں کے بزرگ جس قدر تھے انھوں نے تمام علوم ریاضیات جبر، حساب، لاجک، فلاسفی، ماہل سینس میں ترقی کی آج تک اُن کی یادگار نشانیاں ہیں جس سے ان کی اولاد کو فخر ہے۔ مسلمان بھی کہ اس ملک میں آکر آباد ہوئے وہ بھی اپنے بزرگوں کی عمدہ تحریرات، عمدہ تالیفات اور تصنیفات پر فخر کرتے ہیں۔ انھوں نے علم کی ہر شاخ میں ترقی دی گو یہ علم یونانیوں سے حاصل ہوئے مگر انھوں نے اس کو ایسے درجہ ترقی پر پہنچایا کہ یونان اور انگلستان دونوں کو ان کی شاگردی سے فخر حاصل ہوا۔ یہ باتیں یقیناً بہت سے لڑکے اور جوان یاد کرکے فخر کرتے ہوں گے مگر اے دوستو! بزرگوں کی بات یاد کرکے فخر کرنا اور خود کچھ نہ ہونا حمیت کے خلاف ہے۔ بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی سے اُن بزرگوں کے نام کو بھی بٹہ لگانا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ ان دونوں قوموں پر جن کے بزرگ ایسے گزرے اور وہ جہالت میں پڑکر بزرگوں کو بھی بدنام کریں

اس زمانے میں علم کا بہت چرچا ہو رہا ہے لیکن ہم کو تعلیم کے مقابلے میں اول غور کرنا چاہیے کہ کیا چیز ہے جس کو ہم سیکھیں اور کیا چیز ہے جس کا سیکھنا ہم کو مفید نہ ہوگا۔ میں اس بزرگ زبان کو جو سنسکرت ہے جس کو ہمارے ملک کے باشندوں کا ایک حصہ عزیز رکھتا ہے اور واقعی وہ اپنا ثانی بھی نہیں رکھتی ہے یا اس مقدس زبان کو جو عربی کہلاتی ہے جس کو میں دل سے مقدس سمجھتا ہوں اور جو اس قابل بھی ہے کہ تمام علوم اور سینس اس میں لائے جاسکتے ہیں دل سے پسند کرتا ہوں مگر باوجود ان سب خوبیوں کے جو اس زبانوں میں ہے سوال یہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ اگر ہم بغیر غور و خیال ضرورت کے تعصب یا نیچرل خواہش سے اپنی دونوں زبانوں کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیں تو یقین کرنا چاہیے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی ہم کو ضرورت ہے اس کو چھوڑ بیٹھیں گے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان مقدس اور پرانی زبانوں کو بالکل چھوڑ بیٹھیں۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بالفعل ہم کو ضرورت کس چیز کی ہے اور کون زبان ہم کو علم کے اعلیٰ مطالب کی طرف لے جاسکتی ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ انگلش

گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں کی کتابیں علوم اور
ون سے بھری ہوئی تھیں مگر اب دیکھنا چاہیے کہ علوم و
ون نے یہاں تک ترقی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو علوم کے
ہمارے بزرگوں نے بوئے تھے وہ اب برومند اور
اور درخت ہو گئے ہیں اور ان میں ایسے پھل پھول لگے
یں اور ایسی خوشنما شاخیں نکلی ہیں اور ایسے لذیذ میوے
لے ہیں کہ وہ ایک نئے درخت معلوم ہوتے ہیں۔ علوم
دید جو بالکل نئے ہوں اور جن کا وجود مطلقاً ہمارے
زرگوں کے زمانے میں نہ پایا جاتا ہو اور واقعی تھوڑے
یں اور زیادہ وہی ہیں جو اگلے بزرگوں کے پاس تھے
مگر اب حقیقت میں اس وقت وہ بیج تھے اور
ب وہ پھل دار درخت ہو گئے ہیں۔ پس اب ہمارا
ن بیجوں پر ہی فخر کرنا اور ان بار آور درختوں کے
سایہ سے فائدہ نہ اٹھانا اور ان لذیذ میووں کے
ذائقہ سے محروم رہنا ہم کو نہ کچھ فائدہ دینے والا ہے
نہ کچھ عزت بخشنے والا۔ اگر ہم ہی علوم میں ترقی کرتے
جاویں تو ان بیجوں کا جو ہمارے باپ دادا نے بوئے
تھے ہم کو فائدہ حاصل ہوگا۔ نہیں تو ہم ان پرانے کہنہ
گلے ہوئے بیجوں کو جن میں بہ سبب کہنگی کے نمو کی بھی
طاقت نہیں رہی ہے ہاتھ میں لیے بیٹھے رہیں گے۔
ہم کو اب ہری ہری شاخیں اور میوے دار ٹہنیاں
لینی چاہییں جو میووں کے گچھے اس میں لٹک رہے
ہیں ان سے تمتع حاصل کرنا چاہیے۔ پس اب یہ
بات قابل دیکھنے کے ہے کہ وہ علوم کن کن زبانوں
میں ہیں اور ان میں سے ہم کو کس زبان کو اختیار
کرنا چاہیے۔ تمام یورپ میں فرنچ زبان سب سے اعلیٰ
اور سب سے زیادہ شیریں اور سب سے زیادہ
پولیٹ ہے۔ علوم جدید بھی فرنچ زبان میں بہت
زیادہ ہیں اور قریب زمانے آنے والا ہے کہ جرمن

زبان بھی اس سے زیادہ علوم کے لیے مخزن ہو جاوے
گی مگر وہ دونوں زبانیں ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔
یہ علوم انگلش لینگویج میں بھی ہیں اور ہم جو کچھ ترقی
کر سکتے ہیں اپنی زبان کے ذریعے سے کر سکتے ہیں۔
ہم انگلش گورنمنٹ کے زیر سایہ بستے ہیں جس میں
ہم کو ہر طرح کا امن و امان حاصل ہے۔ ہم کو اپنی گورنمنٹ
کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہم کو امن و
امان کے سوا تعلیم میں بھی ایسی مدد دی ہے کہ کوئی
سلطنت کوئی بادشاہت ایسی ہم کو نظر نہیں آتی جس
نے اپنی رعایا کی تعلیم میں ایسی مدد کی ہو اور عمدہ سامان
تعلیم کا مہیا کر دیا ہو۔ ہندو اور مسلمان دونوں مجھ کو
معاف کریں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ بنارس کے گھاٹوں
کی سیڑھیوں پر دریوزہ گری کر کے یا مسجد یا خانقاہوں
میں بھیک کے ٹکڑے کھا کر پڑھنے اور ان عمدہ
تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے میں کس قدر فرق ہے۔
گورداسپور کوئی بڑا مقام نہیں ہے مگر دیکھیے کہ
گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم گاہ موجود ہے۔ پس کوئی
وجہ نہیں ہے کہ ہم شکر گزاری کے ساتھ تعلیم کا فائدہ
نہ اٹھاویں مگر اے دوستو! میری رائے اور میرا
خیال یہ ہے کہ کوئی گورنمنٹ ہر ایک قوم کی تعلیم کا
ذمہ اپنے اوپر نہیں لے سکتی ہے بلکہ میں مضبوطی سے
اس رائے پر ہوں کہ ممکن نہیں کہ گورنمنٹ اپنی تمام
رعایا کی تعلیم کر سکے۔ اس سے بھی سخت میری رائے
یہ ہے کہ کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی
خواہش ہو جب تک وہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لیوے
اس کی خواہش کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔ جو کچھ مجھے
افسوس ہے یہی ہے کہ ہماری قوم کو ہر جگہ یہی خواہش
ہے کہ گورنمنٹ اسکول قائم ہو مگر یہ خواہش کسی طرح
پوری نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ گورنمنٹ کی آمدنی بلحاظ

اس لیے اور مصارف کے کسی قوم کی تعلیم کے واسطے کافی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستانیوں کو ترقی اس وقت ہوگی جب وہ اپنے باہمی چندہ، اپنے انتظام، اپنی قوت سے بلا مداخلت گورنمنٹ اور اس کے فریق کے اپنی خودسری اور اپنی مرضی کے موافق اپنے بچوں کی تعلیم کریں۔

اے دوستو! تم اس بات کو خیال کرو کہ گورنمنٹ جو ایسی وسیع مملکت ہندوستان میں حکومت کرتی ہے۔ جس میں مختلف قومیں مختلف اغراض کے لوگ بستے ہیں۔ وہ کسی ایک قوم کی طرف داری یا بہتری کی کوشش نہیں کر سکتی۔ اس کو لازم ہے کہ اس کے قواعد تعلیم ایسے ہوں جو یکساں سب سے متعلق ہو سکتے ہوں۔ اور جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ قوم کی ضرورتیں مختلف ہیں۔ پس گورنمنٹ اپنی دور اندیشی کے قاعدے سے کسی خاص فرقے کی خاص ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی اور ہرگز نہیں کر سکتی۔ ایک بات اور خیال کرنے کی ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی کچھ ہی تعریف کی جاتی ہو، کچھ ہی عمدگی اس میں ہو مگر سب سے زیادہ عمدگی جو اس میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلیم مذہبی سے بالکل علیحدہ ہے۔ اگر گورنمنٹ کسی مذہبی تعلیم میں دخل دے گو کہ وہ نیک نیتی اور نیک دلی ہی سے کیوں نہ ہو ہم کو شبہ میں ڈالے گا اور بہت برا خیال ہمارے دل میں پیدا ہوگا۔ اس سبب سے بچوں کی تعلیم مذہبی گورنمنٹ کی مصلحت اس کی پالیسی اور اس کے انتظام حکومت کے بالکل خلاف ہے۔ پس اگر گورنمنٹ کے اسکول ہماری دنیوی تعلیم کے واسطے کافی ہوں، تب بھی ایک ضروری جزو مذہبی تعلیم کا رہ جاتا ہے۔ پس ہمارے وطن اور ہم قوم لوگوں کو گورنمنٹ پر بوجھ تعلیم کا نہ ڈالنا چاہیے اور تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ ہم کو مدد دے اس سے زیادہ گورنمنٹ سے مانگنا بے غیرتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے گورنمنٹ ہر اسکول میں مدد دینے کو تیار ہے ہم کیوں کہیں کہ فلاں قسم کی تعلیم ہم کو چاہیے اور فلاں قسم کے مدرسے یا کالج ہماری تعلیم کے لیے ضروری کیوں نہیں تعلیم کو ہم لوگ اپنے ہاتھ میں لیں اور جس طرح کی تعلیم کی ضرورت سمجھیں اس طرح کی تعلیم دیں۔

کیمبرج یونیورسٹی میں ابھی ایک لیڈی نے ایک نیا کالج قائم کیا ہے۔ اس فیاض لیڈی نے اس کالج کے لیے اپنے پاس سے اٹھارہ لاکھ روپے دیے ہیں جو یہاں کے حساب سے بیس لاکھ روپے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے ملک کے ہر ضلع اور ہر قصبہ کے لوگ مدرسے قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں کی مردم شماری کچھ ہی ہو مگر دو دو روپیہ اوسط فی کس دینے سے یہاں کے لوگ لاہور کالج سے زیادہ عمدہ ایک کالج گورداسپور میں تیار کر سکتے ہیں لیکن ہمت اور ارادہ کی کمی ہے۔ تعلیم کے متعلق میں اس وقت یہ بحث کرنا نہیں چاہتا کہ کون کون علوم اور فنون عمدہ ہیں اور کون کون تعلیم میں شامل ہونے چاہییں۔ یہ بہت بڑا وسیع میدان ہے اور بہت لوگوں نے اس پر رائے دی ہے۔ اس وقت میں اس تعلیم کا ذکر کروں گا جس کو میں ادنیٰ درجے کی تعلیم کہتا ہوں۔ اور جس کی عموماً ملک کے لوگوں کو ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان عمدہ طور پر جاننا، عمدہ گفتگو کرنا، انگریزی اخباروں کا بخوبی پڑھنا، قانون انگریزی کو خوب سمجھنا، اپنے خیالات کو انگریزی تحریر میں اچھی طرح ظاہر کر سکنا۔ اسی تعلیم کی اشد ضرورت ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم سے تربیت جدا نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارے ملک کے لڑکے اس قدر تعلیم پا جائیں اور ایسی تحریر کر سکیں

جس سے وہ لارڈ میکالے کا خطاب پا سکیں اور تربیت
ان میں نہ ہو تو وہ کسی مطلب کے نہیں۔ لارڈ میکالے میرے
خیال میں وہ شخص ہے جس نے ہندوستان میں بھلائی
کے درخت کا یا یوں کہو کہ علم کے درخت کا بیج بویا۔
لاکھ گورنر جنرل اور کوئی وائسرائے ہندوستان میں
ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان
کو بھلائی پہنچائی ہو مگر یقیناً اس نے جو کچھ کیا اپنی
گورنمنٹ کی خیرخواہی اور بھلائی کے لیے کیا مگر اسی
کے ساتھ اصلی خیرخواہی اور بھلائی کی اصلی جان اس نے
ہمارے ملک میں بھی ڈال دی۔ اے دوستو! تربیت
تعلیم دو چیزیں ہیں۔ صرف تعلیم سے آدمی نہیں بنتا بلکہ
تربیت سے بنتا ہے۔ بولنے میں تو یوں آتا ہے کہ تعلیم
اور تربیت۔ مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے
ہماری قوم کے لوگوں کو اس پر خیال کرنا چاہیے کہ اگر لڑکوں
کی تعلیم کا گورنمنٹ کے اسکولوں پر بھروسہ کرتے ہیں
تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ تربیت بھی پا سکتے ہیں۔ ہرگز
نہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد مارل کی درستی ہے۔ بہت سے
تعلیم یافتہ ہیں جن کا طرز اخلاق ایسا خراب ہے جس کو
دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کاش
وہ بے تعلیم ہی رہتے تو اچھا ہوتا۔ میں تمام ہندوستان
میں جہاں تک خیال کر سکتا ہوں اور جن بڑے بڑے
شہروں میں پھرا ہوں اور وہاں کے حالات سے واقف
ہوا نہایت زور سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی کو اولاد کی
تربیت کا خیال نہیں ہے۔

اے عزیزو! اگر لڑکے کسی گورنمنٹ اسکول
میں پانچ گھنٹے تعلیم پا کر آتے ہیں تو ان کا باقی حصہ زندگی
کا جو بالکل سادہ اور مثل ایک پودے کی نرم شاخ
کے ہوتا ہے کہ جس طرف پر چاہو ٹیڑھی یا سیدھی کر سکو
کس طرح بسر ہوتا ہے۔ گھر کے نوکروں کی صحبت، گھر
میں بازاری لونڈوں کے ساتھ کھیلنا ان کی صحبت میں
بد اخلاقی کی باتیں سیکھنا اور فحش اور بداخلاقی کے الفاظ
جو لونڈے بولتے ہیں اور بکتے ہیں ان کو سننا۔ اسی قسم
کے غارت کن رذائل میں ان کی زندگی کا پاک حصہ بسر
ہوتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ فرشتہ سیرت ہوں
شیطان سے بدتر ان کے اخلاق ہو جاتے ہیں۔ جب
کہ لڑکوں کا چہارم حصہ ماسٹر کے پاس اور اس سے
زیادہ حصہ خراب حالت میں گزرتا ہے۔ تو کیا اس سے
ان کی تربیت اخلاق کی توقع ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔
جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اور ہمارے بچے تو
ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ تربیت کی فکر کریں۔ میں نہیں
کہتا کہ وہ سب کچھ میرے ہی خیال کے موافق کریں۔ تم
مجھ کو جانے دو۔ میرے خیال کی پیروی نہ کرو۔ تم خود سمجھ
کر کوئی تدبیر نکالو۔ دیکھو یہ یورپین بچہ (ایک کم عمر لڑکا جو
اس وقت موجود تھا اس کی طرف اشارہ کیا) جو اس موجود
ہے۔ کیا تم کوئی ایسا بچہ اپنی قوم میں نکال سکتے ہو۔
گو یہ بچہ اب تک سوسائٹی میں نہیں ملا مگر یہ لینضمل بچہ
کی تربیت سے کیسا نیک عادتوں کا نمونہ ہوا۔ اگلے زمانے
میں ہماری اولاد بھی اپنے باپ اور اس کے دوستوں
کی صحبت سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ ان کے اخلاق حسنہ
سیکھتی تھی۔ واقعی وہ بہت اچھا طریقہ تھا مگر وہ تیلیاں
جو ڈورے بندھی تھیں ٹوٹ گئیں۔ اب یہ دوسرا ڈورا
ان کے باندھنے کو ہونا چاہیے۔ اب جو نسلیں موجود ہیں وہ
اس لائق نہیں کہ بچے ان سے تربیت پا سکیں۔ پس
مناسب ہے کہ اولاد کی تربیت کی فکر اور تدبیر کی جاوے
گورنمنٹ پر بوجھ نہ ڈالیے اس سے صرف مدد لیجیے جو
اس کا فرض ہے اور جس کے ادا کرنے پر وہ موجود ہے۔
اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو
قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر

دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا کے شریک ہیں ایک دریا یا کنوئیں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے ایک کو دوسرے بغیر ملے چارہ نہیں۔ بس کسی چیز کو جو مناقشت سے علاقہ رکھتی ہے ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں قومیں تباہ اور بگڑ جاویں گی۔ پرانی تاریخوں میں پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں گو ان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو اور مسلمانو کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے ایک ہی قوم ہیں جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔ اتفاق کی خوبیاں مجھ کو زیادہ بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص اتفاق نہیں رکھتا وہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ برا کرتا ہے جو لوگ باہم برخلاف اور ایک دوسرے کے دشمن ہیں وہ بھی جب دل میں سوچتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بری بات ہے۔ جو چیز نہایت عمدہ اور خوب ہے وہ اتفاق ہے۔ اتفاق کر کے جو کچھ کیا جائے گا وہی عمدہ ہوگا۔ پس اس امر پر یہ خیال کر کے باہم اتفاق کرنا چاہیے اور اس اتفاق کے ذریعے سے قومی تعلیم اور تربیت حاصل کرنا چاہیے۔

"میں آپ کے لیے اپنے پروردگار سے بخشش طلب کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے اور میں آپ لوگوں سے اور جن کو آپ خدا کے سوا پکارتے ہیں۔ ان سے کنارہ کرتا ہوں اور اپنے پروردگار ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا۔

سورہ مریم ۴۷، ۴۸

چاروں عناصر

سید حامد ▽

تغلق آباد کے قلعہ کے دامن میں (جسے بنے ہوئے اب پونے سات سو سال ہو رہے ہیں)، دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی طرف سے بنایا ہوا ایک گلستان (پکنک کی جگہ) ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ پہلے "جہاں پناہ" جنگل کا ایک حصہ تھا؟ سڑک نکلی تو یہ کٹ کر الگ ہو گیا اور ڈی ڈی اے والوں نے اسے قدرتی پارک میں تبدیل کر دیا۔ اگر کوہ پیکر قلعہ کو پہاڑ تصور کیجیے تو جہاں پناہ کے اس لخت جگر کو ترائی کہنا پڑے گا۔ چالیس پچاس ایکڑ کے اس قطعہ میں جنگل بھی ہے، چٹان بھی ہے جو قلعہ کو اپنے مضبوط کاندھوں پر تھامے ہوئے ہے گھیڑے بھی ہیں، کنکر پتھر کے ڈھیر بھی ہیں اور خیابان، ہموار زمین، کیاریاں اور اشجار (جن پر ان کے نباتاتی ناموں کی چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی ہوتی ہیں) اور سینچے ہوئے سبزہ زار بھی۔ ایک جگہ چند بزرگوں نے حلقہ بنالیا ہے دائرہ وار پتھر رکھ چھوڑے ہیں، جس پر آ کر وہ صبح کو بیٹھتے ہیں، خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے، پند و نصائح کا دفتر کھلتا ہے، کتاب پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ بزرگانہ ورزشیں ہوتی ہیں، اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں پھینکے ہیں، جیسے پون چکی (ونڈ مل) چل رہی ہو۔

لیکن یہ لگ بھی ہماری گفتگو کا موضوع اور ہمارے عنوان کی منزل نہیں ہے۔ ہماری نگاہ تو ٹھہرتی ہے ان جوانوں پر جو اپنے بنائے ہوئے اکھاڑے میں آ کر کسرت کرتے ہیں، کشتی لڑتے ہیں، محنت کر کے جب تھک جاتے ہیں تو اکھاڑے سے نکل کر چشمۂ شرب کی راہ لیتے ہیں۔ یہ گوبرو لڑکے، یہ قد آور نوجوان، سینے چوڑے، کمر پتلی، شانے فراخ، ٹانگیں بھری ہوئی، گرد میں سر سے پیر تک لتے ہوئے۔ ان کے مضبوط اور سانچے میں ڈھلے ہوئے جسموں سے طاقت، اعتماد، افتخار ابلتا ہوا۔ بادۂ سرخوشی کی یہ کیفیت کہ مینا پگھلی جائے، کرتا اور کشیدہ قامت جسم کی خوبصورتی کی آگہی غالباً اس لیے ہے جانداروں کی پوری دنیا چھان ڈالیے کوئی جاندار خوبصورتی میں انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس انسان کا جو عنفوان شباب میں ہو اور جسے اپنے بدن کے توانائی اور زیبائی کے امکانات کا عملی احساس شریک حال ہو۔ جسم کے ساز کے تار بالکل اسی طرح کسے ہوں جیسے ان گھوڑوں کے جو دوڑ کے اشارے کے لیے

▽ سابق وائس چانسلر، اے ایم یو علی گڑھ ——— ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

بے تاب ہوں۔ قدرت کے جمالی ذخائر میں گھوڑا بھی خوبصورت ہوتا ہے اور شیر اور گلدار بھی، لیکن موزونی تو صرف انسان کو عطا کی گئی ہے۔

سحر کی فرحت اتر رہی تھی۔ یہ نوخیز جوان لہراتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جسم خاک سے اٹھا ہوا تھا پیلو اور جسم ساز مل کا یہ قافلہ آگے بڑھا، پاپ اٹھایا، پانی اس میں سے فوارہ آسا برآمد ہوا۔ باری باری ان تنے ہوئے بدنوں پر خاک و آب معرکہ آرا ہوئے پانی مٹی کو بہاتا چلا گیا۔ میں نے سوچا، عناصر میں سے تین تو یکجا ہو گئے ہیں، آب، باد، خاک، چوتھا یعنی آتش کہاں ہے: یہ نظر ظاہر ہی تھیں۔ کہیں تو سارا آگ کا تھا جو نوجوانوں کے رگ و پے میں خون کی حدت بن کے جو زندگی اور حرکت کی علامت ہے، کسرت اور ریاضت نے جسے اور بھڑکا دیا تھا۔ ان تابناک اور حرارت بھرے، تپتے ہوئے جسموں میں آگ دہک رہی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پانی کی چھینٹیں پڑیں گی تو چھن سے آواز ہوگی۔

انسان بنا ہے آب باد، خاک اور آتش سے حکمت کے بقول زندگی ان ہی چاروں میں ظہورِ ترتیب کا نام ہے۔ ان میں سے تین ہر وقت رواں دواں ہیں۔ ہوا ہر وقت گردش میں رہتی ہے پانی چین سے نہیں بیٹھتا، آگ سرافرازی کی دھن میں بے قابو ہو جاتی ہے، رہی خاک تو اسے کبھی ہوا اپنے دوش پر اڑا لے جاتی ہے، کبھی پانی اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ چاروں عناصر کے خواص اور مزاج کو دیکھتے ہوئے انسان کے بارے میں حکم یہی لگا سکتے ہیں کہ وہ بے تاب ہوگا، بے خواب ہوگا، بے چین ہوگا، گردش میں رہے گا، رواں دواں ہوگا۔ ایک پل بے کار نہ بیٹھے گا آرزو کی آگ جستجو کی تلاش اسے ہر وقت متحرک، ہر آن گرمِ عمل رکھے گی۔

ایسے خوب صورت بدن، ایسی خوشنما قامت ایسے سانچے میں ڈھلے ہوئے اعضا کی نگہداشت سے غفلت برتنا کفرانِ نعمت نہیں تو کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں لوگوں کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ جسم اپنی توانائی اور زیبائی کے ساتھ کتنی بڑی دولت ہے۔ اس کی دیکھ بھال، اس کی پرداخت، اس کی نشوونما ہمارا فرض ہے۔ ہم اگر اس رعنائی سے لبریز جسم کو وقت سے پہلے ڈھل جانے دیں، بدہیئت بن جانے دیں، سینہ اور کمر کے جاذبِ نظر تناسب کو الٹ جانے دیں تو ہم پر آفریں ہے۔ جانور بھی اپنے جسم کو بدقوارہ اور بدہیئت نہیں ہونے دیتے یہ تو رہی شکل و شباہت، ہم اس تندرستی کی طرف سے بھی غافل رہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی سب سے بہت نعمت ہے۔ چٹورپن، پُرخوری، بے حرکتی بے ورزشی، بے اعتدالی سے ہم تندرستی کو برباد کر دیتے ہیں۔ قدرت نے جو دلآویز اور حیرت خیز آمیزہ آب و باد و خاک و آتش کا تیار کیا ہے اس کے قوام کو ہم بگاڑ دیتے ہیں۔ خدا کی سب سے خوبصورت تخلیق، خدا کی خدائی کی افضل ترین مخلوق کو ہم سست عنصر اور کریہ منظر بنا دیتے ہیں وہ گوجر لڑکے جن کے فولاد آسا خاک آلود جسموں کو دیکھ کر زبانِ حال پکار اٹھتی ہے

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

کیا وہ بھی غفلت اور لیل و نہار کے سائے میں ایک دن اپنی آب و تاب کھو دیں گے۔ کتنا بڑا المیہ ہوگا یہ۔

ڈاکٹر ذکی الدین

علی گڑھ کا ایک ممتاز سائنسداں

مختار الدین آرزو ∇

ڈاکٹر محمد ذکی الدین، آرہ ضلع شاہ آباد (اب بھوج پور) بہار کے ایک ممتاز خاندان کے رکن تھے۔ ان کے والد کا نام محمد محسن الدین تھا۔ ذکی الدین ۲۳ فروری ۱۹۰۹ء کو آرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آرہ ضلع اسکول میں حاصل کر کے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آ گئے جہاں سے انھوں نے بی ایس سی اور ۱۹۳۱ء میں طبیعیات میں ایم ایس سی کیا۔ دونوں امتحانوں میں وہ علی گڑھ میں اول آئے اور بی ایس سی اور ایم ایس سی دونوں میں انھوں نے یونیورسٹی سے طلائی تمغے حاصل کیے۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک انھوں نے شعبۂ طبیعیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ ڈاکٹر E. Samuel کی نگرانی میں ریسرچ کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر Ross Masood نے ۲۳ دسمبر ۱۹۳۳ء کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر جو رپورٹ پڑھی تھی، اس کی دو سطریں یہ ہیں۔

> میں شعبۂ فزکس کے صدر ڈاکٹر سموئیل کو ڈاکٹر ذکی الدین کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں جنھیں طبیعیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کا تفویض ہوئی۔ ڈاکٹر ذکی الدین اس یونیورسٹی کے دوسرے طالب علم ہیں جنھیں ڈاکٹریٹ ملی ہے۔ وہ اب جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔
>
> (یونیورسٹی رپورٹ بابت ۱۹۳۳ء، ص ۷)

علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ ملنے کے بعد ہی انھیں جرمنی کی Alexander Von Humboldt فیلوشپ تفویض ہوئی اور وہ جرمنی چلے گئے۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۵ء تک وہ برلن یونیورسٹی میں رہے جہاں وہ عملی و نظری طبیعیات کے ایم ایس سی آنرز کے امتحان میں اول آئے۔ یونیورسٹی کے قیام کے دوران وہ طبیعیات کے متعدد علما سے مستفید ہوئے۔ جرمنی سے انھوں نے ڈی۔فل حاصل کی۔ انھیں مشہور ماہر طبیعیات رائٹ آنریبل لارڈ رتھر فورڈ نے رائل سوسائٹی مونڈ لیبوریٹری انگلستان سے ریسرچ گرانٹ دلوا دی۔ وہ یونیورسٹی کالج کیمبرج میں داخل ہوئے اور انھیں کی نگرانی میں Helium II پر تحقیقی کام کر کے قابل قدر نتائج حاصل کیے۔

∇ سابق صدر شعبۂ عربی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ —— دودھ پور، علی گڑھ

ان کے اساتذہ میں لارڈ رتھرفورڈ، پروفیسر
[illegible] بان یونیورسٹی، پروفیسر H. Kayser
اور پروفیسر [illegible] قابل ذکر ہیں۔ علی گڑھ
اور ان کی جامعات میں انھوں نے Molecules
Low Temperature پر اور کیمبرج میں Spectra
[illegible] Physics and magnetic
properties of metals at very low
temperature پر قابل ذکر تحقیقی کام کیے۔
ان کے کچھ مضامین رائل سوسائٹی دی لندن کی
پروسیڈنگس اور سائنسی مجلہ Nature میں چھپے
اور Kayser's Handbuch der Spectroscopie —
میں بھی ان کے تحقیقی مضامین شائع ہوئے
ان کا ایک تحقیقی مقالہ Band spectra and
Polyatomic molecules بان یونیورسٹی پریس سے شائع
ہوا۔

ڈاکٹر ذکی الدین غالباً ۱۹۳۶ء میں یورپ سے
علی گڑھ واپس آئے اور شعبۂ طبیعیات میں لکچرر ہو گئے
آفتاب کی شعاعوں کی تحقیق سے انھیں علی گڑھ میں دلچسپی
پیدا ہوئی۔ یہ یورپ میں بھی رہی وہاں سے واپسی کے
بعد بھی۔ انھوں نے Cosmic Rays پر ۱۲ فروری
کو ایک لکچر دیا جس کا خلاصہ مسلم یونیورسٹی گزٹ (۱۸ مارچ
۱۹۳۸ء) میں ساڑھے تین کالموں میں چھپا تھا۔ ان
کے نام کے ساتھ ایم ایس سی، ایم ایس سی آنرز، پی ایچ ڈی
ڈی فل (ٹرینٹی کالج، رائل سوسائٹی، مونڈ لیبوریٹری
کیمبرج یونیورسٹی) لکھا ہوا ہے۔ اس زمانے میں گزٹ
کے اڈیٹر ڈاکٹر سید ظفر الحسن صدر شعبۂ فلسفہ اور
اسسٹنٹ اڈیٹر رحم علی الہاشمی تھے۔ وہ ۲۱ جولائی ۱۹۳۹ء
کو شعبۂ طبیعیات میں لکچرر کی جگہ پر مستقل کیے گئے۔
(گزٹ یکم اگست ۱۹۳۹ء)

انھوں نے علی گڑھ سائنٹفک مونوگرافس کی
اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اسی عنوان سے اس
کی تفصیلی رپورٹ ۱۵ جنوری ۱۹۴۳ء کے گزٹ میں
شائع ہوئی ہے جس میں ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء کے مرتب
کیے ہوئے چھ کتابچوں کا ذکر ہے۔ بعض مضامین میں
پروفیسر [illegible] (پیمبروک کالج کیمبرج)
اور پروفیسر H. Kayser (بون یونیورسٹی)
کے بعض سائنسی تحقیقات پر ڈاکٹر ذکی الدین کے اعتراضات
ہیں اور ان دونوں کے بعض مسامحات کی تصحیح۔ تیسرے
کتابچے میں ان کے تین اور چوتھے میں ان کے چار مقالات
ہیں۔ پانچویں کتابچے میں ان کے تصنیف کردہ چھ مقالات
یا کتب کا ذکر ہے۔

۱۔ سائنس کیا ہے حصہ اول
۲۔ سائنس کیا ہے حصہ دوم
۳۔ یورپ کے چند علمائے سائنس حصہ اول
۴۔ یورپ کے چند علمائے سائنس حصہ دوم
۵۔ لارڈ رتھرفورڈ۔ یہ کتاب ان کی زندگی اور
ان کے سائنسی کارناموں پر ہے۔
۶۔ مرآیات

کتابچہ ۶ میں رسالۃ فی المرآۃ المحرقۃ
للکندی

گزٹ کے اسی شمارے میں اطلاع ہے کہ
میتھمیٹک سائنس کانگریس ۱۹۴۳ء کی پروسیڈنگ میں
ان کے مضمون Calcium Fluoride کا خلاصہ
شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر ذکی الدین کی
تصانیف و مقالات علی گڑھ میں محفوظ کرنے کی کوشش
نہیں کی گئی۔ مندرجہ بالا تحریرات کا کوئی نسخہ نہ شعبۂ
طبیعیات کے سیمینار لائبریری میں ملا اور نہ تلاش کے
باوجود آزاد لائبریری میں۔ سیمینار میں تو پروفیسر

حیدالظفر چغتائی کی سعی و تلاش کے باوجود ان کا
نرز کا ایک ورق بھی نہیں ملا۔ مرحوم نے اردو میں
بھی لکھا ہے اور انگریزی میں بھی۔ لائبریری میں صرف
[illegible] Book of [illegible] کا ایک نسخہ
پروفیسر نورالحسن خاں صاحب کی توجہ اور نورالدین بھائی
صاحب کی تلاش سے دستیاب ہوا۔ یہ کتاب دو
حصوں (صفحات ۳۱ + ۴۸) علی گڑھ سے ۱۹۴۱ء میں
شائع ہوئی تھی۔ جناب میرالٰہی صاحب کی مہربانی سے
ڈاکٹر ذکی الدین کا ایک مضمون "سائنس کیا ہے"
دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے
رسالے ہندوستانی (اکتوبر ۱۹۴۰ء) میں شائع
ہوا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ذہین لوگ کم جیتے ہیں۔ وہ
۱۶ مارچ سے ۹ اپریل ۱۹۴۴ء تک ۲۵ دنوں کی
فرصت لے کر اپنے وطن گئے ہوئے تھے۔ ۹ اپریل
کو انھیں علی گڑھ واپس آنا تھا۔ اس سے پہلے ہی
یونیورسٹی کو ایک تار موصول ہوا کہ وہ ۲ اپریل ۱۹۴۴ء
کو آرہ میں وفات پا گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر
صرف ۳۶ سال کی تھی۔ ان کے استاد لارڈ رتھرفورڈ
بھی جواں مرگی کا شکار ہوئے۔

ان کی وفات کی خبر یونیورسٹی میں فوراً پھیل گئی
جس نے سنی اس نے ان کی جواں مرگی پر اظہار افسوس
کیا۔ یونین ہال میں پروفیسر سید ظفر الحسن کی صدارت
میں تعزیتی جلسہ ہوا جس میں صدر نے تعزیت کی
تجویز پیش کی۔ یونیورسٹی کی طرف سے خلیل احمد مراد
لکچرر شعبہ طبیعیات نے اور یونین کی طرف سے اس کے
سکریٹری خالد علی نے ان کی زندگی اور ان کے کارناموں
پر روشنی ڈالی۔ سشا مہا ساج (متعلم بی ایس سی انجینئرنگ
فرسٹ ایئر) نے ان پر ایک خوبصورت انگریزی نظم
لکھی جو گزٹ (مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۴۴ء) میں ان کی وفات
کی خبر کے ساتھ شائع ہوئی۔ ایک مضمون بھی چھپا جس
کی حسب ذیل سطریں قابل ذکر ہیں:

"He was an outstanding Muslim scientist and showed every promise of occupying a very distinguished place among the scientists of international fame."

ڈاکٹر ذکی الدین سے غائبانہ تعارف اس سلسلے
مکاتبات سے ہوا جو ان کے اور والد مرحوم مولانا ظفر الدین
قادری (۱۸۸۵ء - ۱۹۶۲ء) کے درمیان کچھ دنوں
تک رہا۔ والد مرحوم متحدہ ہندوستان کے ان چار پانچ
علماء میں تھے جو علم ریاضی و ہیئت و فلکیات کے ماہروں
میں شمار کیے جاتے تھے۔ ذکی الدین مرحوم کے اردو
میں لکھے ہوئے ان خطوط کے مطالعے کا اتفاق بعد کو ہوا
اور مسائل کے علاوہ انھوں نے یعقوب ابن اسحاق
الکندی (متوفی ۲۵۷ھ) کی کتاب الشعاع کے بارے
میں والد مرحوم سے تشریحات چاہی تھیں جس کا نسخہ
منحصر بفرد کتب خانہ خدا بخش میں محفوظ ہے۔ انھوں
نے اس کی نقل طلب کی تھی اور متعدد خطوط میں اس
بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ چونکہ وہ عربی سے واقف
نہیں اس لیے وہ اس کتاب کا اردو ترجمہ ان کے
لیے تیار کردیں جسے وہ اپنے مقدمے کے ساتھ انگریزی
میں شائع کرسکیں۔ مخطوطے کی عکسی نقل تو انھیں فراہم
کردی لیکن لکھا گیا۔ ایک نہایت اہم سائنسی موضوع پر

ایک کتاب کی اس طرح اشاعت مفید نہ ہوگی.
عربی سے اردو اور پھر اردو سے انگریزی زبان میں
منتقل کرنے سے اس بات کا خدشہ ہے کہ مفاہیم و
مطالب کچھ سے کچھ ہو جائیں اور الکندی کے اصل تصور
سے انحراف۔ والد مرحوم نے انھیں کہا کہ بہتر شکل یہ
ہوگی کہ آپ پڑھ آکر یہ کتاب سبقاً سبقاً مجھ سے پڑھ
لیں، اس کے مطالب ذہن نشین کر لیں اور پھر سکون
خاطر اور توجہ سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں۔ یہ باتیں
مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئیں جب میں علی گڑھ سے گرما
کی تعطیلات میں پٹنہ گیا اور والد مرحوم سے ڈاکٹر ذکی الدین
سے ملاقات کا میں نے ذکر کیا۔
کتاب الشعاع کا انھوں نے انگریزی میں ترجمہ
کیا یا نہیں مجھے نہیں معلوم لیکن جب وہ جرمنی گئے ہیں تو
اس کا عکس ان کے پاس موجود تھا۔
یہ بات ان کی وفات کے کوئی تیس سال بعد
حلب (سوریہ) کی ایک کانفرنس میں پروفیسر محمد یحییٰ
الہاشمی سے معلوم ہوئی جو جامعہ بون (جرمنی) میں ان کے
معاصر تھے۔

ڈاکٹر محمد ذکی الدین، پروفیسر سید ظفر الحسن
صدر شعبۂ فلسفہ کے چہیتے شاگرد ڈاکٹر محمد محمود
احمد (لکچرر شعبۂ فلسفہ) کے قریب ترین دوستوں
میں تھے اور انھیں کے ساتھ رہتے تھے۔ شبلی روڈ
پر غالباً سر راس مسعود کے زمانے میں دو بہت نفیس
اور وسیع کوٹھیاں تعمیر ہوئی تھیں۔ ممکن ہے پہلے
اس میں یونیورسٹی کا یورپین اسٹاف رہتا ہو۔ جس
زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں (۱۹۴۳ء - ۱۹۴۵ء)
۱۔ شبلی روڈ میں سر سید کے ایک عزیز اور آکسفرڈ
کے تعلیم یافتہ اور میرے شفیق استاد ڈاکٹر سید عابد
احمد علی (ریڈر شعبۂ عربی) رہا کرتے تھے۔ بعد کو اس میں
پروفیسر این۔ سی۔ سہا (انجینئرنگ کالج) رہے آج
کل اس میں پبلک اسکول قائم ہے۔ ۲۔ شبلی روڈ
ڈاکٹر محمد محمود احمد اور ڈاکٹر ذکی الدین کا مسکن تھا
بہت بعد کو اس میں پروفیسر گل (صدر شعبۂ طبعیات)
پروفیسر ضیاء الدین انصاری (پرنسپل انجینئرنگ کالج)
پروفیسر عبد الوحید قریشی (شعبۂ تاریخ) اور آخر میں
پروفیسر محمد انس (شعبۂ جغرافیہ) آکر رہے۔ اب اس
میں یونیورسٹی کا کوئی دفتر آگیا ہے۔
میں جب ڈاکٹر محمد محمود احمد سے جو میرے عزیز
تھے اور کلاس میں اخلاقیات پڑھاتے تھے، ملنے آتا
تو اکثر باہر کے برآمدے میں ڈاکٹر ذکی الدین کو بیٹھا
کوئی کتاب پڑھتے دیکھتا۔ ان سے بہت دنوں تک
معاملہ صرف علیک سلیک تک رہا۔ میں انٹرمیڈیٹ
کا طالب علم تھا اور وہ بھی آرٹس کا۔ ان سے گفتگو کیا کرتا!
وہ کم آمیز اور خاموش طبع آدمی تھے۔ گورے، خوبصورت
اور وجیہہ۔ انھیں گھر پر ہمیشہ کرتے پاجامے میں ملبوس
دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ رہتی تھیں اور زیادہ تر
سیاہ عینک لگائے رہتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ
شعبۂ طبعیات کے معمل میں X Rays (شعاعوں) پر
عملی کاموں کی کثرت سے ان کی بینائی متاثر ہوگئی تھی۔
عبد الشاہد خاں شروانی (لٹن لائبریری) مجھ سے مولانا
راغب بدایونی کا قول نقل کرتے تھے کہ
"اسے میری بد دعا لگی ہے اور وہ
بہت جلد مر جائے گا۔"
یہ پیش گوئی افسوس ہے کہ صحیح ثابت ہوئی لیکن یہ قصہ
تفصیل چاہتا ہے۔ پھر کبھی سہی۔
ڈاکٹر ذکی الدین نامور اسکالر اور کامیاب استاد
تو تھے ہی۔ وہ بہت اچھے اخلاق اور مضبوط کردار کے بھی

مالک تھے۔ علی گڑھ سے محبت کرتے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے اپنی گہری دلچسپی کی بنا پر اپنے حلقۂ احباب میں بہت اچھی شہرت رکھتے تھے۔ ممکن ہے ڈاکٹر محمود احمد کی صحبت کا بھی اس میں دخل ہو۔ علی گڑھ کے طلبا کی تربیت بھی کا ذوق و شوق تھا کہ جب پروفیسر ابوبکر احمد حلیم (جو ۱۸ سال تک مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر رہے) ان دونوں کو ہوسٹل کی وارڈن شپ پیش کی تو دونوں نے اپنے علمی و تحقیقی شغف کے باوجود اس ذمہ داری کو قبول کر لیا اور جب تک وہ اس عہدے پر مامور رہے اپنے فرائض بوجوہ احسن انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر ذکی الدین شعبۂ طبیعیات میں ۲۱ جولائی ۱۹۳۹ء کو دو سال کے لیے ایس ایس ویسٹ کے مقیم وارڈن مقرر ہوئے (گزٹ یکم اکتوبر ۳۹ء)۔ میرا قیاس ہے کہ اپنی دو سالہ وارڈن شپ کی مدت کی تکمیل کے بعد وہ ۳ شبلی روڈ کو منتقل ہو گئے ہوں گے۔ اپنی حسن کارکردگی کی بنا پر وہ بعد کو وقار الملک کے ہیرس ہوسٹل کے وارڈن مقرر ہوئے جس پر تاحیات وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۴۴ء کے اوائل میں وہ علی گڑھ میں علیل ہوئے۔ علالت بڑھی تو وہ علاج اور آرام کے لیے اپنے وطن چلے گئے۔ (گزٹ ۵ اپریل ۴۴ء) سے اطلاع ملتی ہے کہ ۴ مارچ سے ۹ اپریل تک کی انھوں نے رخصت لی۔ اس دوران میں ان کی جگہ نصیر خاں صاحب (لکچرر شعبۂ جغرافیہ) ہیرس ہاسٹل کے وارڈن کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۹ اپریل کو انھیں علی گڑھ واپس آنا تھا کہ ۲ اپریل ۴۴ء کو انھیں خدا کا بلاوا آ گیا اور وہ ایسی جگہ چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

۳ اپریل کو میں محمود بھائی کے پاس ۳ شبلی روڈ میں پہنچا تھا کہ آرہ سے تار کے ذریعے ڈاکٹر ذکی الدین کی سانحۂ وفات کی خبر آ گئی۔ وہ بڑے صبر و ضبط اور تحمل کے انسان تھے لیکن تار پڑھ کر غم و اندوہ سے ان کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ اپنے حقیقی بھائی کی وفات پر جس قدر صدمہ انھیں ہوتا شاید اس سے کچھ زیادہ ہی انھیں صدمہ ہوا۔ ذکی الدین مرحوم ان کے بھائی بھی تھے، جگری دوست بھی اور برسوں کے رفیق بھی۔ زندگی بھر کا ساتھ اب چھوٹ گیا تھا اور ڈاکٹر محمود احمد یکہ و تنہا رہ گئے تھے۔

جب ان کی حالت کچھ دنوں کے بعد قدرے اعتدال پر آئی تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شعبۂ طبیعیات سے ان کی کتابیں اور کاغذات منگوائے۔ اپنے شاگرد شہاب الدین محمد منفی اور راقم الحروف کے ساتھ مل کر ان کے کمرے سے کتابیں، سائنس کے ان مضامین یورپ کے علماء کے سائنسی مقالات کے آف پرنٹس اور دوسرے ضروری کاغذات جمع کیے۔ گھر سے ان کا ذاتی سامان علیحدہ کیا۔ ان کا ٹنک کا فرنیچر بڑے اہتمام سے پیک کرایا اور ریل کے ذریعے ان کے اعزہ کو بھجوا دیا۔ کتابیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا علمی ذوق صرف سائنس تک محدود نہ تھا۔ وہ خاصے وسیع المطالعہ آدمی تھے۔ اردو، انگریزی اور جرمن کی کتابیں مختلف موضوعات پر تھیں۔ عالمی سیاست پر خاصی کتابیں تھیں۔ جرمن زبان میں نازی لٹریچر بھی تھا۔ مسلم لیگ اور پاکستان تحریک کی اردو، انگریزی کتابیں اور پمفلٹ بھی تھے۔ اگرچہ سیاست سے ان کی عملی دلچسپی برائے نام بھی نہیں تھی۔

ڈاکٹر ذکی الدین کے بزرگوں میں پروفیسر ابوبکر احمد حلیم، پروفیسر سید ظفر الحسن اور دوستوں میں ڈاکٹر اظہار الحق حقی، ڈاکٹر افضال حسین قادری اور ڈاکٹر

سید محمد سلیم صاحب (شعبۂ تاریخ) کے نام خاص طور پر یاد آتے تھے۔[1]

پروفیسر سلیم، تقسیم ہند سے پہلے ہی سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر کراچی چلے گئے۔ پروفیسر سید ظفر الحسن پنجاب کے رہنے والے تھے، وہ غالباً تقسیم ہند کے بعد لاہور منتقل ہوئے۔ ڈاکٹر افضال حسین قادری بدایوں کے تھے اور آل احمد سرور صاحب کے عزیز۔ وہ کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے اور علی گڑھ میں شعبۂ حیوانیات کے استاد۔ بعد کو کراچی گئے اور یونیورسٹی میں پروفیسر اور پھر فیکلٹی آف سائنس کے ڈین مقرر ہوئے۔ انھوں نے کراچی میں ۲۶ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو وفات پائی۔ ڈاکٹر سید محمد سلیم کا وطن مونگیر بہار ہے۔ پروفیسر محمد حبیب کے خاص شاگردوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ انھی کی نگرانی میں صوفیائے چشت پر انھوں نے ڈاکٹریٹ لی۔ وہ راقم الحروف، جمال یوسف خواجہ (جو بعد کو صدر شعبۂ فلسفہ اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ہوئے) اقبال محمد شفیع (لفٹننٹ کرنل پھر بریگیڈیر ہوئے) کو تاریخ اسلام پر لکچر دیتے تھے۔ ڈاکٹر سلیم صاحب علی گڑھ میں اپنی حق گوئی، راست گفتاری، ہمت اور حرارتِ ایمانی کے لیے مشہور تھے۔ ایسے اوصاف رکھنے والے شخص کی ہندوستان اور خاص طور پر علی گڑھ میں ضرورت تھی لیکن پروفیسر حلیم نے انھیں کراچی یونیورسٹی بلا لیا اور وہ استاد کے حکم کی تعمیل میں وہاں چلے گئے جہاں وہ شعبۂ تاریخ کے صدر ہو کر متقاعد ہوئے۔

کئی برس گزرے، کراچی گیا تو اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ کوئی چالیس سال کے بعد ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہی حق گوئی، وہی راست بازی، انقلابِ زمانہ کے بعد بھی ان میں پائی۔ وہاں کے ناموافق حالات بھی اُن کی حرارتِ ایمانی کو ٹھنڈا نہیں کر سکے۔ کچھ اندازہ ایسا ہوا کہ ملک کے حالات ان کے خوش گوار تصورات کا ساتھ نہیں دے سکے اور وہاں کے اکثر اربابِ اقتدار ان کے توقعات پر پورے نہیں اترے۔ میں نے انھیں کچھ ملول اور دل شکستہ پایا۔ اس طویل عرصے میں وہ ہندوستان اور اپنے وطن کو نہیں بھولے اور علی گڑھ تو ہمیشہ ان کے دل میں دھڑکتا رہا۔ دیر تک وہ پرانے علی گڑھ کا ذکر کرتے رہے اور نئے علی گڑھ کا احوال پوچھتے رہے۔ جب میں اُن سے رخصت ہونے لگا تو وہ دل گرفتہ تھے اور اُن کی آنکھوں میں آنسو، جو ضبط کرنے پر بھی بے اختیار نکل آئے تھے۔

اپنے احباب میں جو لوگ انھیں بہت یاد آتے رہے ان میں علی گڑھ میں مقیم ان کے رفقائے شعبہ پروفیسر سید انوار الحق حقی، پروفیسر عبدالواحید قریشی اور مرحوم ڈاکٹر محمد ذکی الدین تھے۔

---

[1] ڈاکٹر ذکی الدین مرحوم کے دوستوں میں خلیل مراد مرحوم کا ذکر بھی ضروری ہے، جو اُن کی بہت قدر کرتے تھے۔ یہ سائنس کے موضوع پر متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ فنِ تعمیر سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ میرس روڈ پر ان کی تعمیر کردہ "خلیل منزل" ان کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

جھوٹ بولنا اور جھوٹی قسمیں کھانا

محمد مختار اصلاحی ▽

حقیقت اور واقعہ کے خلاف جو بات کہی جائے
لسل سے ظاہر کی جائے اسے "جھوٹ" کہتے ہیں۔ یہ
انیت بُری عادت ہے۔ جو شخص اصل اور صحیح بات نہیں
اتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سب کو دھوکے میں رکھتا
۔ ایسے شخص کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ اس نے تو وہ
ئینہ ہی توڑ ڈالا جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا تھا۔
ٹ بولنے والے کو کسی بھی بُرے کام کے انجام دینے
ں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اسے اس
ت کا یقین ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول کر ہر برائی کو چھپالے
ا۔ سارے مذاہب اور تمام دانش وروں کے نزدیک
بہت سی خرابیوں کی جڑ اور برائیوں کی ماں ہے۔ قرآن
ید میں کئی جگہ اس کی سخت مذمت آئی ہے اور
ں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے مگر اس حقیقت کو
ہیں جھٹلایا جاسکتا کہ ہر طرح کی ملامت اور پھٹکار کے
وجود دنیا کی تمام برائیوں میں جھوٹ سب سے زیادہ
ائج ہے۔

جھوٹ کی دو بڑی قسمیں ہیں:
قولی اور عملی

- قولی تو وہ ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہ ہو۔ یا حقیقت اور واقعہ کے خلاف ہو۔

۲۔ عملی وہ ہے جو کیا جائے اسے نہ کیا جائے۔

جھوٹ کے کئی درجے ہیں:

۱۔ کچھ جھوٹ تو ایسا ہے کہ بے ضرر سمجھتے ہوئے لوگ اسے بلا تکلف بولتے ہیں جیسے بچوں کو بہلانے کے لیے عام طور سے جھوٹے وعدے کیے جاتے ہیں کچھ جھوٹ بچوں سے کہلوائے جاتے ہیں جیسے گھر پر خود موجود ہوں گے اور بچوں سے کہلادیں گے کہ نہیں ہیں۔

۲۔ کچھ جھوٹ کہانیوں اور قصوں میں، کچھ ہنسی مذاق اور خوش گپیوں میں شامل کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کبھی میاں بیوی ایک دوسرے کو خوش کرنے یا قابو میں رکھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا کرتے ہیں۔

۴۔ بعض رسمی طور پر جھوٹ بول لیا کرتے ہیں کھانے پر بلایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ بھوک نہیں ہے یا کھانا کھا کر آیا ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

۵۔ کچھ لوگ جان کر انجان بن جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں

▽ اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ، بمبئی

وعدہ کر کے پورا نہیں کرتے۔

۶۔ بعض اشخاص اپنے کو وہ ظاہر کرتے ہیں جو وہ ہوتے نہیں۔ جیسے کوئی عالم نہ ہو اور اپنے کو عالم بتائے۔

۷۔ جھوٹ یہ جو کچھ بھی سُنے بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے۔

۸۔ ایک شخص کسی کو سچا اور قابل اعتبار سمجھ کر اس کی بات کا یقین کرے لیکن وہ اس یقین سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔

۹۔ کچھ جھوٹ لوگوں کے حقوق غصب کرنے اور عزت آبرو کو نقصان پہنچانے کے لیے بولا جاتا ہے۔

۱۰۔ بہت سے لوگ ضرورتاً اور بلا ضرورت جھوٹی قسمیں کھایا کرتے ہیں۔

کسی درجے کا بھی جھوٹ ہو نقصان سے خالی نہیں بعض تو نہایت خطرناک نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

۱۔ بچوں کے ساتھ کسی طرح کا بھی جھوٹ بولنا گویا جھوٹ کو بچوں کی گھٹی میں شامل کرنا ہے۔

۲۔ کہانیوں، افسانوں اور فلموں میں جھوٹ کی جو ملمع سازی کی جاتی ہے اُن کا بھی ذہن و دماغ پر نہایت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح ہنسی مذاق میں جو جھوٹ بولے جاتے ہیں بسا اوقات ان کے بھی نہایت خطرناک نتیجے نکلتے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ایک ملاقاتی نے اپنے بیٹے کا ایک دردناک واقعہ سنایا تھا کہ ان کا ذہین بچہ جو ہمیشہ اپنی کلاس میں اول آیا کرتا تھا، مذاق میں اس کے ایک ساتھی نے فیل ہونے کی خبر دے دی۔ اس بُری خبر کا اس پر ایسا جھٹکا لگا کہ تصدیق کیے بغیر اس نے کوئی زہریلی دوا کھالی گھر والوں کو معلوم ہوا تو فوراً اسپتال لے گئے۔ فوری علاج سے طالب علم کی جان بچ گئی۔ خدا کا فضل شامل نہ ہوا ہوتا تو خودکشی کرنے والے کے ساتھ ہی خودکشی کا سبب بننے والے کو بھی بڑی کڑی سزا بھگتنی پڑتی۔

۳۔ میاں بیوی کے وہ تعلقات جو جھوٹی بنیادوں پر قائم کیے جاتے ہیں وہ کبھی مستحکم و مضبوط نہیں ہوتے۔

۴۔ رسمی جھوٹ بھی نقصان سے خالی نہیں اور قدر و منزلت کو بھی کم کر دیتا ہے۔

۵۔ جان کر انجان بننا اور وعدہ کر کے پورا نہ کرنا یہ جھوٹ کا ایسا درجہ ہے جس میں انسان کی ذلت و رسوائی لازمی ہے۔

۶۔ جو لوگ وہ نہیں ہوتے جو اپنے کو ظاہر کرتے ہیں، چونکہ حقیقت زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہتی جب وہ ظاہر ہو جاتی ہے تو ایسے لوگ عوام کی نظروں سے بالکل گر جاتے ہیں۔

۷۔ جو افواہوں پر کان دھرتے ہیں اور بلا تحقیق دوسروں تک پہنچاتے ہیں وہ کبھی ایسے شکنجے میں پھنس جاتے ہیں کہ پھر اس سے چھٹکارا پانا ان کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔

۸۔ جو لوگ اپنا اعتبار قائم رکھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ اپنا اعتبار بہت جلد کھو دیتے ہیں۔

۹۔ کسی کے حقوق کو غصب کرنے اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے کے لیے جو جھوٹ بولا جاتا ہے۔ اس کے بھی اکثر انتہائی خطرناک نتائج نکلتے ہیں۔

۱۰۔ جو شخص قسمیں کھاتا ہے۔ وہ اپنی بات کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے۔ یہ بڑی اہم اور غیر معمولی بات ہے۔ پھر اگر قسم جھوٹی ہے تو یہ

جھوٹ کی بد ترین صورت یہ ہے کہ جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ تجارت میں جھوٹی قسمیں کھا کر چیزیں بیچتے ہیں وہ اپنی تجارت کو خیر و برکت سے محروم کر دیتے ہیں اور پھر وہ بددیانتی، ہیرا پھیری اور گھاٹے کا شکار ہو جاتی ہے۔

جھوٹ کے اور بھی بہت سے نقصانات ہیں:

ا - جھوٹ ایسی دیمک ہے جو سچائی کو چاٹ جاتی ہے اور ایسا زہر ہے جو انسان کی خوبیوں کو پامال کر دیتا ہے۔

ب - جھوٹا آدمی کسی بلند درجے پر نہیں پہنچ سکتا۔

ج - جھوٹے شخص کا اعتبار نہیں کیا جاتا اگر وہ سچ بھی بولتا ہے تو لوگوں کو یقین نہیں آتا۔

د - ایک جھوٹ چھپانے کے لیے اور بھی بہت سے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

ہ - جھوٹ کے نتیجے میں بہت سے ملک برباد اور خاندان تباہ ہو گئے۔

خدا کے جتنے بھی نبی و پیغمبر آئے سبھی جھوٹ کی لعنت سے محفوظ رہے اور یہی ان کی کامیابی و کامرانی کا باعث بنا۔ روم کے قیصر نے اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کے نبی کیا نبوت کے دعویٰ سے پہلے جھوٹ بولا کرتے تھے؟

ابوسفیان نے جواب دیا

نہیں۔

قیصر نے کہا کہ

جو شخص بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ پھر خدا پر جھوٹ باندھنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔

جھوٹ ہمیشہ انسان کو ذلیل و رسوا کرتا ہے اس کے برخلاف سچائی میں وہ طاقت و قوت ہوتی ہے جو دلوں کو فتح اور عزت و وقار کو بلند کرتی ہے۔ ہر سمجھدار و معقول آدمی جھوٹ کے شر و فساد سے پناہ مانگتا ہے۔

مشہور شاعر میر تقی میر فرماتے ہیں —

اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اٹھا کیے
ہنگامہ و فساد بھی پر شور رہا کیے
اے جھوٹ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے
اے جھوٹ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے

تدارک:

جھوٹ کی عادت جب گھر کر جائے تو آسانی سے دور نہیں ہوتی لیکن مسلسل توجہ و تربیت اور اچھی صحبت سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بچوں کو شروع ہی سے جھوٹ کے نقصانات بتا کر سچ بولنے کی عادت ڈالی جائے اور سچ بولنے پر انہیں کبھی کبھی انعامات و اکرامات سے بھی نوازتے رہنا چاہیے۔ اس طرح بچوں کے دل میں سچائی کی اہمیت و عظمت بڑھ کر جھوٹ سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ماں باپ اور اساتذہ کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہیں اگر یہ اپنے فرائض پوری توجہ سے ادا کرتے ہیں۔ تو یقیناً اس کا نہایت شاندار نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ خراب لٹریچر اور غلط برے ماحول سے بچوں کو بچانا بہت ضروری ہے کیونکہ جھوٹ کے جراثیم وہاں نہایت آسانی سے مل جاتے ہیں۔

آج کل جھوٹے و سچے کی پہچان کے لیے

یہ آلہ کذب شناسی [illegible] ممالک کے استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں ابھی کم اور ترقی یافتہ ملکوں میں کثرت سے مستعمل ہے یہ آلہ جھوٹ بولتے وقت انسان میں جو ہیجانات پیدا ہوتے ہیں انہیں ظاہر کر دیتا ہے۔ اس کی مدد سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ اب تک جو کذب شناس بنائے گئے تھے وہ انسان کے جسم سے لگائے جاتے تھے۔ اب نئے کذب شناس کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ اسے دور رکھ کر بھی جسمانی تغیرات معلوم کر لیے جاتے ہیں۔ عدالت میں گواہوں کے بیانات کے وقت اور جاسوسی ڈپلومیسی میں بھی یہ آلہ کارآمد ثابت ہو رہا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے ایک ایسے آلے کی جس کی مدد سے انسان جھوٹ بول ہی نہ سکے۔

" اے لوگو! میں انصار کے معاملے میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اس طرح کم ہو جائیں گے جیسے کھانے میں نمک۔ وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا ہے۔ وہ میرے جسم میں بمنزلہ معدے کے ہیں جو تمہارے نفع و نقصان کا متولی ہو۔ اس کو چاہیے کہ ان میں جو نیکوکار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا ہوئی ہے ان کو معاف کرے "

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

زمین دوز آب

ریاض الدین احمد ▽

یانی ہمارا چولی دامن کا ساتھی ہے۔ ہمارے جسم کے
ن کا پہلے حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ کھانے کے مقابلے میں
ی اگر نہ ملے تو انسان کو دس گنا پہلے موت آسکتی ہے۔
ری بستیاں وہیں آباد ہیں جہاں پانی میسر ہے۔ ساری
ادت گاہیں وہیں قرار پاتی ہیں جہاں پانی کا ذخیرہ ہے
یستانوں کے دامن میں نخلستان وہیں ابھر آتے
ں جہاں پانی موجود ہے۔ سمندروں اور دریاؤں کے
ارے جھیلوں اور تالابوں کے پس منظر میں بستیاں
ں جاتی ہیں۔ چٹانوں کا سینہ چیر کر آبشار اور جھرنے
ہ نکلتے ہیں۔

زندگی کی نشوونما میں پانی آبِ حیات ہے۔
پس تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے" اس
زا عطیہ والی نعمت کا خزانہ کہاں ہے، یہ مسئلہ آج بھی
ینۂ راز میں ہے۔ یہی نہیں اور بھی کتنے ہی سوالات
س بارے میں اٹھتے ہیں جن کا جواب موجودہ سائنس
ہیں دے پاتی۔ مثلاً یہ پانی کہاں سے آرہا ہے؟
ے کی ایسی افزائش کیوں؟ جانور پانی کا مقام خود بخود
یسے پہچان جاتے ہیں؟ جسم انسانی پر پانی کے کیا کیا

نا معلوم اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟ کیوں بعض چشمے
امراض کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اگر ہم کیمیاوی
تجزیے سے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا؟ کیا ماضی کے بزرگ
اس کے متعلق ہم سے زیادہ جانتے تھے؟ آج
بھی بزرگان رفتگاں کے مزاروں سے ملحق ایسے چشمے
اور تالاب ہیں جو امراض کو دور کرتے ہیں۔

زمین کا ۳/۴ حصہ پانی ہے۔ اس کی مقدار
ایک ہزار تین سو ستر (۱۳۷۰) ملین کیوبک کیلومیٹر بتائی جاتی
ہے۔ یہ کثیر المقدار پانی کہاں سے آرہا ہے ماہرین
سائنس اس کا پتہ لگانے سے ابھی تک قاصر ہیں
ایک پرانا نظریہ ہے کہ جو بھاپ خلا ارض کو گھیرے
ہوئے ہے وہ اوپر جاکر جم جاتی ہے اور بالآخر پانی
کی شکل میں برس پڑتی ہے۔ یہ فارمولا اب فرسودہ
ہو چکا ہے۔ کیونکہ ماہرین ارضیات کا تجزیہ یہ ہے
کہ زمین کی موجودہ کشش اس قدر پانی کی مقدار کے
واسطے جو دنیا میں موجود ہے ایک لاکھ گنا کم ہے اور
ہمارے سمندروں میں پانی اس سے کہیں زیادہ
ہے جو بھاپ بن کر برستا ہے۔ نیز یہ کہ آسمانی پانی

▽ نور اللہ روڈ۔ الہ آباد۔ یو۔پی

میں شامل ہوتا ہے اور سمندری پانی میں کھارا پن پایا جاتا ہے۔ یہ کھارا پن ان معدنیات کی وجہ سے ہے جو دامن کہسار سے رگڑ کھا کر سمندر میں داخل ہوتے ہیں لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ سمندری پانی میں ایسے اجزا بھی موجود ہیں جو آتش فشانوں میں پائے جاتے ہیں۔

جدید ترین نظریے کے مطابق یہ پانی سخت [illegible] براعظموں کی ضمنی پیداوار ہے کیونکہ زمین کی وہ سطح جسے مینٹل Mantle کہتے ہیں سمندر کے نچلے حصے سے ۱۵۰۰۰ پندرہ ہزار کلو میٹر نیچے ہے۔ یہیں براعظموں کی پلیٹیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور یہی آتش فشاں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں سے ایک تازہ رقیق مادہ مینٹل Mantle سے گزرتا ہوا چھ سو کلو میٹر اوپر اٹھتا ہے۔ اس میں پانی کا وہ حصہ بھی شامل ہوتا ہے جو نتھر کر سمندر میں چلا جاتا ہے۔ اس نظریے کے باوجود یہ پتہ نہیں چل سکا ہے کہ پانی کی بنیادی سطح کہاں ہے۔

اگرچہ یہ امر طے شدہ ہے کہ پانی زمین کے داخلی حصے کی کسی گہرائی سے حاصل ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے اور اس کی اصل حقیقت کیا ہے ابھی تک ایک راز بنا ہوا ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ سمندر کی سائنس ایسے اندھیرے میں چھپی ہوئی ہے کہ ماہرین کیمیا اور مصفیٰ پانی Distilled water کے کاریگر سبھی اس میں کھو جاتے ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ زمین کی تہہ میں کہیں بنیادی پانی کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ قدرتی نالیاں اس پانی کو اٹھا کر اوپر لاتی ہیں۔ یہ پانی کبھی کبھی پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر یہ ایک گنبد نما چھتری کی شکل اختیار کرتا ہے جس کی نلیاں پائپ لائن کا کام کرتی ہیں لیکن ارضیاتی سائنس کی کتابوں میں اس قسم کی کسی چیز کا ثبوت نہیں مل رہا ہے۔

پھر بھی ۱۹۷۵ء کا یہ واقعہ کافی اہم ہے کہ جب ہارلیم اسپتال Harlem Hospital نیو یارک کی توسیع کے لیے بنیاد کھودی جا رہی تھی تو یکایک پانی کا ایک ریلا آٹھ ہزار لیٹر فی منٹ کی رفتار سے اوپر کی طرف ابل پڑا۔ سخت سردی کے زمانے میں اس پانی کا درجۂ حرارت تیس ڈگری سیلسیس تھا۔ پانی، بجلی اور گیس کے ماہرین اس پانی کا پتہ لگانے میں لگ گئے لیکن کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی۔ نہ اس دھارے کا کوئی اختتام نظر آتا تھا۔ بالآخر سیمنٹ کی بڑی بڑی سلوں سے اس کا منہ بند کیا گیا۔

سارا سوال پھر بھی اپنی جگہ پر ہے کہ کبھی نہ ختم ہونے والا پانی کا ذخیرہ زمین کی کس سطح پر ہے، اس کی اصل کہاں ہے، کن راستوں سے یہ اوپر آتا ہے اور کس رفتار سے یہ پانی سمندر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور معدنیات یہاں کہاں سے آ کر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ خصوصاً یہ آتش فشانی مادہ کہاں سے آتا ہے اور کس طرح پانی میں شریک ہو جاتا ہے۔ ان سوالات کا جواب سائنس ابھی تک دینے سے قاصر ہے۔

تعلیمی اداروں کا معیارِ تعلیم

محمد اسحاق ▽

کسی محفل میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں، بچوں کی تعلیم کا ذکر چل پڑا۔ کوئی نہ کوئی صاحب یہ تبصرہ کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں کرسچین مشنری اسکول کا معیار تعلیم بہت اونچا ہے، ہمارے تعلیمی اداروں کا پست۔ کسی ہائی اسکول کا نتیجہ ہر سال صفر ہے تو کسی اور اسکول کا دس پانچ فی صد۔ برسوں سے یہ ادارے اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جس شخص کی زندگی کا سارا تعلق تعلیم ہی سے رہا ہو وہ اس بحث کا اولین مخاطب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی تعلیمی ادارے نے اس احقر کو معیار تعلیم پر کچھ کہنے کی دعوت دی لیکن ایسے وعظ و نصیحت سے معیار تعلیم اونچا ہونے کی کوئی توقع نہیں۔

کرسچین مشنری اسکولوں کی تعداد، کہا جاتا ہے کہ اس وقت سارے ملک میں چالیس ہزار کے قریب ہے ان سب اسکول بظاہر وہی نصاب، وہی زبان، وہی قابلیت کے ٹیچرس ہوتے ہیں جو ہمارے اسکولوں میں ہے لیکن معیار تعلیم میں نمایاں فرق ہوجاتا ہے۔ آخر کچھ تو بات ضرور رہی ہوگی جو ہم سے آج تک راز ہی راز رہ گئی ہے جس کا جاننا اور پانا مشکل ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کی غرض یہی ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کو پتہ چل جائے کہ آخر اس امتیاز کی وجہ کیا ہے۔

کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے کہ حیدرآباد کے ایک نامور اسکول "[illegible]" کے پرنسپل سے ایک نجی ملاقات میں بات چیت کا موقع ملا۔ میں پوچھ بیٹھا کہ آپ کا اسکول کوئی پچاس برس سے اعلیٰ معیارِ تعلیم کے لیے مشہور ہے۔ آپ کالج کیوں نہیں کھول لیتے۔ آپ کو سرکاری منظوری دلانا چند گھنٹوں کی بات ہے۔ اس لیے کہ سارے منسٹرز اور ڈائرکٹرس کے بچے آپ کے اسکول میں ہیں۔" برادر نے جواب دیا "کالج کی ہمیں کیا ضرورت ہے۔ دیکھیے اس سال انٹرمیڈیٹ میں ایک [illegible] بچے۔ ۹۰ درجہ اول آئے اور صرف دو درجہ دوم میں۔ ان میں ۲۱ میڈیکل، ۲۹ انجینئرنگ کالج، ۱۱ آئی آئی ٹی، چند زرعی کالج اور ویٹرنری وغیرہ میں شرکت کے مستحق ہوئے باقی رہنما پور یا پالی ٹیکنک میں مگر ایک تا پندرہ سرفہرست

▽ پرنسپل انڈین ہائی اسکول، الجبیل، سعودی عرب

جاسکے تو طلبا کا قبضہ ہے۔

تعلیمی معیار کا اندازہ چند باتوں سے ہوجاتا ہے۔ بچوں کے سیکھنے کی رفتار، مضامین پر ان کی گرفت، ہوم ورک کا سلیقہ، طلبا کا ذوق و شوق، اساتذہ کی دلچسپی، پبلک امتحان کے نتائج جو ہر اسکول کے معیار تعلیم کے لیے بیرومیٹر کا کام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکول کا ڈسپلن، تعلیمی مصروفیات، اسپورٹس، گیمس، ڈرامے، تقریری و تحریری مقابلوں سے طلبا کی تعلیم و تربیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ محض بچوں کے یونیفارم، وزنی اسکول بیگ، اونچی فیس اور ٹیپ ٹاپ سے یہ سمجھ لینا کہ تعلیمی معیار بہت اونچا ہوگا غلط فہمی ہے۔ البتہ یہ باتیں اسکول کے ڈسپلن اور معیار تعلیم میں معاون ہوسکتی ہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ اس اسکول سے کامیاب طلبا نے کس حد تک پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلہ لیا ہے۔ کیوں کہ اکثر فرسٹ کلاس طلبا کو آرٹس کالجس میں بھی داخلہ نہیں ملتا۔

اچھی معیاری تعلیم مہنگی ہوتی ہے، غیر معیاری تعلیم سستی ہوتی ہے۔ ویسے تعلیم "ایجوکیشن انڈسٹری" میں تبدیل ہوچکی ہے۔ اعلیٰ معیاری شئے کے لیے بازار میں قیمت زیادہ دینی پڑتی ہے۔ اسی لیے بعض تعلیمی ادارے ([illegible]) میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ گورنمنٹ اسکول، میونسپل اسکول پست تعلیمی معیار کے لیے مشہور ہیں۔ غریب ماں باپ ان ہی اسکولوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان کے بچے ان طلبا کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو کسی اچھے اسکول میں پڑھ آئے ہوں۔ ان میں ہر سال میں ایک آدھ کوئی کسی پیشہ ورانہ کالج میں داخلے کا مستحق ہوتا ہے۔

معیار تعلیم کا انحصار: کسی بھی تعلیمی ادارے کی کارکردگی اور معیار تعلیم کا انحصار مندرجہ ذیل سات عناصر کے باہمی خوشگوار اور گہرے ربط و ضبط پر ہے جس کو ہم زنجیری مجموعی اثر یا انگریزی میں [illegible] کہتے ہیں۔

١۔ ادارے کے قیام کا مقصد۔
٢۔ انتظامیہ کی کارکردگی۔
٣۔ اساتذہ کی قابلیت اور دلچسپی۔
٤۔ داخلے کی شرائط۔
٥۔ والدین کا تعاون
٦۔ مادی سہولتیں۔
٧۔ پرنسپل کی شخصیت۔

یہاں پر ان سب پر تفصیل سے بحث کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ضرورت لیکن ایک اجمالی خاکے سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ معیار تعلیم میں ان عناصر کی کیا اہمیت ہے۔

١۔ تعلیمی ادارے کے قیام کا مقصد تجارتی یا ذاتی منفعت ہوسکتا ہے یا پھر اپنی کمیونٹی کی خدمت، یا ایسا اسکول قائم کرنا جس میں صرف اونچے مالدار طبقے کے لوگ ہی اس کا رخ کرسکیں۔ داخلہ فیس اتنی زیادہ رکھی جائے کہ عام لوگ ادھر کا خیال ہی نہ کرسکیں۔ وہ ادارے جو عام غریب طلبا کے لیے قائم کیے جاتے ہیں وہ سوشل سروس کے جذبے اور مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ یہاں پر تعلیم کا کچھ انتظام ضرور ہوجاتا ہے لیکن معیار تعلیم بہت دور رہ جاتا ہے۔

٢۔ کرسچین مشنری اسکولوں میں انتظامیہ کہاں ہے کسی کو پتہ نہیں اور نہ ان تک پہنچ آسان ہے۔ سارے اسکول کا ذمہ دار مشین کی طرح چلتا ہے۔ مشین کے ہر ہر پرزے پر پرنسپل کی نظر ہوتی

ہے۔ کوئی ناقص ٹیچر ان اسکولوں میں چھ سات مہینوں
سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔

اب ذرا یہاں کا حال دیکھیے۔ انتظامیہ کے رکن کا بھتیجا نائنتھ فیل سے لے کر بچوں کے نمبر بڑھانے تک ہے۔ سارے ٹیچر کسی نہ کسی ممبر کے منظور نظر ہیں۔ پرنسپل صرف پوسٹ آفس ورک کرتا ہے۔ کبھی اس کی شکایت کبھی اس کی شکایت۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس صورت حال کی خرابی یہ ہے کہ اسکول چلانے کی ذمہ داری پرنسپل یا صدر مدرس کی ہے لیکن اسے کوئی اختیار نہیں۔ جن کے ہاتھوں میں اختیار ہے وہ ذمہ دار نہیں۔ اسی کو لارڈ کلائیو کی دوعملی پالیسی کہا جاتا ہے۔ وہ مالگذاری وصول کرتا لیکن انتظام کا ذمہ دار نہیں تھا۔ جو انتظام کے ذمہ دار تھے انھیں مالگذاری وصول کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ جس کا بس چلتا ہے وہ ذمہ دار نہیں، جو ذمہ دار تھے وہ بے بس ہے۔ اس صورت حال کی کتنی عملی مثالیں ہمارے تعلیمی اداروں میں کثرت سے مل جائیں گی۔

انتظامیہ کے بعض اراکین کی انا (ego) بہت مضبوط ہوتی ہے۔ بعض تو احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اب انھیں کوئی سیٹ مل گئی تو پھر ان کی رائے کا عمل دخل بڑھ جاتا ہے۔ اکثر آپس میں تو تو میں میں ہو جاتی ہے۔ پھر یہ باتیں فلٹر ہو کر اسٹاف روم میں آتی ہیں۔ چند اساتذہ کے گروپ بن جاتے ہیں۔ اسکول پالیٹکس خوب کام کرتی ہے۔ وہ جو پڑھانے کی بات تھی نصاب کی تکمیل وغیرہ سب بھول جاتے ہیں۔ سب کچھ ہے مگر تعلیم نہیں ہے، جس کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا۔

۲۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کا معیار تعلیم اچھے اور قابل اساتذہ پر ہی ہوتا ہے۔ اگر اسکول میں سب کچھ ہے اچھے ٹیچر نہیں ہیں تو سب بیکار محض ہے۔ مشنری اسکولوں میں Saints اور Nuns ہوتی ہیں جنھیں خدا کی خدمت گار کہا جا سکتا ہے۔ انھیں دنیا کے دھندوں سے کام نہیں۔ بچوں کی تعلیم ہی ان کا ایمان اور یہی زندگی ہے۔ ان میں بلاشبہ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنھیں Dedicated کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس پیشے کو خدمت خلق اور مذہب کے پرچار کا ذریعہ بنا لیا۔ ان کے کام اور لگن کو دیکھیے تو رشک آتا ہے۔ یہ ٹیچر اسکول کا نمک ہیں۔ ان کا وجود اس ادارے کے لیے باعث فخر اور دوسروں کے لیے قابل تقلید ہے۔

اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے۔ ہمارے پرائمری اسکول سے لے کر کالج، یونیورسٹی کی سطح تک دو چار اساتذہ ضرور ایسے مل جائیں گے جنھیں ہم Dedicated کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ فلاں لیڈر، فلاں منسٹر ابتدا میں ٹیچر رہ چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے سیاسی شعبدہ بازی کے ٹریننگ سنٹرس ہیں۔ دیہات میں شاید ہی کوئی ایسا ٹیچر ہوگا جو کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا سرگرم کارکن نہیں ہے۔ الیکشن کے زمانے میں ان کی حاضری اسکول میں مہینوں برائے نام رہتی ہے۔ جب ان کا امیدوار کامیاب ہو گیا تو دوسرے الیکشن تک اس سے جائز و ناجائز کام لے کر یہ اپنی آمدنی بڑھاتے ہیں اصل تعلیم کا مسئلہ کہاں رہ گیا خود انھیں بھی نہیں معلوم۔

پیشہ تعلیم اکثر اساتذہ کے لیے ان کے مزاج اور ذوق سے بہت دور کی بات ہے۔ سارے

زندگی میں ایک ایسے پیشے کا بوجھ بھی پڑ لاد دیے جاتے ہیں۔ تعلیم سے ہم اکثر حیوان اور روحانی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جب تک ان بے چاروں کی پہنچ نہیں ہوگی علم نشستم برخاستم چلتا رہا وہاں تعلیم کے معیار کا تذکرہ بے کار ہے۔

ہمارے مدارس میں ایک اور مرض عام ہے۔ اساتذہ کو تنخواہیں بہت کم دی جاتی ہیں۔ گورنمنٹ سے گرانٹ جو ملتا ہے وہ ٹیچر کو نہیں دی جاتی۔ وہ دستخط تو کرتا ہے لیکن تنخواہ کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جو ہر ٹیچر کے سینے میں سلگتی رہتی ہے، وہ اس کا بدلہ معصوم بچوں سے لیتا ہے۔ آنے والی ساری نسل کا قابلیت کا انحصار اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کسی ماہر تعلیم نے سچ کہا ہے کہ جو ٹیچر مالی پریشانیوں سے بدحال رہتا ہے وہ ملک کو اتنا نقصان پہنچاتا ہے جو کسی بیرونی دشمن سے ممکن نہیں۔

A dissatisfied teacher can harm the country more than a foreign enemy

دینی مدارس میں اساتذہ کی معاشی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ بے شک دین کا کام ثواب کا ہے لیکن محض تعریف و توصیف، ایثار و قربانی کا درس دیتے رہنے سے ٹیچر کا حال درست نہیں ہوسکتا انھیں حکومت کے معیار کی تنخواہیں دینا لازمی ہے تب ہی انھیں سکون حاصل ہوگا، تعلیم کا معیار بلند ہوگا۔

ایک عرصے سے مغربی ممالک میں ایک نئی

اصطلاح چل پڑی ہے۔ فروغ انسانی وسائل میں سرمایے کی مشغولیت

Investment in human resources

یہ بات اب مسلّم ہوچکی ہے کہ سرمایے کا بہترین استعمال انسانی وسائل کی ترقی کے لیے ہی ہوسکتا ہے۔ اس راز کو جاپان نے پالیا۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک تباہ شدہ ملک نے پرائمری اور سکنڈری ایجوکیشن پر اپنی توجہ مرکوز کردی۔ اچھی تعلیم کے لیے اچھے ٹیچرس کی ضرورت ہے۔ حکومت نے ان کی تنخواہوں کو پرکشش بنادیا اور ٹیچرس کو وہی سہولتیں دیں جو منسٹرس کو نصیب ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیس چالیس برس میں جاپان دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ ذہین اور اعلیٰ معیاری تعلیم یافتہ بچے ملک کا اصل سرمایہ ہیں۔ ہم چاہے ملک کی دولت کتنے ہی شعبوں پر صرف کرتے رہیں۔ تعلیم پر اگر خرچ نہ کیا جائے تو سو برس بعد بھی وہیں ہوں گے جہاں آج ہیں۔ اساتذہ کی تنخواہوں سے بہتر کوئی اور انسانی وسائل میں سرمایے کی مشغولیت نہیں ہوسکتی۔ ہمارا ملک تعلیم پر سالانہ بجٹ سے صرف ۲ ½ فی صد خرچ کرتا ہے اور دفاع پر ۴۷ فی صد۔ کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے ۱۹۶۶ء میں ۶ فی صد کی سفارش کی تھی لیکن آج تک بھی تعلیم کا حصہ یہاں تک نہیں پہنچ سکا۔

۴۔ طلبا کا داخلہ اور والدین کا تعاون

مشنری اسکولوں کے اعلیٰ معیار تعلیم کا چرچا ہر شہر میں ہے۔ ہر سال ہزاروں لوگ آدھی رات سے درخواستوں کے فارم حاصل کرنے کے لیے ان کے دروازے ہی پر سو جاتے ہیں۔ وہ

یہاں سے زیادہ ملی ماں باپ کا اثر ورسوخ یہ کہ بہ قسمت سے آپ کے بچے کو داخلہ مل گیا تو سارے خاندان میں آپ کا وقار بڑھ گیا۔ اب اس وقار کو قایم رکھنے کے لیے لاکھ جتن کیے جاتے ہیں۔ اکثر ماں باپ بچوں کو خود پڑھاتے ہیں یا پھر ٹیوشن کا انتظام کرتے ہیں۔ اسکول کی پڑھائی ۶۰ فی صد ہے تو گھر کی محنت ۴۰ فی صد۔ اس طرح ان اسکولوں میں خس و خاشاک جمع ہونے نہیں پاتا۔ تعلیم کا معیار اونچی سطح پر قایم رہتا ہے۔

مادی سہولتوں میں بلڈنگس، کلاس روم فرنیچر، تجربہ گاہیں، لائبریری، کینٹین، کھیل کے میدان ہال اور نمائش وغیرہ کی سہولتیں شامل ہیں۔ اکثر مدارس میں ان سب باتوں کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ اس کا اثر بھی تعلیم پر پڑتا ہے۔

ان سب کے درمیان پرنسپل کا عہدہ اہم اور کلیدی ہوتا ہے۔ قابل دور بیں اور لائق ہونے کے علاوہ اس کو اساتذہ سے کام لینے اور طلبا میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ اسکول کی فضا کو خوش گوار بنائے رکھنا ایک مشکل کام ہے

یہ ایک نہایت لطیف فن ہے۔ جس پر اگر اچھا خاصا قابل شخص کام جانتے ہیں۔ پرنسپل کا تعلق انتظامیہ، اساتذہ، طلبا اور والدین سے آئے دن رہتا ہے۔ ان سب کے مسایل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں اس کو بڑے حوصلے سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے کام کے جذبہ، نیک نیتی اور اخلاق کا اثر سارے اساتذہ اور طلبا پر پڑتا ہے اس کا امانت دار رہنا نہایت ضروری ہے کیوں کہ اسکول کا ڈسپلن جب بگڑ تا ہے تو اکثر اس کی وجہ 'کمیشن بک' ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بے ایمانی 'پیسے کے بارے میں' پرنسپل کی اعلیٰ صفات اور قابلیت پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ اساتذہ کی بغاوت اور لاپرواہی بڑھ جاتی ہے اس کا اثر طلبا کے ڈسپلن اور اسکول کے معیار تعلیم تک پہنچ جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان سات عناصر میں کوئی ایک کڑی بھی کمزور ہو تو معیار تعلیم پر اس کا اثر پڑے گا۔ اگر انتظامیہ ہوش مند ہو اور پرنسپل دانش مند تو معیار تعلیم ضرور ترقی کرکے رہے گا۔

"اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبر خدا کی پھوپھی! تم اللہ کے یہاں کے لیے کچھ کر لو۔ میں اللہ کے یہاں تمہارے کام نہیں آسکتا۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کیڑے مار دوائیں — محافظ یا قاتل

محمد اسلم پرویز ▽

ڈی ڈی ٹی (D.D.T.) کے نام اور کام سے ہم سب ہی بخوبی واقف ہیں۔ شہر میں رہنے والوں کو عموماً دو موقعوں پر اس سے واسطہ پڑتا ہے، یا اس وقت جب ملیریا بھگانے والے کارکن اس کا چھڑکاؤ کرتے ہیں یا پھر جب کارپوریشن کے کرمچاری گلیوں میں انتہا درجے کی صفائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ کرتے ہیں جو کہ کسی اعلیٰ افسر یا عہدے دار کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔ دونوں ہی موقعوں پر لوگ ناک دبا کر وہاں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ اس کی بو بہت تیز ہوتی ہے (بشرطیکہ اس میں چاک پاؤڈر کی ملاوٹ نہ ہو) یا پھر وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ زہریلا پاؤڈر ہے۔ لیکن کیا ناک بند کرکے اس مصیبت سے بچا جا سکتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم روزانہ اپنی خوراک میں لگ بھگ ۰.۰۰ ملی گرام ڈی ڈی ٹی کھاتے ہیں اور صرف ڈی ڈی ٹی ہی نہیں بلکہ ڈی ڈی ٹی جیسی نہ جانے کتنے اقسام کی جراثیم کش دوائیں مختلف طریقوں، راستوں اور وسیلوں سے ہمارے جسم میں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ کیونکر ہوتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ہم واپس اپنی گلی میں چلتے ہیں جہاں ابھی ڈی ڈی ٹی چھڑکی گئی ہے۔ یہ پاؤڈر جو کہ نالیوں کے کنارے پر جراثیم اور کیڑے مکوڑے مارنے کے لیے ڈالا جاتا ہے نالیوں کے اندر بہتا ہوا بڑے نالوں تک پہنچتا ہے جہاں سے یہ شہر کے بڑے نکاسی نظام سے ہوتا ہوا دریا میں جا گرتا ہے۔ (دہلی کا گندہ پانی دریائے جمنا میں بہتا ہے)۔ پانی میں شامل ہونے والی کل غلاظتوں اور مادوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو کہ رفتہ رفتہ قدرتی طور سے تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس کو تحلیل کرنے میں بیکٹیریا، دیگر خوردبینی کیڑے اور موسم مددگار رہتے ہیں۔ فضلہ اور دیگر غلاظتیں اسی قسم میں شامل ہیں۔ دوسرے زمرے میں وہ مادے آتے ہیں جو قدرتی نظام کے تحت تحلیل نہیں ہوتے بلکہ موجود رہتے ہیں۔ پانی میں موجود دیگر غلاظتوں کا ایک بڑا حصہ قدرتی طریقے سے صاف ہو جاتا ہے لیکن ڈی ڈی ٹی اور اسی قسم کے دیگر کیمیائی مادے کسی بھی قدرتی طریقے سے تحلیل نہیں ہوتے۔ اگرچہ دہلی شہر کے کچھ حصوں

▽ لیکچرر، باٹنی ڈپارٹمنٹ، ذاکر حسین کالج (دلی یونیورسٹی) دہلی۔

کا خلیج پانی اب صاف کرنے کے بعد ہی دریا میں خارج کیا جاتا ہے لیکن اس عمل کے دوران بھی ڈی ڈی ٹی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نتیجتاً یہ خطرناک مادہ اور اسی قسم کے بہت سے زہر پانی میں موجود رہتے ہیں اور ان کی مقدار بڑھتی ہی رہتی ہے۔ اسی پانی کے ذریعے مختلف طریقوں سے یہ زہریلے مادے ہمارے جسم میں پہنچتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے ملک میں محدود پیمانے پر ان دواؤں کا استعمال کافی پرانا ہے لیکن اس میں شدت سبز انقلاب کے زمانے میں ہی آئی ہے۔ ہمارے اردگرد ایسے بہت سے جراثیم، کیڑے مکوڑے اور غیر ضروری نیز نقصان دہ پودے پائے جاتے ہیں کہ جن سے ہمیں اور ہماری املاک کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے گھروں میں دیمک، پھپھوندی، کھٹمل، مچھر، چوہے وغیرہ نقصان پہنچاتے ہیں تو بہت سے کیڑے اور جانور ہماری فصلوں کو تباہ کرتے ہیں۔ ان جراثیموں اور جانوروں کو مارنے والی دواؤں کو عرف عام میں کیڑے مار دوا کہا جاتا ہے۔ ان دواؤں کو، ان سے متاثر ہونے والے جانوروں کی بنیاد پر مختلف اقسام میں بانٹا گیا ہے۔ مثلاً کیڑے مکوڑے مارنے والی دواؤں کو انسیکٹی سائیڈ، فصلوں کو نقصان پہنچانے والے جانوروں کو مارنے والی دواؤں کو پیسٹی سائیڈ، پھپھوندی ختم کرنے والی دواؤں کو فنجی سائیڈ اور جراثیم کش دواؤں کو جرمی سائیڈ کہا جاتا ہے۔ ان تمام دواؤں میں سب سے زیادہ مستعمل کیڑے مار دوائیں ہیں جن کا استعمال گھروں میں تو بہت محدود پیمانے پر ہوتا ہے لیکن کھیتوں میں ان کا استعمال بہت شدت سے اور کبھی کبھی تو بے جا بھی ہوتا ہے اور یہی فی الوقت ہمارے لیے اور ہمارے ماحول کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہیں۔

اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ان دواؤں کی ایجادات اور تیاری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن ان کا استعمال محدود تھا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے جب خوراک درکار ہوئی تو نسلوں اور پیداوار میں اضافے کے طریقے کھوجے گئے۔ ایسی نئی نئی اقسام نکالی گئیں جو کم وقت میں زیادہ پیداوار دے سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا سال میں ایک ہی کھیت سے دو، تین اور کبھی کبھی چار فصلیں لی جانے لگیں۔ فصلوں کی کاشت کے ردو بدل سے ماحولیاتی نظام متاثر ہوا۔ جب کھیت میں ہر وقت کوئی نہ کوئی فصل تیار رہی تو اس پر کیڑوں کے حملے کا خطرہ بڑھ گیا۔ نئے نئے موسموں میں جب نئی فصلیں اگائی گئیں تو وہ نئی قسم کی بیماریوں سے متاثر ہوئیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر کیڑے مار دواؤں کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔ ان دواؤں کے استعمال کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ نئی اقسام کی تمام فصلیں کافی مقدار میں کھاد اور پانی مانگتی ہیں جو کہ کسان کو کافی مہنگا پڑتا ہے۔ فصل پر اتنی لاگت لگانے کے بعد کسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے بھرپور فصل حاصل ہو، تاکہ اس کی لاگت وصول ہو سکے۔ ایسے میں اگر فصل کو کسی بیماری یا کیڑوں سے خطرہ ہوتا ہے تو کسان بے دریغ اور بلا تامل کیڑے مار دواؤں کا استعمال کرتا ہے۔ یہاں دو باتیں قابل وضاحت ہیں۔ اوّل یہ کہ اگرچہ کچھ کیڑے پودوں کو نقصان پہنچاتے ہیں لیکن کچھ کیڑے پودوں کے لیے مفید بھی ہوتے ہیں۔ کھیت کی حیثیت ایک چھوٹی سی آبادی کی سی ہوتی ہے جس میں پودے ہوتے ہیں۔ ان پودوں پر انواع و اقسام کے کیڑے مکوڑے، بھنورے، تتلیاں وغیرہ آتی ہیں اور سیر کرتی ہیں یہی کیڑے مکوڑے پودوں کا زیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا کر ان کی افزائش میں مدد کرتے ہیں۔ فصل جس زمین پر لگی ہوتی ہے اس میں بھی سطح کے اوپر اور اندر کئی اقسام

کے کیڑے مکوڑے رہتے ہیں۔ مثلاً کینچوے، چیونٹے اور بہت سی اقسام کے بیکٹیریا اور دیگر خوردبینی کیڑے جو زمین کو ہموار، بھربھرا اور زرخیز بناتے ہیں۔ اس آبادی کا ہر فرد اس نظام میں کچھ نہ کچھ کردار ادا کرتا ہے دوسری بات یہ کہ دنیا دار الاضداد ہے۔ یہاں ہر چیز کی ضد موجود ہے۔ قدرت نے اگر ایک کیڑا بنایا ہے تو اس کو مارنے والا دوسرا کیڑا بھی بنایا ہے اور اسی وجہ سے ان حشرات الارض کی تعداد قابو میں رہتی ہے۔ کیڑے مار دوائیں بلا تفریق ہر قسم کے کیڑوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ اس پس منظر میں اگر کیڑے مار دواؤں کو دیکھا جائے تو ان کی افادیت کسی حد تک محدود نظر آتی ہے۔ ایک مرتبہ کسی علاقے میں اگر کیڑے مار دوا کا استعمال ہو جائے تو وہاں پھر لازمی ہو جاتا ہے کہ ہمیشہ دوا استعمال ہو کیونکہ نقصان دہ کیڑوں سے لڑنے والے مفید کیڑے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے۔ کسان ہر فصل پر دواؤں کا چھڑکاؤ کرتا رہتا ہے اور آن جانے میں پوری نوع انسانی کو خطرے سے دوچار کر دیتا ہے۔ فصلوں پر ڈالی جانے والی دواؤں کے شدت استعمال کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت ۲۵۰ سے زائد اقسام کی دوائیں مارکیٹ میں دستیاب ہیں اور ہمارے کھیتوں میں ۲۰۰۰ ٹن سے زائد دوائیں چھڑکی جاتی ہیں۔ جن کی مقدار اس صدی کے آخیر تک ۲۵۰۰۰ ٹن سالانہ ہو جانے کی امید ہے گھریلو استعمال میں لائی جانے والی دوائیں اس سے الگ ہیں۔

یہ تمام دوائیں بنیادی طور پر زہر ہوتی ہیں۔ جو چیز کسی کیڑے یا دیگر جانور کے لیے خطرناک ہے، وہ انسان کے لیے بھی اتنی ہی خطرناک ہے۔ فرق صرف مقدار کا ہوتا ہے۔ فصلوں پر چھڑکی جانے والی دواؤں کا

بڑا حصہ کسی نہ کسی طرح مٹی میں شامل ہو جاتا ہے۔ یا تو چھڑکنے کے دوران یہ زمین پر گرتی ہیں یا پھر پودے پر سے بہہ کر زمین پر آ جاتی ہیں۔ زمین سے یہ بارش کے پانی کے ساتھ یا تو اندر ہی اندر سما جاتی ہیں اور زیرِ زمین پانی کے قدرتی ذخائر کو متاثر کرتی ہیں یا تیز بارش کے نتیجے میں بہہ کر ندی نالوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ دوائیں چونکہ یہ ناقابل تحلیل ہوتی ہیں اس لیے جہاں بھی جاتی ہیں وہاں اپنی مقدار بڑھاتی رہتی ہیں۔ پانی میں موجود پودے ان کو جذب کرتے ہیں۔ مثلاً ایسے تالابوں میں اگنے والے سنگھاڑوں میں ان دواؤں کی مقدار بہت ہوگی اس پانی میں رہنے والی مچھلیاں، جھینگے، اور وہ تمام جانور جو اس پانی کو استعمال کرتے ہیں، ان دواؤں کو اپنے جسم میں جمع کر لیتے ہیں۔ چونکہ یہ دوائیں جسم کے اندر تحلیل نہیں ہوتیں اس لیے جمع ہوتی رہتی ہیں۔ تجربات کے دوران دیکھا گیا ہے کہ ان دواؤں سے آلودہ پانی میں جو مچھلی جتنی زیادہ دیر تک رہتی ہے اتنی ہی زیادہ دوائیں اس کے جسم میں پائی جاتی ہیں۔ نیز جتنی بڑی مچھلی ہوگی اتنی ہی زیادہ مقدار دوا کی ہوگی۔ یہ مچھلیاں جب ہم بطور خوراک استعمال کرتے ہیں تو یہ زہریلے مادے ہمارے جسم میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ جہاں یہ جگر اور جسمانی چربی میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ کبھی پانی میں ان مادوں کی مقدار بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو مچھلیاں اور دیگر جانور مر بھی جاتے ہیں جیسا کہ اکثر ہم اخباروں میں پڑھتے بھی رہتے ہیں۔ اس آلودہ پانی میں جو پودے بڑے ہوتے ہیں ان کو چرنے سے یا اس پانی کو پینے سے گائے بھینس اور دیگر جانور بھی ان دواؤں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس پانی سے اگر سینچائی کی جاتی ہے تو یہ دوائیں پودوں کے اندر داخل ہو کر انھیں مزید زہریلا بنا دیتی ہیں۔ جب بطور چارہ یہ استعمال کیے جاتے ہیں

تو بھی جانوروں کے جسم میں یہ دوائیں پہنچ جاتی ہیں۔ ایسے جانوروں کے دودھ میں بھی اس کا اثر آجاتا ہے اور یہ دودھ جب ہم استعمال کرتے ہیں تو ایک مرتبہ پھر ان خطرناک دواؤں کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ بمبئی میں کیے گئے ایک جائزے کے مطابق دودھ کی بوتلوں میں ڈی ڈی ٹی اور ڈائی ایلڈرن کی کافی مقدار پائی گئی ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ زہریلے مادے اتنے لمبے چکر کے بعد ہی ہمارے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کا براہِ راست استعمال بھی ہم خوب کرتے ہیں۔ بیماری یا کیڑوں کا حملہ عموماً کھڑی فصل پر ہوتا ہے۔ اس وقت کسان بچاؤ کے لیے خوب دوا چھڑکتا ہے۔ کچھ دن بعد یہ فصل کٹ کر فروخت ہوتی ہے اور منڈی سے ہوتی ہوئی آپ کے گھر وارد ہوتی ہے۔ اگر آپ نے تھوڑی سی بد احتیاطی کی اور اچھی طرح دھوئے بغیر اس کو استعمال کر لیا تو سمجھ لیجیے کہ کچھ ملی گرام زہر آپ کے جسم میں جذب ہو گیا۔ جو فصل فروخت نہیں کی جاتی وہ محفوظ کر لی جاتی ہے۔ فصل کو اس دوران مختلف جراثیموں سے بچانے کے لیے بھی دوائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ خاص طور سے بیجوں کو دوا لگا کر محفوظ کیا جاتا ہے تاکہ وہ صحت مند رہیں اور اچھی فصل پیدا کر سکیں۔ ایسے بیج اگر غلطی سے یا بے ایمانی سے بازار میں آجائیں تو پوری آبادی کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔

کیڑے مار دواؤں کے زہریلے مزاج کو دیکھتے ہوئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کچھ کم زہریلی یا محفوظ دوائیں نہیں ہیں جو کہ انسانی آبادی اور ماحول کے لیے خطرناک نہ ہوں۔ یا قدرتی ماحول میں قابلِ تحلیل ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو کیڑے مار دوائیں استعمال ہوتی ہیں وہ دنیا کی خطرناک ترین دوائیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا استعمال مغربی ممالک میں بند کر دیا گیا ہے۔ ڈی ڈی ٹی جو کہ اکثر ترقی یافتہ ممالک سے ناپید ہو چکی ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال ۱۰۰۰۰ ٹن سے زیادہ مقدار میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہیپٹاکلور، کلورڈین، ڈائی بی سی پی اور بی ایچ سی اور پیرا تھیون کے مرکبات جن کا استعمال ترقی یافتہ دیگر ممالک میں بند کر دیا گیا ہے ہمارے یہاں آج بھی زیرِ استعمال ہیں۔ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں استعمال ہونے والی کل کیڑے مار دواؤں کا ۷۰ فی صد حصہ ان دواؤں پر مشتمل ہے جو کہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بین کر دی گئی ہیں۔ کچھ ترقی یافتہ ممالک تو ایسے بھی ہیں کہ وہ یا ان کی اشتراکی کمپنیاں ان دواؤں کو تیار کرتی ہیں اور ترقی پذیر ممالک کو سپلائی کر دیتی ہیں گویا کہ یہ دوائیں صرف ان کے لیے نقصان دہ ہیں، بقیہ ممالک ان کو استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس صورتِ حال کی ایک اہم اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں استعمال ہونے والی کیڑے مار دواؤں کی بڑی تعداد ملٹی نیشنل کمپنیاں تیار کرتی ہیں۔ چونکہ ان کا مقصد محض نفع کمانا ہے اس لیے وہ دوائیں جو ان کے اپنے ممالک میں بند کر دی گئیں اور جن کی تکنیک بھی پرانی ہو چکی ہے ان دواؤں کو تیسری دنیا کے ممالک میں کھپانا ان کے عین تجارتی مفاد میں ہے۔ بھوپال گیس حادثہ ہم سب کو یاد ہے۔ یونین کاربائیڈ کی فیکٹری بھی کیڑے مار دوائیں بناتی تھی۔

محفوظ قسم کی کیڑے مار دواؤں کے بنانے میں حیدرآباد میں واقع ریجنل ریسرچ لیبارٹری نے کافی پیش رفت کی ہے اور توقع ہے کہ جلد ہی محفوظ قسم کی دواؤں کو بنانے کی تکنیک تیار کر لی جائے گی۔

سائنس دانوں کی کوشش ہے کہ یہ دوائیں پیڑ پودوں یا جانوروں میں پائے جانے والے قدرتی دفاعی نظام کی بنیاد پر تیار کی جائیں۔ قدرت کے خزانوں میں ہر قسم کے جراثیم اور کیڑے مارنے کے لیے جاندار موجود ہیں۔ ان جانداروں کو یا ان سے کشید کردہ مرکبات کی بنیاد پر بنی ہوئی دوائیں کم خطرناک ہوں گی اور قدرتی حالات کے تحت قابلِ تحلیل بھی ہوں گی۔ نیم کے پیڑ میں پائے جانے والے کئی مرکبات اس مد میں کافی کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے پیڑ پودے ہیں جو ہم کو نقصان دہ جاندار والے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اس طرف دھیان دے تاکہ محفوظ قسم کی دوائیں تیار کی جاسکیں۔ نہ تو یہ مسئلہ چھوٹا ہے اور نہ غیر اہم۔ کیڑے مار دواؤں کے ملک گیر اثرات دیکھنے میں آرہے ہیں۔ بہتر فصلوں اور بہتر پیداوار کے لیے ان کا استعمال بھی ضروری ہے اور ان کے استعمال سے کثافت کے خطرات بھی وابستہ ہیں۔ اس صورت حال کو گرفت میں لینے کے لیے حکومت کو کچھ اقدامات کرنے ہوں گے۔ محفوظ قسم کی دواؤں کی تیاری پر زور دینا ہوگا۔ مناسب ہوگا اگر اس کام کے لیے ایک ٹکنالوجی مشن ترتیب دے دیا جائے۔ کسانوں کو بے تحاشہ دواؤں کے استعمال سے روکنا ہوگا۔ ہمارے یہاں کھلے بازار میں ہر قسم کی کیڑے مار دوا موجود ہے۔ کسان جس دوا کو چاہتا ہے اپنی من پسند مقدار میں استعمال کر لیتا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ اور غیر تربیت شدہ کسان ان دواؤں کے استعمال اور مقدار سے صرف اس حد تک واقف ہوتا ہے کہ اس کی فصل محفوظ رہتی ہے۔ ان کے دور رس نتائج سے وہ لاعلم ہے۔ ضروری ہے کہ ان دواؤں کی کھلی فروخت روکی جائے۔ سب سے مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ بلاک کی سطح پر کسانوں کو ان دواؤں کی سہولیات دی جائیں۔ ہر بلاک میں کچھ تربیت یافتہ سرکاری کارکن ہوں جو ضرورت مند کسانوں کے کھیت پر جا کر دوا کا چھڑکاؤ کر سکیں۔ یہ کام کوآپریٹو سطح پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ کسان بھی ان سہولیات سے فیض یاب ہو سکیں گے جن کے پاس دوا چھڑکنے کا انتظام نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں فلور ملوں کو یہ احکامات دینا ہوں گے کہ وہ اناج کو بغیر دھوئے نہ پیسیں تاکہ بازار میں آنے والا آٹا ان زہریلی دواؤں سے پاک ہو۔ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ احتیاطی اقدامات ہم کو بھی کرنے ہوں گے۔ کوشش یہ کریں کہ گیہوں دھو کر سکھا کر ہی پسوائیں۔ ہر سبزی اور پھل کو استعمال سے قبل بھی طرح دھو لیں۔ تاکہ اگر ان پر کچھ دوائیں ہوں تو وہ صاف ہو جائیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ زہریلے مادّے جسم میں کئی اقسام کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں جن میں کینسر سرِفہرست ہے۔

ہمارے ملک کی دو ریاستوں میں ان دواؤں کے شدّت سے استعمال کے نتیجے میں، جگر کی بیماریاں، کینسر، پیدائشی نقص اور اعصابی امراض پائے گئے ہیں۔ ہم کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس صورت حال کا مقابلہ کرنا ہے۔ کچھ اہم ماحولیاتی مسائل پر بروقت توجہ نہ دینے کی وجہ سے ہم آج بھی خشک سالی اور سیلاب کے مسائل سے دوچار ہیں۔ آج اگر کیڑے مار دواؤں کے مسئلے پر مناسب توجہ نہ دی گئی تو عین ممکن ہے کل یہ ہمارے لیے ایک ناقابل حل مسئلہ بن جائے۔

(ماخوذ: سائنس پارے)

کینیڈا کے بارے میں چند دلچسپ اعداد و شمار

محمد ذکریا ورک ٭

کیا آپ جانتے ہیں:

۱۔ کہ کینیڈا میں ننانوے (۹۹ فی صد) شہریوں کے گھر میں ٹیلی فون موجود ہیں۔

۲۔ کہ کینیڈا کے چھیانوے (۹۶) فی صد شہری گھروں میں رنگین ٹیلی ویژن رکھتے ہیں۔

۳۔ کہ کینیڈا کے ۸۰ فیصد شہری کار کے مالک ہیں جب کہ ۴۳ فیصد لوگوں کے گھروں میں مائیکرو ویو اوون Microwave Oven اور ۵۹ فی صد کے پاس وی۔ سی۔ آر موجود تھا۔

۴۔ کہ کینیڈا کے ۳۰ فی صد شہری جسمانی ورزش کے لیے پیدل چلنا پسند کرتے ہیں۔

۵۔ کہ کینیڈا میں ۱۹۸۹ کے سال میں ۴۱۷۶ افراد ٹریفک کے حادثات میں جاں بحق ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں کی سب سے زیادہ تعداد صوبہ اونٹاریو میں تھی۔

۶۔ کینیڈا کی آبادی تقریباً ۲۶ ملین افراد ہے اور سب سے زیادہ لوگ صوبہ اونٹاریو میں رہتے ہیں جس کی آبادی ۹.۰۶ ملین ہے۔

۷۔ کہ کینیڈا میں پچھلے سال شہریوں نے ۴.۲ بلین (ارب) فون کالز کیں۔ ہر شہری ایک سال میں قریب ۱۴۲۳ فون کرتا ہے۔ نیز پچھلے سال کینیڈین لوگوں نے دو ارب لانگ ڈسٹینس (Long distance) فون کالز کیں۔

۸۔ کینیڈا کا معروف ترین ایرپورٹ ٹورنٹو میں ہے جہاں پچھلے سال ۱۷۵,۸۷۲ ہوائی جہاز اترے۔

۹۔ کینیڈا میں رجسٹرڈ نرسس کی تعداد ۲۱۱,۹۵۵ ہے۔

۱۰۔ کینیڈا میں ۴۰.۴ فی صد لوگ گھروں میں کتا بطور پالتو جانور کے رکھتے ہیں جب کہ ۳۴.۳ فی صد گھروں میں بلی رکھتے ہیں۔

۱۱۔ پچھلے سال کینیڈا میں ۵۰,۸۱۶ لوگ عارضۂ قلب سے فوت ہوئے۔ جب کہ سال

٭ کنگسٹن، کینیڈا۔

سے مرنے والوں کی تعداد ...،۴۰ تھی۔ سانس کی تکلیف سے مرنے والوں کی تعداد ۱۴۰۹۳۱ تھی۔

۱۲- صوبہ اونٹاریو میں ۶۰ فی صد لوگ بیر (Beer) پینا پسند کرتے ہیں۔

۱۳- کینیڈا میں لوگ تقریباً ۳۵-۴۰ گھنٹے فی ہفتہ کام کرتے ہیں۔

۱۴- کینیڈا میں ۸۵ فی صد لوگ کار کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ بس کے ذریعے صرف چار فی صد سفر کرتے ہیں۔ ریل گاڑی سے دو فیصد اور ہوائی جہاز سے ۹ فی صد سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

۱۵ کینیڈا میں ہونے والی چند ایک معروف ایجادات اور دریافتیں

نیوز پرنٹ	۱۸۳۸ء
مٹی کا تیل	۱۸۵۳ء
باسکٹ بال	۱۸۹۱ء
گیس ماسک	۱۹۱۵
انسولین	۱۹۲۲ء
خلاء میں کام کرنے والا بازو (Space arm)	۱۹۸۱

۱۶- کینیڈا کے سب سے لمبے دریا کا نام میکنیزی Mckenzie ہے جو ۴۲۴۱ کیلو میٹر لمبا ہے سب سے لمبی سڑک کا نام ینگ اسٹریٹ (yonge street) ہے جو ۱۸۹۶ کیلو میٹر لمبی ہے۔ رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ کیوبک ہے۔ سب سے چھوٹا پارک سینٹ لارنس آئی لینڈ مرکلنشی کے پاس موجود ہے۔

۱۷- کرۂ دنیا کا سب سے زیادہ نیوز پرنٹ کینیڈا میں بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ نصف کے قریب کینیڈا کی زمین جنگلات سے بھری ہوئی ہے۔

۱۸. کینیڈا کی سب سے بڑی جھیل "لیک سوپیریر" Lake Superior ہے جس کی گہرائی ۴۰۵ میٹر اور کل رقبہ ۱۸۴۰۲۴۳ اسکوائر کیلو میٹر ہے۔

> اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبردار ہے۔"
>
> القرآن پارہ ۲۶

زبان کی تعلیم

مظفر حسین غزالی ▽

بچہ کہیں بھی پیدا ہو۔ اس کی پیدائش ایک ہی طریقے سے ہوتی ہے۔ وہ کسی ملک، قوم، نسل، خاندان گاؤں یا شہر جہاں بھی ماں کی گود میں آنکھ کھولتا ہے اس کے پردۂ سماعت سے نامانوس آوازیں ٹکراتی ہیں جن کے جواب میں وہ کچھ مبہم آوازیں نکالتا ہے ماں بچے کی مبہم آوازوں کے جواب میں مسکراتی ہے، پچکارتی اور پیار کرتی ہے۔ اس طرح ترسیل کا عمل طفولیت سے شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ ان آوازوں کی نقل کرتا ہے جنھیں وہ اپنی ماں کی آغوش میں سنتا اور سیکھتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ نہ صرف ان آوازوں سے مانوس ہو جاتا ہے بلکہ سمجھنے بھی لگتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنی توتلی زبان سے بامعنی آوازیں بھی ادا کرنے لگتا ہے۔ لفظ سے جملہ اور جملے سے عبارت یعنی مسلسل کئی کئی جملے بولتا ہے اور اور زبان کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔ والدین اس تبدیلی سے بہت خوش ہوتے ہیں اور بچے میں مزید دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اس سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ گھر میں بولی جانے والی زبان بہت آسانی سے سیکھ جاتا ہے۔ یہی بات تو یہ ہے کہ زبان کی آموزش مدرسے جانے سے قبل اور بغیر کسی رسمی تعلیم کے ہوتی ہے۔

بچہ ابتداً جو زبان سیکھتا اور بولتا ہے وہی اس کی بنیادی اور مادری زبان تصور کی جاتی ہے وہ اپنی مادری زبان بولتے وقت نہ جھجک محسوس کرتا ہے اور نہ خوف۔ وہ بلا کسی پس و پیش کے بے ساختہ اپنے مقصد و خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گھر میں سب لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی ضرورت کو سمجھتے ہیں۔ کئی بار وہ ضد بھی کرتا ہے لیکن مدرسے میں استاد کو نہ تو والدین کی طرح شفیق پاتا ہے اور نہ اپنی خواہشات کا اظہار کر پاتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ استاد اس میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔ اسی لیے اس کی زبان سیکھنے کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ اگر بچے کو زبان سیکھنے کا مناسب ماحول فراہم کیا جائے تو وہ بہتر طور پر زبان سیکھ سکتا ہے۔

تمام ماہرین تعلیم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ

▽ ۷۰-جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

بچوں کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہونی چاہیے کیونکہ مادری زبان کا فطری تعلق اور وسیلۂ اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیب کا بھی مصدر ہوتی ہے۔ اس کے بغیر سماجی زندگی کی تشکیل بہت دشوار نہیں ہوتی بلکہ وہ شائستگی سے بھی یکسر محروم رہ جاتی ہے۔ مادری زبان سے زندگی کی نہ صرف ترجمانی ہوتی ہے بلکہ فکر انسانی کو فروغ بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے اس سے فرد کا جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ غرضیکہ مادری زبان ہماری شخصیت کو توانائی بخشتی ہے اور اس سے نااہلی پوری ذات کو مجہول بنانے کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لیے زبان کی تعلیم بہت اہمیت کی حامل ہے بلکہ فرد کو سماجی طور پر مفید اور موثر بنانے کا کام تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ اسکول کی تعلیم میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ جس پر اس کے وجود کے استحکام کا انحصار ہوتا ہے۔

ابتدائی منزل:

بچہ جب تعلیم کی ابتدائی منزل میں داخل ہوتا ہے تو اس کے پاس ماحول کا پروردہ زبان کا ایسا ذخیرہ موجود ہوتا ہے جو اس کی زندگی کی محدود ضرورتوں کو پورا کرتا رہا ہے۔ لیکن اس کا لسانی تجربہ بہت کم ہوتا ہے۔ پھر بھی غیر شعوری طور پر اس کو اس بات کا تجربہ ہوتا ہے کہ لوگ کس طرح آوازوں کی مدد سے لفظ بناتے ہیں اور ان لفظوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس طرح بچے کی ذہنی بالیدگی میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن ہر بچے میں اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ تاہم اس کی زبان سرعت کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔ دراصل اسکول کی منزل ہی لسانی عمل کی پہلی باضابطہ آماجگاہ ہوتی ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچہ اپنے ماحول کا جائزہ لے کر اس کے مطابق اپنے افعال کو ڈھالنا بھی سیکھتا ہے وہ اپنے ماحول میں کچھ نہ کچھ دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح آموزش کا عمل جاری رہتا ہے آموزش کا عام طریقہ کھوج اور دریافت کا ہی ہے لیکن ابتداً بچے کی آموزش اپنے ماحول تک محدود رہتی ہے۔

تعلیم کے ابتدائی منزل میں بولنے پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور آہستہ آہستہ 'تحریری کلام' میں اضافہ ہوتا ہے۔ زبان کے چار اہم جزو بولنا، پڑھنا، لکھنا اور سمجھنا قرار پائے ہیں۔ جیسے جیسے بچہ عمر کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے اس کی آموزش میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ زبان کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔ نشوونما کا یہ عمل پوری زندگی پر محیط ہے لیکن ابتدائی منزل پر تدریسِ زبان کا بڑا مقصد بچے میں بولنے کی بنیادی مہارتیں پیدا کرنا ہونا چاہیے اور ان مہارتوں کی بتدریج توسیع کی جائے جنھیں وہ گھر پر سیکھ چکا ہے۔

زبان کی نشوونما کے مطالعے سے اندازہ ہوا ہے کہ بچہ جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو اس کا ذخیرۂ الفاظ تقریباً ڈھائی ہزار تک ہوتا ہے اور اس سے زیادہ الفاظ وہ سمجھ لیتا ہے۔ وہ بولتا ہے اور یہ سمجھ کر بولتا ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کو سمجھ بھی رہا ہے استاد بچوں کو خاموش رہنے کی ہدایت کرتا رہتا ہے لیکن جیسے ہی وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے ہم جماعت اس کی بات سننے پر آمادہ ہیں وہ بولنے لگتا ہے۔

دراصل یہ عبوری دور ہوتا ہے اور فطری طور پر بچہ اظہار کی خواہش رکھتا ہے لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنے تقریری اظہار پر قدرت نہیں۔ یہ وقت زبان سیکھنے کی آمادگی کا وقت ہوتا ہے۔ اس لیے ایسا پروگرام مرتب کرنا چاہیے جس سے اس میں

واعتماد پیدا ہو۔ خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے زمانے سے زبان بولنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔

ثانوی منزل

پہلی آٹھ جماعتوں میں زبان آموزی کا محور ہوتی ہے اور ثانوی (نویں دسویں) جماعتوں میں ادب کا پہلو زیادہ اجاگر ہونے لگتا ہے لیکن اس منزل میں نصاب کو پورے ادب کی ارتقائی منازل سے گزارنے کی بھی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ زبان کے عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور طالب علموں کو مختلف اسالیب ادب سے بہرہ مند ہونے کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔ زبان کی تعلیم دیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ طریقۂ تعلیم بھی دلچسپ ہو۔ کیونکہ غیر دلچسپ طریقۂ تعلیم کی سختی اور دباؤ بچہ کی موجود تخلیقی صلاحیتوں، فطری تجسس، عملی خود اعتمادی اور کھیل کی سرگرمیوں کے میلانات کو ختم کر دیتا ہے۔ بچوں میں ان تمام صلاحیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے ان میں کام کرنے کی امنگ اور جوش پیدا کرنے کے لیے طریقۂ تعلیم بے حد موثر اور زیادہ دلچسپ ہونا چاہیے۔

زبان کی نشو و نما پر اثر انداز ہونے والے عوامل۔

ابتدائی تعلیم عموماً ۶ سال سے ۱۱ سال تک کی عمر کے بچوں کو اول سے پنجم جماعت تک ہوتی ہے۔ بچے کی عمر کا یہ حصہ نازک اور اہم ہوتا ہے۔ اس عمر کے بچوں کو تعلیم دینے والے اساتذہ کو زبان کی تعلیم کے سلسلے میں خاص طور سے اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ زبان کی نشو و نما پر کون سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ بات مسلم ہے کہ ہر بچے کی جبلی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ کچھ بچے چست اور ہشاش بشاش رہتے ہیں اور عموماً زیادہ بولتے ہیں اور کچھ سست اور رنجیدہ رہتے ہیں اور عموماً کم بولتے ہیں یہی انفرادی فرق ان کی شرح نمو اور زبان سیکھنے کی رفتار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جسمانی صحت کا بھی بچوں کی صلاحیتوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ جن بچوں کی صحت خراب ہوتی ہے ان میں خود اعتمادی اور استقلال کے مشاغل میں دلچسپی کم ہوتی ہے لیکن صحت مند بچوں میں اس کے برعکس ہوتا ہے اور ان میں زبان کی نشو و نما کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے۔ لسانی نشو و نما کے لیے ذہنی نشو و نما بہت ضروری ہے۔ اس لیے مدرسے میں ایسے مشاغل کا اہتمام کیا جانا چاہیے جس سے ذہنی نشو و نما کی جا سکے تاکہ بچوں کی لسانی نشو و نما ہو سکے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ عموماً لڑکیاں لڑکوں سے پہلے بولنا شروع کر دیتی ہیں اور ان میں نشو و نما کا عمل لڑکوں کے مقابلے تیز ہوتا ہے۔ یہ جلدی پڑھنا شروع کرتی ہیں تیزی سے سیکھتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں اور لڑکوں سے پہلے زبان میں مہارت حاصل کر لیتی ہیں۔ بچوں کی نشو و نما میں جنس کا فرق بہت واضح ہوتا ہے۔ ایک استاد کو اس سے واقف ہونا چاہیے۔

زبان کی کلیدی حیثیت

دنیا میں ترسیل و ابلاغ کا سب سے بڑا وسیلہ زبان ہے۔ انسان اسی وسیلے سے تفکر کرتا ہے سوچتا ہے اور خیال آرائی کرتا ہے۔ اس لیے مدرسے میں زبان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ علامتوں کے ذریعے اطلاعات و معلومات اکٹھا ہو کر ذہن میں منتقل ہوجاتی ہیں اور ذہن میں ان کی از سر نو ترتیب و تشکیل ہوتی ہے۔ اس لیے علامتی نظام ترسیل کا ایک ضابطہ ہے اور اسی لیے زبان کے علامتی اظہار پر سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے۔ انسان ادراک کی قوت سے محروم رہ جاتا، اگر اس میں علامات کی ترجمانی کی صلاحیت نہ ہوتی۔ اگر اس ترجمانی کا عمل ناقص رہ جائے تو

اور اس کی شکل رہتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ علامتی اظہار وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے فنکار کسی شے کے تصور تک پہنچتا ہے۔

گوڈ فرائیڈ نے اپنی تحقیقات کے ذریعے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ بچہ جب کسی شے کو دیکھتا ہے تو اسی وقت یہ بات بھی اس کے بصری ادراک کی گرفت میں آجاتی ہے کہ اس شے میں کون کون سے قابل توجہ مہیجات ہیں۔ ان قابل توجہ مہیجات کا وہ بصری مشاہدہ کرتا ہے اور ایک دوسرے کی تمیز کرنے لگتا ہے۔ یہی تشکیل تصور کی پہلی منزل ہے۔ ایک اعتبار سے اس نظریے کی رو سے پیاژے کے نظریات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ بچوں میں ذہنی اور حرکی سانچے موجود رہتے ہیں اور جوں جوں خارجی مہیجات سے ان کا سابقہ پڑتا جاتا ہے ان کی شخصیت کی تکمیل ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حسی و حرکی سانچے علامتی طریق عمل کا روپ دھار لیتے ہیں جنھیں ہم زبان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

زبان کی ایک اور بھی خصوصیت ہے وہ یہ کہ معنی کے اعتبار سے زبان کا زیادہ موثر اظہار تحریری شکل میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تحریر میں اظہار بہت واضح ہوتا ہے اوسلون کے مطابق زبان کا مواد معنی ہے اور معنی بڑی حد تک ذہنی خاکے پر منحصر ہوتا ہے جبکہ پیاژے نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق مبلغ علم، عملی مشاغل کے توسط سے ذہنی مشاغل کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ دراصل اوسلون طریق وقوف اور وقوف میں امتیاز کرتا ہے۔ اول الذکر کا تعلق مہارت کے رموز سے اور آخر الذکر کا تعلق تجربے سے ہے۔ غرض علامتی تشکیلیں چاہے تقریری زبان کی ہوں یا تحریری زبان کی، ماحول میں ایک نئے قسم کا تفاعل پیدا کرتی ہیں اور اس تفاعل کے دوران نئے نئے قسم کی زبان وجود میں آتی ہے۔

قواعد کی تعلیم:

زبان کی تعلیم کا سب سے اہم جز قواعد کی تعلیم ہے۔ اس سے بچوں میں لفظوں کے استعمال کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بیدار ہوتا ہے۔ زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس میں سلیقہ، نکھار اور شائستگی آتی ہے۔ بچے میں صحیح لکھنے اور بولنے کی صلاحیت اُبھرتی ہے۔ وہ نہ صرف زبان میں دلچسپی لیتا ہے بلکہ اس کے رس سے لطف اندوز ہوتا ہے اور رواں دواں سلیس زبان سیکھ جاتا ہے۔ مادری زبان کے لیے قواعد کی تعلیم گو کہ ضروری نہیں لیکن زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے اس سے بچنا ممکن نہیں۔ البتہ دوسری زبانیں قواعد کے ذریعے ہی آسانی سے اچھی طرح سیکھی جا سکتی ہیں۔

عموماً بچے قواعد کی تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قواعد کے اصول و ضوابط بچوں کو رٹائے جاتے ہیں۔ پھر یہ ایک خشک موضوع بھی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ درس کے دوران ہی استاد بچوں کو قواعد سے واقف کرا دے الگ سے نہ قواعد پڑھانے کی ضرورت پیش آئے، نہ بچوں کو اسے رٹنا پڑے۔ اگر بچوں میں بے کیفی اور خشکی پیدا ہو گئی تو پھر وہ زبان کو بھی اچھی طرح نہیں سیکھ سکتے اس لیے میں ذاتی طور پر اس حق میں ہوں کہ ابتدائی منزل میں قواعد استاد کو آنا چاہیے اور بچوں کو تدریس کے دوران ہی اس سے واقف کرا دینا چاہیے۔

زبان کا پیرہن

زبان کی تعلیم اپنا پیرہن رکھتی ہے جسے مواد کہتے ہیں۔ لسانی مہارتوں کے حصول کے ساتھ ساتھ

ان میں معلومات بھی بہم ہوتی ہے اور اقدار سے
ن شناسائی حاصل ہوا کرتی ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد
ا انسان بنانا ہے جس کے لیے صالح ادب ہی مددگار
تا ہے۔ زبان کی درسیات کے لیے مواد فراہم کرنے
ں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اس مواد
ے ذریعے اقدار عالیہ کی آبیاری ہو سکے اور نو خیز
ہنوں کو پسندیدہ اور پاکیزہ افکار و اعمال کی طرف
غب کیا جا سکے ان کے ارادے نیک ہوں اور
قاصد بلند تاکہ صاحب کردار شخصیتیں معاشرے کو

نصیب ہوں۔ زبان ہی وہ وسیلہ ہے جس سے بچے
مذہب و اخلاقیات کی باتیں آسانی سے سیکھائی جا سکتی
ہیں۔ نیز انھیں ان کے سماج، تہذیب، اقدار اور ثقافت
سے بھی واقف کرایا جا سکتا ہے۔ طلبا [illegible]
ان کے اندر یہ احساس بھی بیدار کیا جا سکتا ہے کہ سماج
کے تئیں ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور انھیں اپنے
سماج کو صالح بنانے نیز بلند مقام تک لے جانے کے
لیے کیا کرنا چاہیے؟ تاکہ وہ اپنے ملک، سماج اور
قوم کا قوم کا صحیح ترجمانی کر سکیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

"میں اگر بندوں میں سے کسی کو دوست بناتا تو
ابوبکرؓ کو بناتا (مگر اللہ ہی میرا دوست ہے
اب جو چیز باقی رہ گئی ہے وہ) میری صحبت
کا شرف اور ایمانی برادری ہے۔ یہاں تک
کہ اللہ ہمیں اپنے پاس جمع فرمالے"

یہ دروازے جو مسجد میں کھل رہے ہیں ان سب
کو بند کر دو مگر ابوبکر کے گھر کا دروازہ بند نہ کرو
کیونکہ میں کسی بھی ایسے آدمی کو نہیں جانتا جو دست
بازو بن کر صحبت نصیب ہونے کے اعتبار سے
اُن سے (ابوبکرؓ سے) افضل ہو"

نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم

سید مسعود الحسن زیدی

محمد حفیظ الدین صدیقی ▽

سید مسعود الحسن زیدی سے میری پہلی ملاقات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اپنے حقیقی ماموں محمد علی صدیقی (سابق اسسٹنٹ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے مکان "انجولی ہاؤس" دودھ پور میں ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی۔ سید مسعود الحسن زیدی میرے ماموں محمد علی صدیقی کے گہرے اور قریبی دوستوں میں سے تھے۔ محمد علی صدیقی کا تذکرہ سید مسعود الحسن زیدی نے اپنی کتاب "علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں" میں صفحات ۴۶، ۹۹ اور ۲۷۶ پر کیا ہے۔ پہلی ملاقات کے بعد میری ان سے مزید ملاقاتیں علی گڑھ میں گاہے بگاہے ہوئیں۔

سید مسعود الحسن زیدی علی گڑھ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ولایت حسین، سرسید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تدریس کے شعبہ میں پچاس سال تک خدمات انجام دی تھیں وہ صحیح معنوں میں سرسید احمد خاں کے جانشینوں میں سے تھے۔ سید مسعود الحسن زیدی نے اپنی ابتدائی سیکنڈری اور یونیورسٹی کی تعلیم علی گڑھ ہی میں حاصل کی اور طالب علمی کے بائیس سال وہاں گزارنے کے بعد مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم وہ یونیورسٹی کی فٹ بال اور ہاکی کی ٹیموں کے کھلاڑی اور کپتان رہے۔ یونیورسٹی کی ہاکی کو بڑی ترقی دلائی اور اکثر کھلاڑیوں کی مالی اعانت بھی کی۔ سید مسعود الحسن زیدی مسلم یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم کو لے کر مختلف شہروں جیسے الٰہ آباد، بمبئی، حیدرآباد دکن، گوالیار، جھانسی، ناگپور، بھوپال، بدایوں، میرٹھ، اٹاوہ، سیوان، مرادآباد، کلکتہ، پٹیالہ، نینی تال اور کراچی گئے اور بیرون ملک بھی لے گئے۔ ہاکی کے میچوں میں زیادہ تر کامیابیاں حاصل کیں اور اس طرح مسلم یونیورسٹی کا نام روشن کیا۔ ہاکی ٹیم میں آپ کے ساتھی بریگیڈیر گلزار احمد، سرفراز احمد، محمد اشرف (سابق جوائنٹ سکریٹری حکومت پاکستان) غلام محمد خاں، محسن عبداللہ دلدخان بہادر شیخ عبداللہ بانی گرلز کالج علی گڑھ، محمد حسن عباسی (آفیسر محکمہ کسٹم کراچی)، انوار اللہ خاں (آفیسر محکمہ تعلیم حکومت ہند و پاکستان)، مصطفیٰ حسن زیدی،

▽ شاہراہ اقبال، لاہور۔

شاد (سابق میر منشی اور مجسٹریٹ ریاست الور) و بیرسٹر
ی) ولد احمد حسن بھوپال، مولانا خلد جمیل (ہیڈ ماسٹر
ل اسکول ملیح آباد)، اکرام احمد خاں (سابق آئی سی ایس
ی سی ایس)، سید قاسم رضوی، غوث بخش بزنجو،
شہور پاکستانی سیاست داں) تھے۔ آپ کے کلاس
یوز اسکول و یونیورسٹی میں ایم ایس بدیع الدین (سابق
یر تعلیم سرحد)، سردار بہادر خاں، فضل رحیم معراج
مد (سابق ڈی آئی جی پولیس حکومت ہند)، غلام نبی پٹھان
ابق وزیر تعلیم و وزیر جنگلات حکومت سندھ)، ڈاکٹر
ی الاسلام (سابق صدر شعبۂ جغرافیہ کراچی یونیورسٹی)،
ارا احمد (چیف آفیسر آئل کمپنی کویت)، طلعت محمود (مشہور
، پلے بیک سنگر فلم بمبئی)، راحت سعید چھتاری (سینئر
فسر پاکستان فارن سروس و سفیر پاکستان)، سید
رف الحسن (سابق اسسٹنٹ سکریٹری محکمہ مالیات
کومت پاکستان)، اے آئی عثمانی (سابق آڈیٹر جنرل
ف پاکستان) اور سید ظفر الحسن لاری (سابق ڈپٹی کمشنر
ہور)، کلیم الرحمن شیروانی اور اختر حسین (آئی سی ایس
سابق گورنر مغربی پاکستان) تھے۔ آپ نے ایم اے
رنے کے بعد یونیورسٹی اسکول علی گڑھ میں چند سال
علمی کی اور بعد میں شعبۂ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی میں بطور
یکچرار ایک سال خدمات انجام دیں اور پھر اس کی ملازمت
ترک کر دی۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر آپ پانی پت
پنجاب) چلے گئے اور پانی پت میں انھوں نے کمبلوں کا
ارخانہ قائم کیا۔ اس کارخانے میں ایک ہزار مزدور
ام کرتے تھے۔ اس کارخانے کے تیار شدہ کمبل فوجوں
و سپلائی کیے جاتے تھے۔ اس کارخانے سے آپ کو
افی آمدنی ہوئی اور یہ کارخانہ کئی سال تک قائم رہا۔
سید مسعود الحسن زیدی تحریک پاکستان کے ایک سرگرم
ارکن بھی رہے۔ پاکستان معرض وجود میں آنے کے

بعد سید مسعود الحسن زیدی اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان
سے لاہور (پاکستان) آ گئے۔ لاہور آنے کے بعد آپ کو
سید ظفر الحسن لاری ڈپٹی کمشنر (جو کہ علی گڑھ میں آپ
کے کلاس فیلو تھے) نے لارنس روڈ پر ایک کوٹھی الاٹ
کر دی۔ یہاں آ کر انھوں نے علی گڑھ اور علی گڑھ والوں
کو فراموش نہیں کیا۔ آپ کی کوٹھی پر بائیس تیس چارپائیاں
ہر وقت موجود رہتی تھیں اور علیگ برادری کی بڑی تعداد
میں ان کی مستقل مہمان رہتی تھی۔ بعد میں آپ کو
لاہور میں کلیم میں انارکلی بازار کی پوری ولایت مارکیٹ
الاٹ ہو گئی۔ اس مارکیٹ کی دکانوں کے کرایوں سے
آپ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی گزر بسر کرتے رہے۔
لاہور میں آپ نے علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم
کی اور آپ اس کے بیس سال تک صدر رہے اور بوقت
مرگ بھی آپ اس ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ جب
جنوری ۱۹۶۵ء میں لاہور میں تہذیب الاخلاق ٹرسٹ
قائم ہو گیا تو آپ اس ٹرسٹ کے تعلیمی بورڈ کے صدر منتخب
ہوئے اور بوقت انتقال بھی اس کے صدر تھے۔
تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کے تعلیمی بورڈ نے لاہور میں
۱۹۶۵ء میں نیا علی گڑھ پبلک سکنڈری اسکول اور
۱۹۶۵ء ہی میں نیا علی گڑھ پبلک اسکول مانگا منڈی
قائم کیے۔ نیا علی گڑھ پبلک سکنڈری اسکول میں
۸۳۰ طلبا و طالبات اور نیا علی گڑھ پبلک اسکول مانگا
منڈی میں ۳۲۰ طلبا اب زیر تعلیم ہیں۔ یہ تعداد اب الگ
ہونے کے بعد مزید بڑھ جائے گی۔ سید مسعود الحسن
زیدی دونوں اسکولوں کے صدر رہے۔ نیا علی گڑھ
پبلک کالج لاہور بھی امسال سے قائم ہو گیا ہے۔
آپ کے دوران صدارت ان دونوں اسکولوں نے
بے حد ترقی کی اور ان اسکولوں میں طلبا کی تعداد میں
بے حد اضافہ ہوا۔ تہذیب الاخلاق ٹرسٹ نے لاہور

سے ایک ماہوار رسالہ بنام "تہذیب الاخلاق" بھی جاری کیا ہے۔ رسالہ ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔
سید مسعود الحسن زیدی نے کراچی میں ایک کالج بنام "پیرامیڈیکل سائنس کالج" بھی قائم کیا۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے تحت مختلف ایام مثلاً یوم سر سید، یوم قائد اعظم، یوم محمد علی جوہر، یوم وقار الملک، یوم حالی، یوم اقبال، یوم مولانا ظفر علی خاں اور یوم پاکستان وغیرہ کے منانے میں سید مسعود الحسن زیدی بے حد سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے اور سب علیگ برادری سے ملاقاتیں کرکے بے حد خوش ہوتے تھے۔ اس ایسوسی ایشن کے تحت مشاعرے اور عید ملن پارٹیاں بھی منعقد ہوتی تھیں جن میں آپ بھی بے حد ذوق و شوق سے شرکت کیا کرتے تھے۔ راولپنڈی اور کراچی میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے جلسوں میں بھی آپ شرکت کرتے تھے۔

سید مسعود الحسن زیدی نے اپنے آپ کو مصنفوں کی صف میں بھی شامل کر لیا تھا۔ آپ نے ایک کتاب بنام "علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں" (۲۰۸ صفحات) ۱۹۷۷ء میں تصنیف کی۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں آپ کے مختلف مضامین شائع ہوتے رہے۔ نیز آپ نے ایک مضمون دوران تعلیم بھی ایکشن یونیورسٹی کے بارے میں تحریر کیا تھا اور یہ مضمون مسلم یونیورسٹی میگزین میں شائع ہوا تھا۔ آپ شاعر بھی تھے اور آپ کا ایک مجموعہ کلام بنام "میری مناقبیں" شائع ہو چکا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں ۱۹۵۱ء میں علی گڑھ (جہاں میرا خاندان ۱۸۸۰ء سے مستقل طور پر یونیورسٹی میں رہائش پذیر ہے) سے کراچی (پاکستان) آگیا اور کراچی میں پاکستان آڈٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء میں میرا تبادلہ کراچی سے لاہور ہو گیا۔ لاہور آنے کے بعد میری ملاقات غلام معین الدین صابری سے ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر (جہاں وہ ملازم تھے) سے ہوئی۔ غلام معین الدین صابری کے ذریعے لاہور میں میری ملاقات سید مسعود الحسن زیدی سے ہوئی اور بعد میں ان سے گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں کئی مرتبہ ان سے ملاقات کرنے کے لیے ان کی رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن بھی گیا۔ جب اپریل ۱۹۷۷ء میں کتاب "علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں" آپ نے شائع کی تو انھوں نے یہ کتاب مجھے خود اپنے دست مبارک سے اپنی رہائش گاہ پر مرحمت فرمائی۔ مطالعے کے بعد انھوں نے اس کتاب کے بارے میں میری رائے معلوم کی تو میں نے ان سے کہا کہ علیگ برادران کے لیے یہ کتاب بے حد معلوماتی خزانہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ میرا جواب سن کر انھوں نے فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ ایک نیک
کام کرایا ہے۔"

۱۹۶۳ء میں میرا تبادلہ میرے دفتر سے ہیڈ آفس دفتر آڈیٹر جنرل آف پاکستان ہو گیا۔ ۱۹۷۲ء میں میرا تبادلہ دفتر آڈیٹر جنرل آف پاکستان ہوا۔
لاہور سے دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ کراچی ہو گیا۔ اپنے تبادلے کو رکوانے کے لیے میں نے ایک درخواست اپنے دفتر میں تحریر کرکے دی اور سید مسعود الحسن زیدی سے کہا کہ وہ اپنے علیگ دوست آئی عثمانی (جو کہ اس وقت آڈیٹر جنرل آف پاکستان کے عہدے پر فائز تھے) سے کہہ کر یہ تبادلہ منسوخ کرادیں۔ سید مسعود الحسن زیدی دو تین مرتبہ میرے ہمراہ خود اپنے دوست اے آئی عثمانی سے اُن کے دفتر میں آکر ملے مگر یہ تبادلہ منسوخ نہ ہو سکا۔ کراچی

میں دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ میں دو سال
۱۹۱۹ اور ۱۹۷۵ء میں سید مسعود الحسن زیدی
سلے سید ہاشم زیدی کے ہمراہ آئے پاکستان پر
دفتر سندھ دوسرے پہر رہا۔ بعد میں میں نے دفتر
اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ کراچی سے نوکری سے ریٹائر منٹ لے
اور آج کل میں لاہور میں ایک کنسٹرکشن کمپنی میں بطور
فنانس اکاؤنٹنٹ خدمات انجام دے رہا ہوں۔

سید مسعود الحسن زیدی کا قد و قامت متاثر
کرنے والا تھا۔ آپ بات کھری کھری دو ٹوک اور بے تکلف
کیا کرتے تھے۔ آپ کا رنگ روپ دلکش اور دستر خوان
وسیع تھا۔ میں ان کی قد آور شخصیت سے کافی مرعوب تھا۔
ان کے احباب ان کے لیے گرفتار زلف نہیں بلکہ گرفتار
اخلاص تھے۔ وہ دوسروں کی گفتگو بڑے انہماک اور
اشتیاق سے سنا کرتے تھے اور اس کے بعد اپنی رائے
اظہار کرتے تھے۔ سید مسعود الحسن زیدی علیگ
برادران اور دوسرے احباب کے لیے مجسم انسانیت
اور ایک بے لوث اور بے غرض انسان تھے۔ ان کے
ظاہر و باطن میں کوئی نفاق و تضاد نہیں تھا۔ کسب حلال
کے ساتھ ساتھ علیگ برادری کا مفاد بھی پیش نظر
رہتا تھا۔ پاکستانی قوم کی صحیح راہ پر ترقی کرنے کے
لیے وہ درست قسم کی تعلیم کو بہت اہمیت دیتے تھے
اور فرماتے تھے کہ ہم سب کو اس کا شعور ہونا چاہیے
کہ تعلیم کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں اپنے
نظام تعلیم کا رخ اس شاہراہ کی طرف پھیرنا ہے کہ جو
شاہراہ ہم سب کے لیے سر سید احمد خان پہلے ہی متعین
کر گئے ہیں۔ ان کے دل میں دین کے لیے خدمت کا
جذبہ بھی تھا اور ان کا دل اپنے علیگ برادران اور
اپنے والوں کی محبت و شفقت سے بے حد معمور تھا۔

آپ کی زندگی نہایت سادہ اور بے تکلف تھی۔ آپ
بے حد پابند تھے اس پر تحسین آفرین کہلوانے
تھے اور اس کی وضع داری کرتے تھے۔ آپ بڑی خوبیوں
کے مالک تھے۔ وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک
ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ دریا دل اور عمدہ مزاج
رکھنے والے لوگوں کو دنیا میں آسودگی بخشتا ہے جیسا
کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے آسودگی بخشی تھی۔ آپ نے
ہر موقع پر اور ہر وقت علیگ برادران اور دوسرے
احباب کے مسائل حل کرنے میں بے حد تعاون
کیا اور مسائل حل بھی کیے۔ ضرورت مند کی
ضرورت معلوم ہونے کے بعد آپ اس ضرورت
کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بلاشبہ وہ بڑے
تھے اور گفتگو بڑے خلوص سے کرتے تھے۔
علیگ برادران سے بے حد سچا جذبہ محبت و
خلوص رکھتے تھے۔ آپ بڑے ملنسار اور
کثیر الاحباب شخصیت کے مالک تھے۔

سید مسعود الحسن زیدی نے اپنے خاندانی سوگواروں
میں ایک بیوہ ایک فرزند انور مسعود زیدی (جو
کہ آج کل سعودی عرب سے منسلک ہیں) اور ایک
دختر بدرین عارف زیدی چھوڑے ہیں۔

دعا ہے کہ رب العزت ان سب
کو اور اعزہ و اقربا اور علیگ برادران کو
یہ صدمہ جانکاہ برداشت کرنے کی ہمت
اور استقامت عطا فرمائے۔ آمین

(بشکریہ ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور)
(ستمبر ۱۹۹۱ء)

کہانی سے سماج تک

سعید الظفر چغتائی

نزن اسٹ کے بین الاقوامی مرکز طبعیات میں تھکن کے وقت پڑھنے کے لیے کچھ ہلکا پھلکا مواد بھی مل جاتا ہے۔ میں نے جان گارڈنر کی ایک خوب بکنے والی جاسوسی کہانی "کوئی ہمیشہ نہیں جیتا ہے" اُٹھالی تو جیمس بانڈ سلسلے کی نکلی۔ کہانی معمولی ہے ہیرو چھٹیاں گزارنے جزیرۂ برطانیہ سے ترا فلم یورپ آتا ہے تو یہاں اس کے قتل کے لیے جال بچھا ہے دشمن نے اتنا بڑا معاوضہ دینے کا اعلان کیا کہ دُنیا بھر کی تنظیمیں اور جاں باز، یہاں تک کہ خود اس کے اپنے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ساتھی ایک دوسرے سے مقابلہ قتل میں سبقت لے جانے کی دھن میں کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں تاکہ دوسروں کو راستے سے ہٹا کر خود ہیرو کا سر جان بے تامل راکھانی کو پیش کریں۔ لیکن بانڈ ہار جاتے اور یقین نہ آنے کی حد تک کئی مرحلوں سے گزر کے دشمن کا قلعہ فتح کر دیتا ہے چار عورتیں کہانی میں برابر کی شریک ہوا جو لے وہ تمام بچے کچے اجزا فراہم کر دیتی ہیں جن کے بغیر کوئی جدید فلمی کہانی۔ واقعی "بورنو" یعنی رنگیک بنے بغیر، پڑھنے والوں سے زیادہ تماشا دیکھنے والوں کی بھیڑ کھینچ سکتی ہے۔ کہانی پَن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ شروع ہی سے ذہن پوچھنے لگتا ہے :

یہ کیسے ہوا ؟ یہ لوگ کون تھے ؟
کون ہیں ؟ اور اس کمرے کا
طلسم کس طرح سے کھلے گا ؟

آج کی بھی خوب بکنے والی کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے اور شاید جو تفصیلات ہیں وہ بھی الٹ پلٹ کے یوں ہی بھرلی ہیں۔ امریکی فلم "ڈاکٹر نو" سے بھی یوں خاصی مشابہت ہے کہ ہر اس ملک کی تنظیم یا فرد کو غارت کر ڈالنا زندگی کا سب سے بڑا اور مقدس مقصد ہے جو شاید کبھی شمالی کے مقابل ایک جنوبی قطب بن سکتا ہو۔ فلم سازی ہو، کتاب سازی ہو یا کوئی اور نئی صنعت کاری پیداوار بڑھانا اور اسے بیچنا، بیچتے رہنا، چاہے جیسے ہو، ضروری ہے۔ تو پھر ایسے میں چوری اور سینہ زوری پہ کون مہر لگا سکتا ہے لیکن پڑھتے پڑھتے کچھ ایسی باتیں ذہن میں آئیں کہ خیال ہوا، آپ کے لیے نہیں تو اپنے ہی لیے لکھ ڈالوں۔

پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف فزکس، اے ایم یو۔ علی گڑھ

زر کو لوگوں نے مقبول کرنا چاہا ہے۔ کیونکہ زندگی کی کامیابی عبارت ہی ہے دولت حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے چلنے سے۔ پیشِ نظر کہانی میں اس کی چار صورتیں پیش کی گئی ہیں۔

ایک تو متفرق افراد کی خاصی تعداد ہے جو ایک سے بے پناہ دولت حاصل کر لینے کے شوق میں مگن رہتے ہیں۔ ان جیسوں کو یہ پرانی کہاوت یاد رکھنی چاہیے۔ دو برس پہلے چینی حکومت کا کلیہ کلام بنا ہوا تھا۔

"تعاون کرو، مقابلہ نہیں۔ تعاون کے ذریعے ہم میں سے ہر کوئی اس سے کہیں زیادہ پا لے گا جو مقابلہ کر کے کوئی بھی نہیں پا سکتا۔"

دوسرے نمبر پر مرس زر کی وہ سبق آموز مثال ہے جس میں آسٹریا کا ایک کامیاب اور نیک نام ڈاکٹر نفسیاتی امراض کا ایک اچھا شفاخانہ چلاتے چلاتے بدمعاشیوں کی مجرمانہ سرگرمیوں میں شریک ہو جاتا ہے، کیونکہ:

"اسپتال چلانے کے لیے اسے سرمایہ درکار تھا۔"

اس موقع پر مجھے وہ بنیادی بحث یاد آتی ہے جو فیض آباد میں ایک میرے ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر پرشاد شری واستو صاحب آئے دن اٹھایا کرتے تھے کہ:

"اچھے مقصد کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے یا اچھا مقصد اچھے راستے ہی سے حاصل کرنا چاہیے۔"

کہانی کے اس کردار کے المیہ سے لکھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اچھے مقصد کے لیے بھی ذرائع کیسے ہونے چاہییں لیکن وہ اصل یہ مشکل سوال ہے اور اس میں مسافر کی نیت، قوت ارادی، قوت فیصلہ، خود اعتمادی، سوجھ بوجھ، ضبطِ نفس اور حالات کے جبر میں بہہ جانے کن کن باتوں کو دخل ہے۔ سچ بولنے کا مشورہ اسی لیے بھی دیا جاتا ہے کہ جھوٹ بول کے نکل جانا ہر کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔

تیسری طرح کا کردار ایک عورت کا ہے جو کسی مال دار بوڑھے سے شادی کر لیتی ہے اور اس کے مرنے پر دولت اور اعزاز پا کے بدحواس نہیں ہوتی۔ سکون اور اعتماد سے جیتی رہتی ہے۔ خطرے پیش آتے ہیں تو ان سے بھی معصومیت کے ساتھ محفوظ گزر جاتی ہے۔

چوتھا اور آخری کردار "تاملے دا جانی" کا ہے جس کے عزائم نا پیدا کنار ہیں۔ اپنی زبردست صلاحیت سے اس نے دولت اور اقتدار حاصل کیا ہے اور وہ اسے دنیا کے صاحبانِ جبروت سے ٹکراتا ہے۔ لامحدود خطرے مول لیتا ہے اور حادثوں، امراض اور پوری زندگی کی جدوجہد کا سارا آخر کار بھسم ہو جاتا ہے۔

اس سے پہلا نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ کامیاب اور ترقی کرتے شخص کو انگلوں سے کہیں زیادہ سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ خوب ناپ تول لینا چاہیے کہ کیا کیا جا سکتا ہے اور کیا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے خطرہ مول لینا پڑتا ہے اور بعض طبیعتیں خطر پسند بھی ہوتی ہیں لیکن ہم جیسے کمزور یہی مشورہ دیں گے کہ خوب جتنی حد تک ہی خطرہ میں پڑنا چاہیے اور دشمن جتنا طاقتور

معلوم ہوتا ہو اسے اس سے زیادہ سمجھنا چاہیے۔

آخر میں بات دولت کی تقسیم پر آجاتی ہے اگر راحمانی کو ذاتی طور پر ایسا عظیم الشان سرمایہ حاصل نہ ہو جاتا تو اتنا بڑا سرمایہ ہی غلط راہ پر نہیں آتا۔ اس موضوع پر طرح طرح کی باتیں کہی جاتی رہی ہیں اور کہی جاتی رہیں گی۔ مگر اس بات میں بھی وزن ہے کہ کوئی فرد چاہے کتنا ہی ذہین اور ہنرمند کیوں نہ ہو، اُسے ایک انسانی اوسط سے بہت زیادہ حاصل یا جمع خرچ کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ ورنہ پتہ نہیں کب اس کا دماغ بھی کام کرنا بند کر دے اور وہ راحمانی یا آسٹریلی ڈاکٹر کی طرح تعمیر چھوڑ کے تخریب کی طرف مائل ہو جائے انسان کو بگڑتے اور دماغ کو خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔

روسی سرزمین اور اس کے علاوہ اثر میں سوشلزم کا ستر سالہ تجربہ ناکام ہو چکا ہے اتنا عرصہ گزرا اور ملک میں قحط تک کا پورا انتظام نہ ہو سکا۔ معیار زندگی مغربی یورپ اور شمالی امریکہ سے پست رہا۔ عوام پر حکومت کا جبروت قائم رہا۔ کم از کم مشرقی یورپ سے شکایت ملتی رہی کہ پارٹی والوں نے حاکموں کا بالائی طبقہ بنا رکھا ہے اور لوٹ کھسوٹ میں لگے ہیں۔ دفترشاہی کے ایسے ہی نتیجے خاصی حد تک خود ہندوستان میں نکلے۔ حکومت اور عوام کے درمیان بیوپاریوں نے اعتماد بحال نہ ہونے دیا کیونکہ بنیا کسی ملک و قوم کا دوست نہیں ہوتا۔

لیکن روٹی، کپڑا، مکان، روزگار اور طبی امداد کا بنیادی ضرورت کے طور پر شہریوں کو حکومت یا سماج کی طرف سے فراہم ہونا سارے ترقی یافتہ ممالک کے لائحہ عمل میں شامل ہو گیا ہے اور رائج ہے۔ یہ بات بھی غور و فکر ہی نہیں خاصی حد تک ٹیکسوں وغیرہ کے اچھے اور بُرے طریقوں سے برابر عملی کوشش کا موضوع ہے کہ انسانی معاشرے میں کسی ایک جگہ جمع دولت کو وسیع تر حلقے میں بانٹ کے ایسا معاشرہ کیسے بنائیں جو اس لعنت کے غیر انسانی نتیجوں سے محفوظ ہو۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کسی کو بُرا کہا اور نہ ہی کسی کو گالی دی اور نہ ہی کسی کو سخت و سست کہا، اگر کبھی آپ کو غصہ آ جاتا تو آپؐ صرف اتنا فرماتے:

"تیری پیشانی خاک آلود ہو"

صحیح بخاری

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی

اس کے اسباب اور علاج

محمد اللہ خاں ٭

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کے لیے بھارت کے تعلیمی اعداد و شمار کو بنیاد بنایا جائے تو یہ تشویش ناک نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ہمارے ملک کے ۳۶ فیصد باشندے تعلیم یافتہ ہیں۔ جب کہ مسلمان صرف ۲ فیصد اور وہ بھی اس طرح کہ پرائمری درجات تک ۱۲ فیصد۔ جونیر ہائی اسکول تک ۹ فیصد۔ ہائی اسکول کے معیار تک ۲ فیصد اور اس سے آگے اعلیٰ تعلیمی درجات میں ان کا کوئی فیصد ہی نہیں ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی اس تعلیمی پس ماندگی اور اس کے اسباب کا قدرے گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو اس کے ذمہ دار خود مسلمان قرار پائیں گے۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کے لیے ضلع ایٹہ کا تعلیمی نقشہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

اس ضلع میں اس وقت ۶ ڈگری کالج۔ ۶۵ انٹر کالج، ۹۵ ہائی اسکول اور تقریباً ۳ سو جونیر ہائی اسکول ہیں۔ ان میں تین انٹر کالج ایک ہائی اسکول اور چند جونیر ہائی اسکول سرکاری ہیں، باقی سب پرائیویٹ ادارے ہیں جنہیں سرکاری امداد سے رجسٹرڈ کمیٹیاں چلا رہی ہیں۔ ان اداروں میں مسلمانوں کے کل دو انٹر کالج ایک ہائی اسکول اور ۳ جونیر ہائی اسکول ہیں۔ جب کہ اس ضلع میں مسلمانوں کی آبادی دس فیصد ہے اور اُن کی اقتصادی حالت بھی بُری نہیں ہے۔

اس ضلع میں ایک شوگر فیکٹری مسلمان مالکان کی ہے۔ کپڑے کی صنعت اور دوسرے درمیانی کاروبار بھی اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ قیمتی زمینوں، باغوں اور جائدادوں کے مالک ہیں اور میں اپنی صحیح معلومات اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ بتادینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اپنے ادارے قائم کرنے اور چلانے کے لیے حکومت کی طرف سے اتنی ہی مدد اور تعاون ملتا ہے، جتنا دوسروں کو ملتا ہے اور انہیں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا دوسروں کو بھی سامنا کرنا پڑتا ہے

ان حالات میں آبادی کے لحاظ سے ضلع ایٹہ میں مسلمانوں کا ایک ڈگری کالج، سات انٹر کالج، دس ہائی اسکول اور تیس جونیر ہائی اسکول لازماً ہونے چاہیے تھے۔

٭ قصبہ سہاور۔ ضلع ایٹہ۔

اس سلسلے میں یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ ضلع ایٹہ میں مسلمانوں کے جو گنے چنے تعلیمی ادارے ہیں کہ جن کے پرنسپل مسلمان، زیادہ تر منیجر مسلمان، انتظامیہ کمیٹیوں کے ذمہ دار مسلمان، اس کے باوجود اُن اداروں میں طلبا کی اکثریت اس لیے غیر مسلموں پر مشتمل ہے کہ مسلمان بچے اُن میں بھی بہ کثرت داخلے نہیں لیتے اور دوسرے اداروں میں تو مسلمان طلبا کے ساتھ تعصب برتے جانے کی بنا پر اُن کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہے۔

ضلع ایٹہ کے اس تعلیمی نقشہ کے تناظر میں پورے بھارت کے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا جو نقشہ ہمارے سامنے پھیلتا ہے۔ اُس کی اصل وجہ ۱۹۴۷ء کا خونی انقلاب ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا بدقسمت ملک تقسیم ہو کر اس طرح آزاد ہوا تھا کہ اس سرزمین پر لاکھوں لوگوں کا خون بہا دیا گیا اور لاکھوں لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان بھاگ گئے اور اُس آبادھاپی میں سرکاری سربرآوردہ سیاسی رہنما بھی کہ جن پر ہندوستانی مسلمانوں کو بہت بڑا اعتماد تھا انھیں کس مپرسی کے عالم میں میدان و سرگرماں چھوڑ کر پاکستان منتقل ہو گئے۔

چنانچہ اُن بدترین حالات میں ہندوستانی مسلمان نفسیاتی طور پر فرد کو بے سہارا اور لاچار محسوس کرتے ہوئے زندگی کی جدوجہد سے علیحدہ ہو گئے اور انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

اس افراتفری، رواروی، دل شکستگی اور مایوسی کے ماحول میں ہندوستان کی اکثریت اور جمہوری حکومت کا اُن کے ساتھ کچھ اس انداز کا برتاؤ رہا کہ آزاد ہندوستان کے جمہوری قانون میں تو ایک اقلیت کی حیثیت سے ان کی جان و مال، عزت و آبرو، مذہب، ثقافت اور زبان کو مکمل تحفظ دیا گیا اور اس کی عمل آوری کے لیے بھارت کی جمہوری سرکاروں اور صدر مملکت کو ذمہ دار قرار دیا گیا لیکن عملاً ایسا کم ہی ہوا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں ہزاروں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں خاص طور سے ایک فرقے کا خون بڑی بیدردی سے بہایا گیا۔ اُس جائدادیں اور کاروبار تباہ کیے گئے تو حکومت کی مشنری نے اُس کی مدد کرنے کے بجائے اسی پر گولیاں چلائیں گرفتار کیا اور اسی کو اُن خونریز فسادات کا ذمہ دار قرار دیا۔ خفیہ احکامات کے ذریعہ ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کیے گئے۔ اُردو زبان کو تعلیمی اداروں سے محض اس لیے بےدخل کیا گیا کہ بہتوں کے نزدیک یہ ایک غیر ملکی زبان ہے۔ تعلیمی اداروں میں اُن کے ساتھ ایسا سخت اور غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا گیا کہ ان کے بچوں کا اُن اداروں میں تعلیم حاصل کرنا بہت دشوار ہو گیا۔ اسی طرح تجارت اور صنعت و حرفت کے دائروں میں بھی ان کے ساتھ امتیاز برتا گیا کہ جس کی وجہ سے اُن کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ زندگی کے ہر میدان سے پیچھے ہٹ گئے۔

بھارت میں کچھ اسی انداز کا خونی انقلاب ۱۸۵۷ء میں بھی آیا تھا اور اس وقت انگریزوں نے بھارتی حکمرانوں کو زیر کر کے پورے ملک میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی بھارتی مسلمانوں کو بہت بڑے پیمانے پر ہلاک و برباد کیا گیا تھا۔ انھیں سرکاری ملازمت تجارت صنعت و حرفت اور تعلیم کے دائروں سے خارج کر کے پست حوصلہ اور اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا

تھا۔

اس انتہائی نازک اور ابتلا کے دور میں سرسید
ر اُن کی فلاح و کامیابی کے ٹھوس اور جامع منصوبوں
ساتھ مسلم سماج میں نمایاں ہوئے اور انھوں نے
ت کا شکوہ اور اپنی محرومیوں کا ماتم کرنے کے بجائے
اعتمادی اور خود اعتمادی کی بنیاد پر اپنے مسائل خود
کرنے کا ولولہ انگیز اصول پیش کیا۔ اوّل اوّل ہندوستانی
لمانوں نے ان کے اس اصول اور منصوبے کو تسلیم
یا کیا۔ بلکہ انہیں انگریزوں کا ایجنٹ اور اپنا بدخواہ سمجھ
ت کی تعلیمی اور سماجی تحریک کی سخت مخالفت اور
ب تحریک کی بڑے بھونڈے انداز میں توہین اور
یل کی۔ لیکن مرحوم بددل نہیں ہوئے اور اپنی تحریک
امیابی کی منزلوں سے ہم کنار کرنے کے لیے نت نئی راہیں
ش کرکے ان پر آخری سانس تک رواں دواں
ے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمان سرسید
وم کے اصولوں اور منصوبوں سے متفق ہو کر اپنی مدد
پ کرنے کے خوگر ہو گئے اور حکومت و حالات کا شکوہ
نے میں ان کا جو وقت اور توانائیاں برباد ہوتی تھیں وہ
وس تعمیری کاموں میں لگنے لگیں جس کے شاندار نتائج
ی گڑھ مسلم یونیورسٹی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
یرنی سوسائٹی، دسیوں مسلم اسکولوں اور کالجوں سیکڑوں
بی اردو زبان، طاقتور مسلم پریس، ولولہ انگیز ترجیح
ر مسلم یونیورسٹی کی فراہم کی ہوئی زندگی کے ہر شعبہ میں
سلمانوں کی مخلص لیڈر شپ کی شکل میں آج بھی ہمارے
سامنے موجود ہیں اور سب سے بڑھ کر سرسید مرحوم
یہ عملی پیغام کہ

" عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو وقت
کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنے بلند حوصلوں
اور مسلسل عملی اقدامات کی بنیاد پر ان
حالات سے مقابلہ کرنے کے عادی بن جاؤ۔"

ٹھیک اسی دور میں جب کہ سرسید مرحوم "اپنی مدد
آپ" کے سنہری اصولوں کی روشنی میں یہ سب کام
کر رہے تھے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دینی تعلیم کو
فروغ دینے کے لیے دیوبند میں دارالعلوم قائم کرنے
کی تحریک شروع کی اور اس سلسلہ کی عمل آوری کے لیے
مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ وہ ہر کام خدا کے بھروسے پر مکمل
جد و جہد کے ذریعہ انجام دینے کی کوشش کریں۔
چنانچہ مولانا نے دارالعلوم کو قائم کرنے اور چلانے کے
لیے جو بنیادی اصول وضع کیے ان میں دو بہت نمایاں
ہیں۔

۱۔ اس ادارے کے لیے حکومتِ وقت
سے کوئی مدد نہ مانگی جائے اور نہ قبول
کی جائے۔

۲۔ دارالعلوم کے لیے کوئی وقف جائداد
قبول نہ کی جائے۔

مولانا نے یہ دونوں اصول اُن حالات میں پیش کیے
جب کہ ہر قسم کے تعلیمی اور سماجی ادارے حکومت کی امداد
اور وقف جائدادوں کے کمزور سہاروں پر ہی چلائے جا رہے
تھے۔ لیکن اُن اصولوں پر عمل کرنے کی برکت دیکھیے کہ
ایک ایسا ادارہ جس کی ابتدا، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ
نے انار کے درخت کے نیچے صرف ایک طالب علم کو درس
دے کر کی تھی، نہایت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا
اس مقام تک پہنچ گیا کہ اس وقت دینی علوم کی تعلیم و تدریس
میں پورے عالم اسلام میں جامعہ ازہر (مصر) کے بعد دوسرے
نمبر پر ہے۔

ہمارے دور کے حالات میں سرسید مرحوم اور
مولانا محمد قاسم نانوتوی مرحوم کے اصولوں اور طریق کار کو اپنا
رہبر بنا لیا جائے تو آج کے نازک حالات میں بھی مسلمانوں

کا سفینہ بھنور سے نکل کر کھلے سمندروں میں رواں دواں ہو سکتا ہے۔

اس وقت بھارتی مسلمان جن آفتوں اور مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں وہ سب توجہ طلب ہیں لیکن تعلیم کا محاذ ایک ایسا محاذ ہے کہ اسے سب محاذوں پر فوقیت دی جاتی چاہیے لیکن افسوس کہ اس وقت اسی مسئلہ کو سب سے کم اہمیت دی جاتی ہے جب کہ یہ مسئلہ "اہم المسائل" سمجھے جانے کا مستحق ہے چنانچہ اس مسئلہ کو حل کر لیا گیا تو انشاء اللہ مسلمانوں کا مستقبل چاند اور سورج کی طرح روشن ہوگا۔ ورنہ سیاہ راتوں کی طرح تاریک اور اس وقت جہالت اپنی گودیں پھیلا پھیلا کر بڑا کہیں گی اور تاریخ ہماری ناعاقبت اندیشی اور کاہلی کو نمایاں کرے گی۔

اس وقت تعلیمی محاذ پر خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے سیاسی، عقائدی، گروہی اور نسلی اختلافات کو نظر انداز کر کے اجتماعی طور پر خوب مضبوطی سے کام کرنا ہوگا۔ جو تعلیمی ادارے جماعتیں اور کمیٹیاں قایم ہوں انھیں انتہائی متحرک اور فعال بنانا ہوگا۔ جہاں ضرورت ہو وہاں نئی کمیٹیاں اور ادارے بھی قایم کیے جائیں گے مسلم سماج کو تعلیم کا خوگر بلکہ عادی بنانے کے لیے بھرپور جد و جہد کریں۔ اس کے لیے علم فہم لٹریچر تیار کیا جائے۔ اس موضوع پر جاندار رسالے جاری کیے جائیں۔ بڑے بڑے جلسے کیے جائیں، جلوس نکالے جائیں، سیمینار منعقد کیے جائیں۔ ہر قسم کے تعلیمی اداروں میں زیادہ سے زیادہ مسلمان بچوں کو داخل کرانے کی مسلسل کوششیں کی جائیں۔ عملی طور پر مسلمان بچے یا اُن کے سرپرست دشواریاں محسوس کریں تو انھیں اجتماعی طور پر حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ جہاں ضرورت ہو وہاں نئے تعلیمی ادارے قایم کیے جائیں اور انھیں مضبوط بنایا جائے۔

مسلمانوں کی جو جماعتیں اور ادارے تعلیمی محاذ پر کام کر رہے ہیں اُن میں ربط قایم رہنا ضروری ہے اس کے لیے اُن جماعتوں اور اداروں کے ذمہ دار وقتاً فوقتاً اپنے افکار اور تجربات کا تبادلہ کریں۔ ہر قسم کی دشواریوں اور رکاوٹوں کو مل جل کر رفع کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی بہت جلد ختم ہو جائے گی اور مسلم سماج کا کارواں تعلیم کی روشنی میں ایک تابناک مستقبل کی طرف پوری رفتار سے رواں دواں ہو سکے گا۔

> "اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام کو تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو تمہیں سلام کرے یا تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے، یوں مت کہہ دیا کرو کہ تم مسلمان نہیں۔"

اترپردیش کے مسلم گرلز ہائی اسکول کے نتائج کا سرسری جائزہ

نوّے فیصد پاس۔ اکیس فیصد فرسٹ ڈویژن

بیگم نصرت شیروانی ▽

اترپردیش کے قریب چالیس گرلز انٹر کالج
ہائی اسکولوں کو ۱۹۹۱ء کے رزلٹ کے لیے
م بھیجے گئے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتہ تک ان میں
چھبیس اداروں کے نتائج آگئے جو چارٹ میں پیش
ہے۔ ٹوٹل اوسط رزلٹ ہے نوّے فیصد پاس
اکیس فی صد فرسٹ ڈویژن۔ چند سال پہلے
۔ اترپردیش کے ہمارے گرلز اداروں سے
اسکول بورڈ امتحان میں بمشکل دو ایک فی صد
بات فرسٹ ڈویژن لا پاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ
تے بڑھتے یہ تناسب اس سال اکیس فیصد
یا۔ پاس فیصد بھی یہی کوئی پچاس کے قریب
کرتا تھا جو اب نوّے تک پہنچا ہے۔ بہتری بلاشبہ
مد افزا ہے۔

چارٹ میں رزلٹ فرسٹ ڈویژن کے تناسب
اعتبار سے درج کیے گئے ہیں۔ ۱ دارالعلوم
ل گرلز ہائی اسکول مئو ناتھ بھنجن میں پینتیس یا
بائیس یعنی اٹھاسٹھ فیصد اور ۲ اسماعیل نیشنل

گرلز انٹر کالج میرٹھ میں ایک سو چھیاسٹھ میں سے ننانوے
یعنی چوّن فیصد اور ۳ عائشہ گرلز ہائی اسکول
مئو ناتھ بھنجن میں پینتالیس میں سے تئیس یعنی اکیاون
فیصد طالبات نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ اس کے
بعد آٹھ اور ادارے ہیں (۴ سے ۱۱ تک)
جہاں فرسٹ ڈویژن کا تناسب تیس فیصد سے لے
کر چیالیس فیصد تک ہے۔ یعنی ان سب اسکولوں
کے اوسط سے بہتر ہے۔ اس کے بعد سات اداروں
(۱۲ سے ۱۸ تک) میں تیرہ فیصد سے لے کر
بیس فیصد تک طالبات فرسٹ ڈویژن لائیں۔
مزید چار اداروں (۱۹ سے ۲۲ تک) میں آٹھ یا
نو فیصد اور ۲۳ میں صرف چار فیصد طالبات نے
فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ آخری ۲۴ میں فرسٹ
ڈویژن صفر تھی۔

اب پاس فیصد دیکھیے۔ پانچ اداروں (۲،
۵، ۶، ۸ اور ۱۱) میں سو فیصد
نو اداروں (۱، ۲، ۳، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵

▽ سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشن کمیٹی۔ کناٹ پلیس۔ نئی دہلی۔

ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۹۰ء

شریک امتحان	پاس تعداد	پاس فیصد	فرسٹ ڈویژن تعداد	فرسٹ ڈویژن فیصد	ادارہ کا نام - مقام - ضلع
۴۶	۴۰	ستاسی	۲۲	انسٹھ	دارالعلوم نسواں اسکول - مئوناتھ بھنجن
۱۳۳	۱۲۹	چھیانوے	۶۲	[illegible]	اسماعیل نیشنل کالج - میرٹھ
۴۵	۴۲	ترانوے	۲۳	اکیاون	عالیہ اسکول - مئوناتھ بھنجن
۳۹	۳۹	سو	۱۸	چھیالیس	قدوائی بالیکا کالج - انجان شہید - اعظم گڑھ
۳۹	۳۹	سو	۱۹	چھیالیس	گورنمنٹ اسکول - سنبھل مرادآباد
۱۱۴	۱۰۹	چھیانوے	۴۹	تینتالیس	ساجد کالج - جون پور
۴۳	۴۳	سو	۱۳	انتالیس	زیب النساء اسلامیہ اسکول بلتھرا روڈ بلیا
۳۹	۳۹	سو	۱۲	اکتیس	رحمانیہ اسکول - چاندپور - بجنور
۵۳	۵۱	نواسی	۱۳	پچیس	مفتی گنج اسکول - لکھنؤ -
۸۱	۷۲	نواسی	۱۹	تئیس	عائشہ رشید اسکول - لار - دیوریا
۶۷	۵۹	اٹھاسی	۱۶	تئیس	فتح پور اسکول - ضلع اعظم گڑھ
۸۲	۷۹	چھیانوے	۱۶	بیس	آل احمد کالج - امروہہ - مرادآباد
۱۴۰	۱۳۶	ستانوے	۲۷	انیس	تعلیم گاہ نسواں کالج - لکھنؤ
۸۵	۸۰	چورانوے	۱۵	اٹھارہ	ابوالکلام آزاد کالج بکھیری - لکھیم پور
۳۰۱	۲۵۲	چوراسی	۴۵	پندرہ	امام باڑہ کالج - گورکھپور
۵۳	۴۳	تراسی	۷	تیرہ	نجیب الدولہ کالج - نجیب آباد - بجنور
۱۵	۱۵	سو	۲	تیرہ	حافظ محمد صدیق اسلامیہ اسکول - اٹاوہ
۳۳۶	۳۲۳	چھیانوے	۴۴	تیرہ	مسلم جوبلی کالج - کانپور
۳۲	۱۶	پچاس	۳	نو	فیاض بیگ اسکول - بلندشہر
۲۵	۲۴	چھیانوے	۲	آٹھ	محمدیہ بنکر اسکول - کانپور
۳۴۸	۲۹۳	چوراسی	۲۹	آٹھ	حمیدیہ کالج - الہ آباد
۷۶	۵۰	چھیاسٹھ	۶	آٹھ	صغریٰ بیگم اسکول - فیروز آباد - آگرہ
۲۸	۲۳	بیاسی	۱	چار	ایچ آر اسکول - خورجہ - بلندشہر
۲۲	۸	چھتیس	—	صفر	بیگم لاری اسکول - لکھنؤ
۲۲۱۳	۱۹۸۳	نوے	۴۷۱	اکیس	چوبیس کا ٹوٹل اور اوسط

١٨- میسرز عبدالقیوم۔
اردو لائبریری
تحصیل گیٹ
گھنٹہ گھر۔ بدایوں

١٩- میسرز اسلامک بک سینٹر
جامع کمپلکس
ایم۔آر۔روڈ
بنگلور۔ کرناٹک

٢٠ محمد شمیم
معرفت خورشید بک اسٹال
بار ڈاوا۔
رانچی روڈ۔
نوادا۔ بہار

٢١- میسرز کریسنٹ بک
اردو بازار
دربھنگہ۔ بہار۔

٢٢- میسرز مکتبہ اسلامی
اپوزیٹ بنّے میاں درگاہ
شاہ گنج۔
اورنگ آباد۔ مہاراشٹر۔

٢٣- میسرز الیس۔ ایم راشد ندیم
محلہ محل سرائے۔ کتب خانہ
دھام پور۔ بجنور۔

٢٤ میسرز روشن درسی کتب خانہ
معرفت ا۔ ڈبلو خاں۔
چاسع مین/ کیولے ای
وہیکل فیکٹری۔
جبلپور۔ مدھیہ پردیش۔

٢٥- میسرز شاہ فیض۔
معرفت میسرز توکلتی کو۔ سیدا پور۔
دھرواڑ۔ کرناٹک۔

٢٦- اسلامیہ بک ڈپو۔
بک سیلرز اینڈ جنرل مرچنٹ۔
نیو مارکیٹ۔ تاتار پور روڈ۔ بھاگلپور سٹی۔

٢٧ میسرز آزاد بک ڈپو۔
مین روڈ۔ مدھوبنی
مدھوبنی۔ بہار

٢٨- میسرز انور بک ایجنسی
ہاؤس نمبر ١-١١-١١٧- مستان پورہ
تانڈور

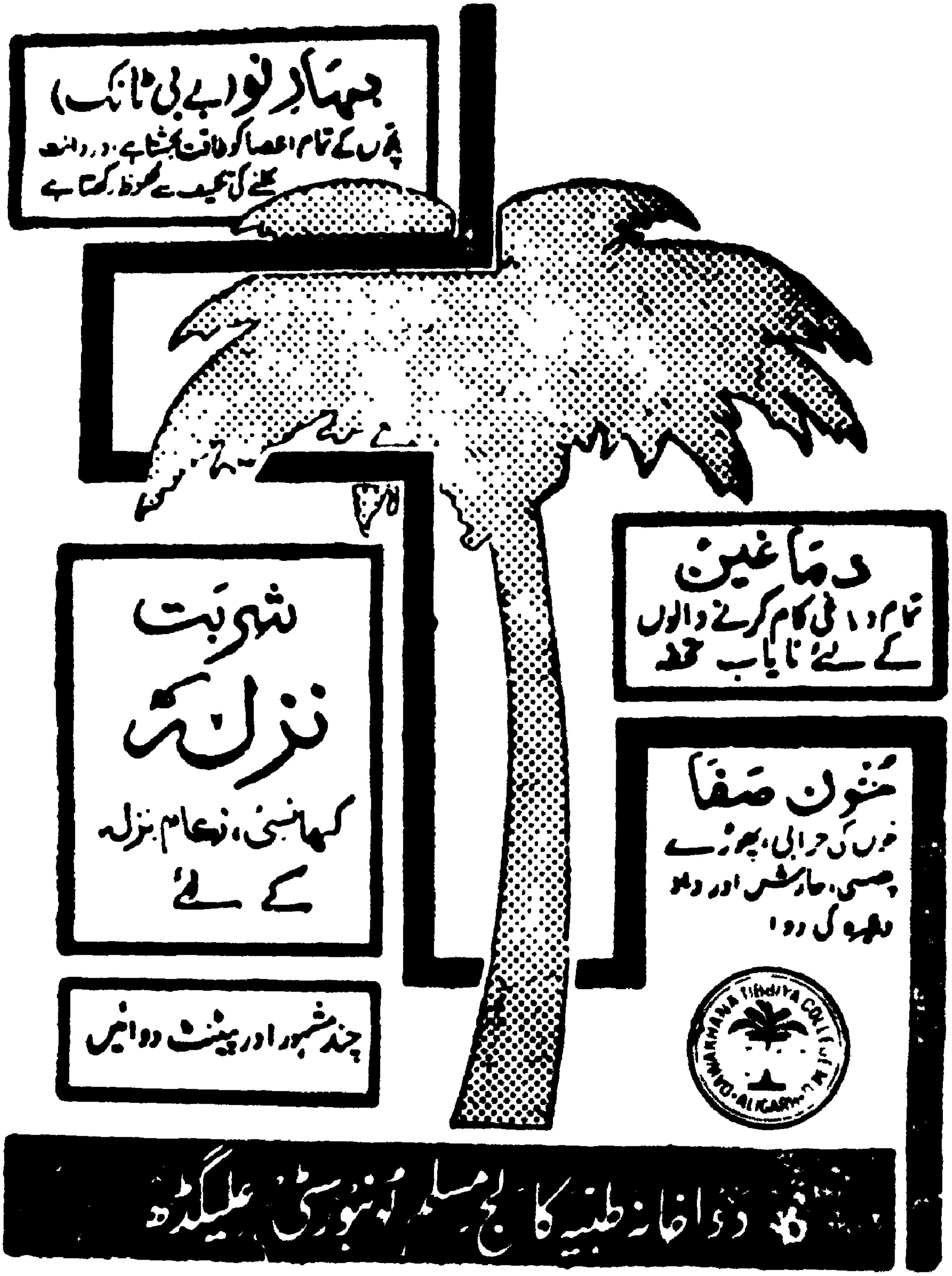
٢٩- میسرز سب رنگ بک
انجمن پلازہ۔ مین روڈ۔
رانچی۔ بہار

٣٠- میسرز شمسی بک سینٹر
چھوٹی مسجد۔ اسٹیشن روڈ
سمستی پور۔

٣١- میسرز محمد شکیل صدیقی۔
معرفت ایم ایم صدیقی صاحب
مونس بانک۔ ڈاکخانہ بی پور
نزد دیناپور۔ کینٹ۔ پٹنہ۔ بہار

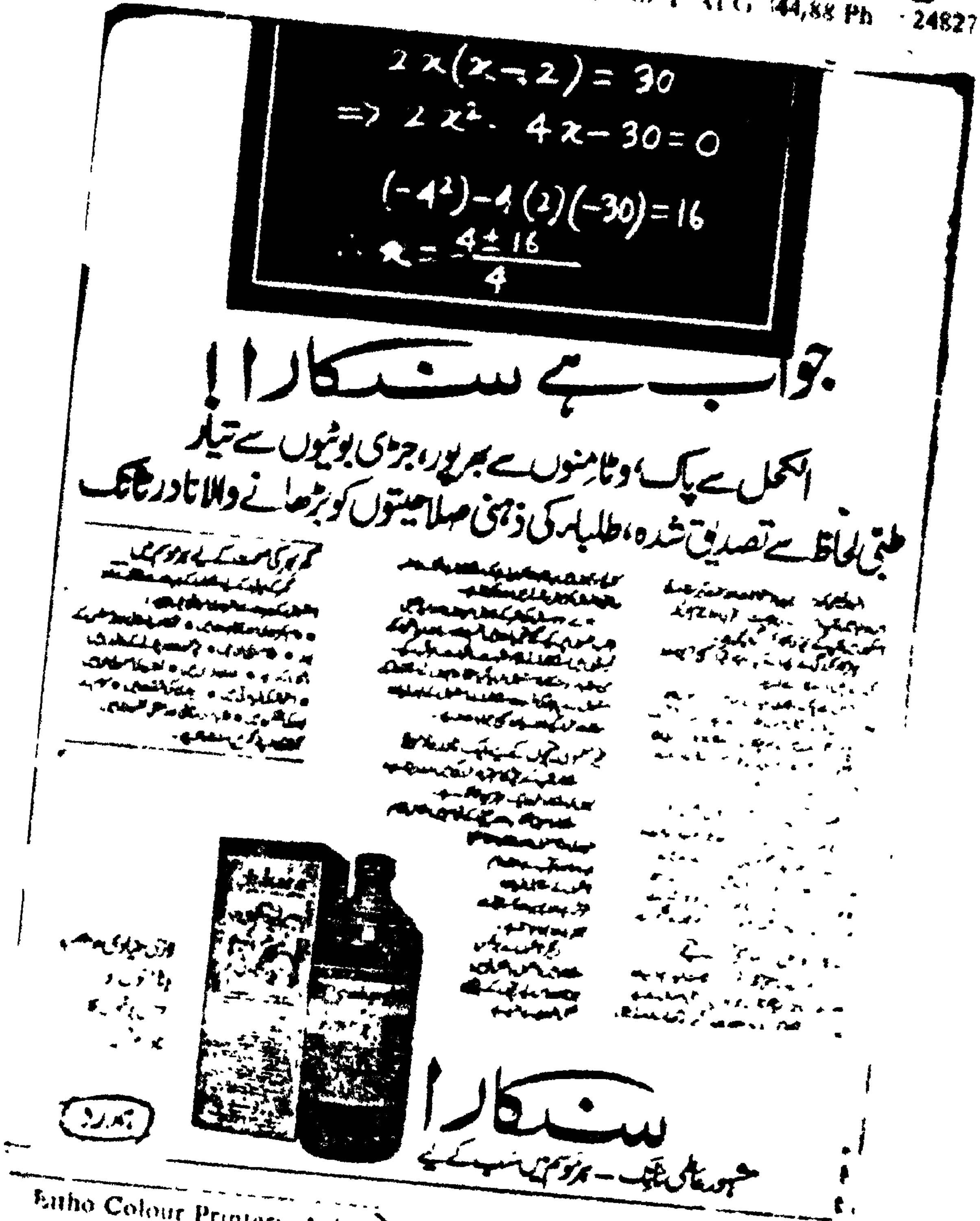
٣٢- میسرز عبدالقدیر بک سیلر
مین روڈ۔ موتی ہاری۔
مشرقی چمپارن۔ بہار

٣٣ میسرز ایم۔ ایچ۔ بک سیلر
جنرل سیلر اینڈ ریٹیلر۔
رحم گنج۔ دربھنگہ۔ بہار



بہار نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے، اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لیے نایاب تحفہ
شربت نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
معجون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد کھجو کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

Tahzibul Akhlaq December [illegible] Regd. No. L ALG 344,88 Ph. 24827



Latho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone : 24185